نہیں پڑھتا۔ جس طرح ایک بیرسٹر اپنے مقدمے کی مختصر یادداشت کو پڑھتا ہے، اسی طرح میں بھی اس رپورٹ کو پڑھتا ہوں، تاکہ اس کے ذریعے سے پیسے کماؤں۔ اگر آپ کسی کتاب کو محض تفریح کی غرض سے پڑھ رہے ہوں تو پھر آپ کے چاروں طرف کچھ بھی ہوتا رہے آپ کو پروا نہ ہوگی۔ خیال ہے کہ میں تو "ٹیرسٹرم شینڈی" اور "ٹریژر آئیلینڈ"[1] سے زلزلہ کے دوران میں بھی لطف لے سکتا ہوں۔

لیکن جب آپ کسی کتاب کو سنجیدہ مقصد کے ماتحت پڑھ رہے ہوں تو آپ کو معقول سکون کی ضرورت ہوگی اور یہی چیز مجھے میسر نہیں آسکی کیونکہ دوسرے ہی اسٹیشن سے دو صاحب تشریف لے آئے جن میں ایک صاحب اپنے ساتھی کے ساتھ راستہ بھر بہت زور زور سے تفاخرانہ لہجہ میں گفتگو فرماتے رہے۔ انھیں دیکھ کر مجھے "ہارن ٹوک" کا وہ قصہ یاد آگیا کہ ایک صاحب سڑک پر بہت ہی اکڑ کر چل رہے تھے۔ ایک ظریف نے انھیں روک کر دریافت کیا کہ "معاف کیجئے گا جناب! کیا آپ خود کو ہم چو من دیگرے نیست سمجھتے ہیں؟" یہ حضرت بھی "ہم چو من دیگرے نیست" قسم کے انسان تھے۔ میں تو رپورٹ کے نقشوں اور جدولوں کے ساتھ جنگ میں مصروف تھا، دوران حضرت کی آواز آندھی کی طرح برابر بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ان کے خاندانی حالات، جنگ عظیم میں ان کے لڑکوں کے کارنامے اور سپہ سالاروں اور سیاسی رہنماؤں کے افعال پر ان کی تنقید نے میری اپنے کام میں لگے رہنے کی کوشش کو رائگاں کر دیا، میں نے کتاب بند کر دی۔ اور کچھ دیر بیٹھے بیٹھے گا اور نہایت بددلی کے ساتھ ان کی گفتگو بھی سنتا رہا۔ وہ اس قسم کے الفاظ کے ساتھ گرج رہے تھے: "فرانس والوں کو اصل میں کرنا کیا چاہئے تھا؟ جرمنی والوں نے اصل میں غلطی کیا کی؟ اگر صرف اسکوتھ نے ...... کیا ہوتا وغیرہ وغیرہ۔" گفتگو کے رنگ کو آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ میں اس قسم کی گفتگو پہلے بھی سن چکا تھا اور کئی بار سن چکا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک خود بخود بجنے والا باجا ہے جس میں سے اگلے زمانے کا کوئی راگ مسلسل نکل رہا ہے۔

اگر میں ان سے کہتا کہ "بندہ پرور! ذرا آہستہ بولئے" تو شاید وہ مجھے بہت ہی بدتہذیب انسان سمجھتے۔ ان کے ذہن میں یہ بات مطلق نہیں آئی کہ ان کی گفتگو سننے کے علاوہ دوسرے شخص کو کوئی اور کام بھی ہو سکتا ہے اور مجھے تو اس میں ذرا بھی شبہ نہیں [illegible] سے ضرور اس یقین کے ساتھ گئے ہوں گے کہ ان کی بدولت تمام مسافروں کا سفر بہت ہی بصیرت افروز رہا اور ہر شخص ان کی ہمہ گیر معلومات کا خوشگوار نقش اپنے ذہن میں لیکر جائیگا۔ یہ واقعہ ہے کہ وہ ایک نیک نیت انسان تھے۔ اگر کمی بات کی ان میں تھی تو صرف یہ کہ وہ آداب مجلس سے ناواقف تھے۔ وہ "شایان انجمن" انسان نہیں تھے۔

دوسروں کے حقوق یا جذبات کے مناسب لحاظ پر ہی حیات اجتماعی کا دارومدار ہے۔ عورتوں کی نسبت عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس معاملے میں وہ مردوں کے مقابلہ میں کم شائستہ ہوتی ہیں اور میں بھی اپنے تجربہ کی بنا پر اس اعتراف پر مجبور ہوں کہ وہ عورت اور خوش پوشاک عورت ہی ہوتی ہے جو ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے سامنے آپ کے آگے گھس جاتی ہے۔ مرد کبھی ایسا نہیں کرے گا کیونکہ اول تو وہ جانتا ہے کہ لوگ اس کے اس فعل کو جائز نہیں کہیں گے۔ دوسرے اس کے وسیع میل جول نے اس کو چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی "عوض معاوضہ" کے اصول کی پابندی سکھادی ہے۔ وہ دنیا کی کھلی فضا میں زیادہ رہا ہے۔ جہاں ہر شخص کو اپنا طرز عمل عام معیار کے مطابق رکھنا پڑتا ہے۔ اس کی اسکول کی زندگی، اور انجمنوں اور کھیلوں میں شرکت اس خصوص میں اس کی ایسی تربیت کر دیتی ہے جس سے عورتوں نے صرف ابھی ابھی مستفید ہونا شروع کیا ہے۔

میرا اعتقاد ہے کہ غریب اور بے زبان لوگوں کے حقوق کا تحفظ بھی اسی قدر ضروری ہے جتنا کہ چھوٹی قوموں کے حقوق کا۔ جب میں کسی موٹر والے کو دیکھتا ہوں کہ وہ اپنا بے درد اور سفاک ہارن[3] بلا ارادہ بجا رہا ہے تو میں سچ کہتا ہوں میرے خون میں اسی قسم کا ایک ابال پیدا ہو جاتا ہے، جیسا کہ اس وقت پیدا ہوا تھا جب جرمنی نے بلجیم کے کچل ڈالنے کے لئے جارحانہ اقدام کیا تھا۔

جناب محترم! آپ کس استحقاق سے ہر اس شخص کو یہ نفرت انگیز گالی سناتے جاتے ہیں جو شاہراہ عام پر آپ کے راستے میں حائل ہو؟ کیا آپ ایک مہذب انسان کی طرح اپنی آمد کا اعلان نہیں فرما سکتے؟ کیا آپ بھی "ہم چو من دیگرے نیست" قسم کے انسان ہیں؟ یا کیا آپ پیغمبر نیٹشے[2] (NIETZSCHE) کے کوئی پرجوش پیرو ہیں؟ مجھے سخت تعجب ہوتا ہے کہ وہ کس قسم کا انسان ہے جو اپنی موٹر کار میں ایک ذہنیت تیز ہارن لگا کر بیٹھتا ہے اور نہیں سمجھتا کہ وہ اس اسپرٹ کا نمونہ ہے جس کا جرمنی

[1] ناولوں کے نام۔

[2] مشہور جرمن فلسفی فلسفہ "انسان افضل" کا بانی۔

[3] HORN

نے سلطا برد کیا تھا اور وہ مہذب دنیا کے صفحہ پر ایک بہت ہی بدنما نقش ہے۔
اب سب سے زیادہ بے ضرر انسان کو لیجئے جس نے ایک بڑے
آواز کا گراموفون خرید لیا ہے۔ اور ہر اتوار کی شام کو اسے بجاتا ہے۔ کھڑکی
کھول دیتا ہے۔ اور تمام محلہ میں "کیپ دی ہوم فائرس برننگ"[1] یا اسی قسم کے کسی
دوسرے گیت کی صدا گونجنے لگتی ہے۔ ان معاملات میں اجتماعی زندگی کے
اعمال و افعال کے جائز حدود کیا ہیں؟ مثال کے طور پر بھرائی ڈھول والے
معاملہ کو لینا چاہئے۔ ہیزلٹ[2] لکھتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس وحشت خیز باجے
کو سیکھنا چاہتا ہے تو وہ اپنے مکان کے اندر سیکھنے کا مجاز ہے۔ چاہے اس
سے اس کے ہمسایوں کو تکلیف ہی کیوں نہ ہو لیکن یہ اس کا فرض ہے
کہ جہاں تک ممکن ہو اس تکلیف کو کم سے کم کرنے کی کوشش کرے
اس کو چاہئے کہ اپنے مکان کے اندرونی حصہ میں بیٹھ کر مشق کرے اور
کھڑکی بند کر دے۔ اس کو بالکل حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے مکان کے
بیرونی حصہ میں بیٹھے کھڑکی کھول دے۔ اور پوری قوت کے ساتھ اپنے شور
سے ہمسایوں کے کان پھوڑ دے" یہی صورت گراموفون کی بھی ہے
اگر آپ کو گراموفون پسند ہے تو آپ اسے خرید سکتے ہیں لیکن اگر آپ
اس کے شور کو اپنے ہی گھر تک محدود رکھنے کی امکانی کوشش نہ کریں
تو آپ اپنے ہمسایوں کی آزادی میں مخل ہوں گے ممکن ہے آپ کے
ہمسایوں کو "کیپ دی ہوم فائرس برننگ" بھلا نہ معلوم ہوتا ہو اور
وہ اپنی اتوار کی شام بے شور و شر گزارنا زیادہ پسند کرتے ہوں۔ آپ کا
سامان برجہ کران کے سکون میں مخل ہونا ایسا ہی معیوب ہوگا جیسا کہ ان کے
باغ میں بغیر اجازت گھس جانا اور ان کے پھولوں کی کیاریوں کو روند ڈالنا"

اس میں کلام نہیں کہ بعض صورتیں ایسی بھی پیش آتی ہیں۔ جہاں
ایک کی آزادی دوسرے کی آزادی سے ٹکراتی ہے اور کوئی درمیانی راستہ
اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ زید میرے ایک پرانے دوست ہیں جو امراء کے
محلے میں رہتے ہیں۔ وہ نیک نہادی اور زود رنجی کا ایک عجیب مرکب ہیں
اگر وہ کبھی سڑک پر پیانو بجتا ہوا سنتے ہیں تو غصے میں بھر جاتے ہیں اور باہر
نکل کر بجانے والے کو فوراً چلے جانے کا حکم دے دیتے ہیں۔ لیکن
ان کے پڑوس میں ایک ممتاز خاتون بھی رہتی ہیں جو لطیف رومانی مذاق
کی حامل ہیں اور بازاری پیانو پر فدا ہیں۔ پیانو بجانے والے بھی ان کی
طرف اسی طرح کھنچتے ہیں جس طرح شہد کی طرف مکھیاں۔ اب اس صورت
میں کس کی آزادی دوسرے کی آزادی پر قربان کی جائے؟ بخدا میرے
پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے کیونکہ بازاری پیانو کو پسند کرنا بھی ایسی
ہی معقول بات ہے جیسا کہ اسے ناپسند کرنا۔ ایسے دلچسپ مسئلے کے متعلق سینچ
پچی کا حل زیادہ قابل قدر رہوگا۔

میں سمجھتا ہوں بات دراصل یہ ہے کہ دنیا کے اس پیچیدہ نظام
کے اندر نہ تو ہم مطلق اشتراکی بن سکتے ہیں اور نہ مطلق نراجی بلکہ ہم کو دونوں کا
ایک موزوں مرکب ہونا چاہئے ہمیں اپنی انفرادی اور اجتماعی دونوں آزادیوں
کو برقرار رکھنا ہے۔ ایک طرف تو ہمیں ارکان حکومت کی اعمال کی نگرانی کرنا
چاہئے اور دوسری طرف مخالفین حکومت کے انسدادی تدابیر ہیں۔ نہ تو
کارل مارکس[1] کا ہم خیال ہوں۔ نہ ٹالسٹائے[2] کا بلکہ میرے خیالات دونوں
کے خیالات کا مرکب ہیں۔ میں کسی اقتدار کے لئے جائز نہیں رکھتا کہ وہ مجھ پر یہ
پابندی عائد کرے کہ میرا لڑکا اسی اسکول میں جائے یا اس میں علم سیکھے یا
ہنر۔ فٹ بال کھیلے یا رگبی۔ یہ سب انفرادی معاملات ہیں لیکن اگر میں کہنے
لگوں کہ میرا لڑکا بالکل تعلیم نہیں پائے گا۔ یا اس کی تربیت اگلے زمانے کے
وحشیوں کی طرح کی جائے گی یا اسے مسٹر فیگن[3] کی درسگاہ جیب تراشی میں تعلیم
دلائی جائے گی تو سماج نہایت اخلاق کے ساتھ لیکن اٹل لہجہ میں مجھے متنبہ
کر دے گی کہ اس کو اگلے زمانے کے وحشیوں کی قطعی ضرورت نہیں ہے
اس کو جیب تراشوں پر سخت اعتراض ہے اور چاہے میں پسند کروں یا نہ کروں
میرے لڑکے کو معینہ کم سے کم حد تک تعلیم ضرور حاصل کرنا ہوگی۔ مجھے اوروں
کے لئے باعث تکلیف ہونے کی یا اپنے لڑکے کو حکومت کے لئے ایک بار اور
خطرہ بنانے کی آزادی نہیں دی جا سکتی۔

غرض یہ ہے کہ معمولی معمولی باتوں میں رہروی کے قاعدہ کی پابندی
ہی ایک ایسا معیار ہے جس کے لحاظ سے ہم اپنے متعلق خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ آیا
ہم مہذب ہیں یا غیر مہذب ہمت اور ایثار کے بڑے مواقع کمیاب ہیں۔ روزمرہ کے کاروبار
میں چھوٹی چھوٹی عادتیں ہی ہماری زندگی کا راستہ تیار کرتی اور ہمارے سفر کو تلخ یا خوشگوار بناتی ہیں
مجھے امید ہے کہ میرے ریل والے دوست اس پر غور کریں گے اس کے بعد یقیناً اپنے
ساتھی کو سمجھانا تو ترک نہیں کریں گے کہ فرانس والوں نے کہاں غلطی کی اور جرمنی والوں نے کہاں
لیکن وہ اس طرح سمجھائیں گے کہ مجھے پارلیمنٹ کی رپورٹ سکون کے ساتھ پڑھنے کا موقع مل سکے۔

ظہور الحق بی اے

۱؎ KEEP THE HOME FIRES BURNING
۲؎ HAZLITT

۱؎ KARL MARX مشہور اشتراکی فلسفی ۲؎ TOLSTOY مشہور روسی فلسفی ۳؎ FAGIN

تو عزیب پر مصیبت آجائے گی کم ازکم ایک بار تو ضرور رکھا یا پیا سب نکل جائے گا۔ دایاں بالا خانہ خالی پڑا ہے۔ پہلے بایاں بھی خالی تھا مگر اب تقریباً ایک مہینے سے آباد ہوگیا ہے خالی والے اور ہمارے بالا خانے کا زینہ ایک ہے اور بائیں بالا خانے کا زینہ دوسرا ہے اور ہمارے اُس کے صحن کو ایک چھوٹی سی دیوار دو حصوں میں منقسم کرتی ہے۔ اس چھوٹی سی دیوار ہی نے واقعات کو یہ رنگ دیا ہے۔ اگر یہ دیوار دو ایک فٹ اور اونچی بنا دی جاتی تو شاید آج صورتِ حالات یہ نہ ہوتی لیکن مکان کے مالکوں کو تو کرایہ سے غرض ہے۔ اُن کی بلا سے اگر کرایہ داروں کو کچھ تکلیف ہو تو ہوا کرے۔ اس بالا خانے میں ایک مسلمان بزاز رہتا ہے۔ صبح کو آٹھ بجے دوکان پر جاتا ہے تو رات کو دس بجے سے پہلے لوٹنا نصیب نہیں ہوتا۔ اس کی بیوی انتہا درجہ کی فیشن کی ولدادہ ہے۔ آٹھ پہر بناؤ سنگار کرتی رہتی ہے۔ گو دو ننھے ننھے بچے بھی ہیں پھر بھی اس کی زیبائش میں فرق نہیں آتا اس قسم کی عورت کی یہ بھی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی اس کی زیبائش پر جان دے اُس کی مدح خوانی کرے۔ لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے۔ شوہر دن بھر کا تھکا ماندہ آتا ہے اور کھانا کھا کر لیٹ جاتا ہے ——— خیر مجھے کسی کے ڈھکے چھپے ٹھیکرے کھولنے کا کیا حق ہے۔

کئی روز تک یہ دیوار پر سے جھانکتی رہی جب میں نظر اوپر اٹھاتا تو فوراً سر نیچا کرلیتی۔ کئی مرتبہ میں نے دیکھنے کی کوشش کی مگر کارگر نہ ہوئی۔ ایک جھلک ——— اور اُس کے بعد معاملہ صاف۔ اتوار کا دن تھا۔ مجھے حجامت بنانی تھی۔ صحن میں میز کرسی بچھائی اور اس دیوار کی طرف پشت کرکے بیٹھ گیا۔ میز کرسی کے کھینچنے کی آواز سے وہ دیوار کے قریب آگئی اور میز کے آئینہ میں اُس کا عکس پڑنے لگا۔ میں نے پیچھے مڑکر غلطی نہ دیکھا۔ آہستہ آہستہ حجامت بناتا رہا۔ شیشے میں اُس کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ اُس نے اپنی بچی کو آواز دی اور کچھ کام کرنے لئے کہا۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ میں مڑکر دیکھوں لیکن میں اُسی طرح بیٹھا رہا جب حجامت بنا چکا تو ایک دفعہ اور گالوں کو صابون لگایا اور دوسرے اُسترے سے جھاگ صاف کرنے لگا۔ اُس نے بھی نقل کی۔ گالوں کے قریب ہاتھ لے جاکر ایسے ہلانے لگی جیسے صابون لگاتے ہیں اور اس کے بعد شہادت کی انگلی پھیرنے لگی۔ اُس کی اس شرارت پر مجھے ہنسی آگئی اور اُسترے نے فوراً اس ہنسی کی سزا دی۔ لیکن کچھ تکلیف محسوس نہ ہوئی کیونکہ اُسترا میرے لگا تھا اور آہ اُس نے کھینچی تھی۔ میں برابر ہنستا رہا۔

اس دن کے بعد اکثر دیوار کی دوسری طرف سے ٹھنڈے ٹھنڈے سانسوں کی آواز آیا کرتی اور کبھی کبھی عشقیہ اشعار سنائی دیتے۔ لیکن میں نے کوئی توجہ نہ کی۔ ایک شام کو انگنائی میں بیٹھا وضو کر رہا تھا کہ ایک پرچہ قریب آکے پڑا۔ اٹھا کے پڑھا تو حیران ہوگیا۔ رحم کرنے کی درخواست کی تھی۔ میں نے کسی پر ظلم کیا تھا جو رحم کرتا۔ اس پرچے کا میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ دوسرے دن پھر اُسی وقت دوسرا پرچہ آیا۔ پہلے کا جواب مانگا تھا اور کچھ عشق کا اظہار بھی کیا تھا۔ تیسرے دن پھر چٹھی تھی۔ دوپہر کو بیٹھا ہوا "ہمایوں" کا پرانا فائل دیکھ رہا تھا کہ میری توجہ اُس کی ننھی لڑکی نے اپنی طرف منعطف کرلی۔ اُس کی والدہ نے اٹھا کر اُسے دیوار پر بٹھا دیا تھا اور وہ اپنے ننھے ننھے [illegible] اودے اودے لب ہلا رہی تھی۔

"بابوجی زور زور پڑھو ہم بھی سنیں گے"۔

میں نیچی نظریں کئے ورق گردانی کرتا رہا۔ لڑکی نے پھر یہی درخواست کی کیونکہ اُس سے ایسا کرنے کے لئے دوبارہ کہا گیا تھا۔ میں نے مارچ کا "ہمایوں" فائل میں سے نکال لیا اور اپنا افسانہ "ثروت" اتنی بلند آواز سے پڑھنے لگا کہ وہ آسانی سے سُن سکے۔ افسانہ پڑھتے ہوئے مجھے شبہ ہوا کہ شاید چلی گئی۔ بچی کو تو اُس نے افسانہ شروع کرنے کے ساتھ ہی ہمسائی کے بچوں کے ساتھ کھیلنے کے لئے بھیج دیا تھا اور دیوار کی دوسری طرف کچھ نظر نہ آتا تھا لیکن میں اسی طرح پڑھتا رہا۔ افسانہ ختم ہونے پر بھی کسی قسم کی آواز سنائی نہ دی میں سمجھا کہ کوئی عورت آگئی ہوگی اور ملازم کو کھانے کے متعلق ضروری ہدایتیں دے کر چلا گیا۔ توقع کے خلاف بہت جلد واپس آگیا۔ ظہیر سے ملنے گیا تھا وہ گھر میں موجود نہ تھے۔ میری آواز سنتے ہی فوراً دیوار کے قریب آکر جھانکنے لگی۔ اتفاق سے ملازم خود بخود بازار چلا گیا۔ اُس کے جاتے ہی کہنے لگی۔

"وہ کتاب ذرا مجھے دے دیجئے"۔

"کونسی کتاب" میں نے پوچھا

"جس میں سے کہانی پڑھ کر سنائی تھی"۔

اس کے چہرے سے [illegible] آواز [illegible]

نمایاں تھے [illegible]

[illegible] اُس وقت [illegible]

ہے اور مدہوش ——— جب میں اپنا قصیدہ ختم کر لیتا ہوں تو اکثر کہتی ہے
"میں اس قابل کہاں ہوں کہ آپ میری تعریف کریں"۔
ایک دن اُس نے مجھ سے ایک عجیب درخواست کی۔ کہنے لگی
"اپنے ملازم کو علیحدہ کر دیجئے" میں نے کہا "کیوں؟ اور کھانا کون پکائے گا"
"کھانا پکائے گا کون" اس نے میرے سوال کو دہرایا۔ پھر بولی "جب تک
میرے دم میں دم ہے آپ کو کھانے کا کیا فکر"
میں نے کہا "نہیں یہ ٹھیک نہیں"
"کیوں" اُس نے سوال کیا
"اس لئے کہ میں کہتا ہوں" مجھے کوئی اور جواب بن نہ پڑا۔
"اس لئے کہ میں کہتا ہوں" اُس نے لبوں ہی لبوں میں یہ الفاظ کہے
اور سر نیچا کر لیا۔

حیات کیا تمہارا کاہل دوست اس قابل ہے کہ اس سے عورت
محبت کرے۔ اُس پر صنفِ نازک کی ایک دلفریب ہستی جان دے ———
نہیں ——— پھر اس بدنصیب کو کیا ہو گیا۔

شاید زندگی میں پہلی مرتبہ اتنا طویل خط لکھا ہے۔ اچھا ۔
رخصت ———

دوسرا خط

سات دن ہوئے ایک خط لکھ چکا ہوں۔ ابھی تم اُس کا جواب
دینے کے متعلق غور کر رہے ہو گے کہ میں دوسرا خط لکھنے بیٹھ گیا۔ تہیہ کر
لو جب تک میرے اتنے خط تمہارے پاس نہ پہنچ جائیں جتنے تم نے مجھے
لکھ [illegible] جواب نہ دینا۔ لیکن یہ ہو نہیں سکتا۔ تم محبت کی داستان سنو اور
[illegible] دلچسپی ہے تو عورت کے پیار سے متعلق
[illegible] عجیب [illegible] میرے نزدیک
[illegible] رہے
[illegible] نظر آتی

ہے اور اب تو مجھے بھی بہت کھلاتی ہے جب دیکھو جیب میں کشمش
بھری ہے اور منہ چل رہا ہے۔

کل ہم سینما دیکھنے گئے تھے کشمش کا شوہر دس بجے گھر آتا ہے
اور پہلا کھیل نو بجے سے پیشتر ختم ہو جاتا ہے۔ اُس نے شام سے ہی ترکاری
پکالی اور آٹا گوندھ کر رکھ لیا میں نے کہا "روٹیاں پکا لو" کہنے لگی "ٹھنڈی ہو
جائیں گی" وہ کہیں گے روٹیاں تو مغرب سے پہلے کی پکی ہوئی معلوم
ہوتی ہیں اس کے بعد کیا کرتی رہیں"۔

میں اُس سے تقریباً دس منٹ پہلے چلا گیا اور سڑک پر جا کر
کھڑا ہو گیا کہ وہ بھی آ گئی۔ ہم نے تانگہ کرائے کیا اور سینما پہنچ گئے میں ٹکٹ
خریدنے کے لئے جانے لگا تو اس نے روپے پیش کئے۔ میں نے کہا کہ
میرے تمہارے روپے ایک ہی ہیں۔ وہ بولی پھر کیا حرج ہے یہی لے
جاؤ۔ میری مرضی فرسٹ کلاس کے ٹکٹ خریدنے کی تھی لیکن اس کے کہنے
سے بکس کے لئے۔ ہال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا تھا اور چار آنے والوں
نے شور و غوغا سے سارے ہال کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔ خدا خدا کر کے تماشہ
شروع ہوا۔ خاصہ دلچسپ کھیل تھا اور سبق آموز۔ تمہارے لئے نہایت
مختصر الفاظ میں اُس کا خلاصہ درج کرتا ہوں۔

"ایک شخص اکرام نامی اپنے دوست کی بیوی پر عاشق ہو جاتا ہے
لیکن اُسے یہ معلوم نہیں کہ اُس کی محبوبہ اُس کے محبوب ترین دوست
کی شریکِ زندگی ہے۔ وہ اپنے عشق کا حال اپنے دوست سے کہہ
دیتا ہے اور جس جگہ اور جس حال میں اُسے دیکھا تھا وہ بھی بتا دیتا ہے۔
دوست بظاہر مطمئن نظر آتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ
اُس کے دل پر چھریاں چل رہی ہیں۔ آخر بڑی مشکل سے دلی جذبات پر
غلبہ پا لیتا ہے اور اپنے دوست سے کہتا ہے فکر نہ کرو آج رات اُس
پری کو تمہارے کمرے میں حاضر کر دوں گا۔ وہاں سے جا کر وہ اپنی بیوی
سے یہ انوکھی درخواست کرتا ہے۔ بیوی راضی نہیں ہوتی لیکن شوہر کی
ضد پر خاموش ہو جاتی ہے۔ وہ خود جا کر اُسے اکرام کی خواب گاہ میں چھوڑ
آتا ہے اور ننگی تلوار لے کر باہر پہرہ دیتا ہے۔ اکرام دوست کی بیوی کو ہاتھ
لگاتا ہے وہ اُسے حقیقت سے آگاہ کر دیتی ہے۔ اکرام یہ راز سن کر اُسے
بہن کہہ کر مخاطب کرتا ہے اور پاؤں میں گر کر معافی مانگتا ہے۔ پھر سوچتا ہے
جن ہاتھوں نے دوست کی زوجہ کو بری غرض سے مس کیا ہے انہیں
کاٹنا چاہیئے۔ یہ خیال کر کے وہ باہر آتا ہے اور دوست سے کہتا ہے

کہ جب میں اُس حسینہ کے قریب جاتا ہوں تو دیوار میں سے دو ہاتھ نکلتے ہیں اور مجھ پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔ دوست اُس کے ہمراہ کمرے میں جاتا ہے اور کہتا ہے "چراغ گل کرکے تم آرام کرو میں یہاں پہرہ دوں گا" اکرام موقع پاکر باہر چلا جاتا ہے اور دیوار کے روزن سے اپنے دونوں ہاتھ اندر کی جانب نکالتا ہے۔ دوست ہاتھ دیکھتے ہی تلوار چلاتا ہے۔ دونوں ہاتھ کٹ کر گر پڑتے ہیں۔ ایک چیخ کی آواز آتی ہے۔ باہر جاکر دیکھتا ہے کہ اکرام بے ہوش پڑا ہے۔ حیران ہے کہ کیا معاملہ ہے اتنے میں بیوی آجاتی ہے اور سارا واقعہ بیان کرتی ہے"۔

اس کے بعد خبر نہیں کیا ہوا ہم اٹھ کر چلے آئے تھے۔ بات یہ ہوئی کہ "وقفہ" میں میں نے جو نیچے جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کشمش کے سرتاج تشریف رکھتے ہیں میں نے اُن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کشمش سے پوچھا "انہیں پہچانتی ہو یہ کون ہیں؟" اُس نے دیکھا اور سہم گئی۔ پھر بولی "یہ کہاں سے آ گئے؟" اور گھر چلنے کی رٹ لگادی۔ میں چاہتا تھا کہ کھیل ختم ہونے پر چلیں لیکن مصلحت فوراً روانہ ہونے ہی میں تھی۔ بچہ بھی رونے لگا تھا۔ لہذا کھیل ختم ہونے سے تقریباً بیس منٹ پہلے واپس چلے آئے۔ اُسے خوف تھا کہ کہیں اُس کے شوہر کو پتہ نہ چل گیا ہو کہ ہم یہاں آئے ہیں لیکن میں نے تسلی دی کہ نہیں یہ یوں ہی چلے آئے ہوں گے۔ بعد میں معلوم ہوا یہی بات تھی حضرت نے گھر آکر سینما جانے کا ذکر تک نہیں کیا۔ کشمش کے دریافت کرنے پر کہ آج دیر کہاں لگی کہنے لگے "آخری وقت میں گاہک آگئے تھے"۔

حیات کتنی عجیب بات ہے میاں بیوی دونوں ایک تماشہ دیکھنے جاتے ہیں۔ ایک ہی سینما گھر میں اور ایک ہی وقت میں مگر ایک دوسرے کو نہیں بتاتے اور دونوں محبت کے دعوے دار ہیں۔ کیا یہ بزاز صاحب کی غفلت کا نتیجہ نہیں کہ اُن کی رفیق زندگی غیر مرد کے ساتھ تماشہ میں گئی اور کیا یہ اُن کی بے رُخی کا انجام نہیں کہ اُن کی شریک حیات نامحرم سے محبت کرتی ہے۔ جتنا اعتبار وہ کرتے ہیں کہاں تک درست ہے۔ کیا محبت میں کبھی شبہ کو دخل نہ دینا چاہیئے۔ اگر یہ کبھی کبھی دُکان کو چھوڑ کر وقت بے وقت گھر کی خبر لے لیا کرتے تو شاید واقعات اس سرعت کے ساتھ ظہور پذیر نہ ہوتے لیکن اُنہیں تو دُکان سے غرض ہے اور روپے سے۔ بیوی کی پروا نہیں —— حیات تم کہو گے کہ دوسروں کو نصیحتیں کرنی آتی ہیں اپنی بُرائیوں پر نظر نہیں کرتے۔ دوست ٹھیک کہتے ہو یہ بھی گناہ ہے لیکن جہاں تک مجھ سے ہو سکتا ہے بچتا ہوں اور جو کچھ تمہیں لکھ چکا ہوں اس حد سے زیادہ نہیں بڑھا۔ شاید تمہیں یہ پڑھ کر حیرت ہوگی کہ آج تک اُس کے بدن سے میں نے اپنی انگلی تک مس نہیں ہونے دی۔ خیر صفائی کی ضرورت نہیں۔ اگر تم کچھ برا خیال کروگے تو تمہارے آگے آئے گا۔

تیسرا خط

ابھی ابھی تمہارا "حماقت نامہ" پڑھ کر بیٹھا ہوں۔ نہ جانے تمہیں کیا ہوگیا۔ مجھے ڈر ہے کہ کبھی لاہور کے مشہور مقام کو تمہاری قدم بوسی کا شرف حاصل نہ کرنا پڑے۔

تم کہتے ہو کہ وہ "زریں زمانہ" ایک مرتبہ اور آئے گا اور ہمیشہ رہے گا۔ تمہاری مراد بہشت سے ہے۔ وہاں بھی ہم معصوم ہوں گے اور بے فکر اور دل شاد لیکن کہتے ہو وہ تمہارے لئے ہوگا میں اُس سے مستفید نہ ہو سکوں گا۔ خوب! حیات یاد رکھو کہ اگر ہم سب دوستوں میں سے کسی کو بہشت ملی تو انشاءاللہ خاکسار ہی کو ملے گی۔ یہ اور بات ہے کہ وہاں میرا جی نہ لگے اور میں اللہ میاں کی منتیں کرکے تمہیں بھی اپنے پاس بلا لوں۔

تم میرا "افسانۂ محبت" سننے کے لئے بہت بے تاب ہو۔ کیوں؟ تم تو لکھتے ہو کہ آگ سے نہیں کھیلنا چاہیئے اور خاص طور پر جب کوئی مطلب نہ ہو تو جتنا دور رہا جائے بہتر ہے۔ حیات تمہارے خیال میں میں آگ سے کھیل رہا ہوں۔ عورت کو تم آگ کہتے ہو یہ صنفِ نازک کی سخت توہین ہے۔ عورت دنیا کی زیبائش ہے۔ عورت خداوند تعالیٰ کی صنعت کا بہترین نمونہ ہے۔ عورت نے دنیا میں بڑے بڑے مصلح، قاید، ولی اور پیغمبروں کو جنم دیا۔ عورت نے دنیا کو معراجِ ترقی پر پہنچایا۔ عورت سے زندگی کی دلچسپیاں وابستہ ہیں اگر عورت نہ ہوتی تو دنیا کی ہر چیز نامکمل رہ جاتی اور کسی شے میں حُسن نظر نہ آتا۔ ظلمت کا دور دورہ ہوتا اور نور کا کہیں پتہ نہ چلتا پھر تم عورت کو آگ کیسے کہتے ہو اگر آگ ہی ہے تو ٹھنڈی آگ ہے۔ روشنی پہنچاتی ہے جلاتی نہیں۔

"اگر مطلب نہ ہو تو جتنا دور رہا جائے بہتر ہے" اس مطلب پرستی نے ہندوستان کو تباہ کردیا۔ کاش یہ الفاظ لکھتے ہوئے تمہارا قلم ٹوٹ جاتا۔ مجھے اس ایک فقرے کو پڑھ کر اتنا رنج ہوا کہ بیان سے باہر ہے۔ ایک طرف تم محبت کی توہین کرتے ہو دوسری طرف عورت کی۔

جی تو یہ چاہتا ہے کہ آئندہ تمہیں کشمش کے متعلق کچھ نہ لکھوں۔ لیکن پھر خیال آتا ہے کہ مفت میں ناراض ہو جاؤ گے۔ اچھا سنو فسانۂ اُلفت سنو اور اگر خدا توفیق دے تو نیک سبق حاصل کرو۔

خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ملازم بیمار ہو گیا اور مجھے مجبوراً اُسے چھٹی دینی پڑی۔ دو وقت تو بازار میں کھانا کھایا لیکن کشمش نے بہت بُرا مانا اور قسم کھا کر کہنے لگی کہ اب آپ جب تک بازار میں کھانا کھائیں گے مجھے بھی کھانا پینا حرام ہے۔ دو تین وقت میں نے اور ٹال دئیے طشت میں کھانا رکھ کر دیوار پر سے دینے لگی مگر میں نے نہیں لیا۔ اُس کے بعد کچھ نہ بولی اور بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ مجھے اس کی لڑکی کی زبانی اس بات کی خبر ہو گئی اور خود کہنا پڑا کہ شام کا کھانا میں آپ کے یہاں کھاؤں گا۔

حیات وہ نظارہ بھی خوب تھا۔ دیوار کو ہم نے میز بنا رکھا تھا ایک جانب کرسی پر وہ کھڑی تھی اور دوسری طرف میں اور ایک ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ اندھیری رات تھی۔ گو سرد ہوا چل رہی تھی پھر بھی پسینہ سا آ رہا تھا۔ یہ میری مختصر حیات میں پہلا واقعہ تھا کہ میں ایک نامحرم عورت کے ساتھ کھانا تناول کر رہا تھا۔ بدن میں ہر دو تین لمحوں کے بعد سنسناہٹ سی محسوس ہو رہی تھی اور دل کو ایک عجیب سرور حاصل تھا۔ وہ مارے خوشی کے کھلی جاتی تھی۔ بات بات میں ہنس رہی تھی۔ سویاں سینکڑوں دفعہ کھائی ہوں گی مگر جو لطف اُس دن آیا کبھی نہ آیا تھا۔ اُس دن سے دونوں وقت کھانا طشت میں لگا کر دیوار پر سے پکڑا دیتی ہے۔ ہر چند کہتا رہتا ہوں کہ تم مجھے شرمندہ کرتی ہو بس اب میرے لئے کھانا نہ پکانا مگر وہ ایک نہیں سنتی اور ہمیشہ اچھے سے اچھا پکاتی ہے۔ آج کل وہ وہ چیزیں کھا رہا ہوں کہ تم نے اُن کے نام بھی نہ سُنے ہوں گے۔

چوتھا خط

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں کس طرح سمجھاؤں کشمش کی طرف سے تمہارے خیالات اتنے بُرے کیوں ہو گئے۔ وہ اتنی بُری نہیں جتنا کہ تم خیال کرتے ہو۔ اُسے مجھ سے محبت ضرور ہے اس کا میں بھی اعتراف کرتا ہوں مگر بے لوث محبت ہے اس کی تہ میں کوئی غرض یا مطلب پنہاں نہیں اور مطلب ہو بھی کیا سکتا ہے۔ مالی حالت اُن کی مجھ سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ میں پھر ایک کلرک ہی ہوں اور وہ تاجر۔ دو تین دن ہوئے اُس نے مجھے نہایت قیمتی فیروزہ کی ایک سنہری انگشتری دی ہے۔ کیونکہ میرے پاس کوئی ایسا قیمتی تحفہ اُسے دینے کو نہ تھا اس لئے میں نے لینے سے انکار کیا مگر اس نے ہر دلیل کی تردید کی اور نہ مجھے وہ انگوٹھی قبول کرنی پڑی۔ اس کے ساتھ اُس نے ایک درخواست بھی کی۔ "جب آپ کی شادی ہو جائے تو یہ انگوٹھی میری طرف سے اپنی بیوی کو دے دینا"

میں نے کہا "ہرگز نہیں اسے تو میں ہر وقت اپنی اُنگلی میں رکھوں گا اور آنکھوں کے سامنے"۔ کہنے لگی "آپ کو اختیار ہے میں تو اپنی درخواست عرض کر چکی"۔

میں خود اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر ابھی کامیاب نہیں ہوا۔ اس کی باتیں ـــــ محبت بھری اور پیاری باتیں اس کا حُسن سلوک اور اس کی محبت میرے لئے ایک مُعمّا ہے کبھی کبھی میں بدگمان ہو جاتا ہوں مگر پھر یہ کوئی نہ کوئی ایسی بات کہہ دیتی ہے کہ میرا دل بالکل صاف ہو جاتا ہے۔

گئی جمعرات کا ذکر ہے کہ اُس نے کہا "تم مضمون لکھتے ہو"۔

"نہیں تو۔ کون کہتا ہے؟" میں نے کہا

"مکرتے کیوں ہو؟ تم نے خود مجھے اپنا افسانہ پڑھ کر سنایا تھا اور اس کے بعد میں نے تم سے جتنے رسالے مانگے ان سب میں تمہارے مضمون تھے"۔

"پھر تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں کیا چاہتی ہوں" اس وقت بتاؤں گی اگر تم یہ وعدہ کرو کہ جو کچھ میں کہوں اُسے ضرور پورا کرو گے"۔

میں نے وعدہ کر لیا تو بولی "تم مرد وہ کام کرتے ہو جس میں یا تو تمہاری ہی جنس کو فائدہ پہنچے یا بالکل فضول ہو۔ عورتوں کے لئے تم کچھ نہیں کرتے اور تمہارے خیال میں اس کی ضرورت بھی نہیں"۔

"کیوں عورتوں کے لئے میں کیا نہیں کرتا ـــــ تمہاری رائے میں مجھے اور کیا کرنا چاہئے؟"

"تم نے ابھی کیا ہی کیا ہے تعلیم ہی کو لیجئے سو میں مشکل سے دس پڑھی ہوئی ملیں گی۔ تم نے کبھی اس کے متعلق قلم اٹھایا۔ ہماری صحت کا تم نے کیا خیال کیا۔ کیا ہماری تقدیر میں صرف یہ چار دیواریں ہی رہ گئی ہیں۔ جسے دیکھو وہی بیمار ہے۔ جسے دیکھو اُسی کا رنگ زرد ہے۔ تمہیں تمہارے دلچسپ مشغلے اس طرف توجہ کرنے ہی نہیں دیتے۔ تم ساری قوم کو کمزور اور جاہل بنا رہے ہو۔ بیمار اور ضعیف ماؤں کے بچے کہیں تندرست اور طاقتور ہو سکتے ہیں اور ان پڑھ ماؤں کی اولاد بھی کبھی مہذب ہو سکتی ہے؟"

کچھ دیر کی پُرلطف بحث کے بعد میں نے مکرر وعدہ کیا کہ آئندہ جو کچھ لکھوں گا جنس لطیف کے مفاد کے لئے لکھوں گا کشمش نے شکریہ ادا کیا۔

حیات میں تمہیں اتنے بڑے بڑے خط لکھتا ہوں اور تم مجھے شاہ آباد کی خاص خاص ہستیوں کے حالات سے بھی مطلع نہیں کرتے۔ تمہیں تو افسانہ سننے کی پڑی ہے اور یہ چاہتے ہو کہ ایک ہی دن میں ختم کر دیا جائے۔ خیال تو کرو کہ میرے پاس کیا لکھا رکھا ہے جو اٹھا کر ڈاک میں ڈال دوں۔ جب کوئی بات ہوتی ہے تو میں تمہیں ضرور لکھتا ہوں۔

پانچواں خط

نہ جانے تمہاری تحریر میں یہ اثر کہاں سے آگیا۔ تم روز بروز میرے دل میں کشمش کی طرف سے زیادہ ہی زیادہ شبہ پیدا کر رہے ہو۔ جب تمہارا خط آتا ہے اُس وقت تو خاص طور پر میں اُسے "سراپا معصیت" سمجھنے لگتا ہوں لیکن پھر کشمش اپنی دلفریب باتوں اور بے غرض محبت سے حور سے زیادہ معصوم معلوم ہونے لگتی ہے۔

آج میں نے دفتر آنے سے پہلے ایک حماقت کی۔ اس سے کہا "ایک بات پوچھوں اگر تم برا نہ مانو"

"پوچھو" اُس نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے جواب دیا "شوق سے پوچھو۔"

اور خبر نہیں کیوں ——— میں نے اُس سے سوال کیا "تم نے اب تک کتنوں سے محبت کی ہے؟"

"میں نے ——— اب تک ——— کتنوں سے ——— محبت کی ہے" اُس نے رُک رُک کر اور اٹک اٹک کر کہا۔ ذرا دیر سوچتی رہی۔ شاید سوال کی اہمیت پر غور کر رہی تھی اور پھر فوراً نیچے بیٹھ گئی۔ میں نے کچھ خیال نہ کیا اور دفتر چلا آیا۔

حیات تمہاری تحریر نے یہ گل کھلایا ہے۔ خدا جانے اس کا انجام کیا ہو۔ دفتر میں بیٹھا ہوں اور دل کشمش میں پڑا ہے۔ مجھے اس بات کا رنج ہے کہ میں نے اس کے دل کو صدمہ کیوں پہنچایا جب کہ وہ میرا اس قدر خیال کرتی ہے اور مجھے ہر طرح سے آرام پہنچانے کی تدبیریں سوچتی رہتی ہے۔

میری بھی یہی دلی خواہش ہے کہ خدا شوکت کو کسی بڑے عہدے پر مامور کر دے۔ ان حضرات نے ناز و نعمت میں آنکھیں کھولیں، چاؤ چوچلوں میں پلے اور عیش و عشرت میں جوان ہوئے۔ اب یہ کوئی سخت کام نہیں کر سکتے۔ انہیں اُداس اُداس دیکھ کر میرا بھی دل کڑھتا ہے اور قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ابھی یہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ ہوئے تھے کہ والد صاحب کا سایہ سر سے اٹھا لیا اور پھر اُن کی مفارقت کے زخم بھرنے نہ پائے تھے کہ والدہ کے لطف و کرم سے محروم کر دیا۔ ان ناقابلِ برداشت صدموں کی تلافی اُس وقت ہی ممکن ہے کہ انہیں کوئی اعلیٰ عہدہ مل جائے اور یہ پہلی سی بےفکری اور "فضول خرچی" سے زندگی بسر کرنے لگیں۔

چھٹا خط

غضب ہو گیا حیات! غضب ہو گیا۔ اب تمہارا کلیجہ ٹھنڈا ہو گا۔ اب تم اطمینان کا سانس لو گے۔ اس مرتبہ اور "رودادِ غم" پڑھ کر اس کے بعد میں تمہیں کچھ نہ لکھوں گا۔ یہ سب کچھ کیا دھرا تمہارا ہی ہے۔ نہ تم مجھے اکساتے نہ میں اس سے ایسا سوال کرتا اور نہ یہ سانحہ ——— یہ جانگداز سانحہ وقوع میں آتا۔

اُس روز شام کو دفتر سے واپس آیا تو کسی کو اپنا منتظر نہ پایا ورنہ جب میں آتا تھا تو ہمیشہ کھڑی انتظار کرتی ہوتی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی اور صحن میں بوٹوں سے آواز پیدا کر کے پھرنے لگا۔ پھر یوں ہی کھانسنے لگا لیکن بے سود۔ دروازے کو کھٹکے سے بند کرتا اور پھر اُس سے بھی زیادہ زور کے ساتھ کھولتا۔ اپنی آمد کی مختلف طریقوں سے اطلاع کرنے پر بھی کسی کی آواز سنائی نہ دی اور نہ کوئی دیوار پر سے جھانکا تو میں دبے پاؤں دیوار کے قریب گیا اور کان لگا کر سننے لگا۔ اُس طرف موت کی خاموشی طاری تھی۔ میں سہم گیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ دوسری جانب دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ صحن میں جتنی چیزیں تھی سب بے قرینہ پڑی تھیں اور ہر شے سے رنج و غم برستا معلوم ہوتا تھا۔ اُس وقت مجھے سوال کی نوعیت کا خیال آیا اور میں خود کو لعنت ملامت کرنے لگا۔ کرسی انگنائی میں نکال کر بیٹھ گیا۔ بیٹھ گیا اور غور کرنے لگا غور کرتے کرتے اس نتیجے پر پہنچا کہ یا تو وہ آج ہی آجائے گی اور یا پھر اس مکان میں کبھی نہ آئے گی ——— بیٹھے بیٹھے جی گھبرایا تو سیر کرنے چلا گیا۔ سیر میں بھی کچھ لطف نہ آیا لیکن میں بڑھتا چلا گیا اور بڑی دیر بعد واپس آیا۔ آکر دیکھا اُن کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے دروازے کو خوب زور سے بند کیا اور صحن میں ادھر اُدھر پھرنے لگا۔ نہ کشمش دیوار کے

قریب آئی نہ اُدھر ہی سے کوئی بات کی۔ ٹہلتے ہوئے چار پانچ منٹ نہ گزرے تھے کہ آہستہ آہستہ رونے کی آواز آئی۔ میں ساکت و صامت دیوار سے کان لگا کر کھڑا ہو گیا اُس کا شوہر کہہ رہا تھا تمہیں ہوا کیا خود بخود کیوں رونے لگیں" اس نے کچھ جواب نہ دیا اور زیادہ شدت کے ساتھ رونے لگی۔ روتی رہی حتیٰ کہ سسکیاں بھرنے لگی اور روتے روتے بے ہوش ہو گئی شوہر کی سمجھ میں خاک نہ آیا کہ کیا کرے آخر لڑکی سے پوچھا "بیٹا آج یہاں کوئی تمہاری ننھیال سے آیا تھا۔ تمہاری اماں کو کیا ہو گیا"۔

"صبح بابوجی نے کچھ کہا تھا اس وقت سے رو رہی ہیں پھر ڈولی میں ہم نانی اماں کے گئے تھے وہاں بھی روتی رہیں"۔

غریب لڑکی بھی پریشان ہو گئی تھی۔ پریشانی ہی میں اُس نے اپنی ماں کے بہت اہم راز کو افشا کر دیا تھا اور اسے معلوم بھی کیا تھا کہ یہ بات کہنے سے کیا ہو گا۔

"کون بابوجی" ابا نے پوچھا

"یہ جو اس طرف رہتے ہیں"

"تمہاری اماں اُن سے باتیں کرتی ہیں؟"

"ہاں —— نہیں کرتی" لڑکی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مجھے کشمش کا خیال تھا کہ غریب پر کیسی مصیبت آئی۔ میرا کیا تھا مجھے وہ کیا کہہ سکتا تھا اور زیادہ افسوس اس بات کا تھا کہ یہ سب کچھ میری بے وقوفی سے ہوا تھا نہ میں اس سے وہ سوال کرتا نہ واقعات یہ صورت اختیار کرتے۔ آ کر کمرے میں لیٹ گیا۔ کچھ دیر میں دوبارہ سسکیوں کی آواز آئی۔ پھر باہر جا کر دیوار کے قریب بیٹھ گیا۔ جتنا زیادہ واقعات کی اہمیت پر غور کرتا تھا اتنا ہی دل کو رنج پہنچتا تھا۔ بارہ بجے تک یہی حالت رہی کبھی رونے کی آواز آتی اور کبھی سناٹا چھا جاتا۔ بارہ بجے کے بعد قطعی خاموشی ہو گئی۔ شاید وہ سو گئے تھے لیکن حیات اس رات میں ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سویا۔ ساری رات قرآن کی تلاوت کرتا رہا۔

خیال تھا کہ صبح کو ملاقات ہو گی تو معافی مانگ لوں گا لیکن اُس کا خاوند اُس روز دُکان پر نہ گیا میں بیٹھا انتظار کرتا رہا کہ وہ جائے تو کشمش سے بات کروں۔ آخر پونے دس بج گئے اور مجھے دفتر بھاگنا پڑا۔ رات کو کھانا بھی نہیں کھایا تھا گو سخت بھوک لگ رہی تھی لیکن میں نے اُس وقت بھی کچھ نہ کھایا۔

دفتر کے کام میں رنج میں اور شام کی ملاقات کی اُمید میں دن تمام ہو گیا۔ اس بات کا خاص طور پر صدمہ تھا کہ میری وجہ سے کسی کو کیوں رنج پہنچا۔ چار بجے سے پہلے ہی ہیڈ کلرک سے اجازت لے کر چل پڑا۔ گھر پہنچا تو پھر دیوار کو خالی پایا۔ انگنائی میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا آج اُس نے قطعی دُکان نہیں کھولی ورنہ کشمش رکنے والی نہ تھی۔ کئی دفعہ جی میں آیا کہ لڑکی کو آواز دوں پھر اُس کے والد کے خوف سے چپ ہو رہا کہ جو کچھ رات لڑکی نے کہا تھا اُس کا اُسے بالکل یقین آ جائے گا۔ انتظار کرتے کرتے خاصی دیر ہو گئی لیکن ادھر سے کوئی آواز نہ آئی نہ بات کرنے کی نہ بچوں کے بولنے کی اور نہ کسی کے چلنے پھرنے کی۔ مجھے بڑی فکر ہوئی۔ دبے پاؤں دیوار کے نیچے گیا اور آہستہ آہستہ سر اوپر اٹھانے لگا۔ دوسری طرف جھانکنے لگتا کہ پھر سر نیچا کر لیتا۔ آخر ایک مرتبہ دل کڑا کر کے دوسری جانب دیکھ ہی تو لیا —— کیا دیکھا قلم میں اس کے بیان کرنے کی طاقت نہیں۔ پہلی بار مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ دوبارہ دیکھا —— کمرے کے سارے دروازے چوپٹ کھلے تھے اور وہاں نہ کشمش تھی نہ کشمش کی کوئی چیز ——

حیات یقین مانو کہ مجھے اُس سے عشق نہ تھا لیکن اُن کے ایسی طرح چلے جانے پر میرے دل کو بے انتہا صدمہ پہنچا اور میں بغیر کسی خاص ارادے کے جنگل کی طرف چلا گیا۔ مجھے یاد نہیں کہ کب واپس ہوا۔ صبح کو جب آنکھ کھلی تو اپنی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں کشمش کے لئے سوگوار ہوں اور یہ بھی یقین ہے کہ زندگی میں اُس سے زیادہ خوبصورت، اس سے زیادہ حسین، اس سے زیادہ دلکش عورتوں سے پالا پڑے گا لیکن اس کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی سینے میں بیٹھا کلیجہ مسل رہا ہے۔ گو مجھے اُس سے معافی مانگنی نصیب نہیں ہوئی لیکن میں اپنی خطا پر سخت پشیمان ہوں۔ آسمان چاند تارے، زمین پتھر، چٹانیں، گھاس اور درخت سب گواہ ہیں میں پشیمان ہوں اور ان سب نے مجھے اپنی غلطی پر آنسو بہاتے دیکھا ہے۔

ساتواں خط

تم اپنے آپ کو بے خطا ثابت کرنا چاہتے ہو لیکن نہیں کر سکتے۔ تم ہزار ثبوت پیش کرو مگر میں ایک نہ مانوں گا۔ تم نے صرف مجھے ہی نہیں بہکایا بلکہ کشمش کے دل پر بھی ایسا چرکا لگایا ہے کہ جیتے جی تمہیں دعائیں دے گی۔ اب معافی مانگنے سے کیا ہوتا ہے جو ہو چکا ہو چکا مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ تم نے اچھا نہیں کیا۔

تم مجھے مجبور کرتے ہو کہ خط لکھتا رہوں اور یہ داستان جو اب حد درجہ ناگوار ہو گئی ہے سناتا رہوں۔ حیات اگر داستان سننی تھی تو کشمش کو خط کیوں لکھا تھا۔ تم تو مجھے اس کے پیچھے سے نکالنا چاہتے

تھے۔ لیکن میں تو اور گرفتار ہو گیا۔

دوسرے دن دفتر جانے سے پہلے میں نے اس طرف پھر دیکھا دیوار پر ایک نئی اینٹ رکھی تھی۔ میں نے اُسے اٹھا لیا۔ اُس کے نیچے سے ایک پرچہ ملا۔ یہ کشمش کا خط تھا اور اس کے ساتھ تمہارا خط نتھی تھا۔ اب میں اس کے رونے اور بے قرار ہونے کا سبب سمجھا۔ بھلا تم نے جھوٹ بول کر کیا لیا۔ خدا تمہیں اس "نیک کام" کا اجر دے۔

اب پھر وہ زمانہ آگیا ہے کہ زندگی میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ دفتر جاتا ہوں تو وقت کاٹنا مشکل ہو جاتا ہے گھر آتا ہوں تو در و دیوار کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ اسی وحشت میں قدسیہ باغ یا کسی دوسری سیرگاہ میں چلا جاتا ہوں مگر وہاں وحشت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ نوجوان مرد خوبصورت اور حسین عورتوں کو بغل میں لئے سرگشت کرتے نظر آتے ہیں ایسی خوبصورت اور حسین عورتوں کو جن پر ایک دفعہ نظر پڑنے کے بعد انسان متاعِ زہد و اتقا کھو بیٹھتا ہے۔

جی چاہتا ہے کہ میں بھی کسی رشکِ حور کو ساتھ لے کر ان باغوں کی سیر کروں۔ ان خوشنما روشوں پر اکڑ اکڑ کر چلوں اور ہر بے عورت کے مرد کو حقارت کی نظر سے دیکھوں۔ علاوہ ازیں جب کسی حسین عورت کو بدصورت مرد کے پہلو میں دیکھتا ہوں تو دل کو ناقابلِ بیان تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ جنون کا دورہ زیادہ شدت کے ساتھ ہوتا ہے اور میں واپس بھاگ آتا ہوں۔

حیات دعا کرو کہ خدا اس زندگی کا جلد خاتمہ کر دے۔ پہلے اور اب کے زمانے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ گو پہلے بھی زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن اُس وقت میں یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں دلچسپی ہے ہی نہیں اور اب یہ یقین ہو گیا ہے کہ ہے تو سہی لیکن میری دسترس سے باہر ہے۔

آٹھواں خط

آج کل غم بہت ہلکا ہے۔ کبھی کبھی کشمش کی میٹھی میٹھی باتیں یاد آجاتی ہیں اور میں غمگین ہو جاتا ہوں مگر اختر اپنی مضحکہ خیز باتوں اور حرکتوں سے پھر ہنسا دیتا ہے۔ وہ میرے دل سے کشمش کو بالکل محو کر دینا چاہتا ہے اور ایک حد تک کامیاب بھی ہو گیا ہے۔ شاید تم اختر کو بھول گئے ہو۔ یہ وہی اختر ہے جو دوسرے تیسرے ہمارے کمرے میں آجاتا تھا اور گھنٹوں اپنی بکواس سے میرا اور تمہارا دماغ کھایا کرتا تھا تم اکثر اس کی گفتگو سے اکتا کر باہر چلے جاتے تھے لیکن میں اس کا جی میلا نہ کرتا تھا اور اُس کے پاس بیٹھا دلچسپی سے باتیں سنتا رہتا تھا۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد یہ ولایت چلا گیا تھا وہ مہینے ہوئے انجینیری کی سند لے کر آیا ہے۔ اب یہ پہلا سا اختر نہیں رہا۔ بڑی عقلمندی کی باتیں کرتا ہے۔ بڑے بڑے چالاکوں کے کان کترتا ہے ہفتہ سے میرے یہاں مقیم ہے۔ اتفاقیہ سینما گھر میں مل گیا تھا۔ میں نے تو پہچانا بھی نہ تھا کیونکہ اس کی اب کی اور پہلی شکل و صورت میں بہت فرق ہے اور لباس میں بھی۔ تماشہ ختم ہو جانے کے بعد میں اس کا سامان ہوٹل سے اپنے یہاں اٹھوا لایا تھا۔ ساری رات اُس نے ولایت کی باتیں کیں۔ صبح کو میں کچھ رنجیدہ سا تھا۔ اُس نے وجہ پوچھی اور میں نے بے کم و کاست سارا "افسانہ" سنا دیا۔ دیوار کو دیکھ کر کہنے لگا اسی میں کیتی دروازہ لگا دوں میں نے کہا "تمہیں اب کیا ضرورت ہے"؟ کہنے لگا "اب کیا یہ خالی ہی پڑا رہے گا"۔

"تو کیا جو بھی اس مکان میں آکر آباد ہو گا وہ مجھ سے محبت ضرور کرے گا" میں نے پوچھا

"ہاں ضرور کرے گا۔ تم اسی قابل ہو کہ تم سے ہر ایک محبت کرے اگر تم ولایت جاتے تو دیکھ لیتے کہ تم پر کتنی پریاں عاشق ہوتیں اور تمہیں یہ ساری پارسائی اور زہد طاق میں رکھنا پڑتا" وہ بہکتا رہا۔

اسی دن شام کو اُس نے اپنے پاس سے ایک قسم کا تیزاب سا پانی میں ملا کر پچکاری کے ذریعہ دور کھڑے ہو کر ننھی سی دیوار پر چھڑک دیا۔ دس گیارہ بجے تک دیوار میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ میں ہنسنے لگا۔ "اختر تم مجھے بناتے ہو بھلا دیوار پر اس پانی سے کیا اثر ہوتا۔

"صبح کو دیکھنا" اُس نے یقین اور اطمینان کے ساتھ کہا۔

دوسرے روز علی الصبح میں شوق میں اٹھ بیٹھا۔ اُٹھتے ہی باہر آیا۔ تو دیوار غائب تھی۔ مجھے یقین نہ آیا۔ اسے میں نظر کا دھوکا سمجھا۔ آنکھیں ملیں پھر دیکھا دیوار ڈھیر ہوئی پڑی تھی۔ قصہ مختصر اختر نے اُس میں کمانیوں سے ایسا دروازہ لگایا ہے کہ بالکل پتہ نہیں چلتا۔ پیچ دار ایک کھونٹی ہے۔ اس میں بٹن لگا ہے۔ بٹن کو دبانے سے دروازہ کھل جاتا ہے اور کمال یہ ہے ذرا بھی آواز پیدا نہیں ہوتی۔ یہ کمانیاں وہ اپنے ساتھ ولایت سے لایا تھا۔ کہتا ہے کہ یہ ایجاد ابھی ہندوستان نہیں پہنچی۔ اس سے ترکیب پوچھ لوں گا تاکہ جب کبھی مکان چھوڑنا پڑے تو کمانیاں ساتھ لے جاسکوں

اختر آج کل میں جانے والا ہے گو نہ میرا جی چاہتا ہے اور نہ اس کا کہ مجھے چھوڑ کر چلا جائے۔ لیکن مجبوری ہے۔ ملازمت کا تار آگیا ہے۔ میں اُسے روک نہیں سکتا۔

نواں خط

تین چار ہفتوں سے پھر میں نے تمہیں خط نہیں لکھا۔ تمہارا خیال غلط ہے میں ناراض نہیں۔ معافی کس بات کی مانگتے ہو جو ہونا تھا ہو چکا۔ مجھے اس بات کا ذرہ برابر بھی خیال نہیں۔ میں تو تقریباً بھول چکا تھا تمہیں نے یاد دلا دی۔ خط نہ لکھنے کی وجہ وہی پہلی سی مصروفیت ہے اور کچھ نہیں۔ پندرہ بیس دن ہوئے یہ مکان آباد ہو گیا ہے اور خدا نے کشمش کا ایسا نعم البدل عطا فرمایا ہے کہ الفاظ میں تعریف کرنا ناممکن ہے۔

ایک سارٹر صاحب تشریف لائے ہیں۔ شاید سارٹر کا مطلب تم اچھی طرح نہ سمجھ سکو۔ ڈاک خانے کی ایک شاخ "ریلوے میل سروس" ہے۔ سارٹر اُس کے کلرک ہوتے ہیں۔ ان میں کچھ اسٹیشنوں کے دفتروں میں کام کرتے ہیں اور باقی باہر جاتے ہیں۔ مختلف ڈاک گاڑیوں میں اور مختلف اطراف میں۔ غریبوں کی کیا زندگی ہے آج یہاں کل وہاں۔ یہ سارٹر صاحب بھی لاہور جاتے ہیں۔ تین دن یہاں رہتے ہیں دو دن لاہور۔ تیس راتوں میں بارہ سفر میں کٹتی ہیں بارہ دہلی میں اور چھ لاہور میں بے چارے کو پیٹ کی خاطر کیسی مصیبت اٹھانی پڑتی ہے۔ ساری عمر کی کمائی ایک لڑکی ہے جو دسویں جماعت میں تعلیم پاتی ہے اور بیوی دائم المرض ہے۔

جب یہ پہلے دن مکان میں آئے تو معمولی علیک سلیک ہو گئی تھی۔ کیا خبر تھی کہ یہ ذرا سی ملاقات بڑی کارآمد ثابت ہو گی۔ کئی روز تک یہ نظر نہ آئے۔ میں نے بھی کچھ پروا نہ کی۔ ایک دن تمہیں خط لکھنے بیٹھا تو حضرت آ نازل ہوئے۔ دو تین سطریں ہی لکھنے پایا تھا کہ قلم اٹھا کر رکھ دیا اور باتوں میں مشغول ہو گیا۔ باتوں باتوں میں انہوں نے اپنی مصیبتوں کا ذکر شروع کر دیا کہ باوجود ہزاروں دواؤں کے استعمال کے ہنوز اولادِ نرینہ سے محروم ہیں۔ چار لڑکیاں ضائع ہو چکیں۔ پھر کہنے لگے بیوی ہے وہ ہمیشہ کی بیمار لڑکی اسکول میں پڑھتی ہے ایک جان کیا کیا کام کرے۔ گھر کے کام کاج کے لئے کوئی خادمہ مل جاتی تو اچھا تھا۔

"لڑکی کونسی جماعت میں ہے؟" میں نے اور باتوں کو قطع نظر کرتے ہوئے پوچھا۔

"دسویں میں"

"اتنی زیادہ تعلیم کی کیا ضرورت ہے۔ پھر ایسے حالات میں اُسے اسکول سے اٹھا لینا مناسب ہوتا"۔

"میری تو یہی مرضی تھی مگر وہ کہنے لگی ابا ایک برس رہ گیا ہے کم از کم انٹرنس تو کر لوں"۔

مجھے وہ عہد یاد آ گیا جو میں نے دو تین مہینے پہلے کشمش سے کیا تھا۔ اس لئے تعلیم دلانے کے خلاف اور کچھ نہ کہا۔

"خادمہ تو کوئی نظر میں ہے نہیں البتہ ایک لڑکا ہے جو بہت اچھا کھانا پکانا جانتا ہے اور رہے بھی ہوشیار سمجھ دار"۔

"کس عمر کا ہے؟"

"یہی کوئی بارہ تیرہ برس کا ہے"۔

"کہاں ہے پھر اُسی (اُسے ہی) بلا دو"

"بہت اچھا اس مرتبہ جب آپ لاہور سے تشریف لائیں گے تو آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا"

وہ تو چلے گئے تو میں نے فوراً رشید کو خط لکھ دیا۔ اُس کے دو تین خط آ چکے تھے جن میں لکھا تھا کہ اب میں بالکل اچھا ہوں کسی جگہ کوئی نوکری ہو تو مہربانی کر کے بلا لیجئے۔ اُس کا خیال تھا کہ میں نے اس کی جگہ دوسرا ملازم رکھ لیا ہے ورنہ خط لکھوانے کی بجائے وہ خود کبھی کا آ چکا ہوتا۔

رشید تو تیار ہی بیٹھا تھا۔ خط ملتے ہی فوراً آ گیا۔ پھر سارٹر صاحب نے ایک اور فرمائش کی کہ میں بازار میں کھانا نہ کھایا کروں بلکہ دونوں وقت اُن کے یہاں سے آ جایا کرے گا۔ بہت سے عذر پیش کئے مگر ان کے لئے ایک بھی قبول کئے جانے کے قابل نہ تھا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ اتنے مصر کیوں ہیں۔ خیال کیا کہ شاید ان کی لڑکی نے کہا ہو کیونکہ مجھے وہ تین چار دفعہ گلی میں مدرسے سے آتے جاتے مل چکی تھی اور شاید ایک دفعہ کھانا لاتے بھی دیکھ لیا تھا لیکن پھر سوچنے لگا کہ اُس نے تو نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔

مجھے اُن کی یہ فرمائش منظور کرتے ہی بن پڑی رات بھر سوچتا رہا کہ ان کی لڑکی جوان ہے اور بیاہ دینے کے قابل۔ شاید ان حضرت کی نظرِ انتخاب مجھ غریب پر ہی پڑی ہے۔ انہیں مجھ میں کیا خوبی نظر آئی بظاہر

تو کوئی خوبی ہے نہیں اور برائی بھی کیا ہے خود بخود یہ خیال بھی عین اسی وقت دماغ میں آ گیا جب کہ پہلی بات سوچ رہا تھا اور میں اپنے دل ہی دل میں شادی کے متعلق فیصلہ کرنے لگا کہ والدین کی رضامندی کے بغیر ہرگز ہرگز شادی نہ کروں گا۔ دسویں جماعت تک پڑھی لکھی لڑکی کو تو کبھی دلھن نہ بناؤں گا۔ اس کے علاوہ بے پردہ بھی تو ہے۔ اسے تو والدہ صحن میں قدم بھی نہ رکھنے دیں گی۔ پھر مجھے اس کے خوبصورت خط و خال یاد آ گئے اور اس کی مستانہ چال ـــــ اور میں نے محسوس کیا کہ اوپر کے فیصلہ میں ضرور ترمیم ہونی چاہیئے۔

اس واقعہ کے چوتھے دن یہ عقدہ کھلا۔ ماسٹر صاحب فرمانے لگے کہ لڑکی کو یونیورسٹی کا امتحان دینا ہے۔ پچھلے دنوں وہ دو مہینے بیمار بھی رہ چکی ہے اور والدہ کی بیماری نے بھی اُسے اسکول کا کام نہیں کرنے دیا۔ کوئی بھلا مانس اور شریف استاد مل جاتا تو کمی پوری کرا دیتا۔ جی میں آتا ہے اشتہار دے دوں پھر خیال آتا ہے کہ اس طرح بھلے بُرے میں تمیز نہ ہو سکے گی"۔

میں کہنے ہی لگا تھا کہ "میں حاضر ہوں" لیکن یکایک بجلی کی تیزی کے ساتھ یہ خیال آیا "کیا میں بھلا مانس اور شریف بھی ہوں" اور لفظ زبان پر آتے آتے رہ گئے۔ آخر انہوں نے خود ہی کہا۔ "اگر آپ یہ تکلیف کریں تو میں آپ کی ہر خدمت کرنے کے لئے تیار رہوں اور یہ احسان آپ کا ہم تینوں پر ہو گا"۔

مجھے محسوس ہوا کہ کوئی خزانہ مل گیا ہے۔ میں نے کہا "نہیں صاحب احسان کس بات کا ہے۔ میں تو آپ کا خادم ہوں جو حکم دیں بسر و چشم حاضر ہوں"۔

کوئی چار دن سے میں نے اُسے پڑھانا شروع کیا ہے غضب کی ذہین لڑکی ہے جو بتاتا ہوں فوراً یاد کر لیتی ہے۔ اس کے باپ کو غلط فہمی ہوئی یہ تو بغیر میری مدد کے بھی بڑے اچھے نمبروں سے پاس ہو جاتی۔

کل سے ہم کھانا بھی ایک ساتھ کھا رہے ہیں۔ اس کا علم صرف رشید کو ہے۔ ماسٹر صاحب لاہور گئے ہوئے ہیں۔ ماں غریب منہ سر لپیٹے پڑی رہتی ہے۔ وہ اس تعلیم اور بے پردگی کے بہت خلاف ہے مگر شوہر دم مارنے نہیں دیتا۔ ابھی میں نے چور دروازے کا راز اُسے نہیں بتایا۔ چار پانچ دن میں امتحان کی تیاری کی چھٹیاں ہونے والی ہیں میں بھی ڈاکٹری سرٹیفکیٹ بھیج کر چھٹی لے لوں گا۔

حیات اس میں بہت سی خوبیاں ہیں حسین بھی ہے تعلیم یافتہ بھی ہے ہارمونیم اور پیانو پر اردو انگریزی کے گیت گا لیتی ہے۔ لیکن دل اس سے شادی کرنے کو نہیں مانتا۔ گو روز بروز مجھے اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ محبت ہوتی جاتی ہے لیکن پھر بھی یقین ہے کہ شادی کرنے پر کبھی آمادہ نہ ہوں گا خواہ اس کا انجام کیسا خوفناک کیوں نہ ہو۔

دسواں خط

دو دن سے چھٹی لے رکھی ہے۔ بڑے لطف سے گذ[illegible] ی ہے اس کی بھی چھٹیاں ہیں۔ ہم ایک ساتھ سیر کو جاتے ہیں۔ وہ بھی مرد[illegible] لباس میں ملبوس ہوتی ہے۔ ان کے اسکول میں ایک تمثیل کی گئی تھی جس میں شہزادہ کا پارٹ اُس نے کیا تھا۔ اس کی دو پوشاکیں اس کے پاس موجود ہیں۔ مردانہ بھیس میں ایسی دلکش معلوم ہوتی ہے کہ کیا کہوں۔ میں بھی رحیم بہن کر اور دوپٹہ باندھ کر سیر کو جاتا ہوں۔ لوگ اُسے دیکھ کر بے خود ہو جاتے ہیں بہت سے کمینے کبھی کبھی کچھ بک دیتے ہیں تو اُسے بہت ناگوار گزرتا ہے ایک اور مزے کی بات سنو جب یہ بات کرتی تھی تو اُسے یاد نہ رہتا تھا کہ میں مرد بنی ہوئی ہوں صیغہ مذکر استعمال کرنا چاہیئے۔ وہی مونث صیغہ "میں گئی" "میں بولی" زبان پر چڑھا ہوا تھا۔ اسے دور کرنے کے لئے میں نے اس سے کہا کہ انگریزی میں بات چیت کیا کرو۔

پرسوں پہلی مرتبہ میں نے چور دروازے کو استعمال کیا۔ اسے بڑی حیرت ہوئی کیونکہ اس کے خیال میں ایسے مکان میں بیسویں صدی کی یہ ایجاد ہونا حیرت انگیز ہے۔ کل وہ اپنی ایک سہیلی کو جو حسن و صورت کے اعتبار سے اس سے ذرا کم نہیں دروازہ دکھانے لائی تھی۔ میرا بھی استاد کی حیثیت سے تعارف کرایا تھا۔ سہیلی تعریف کرتے کرتے مذاق پر اتر آئی "لیکن اس دروازے کی یہاں کیا ضرورت ہے"۔ شاگرد سوچنے لگی کہ کیا جواب دے۔ آخر استاد کو بولنا پڑا "یہ کمانیاں فالتو رکھی تھیں۔ اس دیوار میں لگا دیں کہ چلو نمائش ہی رہے گی۔ یار دوستوں کو دکھا کر تعریف ہی سنا کریں گے"۔

حیات تم اس کا نام کیوں پوچھتے ہو؟ کیا اسے بھی خط لکھنے کا ارادہ ہے۔ دوست اب ایسی حرکت نہ کر بیٹھنا ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ میں نے اس کا نام گلاب تجویز کیا ہے کیونکہ اس کے رخسار گلاب کی طرح کھلے رہتے ہیں اور رنگت میں بھی کسی طرح گلاب سے کم نہیں۔ یہ تو ہر حیثیت سے کشش سے با[illegible] نے [illegible] تمہارے کاہل دوست کو اس نے اپنا راز داں بنا لیا ہے اور طالب علمی کے دو وہ تجربے بیان کئے ہیں کہ اگر میں انہیں کسی اخبار یا رسالہ میں شائع کرا دوں تو نوے فی صدی آدمی تعلیم

نسواں کے خلاف ہو جائیں کم از کم موجودہ طرزِ تعلیم کو تو کوئی بھی پسند نہ کرے
میرے دل میں اس کی قدر ہے بھی اور نہیں بھی۔ جب اس کی خوبیوں پر
نظر جاتی ہے تو یہ حور سے بھی بہتر معلوم ہوتی ہے اور جب عیبوں کو
دیکھتا ہوں تو ـــــ

آج کی بات ہے گلاب کہنے لگی

"ایک بات پوچھوں اگر آپ سچ سچ بتائیں"

"پوچھو" میں نے کہا۔ لیکن وہ چپ رہی "پوچھو" میں نے پُراشتیاق
لہجے میں کہا "چپ کیوں ہو گئیں"۔

"آپ ایک ہیں یا دو ہو چکے؟" اس نے دریافت کیا

اب خاموش ہونے کا میرا نمبر تھا۔ وہ ایک منٹ جواب کا انتظار
کرکے بولی۔

"میں کیا پوچھ رہی ہوں آپ ایک ہیں یا دو ہو چکے"

میں جھوٹ بولنا نہ چاہتا تھا اس لئے میں نے کہا

"اس کا جواب کل دوں گا"

"جو بات ہے آپ صاف صاف کیوں نہیں بتاتے اس کا تو
یہ مطلب ہے کہ آپ کو سچ بولنے میں تامل ہے"۔

ٹھیک اس وقت گلاب کے والد آگئے اور میں اُسے سبق پڑھانے
میں مصروف ہو گیا۔

حیات اگر تم تیار ہو تو میں اسے اور اس کے باپ کو تو راضی کر
لوں گا۔ یہ یاد رہے کہ کسی سے پردہ نہیں کرتی اور دسویں جماعت میں پڑھتی
ہے۔

گیارھواں خط

گلاب چھ روز سے بیمار ہے۔ سردی لگی تھی اس سے بخار ہو گیا
تھا۔ اس نے کچھ پروا نہ کی پھر نمونیہ ہو گیا۔ اس کے والد کی ڈیوٹی
تبدیل ہو گئی ہے۔ پرسوں راولپنڈی گئے ہیں تین دن میں واپس
آئیں گے۔ جب وہ جانے لگے تو گلاب کو معمولی سی حرارت تھی۔ یہ
خبر نہ تھی کہ یہ معمولی سی حرارت خطرناک بخار اور نمونیہ کی صورت اختیار
کرے گی جس رات کو وہ گئے اسی رات کو گلاب کو بہت زور کا بخار چڑھ
آیا اور سینے میں درد ہونے لگا۔ میں اپنے کمرے میں بے خبر سو رہا تھا کہ
اس کی والدہ نے دیوار میں اینٹیں مار مار کر جگا دیا۔ میں گھبرا کر اُٹھا اور
اُن سے پوچھنے پر گلاب کی حالت معلوم ہوئی۔ گھبراہٹ ہی میں میں
نے خفیہ دروازہ کھول لیا۔ مجھے اس بات کا قطعی خیال نہ آیا کہ گلاب کی
والدہ کو ابھی تک اس دروازے کا حال معلوم نہیں اور جلدی میں
اُسے کھلا ہی چھوڑ گیا۔ اس کی والدہ نے پوچھا "کہاں سے آگئے۔ دیوار
پر سے؟"

"ہاں"

"کودنے کی آواز تو آئی نہیں" وہ بولیں۔

اس وقت مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور میں چپ رہ گیا۔
مگر انہوں نے زیادہ خیال نہ کیا کیونکہ لڑکی کی وجہ سے پریشان ہو رہی
تھیں۔ میں نے نبض دیکھی۔ اُس پر نیم غشی طاری تھی۔ سمجھ میں نہ آیا کیا کروں
"بے وقت اور پھر کسی ڈاکٹر کا گھر معلوم نہیں۔ ہسپتال بہت دور ہے"۔
میں سوچتا رہا اور سوچتے سوچتے دروازے کا بٹن دبا دیا۔ کپڑے
پہنتے ہوئے بھی فکر رہا کہ کونسے ڈاکٹر کو بلا کر لاؤں۔ آخر زینہ میں ہو کر
ان کے یہاں گیا اُس کی والدہ نے کنڈی کھولی اور میں انہیں تسلی
دے کر چلا گیا۔ ڈاکٹروں کی دو تین دکانوں پر آوازیں دیں مگر بے سود
میں نامراد واپس آنے ہی لگا تھا کہ ایک سپاہی نے ڈاکٹر کا گھر بتایا۔
اس کے یہاں گیا بڑی دیر میں تیار ہو کر آیا اور کہنے لگا "آٹھ روپے
فیس ہو گی"۔

"آپ چلئے تو سہی فیس بھی لے لیجئے گا"

"میں اُسے لے کر گھر آیا"

گلاب کا بخار اب اور بھی زیادہ ترقی کر گیا تھا اور اُس پر مکمل بیہوشی
طاری تھی۔ انہوں نے مقیاس الحرارت سے بخار کا درجہ معلوم کیا اور
کہا "بہت خطرناک حالت ہے اگر آج رات آرام سے گزر گئی تو خیر
ورنہ ـــــ"

"ورنہ کیا" میں نے جلدی سے دریافت کیا

"ورنہ زندگی کا خطرہ ہے"۔

"زندگی کا خطرہ ہے" میرے منہ سے بے اختیار یہ لفظ نکل
گئے۔

میں اُس کے ساتھ ہی گیا اور دوا لے آیا۔ فیس میں نے اپنے
پاس سے دے دی اور گلاب کی والدہ سے کہہ دیا یہ میرا دوست
ہے فیس ویس کچھ نہ لے گا۔ دوا کی قیمت اس نے کچھ نہ لی تھی۔ ایک ایک

گھنٹے کے بعد خوراکیں دینی تھیں۔ میں اُس کے پلنگ کے نزدیک کرسی بچھا کر بیٹھ گیا۔ انگیٹھی میں کوئلے سلگا لئے اور اُس کی والدہ سے کہا "آپ اس کے سینے میں دوا کی مالش کر کے آرام کریں۔ میں جاگتا رہوں گا فکر کی بات نہیں"۔ وہ غریب چاہتی تو یہ تھی کہ بیٹی کے پاس بیٹھی رہے مگر کھانسی کا دورہ اُٹھنے لگا اور مجبور ہو کر لیٹ گئی۔ میں نے اُسے جب دوا کی دوسری خوراک دی تو اُس نے آنکھیں کھولیں —— میں نے کہا "کیسی طبیعت ہے گلاب" وہ مجھے تکتی رہی مایوسی اور حسرت کے ساتھ اور پھر اُس نے کروٹ لے لی۔ شاید اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ حیات میں سمجھتا تھا کہ میں گلاب سے یوں ہی دل بہلا لیتا ہوں مجھے اس سے محبت نہیں ہے مگر کل رات پہلی مرتبہ مجھے معلوم ہوا کہ میرے دل میں اُس کی محبت موجود ہے —— بے انتہا محبت اس کی بیماری سے میرا دل بہت بے چین تھا۔ سارے کمرے میں سکوت نے تسلط کر رکھا تھا۔ ایک ٹائم پیس کے چلنے کی آواز متواتر آرہی تھی یا کبھی کبھی مجھے اپنے دل کے دھڑکنے کی صدا سنائی دے جاتی تھی میں نے دہکتے ہوئے کوئلوں سے بھری ہوئی انگیٹھی کو دیکھا اور سہم گیا کچھ دیر پہلے کوئلے سرد تھے پھر سلگنے لگے آخر سارے دہک گئے اب کچھ دیر میں خاک ہو جائیں گے۔ یہی حالت دنیا کی ہے۔ دنیا ایک انگیٹھی کے مانند ہے اور ہم سب انسان کوئلے ہیں جلتے ہیں اور جل کر خاک ہو جاتے ہیں۔ دنیا ویسی کی ویسی رہتی ہے۔ جب میرا دل زیادہ گھبرایا تو میں صحن میں نکل کر ٹہلنے لگا۔ چاند نکل چکا تھا۔ ہر چیز چاندنی کے سمندر میں نہائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ بڑا دلفریب منظر تھا ہر طرف سکوت، ہر طرف چاندنی —— مگر مجھے یہ سکوت اور یہ چاندنی ایک ڈائن معلوم ہوئی جو میری گلاب کو کھانے آئی تھی۔ میں پھر کمرے میں آ کر گلاب کے سرھانے بیٹھ گیا اور اُس کے مرجھائے ہوئے زرد گالوں کو دیکھنے لگا۔ گیسو پریشان ہو کر رخساروں پر آ گئے تھے۔ تین منٹ مسلسل نہ دیکھ سکا۔ میرا جی بھر آیا۔ اُس نے پھر کروٹ بدل لی۔ میں نے کہا "گلاب! گلاب!!"۔ وہ بے ہوش تھی اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ میں نے اس کی پیشانی پر اپنا رخسار رکھ دیا —— میں بے بس تھا۔ ضبط کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں رو رہا تھا آہ —— اس کی پیشانی دہکتے ہوئے کوئلوں سے زیادہ گرم تھی اور سرخ۔ شاید میرے آنسوؤں کی نمی کا احساس اُسے ہوش میں لے آیا۔ اُس نے بڑی بڑی کٹورا سی آنکھیں کھولیں اور نازک نازک لبوں کو حرکت دی "ظفر صاحب! ابا جی کو تار دے دیا؟" میں نے کہا نہیں۔ مگر اُس نے میرا جواب نہیں سنا اور پھر بے ہوش ہو گئی۔

غرضکہ میں ساری رات اُس کے قریب بیٹھا روتا رہا۔

علی الصبح پھر ڈاکٹر کے پاس گیا اور حالت بیان کی۔ وہ کمبخت کہنے لگا "آثار اچھے معلوم نہیں ہوتے" کیا مطلب —— میں بمشکل یہ الفاظ ادا کر سکا۔

"مریضہ کی حالت خطرناک ہے اور زندگی کی کوئی امید نہیں" اس نے کہا

میں نے سوچا یہ ڈاکٹر کام کا نہیں۔ اسے تو تیمارداروں کی تسلی بھی کرنی نہیں آتی حالانکہ اُس نے صاف صاف بات کہہ دی تھی۔ دوسرے ڈاکٹر کو لا کر دکھایا اُس کی دوا سے بھی کچھ فایدہ نہ ہوا۔

آج تمام دن انتہائی پریشانی میں بسر ہوا۔ یہ خط بھی اُس کے قریب بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ دوسرے ڈاکٹر نے بھی جواب دے دیا ہے۔ آنکھیں روتے روتے خشک ہو گئی ہیں اب ان میں آنسو نہیں رہے۔ جی گھبرا رہا تھا تمہیں خط لکھنے بیٹھ گیا۔ خبر نہیں جلدی اور رنج میں کیا کیا لکھا گیا۔ حیات دعا کرو کہ خدا گلاب کو صحت عطا کر دے۔ لیکن وہ تو آپ کی دعا سے پہلے ہی اسی قسم کی دعاؤں سے بے نیاز ہو چکے گی۔ آہ۔ خدا نہ کرے اگر ایسا ہو گیا تو میں کیونکر زندہ رہوں گا —— حیات! گلاب کے بغیر میں زندگی کا "بارِ گراں" نہ اُٹھا سکوں گا۔

بارھواں خط

اس مرتبہ تم نے خط کا جواب خلافِ معمول بہت جلد دے دیا لیکن میں حسبِ معمول "تاخیر" سے لکھ رہا ہوں۔ تمہاری دعاؤں کا شکریہ نہ زبان سے ادا ہو سکتا ہے نہ قلم سے۔ تمہاری دعاؤں ہی کی بدولت گلاب کی جان بچ گئی ورنہ بیماری کا حملہ بہت مایوس کن تھا اور ہم سب اس کی زندگی سے مایوس ہو گئے تھے۔

کئی روز سے خط لکھنے کے متعلق سوچ رہا تھا لیکن بے وجہ دیر ہوتی رہی اور اب تین چار دن سے ایک "الجھن" نے پریشان کر رکھا ہے ہزار سوچتا ہوں، دماغ پر لاکھ زور دیتا ہوں مگر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ بالکل مجبور ہوں اور بے بس۔ آپ سے "رازِ دل" بیان کرتا ہوں شاید آپ اس معاملے میں میری کچھ مدد کر سکیں۔

پرسوں جب میں دفتر سے آیا تو رشید نے مجھے ایک لفافہ دیا جس پر گلاب کے والد کا پتہ تحریر تھا اور بولا "یہ بی بی جی دے گئی ہیں"۔

"وہ خود کہاں ہیں" میں نے لفافہ لیتے ہوئے کہا

"خبر نہیں صاب" رشید کہہ کر چلا گیا۔

میں نے لفافے میں سے خط نکال کر پڑھا۔ یہ گلاب کے کسی رشتہ دار حضرت کا خط تھا۔ انہوں نے تحریر فرمایا تھا "دو خط لکھ چکے آپ نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ اگر آپ نے اس خط کا جواب بھی ایک ہفتے کے اندر اندر نہ لکھا تو ہم آئندہ رضواں کے رشتے کے لئے آپ کو کبھی نہ لکھیں گے۔ خدا کے فضل سے رضواں میں کوئی عیب نہیں ہے۔ پڑھا لکھا ہے نیک چلن ہے۔ آج ہم ذرا تحریک کریں تو بیس رشتے موجود ہو جائیں مگر اس کی اور اس کی والدہ کی یہی مرضی ہے کہ آپ ہی کے یہاں ہو۔ اس لئے بھائی مکرر عرض کرتا ہوں کہ رضواں کو اپنی غلامی میں قبول کر لیجئے اور اگر آپ کا ارادہ کچھ اور ہو تو جلد مطلع فرمائیے۔"

میں نے لفافہ جیب میں ڈال لیا اور چارپائی پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ کیا کروں کیا والد صاحب کو خط لکھ دوں کہ میرے رشتے کے لئے گلاب کے والد کو لکھیں پھر مجھے والدہ کا خیال آ گیا ——— میں ابھی اسی قسم کے خیالات میں محو تھا کہ گلاب اپنے مکان میں آئی اور رشید سے میرے متعلق دریافت کر کے فوراً میرے پاس آ گئی اور آتے ہی ریاضی کا ایک سوال سمجھانے کے لئے کہا۔ میں اُس وقت اپنا ایک نہایت اہم سوال "حل" کر رہا تھا لیکن گلاب کی بات کو رد کرنا بھی آسان نہ تھا لہذا حساب کی کتاب لے کر سوال کی عبارت پڑھنے لگا۔ ابھی میں نے سوال کو دوسری دفعہ ہی پڑھا تھا کہ ایک نسائی آواز نے ہم دونوں کو حیران کر دیا۔

"کیا ظفر صاحب اسی مکان میں رہتے ہیں"

میں اور گلاب ایک ساتھ اُٹھ کر زینے کے دروازے تک گئے ایک سرو قد عورت کشمشی رنگ کا برقعہ اوڑھے کھڑی تھی۔ میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ کشمش ہے۔ آواز سن کر پہلے ہی شبہ ہو گیا تھا اور برقعہ دیکھا تو بالکل یقین آ گیا۔ گلاب کو بڑی حیرت ہوئی۔ کہنے لگی "تم کون ہو ——— اوپر آ جاؤ"

"ایک بدنصیب بیوہ" اُس نے آہ بھرتے ہوئے کہا

"بیوہ! خدا نہ کرے" میں نے کہا "خدا تمہارے سہاگ کو قائم رکھے"

جب میں یہ بات کہہ رہا تھا تو گلاب تعجب سے میری طرف تک رہی تھی۔

کشمش اوپر آ گئی اور ہم تینوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اس نے گلاب کے کہنے سے برقعہ اتار کر الگ رکھ دیا۔ کچھ دیر ہم تینوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر میں نے اُن دونوں کا تعارف کرایا لیکن دونوں کو یہ خیال رہا کہ میں نے انہیں ایک دوسری کے متعلق صاف صاف بات نہیں بتائی۔ گلاب تو ہر روز کے معمولی لباس میں تھی مگر کشمش بہت بن سنور کر آئی تھی۔ اُس کا لباس اور چہرے کی خوشی کی علامتیں دیکھ کر اور اُس کی گفتگو سن کر کوئی اُسے بیوہ نہ کہہ سکتا تھا۔ اُس نے بتایا کہ اس مکان سے جانے کے پندرہ دن بعد اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اُس نے دُکان کا حصہ دوسرے حصہ دار کے پاس فروخت کر دیا اور سارا روپیہ بنک میں جمع کرا دیا اُس نے باتوں ہی باتوں میں دوسرا نکاح کرنے کا ارادہ بھی ظاہر کر دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ اس کے لئے شوہر میں تجویز کروں اور اگر میں نے ایک ہفتے میں کوئی امید افزا جواب نہ دیا تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دہلی سے چلی جائے گی اور یہ کہ اس وقت اس کے پاس جائیداد اور نقد تیس ہزار کے قریب ہے۔

کشمش جب تک بیٹھی رہی مجھے حسرت اور امید سے تکتی رہی اور گلاب کشمش کو۔ کچھ دیر کے بعد پھر خاموشی چھا گئی اور ہم مختلف قسم کے خیالات میں کھو گئے۔ آخر کشمش اٹھی اور دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے جانے کی اجازت چاہی میں نے کہا "ذرا دیر ٹھہریئے کھانا تیار ہے"۔

اس نے مسکراتے ہوئے کہا "کھانا تیار ہے؟ کہاں! ——— مجھے تو نظر آتا نہیں"۔

"ابھی نظر آنے لگے گا دو لمحے انتظار تو کیجئے" میں نے اس کی بات کا جواب دیا اور گلاب کی طرف دیکھا۔

گلاب چپ چاپ بیٹھی تھی۔ حیرت! وہ گلاب جو انتہا سے زیادہ خلیق ہے اور مہمان نواز اُس وقت کسی خیال میں محو تھی۔ نہ اُسے اخلاق کا دھیان تھا نہ خاطر تواضع کا۔ میں اُس سے کھانا لانے کے لئے لفظی درخواست کرنے ہی لگا تھا کہ کشمش یہ کہہ کر چلی گئی "آپ تکلیف نہ کیجئے میں اس وقت نہیں ٹھہر سکتی"۔

اُس کے جاتے ہی گلاب بھی اٹھ کر چلی گئی اور میں بغیر کھانا کھائے روشن آرا باغ کی طرف چل دیا۔ رستے میں طبیعت کچھ اور زیادہ پریشان

ہوگئی اور میں نے جنگل کا رخ کیا آبادی سے بہت دور جا کر جمنا کے کنارے ہری ہری گھاس پر بیٹھ گیا۔ سینے میں خیالات کا ایک سمندر موجزن تھا اور دل سے ایک ابال سا اٹھ رہا تھا۔ سامنے دریا کا پانی خراماں خراماں بہہ رہا تھا۔ چاند نہ نکلا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے خود بخود کیا ہوگیا کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا کشمش کی ملاقات کا رنج تو ہوا نہیں۔ خوشی کی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پھر دل کو کیا ہوگیا۔ دماغ کیوں پریشان ہے۔ پھر چاند نکلنے لگا۔ اس کا عکس پانی میں ایسا دلفریب تھا کہ میرا دل ذرا دیر کے لئے اپنی اصلی حالت پر آگیا اور یکایک خیال آیا کہ مجھے گلاب اور کشمش میں سے ایک کو انتخاب کرنا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ میں ایسی جگہ کھڑا ہوں جہاں سے "منزل" کو دو راستے جاتے ہیں اور ہر راستے میں الگ الگ "رفیقِ سفر" ملے گا۔ ایک راستہ اختیار کرنے سے اپنی حالت بدل جائے گی، عیش و عشرت اور امیرانہ ٹھاٹھ سے مسافت طے ہوگی۔ روپے پیسے کے تفکرات سے بے نیاز ہو جاؤں گا۔ گو رفیقِ سفر کچھ عمر رسیدہ سا ہے لیکن تجربہ کار اور ہوشیار ہے۔ دوسرا راستہ اختیار کرنے سے تمام سفر میں روپیہ حاصل کرنے کے فکر اور پیٹ بھرنے کے افکار چین نہ لینے دیں گے۔ لیکن ساتھی ایسا ہوگا جسے دیکھ کر ہی تمام رنج و غم کافور ہو جائیں۔ جو جوانی میں مست اور حسن میں مخمور ہے جس کے مقابلے میں انسان دنیا کی ہر نعمت کو بخوشی ٹھکرانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ میں سوچتا رہا۔ پانی کی سطح پر نظریں جمائے سوچتا رہا لیکن یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ کونسا راستہ بہتر ہے۔

چاند کافی بلند ہو چکا تھا۔ ہر چہار سمت چاندنی نے اپنی دلفریب چادر بچھا کر ایسا دلچسپ اور سہانا منظر پیدا کر دیا تھا کہ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی۔ "کاش یہاں گلاب ہوتی" اور دوسرے لمحہ یہ الفاظ میری زبان سے نکل رہے تھے "یا کشمش"۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی فیصلہ کر کے وہاں سے آؤں لیکن دماغ بالکل کام نہ کرتا تھا۔ چاند کو دیکھ کر میرے دل میں خیال آیا کہ کشمش اس چاند کے مانند ہے اور گلاب ہلال کے مانند۔ گلاب ایک کلی ہے خوشنما جو عنقریب کھلنے والی ہے اور کشمش ایک شگفتہ پھول ہے اسی طرح مقابلہ کرتے کرتے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ گلاب کو حسن و صورت کے لحاظ سے کشمش پر فضیلت حاصل ہے اور کشمش دولت اور محبت کے اعتبار سے گلاب سے افضل ہے۔ جب میں قطعی مجبور ہوگیا اور ایک رائے قائم نہ کر سکا تو میں نے وہ کیا جو شاید ہر انسان ایسے موقع پر کیا کرتا ہے یعنی تقدیر پر چھوڑ دیا ——— اور وہاں سے چلا آیا واپس آتے ہوئے میرے دل میں کشمش کی زیادہ عظمت تھی۔ مجھے یقین ہوگیا تھا کہ کشمش مجھے گلاب سے زیادہ عزیز رکھتی ہے لیکن گھر پہنچنے پر اس بات کی بالکل تردید ہوگئی کمرے میں روشنی ہو رہی تھی یہ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا تھا اس لئے زینے میں نہایت آہستہ آہستہ قدم رکھ کر اوپر چڑھا۔ زینے کے دروازے میں پہنچ کر میں ذرا ایک لمحے ٹھہرا اور پھر تیزی سے یک لخت کمرے میں چلا گیا۔ میز پر میرا فوٹو رکھا تھا اور گلاب اس پر جھکی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کھڑی ہوگئی اور رحم طلب نگاہوں سے تکنے لگی۔ حیات! خبر نہیں ان نظروں میں کیا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ آج تمام کائنات غمگین ہے اور میری بے وفائی کا ماتم کر رہی ہے۔ میں نے کپڑے بدلے اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ گلاب آ کر قریب کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کھانا لاؤں؟" اس نے پوچھا

"نہیں ——— مجھے بھوک نہیں"

"کیوں کیا کہیں اور کھا آئے"

"نہیں"

گلاب نے رشید کو آواز دی اور کہہ دیا کہ برتنوں کو اٹھا کر رکھ دے۔ اس نے دریافت کیا کھانا نہیں کھائیں گے۔ کہنے لگی "نہیں انہیں بھوک نہیں ہے"

"اور آپ" رشید نے دوبارہ پوچھا۔

"مجھے بھی بھوک نہیں" گلاب نے جواب دیا

"آپ جب تو کہہ رہی تھیں بھوک لگ رہی ہے خبر نہیں ظفر صاحب ———"

"تمہیں جو کہا ہے وہ کرو اپنی طرف سے بکواس کرنے کی ضرورت نہیں" گلاب نے ناراضی سے رشید کی بات کاٹ کر کہا

ہم دونوں خاموش تھے۔ نہ جانے گلاب کیا سوچ رہی تھی لیکن

میں اُسی سوال میں اُلجھا ہوا تھا کہ کسے انتخاب کروں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد گلاب کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ اُس کا چہرہ کسی خاص غم سے پژمردہ ہوگیا تھا اور آنکھیں نم آلود تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے پھر چپ ہو جاتی ہے۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا

"گلاب!"

اُس نے اپنی نظریں زمین پر سے اٹھائیں اور میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں جن کی سیاہی میں دو سفید سفید موتی چمک رہے تھے اُس کے جذبات کی ترجمانی کر رہی تھیں۔ میں نے پھر کہا

"گلاب"

اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپالیا اور رونے لگی میرا بھی جی بھر آیا لیکن میں نے ضبط کیا اور اُسے سمجھانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ اتنے میں کسی کے اوپر چڑھنے کی آواز آئی۔ گلاب کے والد ڈیوٹی پر گئے ہوئے تھے اور کسی اور کے آنے کا وقت نہ تھا حیرت ہوئی کہ اس وقت کون آگیا اور صحن میں نکل آیا۔ دیکھا کشمش ہے۔ مجھے اُس کی آمد سے اُس وقت رنج ہوا۔ گلاب کسی نامعلوم غم میں رو رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اُس سے اُس کے رنج کی وجہ دریافت کروں اور یہ بات صرف تنہائی ہی میں پوچھی جاسکتی تھی۔ کشمش مجھے دیکھتے ہی بولی۔

"ظفر! پیارے ظفر۔" اُس کا خیال تھا کہ میں کمرے میں اکیلا ہی ہوں۔ میری شہادت کی انگلی خود بخود اٹھ کر میرے منہ کے قریب چلی گئی اور کشمش محجوب سی ہوگئی۔

گلاب کشمش کے آنے سے خاموش تو ہوگئی لیکن اس کے چہرے کے نقوش سے صاف ظاہر تھا کہ یہ پہلے سے دو چند غمگین ہے اور کشمش دوبارہ آنے پر پریشان تھی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ انہیں تفصیل کے ساتھ سارے واقعات بتادوں اور پھر دونوں سے رائے لوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے نہایت مشکل سے میں نے پہلے کشمش کے حالات بیان کئے پھر گلاب کے۔ دونوں نے غور و خوض سے میری باتیں سنیں۔ مگر دونوں غمگین تھیں اور اُداس۔

رات زیادہ جاچکی تھی اس لئے میں اور گلاب کشمش کو پہنچانے گئے وہاں سے آکر گلاب بھی اپنے یہاں چلی گئی اور میں تمام رات بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ کبھی کشمش آنکھوں کے سامنے آجاتی تھی کبھی گلاب اور کبھی دونوں۔

جیسا کہ تم میرے دوست ہو اور تمہیں ساری باتیں بھی معلوم ہیں۔ شاید تم مجھ سے بہتر رائے قائم کر سکو۔ بتاؤ ــــ پہلے خوب سوچ اور غور کرو، پھر بتاؤ کہ کون بہتر ہے۔

تیرھواں خط

تم بھی ایک فیصلہ نہ کر سکے۔ مجھے یہی توقع تھی۔ میری رائے معلوم کرنے کا تمہیں بہت اشتیاق ہے۔ سنو۔ پہلے میں نے بڑی کوشش کی کہ صرف ایک کو انتخاب کرلوں لیکن یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ دل قابو سے باہر تھا۔ اگر عقل کشمش کے حق میں رائے دیتی تھی تو یہ گلاب کے لئے تڑپتا تھا اور جب میں گلاب کو انتخاب کرنے لگتا تو کشمش کی خاطر مچلتا غرضکہ دل نے دو دن اور تین رات پریشان رکھا۔ آخر میں نے تیسرے دن کشمش سے پوچھا اُس نے کہا "گلاب سے شادی کر لیجئے۔ میرا کیا ہے میں تو آپ کی اور آپ کی وجہ سے گلاب کی خادمہ ہوں۔ عمر بھر دونوں کی خدمت کرتی رہوں گی" پھر میں نے گلاب سے دریافت کیا اس نے بھی یہی کہا کہ کشمش مجھ سے بہتر ہے اور میں تو آپ دونوں کی لونڈی بننا اپنی خوش قسمتی سمجھتی ہوں۔ لیکن ان دونوں کے جواب میں ایک نمایاں فرق تھا۔ کشمش کے لب و لہجے میں صدق تھا اور اخلاص اور گلاب کے لب و لہجے میں شکایت تھی اور طنز۔ جب میں نے دیکھا کہ میں دونوں میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑ سکتا تو مجبوراً یہ فیصلہ کیا کہ دونوں کو حبالۂ عقد میں لے لیا جائے لیکن اس کی دونوں نے تردید کی اور یہ رائے دی کہ قرعہ ڈالا جائے۔ لہذا میں نے شام کو انہیں اپنے یہاں چائے پر مدعو کیا اور چائے پینے کے بعد میں نے کاغذ کے دو پرزوں پر کشمش اور گلاب لکھا پھر دونوں پرزوں کی گولیاں بنا کر رشید سے کہا کہ ان میں سے ایک اٹھالو۔ اُس نے ایک گولی اُٹھالی۔ ہم تینوں بے تاب ہوگئے کہ جلدی کھول کر پڑھیں۔ گلاب نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کاغذ کھولا اور اپنا نام دیکھ کر شرما گئی لیکن اُس کی صورت پر خوشی کی ایک رو دوڑتی صاف نظر آرہی تھی۔ کشمش نے کاغذ کی دوسری گولی اٹھا کر کھولی۔ پھر ہنستے ہوئے گلاب کو بہترین خاوند ملنے پر مبارکباد دی اور دو ہزار روپے نقد دینے کا وعدہ کیا۔ مجھے پہلے تو خوشی ہوئی پھر رنج اور کشمش بظاہر مسرور تھی اور بباطن رنجیدہ۔

گلاب کے والد سے یہ قرار پایا ہے کہ فی الحال صرف نکاح کر لیا جائے اور پھر دو ایک مہینے میں وہ اپنے وطن جاکر باقاعدہ وداع کردیں گے

حیات یہ بات ہے بھی درست۔ نکاح ہونے کے بعد تو کوئی کچھ نہ کر سکے گا ورنہ والدہ اس شادی کی ہرگز اجازت نہ دیں گی۔

پرسوں بعد مغرب نکاح ہے۔ اگر تم شامل ہونا چاہو تو آجاؤ اور کسی شخص کو اس کی خبر نہ ہو۔

آخری خط

آپ کا پارسل ملا۔ سنہری انگوٹھیوں اور سہرے کا شکریہ قبول فرمائیے۔ انگشتری پر میرا اور اپنا نام دیکھ کر گلاب کو بڑی خوشی ہوئی۔ گو آپ کے تحفے دیر سے پہنچے لیکن اس میں آپ کی غلطی نہیں۔ میں نے اطلاع ہی بہت دیر سے دی تھی اور اس سے زیادہ جلدی آپ کیا کرتے۔ گلاب اپنے شوہر کے عزیز ناز جان دوست کو سلام کہتی ہے اور ملاقات کا شوق ظاہر کرتی ہے۔ حیات آپ نے دو انگوٹھیاں کیوں بھیجیں بس ایک ہی کافی تھی۔ فضول خرچی بہت بری ہے۔ جس انگوٹھی پر ہمارے نام کندہ ہیں ہم وہ رکھ لیں گے اور دوسری واپس کر دیں گے مگر ایک شرط ہے ـــــ

حیات اگر تم برا نہ مانو تو تمہیں ایک بہت اہم راز سے آگاہ کر دوں ایسے راز سے جس کے انکشاف کے بعد تم بہت جز بز ہو گے لیکن شکست ہو چکی ہے اب شرمندگی سے کچھ حاصل نہیں اور نہ کسی قسم کی تاویل سے تمہیں اپنی شکست کا اعتراف کرنا پڑے گا اور بغیر کسی دلیل کے۔ تمہاری تحریریں ـــــ طویل خطوط میرے پاس محفوظ ہیں جو تمہارے انکار کرنے پر ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ممکن تھا کہ ابھی اور اس راز کو ظاہر نہ کرتا لیکن صبح جو میں نے پرانی ڈائری دیکھی تو معلوم ہوا کہ اس واقعہ کو پورا ایک برس ہو چکا ہے جس نے مجھے یہ افسانہ لکھنے پر مجبور کیا اس کے علاوہ آج ہی حامد کا خط بھی آیا ہے اور قیوم کا بھی۔ وہ بھی لکھتے ہیں کہ اب بغیر کسی توقف کے آپ کو یہ راز بتا دیا جائے۔

راز یہ ہے کہ میں نے تمہیں کامل چھ مہینے بے وقوف بنائے رکھا اور تم بھی یہ تسلیم کرو گے کہ اس دراز عرصے میں ایک دن بھی تمہیں اپنی بے وقوفی کا احساس نہیں ہوا۔ وہ وقت یاد کرو جب تم نے یہ شیخی ماری تھی کہ تم میرے لکھے ہوئے فسانے پر کبھی یقین نہ کرو گے اور کبھی یہ نہ مانو گے کہ وہ فسانہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ یہ خطوط کیا ہیں ـــــ میرا لکھا ہوا افسانہ۔ اب سیدھے ہاتھ سے بیس روپے عبداللہ کو دے دو۔ تم شرط ہار چکے ہو اور اگر ابھی تمہیں یہ یقین ہو کہ جو کچھ میں لکھ چکا ہوں وہ درست ہے، حقیقت ہے تو پہلی گاڑی سے دہلی چلے آؤ اور یہاں آ کر مکان کا حدود اربعہ دیکھ لو اور چور دروازہ بھی۔ اختر تو ابھی ولایت ہی سے نہیں آیا اور محلہ میں جس شخص سے چاہو دریافت کر لو کہ میں چھ مہینے سے نیچے کے مکان میں رہتا ہوں جس کے برابر کا مکان بھی اتنے ہی عرصے سے خالی پڑا ہے اور اوپر کا بھی۔ دوسری طرف میدان ہے، سامنے سڑک ہے۔ حیات جب یہ شرط قرار پائی تھی میں نے اس دن تہیہ کر لیا تھا کہ ایسے وقت میں شکست دوں گا جب تم قطعی بھول چکے ہو گے۔ اس لئے چھ ماہ بعد یہ ذکر چھیڑا اور نصف برس تک تمہیں اس کا احساس نہ ہونے دیا۔ میں نے جتنے بھی خط تمہیں لکھے ان کی نقلیں برابر عبداللہ، قیوم، شفقت اور حامد کے پاس بھیجتا رہا کیونکہ یہی اصحاب اربعہ شرط کے گواہ ہیں۔ اب تم سمجھے کہ میں نینسل سے کیوں خط لکھا کرتا تھا۔

تم کہو گے کہ اس بات کو اتنا طول دینے کی کیا ضرورت تھی۔ دو ایک خطوں کے بعد ہی یہ مقصد حاصل ہو گیا تھا۔ درست ہے لیکن اس طرح افسانہ مکمل نہ ہوتا۔ ہاں البتہ کشمش کی جدائی کے ذکر کے بعد میرا ارادہ تھا کہ ظاہر کر دوں مگر حامد نہ مانا اس نے لکھا کہ ابھی دو ایک مہینے اور یہ دلچسپ کھیل کھیلتے رہیئے۔ اس کے بعد میں فلاں تاریخ کو شاہ آباد جاؤں گا تو ظاہر کرنا تاکہ میں ان سے مٹھائی کے روپے وصول کر سکوں۔ شاید وہ آج شاہ آباد پہنچ گیا ہو۔ تم اسے یہ خط کیوں دکھانے لگے۔ لیکن واضح ہو کہ میں اس کی نقل بھی اس کے پاس علیحدہ ارسال کر رہا ہوں۔

تمہیں تعجب ہو گا کہ تمہارا وہ خط جو تم نے کشمش کو لکھا تھا مجھے ہی ملا تھا ڈاکیہ مجھ سے پوچھنے لگا کہ آپ کے اوپر والے کمرے میں کوئی نیاز کی بیوی رہتی ہے میں نے کہا کیوں کیا بات ہے۔ اس نے مجھے لفافہ دکھایا میں نے تمہارا خط پہچان لیا اور اس سے لے کر رکھ لیا اور کہہ دیا کہ اس وقت وہ کہیں گئے ہوئے ہیں جب آئیں گے میں پہنچا دوں گا۔ جن جذبات کا تم نے اس خط میں اظہار کیا وہ واقعی قابل تعریف ہیں۔ اگر سچ مچ کوئی کشمش ہوتی اور تمہارا خط اسے مل جاتا تو تمہیں اور تمہارے دوست کو جی بھر کے کوستی اور گالیاں دیتی۔

حیات معاف کرنا لیکن اس میں میری کیا خطا۔ بیس روپے کی شرط اور تم اس کے ذمہ دار ہو۔ تمہاری ایک انگوٹھی اس شرط پر واپس کی جا سکتی ہے کہ تم "شرط" کے روپے خوشی سے دے دو اور اگر ذرا بھی حیل و حجت کی تو انگوٹھی سے روپے وصول کر لئے جائیں گے۔

ظفر واسطی

موت اور عشق

عشق نے موت کو، مگر کتنا حسیں بنا دیا
موت کی سرد رُوح میں سیلِ جنوں بہا دیا

ایک حیاتِ جاوداں موت میں ہے چھُپی ہوئی
ایک بہارِ بے خزاں موت میں ہے چھُپی ہوئی
روحِ نشاطِ قلب و جاں موت میں ہے چھُپی ہوئی

عشق کا سحر دیکھ کر موت نے مُسکرا دیا

موت نے عشق کو مگر کتنا بلند کر دیا
درد پرست دل دیا، زخم طلب جگر دیا

روح و رواں ہی موت ہی عشق کے شاہکار کی
موت نے بزم گرم کی عشق جنوں شعار کی
رُوح کی طاقتِ نہاں موت نے آشکار کی

عشق کی داستان میں سوزِ دوام بھر دیا

عدمؔ

اعجازِ بیاں

کاش اِک روز تو یوں رونقِ محفل ہوتا ۔۔۔ پاؤں رکھتا تو جہاں واں پہ مرا دل ہوتا

حُسن کامل تھا ترا، عشق بھی کامل ہوتا ۔۔۔ یعنی ہاتھوں میں مرے پردۂ محمل ہوتا

دلِ ساحل کو ہے ارمان کہ ہو جائے وہ بحر ۔۔۔ بحر کو ہے یہ تمنّا کہ وہ ساحل ہوتا

دل نہ زنہار نوا سنجِ شکایت ہوتا ۔۔۔ لطف بھی کچھ جو ترے جور میں شامل ہوتا

خوگرِ جور ہیں ہم جاں سے گزر ہی جاتے ۔۔۔ گر ستم چھوڑ کے تُو لطف پہ مائل ہوتا

کاش اس طرح سے یہ چاندنی راتیں کٹتیں ۔۔۔ کہ ہم آغوش مرے تُو لبِ ساحل ہوتا

ترے پہلو میں گزرتی مری اک ساعتِ عیش ۔۔۔ خوب ہوتا یہ مری عمر کا حاصل ہوتا

کس قدر یاس فزا شامِ اجل تھی اعجاز

کاش بالیں پہ مرے وہ مہِ کامل ہوتا

سعید احمد اعجاز

۳٦ ۲ ھ

قبر

۱۲ر جولائی ۱۸۸۲ء کو ڈھائی بجے رات کے قریب قبرستان کا محافظ، جو وہیں کونے کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا، باورچی خانے میں بندھے ہوئے کتے کی آواز سے چونک پڑا۔ وہ جلدی سے نیچے اترا کتا کسی چیز کی بو پا کر زور زور سے بھونک رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی لنگڑا مکان میں دبے پاؤں گھس آیا ہے۔ محافظ ون سینٹ احتیاط سے اپنی بندوق اٹھائے باہر نکلا۔ اس کا کتا باہر کو جانے والے ایک راستے کی طرف چل پڑا اور مادام ٹومائس کی قبر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

محافظ احتیاط سے ذرا آگے بڑھا۔ مدہم سی روشنی باہر کے دروازے پر نمودار ہو رہی تھی۔ وہ ایک قبر کے پتھر کے پیچھے جا چھپا۔ جہاں سے اس کی آنکھوں نے ایک نہایت ہی خوفناک فعل کا ارتکاب ہوتے دیکھا۔

ایک نوجوان تازہ دفن کی ہوئی ایک عورت کی قبر کا پتھر اٹھا کر اس کی لاش کو اوپر کھینچ رہا تھا۔ یہ ہیبت ناک منظر، مٹی کے ڈھیر پر پڑی ہوئی ایک چور لالٹین کی مدہم روشنی میں نظر آ رہا تھا۔

ون سینٹ ملزم پر جھپٹ پڑا اور جھٹ زمین پر گرا کر اس کے ہاتھ باندھ لئے اور پولیس سٹیشن میں لے گیا۔

ملزم کورٹیلی، شہر ہی کا ایک دولتمند وکیل تھا۔ جو نیک نامی کے باعث بہت مشہور تھا

مقدمے کی سماعت شروع ہوگئی۔ سرکاری وکیل نے وہ وحشتناک واقعہ دوبارہ لوگوں کے سامنے بیان کیا جس کا ملزم ارتکاب کر چکا تھا۔ حاضرین کا اشتیاق اور بڑھ گیا، اور وہ ہمہ تن گوش کارروائی کو سننے لگے۔

سارا مجمع ملزم کے مذموم فعل پر نفرت کا اظہار کر رہا تھا اور جونہی مجسٹریٹ اندر داخل ہوا "اسے موت کے گھاٹ اتار دو، اسے مار ڈالو" آوازیں بلند ہونے لگیں۔

مجسٹریٹ نے خفگی کے لہجے میں ملزم سے پوچھا "بتاؤ تمہارے پاس کیا جواب ہے؟"

کورٹیلی، ایک خوبصورت، دراز قد، سیاہ فام اور خوش رو نوجوان تھا، اس کی آنکھیں اس وقت بے خوف سی معلوم ہوتی تھیں۔ اس نے کسی وکیل کی امداد طلب نہ کی اور خود ہی اٹھا۔ اسے دیکھتے ہی ہجوم میں جنبش سی پیدا ہو گئی۔

اس نے نہایت دلیری اور جرات سے بھاری آواز میں، جو بتدریج تیز ہوتی چلی جاتی تھی، تقریر شروع کی:

"فاضل منصف، و دیگر حاضرین! مجھے بہت تھوڑا کہنا ہے۔ وہ عورت جس کی قبر میں نے کھودی تھی، میری ہی محبوبہ ہے۔ مجھے اس سے بے حد محبت تھی اور میرا صاف اور بے لوث دل اس کی محبت میں ہمیشہ سرشار رہتا تھا۔ یوں سمجھئے کہ مجھے گویا اس نے دیوانہ ہی بنا دیا تھا۔

اب سنئے:

جب پہلے پہل اس سے میری ملاقات ہوئی تو اسے دیکھتے ہی ایک عجیب سے جذبے نے مجھ پر قابو پا لیا۔ جو نہ تو کسی جرات کا نتیجہ تھا، اور نہ نگاہ اربیں سے پیدا شدہ کسی فوری الفت کا اثر تھا۔ وہ ایک مسرت انگیز رنگین جذبہ تھا جس کے اثر سے مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں کسی نیم گرم حمام میں ایک سرمدی کیف کے مزے لے رہا ہوں۔ اس کی حرکات نے فریفتہ اور اس کی آواز نے مجھے مسحور کر رکھا تھا۔ اس کے ہر انداز میں ایک کیف محسوس کرتا تھا — اور میرے دل میں یہ خواہش تھی کہ کاش اس سے پیشتر میں اس سے آشنا ہو چکا ہوتا اور اس سے پہلے اسے دیکھ لیا ہوتا۔

مجھے یوں معلوم ہوتا تھا گویا میری روح کا کچھ حصہ اس کے جسم میں سرائت کر گیا ہے۔ فی الحقیقت وہ میری روح کی التجا کا جواب تھی — وہی روح جو ہمیں عمر بھر فطرت سے ہمکنار ہونے کی دعوت دیتی رہتی ہے!

جب میں اس سے کچھ آشنا ہو گیا تو محض اس کی ملاقات کے خیال ہی سے میرے جذبات میں ارتعاش پیدا ہو جاتا تھا۔ اس کے ہاتھ کا خفیف سا لمس میرے لئے اتنی مسرت کا باعث ہوتا تھا جس سے قبل ازیں میں کبھی لطف اندوز نہ ہوا تھا — اس کا تبسم میری آنکھوں کو منور کر دیتا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں رقص کرتا کرتا زمین پر لوٹ رہا ہوں۔

کچھ عرصہ بعد وہ میری محبوبہ بن گئی۔

اس کے ہوتے ہوئے مجھے دنیا میں کسی چیز کی تمنا نہ تھی۔ ایک شام جب ہم ندی کے کنارے کنارے ٹہل رہے تھے، ہمیں بارش نے آلیا۔ اسے سردی لگ گئی۔ اگلے دن اس کے پھیپھڑے متورم ہو گئے اور آٹھ روز کے بعد وہ چل بسی۔ مایوسی کے ان آٹھ دنوں میں عقل اور فہم مجھ سے رخصت ہو چکے تھے۔

جب وہ مر گئی تو میں اتنی گہری مایوسی میں ڈوبا ہوا تھا کہ مجھے معلوم نہ ہوتا تھا کہ میں کیا کروں۔ بالآخر میں رونے لگا۔

تجہیز و تکفین کے دردناک منظر کو دیکھ کر میں انتہائی غم میں گھر گیا۔ جس سے میرے حواس بالکل ضائع ہو گئے۔

جب وہ مجھ سے رخصت ہو گئی اور زمین کے نیچے کہیں غائب ہو گئی تو یکایک میرے دل سے رنج و الم کے بادل چھٹ گئے۔ مگر میرا دماغ ذہنی تکالیف کی آماجگاہ بن گیا جو اس کی الفت کے مقابلے میں ہزار گنا زیادہ تھیں۔

پھر ایک اور خیال نے میرے دل پر قبضہ کر لیا، "کہ اب میں اسے کبھی دیکھ نہیں سکوں گا" اور اس خیال نے مجھے ایک عرصہ تک دیوانہ بنائے رکھا۔

ذرا غور کرو۔ ایک بے نظیر محبوب ہو۔ اس کی تم پرستش کرتے ہو۔ وہ اپنے آپ کو تمہارے حوالے کر دے اور تمہارے ساتھ وہ پُراسرار تعلق پیدا کرے جسے الفت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کی طلسم ریز نظر ـــ تمہیں دنیا کی پہنائیوں سے زیادہ وسیع اور زیادہ دلکش دکھائی دے ـــ جب وہ تم سے ہم کلام ہو تو اس کی آواز سے تمہارے دل میں مسرتوں کا ایک بے پایاں سمندر موجیں لینے لگے۔

اور یکایک وہ نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ ذرا غور کرو۔ نہ صرف تمہاری نظروں سے بلکہ دنیا کی نظروں سے وہ غائب ہو جائے۔ یعنی موت اسے اپنی آغوش میں لے لے . . . تمہیں معلوم ہے موت آہ موت سے کیا مراد ہے . . . تو وہ یکایک مر جائے اور اس کی روشن آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں اور وہ آواز، جس کے ساتھ دنیا کی کوئی آواز مشابہ نہیں، جو کبھی شیریں الفاظ ادا کیا کرتی تھی ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائے اور وہ چہرہ جس کے مانند کبھی کوئی چہرہ روئے زمین پر نمودار نہ ہوا ہو۔ اگر آنکھوں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو جائے تو کیا یہ انسان کو دیوانہ بنانے کے لئے کافی نہیں۔ ذرا سوچو تو!

وہ بیس سال زندہ رہی ـــ زیادہ نہیں ـــ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کہیں غائب ہو گئی۔ آہ وہ کبھی ہنسا کرتی تھی، کبھی محبت کیا کرتی تھی، کبھی اس کے دل میں خیالات کا ایک طوفان برپا تھا ـــ مگر اب یہ داستان ایک حکایتِ پارینہ ہو کر رہ گئی ہے۔ ہماری اور ان مکھیوں کی خلقت میں کوئی فرق نہیں، جو خزاں نمودار ہوتے ہی مر جاتی ہیں۔

میں اس خیال میں منہمک رہتا تھا کہ اس کا اتنا نوخیز، اتنا گرم، اتنا صاف، اتنا سپید اور اتنا خوب صورت جسم کس طرح مٹی میں مٹی ہو رہا ہو گا اور اس کی روح، اس کا دل، اس کا جسم اب کس عالم میں جا چھپے ہوں گے۔

کیا اب وہ پھر نظر نہیں آئے گی؟ کیا کبھی نہیں؟ کیا اس کے جسم کے عناصر ہمیشہ کے لئے منتشر ہو چکے ہیں؟ ـــ میرے دل پر ایسے خیالات مسلط رہتے تھے۔

[illegible] میں بیلچہ، لالٹین اور ہتھوڑا لے کر چل پڑا۔ قبرستان کی [illegible] اس جگہ پہنچا جہاں اس کی قبر تھی۔ میں نے صندوق [illegible] ایک۔ ایک تیز بدبو میرے نتھنوں میں پہنچی . . . آہ کبھی [illegible] تیرے پسویا کرتی تھی!!

[illegible] کر لالٹین ذرا آگے بڑھائی۔ اس کا چہرہ پتلا پڑ [illegible] [illegible] مخمور رہو [illegible] ہوسکی! مجھ پر خوف طاری ہو گیا مگر میں نے جرأت کر [illegible] پکڑ لئے تاکہ ذرا آگے ہو کر اسے اچھی طرح دیکھوں۔ تو یہ لحہ تھا جب [illegible] نے مجھے آدبوچا۔

اب تمہیں [illegible] ہے جیسا چاہو کرو۔

ہال میں سکوت طاری تھا۔ لوگ اس سے آگے بھی کچھ سننے کے مشتاق نظر آتے تھے تو عدالت معاملے پر غور کرنے کے لئے اٹھ بیٹھی۔ چند منٹوں کے بعد کارروائی پھر شروع ہو گئی۔ ملزم کے چہرے سے پریشانی کے آثار دور ہو چکے تھے۔ جج نے انصاف کے مطابق فیصلہ سنایا۔

عدالت نے بے گناہ قرار دے کر اُسے بری کر دیا۔ لوگ فیصلہ سنتے ہی تحسین و آفرین کے نعرے بلند کرنے لگے۔

(موپاساں)

طاہرہ دلاور ہاشمی بی اے

تجلّیات

صبا میں ہیں مستیاں اُسی کی، اُسی کا پھولوں میں رنگ و بُو ہے
وہی تو ہے رُوبرو تمہارے، اثؔر تمہیں کس کی جستجو ہے!

زمیں پہ ہے رنگِ لالہ و گل، فلک پہ ہے نورِ ماہ و انجم
ریاضِ ہستی میں جلوہ آرا جمال تیرا ہی ہو بہو ہے!

سرور سے گُل مہک رہے ہیں، فلک پہ تارے بہک رہے ہیں
زمین سے لے کے آسماں تک عجیب غوغائے ہاؤ ہو ہے۔

سحر کا عارض ہے یا شرابِ طہور کا ایک مست دریا
ہے ایک طوفان مستیوں کا کہ شام کی زلفِ مشکبو ہے۔

ہوائیں مسرور ہو گئی ہیں، فضائیں پُر نور ہو گئی ہیں
نگاہیں مخمور ہو گئی ہیں، عجیب طوفانِ رنگ و بُو ہے

ہوئے ہیں گلپوش کوہ و صحرا، ہوئے ہیں مدہوش دشت و دریا
بہار ہے گلستاں بدامن، بہار کے دوش پر سبُو ہے۔

بہار پیغام زندگی کا، بہار ہے جام زندگی کا
کہ ذرے ذرے میں پنہاں ہیں موجِ صہبائے آرزو ہے

شفق ہے یا ہے کسی عہدِ الفت کا کوئی بھولا ہوا فسانہ
عجیب سا خوابناک منظر مری نگاہوں کے روبرو ہے

اثؔر میں اک رندِ لم یزل ہوں، دوام ہے میری مستیوں کو
کہ حسن میں ہے شراب میری، ہر اک حسیں شئے مرا سبو ہے

اثر صہبائی

ناموں کی اہمیّت

علومِ عصریہ میں ناموں کے دو پہلو ہیں، لسانی اور نفسیاتی مغربی زبان دانوں نے لسانی پہلو پر کافی بحث و تمحیص کی ہے لیکن اردو میں علوم کی یہ شاخ تاحال تقریباً تشنۂ تعارف ہے اور نفسیاتی اہمیت پر اردو کا تو ذکر ہی کیا انگریزی اور مغربی زبانوں میں بھی بے حد کم توجہ دی گئی ہے۔ نفسیات کے ماہرین میں سے سٹیکل اور فلوگل نے ناموں کی نفسیاتی اہمیت کے متعلق چند نظریے قائم کئے ہیں۔ اور آج کی فرصت میں راقم کا مقصد اردو دنیا کو اردو ادب کے لحاظ سے ان نظریوں سے روشناس کرانا ہے۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ ناموں کا صرف ایک ہی کام ہے: نام ہونا یعنی مختلف اشیاء اور افراد کے لیبل لیکن عوام (اور خواص) کی اس کم علمی کے باوجود ناموں کی نفسیاتی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حواس خمسہ میں سے سُننے اور بولنے کی قوتوں کا ناموں کے ساتھ بہت سا تعلق ہے۔ اس کے علاوہ اجتماعِ خیالی یا تصور کا تسلسل بھی ناموں کی اہمیّت میں برسرِ کار ہوتا ہے یہ سمجھئے کہ ہلکے پھلکے لفظ۔ لفظوں کے نرم یا مختصر اجزا، آرام و آسائش، تن آسانی، نزاکت، نازکی ضعف وغیرہ کا خیال لائیں گے۔ بوجھل۔ موٹے صحیح مخرج سے ادا کئے ہوئے شین قاف نما الفاظ، شملہ بقدرِ علم کے مطابق الفربہ خواہ مخواہ اور وزنی اشیا یا افراد کا تصور پیش کریں گے۔ حروفِ ہجا پر غور کرنے سے ہی لسانی پہلو کی یہ دلچسپی ظاہر ہو سکتی ہے۔ کوئی حرف ہمیں کسی تپلی دبلی انسانی شخصیّت کے متوازی محسوس ہوتا ہے اور کوئی اس کے خلاف۔

ان باتوں کے بعد ہی ہماری نظروں میں ناموں کی ایک خاص حیثیت ہو جانا چاہیئے۔ غور کرنے سے ہمیں یہ بھی محسوس ہو سکتا ہے کہ ہماری حیاتِ ذہنی میں ناموں کا ایک خاص درجہ ہے بلکہ ممکن ہے کہ ہمارے چال چلن اور زندگی کی روش پر بھی ناموں نے کچھ اس قسم کا اثر کیا ہو جسے ہم اب تک نہ سمجھ سکے ہوں ناموں سے بے تعلق کوئی بھی نہیں۔ کوئی نام آپ کو اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن مجھے پسند ہی نہیں آتا کسی نام کو سُن کر آپ توجہ بھی نہیں کرتے لیکن مجھے وہی نام اپنی خارج از فہم مقناطیسیت سے گویا کھینچے لیتا ہے۔ اگر کسی فرصت کے وقت ہم اچھائی برائی یا پسند ناپسند کے لحاظ سے ناموں کا انتخاب و شمار کرنے لگیں تو اپنی ترجیحات اور جذباتی ردِّعمل کے حیران کُن انکشافات ہم پر ہوں گے۔ انھیں بے معنی ناموں سے متعلق ایسے لوازمات اور دلائل ہم پر ظاہر ہو جائیں گے جن سے پیشتر ناواقفیت تھی۔

مغرب کے مفکرّین نے اس بات کو بہت عرصے سے مان لیا ہے کہ افسانوں میں مصنّفین کرداروں کے جو نام پیش کرتے ہیں۔ وہ نام کردار کے چربے سے انفرادی طور پر خاص لگاؤ رکھتے ہیں۔ اور نقد و نظر سے دیکھا گیا ہے کہ کئی مصنّفوں میں مناسب ناموں کے انتخاب کی قابلیت خصوصاً موجود تھی۔ فرانسیسی ناول نگار امیلے زولا اس نظریے کا زبردست حامی تھا اس کا اعتقاد تھا کہ نام اپنے موسوم سے ایک پُر اسرار باہمی رشتہ اور مطابقت رکھتا ہے۔ ایک اور فرانسیسی محقق کے خیال میں ہر نام ایک خاص انداز کی انفرادی شخصیت کا تصور ذہن میں پیدا کرتا ہے اور جن کا بھی وہ نام ہو وہ سب کم و بیش اسی شخصیت کے مالک ہوتے ہیں (واضح رہے کہ "شخصیت" سے محقق کا منشا "جسمانی شخصیت" ہے) مثلاً بوجھل۔ کڑے چیت زور دے کر بولے جانے والے تشدیدی الفاظ والے نام سی ہوتے۔ بھاری بھرکم یا بھرے ہوئے یا گٹھے ہوئے یا مضبوط جسم کا اشارہ کرتے ہیں۔ اور چھوٹے سے نام دُبلے۔ پتلے۔ چھریرے تیلے شخص کا تصور لاتے ہیں۔

ناموں کی عمومی متعلقہ اہمیت کے باوجود کسی شخص اور اس کے نام کی شرح اور وضاحت کے انفرادی اختلافات بین ممکن ہیں متعلقہ اہمیت کا دارومدار ان باتوں پر ہے: قومیت، اسی نام کے اور لوگ لغوی اور سماجی متعلقات اور آواز کے لحاظ سے اثر اندازی۔ تجزیۂ نفسی کے ماہرین میں سٹیکل اوّلین شخص تھا جس نے اوروں کو اس طرف توجہ دلائی کہ ناموں کی غیر شعوری

اہمیت کا اثر ترکیب سیرت اور جذباتی اندازِ نظر پر ہوتا ہے۔ ناموں کا جو غیر شعوری اثر سیرت پر ہوتا ہے اس کی تین بڑی شاخیں ہوسکتی ہیں۔ (اور ممکن ہے کہ آیندہ تحقیقات اور شاخوں کو بھی دریافت کرسکے)۔

۱۔ سیرت اور چال چلن پر عام اثر۔

۲۔ پیشے اور کام کے انتخاب پر اثر۔

۳۔ محبوب کے انتخاب پر اثر۔

سیرت پر نام کا اثر عموماً کسی شخص کی عشقیہ یا جنسی زندگی میں ظاہر ہوسکتا ہے لیکن یہ بات بیشتر یاد رہنا چاہئے کہ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ نام اپنے معانی اور متعلقات سے سراسر مختلف اثر بھی کرتے ہیں یعنی جس کا نام ہوا سے اس نام اور اس کے متعلقات سے ایک نفرت یا چڑ سی ہوجاتی ہے اور وہ غیر شعوری طور پر بضد بے حد مختلف خصوصیات اپنے میں پیدا کرلیتا ہے۔ خواہ وہ خصوصیات اس کی اپنی ذات کے لئے مضر ہی کیوں نہ دکھائی دے رہی ہوں۔

نام کا جو اثر پیشے کے انتخاب پر ہوتا ہے وہ مسلّمہ ہے لیکن تحقیق و نتائج دوراز کار نہ ہوں اور مکمل ہوں۔ اس لئے اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ نام اور پیشے کا تعلق تقریباً بالکل نمایاں ہو، یا اتفاقیہ نہ ہو۔ یا آپ کو اس بات کا ذاتی علم ہو کہ نام نے یقیناً اثر اندازی کی ہے۔ یہ ممکن ہے۔ نام اکثر درجے اور مقدار دونوں کے لحاظ سے سیرت پر اثر انداز ہوں۔ یعنی وہ کسی فرد کی "خاص کشش" کو کم یا زیادہ کردیں۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس "خاص کشش" کو ایک راہِ مخصوص پر ڈال دیں۔ نام میں کسی قسم کے معنی ہوں وہ انفرادی رجحان کی نشو و نما اور رہنمائی اُن خصوصیات کی طرف کرتے ہیں جو بالآخر امتیاز کے حصول میں معاون ہوں اور جن کے نام محض امتیاز شخصیت کا مقصد حل کرتے ہیں اور کسی قسم کی اہمیت کے حامل نہیں انہیں یقیناً اس کار زار حیات کی مدافعت کے لئے ایک بہت بڑی خامی کا سامنا ہے۔

کئی بار ایسا ہوا ہے کہ نام کے لحاظ سے پیشے میں جو غیر شعوری دلکشی پیدا ہوجاتی ہے اس نے بہت سی دشواریوں پر قابو پالیا۔ خواہ نام کے معنی کا تعلق پیشے سے نمایاں نہ ہو۔ پھر بھی اکثر دلچسپی کے قائم کرنے میں نام نے اثر کیا ہے۔

جب ہم محبوب کے انتخاب پر نام کے اثر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ عام کے معنی کی نسبت ماحول کے متعلقات اور تخصیص زیادہ اہم ہیں۔ عیسائیوں میں مریم کو تقدیس و تبرک کا جو مرتبہ حاصل ہے۔ وہ قریب قریب ایک دیوی کے ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مریم کی ہستی اہم خلائق بھی ہے۔ اس حقیقت سے جنسی ممانعت (TABOO) کی شدید دلکشی قائم ہوجاتی ہے اور تعلقِ خاطر اس نام کی ہستی سے ہوجاتا ہے جو اس نام سے ملتا جلتا ہو اس کی ایک نہایت عمدہ مثال انگریزی کے شاعر بائرن کی شخصیت ہے اس کی زندگی میں بے شمار عورتوں کا دخل تھا جن کے نام عموماً مریم یا مریانہ تھے۔ ابھی اس کی عمر آٹھ برس کی ہی تھی کہ اس کا میلانِ طبع میری ڈف نام کی ایک عورت پر مرکوز ہوا۔ مریم نام سے بائرن کو جو والہانہ دلچسپی تھی اس کا ذکر عام طور پر اس نے اپنی نظموں میں کیا ہے۔ چنانچہ اپنی مشہور نظم "ڈان وان" میں لکھتا ہے:۔

"مریم کے نام کے لئے میرے دل میں ایک شدید جذبہ ہے
کیونکہ ایک زمانہ تھا جب یہ میرے لئے ایک جادو کی آواز تھی۔
اور اب بھی یہ اس سرزمین پرستان کا تصور لے آتی ہے۔
جہاں میں نے وہ باتیں دیکھیں جو عالمِ امکان میں نہ تھیں،
تمام احساس بدل جاتے ہیں لیکن یہ تاثر۔
ہمیشہ مختلف صورتوں میں آتا رہا۔
اور یہ ایک ایسا جادو ہے جس کے اثر سے آج بھی میں آزاد
نہیں ہوں"

اسی طرح ایک ہی نام کے تواتر کی مثال شیلے اور شلر کی زندگیاں بھی ہیں۔ شیلے کی زندگی میں ایک ہی نام تین بار آیا۔ ہیریٹ گروو ہیریٹ ویسٹ برک اور ہیریٹ بون ول۔ یوں ہی شلر کی حیاتِ جنسی میں بھی تین بار ایک ہی نام کی عورتوں نے اثر اندازی کی۔ شارلوٹ فان لینج فیلڈ۔ شارلوٹ فان کالب اور شارلوٹ فان ول زوجن۔ ابھی تک ان وجوہات کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے جو ہم کو بچوں کے نام مقرر کرنے پر اکساتی ہیں۔ اس سلسلے میں خاندانی رسم و رواج اہم ترین جزو ہیں۔ کئی بار یوں بھی ہوتا ہے کہ کسی بڑے آدمی کے نام پر بچے کا نام بھی وہی رکھا جاتا ہے۔ اور وہ بڑے آدمی بچے کے والدین کے خیالات و اعتقادات کے لحاظ سے قابلِ تعظیم ہوتے ہیں۔ اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہی عادات و خصائل اور خصوصیات بچے میں بھی راسخ ہوں۔ اس سلسلے میں ایک بے حد دلچسپ مثال سوئٹزرلینڈ کی حکومت کی ہے جس نے ایک بچے کا نام ٹراٹسکی رکھا جانا ممنوع قرار دیا۔ مبادا بچہ بڑا ہو کر انقلابی خیالات و تحریکات کا حامل ہو۔

چونکہ تا حال ناموں کے نفسیاتی پہلو کا علم نامکمل ہے۔ اس لئے

اس مختصر مقالے میں اس موضوع کے ہر پہلو پر وضاحت کے ساتھ غور کرنا ناممکن ہے۔ ہر شخص کو ان نظریات کے مطابق غور و فکر سے مثالیں سوجھ سکتی ہیں۔

اور اب اردو ادب کے متعلق بھی لگے ہاتھ دو چار باتیں کہہ دی جائیں۔

اردو ادب میں آغاز کے افسانوں میں مغل بیگمات کی بناوٹی زندگی کے اثر کے تحت نیز مصنفین کی شاعرانہ افتادِ طبع کی وجہ سے جو نام استعمال ہوئے وہ پُر تکلف اور نفسیاتی لحاظ سے کردار کی سیرت سے دور از کار ہوا کرتے تھے لیکن جب ناول نگاری مغربی اثرات کے ماتحت ترقی کرنے لگی تو ادائے موضوع و بیان میں انقلاب کے باوجود ناموں کے انتخاب میں ایک نئی قسم کا تکلف رہا یعنی ہیرو کا نام حامد، ہیروئن کا حامدہ، ہیرو کا نام راشد، ہیروئن کا راشدہ۔ سرشار کے نام سیرتوں کی خصوصیات کے لحاظ سے باموقع تھے۔ مثلاً خوجی۔ کھوجی یعنی کھوج لگانے والا متجسس اور اس کردار کی فطرت میں تھا کہ غیر معمولی تجسس کی وجہ سے عموماً دخل در معقولات کا موجب بن بیٹھتا۔ اس کے ساتھ ہی سرشار کی اپنی سیرت کا نمائندہ یعنی میاں آزاد۔ یہ صلح کل۔ مرنجاں مرنج اور دقیانوسی خیالات اور بھی تصورات سے فارغ کردار ہے۔

شرر چونکہ زیادہ تر تاریخی ناول لکھتے تھے۔ اس لئے ان ... نام ہر ملک کے مطابق ہونا زیادہ ضروری تھے۔ سیرت کے مطابق ہوں یا نہ ہوں۔ البتہ ہندوستان کے معاشرتی ناولوں میں جو نام استعمال کئے گئے ہیں وہ نفسیات کے لحاظ سے قابلِ غور ہو سکتے ہیں۔ اور ان میں ناموں کے نفسیاتی پہلو پر غور کیا گیا ہو یا نہ، یہ ضرور ہے کہ ان کے اختلاف سے ایک قدرتی پن اور معاشرتی اثر یقیناً پیدا ہو گیا ہے۔ محمد علی خاں کے تاریخی اور معاشرتی ناولوں کا بھی یہی حال ہے۔ راشد الخیری کے نام بھی نفسیاتی پہلو سے عاری ہیں۔ چونکہ ان کے کردار گہرے اور زور دار نہیں ہوتے محض المیہ واقعات کا بہاؤ دکھانے اور قائم رکھنے کے لئے لائے جاتے ہیں۔ اس لئے ان کے قریباً تمام ناول معاشرتی ناموں سے بھرے پڑے ہیں۔ مرزا رسوا کے ناولوں میں بھی نام معاشرت کے بے حد آئینہ دار ہیں لیکن چونکہ ان کے کردار گہرے اور زور دار ہوتے ہیں اس لئے ان کے معاشرتی لیبل ان سے ایک خاص تعلق رکھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں مرزا محمد سعید کی "یاسمین" میں غیر شعوری طور پر ایک دو نام نفسیاتی اہمیت رکھتے ہیں۔ یاسمین اور پھول چند سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ کردار غیر معمولی خصوصیات کے حامل ہوں گے۔ پریم چند نے ہمیشہ نفسیاتی پہلو کی بجائے معاشرتی پہلو کا زیادہ تر لحاظ رکھا ہے اور اختلافِ موضوع کے مطابق ان کے نام بھی کبھی اَن پڑھ دیہاتی اور کبھی پڑھے لکھے شہری کرداروں کا اظہار کرتے ہیں۔

حامد اور حامدہ قسم کے نام زیادہ تر بلکہ تمام تر عورت ناول نگاروں کی افتادِ ذہنیت تھے اور اس سلسلے میں والدہ افضال علی کے "گودڑ کے لال" نے اپنے زمانے کے ناولوں پر بے حد اثر کیا۔ لیکن شکر ہے کہ اب وہ زمانہ گزر گیا۔ اردو افسانوں کی موجودہ روش یہ ہے کہ ناموں کو معاشرت کے لحاظ سے رکھا جاتا ہے اور یہ طریقۂ کار دنیا کے تنوع کو افسانہ میں لے آنے کا مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اگرچہ جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے نفسیاتی پہلو پر نادر معدوم والی توجہ دی جاتی ہے۔ پھر بھی چونکہ انسانی افعال، انسانی نفسیات کے آئینہ دار ہیں۔ اس لئے ناموں کا معاشرت کے مطابق ہو جانا ہی اس بات کے لئے کافی ہے اور کرداروں کے نام خود بخود نفسیات کے مطابق ہو جاتے ہیں مثلاً شرر کے "آغا صادق کی شادی" میں آغا صادق۔ صاف گو۔ سچا۔ وعدے کا پکا اور اپنا کہا کر کے دکھانے والا ہے اور ننھی بیگم یعنی ہیروئن شرمیلی کمزور طبیعت اور بڑی بوڑھیوں کے اثر میں آجانے والی ہے۔ اور ہیرو ہیروئن کی ان خصوصیات کی بنا پر ہی پلاٹ کی باقاعدگی کا دارومدار ہے +

"میراجی"

شعر

مجھے دل کی خطا پر یاسؔ شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

یاسؔ یگانہ لکھنوی

ذوقِ محبّت کی خامی

۱۹۳۷

بادۂ سہ آتشہ

(ذیل کا ترجمہ جو مَیں نے اپنے عزیز دوست اختر اسلام احسن بی۔ ایس سی، ایل ایل۔ بی کی فرمایش سے کیا ہے۔ انھیں کے نام سے معنون کرتا ہوں۔)

(ح۔ ہ)

(۱)
فارسی

"چو نبوَد عشقِ عاشق را کمالے — نہ بند جُز مُرادِ خود خیالے
طفیلِ خویش خواہد یارِ خود را — بکامِ خویش سازد کارِ خود را
بوئے یک گُل از بستانِ معشوق — زند صد خارِ غم بر جانِ معشوق"

(مُلّا جامیؒ در "یوسف و زلیخا" ۱۴۸۴ء)

(۲)
انگریزی

When love is not perfect, with one sole thought —
Himself — is the heart of the lover fraught.
He looks on his love as a charming toy,
The spring and source of his selfish joy.
One rose he would pluck from his love, and leave
A hundred thorns her lorn heart to grieve.

R.T.H. Griffith. (18881).

(۳)
اُردو

خامیٔ ذوقِ محبّت نے جہاں میں اکثر — حُسن کو رنج و مصیبت میں گرفتار کیا
جذبۂ شوق کی تسکین کا ساماں چاہا — اُن سے جب پیار کیا اپنے لئے پیار کیا
"عشقِ خود کام" نے اک لمحۂ عشرت کے لئے — "حُسنِ معصوم" کو آزردہ و بیزار کیا
چمنِ ناز سے اک گُل کی تمنا میں حفیظؔ — دلِ محبوب کو محنت کشِ صد خار کیا

(حفیظ ہوشیارپوری ایم۔ اے ۔ ۱۹۳۷ء)

زلزلہ

زلزلے کو گزرے صرف دو دن ہوئے تھے ، مگر اس قلیل عرصے میں سالہا سال کی زندگی ۔ کے جانکاہ مناظر اور دلخراش اثرات کے ہجوم نے گزرے وقت ، کے احساس کو معطل کر دیا تھا جس طرح چند لمحوں کی نیند میں انسان کئی سال کی زندگی کو طے کر جاتا ہے اسی طرح اس بیداری کے خواب میں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس قیامت خیز حادثے کو کئی برس گزر چکے ہوں ۔

میں اُن چند خوش قسمت یا بد قسمت اشخاص میں سے تھا جن کو ابھی کچھ اور دنوں کی مہلت دی گئی ۔

جدھر نظر اُٹھتی تھی صرف گرد و غبار دکھائی دیتا جو نہایت بے ترتیبی اور بے پروائی سے جھومتا ہوا ادھر سے اُدھر نکل جاتا یا چند بگولے جو اٹھکیلیاں کرتے ہوئے آس پاس کے سبز درختوں میں چھپ جاتے ۔ کوئٹے کے شاداب اور خوبصورت شہر کی کائنات چند دبی ہوئی ، خاموش آہیں رہ گئیں . . .

ایک پر اسرار سکون تھا ۔ گویا تقدیر سانس لے رہی تھی ۔

رنج و غم کا اظہار ، آہ و بکا ، چیخ پکار حادثات کی نوعیت اور گرد و پیش کے حالات سے اضافیت رکھتا ہے اس لئے جب رنج و غم کی صدائے بازگشت کی امید نہ ہو تو سوائے خاموشی کے جو اپنی آپ آواز ہے ذریعہ اظہار نہیں ہوتا کچھ لوگ جو چلتے پھرتے نظر آتے تھے اُن کے چہرے اور آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں ۔ تقدیر ہنس رہی تھی ۔ " رو تو ، بھلا کس کس کو روتے ہو ؟ "

میرے جذبات اور احساسات پر جمود کا عالم طاری تھا . . .

محبت ، ہمدردی ، غم ایک حرفِ غلط تھا جس کو مٹا دیا گیا تھا ۔

معاً خیال آیا اور انڈین ملٹری ہسپتال کی طرف چل دیا ۔ یہ ہسپتال زلزلے کے زخمیوں کے لئے مخصوص کیا گیا تھا ۔ مجھے یقین تھا کہ وہاں کوئی نہ کوئی واقف یا دوست مل جائے گا ۔ باتیں کریں گے اور ممکن ہے کہ ضائع شدہ احساسات عود کر آئیں ۔ شہر سے ہسپتال کا فاصلہ دو میل سے زیادہ نہیں مگر اس کو طے کرنے میں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی دوسری دنیا میں انتقال کیا ہو ۔ شہر کی گزشتہ عظمت ، قابلِ رشک سوسائٹی ، ایک پریشان خواب کی طرح دماغ میں گھوم رہے تھے ۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ان ذہنی اشکال کو ایک لمحے کے لئے قائم کر لوں مگر بے سود ۔ اسی بے معنی کشمکش میں ہسپتال کے قریب پہنچ گیا ۔

ہسپتال کیا تھا ، ایک وسیع میدان میں خیمے نصب تھے ۔ جہاں کراہنے والے بے کسی اور بے چارگی کی حالت میں پڑے ہوئے تھے ۔ میرے لئے یہ نظارہ ناقابلِ برداشت ہو رہا تھا ۔ خون سے لتھڑے ہوئے جسم ۔ رحم کی ملتجی آنکھیں ، ناامیدی اور افسردگی کی زندہ تصویریں تھیں ۔ عورتیں ، بچے ، بوڑھے جوان بغیر کسی جنسی یا سوشل امتیاز کے وقت کے طویل لمحوں کو گن گن کر گزار رہے تھے رشاید اب میں تیسرے خیمے میں سے ہو کر واپس لوٹنے کو تھا کہ ایک نحیف سی آواز آئی " پانی ! "

میں نے بغیر دیکھے ایک کٹورے میں پانی ڈالا اور زخمی کو پیش کیا ۔ پانی مانگنے والا ایک نوجوان تھا جس کے سر اور رخساروں پر پٹی کچھ اس طرح سے بندھی ہوئی تھی کہ اس کے ہونٹ اور ایک آنکھ کے سوائے اس کے چہرے کا اور کوئی حصہ دکھائی نہ دیتا تھا ۔ دو گھونٹ پانی پینے کے بعد مریض نے اوپر نگاہ اٹھائی اور میری طرف ایک لمحے کے لئے دیکھا ۔ کٹورا میں نے اس کے ہاتھ سے لے لیا اور چلنے کو تھا کہ اُس نے میری آستین کو پکڑ کر بیٹھنے کا اشارہ کیا ۔ بغیر کسی حیل و حجت کے میں اُس کے سامنے بیٹھ گیا کچھ دیر خاموشی رہی پھر زخمی نے آہستہ سے اپنے زرد ہونٹوں کو جنبش دی " کیسے رہے آپ ؟ " اور ساتھ ہی ایک ہلکی سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی ۔

" او ہو ! زبیندر ، تم ہو " حیرانی کی کوئی بات نہ تھی مگر میرے دل کو ایک ٹھیس سی لگی ۔

زبیندر دو سال پہلے کوئٹہ میں آیا تھا ۔ سول دفتر میں کام کرتا تھا چوبیس پچیس برس کی عمر تھی ۔ خوبصورت اور خلیق نوجوان تھا ۔ شب بیتی گفتار اور حسنِ سلوک کے باعث ہماری کلب کا ہر دلعزیز ممبر تھا ۔ مجھے کئی بار اس کی معیت میں سینما جانے کا اتفاق ہوا اور میں نے ہمیشہ اس کو ایک سنجیدہ اور بامذاق انسان پایا ۔ ہاکی اور ٹینس سے اس کو خاص لگاؤ تھا ۔

ہمارے تعلقات کچھ خاص طور پر گہرے نہ تھے مگر موجودہ حالات

میں تو کسی محض صورت آشنا کو دیکھ کر آنسو بھر آنا کچھ عجیب نہ تھا اور ایک اپنی کلب کے ممبر کو دیکھ کر اور اس حالت میں دیکھ کر میرے خوابیدہ جذبات بیدار ہونے شروع ہوئے مگر نریندر کی کمزور حالت کو مدنظر رکھ کر میں نے ضبط سے کام لیا۔ وہ مجھ کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

نریندر بابو محلے میں رہتا تھا، وہ تنہا تھا۔ ابھی اُس کی شادی نہ ہوئی تھی۔ اسی لئے بیوی بچوں کی خیریت کے متعلق رواجی گفتگو کی ضرورت ہی نہ تھی۔

"اور کیا حال ہے؟" پھر اس نے کہا۔ اُس کی آواز پہلے سے زیادہ صاف اور بلند تھی۔ میں خاموش تھا کہ اس کو کیا جواب دوں، حال! کس کا حال! کھنڈرات کا حال . . . یا اُن دوستوں کا جو لاکھوں من مٹی کے نیچے دبے پڑے تھے!

"اچھا ہے"۔ خیمے کی چھت کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔

"کہیں رام لعل کو دیکھا! مجھے اُس کا کئی بار خیال آیا ہے"۔

اب میں کیا کہتا، کہ رام لعل نے بہنوں کا ساتھ دیا ہے اور اُس کی نوجوان بیوہ جس کو صرف چند دن پہلے کوئٹہ لایا تھا۔ اُس کے پاس کے خیمے میں دست و پا شکستہ سسک رہی ہے۔ مجھے اتنا ضرور معلوم تھا۔ مگر کہتا کون۔

"دیکھا نہیں۔ ہوگا کہیں . . ." میرے دماغ میں ایک جلن سی پیدا ہو رہی تھی۔ میں نے فطری طور پر بات ٹالنے کے لئے کہا . . "تمہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔ کیا میں تمہارے لئے کچھ کر سکتا ہوں؟"

"میرے لئے! میرے لئے اور کیا کرو گے۔ یہی بہت ہے کہ تم آگئے۔ مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے۔ آہ۔ اگر تم چپکے سے چلے جاتے . . ."

"نریندر۔ اچھا ہوا تمہاری ابھی شادی نہ ہوئی تھی۔ ورنہ تمہیں کس قدر زیادہ تکلیف ہوتی . . . تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے . . ." تسلی دیتے ہوئے میں نے کہا۔ مگر مجھ کو اپنے الفاظ بے معنی معلوم ہو رہے تھے۔

"موہن!" اُس نے میری توجہ اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "اگر زلزلہ نہ آتا تو آج کے دن میں اور . . . ہائے میں اور میری بیوی شاید بمبئی کی سیر کر رہے ہوتے . . . اگر میں نے اب تک شادی نہیں کی تو اس میں میری دوربینی کو کوئی دخل نہیں . . . یہ سب تقدیر کا کھیل ہے۔ اچھا یا بُرا یہ الفاظ ہمارے محدود خیالات کا ترجمہ ہیں۔"

"تم اور تمہاری بیوی"! تعجب سے میں نے استفسار کیا لیکن گزشتہ دو دنوں میں اتنے اور ایسے ایسے واقعات نظر سے گزر چکے تھے کہ کسی بات پر تعجب کرنا فضول تھا۔

بجائے میرے سوال کا جواب دینے کے اُس نے ذرا لمبی سانس لی اور خاموش ہو گیا۔ اُس کی آنکھ سے اس کی اندرونی کشمکش اور کرب کا اظہار ہو رہا تھا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اُس نے اپنے سر کو ذرا سرہانے پر بلند کیا اور نہایت سکون سے کہنا شروع کیا۔

"موہن! مجھے معلوم نہیں کہ کسی اور صورت آشنا کو دیکھنا نصیب ہوتا ہے یا نہیں، اس لئے میں تم سے چند آخری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اگر ممکن ہو سکے تو نرملا سے کہہ دینا۔ جو کچھ کہ تم دیکھ رہے ہو۔ خدا جانے وہ بے چاری ہے بھی کہ نہیں . . . بہرحال میری قسمت تمہیں یہاں کھینچ کر لے آئی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اپنی داستانِ غم تم سے کہہ ڈالوں"

ایک منٹ کے لئے نریندر خاموش ہو گیا۔ پھر بولا۔

"رائے صاحب رامیش چندر کا مکان تو تم نے دیکھا ہوگا . . . وہی نا۔ جہاں اُس روز کھڑا تھا . . . جب تمہاری ہیٹ ہوا سے اُڑ کر دور جا گری تھی اور میرے قہقہہ لگانے پر تم کچھ کھسیانے اور کچھ ناراض ہو گئے تھے"۔

مجھ کو یہ واقعہ کیسے بھول سکتا ہے، ساری گلی کے بچے مجھے اب بھی ہنستے ہوئے نظر آتے تھے اور اس پر نریندر کا بلند اور بے اختیار قہقہہ میں نے سر کے اشارے سے بتایا کہ مجھے سب کچھ یاد ہے اور اس دلچسپ واقعہ کو یاد کرتے ہوئے میں خفیف سی ہنسی کو ضبط نہ کر سکا۔

"ہاں تو وہی مکان ہے . . . بہرحال تھا . . . وہی جگہ تھی اور دفتر جاتے وقت میں اسی راستے سے گزرا کرتا تھا اور اس میں کوئی خاص امر قابلِ ذکر نہیں۔ میں عموماً پیدل جاتا تھا اور یہ راستہ ذرا نزدیک پڑتا تھا"۔ میں نے سر جھکا کر اُس کے قریب کر دیا۔

"اس واقعے کو آج دس مہینے ہوتے ہیں . . . میرے دماغ میں وہ دن کتنا تازہ ہے . . . ہاں دس مہینے ہوتے ہیں کہ نرملا کا بڑا بھائی جو کالج میں میرا ہم جماعت رہ چکا تھا گرمیوں کے دن گزارنے کوئٹہ آیا اور ایک دن مجھے سہ پہر کی چائے پر مدعو کیا۔ اس دن نرملا کو پہلی بار دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں اور ہماری اہمیت ایک بے حس کھلونے سے زیادہ نہیں . . . میری تقدیر میں یہی تھا۔

اور مجھے معلوم نہیں کہ نرملا کی محبت کا بیج میرے دل میں کس طرح بو دیا گیا۔ مجھے اپنی زندگی میں اپنی ہم عمر لڑکیوں سے زیادہ میل جول کا موقع

نہیں ملا اور کبھی یہ بات میرے دماغ میں نہ آئی تھی کہ میں بھی کسی سے محبت کروں گا۔ میں اپنے آپ کو ہمیشہ اس بے اختیار جذبے کے ناقابل خیال کرتا رہا۔ مگر یہی تو قدرت کی ستم ظریفی ہے۔ اُسی گلی میں سے اب بھی گزرتا جہاں سے اس سے قبل سیکڑوں مرتبہ گزرا تھا مگر جب نرملا کا گھر قریب آتا تو اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز میرے کانوں کو سنائی دینے لگتی اور میرے قدموں میں بے قاعدگی پیدا ہو جاتی۔ دونوں وقت نرملا دروازے پر کھڑی ہوتی۔ میں بغیر ادھر اُدھر دیکھے سیدھا گلی کے آخر تک چلا جاتا اور یہ دوری مجھ میں کچھ جرأت پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتی۔ گلی سے مڑتے وقت میں بے اختیار پیچھے لوٹ کر دیکھتا۔ صرف ایک نہایت مختصر لمحہ کے لئے اور نرملا جھینپ کر اندر ہو جاتی۔ اور میں دفتر جا پہنچتا۔ وہ ہر روز صبح اور شام میری منتظر رہتی۔ رفتہ رفتہ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالنا شروع کی۔ اُس کا حسن روز بروز بڑھتا ہوا نظر آتا۔ اب میں نظر بھر کر اس کو دیکھتا اور وہ مسکرا کر نگاہ نیچی کر لیتی۔

”دن ایک خواب کی مانند گزر رہے تھے۔ ایک خواب تھا۔ مگر ہماری زندگی اپنی بے حجاب حقیقتوں کے باوجود اتنی شیریں اور دیرپا نہیں۔ کاش کہ ہماری زندگی ایسے ہی ایک آدھ خواب پر مشتمل ہوتی۔ یہ نام نہاد حقیقی زندگی ہی ہماری دشمن ہے۔

”نرملا کو صبح و شام دیکھنا میری زندگی کا اہم ترین حصہ تھا۔ اگر کسی دن کسی وجہ سے وہ نظر نہ آتی تو میرے لئے اپنے فرائض منصبی کو انجام دینا دوبھر ہو جاتا۔ دن رات میری ذہنی فضا ایک خواب میں مستور رہتی اور یہ خواب نرملا کے معصوم حسن کی نیرنگیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ اس ذہنی تگ و دو کا نتیجہ کچھ نہ ہوگا۔ میں نے کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے غور [illegible] آخر یہی سوچا کہ نرملا سے

ملاقات اور بات

جاتا تھا۔ بات کر

وقت مجھے نرملا

الفاظ میں ڈھالنے

اور آخر کار میں ایک

ان فقروں کو خوب

انتظار تھا۔

”نرملا کے بھائی کی رخصتیں ختم ہونے کو تھیں۔ ایک دن اتفاق سے بازار میں اُس سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے شام کے کھانے پر اس کو بلایا اور اُس نے نہایت بے تکلفی سے آنے کا وعدہ کیا۔ کھانے پر ادھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ جاتے وقت اُس نے مجھ کو دوسرے روز شام کی چائے پر بلایا۔ مجھے اس سے بڑھ کر اور کیا چاہئے تھا۔ مگر میں نے کچھ انکار کیا مگر اُس کے اصرار پر مان گیا اور اب دوسرے دن کے انتظار میں بے قرار تھا۔

”میں نے اپنی تیار کردہ تقریر کو ذہنی طور پر دہرانا شروع کیا۔ سوچا اور پھر سوچا۔ پہلے یہ کہوں گا۔ پھر اس طرح سے تمہید . . . الغرض اپنی تصورات میں ڈوب کر رات کاٹ دی۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ نرملا کو میری آمد کی خبر دی گئی ہو گی۔ مگر باوجود ہر طرح کے دلائل کے یقین نہ تھا کہ وہ مجھے گفتگو کا موقع دے گی۔ میں اس موقعے سے فائدہ اٹھانے کے لئے کس قدر بے قرار تھا . . . ساڑھے چار بجے چائے کا وقت مقرر تھا۔ مگر میں اضطرار کی حالت میں تین بجے ہی روانہ ہو گیا۔ پہلے آ جانے کا بہانہ ایک آدھ بن ہی سکتا تھا۔ گھڑیوں کے وقت کا اختلاف . . . یا چابی دینا بھول جانا . . . وغیرہ وغیرہ محض اپنے دل کو فریب دینا تھا اور یہ کچھ مشکل بات نہیں۔

”دروازے پر جا کر میں نے دستک دی . . . میری مشکلیں کس قدر جلد آسان ہو رہی تھیں۔ میں اپنی خوش قسمتی پر نازاں نہ تھا، گھبرا رہا تھا۔ دنیا کے ہنگاموں میں کتنی رونق نظر آ رہی تھی۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ کسی مہم میں ابتدائی کامیابی خواہ وہ کتنی ہی بے حقیقت کیوں نہ ہو ایک شگون [illegible] کے خوش کن تاثرات کی رو ہمارے [illegible]

قدر جلد آجانے پر افسوس تھا۔ لوٹنا چاہتا تھا کہ بیٹھک کا دروازہ کھلا:۔

"آپ اندر آجایئے . . . بھائی صاحب نوکر کو ساتھ لے کر ذرا بازار گئے ہیں۔" شرماتے ہوئے نرملا نے کہا۔ ان الفاظ کی شیرینی صرف محسوس ہو سکتی ہے، بیان نہیں ہو سکتی۔ ابھی تک اُس کے یہ الفاظ میرے کانوں میں گونجتے ہیں۔ ہماری محبت کی تمہید کتنی شیریں تھی۔ خاموشی سے اندر داخل ہوا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا مگر مجھے اپنے ہوش و حواس پر قابو نہ تھا۔ بغیر کسی آئینے کی مدد کے میری پریشانی مجھے اپنے چہرے پر عیاں نظر آ رہی تھی۔

"نرملا میری طرف دیکھ رہی تھی اور میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ نرملا سے گفتگو کرنا میں نے کس قدر آسان جانا تھا۔

"نرملا نے میری پریشانی کو دیکھا اور مسکرا کر ساڑھی کے دامن کو مروڑتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

"نرملا آئی اور چلی گئی۔ میں مبہوت بیٹھا خواب دیکھ رہا تھا۔ اُس کے چلے جانے کے بعد پھر میں نے اپنے آپ میں کچھ سکت محسوس کی۔ اپنی محبت کی پہلی 'تقریر' کو دہرانا شروع کیا مگر الفاظ بے ربط اور بے ترتیب معلوم ہونے لگے اور الفاظ کے 'مناسب' معانی جن پر میں نے کئی دن صرف کئے تھے معنی سے مبرا معلوم ہو رہے تھے۔ ایک لمحے کے لئے مجھے سب کچھ بھول گیا۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا میرے حواس بجا ہونے لگے۔ میں نے جیب سے گھڑی نکالی۔ ابھی سوا تین بجے تھے گھڑی کو ایک گھنٹہ آگے کر دینے سے کچھ سکون ہوا۔ اب جلد آجانے کا بہانہ بالکل تیار تھا۔

نرملا پھر اندر آئی۔ . . .

نہ تھی۔ یہ شاید ملاقات کا آخری موقعہ ہو۔ میں نے دل میں خیال کیا اور بغیر کسی تمہید کے میں اپنے جذبات کے اظہار کی کوشش کرنا چاہتا تھا مگر الفاظ نہ ملتے تھے۔ معلوم نہیں میری رٹی ہوئی تقریر کیا ہوئی۔ میرے دماغ پر کچھ اور ہی باتیں مسلط تھیں۔

"میں ماتاجی کو بتانے گئی تھی کہ آپ آگئے ہیں . . . ماتاجی کی طبیعت کل سے کچھ ناساز ہے۔"

"اور خیریت ہے۔" میں نے رکتے ہوئے پوچھا اور میرا بدن کانپنے لگا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں نے کسی عورت سے ان حالات میں بات کی ہو۔

"آپ اتنے گھبرا کیوں رہے ہیں . . . آرام سے بیٹھیں۔ . . . بھیا ابھی آجائیں گے۔ وہ آپ کی بہت تعریف کیا کرتے ہیں . . . آپ ذرا سکون سے بیٹھیں . . ."

"میں نے اب پہلی بار دیکھا کہ میں کرسی کی سیٹ کے ایک کنارے پر اٹکا ہوا ہوں۔ مجھے اپنی بدحواسی پر بہت ندامت ہوئی۔ نرملا کی آنکھوں میں شرارت آمیز تبسم تھا اور چہرے پر سرخی دوڑ رہی تھی بات کو ٹالنے کے لئے میں نے یوں ہی کچھ زیر لب کہنا شروع کیا۔ مجھے الفاظ ملنے مشکل ہو گئے . . . اگر میری جرأت اور میرے منصوبوں پر ہی ہماری بات کا انحصار ہوتا تو بات ختم تھی۔ مگر اُف۔ نرملا کتنی حواس کی مالک تھی۔ مجھ کو اس کے یہ الفاظ کبھی نہ بھولیں گے "کیا آپ نے مجھے پہلی بار دیکھا ہے کہ آپ ایک اجنبی کی طرح گھبرا رہے ہیں۔" کاش میں اجنبی ہوتا۔ اجنبی کو گھبرانے کی کیا ضرورت؟ میرا اجنبی نہ ہونا ہی تو میری مشکل تھی۔ البتہ نرملا کی آزادانہ طرز گفتگو نے مجھے جرأت دلائی اور میں نے پُراسرار طریقے سے سر کو جھکاتے ہوئے کہا۔ "میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں"

ں نے شرماتے

ں کچھ حواس میں۔

کیا۔ . . .

صاف طور پر پوچھ

ت ہے بے انتہا

قادر نہ تھی۔

میں نے اپنی جیب سے

"نرملا کا بھائی چند دنوں کے بعد رخصت ہو گیا اور میں ا
مقرر ہوا۔ اس بات کی تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں کہ یہ
کس طرح طے کیا۔ مگر اس سراپا فریب دنیا میں اگر کوئی ا
ہو سکتی ہے تو یہ یقینی امر ہے کہ میں اتالیق مقرر ہو گیا
خواہ یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہوں . . . مجھے
پر شک گزرنے لگتا ہے۔
"یہ میری زندگی کی بہار تھی . . . اُف
چند سیکنڈ کے لئے نریندر خاموش
کرتے ہوئے میں نے چند گھونٹ پانی پیئے
نے زیادہ صاف اور بلند آواز میں کہ
"نرملا جوان تھی۔ خوبصورت
سینا پرونا حسب دستور جانتی تھی
کا کاروبار کرتا تھا اس لئے یہ کو
بہادروں اور رائے صاحبوں
اُن حالات میں نرملا
لڑکی، کے ماسٹر کی حقیر سی شک
پسندی کی انتہا دیکھ کر میں ا
خیال کرتا تھا، اور کسی کو
اور اس کی محبت کا خیا
"رائے صاح
ایک دن مجھ سے بیا
کیا گیا ہے۔ یہ میر
"لیکن میں ا
جائیں گے۔ معلوم نہ
برا بھی خیال نہ کیا او
"آخر کار نر
"صرف د
انتہائی غور و فکر کے
کے ساتھ نرملا کا نام
رام لعل نے
سجھائی نہیں دیتا تو

،دیں . . . یہ ہماری بزدلی . . . ہے۔ اخلاقی
."میں نے زملا کو اپنے فوری خیالات سے مطلع کر دیا۔
،اور اُس کی بیوی نے بھی ہم سے اتفاق کیا اور اگر
اور رزملا . . ."

مجھ اس طرح سے رُک گئی جس طرح تھکا ماندہ
،بار گی بے حس و حرکت گر پڑتا ہے۔
شاید کمزوری کی وجہ سے وہ خاموش ہو گیا

کہا،

ہو گئے . . ."
یا۔ میں نے آگے سڑک کراس کے
کے ساتھ معلوم نہیں کہاں پہنچ

نظر رکھ کر شہر کو پبلک کی آمدو
کے کھنڈروں کو دیکھنے جب
،پاس سے گزرا۔ رائے
ذرا نمایاں تھا۔ ایک لمحے
،والا امکان ہے اور کھڑکی
لے نوجوان کی طرف
اسے بے خبر ہیں۔
سامنے سڑک پر
آواز میرے کانوں
نڈروں کے غبر

فانی

رومال نکالتے ہوئے کہا

"ہاں، مگر یہ تو آپ کو پہلے سے معلوم ہے . . . آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں"۔

"یہی نا کہ پھر وہ چلے جائیں گے"۔

"مجھے جب کبھی یہ گفتگو یاد آتی ہے تو اپنے بے ربط الفاظ اور معانی پر کبھی شرم سی محسوس کرتا ہوں کبھی مسرت۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ جو گفتگو دو محبت سے لبریز دلوں کے درمیان ہوتی ہے وہ اس قدر مضحکہ خیز طور پر بے ربط ہوتی ہے کہ تھیئٹر وغیرہ کے مسخروں کے پارٹ اُس کے سامنے ہیچ دکھائی دیتے ہیں اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ اس بے ربطی کو محسوس نہیں کیا جا سکتا اور دونوں طرف نہایت سنجیدگی سے ہضم ہو جاتی ہے۔

"اب میں پھر خاموش تھا اور چاہتا تھا کہ جابیر کا نعرہ لگا کر سب کچھ کہہ ڈالوں مگر سوائے اس کے کچھ نہ کر سکا کہ جیب سے گھڑی نکال کر بغیر کسی مطلب کے اُس کے مطالعے میں مصروف ہو جاؤں۔

"ساڑھے چار بج گئے ہیں" میں نے اپنے آپ سے کہا مگر میرے الفاظ زرملا نے سن لئے تھے۔ "ساڑھے چار! یہ کیسے! آپ کی گھڑی اور ہماری کلاک کا وقت تقریباً ایک برابر ہوتا ہے۔ کم از کم دس اور چار بجے کے قریب . . . "

اب میں نے اس موضوع پر گفتگو کرنا زیادہ آسان جانا۔ خیال آیا کہ پوچھوں کہ اُس کو گھڑیوں کے وقت کی مطابقت کا علم کیسے ہوا۔ مگر گزشتہ ایام کی صبح و شام کوئی بھولنے والی چیز نہ تھی، اور یہ سوال کرنا حماقت خیال کیا۔

"ابھی تو ساڑھے تین کا وقت ہے" اُس نے پھر کہا

"اوہو۔ پھر تو میں نے بہت تکلیف دی۔ میں کل رات گھڑی کو چابی دینا بھول گیا، اور یہ وقت اندازاً کر دیا تھا . . . "

"اچھا تو آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"وہ اچھی طرح سے جانتی تھی کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ مگر اُس کو میری زبان سے سننا منظور تھا۔ وہ میرے رُکتے ہوئے بے ربط الفاظ میں بسنے کے والہانہ اظہار کی پیاسی تھی۔

یہ بات عورت کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ محض خاموش جذبات سے تسکین نہیں پاتی۔ یہ دیوی پرستش کے علاوہ منتروں کے الاپ کی بھی متمنی ہوتی ہے۔ وہ مجھ سے زیادہ بے قرار تھی۔

"زرملا" میں نے دبے ہوئے الفاظ میں کہا: "اگر یہ ہماری آخری ملاقات ہے . . . تو میں یہ راستہ کل سے چھوڑ دوں گا . . . مجھے اپنے آپ سے راہِ فرار نظر نہیں آتی"۔

"آپ تو بہت جلد اس نتیجے پر پہنچ گئے . . . کیا آپ قسمت پر اعتبار نہیں کرتے . . . آج کل کے پڑھے لکھے لوگوں کا یہی حال ہے" زرملا نے دروازے کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"زرملا میں بالکل بے بس ہوں . . . میں نہیں جانتا مجھے کیا ہو گیا۔ میں اپنی ایک کمزوری کیا نہ اگر کمزوریاں تسلیم کرنے کو تیار ہوں"۔ اپنے الفاظ میں اور گفتار میں بڑھتا ہوا جوش محسوس کر کے میں نے خاموش ہو جانا بہتر خیال کیا۔

"کچھ سیکنڈ تک خاموشی رہی۔ میرے رگ و ریشہ میں ایک ہیجان تھا۔ مگر زرملا نہایت سکون سے کھڑی تھی۔ وہ سر جھکا کر کچھ سوچ رہی تھی۔ میرے جذبات کا دریا امنڈا ہوا چلا آرہا تھا اور دماغ تقریباً معطل ہو چکا تھا۔ اس چند لمحوں کی خاموشی میں امید و بیم کے مختلف مناظر میرے سامنے سے گزر رہے تھے . . . طوفانی گھٹائیں اُٹھیں ایک لمحے کے لئے چھا گئیں اور کھل گئیں۔

"آپ نے کہاں تک تعلیم پائی ہے"۔

"ایف اے تک" چونک کر میں نے جواب دیا۔ جیسا کہ کسی افسر نے سوال کیا ہو۔ "تو آپ میرے چھوٹے بھائی کو . . . جو پانچویں میں پڑھتا ہے۔ پڑھایا کریں . . . وہ پڑھائی میں کمزور ہے اور ماتاجی نے کئی بار کسی ماسٹر کے مقرر کرنے کا ارادہ کیا ہے مگر یونہی وقت گزر رہا ہے، اور ابھی پتاجی کسی ماسٹر کی تلاش میں ہیں۔ اچھا میں ذکر کروں گی . . . "

"بغیر کسی مزید گفتگو کے وہ کمرے سے نکل گئی۔ حالات کی رفتار اور موافقت مجھے ناقابلِ یقین اور ناقابلِ برداشت معلوم ہو رہی تھی۔ کیا یہ خواب تھا . . . خواب میں وقت کی رفتار ہمارے دماغی تاثرات کے ماتحت ہوتی ہے۔ مگر یہ خواب نہ تھا۔ آہ . . . کاش کہ یہ سب کچھ خواب ہوتا . . . مگر زمانے کی ہیبت ناک حقیقت سے نجات کہاں . . .

"زرملا سے ملاقات اُس کی گفتگو اور گزشتہ چند منٹوں کے نفسیاتی واقعات نہایت تیزی سے میرے دل و دماغ میں سے گزر رہے تھے۔ زندگی بعض اوقات منجمد اور سست ہوتی ہے اور ایک ذرا سی تبدیلی سے کس قدر تیز اور ہیجان آفریں معلوم ہونے لگتی ہے۔

تیاگ

لو آج تمہیں میں نے اپنے غمگیں دل سے رخصت دے دی!
اور خانۂ دل کے دروازے پر یہ لکھا "میں بھول گیا!"
گر آئے کوئی اور پوچھے "کیا میرا رہتی ہے یاں پر؟"
میں کہہ دوں گا "کیا کہتا ہے؟ میں بات نہیں سمجھا تیری!"
لیکن یہ کیا ہوا جب کانوں میں کوئی میٹھی آواز آئے!
میں چونک پڑوں اور یہ سوچوں! یہ میرا کی آواز نہ ہو!؟
لیکن یہ کیا؟! جب لوگوں سے میں ذکرِ محبت سُن پاؤں
بے ساختہ یاد آجائیں مجھے جو باتیں تم نے کیں مجھ سے!
محسوس مجھے یوں ہوتا ہے اک ہاتھ ہے میرے ہاتھوں میں!
میں سرگوشی میں کہتا ہوں "ہاں مجھ کو تم سے محبت ہے"!
میں دیکھتا ہوں تم سڑکوں پر آہستہ آہستہ ہو رواں!!
اور پیچھے پیچھے بے بس اور مجبور چلا آتا ہوں میں!!
ہاں آج تمہیں میں نے اپنے غمگیں دل سے رخصت دے دی
اور خانۂ دل کے دروازے پر یہ لکھا "میں بھول گیا!"
گر آئے کوئی اور پوچھے "کیا میرا رہتی ہے یاں پر؟"
میں کہہ دوں گا "کیا کہتا ہے؟ میں بات نہیں سمجھا تیری؟"

میراجی

مریاں نے مرنے
کرایا اور سمجھا کہ اب وہ د
عاقبت کے لئے اس نے
"سات سال
میں دنیا کی مصیبتوں
کرتی رہیں۔ آج
گی اتنی بڑی
رکھے۔ چند
کا سہارا

کاٹے
سے،
آ کے

ں کیوں۔ مگر امی۔ ذرا سمجھنے کی کوشش
ا غوں میں چھپ چھپ کے رہیں
ہ کم از کم ہیں اب لاوارث تو نہ
ا چاہیے تھا۔ زندگی کے دن
یال رکھنا تھا۔ ہ مہینے کے بعد

ار ہا۔ اسے خیال تھا کہ ہیں
ے کو اپنے روزگار کی فکر تھی۔
ک اس سے اب بھی
مجھے اچھی نظروں سے
لگے۔ دو وقت
میلے کپڑے
ں اچھی طرح

ئی۔ جس
ے اس
ایسے
یک
انے
ے!
!!
!!!

ایک مصیبت میں پھنس گئی۔ رات دن کا آرام جاتا رہا اور میں سوچنے لگی کہ کہیں اور نوکری کروں تو اچھا ہے کہ میرے نصیب جاگے۔ جمیلہ کا خاوند ایک دن بیرسٹر کی عیادت کو آیا۔ شاید وہ اس کا دوست تھا۔ گو بیرسٹر کے ہاں پہلے تو کبھی میں نے اسے نہ دیکھا تھا۔ مگر یہ معمولی بات ہے۔ خیر۔ جمیلہ کے خاوند نے مجھے دیکھا اور وہ حیران رہ گیا۔ اس نے دیر تک میرے پاس بیٹھ کر میری باتیں سنیں اور کچھ تسلی بھی دی۔ دوسرے تیسرے دن وہ پھر آیا تو جمیلہ کا پیغام واپسی بھی لایا۔ شاید جمیلہ کو اپنے جھوٹے الزام کا احساس ہوا یا شاید اپنے ظلم کے بدلے اب مجھے وہ اس مصیبت سے چھڑانا چاہتی تھی۔ بہر حال میں تیسرے دن بیرسٹر کے لئے ایک دوسرے نوکر کا انتظام کر کے جمیلہ کے ہاں پھر واپس آ گئی۔

یہاں آ کے دیکھا تو گھر کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔ وہ خلیج جو میاں بیوی کے درمیان حائل تھی دن بدن وسیع ہوتی چلی جاتی تھی۔ جمیلہ کا دل بھی اب پتھر ہو چکا تھا۔ اس نے اب نوکروں سے پردہ وغیرہ چھوڑ دیا تھا اور اسے اپنے خاوند کی طرف سے جیسے بالکل اطمینان تھا اسے اب اس بات کی ذرا پروا نہ تھی کہ وہ رات کو کتنے بجے گھر آتا ہے۔ کون کون سی کلب میں جاتا ہے۔ کس کس کے ساتھ پھرتا ہے اور کیوں اتنی راتیں باہر کاٹ آتا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکی وہ کس طرح ان باتوں سے چشم پوشی کرتی تھی۔ ایک عورت اپنے خاوند کی اس بے پروائی کا خیال اسی وقت نہیں کرتی جب وہ خود بھی اتنی ہی بے پروا ہو جائے اور یہ ناممکن ہے۔ اس کی بیوی ہوتے ہوئے اسے ضرور تھوڑا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کم از کم میں تو یہی جانتی تھی۔ خیر بار ہا مجھے یہ بھی خیال آیا کہ شاید ظاہر داری کی خاطر یہ اس کی اس بے پروائی کو اس لاپروائی سے ٹال جاتی ہے یا شاید یہ بے پروائی بھی ایک ریاکاری اور خود فریبی ہو۔

میرے ساتھ اب جمیلہ کا سلوک کچھ مختلف تھا۔ وہ مجھے ہر وقت کام میں مصروف دیکھنا چاہتی تھی۔ کام اچھا ہو بس۔ اسے اب اور کوئی وہم و گمان بھی نہ تھا۔ شاید وہ اپنی پہلی غلطی کی ضرورت سے زیادہ تلافی کرنا چاہتی تھی۔ جب کبھی موقعہ ملتا وہ مجھ سے کنارہ کرنے کی کوشش ہی کرتی۔ اب بھول کر بھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ ایک ناگن کو وہ پہلو میں پال رہی ہے۔ وہ جیسے میری طرف سے بالکل مطمئن تھی۔ پہلی سب باتیں بھول چکی تھی یا کیا پتہ ہے وہ میری طرف سے دیدہ دانستہ آنکھیں بند رکھنا چاہتی تھی۔ وہی کبوتر کا بلی کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا۔

مجھے جمیلہ کے ہاں واپس آنے کی بڑی خوشی ہوئی۔ یہ نہیں کہ یہ گھرانہ اچھا تھا۔ نہیں۔ یہ خوشی کچھ اور ہی تھی جس کو میں اب کچھ کچھ سمجھنے لگی ہوں۔ یہ خوشی وہ تھی جو ایک ناگن کو ہو سکتی ہے جب اس کا پھن نیولے کے منہ سے نکل آئے اور اسے ڈسنے کا موقعہ مل جائے۔ یہ انتقام کی خوشی تھی جس کے لئے جمیلہ نے خود مجھے تیار کیا تھا اور جس کے لئے میں اب اپنی تمام طاقتوں کو پورے زوروں پر دیکھتی تھی۔ مجھے اب جمیلہ ایک بے بس کبوتری نظر آتی تھی جو میرے شکنجے میں پھڑک رہی ہو۔ میں جب کبھی رات کو سوتی اور سوچتی تو میرا سینہ زور زور سے ابھر کر تنا۔ میرا دم تیز ہو جاتا اور میرا خون کھولنے لگتا۔ میں نے جمیلہ کے ہاں آتے ہی اپنے انتقام کی تدبیریں سوچنی شروع کر دیں اور صورت حالات میرے بالکل موافق نظر آتی تھی۔ جمیلہ اور اس کا خاوند بالکل اس طرح رہتے تھے جیسے ایک مکان میں دو کرایہ دار جنہیں ایک دوسرے سے بولنے سے بھی نفرت ہو۔

تم پھر کہو گی میں کس طرح ایسی محسن کش بن گئی مگر امی اس میں میرا کیا قصور تھا۔ میں اب دنیا کے مصائب جھیل جھیل کر سنگ دل ہو چکی تھی میری طبیعت کی وہ نرمی اور گداز جسے میں گھر سے لے کر نکلی تھی اب جاتے رہے تھے۔ میں اب سخت تھی پتھر کی طرح۔ میرا دل اب وہ دل ہی نہیں رہا تھا۔ میں اب اخلاق اور سماج کے قوانین پر ہنسا کرتی تھی۔ مجھے بار ہا ان لوگوں کی سادہ لوحی پر ہنسی آتی تھی جو اپنی زندگی محض اس لئے ایک مصیبت بنا لیتے ہیں کہ سماج اور مذہب والے ان سے کچھ توقعات لگائے رکھتے ہیں اور انہیں ان توقعات کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ مگر آخر یہ ہے کیا؟ مذہب۔ سماج۔ اخلاق۔ کچھ بھی نہیں۔ لچر اور پوچ۔ امیر طبقے کے خالی از جذبات مردہ اور سڑے ہوئے دماغوں کی اختراع۔ اصل میں زندگی ایک کشمکش کا نام ہے اور وہ کشمکش مذہب اور اخلاق سے کہیں بالا ہے۔ میں اس عرصے میں ان تمام حقیقتوں سے آگاہ ہو چکی تھی۔ آخر مجھ میں بھی کچھ سمجھ تھی۔ مجھے بھی خدا نے کچھ دماغ دیا تھا۔ لیکن امی تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔ ایک گاؤں میں رہ کر ان باتوں کی کبھی سمجھ نہیں آ سکتی۔ یہ جان جوکھوں کا کام ہے اور میں اس راز کو فاش کرنے کے لئے جسے ہمارے سامنے بچپن سے ہی اس کد و کاوش سے سجایا جاتا ہے اپنی جان پر کھیل گئی۔

جمیلہ کا خاوند پہلے تو کچھ دنوں ڈرتا رہا۔ اسے شاید جمیلہ کی اسی بناوٹی بے پروائی سے ڈر لگتا تھا۔ مگر کب تک وہ نا کردہ گناہ جو جمیلہ نے

میرے سر لگا یا تھا اس کے دل میں بھی کھٹکتا تھا اور وہ بھی اب انتقام لینے کے لئے بالکل تیار تھا۔ ادھر میری تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔ میرا زاویہ نگاہ ہی کچھ اور بن چکا تھا اور ہمیں جمیلہ سے اپنا انتقام لینے میں ذرا بھی دقت پیش نہ آئی۔ آخر ہونا تو وہی تھا جس کے لئے جمیلہ نے مجھے اور اپنے خاوند کو اپنے ہاتھوں تیار کیا تھا۔

تمہاری چھوکری اب امی بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ مگر نہیں نہیں تباہ کیوں۔ کس کو اختیار ہے کہ میرے عمل کا جائزہ لے۔ مجھے یقین ہے کوئی کسی کے اعمال کا ذمہ دار نہیں اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مجھے سزا کا مستحق سمجھے۔ آخر میں نے کیا کیا، وہی نہ جس کے لئے دنیا نے مجھے مجبور کیا، جس کے لئے دنیا بھر کی طاقتوں نے مجھے اکسایا اور ابھارا تو پھر اس میں میرا اپنا کیا قصور رہے۔ تمہاری غربت اور ناداری میرے بس کی بات نہ تھی۔ رشتہ داروں کا ہم سے اس قدر ظلم کرنا ہمارے اپنے بس میں نہ تھا اور جمیلہ کے ہاں سے اس طرح بے بسی کی حالت میں نکال دیا جانا بھی تو میرے بس کی بات نہ تھی۔ آگے جو کچھ ہوا وہ تم سمجھ ہی سکتی ہے۔ اس میں میرا کیا قصور تھا مجبوری ناداری۔ ناچاری۔ احتیاج۔ غربت۔ کیا دنیا ان حقائق سے آنکھیں بند کر سکتی ہے اور اگر کرتی ہے تو کیوں۔ کیا یہ بھی ایک گناہ نہیں! میں کہتی ہوں یہ میرے گناہوں سے کہیں زیادہ خطرناک اور مہلک ہے۔ کیونکہ میں مجبور تھی اور یہ سماج کے اجارہ دار مجبور نہیں ہوتے

آخر امی آج میں اپنے کئے کی سزا بھگت رہی ہوں۔ جمیلہ کے خاوند سے مدتوں کھلی ملی رہی اور جمیلہ کو ذرا پتہ نہ لگا۔ جمیلہ کے خاوند نے ظاہر داری کی خاطر میرا نکاح ایک مریل سے نوکر سے کروا دیا اور میں رضامند ہوگئی۔ اس بات پر رضامند ہوگئی کہ جو کچھ بھی ہو میں اسے بدنام نہ ہونے دوں گی۔ کسی پر بھی اس راز کو فاش نہ کروں گی اور دنیا کو جو ہمارے مصائب سے دیدہ دانستہ آنکھیں بند کر لیتی ہے اس امر کی تہ تک کبھی نہ پہنچنے دوں گی جس کا اُسے کسی صورت بھی حق نہیں پہنچتا۔

اب میں خط کو ختم کرتی ہوں۔ معاف کرنا میں نے وہ باتیں کیں اور کہیں جن کی تمہیں مجھ سے امید نہ تھی مگر چونکہ مجھے اب یقین تھا کہ اب میں ایک لمبے سفر کے لئے تیار ہو رہی ہوں۔ میں نے بے خوف و خطر وہ سب کچھ کہہ دیا جو میری طرح ہزاروں کو پیش آتا ہے مگر کسی کو کہنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ دوپہر ڈھل رہی ہے اور باورچی بیچارے نے جسے میں نے اب تک اپنے بستر کے پاس باندھ کے بٹھا رکھا ہے ابھی شام کے کھانے کے لئے چیزیں لینے بازار جانا ہے۔

میری حالت اب خطرناک ہوتی جاتی ہے بخار بہت تیز ہے اور مجھے اپنا جسم جلتا معلوم ہوتا ہے۔ ادھر اُس مریل خاوند کے نام پر جو کچھ میں نے کیا وہ میرا جان لیوا بن رہا ہے۔ مجھے اب درد شروع ہو گیا ہے جو مجھے یقین ہے میری موت اور ایک نئی جان کی تخلیق میں ہی ختم ہوگا جو دنیا کے سامنے اس کے ظلم وستم کو آشکارا کرنے کے لئے میری اور جمیلہ کے خاوند کی باہمی کوششوں سے لائی گئی ہے۔ مگر لوگ اس کو بھی نہیں سمجھیں گے۔ وہ دیدہ دانستہ بلی کی طرح سے آنکھیں بند کرنے والے اب واقعی اندھے ہو چکے ہیں اور اس راز کی تہ کو نہیں پہنچ سکتے۔ نہ جمیلہ مجھے کوسے گی نہ لوگ مجھے کچھ کہیں گے۔ کیونکہ ایک سال سے میں اپنے مریل خاوند کی نام نہاد بیوی رہ چکی ہوں۔ کوٹھڑی کی دیواریں اب جل رہی ہیں۔ مجھے ہر کونے میں آگ کے شرارے نظر آرہے ہیں جو مجھے جلانے کی خاطر میری طرف ہر سمت سے بڑھے چلے آرہے ہیں۔ امی۔ ہاں وہ دیکھو آگ ہی آگ۔ چاروں طرف مجھے آگ نظر آرہی ہے۔ میں جل رہی ہوں۔ بچانا بچانا امی مجھے بچانا۔ میں جل گئی۔ میں جل گئی . . .

آگ اب مدھم ہو گئی ہے اور مجھے پھر کچھ کہنے کی فرصت ملی ہے۔ میرا مریل خاوند دایہ کو بلانے کے لئے باہر گیا ہے اور جمیلہ کا خاوند میرے سرہانے بیٹھا ہے۔ باورچی بیچارا اب خط لکھتے لکھتے تھک گیا ہے اور حیرانی سے میری طرف دیکھ رہا ہے۔

گھبراؤ مت امی میں تمہاری خاطر بہت کچھ چھوڑے جا رہی ہوں۔ جمیلہ کے خاوند نے میرے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ اس خط کے ساتھ وہ سب کچھ تمہیں پہنچا دے گا۔ تم اس سے مونی کی پرورش کرنا۔ اُسے لکھانا پڑھانا اور جب وہ بڑا ہو جائے تو اسے یہ میرا خط دکھانا اور کہنا کہ اس بیرحم دنیا سے میرا انتقام لے اور جی بھر کر انتقام لے . . . وہ آگ آگ۔ امی اب پھر آگ مجھے نگلنے کو میری طرف دوڑی آرہی ہے۔ جمیلہ کے خاوند کا ٹھنڈا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے اور مجھے اب نیند آتی جا رہی ہے۔ اندھیرا ہو چلا ہے۔ درد۔ ہائے ٹیسیں۔ میں مر گئی۔ خدایا۔ امی مجھے بچا۔ میں چلی . . .

محمد حمید الدین ایم اے

غزل

نشانے پر جو میں نے اپنی جانِ ناتواں رکھدی
تو پھر کیوں مسکرا کر ہاتھ سے تو نے کماں رکھدی

ذرا اس بلبلے کو دیکھ موجوں کے تھپیڑوں میں
خلاصہ کر کے گویا زندگی کی داستاں رکھدی

وہ تیرا حسن ہو یا عشق میرا ایک آتش ہے
ترے رخ پر عیاں کر دی مرے دل میں نہاں رکھدی

صبا دامن کشاں خاموش غنچے سبزہ بیگانہ
الٰہی کس چمن میں میں نے طرحِ آشیاں رکھدی

کہیں انسان کے جھگڑے کہیں شیطان کے جھگڑے
یہ تیرے دل میں کیا آئی کہ بنیادِ جہاں رکھدی

ملائک کو نہ کر دیں منحرف بے رحم نظارے
بنی آدم کی دنیا تو نے زیرِ آسماں رکھدی

اجل کے ہاتھ میں مجھ کو بنا کر اک کھلونا سا
مرے دل میں تمنائے حیاتِ جاوداں رکھدی

اسی نے اشکِ غم کو خوئے آتشناک بخشی ہے
کہ جس نے ابر کے دل میں رگِ برقِ تپاں رکھدی

کوئی تو کاتبِ تقدیر سے یہ پوچھ دے مجھ کو
کہ لکھی تھی مری تقدیر تو لکھ کر کہاں رکھدی

تری نیت پہ ہے موقوف پھل تیری عبادت کا
وہ بت خانہ حرم ہے یہ جبیں دل سی جہاں رکھدی

معمّا زندگی کا حل ابھی ہونے نہ پایا تھا
اجل نے سامنے میرے عدم کی چیستاں رکھدی

میری قیمت نہیں لعل و گہر میں مفت ملتا ہوں
کوئی کیا لے مجھے قیمت بڑی میں نے گراں رکھدی

مسعود شاہد

نواب سعد اللہ خاں لاہوری

وزیر شاہجہاں

نام اور وطن سعد اللہ خاں نام تھا، شیخ سعد اللہ خاں لاہوری اور ملا سعد اللہ خاں مشہور تھا، اکثر تاریخوں میں وطن لاہور لکھا ہے، لیکن مصنف سیر المتاخرین نے سعد اللہ خاں کا وطن جنبوت بتایا ہے اور سکونت لاہور لکھی ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے۔

کہ موطن او جنبوت و منشاش لاہور است[1]

علمی استعداد سعد اللہ خاں تمام علوم عقلی و نقلی میں نہایت کامل دستگاہ اور فاضلانہ قابلیت رکھتا تھا۔ زبردست ادیب اور مقرر تھا، فارسی اور عربی میں نہایت اچھی تحریریں لکھتا تھا۔ بادشاہ کی طرف سے دوسرے سلاطین کو جو فرمان جاتے تھے وہ سعد اللہ خاں ہی کے لکھے ہوئے ہوتے تھے اور اب بھی تاریخوں میں موجود ہیں۔ یہ فرمان بالعموم فارسی زبان میں لکھے جایا کرتے تھے۔ لیکن ۱۰۶۱ھ میں سید محی الدین قیصر روم کا ایلچی بہت سے تحائف اور خط لے کر آیا تو سعد اللہ خاں نے بادشاہ کے حکم سے اس کا جواب عربی میں لکھا۔

اس زمانے کا عام دستور تھا کہ خطوط اور فرامین بڑی قابلیت سے لکھے جاتے تھے، اور ان کی ترتیب و تسوید میں نہایت اہتمام کیا جاتا تھا۔ وہ بادشاہ اور اس کے درباری لوگوں کی علمی استعداد اور ادبیت کا آئینہ ہوا کرتے تھے اور یہی ایک ذریعہ تھا، تحریر و کتابت کی قابلیتوں کے اظہار نفسِ مضمون کے علاوہ خطوط کی ظاہری شان و شوکت پر بھی کافی توجہ کی جاتی تھی، بہترین خوشنویس موجود رہا کرتے تھے وزیر کے لئے بھی ضروری تھا کہ املا و انشاء میں پوری مہارت رکھتا ہو۔ ان خطوط کے دیکھنے سے نواب سعد اللہ خاں کی ادیبانہ و منشیانہ نکتہ سنجیوں کا آج بھی اچھی طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے، ظاہری کمالات کے علاوہ مورخین نے اس کے رسوخِ باطنی کے متعلق بھی بہت کچھ لکھا ہے مگر ہماری رائے میں ان باتوں کو اس کی فضیلتِ علمی سے کوئی تعلق نہیں ہے، البتہ اس کی خدا پرستی اور مذہبیت پر ضرور روشنی پڑتی ہے، سعد اللہ خاں حافظِ قرآن بھی تھا۔

دربارِ شاہی سے تعلق سعد اللہ خاں پہلی مرتبہ دربار میں آیا تو بادشاہ کو اس کے جوہر ذاتی کا علم نہ ہوا اور اس نے زیادہ التفات نہ کی تنخواہ بھی بہت کم مقرر کی جسے سعد اللہ خاں نے اپنی خودداری سے منظور نہیں کیا،

رمضان ۱۰۵۰ھ میں موسوی خاں صدر کو حکم ہوا کہ سعد اللہ خاں کو ہمارے پاس بھیج دیا جائے چنانچہ سعد اللہ خاں حاضر دربار ہوا۔ اس کی مرتبہ مناسب تنخواہ مقرر ہوئی، خلعت ملا، اور اصطبل خاص سے گھوڑا بھی عنایت کیا گیا۔ پھر دو تین روز کے اندر ہی یومیہ کی جگہ منصب پر سرفراز کیا گیا، اور ایک سال کے اندر ہی اندر منصب ہزاری ذات اور دو سو سوار خطاب، اور عرضداشت مکرر کی خدمت عطا ہوئی۔ پھر غسل خانہ کی داروغگی پر مقرر ہوا،

ترقی مناصب اور عہدہ وزارت سعد اللہ خاں ایک جوہر قابل تھا اب تک اس کی قابلیتوں کا اظہار نہ ہوا تھا، دربار میں آتے ہی گویا اس کی اقبال مندی و خوش نصیبی کا آفتاب، بادلوں سے نکل آیا، اور اپنی تابانی سے ہندوستان بھر کو منور کر دیا، رفتہ رفتہ اس کی کاردانی اور فہم و فراست ظاہر ہوتی گئی اور اس نے اس قدر جلد اور متواتر ترقیاں حاصل کیں کہ دوسرے درباری امرا کی زندگی میں یہ واقعات نظر نہیں آتے۔

شاہجہاں بہت ہی مردم شناس، اور قدردان بادشاہ تھا، سعد اللہ خاں کا اس کے پاس پہنچ جانا ہی اس امر کی کافی ضمانت تھی کہ وہ اپنی

[1] سیر المتاخرین صفحہ ۲۷۰

ظاہری و باطنی استعداد کے شایانِ شان ترقی کرے گا، چنانچہ ملازمت کے دوسرے ہی سال میں سہ ہزاری منصب دو ہزار سوار اور خان سامانی کا عہدہ اُسے مل گیا، چوتھے سال ترقی کرتے کرتے ۲۰ رجب ۱۰۵۵ھ کو وزارت کا منصب جلیل اس نے حاصل کر لیا، اسلام خاں کو ہٹا کر قلمدانِ وزارت سعد اللہ خاں کو دیا گیا، منصب میں ہزار و پانصد کی ترقی ہوئی اور پنج ہزاری پانصد ذات پنج ہزار و پانصد سوار کا منصب مرحمت ہوا۔

پھر ساتویں سال وہ ہفت ہزاری اور ہزار سوار دو اسپہ و اسپہ کی عزت ملی۔

دربار میں اس سے بڑا کوئی منصب نہ تھا، امرا اس منصب سے آگے ترقی نہیں پاتے تھے، البتہ شہزادوں کو اس سے بڑے مناصب بھی دئے جاتے تھے۔

۱۰۵۹ھ میں اس کی تنخواہ دو کرور درم یعنی تیس لاکھ سالانہ مقرر ہوئی۔ اس کے آگے ترقی کا کوئی درجہ باقی نہ رہا تھا۔ سعد اللہ خاں نے بہت تھوڑے عرصے میں تمام مدارج عزت کو طے کر لیا، صاحب سیر المتاخرین لکھتا ہے۔

سعد اللہ خاں کہ بنوازشہائے متواتر مدارج منصب و امارتِ ہمگی
طے نمود و مرتبہ باقی نماندہ بود کہ بدان رتبہ ترقی کند[1]

سعد اللہ خاں کی متواتر ترقیوں سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس زمانے میں منصب حاصل کر لینا کوئی معمولی بات تھی۔ ہمیں خاص طور پر شاہجہاں کے متعلق معلوم ہے کہ وہ منصب عطا کرنے میں نہایت سخت تھا۔ اس کے یہاں چار آدمی سے زیادہ ہفت ہزاری نہ ہوتے تھے۔ جب ان میں سے کوئی مر جاتا تھا تو اس کی خالی جگہ پر کسی اور امیر کو ترقی دے دی جایا کرتی تھی، آج کل کے خطابات کا سا قصہ نہ تھا کہ افسران کی معمولی سی توجہ میں آدمی خاں صاحب اور خان بہادر ہو جاتا ہے۔ بادشاہ خود امرا کی کارگزاریوں کو دیکھتے اور پرکھتے تھے، پھر کہیں جا کر ترقی نصیب ہوتی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ سعد اللہ خاں نے اپنی جاں نثاری، کاردانی اور معاملہ فہمی سے بادشاہ کے دل میں کافی گنجائش پیدا کر لی تھی، چنانچہ شاہجہاں اس کو بہت عزیز رکھتا تھا اور اس کے اثر و نفوذ کا یہ عالم تھا کہ شاہجہاں کوئی ملکی و مالی معاملہ بغیر اس کی صلاح و مشورہ کے طے نہ کرتا تھا علاوہ ان کاموں کے جو وزارت سے متعلق تھے۔ تمام کاروبارِ سلطنت جزوی و کلی طور پر سعد اللہ خاں کے ہاتھ میں تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ دارا شکوہ باوجودیکہ بادشاہ کا چہیتا بیٹا تھا، سب بیٹوں سے زیادہ عزیز تھا۔ بادشاہ نے کبھی اسے جدا کرنا گوارا نہیں کیا، ولیعہد بھی تھا، ہر وقت بادشاہ کے پاس رہتا تھا مگر سعد اللہ خاں کے بڑھتے ہوئے اقتدار پر اُسے بھی حسد ہونے لگا تھا چنانچہ اس نے اکثر بادشاہ سے جا و بے جا شکایتیں بھی کیں، مگر سعد اللہ خاں کو ان سے کوئی نقصان نہ پہنچا۔

عادات و خصائل سعد اللہ خاں نہایت ایماندار، خدا ترس وزیر تھا۔ بادشاہ کا خیر اندیش اور رعایا کا بہی خواہ تھا، مردم آزاری کو بہت برا خیال کرتا تھا، اور حتی الامکان کوئی ایسا نیا ضابطہ جس سے مخلوق کو تکلیف پہنچے نافذ نہ کرتا تھا، اپنے فرائض کو دیانت و امانت کے ساتھ ادا کرتا تھا، رعایا کی فلاح و بہبود، اور غربا و مساکین کی تکالیف کا بہت لحاظ رکھتا تھا، شاہی خزانے کو معمور کرنے سے زیادہ رعایا کی دلداری اور اس کی مالی پریشانیوں کو ملحوظ رکھتا تھا، اس کا عقیدہ تھا کہ ایسی کفایت شعاری جو رعایا کے لئے موجب تکلیف و پریشانی ہو بادشاہ کے لئے کبھی مفید نہیں ہو سکتی، سلطنت کا فائدہ اسی میں ہے کہ مخلوق آرام و اطمینان سے رہے اور رعایا کی اقتصادی حالت مضبوط ہو۔

مذہب اکبر اور جہانگیر کے زمانۂ حکومت کو مورخین خصوصاً متعصب اور کوتاہ اندیش مورخین نے عام طور پر کفر و الحاد کا زمانہ کہا ہے، لیکن شاہجہاں کی حکومت پر تمام مورخین کو اتفاق ہے کہ وہ بالکل مذہبی رنگ کی حکومت تھی، اور الحاد کا اگر کوئی اثر تھا تو صرف اتنا ہی کہ بادشاہ اُدھر متوجہ نہ ہوا اور باپ دادا کا طریقہ سمجھ کر کسی بات میں فوری تغیر روا نہ رکھا، شاہجہاں خود بھی مذہب کا پابند تھا، اسی طرح سعد اللہ خاں نہایت سچا مسلمان تھا، مگر مذہبی تنگ نظری اور تعصب اس میں قطعاً نہ تھا،

چنانچہ رگھناتھ کی جو سعد اللہ خاں کا پیشکار رہ چکا تھا خالصہ و تن کی پیشکاری اس کے سپرد تھی، اتنی اچھی تربیت کی کہ وہ سعد اللہ خاں کے بعد دیوان کل مقرر ہونے تک وزارت پر مامور رہا، اور شاہجہاں سے راجے رایان کا خطاب حاصل کیا۔

عام طور پر مسلمان بادشاہوں کو بدنام کیا جاتا ہے کہ وہ متعصب اور مسلم پرست ہوا کرتے تھے مگر یہ اور اسی قسم کے بے شمار تاریخی واقعات ثابت کرتے ہیں کہ یہ الزام کوئی وقعت نہیں رکھتا، عہدے کی ترقی پر مذہب اور عقیدے کا کوئی اثر نہ تھا۔ اس کے لئے صرف اہلیت درکار

تھی، ورنہ ظاہر ہے کہ ہزاروں مسلمان امرار اور منصبداروں، نیز سرداران فوج پر حکومت کرنے کی غرض سے ایک ہندو کو متعین نہ کیا جاتا، بلکہ یہ کام کسی مسلمان ہی کے سپرد ہوتا، اسی عہد میں سعد اللہ خاں کے انتقال پر ایک اور ہندو شخص چندر بھان دارالانشا کی خدمت پر مامور ہوا تھا، رائے چندر بھان" کا خطاب اُسے حاصل تھا اور بہت معزز تھا۔ اس کے اعزاز کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ دارالانشار کی خدمت اس کے سپرد تھی جو کوئی معمولی خدمت نہ تھی، بہر حال سعد اللہ خاں اس قسم کی تنگ خیالیوں سے بالکل پاک تھا اور نہایت روادار انسان تھا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ مذہبیت کو تنگ نظری سے کوئی تعلق نہیں۔ امور مملکت میں آدمی کو ہمیشہ وسیع النظر، عالی حوصلہ اور فراخ دل ہونا چاہیئے، اور مذہب ہرگز اس چیز کو مانع نہیں ہے۔

اولاد| تاریخوں میں سعد اللہ خاں کے دو بیٹوں کے نام ملتے ہیں۔ لطف اللہ اور عنایت اللہ مگر ان کے علاوہ بھی اس کے اور اولاد تھی لیکن ان کے نام اور حالات ہمیں معلوم نہیں ہو سکے،

لطف اللہ اور عنایت اللہ ۱۰۶۱ھ میں پہلی مرتبہ بادشاہ کی ملازمت سے مشرف ہوئے اس سے پہلے کبھی وہ دربار میں نہ آتے تھے۔ لطف اللہ خاں کو موتیوں کی تسبیح، اور عنایت اللہ کو سرپیچ مرصع عنایت ہوا[1]۔

سعد اللہ خاں کے انتقال کے وقت اس کے بڑے بیٹے لطف اللہ کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی بادشاہ نے اس کو ہفت صدی صد سوار کا منصب دیا دوسرے بیٹوں کا یومیہ مقرر ہو گیا۔

سعد اللہ خاں کا عہد وزارت| سعد اللہ خاں کے عہد وزارت میں سلطنت کے کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام پذیر ہوئے، ہندوستان میں عام مرفہ الحالی اور رونق پیدا ہو گئی، اکثر پرانے ضابطوں میں اس نے اصلاحیں کیں، لیکن اسی حد تک کہ رعایا پر کسی قسم کا بار نہ پڑے، اس سے پہلے یہ دستور تھا کہ عامل اور تحصیلدار کو مالگذاری وصول کرنے کا حق پانچ روپیہ سیکڑہ مقرر تھا، یعنی سو روپے وصول کر کے عامل پچانوے روپے خزانہ سرکار میں داخل کر دیا کرتا تھا اور پانچ روپے اپنے حق کے رکھ لیتا تھا، سعد اللہ خاں نے کفایت اور فائدے کے خیال سے اس ضابطہ کو تبدیل کر کے یہ اصول مقرر کر دیا کہ ایک سو پانچ روپے وصول کر کے سو روپے خزانے میں داخل کئے جائیں اور پانچ روپے حق تحصیل کے رکھ لئے جائیں۔ مگر عمر بھر وہ اپنے اس فعل پر نادم رہا کہ میں نے محض بادشاہ کے فائدے کو ملحوظ رکھا اور رعایا کی منفعت و آسانی کو نظر انداز کر دیا، کاش اس دن میرے ہاتھ خشک ہو جاتے اور قلم پکڑنے پر قادر نہ ہوتے۔

وہ عمال کے حقوق کی بہت حفاظت کرتا تھا اور عہدیداروں کے مظالم سے ہمیشہ انہیں بچاتا تھا،

اکبر کے عہد حکومت میں راجہ ٹوڈرمل نے یہ قانون نافذ کیا تھا کہ عاملوں اور کروریوں کا فاضل اگر سو سے کم ہو تو ان کو مجرا نہ دیا جائے البتہ سو سے زیادہ ہو جائے تو اس کو حساب میں شامل کیا جائے شاہجہاں کے زمانے میں محاسبوں نے اس اصول سے ناجائز فائدہ اٹھایا، اور عاملوں کا فاضل مجرا دینے میں مشکلات پیدا کر دیں، سعد اللہ خاں کے سامنے اس قسم کے حسابات پیش ہوئے تو اس نے حکم لکھا کہ جب یہ ضابطہ مقرر ہے کہ سو سے اوپر فاضل مجرا دیا جائے تو پھر کیوں یہ دقتیں پیدا کر کے اپنی اور ہماری عاقبت خراب کرتے ہو،

حاصل خالصہ کی بدر نویسی اور فرد باز یافت اس کے سامنے رکھی گئی تو اس نے دستخط کر کے لکھ دیا کہ اس کنارۂ فرد کو دھوپ میں رکھ دو خشک ہونے پر جو باقی رہے وصول کر لو۔

سعد اللہ خاں ملک کی آبادی اور عمرانی ترقی پر بہت توجہ کرتا تھا۔ اس کی جاگیر کے مواضعات ہمیشہ سرسبز اور آباد رہتے تھے۔ ایک مرتبہ دارا شکوہ نے بادشاہ سے شکایت کی کہ سعد اللہ خاں نے ویران اور برباد پرگنے ہماری جاگیروں میں دے دیئے ہیں اور آباد و سیر حاصل پرگنے اپنی جاگیر میں رکھ لئے ہیں۔ سعد اللہ خاں کو یہ حال معلوم ہوا تو اس نے شاہزادے کے وکیل کو بلا کر اس کی جاگیر کے ویران دیہات خود لے لئے اور وکیل نے جو مواضعات ان کے بدلے میں لینا پسند کئے وہ اس کو دے دیئے۔ دو تین سال میں شاہزادے کے ظالم عمال نے ان دیہات کو بھی برباد کر دیا اور سعد اللہ کی جاگیر اُسی طرح سرسبز و شاداب رہی،

عاملوں کے ظلم و ستم پر ہمیشہ اس کی نگاہ رہتی تھی جہاں وہ ان کے حقوق کی حفاظت کرتا تھا وہاں رعایا کو بھی ان کے استبداد سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ عاملوں کی زیادتی اور ان کے جبر سے رعایا بددل اور پریشان ہو جاتی ہے،

نہایت ہی تجربہ کار اور بہادر تھا وہ ایسی قیامت خیز گولہ باری کر رہا تھا کہ ان
لوگوں کو کسی کام کا موقعہ نہ ملتا تھا اور اکثر اوقات سرنگیں بھی بیکار رہ
جاتی تھیں۔

اسی اثنا میں ایران کے ایک جدید امدادی لشکر نے دفعتہً
ہندوستان کی اس فوج پر حملہ کر دیا جو لشکر شاہی کے لئے گھاس، لکڑی
وغیرہ مہیا کرنے کے لئے مامور تھی اور اکثر آدمیوں کو مار کر بہت سے
مویشی گھیر کر لے گئے۔ یہ خبر سن کر رستم خاں نے اس لشکر کا تعاقب
کیا، اور خونریز معرکہ ہوا۔

اس کے علاوہ بھی ایک لڑائی ہوئی جس میں بادشاہی فوج کو فتح
ہوئی مگر قلعہ ہاتھ نہ آیا۔ گرانی بدستور زیادہ ہو رہی تھی اور فوج سخت
تکالیف میں مبتلا تھی، مجبوراً شاہجہان نے چار مہینے کے بعد فوج کو
واپس بلا لیا۔ وہ تین ہزار آدمی اور چار پانچ ہزار جانور اس محاصرے
میں ہلاک ہوئے، شروع ذی قعدہ میں سعد اللہ خاں بادشاہ کی
خدمت میں حاضر ہو گیا۔

قندھار کی دوسری مہم | ۱۷ ربیع الاول ۱۰۶۲ھ کو سعد اللہ خاں دوبارہ قندھار
روانہ کیا گیا پچاس ہزار سوار، دس ہزار پیادے اور تین قلعہ شکن توپیں
اس کے ساتھ تھیں بست ہاتھی بھی تھے۔

دو کرور روپیہ بے شمار بیلدار اور مزدور وغیرہ تھے۔ تیس ہزار اونٹ
محض توپوں کے لئے گولہ بارود اور سیسہ وغیرہ کی باربرداری کے لئے
تھے۔ غرض نہایت ساز و سامان اور شان و شوکت سے یہ جنگی مہم روانہ
ہوئی، امراکی فوج ملا کر ستر ہزار سوار علاوہ توپ خانے کے تھے۔ محاصرہ
کرنے کے لئے ۳ رجمادی الاخری بادشاہ نے مقرر کر دی تھی لہذا یہ ضروری
تھا کہ اس تاریخ کو قلعہ گھیر لیا جائے۔

بادشاہ خود بھی ہندوستان سے کابل کو روانہ ہو گیا، سعد اللہ خاں
کوچ پر کوچ کرتا ہوا یکم جمادی الاول کو قندھار کے قریب اورنگ زیب کے
پاس پہنچ گیا جو ملتان کے راستے سے آیا تھا۔

دونوں نے مل کر قلعہ کا محاصرہ کیا اور مورچے تعمیر کئے سعد اللہ
خاں نے بڑی بہادری اور عقلمندی سے کام کیا محاصرہ کے کچھ دنوں بعد
قلعہ دار نے ایک دم خاموشی اختیار کر لی ادھر کے لوگ قلعہ کے نیچے پہنچ
گئے مگر قلعہ سے کوئی مدافعت نہ کی جاتی تھی، آخر راجہ راج روپ نے
اجازت مانگی کہ میں کمند کے ذریعہ سے برج پر چڑھ جاؤں گا لشکر
مسلح رہے اور میرے اشارہ پر فوراً حملہ کر دے اورنگ زیب اور
سعد اللہ خاں نے اجازت دے دی۔

راجہ رات کے وقت چند جانبازوں کے ساتھ قلعہ کی دیوار
پر چڑھ گیا اور لشکر کو اشارہ کر دیا جو پہلے سے منتظر تھا فوراً حملہ ہوا،
قرنا کی آواز فضا میں گونجی، اہل قلعہ اسی موقعہ کا انتظار کر رہے تھے سب طرف
سے مشعلیں اور جنگی حربے لئے کر ٹوٹ پڑے۔ نہایت سختی سے گولہ باری
اور تیر باری ہوئی آگ اور پتھر برسائے گئے۔ کھولتا ہوا تیل پھینکا گیا۔
حملہ آوروں کے چھکے چھوٹ گئے بہت سے مسلمان اور راجپوت
کام آئے جو شخص بھی برج یا دیوار کے پاس گیا زندہ نہ بچا بے شمار آدمی
ہلاک اور مجروح ہوئے۔

اس کے بعد دو مہینے تک مورچوں کے اندر سے لڑائی ہوتی
رہی۔ قزلباش رات کو ہندوستانیوں کے مورچوں پر حملے کر کے مویشی
اور انسانوں کو نقصان پہنچاتے تھے، ایک رات رستم خاں اور
سعد اللہ خاں کے مورچوں پر ایرانیوں کی فوج نے حملہ کر کے کئی توپوں
کو خراب کر دیا اور کچھ لوگوں کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ قلعہ میں لے گئے
ادھر سے تعاقب کیا گیا مگر قلعہ کے اوپر سے گولہ باری شروع ہوگئی اور
انہیں واپسی پر مجبور ہونا پڑا،

بادشاہی بہادر بڑی کوشش سے مورچوں کو آگے بڑھاتے
مگر گولہ باری کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ جاتی۔ اسی دوران میں بادشاہ
کی دو بڑی توپیں تڑخ گئیں اس کے علاوہ پانچ اور توپیں یوں بیکار ہو
گئیں کہ ان کے چلانے والے اناڑی تھے گولہ مارتے کہیں تھے اور
پڑتا کہیں تھا برخلاف اس کے قلعہ سے رومی اور قزلباش ایسا بے خطا
گولہ لگاتے تھے کہ ٹھیک نشانہ پر بیٹھتا تھا ایک اور مصیبت یہ ہوئی کہ
سرداران فوج کے اختلاف رائے کی وجہ سے دوسرے حلقوں کی
تسخیر بھی نہ ہو سکی،

محراب خاں قلعہ دار اتنا تجربہ کار تھا کہ اس نے اورنگ زیب
اور سعد اللہ خاں کی عقل و دانائی کو بیکار کر دیا۔ ان دونوں نے بہت
کوشش کی مگر کچھ بن نہ پڑا۔ بادشاہ نے ان حالات کی بنا پر پھر لشکر کو واپسی
کے احکام بھیج دئیے۔

چتوڑ پر چڑھائی | شاہجہاں سے قبل جہانگیر کے عہد میں چتوڑ کے رانا نے معاہدہ
کیا تھا کہ وہ اور اس کی اولاد کبھی قلعہ کی مرمت نہ کرے گی۔ شاہجہاں کے

شاہجہاں کی حکومت کے مشہور کارناموں اور یادگاروں میں تاج محل کے ساتھ، دہلی اور تختِ طاؤس کے تذکرے کبھی صفحاتِ تاریخ سے محو نہ ہوں گے، دہلی ایک زندہ یادگار ہے جو اب تک باقی ہے۔ تختِ طاؤس اگرچہ اپنی ہستی قایم نہ رکھ سکا مگر تاریخ ہمیشہ اسے باقی رکھے گی۔

دہلی میں عہدِ شاہجہانی کی دو بڑی اور عظیم الشان یادگاریں ہیں. قلعہ اور جامع مسجد، ان میں سے جامع مسجد سعداللہ خاں کے اہتمام سے تیار ہوئی ہے ۱۰۶۰ھ میں سعداللہ خاں نے ایک پہاڑی پر اس کی بنیاد رکھی تھی۔

افسوس ہے کہ سعداللہ کی زندگی میں اس کی تکمیل نہ ہوئی اگرچہ سب کام پورے ہو چکے تھے اور جس سال سعداللہ خاں کا انتقال ہوا ہے اسی سال مسجد کی تکمیل بھی ہو گئی تھی مگر وہ اس تقریبِ مسرت میں شرکت کے لئے زندہ نہ رہا تھا۔ تختِ طاؤس پر جلوس فرمانے کی خوشی میں شاہجہاں نے علاوہ خاندانِ شاہی کے ایک سو امیروں کو بھی انعامات دئے تھے اور ان کے اضافے بھی ہوئے تھے جن میں سعداللہ خاں بھی شامل تھا۔

بہرحال ان دو شاہجہانی یادگاروں کو سعداللہ خاں کے عہدِ وزارت سے جدا نہیں کیا جا سکتا، اور اس کی وزارت کے کارناموں میں ان کا بھی شمار ہے،

قومی خدمات
موجودہ عہدِ تہذیب سے پہلے (جس کو آلاتِ جنگ اور اسبابِ تباہی کے لحاظ سے دورِ وحشت و بربریت کہنا زیادہ موزوں ہے) جب لڑائی میں صرف ایسے آلات اور حربے استعمال ہوتے تھے جن کا تعلق براہِ راست انسان کی بہادری اور شجاعت سے تھا، وزیر کے لئے سب سے پہلی شرط یہ تھی کہ وہ قلم اور تلوار دونوں کا دھنی ہو اگر اس کا قلم صفحۂ قرطاس پر موتی بکھیر سکتا ہو تو تلوار میں بھی یہ طاقت ہو کہ میدانِ کارزار کو لالہ گوں کر سکے، چنانچہ سعداللہ خاں میں بھی یہ دونوں اوصاف بدرجۂ اتم موجود تھے اور واقعی طور پر وہ صاحب السیف والقلم تھا۔ چنانچہ اس کے نام کے ساتھ یہ لقب لکھا بھی جاتا تھا۔ وہ بڑی بڑی نازک مہموں پر بھیجا گیا اور ہمیشہ حزم و احتیاط سے اپنے فرائض انجام دیتا رہا اگرچہ اس کی اکثر مہمیں ناکام رہیں اور اس کے جنگی کارناموں میں کوئی بڑا کارنامہ نہیں ملتا، قندھار کی مہم پر وہ دو مرتبہ نامزد ہوا لیکن دونوں مرتبہ ناکام واپس آیا مگر یہ ناکامی مخصوص حالات اور واقعات کی بنا پر تھی، اس کی بے تدبیری، ضعفِ عقل یا فنونِ جنگ سے ناواقفیت کو قطعاً اس میں کوئی دخل نہ تھا۔

بلخ و بدخشاں کی مہم پر شاہجہاں نے اپنے چھوٹے بیٹے مراد بخش کو بھیجا تھا اس نے وہاں پہنچ کر بڑے کارنمایاں کئے لیکن علی مردان خاں کے تسلط و اقتدار اور آب و ہوا کی ناموافقت کے باعث شہزادہ مراد باپ کی مخالفت کے باوجود وہاں قیام نہ کر سکا، اور اپنی خدمات سے مستعفی ہو گیا۔

بادشاہ نے بڑے غور و خوض کے بعد سعداللہ خاں کو اس کام کے لئے منتخب کیا وہ چاہتا تھا کوئی ایسا آدمی بلخ بھیجا جائے جو میرا معتمد اور مزاج شناس بھی ہو اور اسی کے ساتھ تجربہ کار اور مقبولِ عوام بھی، تاکہ لوگ اس کا اعتبار کریں اور اس کی طرف مائل ہوں سعداللہ خاں میں یہ سب اوصاف موجود تھے۔ اس لئے اسی کو اس مہم کے لئے بہتر سمجھا گیا۔

بلخ و بدخشاں کی حالت بہت خراب اور نازک تھی اوزبکوں کا مقابلہ تھا، اور حالات یہ تھے کہ خود بادشاہزادہ سرداران فوج کے طرزِ عمل سے بد دل ہو کر واپسی پر آمادہ ہوا تھا، لیکن سعداللہ خاں نے اسے سنبھال لیا۔

سعداللہ خاں کو جو احکام اور اختیارات دربار شاہی سے ملے تھے۔ اگر ان کو جمع کیا جائے تو ایک طویل فہرست تیار ہو جائے۔ مختصر یہ ہے کہ اس کو شہزادے کی جگہ بھیجا گیا تھا جو وہاں فرمانروا کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔

سعداللہ خاں خنجان کے رستے سے ۸ رجب ۱۰۵۶ھ کو گیارہ روز میں بلخ پہنچ گیا، روانگی کابل سے ہوئی تھی احکمِ شاہی کے بموجب اس نے شہزادہ مراد کو بہت سمجھایا مگر وہ کسی طرح وہاں رکنے پر آمادہ نہ ہوا، سعداللہ خاں نے تمام ملازموں کو حکم دے دیا کہ شہزادے سے ملاقات نہ کریں نہ اس کی قیام گاہ پر جائیں، اس کے بعد اس نے بہت ہی سرگرمی کے ساتھ احکام شاہی کی تعمیل کی، اور دن رات کی مصروفیت، شب و روز کے انہماک سے بائیس روز کے قلیل عرصے میں جملہ احکام کی تعمیل کر دی۔

قندھار کی مہم
علی مردان خاں نے قندھار شاہجہاں کے حوالے کر دیا تھا ایرانیوں نے محض اس خیال سے کہ ان کی اندرونی حالت اچھی نہ تھی، اور سلطنت میں حد درجہ ضعف پیدا ہو گیا تھا، اس ذلت کو برداشت

کر لیا تھا، شاہ صفوی کے بعد شاہ عباس ثانی تختِ ایران پر متمکن ہوا تو اس کی عمر بہت کم تھی۔ اس کم سنی میں کسی طرح وہ اس امرِ خطیر کا متحمل نہ ہو سکتا تھا کہ شاہجہاں کے مقابلے میں نبرد آزمائی کرے۔ اس لئے شروع شروع میں خاموش رہا۔ جب سن شعور کو پہنچا تو امرائے اسے قندھار کی واپسی پر آمادہ کیا اور بتایا کہ قندھار آپ کا آبائی ملک ہے اس کی تسخیر سب کاموں پر مقدم ہے۔

چنانچہ وہ قندھار پر لشکر کشی کرنے کو تیار ہو گیا، یہاں خاموشی کے ساتھ یہ منصوبے باندھے جا رہے تھے اور ادھر شاہجہاں اپنے آباد کئے ہوئے شہر شاہ جہاں آباد میں رنگ رلیاں منا رہا تھا، اسی دوران میں خواص خاں قلعدار کی عرضداشت پہنچی جس میں لکھا تھا کہ ۴ ربیع الاول ۱۰۵۹ھ کو شاہ عباس زبردست لشکر کے ساتھ قندھار پر حملہ کرنے کے لئے صفاہان سے نکلا ہے اس کا ارادہ ہے کہ جب کابل اور قندھار کے راستے شدتِ برف باری سے بند ہو جائیں تو خود آ کر قندھار پر چڑھائی کرے۔ شاہجہاں نے اورنگ زیب کو سعد اللہ خاں کی اتالیقی میں قندھار بھیجا، فوج میں سادات، افغان اور راجپوت بہادر شامل تھے، جس کی تعداد سوار اور پیادے ملا کر ستر ہزار تھی۔

لشکر بڑے اہتمام سے روانہ ہوا تنخواہ کے علاوہ سو روپیہ ہر شخص کو امداد کے طور پر دیا گیا جو لوگ نقد تنخواہ پاتے تھے ان کو تین مہینے کی تنخواہ پیشگی تقسیم ہوئی۔ شاہجہاں کو اس مہم میں اتنی عجلت تھی کہ اورنگ زیب کو باقاعدہ رخصت کرنے سے پہلے ہی حکم دیا گیا کہ ملتان کے راستے سے روانہ ہو جائے اور ملتان پہنچ کر لشکر جمع کرنا شروع کر دے۔ اس کے لئے خلعت اور گھوڑا بعد میں سعد اللہ خاں کے ساتھ بھیجا گیا۔ بادشاہ بھی کابل کے ارادے سے ربیع الاول میں روانہ ہو گیا۔ ابھی وہ دریائے چناب کے پار نہ ہوا تھا کہ ایک گرز بردار نے قندھار سے آ کر بیان کیا کہ قندھار پر قزلباشوں کا قبضہ ہو گیا۔

اورنگ زیب اور سعد اللہ خاں کو جلد قندھار پہنچنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ یہ بھی کہہ دیا گیا تھا کہ تمہارے پہنچنے تک قلعہ پر ایرانی قابض ہو جائیں تو انہیں استقلال حاصل کرنے کا موقع نہ دینا اور فوراً پہنچ کر قلعہ کا محاصرہ کر لینا۔ مگر اورنگ زیب کو ملتان میں لشکر جمع کرنے میں دیر ہوئی اور سعد اللہ خاں کو بے وقت بارش کے باعث اور اورنگ زیب کے انتظار میں ٹھہرنا پڑا، صفر کے وسط میں جب دونوں لشکر قریب آئے تو خلیل بیگ کے خط سے معلوم ہوا کہ دروں میں ابھی برف جمی ہوئی ہے اگر بارش نہ ہوئی تو مشکل سے ایک مہینے میں یہ راستہ آمد و رفت کے قابل ہو سکے گا۔

اسی دوران میں متواتر یہ اطلاعات آئیں کہ قندھار کے قلعہ پر قزلباش قابض ہو گئے چنانچہ بادشاہ نے تاکیدی احکام جاری کئے کہ جلد قندھار پہنچو، جس راستے سے جانا طے ہوا تھا مجبوراً اس کو چھوڑ کر پشاور کے پہاڑوں پر سے جانے کا ارادہ کیا گیا پہاڑ بہت اونچے تھے، فوج کو پیدل سفر کرنا پڑا بہت سا ضروری اور غیر ضروری سامان چھوڑ دیا گیا راستے میں زبردست مشکلات پیش آئیں۔ اکثر جانور بیکار ہو گئے۔ غلہ بہت گران ہو گیا۔ بہ ہزار دقت و دشواری ۱۲ ربیع الاول کو فوج کابل میں داخل ہوئی۔

یہاں ضروریات کا انتظام کرنے کی غرض سے پندرہ روز قیام ہوا اور ربیع الثانی کے شروع میں کابل سے کوچ کر کے غزنیں پہنچے۔ گرانی بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ کھانے پینے کی چیزیں دستیاب نہ ہوتی تھیں خاص خاص لوگوں کو روپیہ کا ایک سیر غلہ اور ڈیڑھ سیر گھاس ملتی تھی۔ لشکر سخت پریشان تھا۔ پھر یہ اطلاع ملی کہ غزنیں سے قندھار تک قزلباشوں کا تسلط ہے اور ضروریات بہم پہنچانا قطعاً ناممکن ہے۔ سعد اللہ خاں نے ان سب امور کی اطلاع بادشاہ کو دی وہاں سے حکم آیا کہ ایسے موقعوں پر آرام و آسائش کی تلاش فضول ہے جس طرح بھی ممکن ہو قندھار پہنچنے کی کوشش کرو۔

پندرہ دن قیام کرنے کے بعد پھر کوچ ہوا۔ ۱۴ جمادی الاول ۱۰۵۹ھ کو قندھار کے مقابل پہنچے اور مورچے وغیرہ بنانے میں مصروف ہو گئے۔

۱۵ جمادی الاول کی دوپہر کو راجہ مان سنگھ گوالیاری اور بخشی سعد اللہ خاں نے مل کر قلعہ کے برجوں پر حملہ کیا جس کا جواب اہلِ قلعہ نے بہت سخت دیا، اور حملہ آور قلعہ کے برج تک نہ پہنچ سکے لیکن شہزادے کے حکم سے جانوں کو خطرے میں ڈال کر جہاں پہنچ گئے تھے وہیں قائم رہے۔

دوسری طرف سے سعد اللہ خاں وزیر نے بڑی کوشش اور جانفشانی سے سرنگیں کھود کر قلعہ کی خندق تک پہنچا دیں تیسری طرف سے رستم خاں اور قاسم خاں نے بھی خند[illegible]

محراب خاں جو حکومتِ ایران کی

زمانۂ حکومت میں اس معاہدے کی خلاف ورزی ہوئی اور رانا جگت سنگھ نے قلعہ کو درست کرلیا۔ شاہجہاں کو معلوم ہوا تو اس نے تحقیق کے لئے ابدال بیگ کو چتوڑ بھیجا کہ خود قلعہ کو دیکھ کر آئے۔ اس نے واپسی پر بیان کیا کہ واقعی قلعہ کی مرمت کی گئی ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے سعد اللہ خاں کو حکم دیا کہ قلعہ منہدم کردو اور رانا سرکشی کرے تو اس کی بھی گوشمالی کرو۔ وہ تیس ہزار سپاہ لے کر گیا۔ مگر رانا نے داراشکوہ کی معرفت بادشاہ سے اظہارِ اطاعت کیا اور شاہزادے نے سفارش کی۔ چنانچہ بادشاہ نے سعد اللہ خاں کے نام فرمان بھیجا کہ صرف قلعہ کو منہدم کرکے چلے آؤ۔ یہ واقعہ سنہ ۱۰۶۵ھ کا ہے۔

انتقال: سعد اللہ خاں چار یا پانچ مہینے سے فالج (بعض نے قولنج لکھا ہے) میں مبتلا تھا۔ بادشاہ چند بار عیادت کو گیا ایک مرتبہ داراشکوہ بھی باپ کے ساتھ اُسے دیکھنے گیا۔ بادشاہ نے متعدد طبیبوں سے علاج کرایا۔ لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ آخر میں تقرب خاں کے زیر علاج تھا کہ ۲۲ر جمادی الاخرے سنہ ۱۰۶۶ھ کو سینتالیس سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوگیا۔

بادشاہ کو اس قدر صدمہ ہوا کہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر روتا تھا۔ اس کا بڑا بیٹا لطف اللہ خاں پندرہ برس کا تھا بادشاہ نے اس کو ہفت صدی صد سوار کا منصب دیا دوسرے بیٹوں اور اس کے وابستگان کا یومیہ مقرر ہوگیا۔ یار محمد سعد اللہ خاں کا بھانجا تھا اس کو سہ صدی شصت سوار کا منصب ملا۔ عبد النبی کو جو سعد اللہ خاں کی جاگیر کا مدار المہام اور اس کا معتمد تھا ہزاری بنایا۔ غرض سعد اللہ خاں کے اکثر ملازموں کو بادشاہ نے ان کے شایانِ شان منصب اور وظائف عطا کئے۔

کوثر چاندپوری

حدیثِ ارتقا

قیدِ امکاں سے جدا کوئی نظر پیدا کر
تو نئی اپنے لئے شام و سحر پیدا کر

حُسنِ فطرت کے حجابوں کی شکایت کب تک
دیکھنے کی ہے تمنا تو نظر پیدا کر

ہے غمِ پیہمِ الفت ہی متاعِ ہستی
عیش و راحت سے گذر، دردِ جگر پیدا کر!

ہو چکے شیخ و برہمن کے طریقے پامال
تو کوئی چیز بہ اندازِ دگر پیدا کر

یہ فنا زار بھی تمہیدِ بقا ہے حاجی
شانِ ہستی کو تو پامال نہ کر، پیدا کر!

حاجی سرحدی

پریم کی شکتی

بس میں آوے جو دنیا کے پریم کے بس میں ہوئے ایسا نہ منتر اور ہے دوجا ایسا نہ جادو کوئے
پریم ہے سکھ کا ساگر، پریمی سکھ کی نندرا سوئے
پریم کو تج کر کیوں رے مورکھ اپنا جیون کھوئے

پتہ پتہ میں کن کن میں بندھی پریم کی ڈور پریم کے کارن گھوم رہے ہیں تارا گن چہوں اور
پریم ہے سکھ کا ساگر، پریمی سکھ کی نندرا سوئے
پریم کو تج کر کیوں رے مورکھ اپنا جیون کھوئے

چاند اور سورج پریم کا دونوں برساتے ہیں نور جگ جیون کا پنتھ دکھاویں کریں اندھیرا دور
پریم ہے سکھ کا ساگر، پریمی سکھ کی نندرا سوئے
پریم کو تج کر کیوں رے مورکھ اپنا جیون کھوئے

پی کر دودھ پریم کا پیارے منی اگل دے ناگ ہرن چوکڑی بھول کے بیٹھے پریم کا سن کر راگ
پریم ہے سکھ کا ساگر، پریمی سکھ کی نندرا سوئے
پریم کو تج کر کیوں رے مورکھ اپنا جیون کھوئے

پریم کی ساری پھلواری ہے جس کے ہیں یہ پھول پریم کی گنگا اس میں بہا وے پریت کی ریت نہ بھول
پریم ہے سکھ کا ساگر، پریمی سکھ کی نندرا سوئے
پریم کو تج کر کیوں رے مورکھ اپنا جیون کھوئے

پریم ہے سکھ کا ساگر، پریمی سکھ کی نندرا سوئے پریم کی شکتی کھو کر بھارت بیٹھا بیٹھا روئے
پریم ہے سکھ کا ساگر، پریمی سکھ کی نندرا سوئے
پریم کو تج کر کیوں رے مورکھ اپنا جیون کھوئے

اندر جیت شرما

اوشا

مدت سے میرے گھر کا انتظام اوشا کے ہاتھ میں ہے گو ایک متوسط درجہ کے کنوارے مصور کے رہائشی کمروں کے لئے گھر ایسے وزنی لفظ کا استعمال نامناسب معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت ہے کہ اوشا کی زندہ دلی اور حسن انتظام نے میرے کمروں میں گھر کا سا ماحول پیدا کر دیا ہے اور اُن کے درو دیوار سے ویسی ہی اپنائیت اور اُنسیت کی بو آتی ہے جیسی کہ آپ اپنے پیارے گھر سے متوقع ہوتے ہیں۔ جب میں دن بھر کی مسلسل محنت کے بعد شام کو اپنے کمروں کا رُخ کرتا ہوں تو راحت و آرام کے خیال سے میرا دل مسرت اور محبت کے جذبات سے معمور ہو جاتا ہے، اور تھوڑی دیر کے لئے میں دنیا بھر کے افکار سے آزاد ہو کر رہائشی زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے تصور میں محو ہو جاتا ہوں۔ شہر کے پُرشور ہجوم اور گرد آلود بازاروں سے گزرنے کے بعد گھر اور گھر کی پُرامن زندگی کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے جب میں گھر میں قدم رکھتا ہوں تو میری آنکھیں خوشی سے چمک اٹھتی ہیں ہر ایک چیز متبسم اور محبت سے لبریز نظر آتی ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دیواریں خوش آمدید کہنے کے لئے جھکتی ہیں۔ میز پر رکھے ہوئے شمع دان کی لرزتی ہوئی زرد روشنی سے ہمدردی ٹپکتی ہے۔ شاید یہ تنہائی زندگی کی پابندیوں اور مجبوریوں سے واقف ہے جبھی مجھے ہر شام ایسی حسرت بھری نظروں سے دیکھتی ہے!

مجھے یہ سب چیزیں جاندار نظر آتی ہیں، ان میں زندگی دوڑتی دکھائی دیتی ہے، میں نے بارہا چائے دانی کو ہنستے دیکھا ہے، اور اس کی ٹھنڈی ٹھنڈی سطح کو اپنی آنکھوں سے لگایا ہے تنہائی میں جب اوشا گھر کے کام میں مصروف ہوتی ہے، میں نے گلدان کو گود میں اٹھایا ہے اور اس کے معصوم پھولوں کو سینے سے لگایا ہے، نازک پھولوں کی مخملیں تیلیوں کی دھیمی دھیمی دھڑکن بڑے غور سے سنی ہے اور انہوں نے میری محبت کا اعتراف ہزاروں مرتبہ اپنی پیار بھری نگاہوں سے کیا ہے، موٹے موٹے نَے کی چرٹ اور اُن کا خوشبودار گہرا نیلا دھواں کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے جب وہ نغمہ کی طرح لہراتا ہوا، سینکڑوں بل کھاتا ہوا اوپر کو اٹھتا ہے، تنہائی کی بعض افسردہ راتیں میں نے اسی رنگین دھوئیں کی ریشمی لہریں کے تار شمار کرنے میں کاٹی ہیں شفق کی روشنی میں گرم چائے کے خوشبودار گھونٹ کتنے جان بخش ہوتے ہیں، اور بارہ گھنٹے کے بندھے ہوئے پاؤں کے لئے ٹھنڈے سلیپروں کا نرم مس کتنا پیارا ہوتا ہے، چائے کی نارنجی ڈورے دار پیالی کا خوب صورت چمکتا ہوا کنارہ یا کسی معصوم بچی کے سُرخ ہونٹ!

یہ سب کچھ اوشا کی بدولت ہے کہ میں تجرد کی زندگی اتنے اطمینان اور سکون سے بسر کر رہا ہوں، اوشا کو تعیش کی زندگی اور امیرانہ ساز و سامان سے دلی نفرت ہے، اور جب کبھی میں نے آرائش کے متعلق کبھی کوئی تجویز پیش کی ہے اس نے یہ کہہ کر رد کر دی کہ گھر کو گھر ہی رہنے دو۔ تمہارے ایسے کنوارے گنوار کیا جانیں، خوبصورتی کس بلا کا نام ہے! اس کا یہ مقولہ ہے کہ بیش قیمت اور پُرتکلف چیزوں کے انتظام اور اہتمام سے گھر کی وہ پُرلطف اور آسان زندگی ختم ہو جاتی ہے جو گھر کو گھر بنانے کے لئے از حد ضروری ہے۔ اس کو آرائش کا شوق ضرور ہے، اور اس کی سلیقہ شعار اور نفاست پسند طبیعت نے ہمارے کمروں کو خاصا خوبصورت بنا دیا ہے، مگر وہ ایسی خوبصورتی کی قائل نہیں جو بجائے مسرت و آرام کے وبالِ جان ہو جائے۔ اسی سادگی کے طفیل ہم آزادی اور خوشی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، ملنے والے بھی ہمارے یہاں آ کر خوشی اور اطمینان کا سانس لیتے ہیں، ہمارے ہاں کوئی بھاری قسم کا نمائشی فرنیچر نہیں ہے اور نہ ہی دستور کے مطابق در و دیوار پردوں اور تصویروں سے لپے ہوئے ہیں۔ سفید سفید بلند دیواریں کھڑکی کے انگوری پردے کی ملائم روشنی میں کتنی پیاری معلوم ہوتی ہیں۔ اگر کوئی چیز اسراف کی ہے تو وہ تازہ ترشے ہوئے پھولوں کا گلدستہ ہے جو صبح و شام ہمارے بڑے کمرے کی زینت ہوتا ہے، اس کمزوری کا احساس ہم دونوں کو ہے مگر پھولوں کے بارے میں ہمیں مجبور سمجھنا چاہیئے۔

آج نومبر کی پہلی شام ہے، خدا خدا کر کے گرمی کے خوفناک اور آتشیں مہینے تمام ہوئے اور دنیا کو اس عذاب سے نجات ملی، ۱۲ گھنٹے کا پہاڑ سا دن، کڑاکے کی دھوپ، جھلستی ہوئی ہوائیں، تانبے کی طرح تپتے ہوئے زمین و آسمان، اللہ اللہ کیا کم عذاب ہے! ایک نحیف انسان کی روح ذ... ہوتی ہے۔

ہم شہریوں کے لئے جنھوں نے اینٹ اور پتھر کے تنور نما مکانوں میں تڑپ تڑپ کر یہ گرمی کے مہینے گذارے تھے، پیاری سردی کی آمد کتنی دلفریب اور جاں بخش ہے، اوشا آج صبح ہی سے سردی کی آمد کے انتظام میں منہمک تھی، کمرا پرانے گرم کپڑوں کی مانوس خوشبو سے مہک رہا تھا۔ بھورے رنگ میں دار توشے آج پھر کھونٹی پر دکھائی دے رہے تھے، گہرے سبز رنگ کی تمام چینی کی چائے کی پیالیاں چھ ماہ کے بعد آج پھر میز پر نظر آ رہی تھیں، میں نے چائے کے چند رسمی گھونٹ پیئے اور باہر جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا، جیب میں کچھ رنگین چاک تھے، شام کی دلفریبیوں کے نقش لینے کا ارادہ تھا، چلتے چلتے اوشا نے جلدی کی تاکید کردی، اوشا نہیں چاہتی تھی کہ آج میں کہیں جاؤں۔ مگر مجھے شام کی دوشیزہ سحر کاریاں کھینچ رہی تھیں۔ چلتے وقت اوشا نے کچھ ایسی معنی خیز نظروں سے دیکھا کہ میں گھبرا سا گیا، میرے قدم ٹھٹھک سے گئے مگر ہمت کرکے چلا ہی آیا۔

اُف! کتنی سیلی شام تھی! کہیں کہیں ہلکے ہلکے رنگوں کے سوا چاروں طرف زردی چھائی ہوئی تھی، فضا ایک حسین مریضہ کی طرح مضمحل نظر آ رہی تھی۔ کتنا پیارا سماں تھا،

فطرت کی یہ سادگی کتنی جاذب نگاہ تھی! تالاب میں سنگھاڑے کی بیل پھیل رہی تھی، سبز پتے تیرتی ہوئی کٹوریاں معلوم دیتے تھے، جیسے کسی نے چاندی بھرنے کے لئے قطار در قطار رکھ دی ہوں، میں چاہتا تھا کہ ان دلکش مناظر کو کاغذ پر لے لوں مگر طبیعت اچاٹ ہو گئی تھی، مجھے بار بار اوشا یاد آ رہی تھی، چاروں طرف گہری خاموشی تھی، آج پرندے سویرے ہی واپس آ گئے تھے، خنکی بڑھ رہی تھی، میں گھر کے خیال سے واپس چلا آیا، پانچ سال ہوئے ہم نے مشترک رہائش اس وعدے پر شروع کی تھی کہ شادی بیاہ کے معاملے میں ہم ایک دوسرے کے پابند نہ ہوں گے،

میں نے اوشا کو ہمیشہ صرف ایک ہنس مکھ، سلیقہ شعار اور عقل مند عورت سمجھا، اس کی شکل وصورت کا جائزہ لینے کی کبھی کوشش نہ کی، اور نہ مجھے قدرت کی نیرنگیوں نے اتنی فرصت دی تھی کہ میں کسی کے کاکل دراز یا لب ہائے لعلیں کی طرف متوجہ ہوں مگر اوشا کی محبت آمیز مہربانیاں بعض دفعہ حد سے بڑھ جاتی تھیں اور مجھے مجبوراً اس کو وہ عہد یاد دلانا پڑتا تھا۔ مگر آج مجھے اپنی شکست کے آثار نظر آ رہے تھے!

میرا دل عجیب قسم کے خیالات اور کشمکش کا مسکن بنا ہوا تھا، مگر میں ہر ممکن کوشش کر رہا تھا کہ ان خیالات کے سلسلہ کو توڑ دوں۔

گھر پہنچا تو اوشا کو مجسم انتظار پایا، میں بدستور نیچی نگاہیں کئے داخل ہوا، اچانک میری نگاہ اس کے ننھے ننھے پاؤں پر پڑی، آہ، کتنے خوبصورت تھے وہ! گول گول ایڑیاں اور پیارے پیارے ناخن، زندگی سے لبریز! مجھے کبھی اس کو غور سے دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا، آج جو نگاہ پڑی تو دیر تک دیکھتا رہا، انگور کی بیل کی طرح رس بھری سڈول باہیں، اور ان میں نیلی نیلی رگیں، میں محو حیرت ہو کر رہ گیا۔ ہائیں! وہ اس قدر حسین تھی!!! پھر چونکا اور سیٹی بجاتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

چولہے میں آگ روشن تھی، کیتلی میں پانی زور سے کھول رہا تھا، کافی سردی ہو گئی تھی، میں نے اپنا پرانا سیاہ کوٹ پہن لیا، اس کی گرمی سے میری طبیعت بہت چمک گئی، فرط مسرت سے میں نے بوڑھے وفادار کوٹ کو چوم لیا، اس نے بھی گرم جوشی سے اپنے عمر رسیدہ ہونٹوں سے اپنی محبت کے اظہار میں کوتاہی نہ کی۔

اوشا خوشی سے ادھر اُدھر پھر رہی تھی، اس کے ہونٹ مسکراہٹ اور مسرت سے تھرتھرا رہے تھے، میز پر کھانا آ چکا تھا، میں اوشا کا منتظر تھا کہ حسب دستور وہ مجھے بلانے آئے گی مگر اس نے بجائے خود آنے کے شرارت سے کھانے کی گھنٹی بجا دی، حیرت سے میں نے جو نظریں اٹھائیں اوشا میری طرف محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی، شرم سے وہ دوہری ہو گئی! آج رات اس نے توس پر بڑا موٹا مکھن پھیلایا تھا۔ کھانا بھی آج بہت لذیذ معلوم ہو رہا تھا اور نہ معلوم کیوں بات بات پر ہنسی آ رہی تھی، چاند بہت اونچا آ چکا تھا، میری درخواست پر اوشا نے چند دیہاتی گیت سنائے خوشی سے میرے آنسو نکل آئے، میں چاہتا تھا کہ اُسے آغوش میں لے لوں، مگر اس نے شرارت آمیز مسکراہٹ سے مجھے وہ وعدہ یاد دلایا۔

"بہت اچھا، اب دیر ہو گئی ہے، خدا حافظ" میں نے بگڑتے ہوئے کہا، وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی اور زور سے چلائی "نہیں نہیں، آج کی رات دیر سا کوئی لفظ نہیں"۔ اور مجھے واپس کھینچ لیا،

شمع دان کی دھیمی روشنی میں، میں نے اپنی شکست کا اعتراف کر لیا!

اب شمع دان کی روشنی میں حسرت نہیں نظر آتی بلکہ محبت ٹپکتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

خلیق احمد فاروقی

دنیائے ادب

اردو

نئے ادب کی ضرورت پر چند رائیں

ادب محض دل بہلاؤ کی چیز نہیں ہے۔ دل بہلاؤ کے سوا اس کا کچھ اور بھی مقصد ہے۔ وہ اب محض عشق عاشقی کے راگ نہیں الاپتا بلکہ حیات کے مسائل پر غور کرتا ہے۔ اُن کا محاکمہ کرتا ہے۔ وہ اب تحریک یا ابہام کے لئے حیرت انگیز واقعات تلاش نہیں کرتا۔ یا قافیہ کے الفاظ کی طرف نہیں جاتا بلکہ اس کو ان مسائل سے دلچسپی ہے جن سے سوسائٹی کے افراد متاثر ہوتے ہیں۔ اُس کی فضیلت کا موجودہ معیار جذبات کی وہ شدت ہے جس سے وہ ہمارے جذبات اور خیالات میں حرکت پیدا کرتا ہے۔ اخلاقیات اور مذہبیات کی منزلِ مقصود ایک ہے۔ صرف اُن کے طرزِ خطاب میں فرق ہے۔ اخلاقیات دلیلوں اور نصیحتوں سے عقل اور ذہن کو متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ادب نے اپنے لئے کیفیات اور جذبات کا دائرہ چُن لیا ہے۔ ہم زندگی میں جو کچھ دیکھتے ہیں۔ یا ہم پر جو کچھ گزرتی ہے وہی تجربات اور وہی چوٹیں تخیل میں جا کر تخلیق ادب کی تحریک کرتی ہیں۔ شاعر یا ادیب میں جذبات کی جتنی ہی شدتِ احساس ہوتی ہے۔ اتنا ہی اس کا کلام دلکش اور بلند ہوتا ہے۔ جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح نہ پیدا ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے۔ ہم میں قوت اور حرکت نہ پیدا ہو۔ ہمارا جذبۂ حُسن نہ جاگے، جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کے لئے سچا استقلال نہ پیدا کرے وہ آج ہمارے لئے بیکار ہے اُس پر ادب کا اطلاق نہیں ہو سکتا زمانۂ قدیم میں مذہب کے ہاتھ سوسائٹی کی لگام تھی۔ انسان کی روحانی اور اخلاقی تہذیب مذہبی احکام پر مبنی تھی اور وہ تخویف یا تحریص سے کام لیتا تھا۔ عذاب و ثواب کے مسائل اس کے آلۂ کار تھے۔ اب ادب نے یہ خدمت اپنے ذمے لی ہے اور اس کا آلۂ کار ذوقِ حُسن ہے۔ وہ انسان میں اس ذوقِ حسن کو جگانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسا کوئی انسان نہیں جس میں حُسن کا احساس نہ ہو۔ ادیب میں یہ ذوق جتنا ہی بیدار اور پُر عمل ہوتا ہے اتنی ہی اس کے کلام میں تاثیر ہوتی ہے۔ فطرت کے مشاہدے اور اپنی ذکاوتِ احساس کے ذریعہ اس جذبۂ حُسن کی اتنی تیزی ہوجاتی ہے کہ جو کچھ قبیح ہے غیر مستحسن ہے۔ انسانیت سے خالی ہے۔ وہ اس کے لئے ناقابلِ برداشت بن جاتا ہے نیز وہ بیان اور جذبات کی ساری قوت سے وار کرتا ہے۔ یوں کہئے کہ وہ انسانیت کا، علویت کا، شرافت کا علمبردار ہے جو پامال ہیں، مظلوم ہیں، محروم ہیں چاہے وہ فرد ہوں یا جماعت ان کی حمایت اور وکالت اُس کا فرض ہے۔

. . . .

ادیب کا مشن محض نشاط اور محفل آرائی اور تفریح نہیں ہے۔ اس کا مرتبہ اتنا نہ گرائیے وہ وطنیت اور سیاسیات کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں بلکہ اُن کے آگے مشعل دکھاتی ہوئی چلنے والی حقیقت ہے"۔

. . . . . .

ہم ادب کو محض تفریح اور تعیش کی چیز نہیں سمجھتے۔ ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو۔ آزادی کا جذبہ ہو حُسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت اور بے چینی پیدا کرے۔ سُلائے نہیں کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی"۔

پریم چند مرحوم

. . . . . .

ہمارے لئے بزرگانِ سلف نے ادب کا ایک بہت بڑا ترکہ چھوڑا ہے اس میں خوبیاں بھی ہیں خرابیاں بھی ہیں۔ ہمارا کام اپنی ضروریات کے مطابق ان کمیوں کو پورا کرنا اور نئی نئی چیزوں کا پیدا کرنا ہے۔ ہماری اکثر پرانی قسم کی غزلوں میں ایک خیالی صنم کے عشق میں بے قرار رہنا مصنوعی محبت کی نوک

جھڑنک، مبالغہ زمین و آسمان کے قلابے ملانا۔ سرد آہیں بھرتے رہنا۔ ہر گھڑی مقدر کا رونا رونا۔ کفن سر سے باندھے رہنا۔ یہ ایک الٹی قسم کی ذہنیت اور ایک غیر فطری اور بیکار اور لغو زندگی کی علامات ہیں ع۔ غنچہ چٹکا تو کہا سر میں دھمک ہوتی ہے۔ اب نہ ایسی خیال آرائی برداشت کر سکتی ہے نہ ایسی نازبرداریاں ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ ہم اپنے ملک الشعراء کے اس قول پر کان دھریں کہ ؎

تدبیر نہ کر فایدہ تدبیر میں کیا ہے • کچھ یہ بھی خبر ہے تری تقدیر میں کیا ہے

بلکہ ہمیں اپنے "ترجمان حقیقت" کی اس ہدایت پر عمل کر دکھانا ہے کہ ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندہ سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

راقم نے سکول کے دنوں میں جب یہ شعر سُنا ؎

جو چمن سے گزرے تو اے صبا تو یہ کہنا بلبل زار سے
کہ خزاں کے دن بھی قریب ہیں نہ لگانا دل کو بہار سے

تو فوراً اپنی تک بندیوں کے لئے زار تخلص اختیار کر لیا۔ لیکن جب ذرا ہوش سنبھالا اور دنیا کا نیا انداز دیکھا تو معلوم ہوا کہ مشرق و مغرب میں "بلبل زار" اور "زار زار دس" دونوں کا زمانہ ہو چکا ہے۔ ہم ابھی یہی رونا رو رہے ہیں کہ "وہ کونسا غم ہے کہ جو دنیا میں نہیں ہے"! اور "آہستہ خرام بلکہ مخرام" اور وہاں بیل گاڑی کی بجائے موٹر کار اور ہوائی جہاز اور ریڈیو ایجاد کیا گیا کچھ رگ رگ میں زندگی کا خون دوڑ رہا ہے۔ رد ڑ زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔!

جناب جوش ملیح آبادی خوب لکھتے ہیں: "شبابِ محبت کا واسطہ، اپنے ادبیات میں حیات و بیداری کا خون دوڑایئے اور وطن عزیز کے لئے دلوں کی طرح دھڑکتے ہوئے زندہ الفاظ کو جوڑ کر ایک نیا باب الہند تیار کیجئے جس کی سنہری اور بلند محراب کے نیچے سے زندہ کر دینے والے انقلابات کے نقرئی جلوس فوج در فوج اور قطار اندر قطار ہندوستان میں داخل ہونا شروع ہو جائیں۔

یہ درست ہے کہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" ہمارے ادب کے چمن میں بجائے بلبل و قمری کے کوئل اور فاختہ کی ضرورت ہے۔ ہندوستانی فضا پیدا کرو، مقامی افسانہ لکھو، ہندوستان کے مذاہب کا تذکرہ کرو لیکن ساتھ ہی گھر سے نکل کے دیکھو ہندوستان والو۔" دیکھو کہ دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ مغرب کی نئی زندگی کو دیکھو وہاں کے تازہ ادب کو دیکھو۔ کیونکہ آزادی کی، تنظیم کی، منصوبہ بندی کی، اشتراکیت کی، اور عدل و مساوات کی موجیں اس کے طوفانی سمندروں میں اچھل رہی ہیں۔ تم میں بھی نئی زندگی کا احساس پیدا ہوگا تو نئے سے نئے خیال پیدا ہوں گے اور وہ اپنے لئے خود بخود اظہار کے نئے طریقے ڈھونڈ لیں گے اس طرح ایک نئی طرز تحریر، نئے الفاظ اور ایک نیا ادب پیدا ہوگا اور جو خیال ایک صحیح قسم کی زندگی سے پیدا ہوگا جو اپنے لئے مشکل الفاظ نہ تلاش کرے گا بلکہ وہ دل سے نکل کر دل میں آسانی سے جگہ پیدا کرے گا۔ ہمارا مقصد ہونا چاہیئے عام لوگوں کی تعلیم و ترقی۔ اس کے لئے ضرورت ہے اصلاح شدہ مشاعروں کی آسان فلمی ڈراموں کی، اور رسالوں خصوصاً روزانہ اخباروں میں آسان عام فہم زبان میں نئے اصلاحی و انقلابی خیالات کی، لمعات، کیفیات، ان مجہولات کی جگہہ اگر دل سے دل کی باتیں ہوں، سیدھے سادے جذبات ہوں۔ دنیا کی تازہ تحریکوں کا نقشہ ہو سائنس کی روز افزوں ترقی کا بیان ہو تو ہماری جاہل ناواقف قوم ادبیات سے کتنا فایدہ اٹھائے پھر ادب اُس کی بیداری کا ذریعہ بن جائے اور ایک نئی زندگی کی بنیاد پڑے۔ کہیں کہیں کوئی آواز بلند ہو رہی ہے۔ مغربی ادب کے مطالعہ اور اقبال کی حیرت انگیز شاعری نے ایک نئے دور کا آغاز ضرور کیا جس سے بعض نوجوان مصنّف اور شعرا متاثر ہوئے لیکن اس کے ساتھ ہی بدقسمتی سے نشاط پسندی اور ایک غلط قسم کی "ٹیگوریت" اور نام نہاد روحانیت" نے پھر ہاتھ پاؤں شل کر دئیے"! تو دو پٹہ چن رہی تھی اور میرا دل دھڑک رہا تھا" یا "اے شاہد حقیقی! میں تیرے نور جمال سے بے اجر ہو کر افتاں وخیزاں آرہا تھا" وغیرہ وغیرہ۔ اس دل کی دھڑکن اور اس اندھا دھند نام نہاد حقیقت پرستی کی روک تھام کی اشد ضرورت ہے۔ فطری خیالات کی اور آسان زبان کی حاجت محض اس لئے نہیں کہ ہماری زبان دوسری زبانوں کا مقابلہ کامیاب طور پر کر سکے بلکہ زیادہ تر اس لئے کہ وہ خود ہمارے لئے مفید ثابت ہو اور ہماری صحیح تعلیم و تربیت کی ضامن بنے۔ پھر کچھ شبہ نہیں کہ دوسرے لوگ اس سے ضرور متاثر ہوں اور دیکھیں کہ کیسے ہم نے اپنی زبان کو اور ہماری زبان نے ہمیں شاہراہ زندگی پر سیدھے رستے ڈال دیا ہے"!

میاں بشیر احمد بی اے

ہمارا ملک ہر قسم کے مذہبی توہمات کا شکار رہے مذہبی تعصب یا

روحانیت نے جو گل ہندوستان میں کھلائے ہیں سب کو معلوم ہیں۔ روحانیت کے علاوہ ہمیں اپنے اخلاق پر بھی ناز ہے، ممکن ہے کہ ناز بجا ہو، مجھے اس سے بحث نہیں۔ رونا اس بات کا ہے کہ مذہب، روحانیت اور اخلاق ادبی دنیا میں بھی گھس گئے ہیں اور اس بری طرح کہ نکالے نہیں نکلتے۔ ادبی فن کو مذہب روحانیت اور اخلاق کے ترازو میں تولا جاتا ہے۔ جب میں اپنے تعلیم یافتہ دوستوں کی زبانی سنتا ہوں کہ فلاں کہانی، فلاں ڈراما یا فلم دھارمک ہے یا اخلاق اور روحانیت سے پر ہے تو مجھے یہ خیال کر کے رنج ہوتا ہے کہ سیاسی سوراج کی طرح ہمارا ادبی سوراج بھی ابھی کوسوں دور ہے۔ ہر ایک ملک اور زمانہ کا اخلاق مختلف ہے، بدلتا رہتا ہے اور بدلتا رہے گا مگر خوبصورتی ایک اٹل چیز ہے۔ خوبصورتی کے پروانے مذہب وملت رسم و رواج کی بندشوں سے آزاد ہوتے ہیں۔ ایک غزل یا افسانہ کو اخلاقی یا روحانی یا مذہبی نظر سے دیکھنا ایسا ہی بے معنی ہے جیسا کہ ایک پھول سے ہم پوچھیں کہ تیرا مذہب کیا ہے اور تیرے پیدا ہونے کا راز کیا ہے اور تو اپنی خوشبو اور خوبصورتی کو بے شرمی سے باغ میں کیوں بکھیر رہا ہے . . . !!

پروفیسر بھوپال سنگھ ایم اے ڈی لٹ،

. . .

". . . یہ زمانہ غپ شپ اور قصہ کہانیوں کا نہیں ہے۔ شاعری کرنا ہے تو افسانوں کو چھوڑیئے۔ نقاشی مت کیجئے بلکہ فوٹوگرافری کیجئے ورنہ آپ کی نقاشی کے ایک سے ایک بڑھ کر نمونے فوٹو کی ایک کھنڈر کی تصویر پر سے قربان کر دیئے جائیں گے . . . یورپ کی افسانہ نگاری کا عروج اس میں ملتا ہے اور اگر آج نئی پود اپنی افسانہ نگاری میں سے گل و بلبل نکال پھینکے اور سیدھی سادی وقائع نگاری پر آ جائے تو ناممکن کہ ہم یورپین افسانہ نگاروں سے بڑھ نہ جائیں۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ دلچسپ واقعات روس میں تو ہوتے ہوں مگر ہندوستان میں نہ ہوتے ہوں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ چونکہ ہندوستان میں سیکڑوں مذاہب، رسمیں، قومیں، زبانیں اور روس اور فرانس سے کہیں زیادہ اقسام کی ذہنیتیں موجود ہیں قدم قدم پر طرح طرح کے قانون ہیں لہٰذا بہ نسبت روس اور فرانس کے ہندوستان کی معاشرت ایسے ایسے تماشہ کے واقعات پیش کرتی ہے جن کے عجیب و غریب پلاٹ دوسری جگہ مرتب ہونا ممکن ہی نہیں۔ چنانچہ میرا قول ہے کہ "جو دیکھو وہ لکھو، اور جو دکھائی دے وہ لکھو۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی

". . . ایک طرف پولیس کا وہ پنشن خوار داروغہ ہے جو تمام عمر اپنی فرعونیت اور ہوس پرستی کا مظاہرہ کرنے کے بعد تسبیح کے دانوں پر اپنے گناہوں کا شمار کر رہا ہے۔ اُسے ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جو اُس کو رُلانے اور رسلانے میں مدد دے سکیں۔ پھر وہ مولوی ہے جو دین کے پردے میں دنیا دار ہے جس کی ہوس پرستی کو اشعار کے اس ناپاک دفتر سے ایک گونہ تسکین ہوتی ہے اور وہ تعلیم زدہ لڑکیاں ہیں جو زن مرید شاعروں کی ٹھنڈی سانسیں سن کر کسی مجنون کے انتظار میں ہیں۔ وہ ایسی کہانیاں پڑھنا چاہتی ہیں جن کی ہیروئن وہ خود ہوں اور جن کے ہیرو خودکشی کر کے بھیڑوں کی طرح تڑپ رہے ہوں۔ کیا آپ کی آیندہ کاوشیں اُن ہی کے لئے وقف ہوں گی۔

دوسری طرف وہ کسان ہے جو سماج کا سنگِ بنیاد ہے زمیندار اور سود خور جونک کی طرح اس کا خون پی رہے ہیں مولوی اس پر خودگزاری اور صبر و شکر کا جادو پھونکتے ہیں اُس کی بیوی روٹیوں کے لئے عشوہ فروشی پر مجبور ہے۔ اُس کے بچے بھوک سے تنگ آ کر آپ کی جیب پر گھات لگائے ہوئے ہیں۔ وہ مزدور ہے جو سماج کی عمارت کا ستون ہے وہ مال اس لئے پیدا کرتا ہے کہ منافع کے نام سے ایک دوسرا شخص اُسے ہتیالے جس کے لئے لغت میں مالک کا لفظ تراشا گیا ہے۔ قید خانہ کی کوٹھڑیوں سے بدتر جھونپڑیوں میں پلیگ اور ہیضہ میں تڑپ کر وہ بھوکا اور ننگا مزدور اس حسرت میں مر جاتا ہے کہ مارواڑی کا سانڈ یا کسی امیر کا کتا کیوں نہ ہوا۔ کیا اس کے حالِ زار نے کبھی آپ کے دل میں چٹکی لی ہے۔ کیا کبھی آپ نے سوچا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کیا کبھی ان اسباب و علل کو مٹانے کا خیال آپ کے ذہن میں آیا ہے۔ اگر نہیں تو آپ ادب کے لئے باعثِ ننگ ہیں۔ ایسے ادیبوں کے لئے گردیا کہتا ہے:۔

کیا تم مصنف بننے کی آرزو رکھتے ہو؟ تو اپنے ملک کے مصائب کی داستان پر نظر ڈالو اور اگر اس کے بعد تمہارا دل خون نہیں ہو جاتا تو اپنے قلم کو پھینک دو۔ اس قلم کا مصرف صرف یہ ہے کہ تمہارے بے حس دل کی ناپاکی کا پردہ فاش کرتا رہے"

اختر حسین رائے پوری بی اے

"شاہجہاں"

کیفیات

اُف وہ روئے تابناک و چشمِ تر میرے لئے
ہائے وہ زلفِ پریشاں تا کمر میرے لئے

ہر نفس میں ایک دنیائے محبت نَو بہ نَو
ہر نظر میں اک پیامِ تازہ تر میرے لئے

کچھ تجاہل، کچھ تغافل، کچھ توجہ، کچھ غرور
روز و شب میرے لئے، شام و سحر میرے لئے

وہ رُخِ رنگیں پہ انوارِ محبت زرد، زرد
وہ لبِ نازک پہ طوفانِ شرر میرے لئے

صبح سے تا شام نظروں کو مری ہے جستجو
شام سے تا صبح آنکھیں سوئے در میرے لئے

سر سے پا تک آہ وہ اک پیکرِ حُسنِ حزیں
چار جانب دیدۂ حسرت نگر میرے لئے

سرد سرد آہوں میں تاثیرِ محبت گرم گرم
خشک خشک آنکھوں میں جوشِ اشکِ تر میرے لئے

جوشِ غم، جوشِ حیا، آغازِ عشق، احساسِ حُسن
اک قیامت سی قیامت سر بسر میرے لئے

یاس و حرماں، شوق و اُمید، آرزو و بے دلی
کشمکش سی کشمکش آٹھوں پہر میرے لئے

حیف وہ لغزیدہ لغزیدہ قدم [illegible]ری طرف
ہائے وہ دزدیدہ، دزدیدہ نظر میرے لئے

سامنے آتے ہی آ[illegible]س تیز تیز
سینۂ شفاف وہ زیر و زبر میرے لئے

وہ سرک جانا یکا[illegible]تاباں سے نقاب
حیرت افزا رونقِ دیوار و در میرے لئے

عشوہ عشوہ منظرِ حسرت [illegible] رنگ رنگ
جلوہ جلوہ، دعوتِ ذوقِ نظر میرے لئے

اف وہ آغوشِ تہی مشتاقِ آغوشِ دگر
اُف وہ دردِ شوقِ محتاجِ اثر میرے لئے

ہائے وہ رنگیں رُخ و سیمیں تن و زریں کمر
ہائے وہ لعلیں لب و سلکِ گہر میرے لئے

اُس نگاہِ ناز میں وہ ہلکی ہلکی جنبشیں
معنی بے لفظ و شرحِ مختصر میرے لئے

تھرتھراہٹ سی لب و چشم و جبیں پر بار بار
کپکپاہٹ سی وہ سارے جسم پر میرے لئے

شبنم آلودہ وہ آنکھیں وہ گلاب افشا جبیں
وہ دھڑکتا دل، وہ گھبرائی نظر میرے لئے

میں سراپا بے نیازِ ربط و ضبطِ حسن و عشق
وہ مجسم حسن و عشق معتبر میرے لئے

وہ مری آزادِ فطرت وہ مری تمکینِ ہوش
وہ شکستِ حسن وہ نیچی نظر میرے لئے

اول اول آہ وہ دل میں مرے احساسِ عشق
آخر آخر اُف وہ نوکِ نیشتر میرے لئے

اس طرف جو تھیں وہی کیفیتیں سب اس طرف
جو اِدھر تھا سب وہی عالم اُدھر میرے لئے

لحظہ لحظہ وہ مرا ابہامِ سکوتِ مضطرب
لمحہ لمحہ عالمِ نورِ دگر میرے لئے

ظاہری وہ احتیاطِ رسم و راہِ حسن و عشق
باطنی وہ اختلاطِ بیش تر میرے لئے

یک بہ یک کہنا وہ پھر باہوں میں باہیں ڈال کر
میں جگر کے واسطے ہوں اور جگر میرے لئے

جگر مرادآبادی

"عالمگیر"

تعظیم نہ کر

آزاد منش رہ دنیا میں، پروائے امید و بیم نہ کر
جب تک نہ ملیں فطرت کے قدم، خم دیکھ سرِ تسلیم نہ کر

سینے میں ہے اُس کے سوز اگر، شیطاں کے قدم لے آنکھوں پر
بیگانۂ دردِ دل ہے اگر، جبریل کی بھی تعظیم نہ کر

کتنی ہی شعاعیں ابر میں ہوں، خورشیدِ جنوں پر ایماں لا
کتنے ہی دلائل روشن ہوں، دانش کو کبھی تسلیم نہ کر

سانچوں میں برابر ڈھلتا جا، رفتارِ جہاں سے پھیر نہ منہ
تنسیخ تو کیا، اس دفتر میں، جینا ہے تو کچھ ترمیم نہ کر

اے جوش ہجومِ کلفت میں فریاد و فغاں سے کام نہ لے
گھٹ جائے گا اس سے دل کا اثر، اجزائے تپش تقسیم نہ کر

(جوش)

انگریزی

فاحشہ

میرا ایک مصیبت کا مارا دوست، گردشِ ایام سے نہایت ضعیف
وناتواں؛ اوائلِ عمر سے بدنصیبی کا شکار، اب حضرتِ عشق کا ساتھی بنا۔
خبط کی مجبوریوں سے تنگ آکر ایک حسین فاحشہ کو دل دے بیٹھا۔

اس کے میں صاحبِ دوست تھا ـــــ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ
میں طاقت کا مالک تھا

وہ حسین فاحشہ جس کے طفیل بیسیوں بھر[illegible]ے ہوئے گھر اُجڑ گئے . . .
وہ دلفریب طائفہ جس کی نظرِ بد عہدِ جوانی میں کئی [illegible]ن نوجوان کھا گئی۔ وہ
جادو نگاہ جس کے سمندر کی رو میں محبت میرے [illegible]عظیم [illegible]ست کو بہا کر لے گئی۔

وہ میری طرف اس طرح آئی جس طرح بلبل میوے کو دیکھ کر آتی
ہے۔ وہ مجھ سے ایسی مانوس ہوئی۔ جیسے بھونرا پھول سے پریم کرتا ہے،
اُس نے سمجھا گویا اُسے میری ہی تلاش تھی۔

حسن
میں نے کہا۔ ہڈیوں کا پنجر میرا دوست میں صاحبِ [illegible]دوں سے بدتر ہے
میں نے سوچا دوست کو گردابِ بلا سے بچانا الٰہی صداقت کا فرض ہے لیکن
بات یہ ہے کہ عشق کا مارا سمجھانے سے بھ[illegible]تا ہے۔

میرا دوست بے تاب ہو گیا۔ مضطر ہو گیا۔ اُس کے لبوں پر
خاموشی چھا گئی۔ اُس کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کہہ رہا ہے
"تو نے میری آرزوؤں کا خون کیا محسن کش!"
میں حیران تھا۔ میں نے تو اُسے آفت سے بچایا تھا۔

اس حور کو اپنی طرف لانا آسان تھا او[illegible]رح دوست کو بچانا
بھی سہل تھا۔ کیونکہ میرا دوست ٹوٹا ہوا بازو ہا[illegible]ہمت تھی۔ برخلاف

میں خوب ہنسا۔ دوست کو کھو دیا۔
میں نے کیا کیا۔ کیوں کر ایک چڑیل کو اپنے گلے مڑھ لیا۔
میرا دل صاف تھا لیکن پھر بھی میں لوگوں کی نظروں میں گر گیا۔

براؤننگ

امرت لال عندلیب

نقد و نظر

سوزِ ناتمام

حضرتِ عاشق بٹالوی کے بیس مختصر افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے
عاشق صاحب ملک کے اُن چند افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنہوں نے معاشرت اور اس کے مسائل کو غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے، اور پھر اپنی مصورانہ قابلیت سے اُن کا ایسا موثر اور زندگی سے لبریز نقشہ پیش کیا ہے جو پڑھنے والے کو حقایق کی روح سے قریب تریں لے جاتا ہے۔ عورت کی فطرت گناہ کی اصلیت اور انجام معاشرت کی خامیاں اور خرابیاں، زندگی اور زندہ دلی ان افسانوں کے مضامین ہیں، اور ان کو جس بے باکی اور قدرت کے ساتھ مصنف نے نباہا ہے اس کی نظیر ہمیں اپنے اہلِ قلم میں بہت کم ملتی ہے۔ آخری افسانہ تحریر کے لحاظ سے بھی اِن افسانوں میں غالباً آخری افسانہ "حیاتِ تازہ" ہی ہے۔ اگرچہ اس کو پڑھنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اسے افسانہ کہیں یا سوانح عمری یا مضمون، لیکن اس کے باوجود یہ مصنف کا شاہکار ہے۔ اس میں وہ تمام خصوصیات و رجحانات ہمیں یکجا ملتے ہیں جن کی علیحدہ علیحدہ جھلک ہم نے مصنف کے مختلف افسانوں میں دیکھی ہے۔ گویا جس تصویر کا مصور کبھی کبھی کوئی رُخ دکھا یا کرتا تھا آخر میں اس نے اسے ایک حقیقتِ عریاں کی طرح نظروں کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ حادثات کا زیر و بم، جذبات کی گوناگونی، رومان اور حقیقت، اُن کی شیرینیاں اور تلخیاں ایک حقیقی انسانی کردار کی تخلیق کرتی ہوئی اس میں موجود ہیں۔ "غرضکہ زندگی" سے لے کر جو اس مجموعے کا پہلا افسانہ ہے اور اس موضوع پہ ایک فراخ دلانہ تبصرہ ہے "حیاتِ تازہ" تک اس مرقع کا ہر نقش غائر نظر سے دیکھے جانے کا حق رکھتا ہے۔ عاشق صاحب کی زبان اور اسلوبِ تحریر بھی کچھ کم جاذب نہیں اگر انہیں صاحبِ طرز ادیب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ نہایت شستہ و رفتہ اردو لکھتے ہیں، الفاظ کی قدر و قیمت جانتے ہیں، اور ترشی ترشائی منجھی ہوئی ترکیبیں اور فقرات استعمال کرنے میں کمال رکھتے ہیں۔ کتاب ظاہری حیثیت سے بھی بہت اچھی چھپی ہے۔ حجم ۳۲۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ
ملنے کا پتہ: دفتر ادبی دنیا، کمرشل بلڈنگ لاہور۔

تمدنِ عتیق

مولفہ ابوظفر عبدالواحد صاحب ایم اے و محمد عطاء الرحمن صاحب بی اے اساتذہ سٹی کالج حیدرآباد دکن۔ یہ کتاب دنیا کے آغاز سے لے کر کلدانی سلطنت کے خاتمے اور آریاؤں کے آغاز تک کی تاریخ ہے انسان صفحۂ ہستی پر کیسے نمودار ہوا؟ تہذیب و تمدن کا آغاز کب ہوا؟ تمدنی اور معاشرتی حالات نے انسان کے ارتقا کے ساتھ ساتھ کس طرح ترقی کی؟ کہاں کہاں ترقی کے مدارج کی کیا کیفیت تھی؟ سائنس کی تحقیقات اور آثار کی شہادتوں کے ذریعے سے ان سوالات کے اس کتاب میں جواب ہیں۔ اردو زبان میں اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے۔ لیکن فاضل مولفین نے ایسی وضاحت اور سلاست کے ساتھ ارتقا کی اس گتھی کو سلجھایا ہے کہ جو شخص پہلی بار بھی اس مضمون کا مطالعہ کرے گا وہ اس میں دلچسپی اور معلومات کا کافی ذخیرہ پائے گا۔ حجم ۲۲۴ صفحات ہے اور کتاب مجلد ہے۔ قیمت بے تصویر ایڈیشن دو روپے باتصویر ایڈیشن تین روپے۔ مولفین سے طلب فرمائیے۔

مثنویات

منشی محمد امیر احمد صاحب علوی بی اے کی ایک قابلِ قدر تالیف ہے۔ دراصل یہ ایک مبسوط مضمون ہے جو سالنامۂ "نگار" بابت ۱۹۳۵ء کے لئے لکھا گیا تھا۔ بعد میں اس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے مناسب حذف و اضافے کے بعد کتابی شکل میں شائع ہوا۔ اس میں مثنوی کی حقیقت اور تاریخ لکھنے کے بعد قدیم طرز کی اردو مثنویات پر ایک محققانہ تنقید کی ہے جو بہت سے ادبی نکات سے بھی پُر ہے۔ حجم ۱۰۲ صفحات قیمت بارہ آنے۔ ملنے کا پتہ۔ انریری لائبریرین، امیر محل لائبریری۔ نہیر باغ۔ کاکوری (لکھنؤ)

پیمانہ

اس ماہوار رسالے میں فلمی دنیا کی سرگرمیوں کے متعلق دلچسپ مقالات اور ادبی مضامین اور نظمیں ہوتی ہیں۔ اس کے ایڈیٹر جناب باصر ایک خوش مذاق ادیب ہیں جو رسالے کو مفید بنانے میں کوشاں رہتے ہیں۔ سالانہ چندہ دو روپیہ دفتر رسالہ "پیمانہ"۔ ہسپتال روڈ۔ لاہور سے طلب فرمائیے۔

منصور احمد

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۳۷ء

جلد ۱۵ تصاویر:- ۱۔ سعدی فکر شعر میں ۲۔ جونو اور مور **نمبر ۴**

سالانہ چندہ چار روپے سات آنے محصول و وی پی نو آنے کل پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

(گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا مزنگ ... روڈ لاہور سے شائع ہوا)

بزمِ ادب

ہمیں مسرت ہے کہ اس دفعہ بھی "ادبی دنیا" کا سالنامہ ہر پہلو سے کامیاب رہا اور ادبا و اخبارات نے اپنی آرا میں اس کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کر کے ہماری محنت کی داد دی۔ اب تک جو آرا موصول ہو چکی ہیں اُن میں سے چند یہاں درج کی جاتی ہیں تاکہ ناظرینِ "ادبی دنیا" کو معلوم ہو کہ اُن کے پرچے کے متعلق ملک کے اکابر ادبا کیا خیال کرتے ہیں۔

علامہ برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی نے محسوس کیا ہے کہ سالنامہ عام سالناموں کی طرح محض ظاہری لباس سے مزین نہیں ہے بلکہ اس میں ایسے ایسے پائیدار مضامین موجود ہیں جو ادب پر خاص اثر اور نشان پیدا کرتے ہیں:

"طبیعتوں کی طرح رائیں بھی مختلف ہوا کرتی ہیں۔ بہت لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ رسالوں کے خاص نمبر خودنمائی ہے اور کچھ نہیں ہے۔ اس رائے والوں نے اگر "ادبی دنیا" کا سنہ رواں کا سالنامہ دیکھا ہوتا تو انہیں اپنی رائے بدل دینی پڑتی۔ بات اصل یہ ہے کہ خاص نمبروں کے لئے جو خاص اور غیر معمولی اہتمام کیا جاتا ہے وہ صحافت سے گزر کر لٹریچر پر خاص اثر اور نشان پیدا کرتا ہے۔ وہ رسالہ کا ایک نمبر نہیں رہتا بلکہ ادب کا ایک شاہکار بن جاتا ہے۔ ادبی دنیا کا یہ سالنامہ اس وصف کا مالک ہے۔ لٹریچر کے اکثر اہم شعبوں پر اس میں دلچسپ مسالہ ملتا ہے۔ جبکہ بعض مندرجات کی انفرادیت ہنگامی اہمیت سے بالاتر ہے۔ مولوی منصور احمد صاحب ہر اہلِ ذوق اور ادب دوست کی تہنیت کے مستحق ہیں کہ انہوں نے یہ قریباً ڈھائی سو صفحہ کی ایسی کتاب تیار کر دی ہے جس کے محاسن صوری و معنوی کی پوری توصیف امکان سے باہر ہے۔ کیا فسلیجئے، اور کیا ادبی مقالے اور کیا نظم یر جو کچھ بھی اس میں ہیں محبوبیت اور افادت کا نذرانہ طلب کرتی ہیں۔" **کیفی**

پروفیسر رگھوپتی سہائے صاحب فراقؔ گورکھپوری نے دو سطروں میں سالنامے کی اتنی تعریف کر دی ہے کہ "ادبی دنیا" کے لئے باعثِ صد فخر و ناز ہے اس کے بعد انہوں نے ایک تجویز لکھی ہے، جسے بجنسہٖ یہاں درج کیا جاتا ہے اس میں شک نہیں کہ ایسی تحریکیں ادب کی زندگی کا نشان ہوتی ہیں اور اُس زندگی کے مدِنظر جو کچھ عرصے سے اردو ادب میں نظر آ رہی ہے ہمیں امید ہے کہ اہلِ قلم اس طرف توجہ فرمائیں گے، اور اس تجویز کی تکمیل کی نسبت اپنی آرا سے ہمیں مطلع کرینگے۔

"مکرمی تسلیم

سالنامے کی عظیم الشان کامیابی پر مبارک باد۔ ہر لحاظ سے یہ نمبر یادگار نمبر ہے صرف "ادبی دنیا" کی تاریخ میں نہیں بلکہ اردو ماہناموں کی تاریخ میں۔

یہ خط ایک تجویز پیش کرنے کے لئے لکھ رہا ہوں۔ آج کل اردو ادب اور اردو شاعری بلکہ ہندوستان بھر اور دنیا بھر کے ادب میں انقلاب اور زندہ دلی کے جذبات کا زور شور رہے۔ اردو میں آج لوگ ایسے ادب کے مشتاق ہیں جس میں زندگی ہو جو حیات بخش ہو جس میں امنگ ابھار اور گرمی ہو اور اسی نظر سے پہلے کے ادب کی بھی جانچ پڑتال ہو رہی ہے۔ چنانچہ میں آتشؔ کے دیوان کی سیر اسی نظریے کی تحت میں کر رہا ہوں۔ اُن کے وہاں آٹھ ہزار اور نو ہزار کے بیچ میں اشعار ہیں۔ میں نشان لگاتا جا رہا ہوں آتشؔ کے یہاں پچیس فی صدی اشعار موجودہ فضا اور اسپرٹ کے لحاظ سے بہت کامیاب ہیں اور نیا پیغام نئی معنویت اور ایک خاص تاثر کے ساتھ ذہن پر کام کرتے ہیں اور دل میں اترتے ہیں۔ میرا انتخاب ڈھائی ہزار اشعار تک پہنچے گا۔ چنانچہ میری آپ سے تجویز ہے کہ آپ جون ۱۹۳۷ء کا نمبر آتشؔ نمبر کے نام سے نکالیں جس میں زیادہ سے زیادہ دس مضمون آتشؔ پر ہوں بلکہ پانچ ہی چھ مضامین ہوں تو اچھا ہے یعنی ۷۰ صفحوں کے اندر مضامین ختم ہو جائیں یا زیادہ سے زیادہ ۸۰ صفحوں پر اور آتشؔ کے پورے کلام کا مکمل انتخاب کر کے میں دے دوں گا۔ معہ ایک مضمون کے جو مختصر مگر جامع اور نئے نکتۂ نظر سے لکھا ہوا ہوگا۔ مناسب سمجھیں تو آتشؔ نمبر کا سائز زمانہ کانپور کا سائز رکھیں یا جو "ادبی دنیا" کا سائز ہے وہی رکھیں۔

اگر آپ کو یہ تجویز پسند ہو تو فروری یا جنوری نمبر میں اس کا اعلان کر دیں کہ آپ کا جون نمبر آتشؔ نمبر ہوگا اور اس کی یہ خصوصیتیں ہوں گی اور مضامین آخری اپریل تک منگالیں میں اپنا انتخاب تو فروری میں بھیج سکتا ہوں اور مضمون مارچ میں۔

کیا آپ اس تجویز پر غور کر کے اندر ایک ہفتہ کے یعنی جنوری کے اخیر تک مجھے اپنا فیصلہ لکھیں گے؟

نیاز کیش۔ رگھوپتی سہائے فراقؔ"

جناب مرزا محمد سعید صاحب ایم اے نے ایک عام ریویو لکھا ہے اور "ادبی دنیا" کی ترقی پسند روش سے متاثر ہو کر اس کے لئے لکھنے کا خاص وعدہ فرمایا ہے۔ ہم ان کے فاضلانہ مقالات کے لئے چشم براہ ہیں اور اُن کی دعاؤں کے شکر گزار ہیں۔

"مخدومی و محترمی تسلیم۔ "ادبی دنیا" کا سالنامہ موصول ہوا اور یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ کا رسالہ نہ صرف اپنی شاندار روایات پر قائم ہے بلکہ روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ مضامین سب مفید اور دلچسپ ہیں اور تصاویر کا انتخاب نہایت اچھا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے مقاصد میں کامیاب کرے"۔

خاکسار محمد سعید

حضرتِ یاس یگانہ چنگیزی لکھنوی نے تصاویر اور نظموں میں سے اپنے انتخاب کے دو نمونوں کی نسبت چند پُرجوش الفاظ میں اظہارِ خیال فرمایا ہے۔

مائی ڈیر منصور صاحب۔ السلام علیکم

سالنامہ پہنچا۔ اچھا نکلا۔ مبارک باشد۔ کرشن لیلا کے عنوان سے جو تصویر نظر آ رہی ہے شاید جنت کی زندگی کا مرقع ہے۔ بانسری والے کا حُسن اور اُس کی بانسری قیامت ڈھا رہی ہے معلوم ہوتا ہے سامعین کی روحیں عرشِ اعظم کو پہنچ گئی ہیں۔

شعر سننے کو تو میں ترس گیا ہوں۔ مگر پروفیسر فراق کے ترانۂ عشق میں حقیقی شاعری کے بعض نمونے دیکھ کر کچھ تسکینِ ذوق ہو گئی۔ کیا خوب فرمایا ہے ؎

جلوۂ گل بلبل کو بہت ہے۔ شمع کو گردِ شام
یادِ بہاری گل کو بہت ہے۔ مجھ کو تیرا نام (جل جلالہٗ)

گل کو یادِ بہاری اور مجھ کو تیرا نام۔ ان وجدانی لطافتوں کا کیا کہنا!

شاخ پہ شعلۂ گل کی لپک ہو۔ چرخ پہ انجم و ماہ
دنیا پہ سورج کی چمک ہو۔ مجھ پہ تیری نگاہ

(اللہ بس باقی ہوس)

مجھ پہ تیری نگاہ! فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست احسنتَ جزاک اللہ۔

میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی"

جونو اور مور

مور نے آسمانوں کی ملکہ جونو سے کہا۔
"اے دیوی، میں حق بجانب ہوں گا
اگر میں اولمپین قوانین پہ اعتراض کروں۔
جو آواز تم نے مجھے دی ہے، ساری فطرت کو بیزار کر دیتی ہے!
حالانکہ بلبل، جو ایک چھوٹا سا پرندہ ہے
اور جس کی دُم بھی ناقابلِ ذکر سی ہے
اپنے گلے میں سے ایسے نور بھرے نغمے نکالتا ہے
کہ بہار جگمگا اٹھتی ہے۔
بہار کی رنگینیوں میں اس کا نغمہ سب سے دلکش رنگ ہے"!
ملکہ خفا ہو گئی، اُس نے ملامت آمیز لہجے میں کہا
"حاسد پرندے، خاموش!
کیا تجھے ایک نغمے پر کڑھنا زیبا ہے ـــ
تجھے، جس کی معزور گردن میں
ریشمی قوسِ قزح کے سیکڑوں رنگ موجود ہیں
جو میرے باغ کی روشوں پر محوِ خرام رہتا ہے
اور اپنے پُرشوکت پروں کی نمائش سے
جن میں گویا دنیا بھر کے ہیرے جواہرات جڑے ہیں
فضا میں ایک آگ سی لگائے رکھتا ہے؟
کیا آسمان کی چھت کے نیچے کوئی اور پرندہ بھی ہے
جسے تجھ سے زیادہ حسن عطا کیا گیا ہو؟
ہم نے مختلف چیزیں مختلف مخلوق کو دے رکھی ہیں
سب کو سبھی کیسے مل سکتی تھیں؟
بعض پرندے قوت کے لئے مشہور ہیں بعض قد کے لئے،
شاہین کو تیزی دی، شتر مرغ لمبائی،
باز بہادر ہے اور کوا سمجھ دار،
ہر ایک اپنے اپنے حال میں خوش ہے۔
خاموش اے ناشکر گزار ورنہ دیوتاؤں کی قسم
میں تیری یہ دُم کاٹ لوں گی!
(لافانتین)

منصور احمد

آئینۂ عالم

مصنّفینِ روس اور مسائلِ ادب

سویت مصنفین کی ایک کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے اے۔ این ٹالسٹائی نے کہا :-

ہماری زندگی اور ہمارا ملک تمام مظلوموں اور محروموں کا مرکزِ توجہ ہے۔ یہ طبقہ نوعِ انسان کا بہت بڑا طبقہ ہے اور یہ طبقہ اُن سنگریزوں کی طرح تعداد میں بڑھتا جاتا ہے جو ایک گرتی ہوئی عمارت میں سے ٹوٹ ٹوٹ کر پھیلتے جاتے ہیں۔ یہ لوگ ہمیں جاننا چاہتے ہیں۔ ہم کون ہیں۔ ہماری اخلاقیات کیا ہیں۔ ہم کس طرح رہتے سہتے ہیں کس طرح کام کرتے ہیں اور ہماری تفریحات کیا ہیں۔ ہم اپنے بچّوں کو کیسی تعلیم دیتے ہیں اور عورتوں سے ہمارے تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔ ہم یعنی سویت یونین کے باشندے اہلِ مغرب کے نزدیک ایک نیم حقیقی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ ہم ایسے حالات اور ایسی زندگی کی تخلیق کر رہے ہیں جو ان کے لئے محض خواب ہے۔ اگرچہ وہ لوگ خواب میں بھی ایسے خیالات سے ڈرا کرتے ہیں۔

رفیقو! لوگ ہمیں جاننا چاہتے ہیں۔ ہم خود بھی اپنے آپ کو جاننا چاہتے ہیں کیونکہ ہم جوان ہیں اور جوانی میں غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہم اپنے آپ کو جاننا چاہتے ہیں اور ہم سے زیادہ ساری دنیا ہم کو جاننا چاہتی ہے کیونکہ وہ ہم میں جرأت۔ قوتِ ارادہ۔ عقل و دانش، قابلیت۔ جوش اور رجائیت کے متلاشی ہیں۔ سیاحت کے دوران میں بیسیوں ہی مرتبہ میں نے رشک کی نگاہیں اپنے اوپر اُٹھتے دیکھی ہیں۔ اور کتنی ہی مرتبہ میں نے لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے :"آہ تم روسی کتنے خوش قسمت ہو!"

کیا غیر ملکوں کے یہ لوگ ہمیں جانتے ہیں؟ نہیں! وہ ہمیں نہیں جانتے۔ جب وہ ہم سے ملتے ہیں تو اس قسم کے سوالات کرتے ہیں :-

"یہ تو بتائیے، کیا یہ سچ ہے کہ روس میں تمام عورتیں ایک ہی قسم کی پوشاک پہنتی ہیں؟ کیونکہ وہاں مساوات ہے۔" یا

"کیا روس میں بیر بھی بنتی ہے؟"

ہم جواب دیتے ہیں "ہاں، روس میں بیر بنتی ہے۔"

وہ کہتے ہیں "لیکن بیر وہاں کون پی سکتا ہوگا۔ صرف وزرائے حکومت پیتے ہوں گے۔"

رفیقو! وہ ہماری نسبت بہت کم جانتے ہیں۔ اس کم علمی میں اضافہ اُن فسطائی اخبارات کی دروغ بافیوں سے ہوتا ہے جنھیں حکومت کی طرف سے رشوتیں ملتی ہیں۔ ہمارے متعلق اس لاعلمی سے فاسیت فائدہ اٹھاتی ہے۔ فاسیت چاہتی ہی یہ ہے۔ ہمارے متعلق لاعلمی کے عمیق سمندر میں سے اسے کافی شکار ہاتھ آجاتا ہے۔

اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہمیں ادب میں کیا کچھ کرنا ہے۔ جیسے کہ دستورِ آزادی کا مفاد انقلاب کا راستہ نکالتا اور بناتا ہے۔ بالکل اسی طرح سویت ادب میں ایسے ناول تمثیلیں اور نظمیں لکھی جانی چاہئیں جو ہمارے ملک کے چہرے سے نقاب اٹھا دیں اور اس چہرے کی روشنی زندگی اور جوانی کی ایک ایسی پُر آب و رنگ تصویر پیش کریں کہ دنیا کی آنکھیں اس کو دیکھ کر روشن ہو جائیں اور فسطائیوں کے جھوٹ اس کو دیکھ کر ماند پڑ جائیں۔

لیکن ابھی تک ہم اس منزلِ مقصود کی طرف کیوں نہیں بڑھے؟ اوّل اسلئے کہ ہمارے ادبا اور شعرا کو اپنے آرٹ کی خصوصیّات کو از سرِ نو تعمیر کرنا تھا ہمارا انقلاب سے پہلے کا ادب۔ ادبِ مغرب کی طرح جماعتی امتیازات کی بنا پر تعمیر ہوا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ ایک ایسا ادب تھا جو قدیم نظام کی مخالفت پر مشتمل تھا اس میں منفی سے دلالت کی گئی تھی؟ اس میں یا تو ہیرو کا فقدان تھا۔ یا ایک ایسا

شخص پیش کیا گیا تھا جسے معاشرتی اور سیاسی نظام نے مصائب میں مبتلا کر رکھا ہو۔

ہم مستقبل قریب کی ایک ایسی سوسائٹی کا ادب تعمیر کر رہے ہیں جس میں ادنےٰ و اعلیٰ طبقے کا امتیاز مفقود ہو گا۔ ہم ایک مثبت ہیرو کے اقسام کی تشکیل کر رہے ہیں۔ ہم اُس آرٹ کے سرچشموں کو کھود رہے ہیں جسے زمانے نے بھلا دیا ہے۔ اور جو ہزار ہا سال کے کوڑے کرکٹ کے نیچے دبا ہوا ہے۔ ایک قومی آرٹ۔ آفتاب اور زندگی کی نظم۔

ناول اور ڈراما کے فن پر قدرت حاصل کرنے کے لئے ایک طباع آدمی کو وقت درکار ہے۔ طباع آدمیوں کو وقت دو۔ اگر کوئی صاحبِ قلم کچھ عرصہ کے لئے خاموش ہو گیا ہے تو اس سے لکھوانے کے لئے جلدی نہ کرو۔ اسے اطمینان سے مطالعہ کرنے دو۔ اس دوران میں کوئی اور مصنف کچھ لکھ دے گا۔ ہمارا ادب نہ صرف بلند پایہ ہو گا بلکہ دنیا میں بہترین ہو گا۔ ہمارا دستور اس کی ضمانت ہے۔ صرف جلد بازی سے احتراز لازمی ہے۔ مصنفین کو موقع دو کہ وہ اپنی فن کارانہ ہستی کی تکمیل کر لیں۔ میں ضروری خیال کرتا ہوں کہ ہمارے رسالے اس ذہنی اور فن کارانہ جہد و کوشش کا مرکز بن جائیں جو تخیّل کے نئے محلات تعمیر کرنے والی ہے۔

یہ باتیں میں کسی قدر بعد از وقت کہہ رہا ہوں کیونکہ یہ کام پہلے ہی سے ہو رہا ہے۔ میں صرف اپنے لاکھوں قارئین کی بے تابی کو ایسی اعلےٰ پایہ کی انجمنوں تک پہنچانا چاہتا ہوں جیسی مثلاً "جمعیتِ مصنفین" ہے۔ یہ ضروری ہے کہ اہلِ قلم کی روزمرّہ زندگی کا خیال رکھا جائے اور یہ ہو رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بہتر ہو گا کہ ہم اپنے ادب کی خاطر اپنے تخلیقی حالات و رجحانات کو منظم کریں۔ رسالوں میں نئی روح پھونکیں۔ قارئین کی کانفرنسیں بلائیں۔ ان کی آرا کی طرف توجہ دیں۔ لائبریریاں کھولیں اور اسی قسم کے دوسرے کام کریں۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن اب ہمیں اس کو ایک بڑے پیمانے پر شروع کرنا چاہیئے۔ ایک ایسے پیمانے پر جو ہماری زندگی کے معیار اور وسعت سے پیچھے نہ رہ جائے۔

رفیقو۔ سویٹ ادب بہت کام کر چکا ہے۔ مگر ہم اس سرعت سے آگے بڑھ رہے ہیں کہ اس کے متعلق سوچنے کا ہمارے پاس وقت نہیں۔ سویٹ ادب کو اب ایسے عظیم اور مشکل کام درپیش ہیں جن کا پہلے کاموں سے کچھ مقابلہ ہی نہیں۔ پڑھنے والوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے اور تمام دنیا میں اس ادب کو پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ کیا ہم اہلِ قلم اس کام کو سرانجام کر سکیں گے۔ نہ صرف ہم اسے سرانجام کریں گے بلکہ ہم اور آگے بڑھیں گے اس سے زیادہ سرعت کے ساتھ جتنا کوئی خیال کرے اور تخلیقی سرگرمیوں کے جدید ترین اور نامعلوم اطراف میں ہم اہلِ قلم اپنے عظیم الشان ملک کے روح رواں ہیں۔ ہم پر اعتراض و تنقید بری نہیں لیکن اس سے بہتر یہ ہے کہ ہم پر اعتماد کیا جائے۔

دُنیا کے سامانِ حرب میں اضافہ

جرمن محکمہ تفتیش کی ایک رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے۔ گزشتہ چند سال میں سامانِ حرب میں بے حد اضافہ ہوا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۱۴ء کی بہ نسبت گزشتہ سال دنیا نے اپنی فوجی قوتوں کے استحکام کے لئے تگنا روپیہ خرچ کیا۔ شمار و اعداد یہ ہیں:-

۱۹۱۳ء	۸۳۳۰۰۰۰۰۰ پونڈ
۱۹۲۹ء	۱۲۵۰۰۰۰۰۰۰ پونڈ
۱۹۳۳ء	۲۵۰۰۰۰۰۰۰۰ پونڈ سے
	۲۹۰۰۰۰۰۰۰۰ پونڈ تک۔

سویٹ روس اور جاپان دو ایسے ملک ہیں جن کے سامانِ حرب میں گزشتہ آٹھ سال کے اندر سب سے زیادہ اضافہ ہوا۔ ۱۹۲۸ء اور ۱۹۳۶ء کے درمیان جاپان کے مصارف سو فیصدی بڑھ گئے اور روس کے سولہ گنا ہو گئے۔

برطانیہ کا اضافہ ۳۹ فی صدی۔ ریاست ہائے متحدہ کا ۳۸ فی صدی اور فرانس کا ۵۶ فی صدی دکھایا گیا ہے۔ عجیب یہ ہے کہ جرمنی نے اپنے متعلق کوئی شمار و اعداد درج نہیں کئے اور کہا ہے کہ فرانس کو مقابلے کے طور پر لیتے ہوئے ۱۹۲۸ء اور ۱۹۳۴ء کے درمیان جرمنی نے بھی اپنے مصارف حرب میں ۱۶۵۰۰۰۰۰۰ پونڈ کا اضافہ کیا ہوتا اگر اس پر معاہدۂ ورسیلز کی پابندیاں عائد نہ ہوتیں۔

قیامِ امن کے لئے زبانیں سیکھو

"محاسن و معائب کے لحاظ سے تمام دنیا کے لوگ ایک جیسے ہیں اور اس دنیا میں نفرت اور حسد کو الگ رکھتے ہوئے ہر ایک کے لئے جگہ موجود ہے"

مندرجہ بالا خیالات کا اظہار مادام کٹی وائیلوزیل نے ڈبلن روٹری کلب میں "بین الاقوامی رواداری" پر تقریر کرتے ہوئے کیا۔ اس کے بعد انھوں نے قوموں میں ایک دوسری کے لئے خیر اندیشی کا جذبہ پیدا کرنے کا طریقہ یہ بتایا کہ مختلف زبانیں سیکھنے کی طرف توجہ کی جائے۔

انھوں نے کہا کہ یورپ اور امریکہ میں جنگ اور امن کے متعلق غور و بحث کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ امن پسند بننے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ غیر زبانیں

سیکھی جائیں کیونکہ اس سے قوموں اور ملکوں سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور دلچسپی پیدا ہو گی تو یہ معلوم ہو گا کہ تمام دنیا کے لوگ محاسن اور معائب کے لحاظ سے ایک جیسے ہیں اور نفرت اور حسد سے قطع نظر ہر ایک کے لئے یہاں جگہ موجود ہے۔

سیاسیات سے زیادہ تر مردوں کا تعلق ہے۔ اور وہی اس کے بنانے والے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عورتوں کو سیاسیات میں دخل نہ دینا چاہئے اور بچوں کو پالنے اور گھروں کی دیکھ بھال کی طرف توجہ کرنی چاہئے لیکن ایک عورت کی حیثیت سے میں کہتی ہوں کہ پھر دنیا کے امن کی ذمہ داری بھی مردوں کو لینی چاہئے کیونکہ صرف ایک محفوظ اور پُر امن ملک ہی میں عورتیں صحت مند اور مسرور بچے پیدا کر سکتی ہیں۔

دنیا اتنی حسین ہے اتنی جلد گزر جاتی ہے اور اس میں اتنی کثرت سے مختلف چیزیں موجود ہیں کہ وہ نہ کچھ سیکھ سکتی ہیں۔ نہ جان سکتی ہیں۔ نہ دیکھ سکتی ہیں کیونکہ ان کی روزمرہ کی زندگی اور واقعاتِ عالم کی موجودہ کیفیت ان کی توجہ کو ان حسین چیزوں سے ہٹا کر اپنی طرف پھیرے رکھتی ہے۔

نہ ٹھوس نہ مائع نہ گیس

حال ہی کے ایک لیکچر میں مشہور حکیم سر جیمز جینز نے مادے کی ایک چوتھی حالت کا انکشاف کیا جو نہ ٹھوس ہے نہ مائع نہ گیس اور جو کائنات کے تمام مادے میں ننانوے فی صدی موجود ہے۔ یہ "چوتھی حالت" کسی معمل میں تیار نہیں کی جا سکتی۔ اور اس کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ اگر آپ کے پاس اس کی کچھ مقدار رہے اور آپ اس میں اور اضافہ کریں تو یہ بڑھنے کی بجائے کم ہو جائیگی ایک اور بات یہ ہے کہ اس کی زیادہ سے زیادہ مقدار کا بھی کوئی حجم نہیں ہوتا۔

آرتھر برزبین

آرتھر برزبین امریکہ کا ایک مشہور اخبار نویس تھا۔ گزشتہ کرسمس کی صبح کو وہ اپنے بستر میں مردہ پایا گیا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر بہتر برس کی تھی۔ دنیا کے اخبار نویسوں میں اس کے مضامین سب سے زیادہ پڑھے جاتے تھے اور سب سے زیادہ قیمت پاتے تھے۔

سالہا سال تک اسے ہرسٹ پریس سے پچاس ہزار پونڈ سالانہ تنخواہ ملتی رہی اور پچیس ہزار پونڈ دوسرے پرچوں اور رسالوں سے مضامین نویسی کا معاوضہ ملتا رہا۔

اس کا روزانہ کالم "آج" ریاست ہائے متحدہ کے دو سو سے زیادہ پرچوں میں شائع ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کا ہفتہ وار کالم تقریباً بارہ سو ہفتہ وار پرچوں میں چھپتا تھا۔

اس کے مضامین نہایت آسان انداز میں ناظرین کے ذہنی میلانات کو ملحوظ رکھ کر لکھے ہوئے ہوتے تھے۔ سوفسطائی نقادوں کا تمسخر اُسے بالکل متاثر نہ کرتا تھا۔ کیونکہ وہ جو کچھ لکھتا تھا۔ ان کے لئے نہ لکھتا تھا۔

اس کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور اس کے دماغ نے خوب جلا پائی تھی۔ فرانسیسی اور جرمن زبان روانی کے ساتھ بول سکتا تھا۔ وہ اہم واقعات افراد اور تحریکات کو عوام تک پہنچانے کے لئے ایسی زبان لکھتا تھا جسے وہ آسانی سے سمجھتے تھے۔

جذبات پر قابو پیدا کرو

مشہور حکیم پروفیسر جولین ہکسلے کہتا ہے :" دنیا مصیبت اور آفت کے اس گڑھے میں کیوں گری جس میں ہم اس وقت اپنے آپ کو پاتے ہیں۔ اس کے وجوہ خواہ کچھ ہی ہوں ان کا تعلق بہت کم یا بالکل اُس بے اختیاری سے نہیں جو انسان کو فطرت کے معاملے میں درپیش ہو بلکہ اس تمام مشکل کی وجہ خود ہمارا اپنی فطرت پر اور ہمارے اپنے معاشرتی اور اقتصادی نظاموں پر قابو نہ ہونا ہے ہمیں یہ بات قعرِ مذلت میں گرائے ہوئے نہیں ہے کہ ہم اپنے علمِ کیمیا اور علمِ برق سے طوفانوں اور جھکڑوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے جذبات پر قابو نہیں ہے۔ ہم اپنی حرص اور نفرت۔ امیری، غریبی اور قومی و ملی احساس، سیاسی و اقتصادی امور جن کا تعلق ہماری معاشرتی عضویتوں سے ہوتا ہے، اور اقتصادی ہلیت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

گداگری کے دو رُخ

سمرنا کی پولیس نے گداگروں کی ایک کمپنی کا سراغ لگایا ہے جس کے ستّرہ ارکان تھے۔ جو لنگڑے لولے بن کر اور خود اپنے آپ کو زخموں میں مبتلا

کرکے خیرات حاصل کرتے تھے۔

ایک لنگڑے محاسب کی تحویل میں اس کمپنی کے حساب کتاب کی باضابطہ کتابیں تھیں جو کمپنی کے مالی معاملات سرانجام دیتا تھا۔ پولیس کہتی ہے کہ یہ گداگر اس کمپنی سے تقریباً ساڑھے تین ہزار پونڈ سالانہ منافع حاصل کرتے تھے۔

اس کے برعکس مسز گریس ہلیارڈ جو ایک امریکن ماہر تعلیم ہیں لکھتی ہیں "ہم نے روس میں ایک بھی سست آدمی نہیں دیکھا لیکن ہم نے پانچ چھ بڑھیا فقیرنیاں دیکھیں تو ان کے متعلق دریافت کرنے پر ہم سے درخواست کی گئی کہ "براہ مہربانی ان کو کچھ نہ دیجئے گا۔ یہ بڑھیاں ننگ قوم ہیں انہوں نے تمام عمر گداگری کی ہے۔ اور اب تھوڑا سا کام کرکے اپنی روزی حاصل کرنا انھیں دوبھر معلوم ہوتا ہے۔ ان کو ہر چیز مہیا کردی جاتی ہے۔" القصہ یہ بات ہے جو ہم نے روس میں محسوس کی جہاں ہم ایک نئی زندگی۔ ایک نئی امید ہر دل میں موج زن پاتے ہیں۔ مشکلات جو ایک ایسے عظیم الشان تجربے میں پیش آتی لابدی ہیں، ہم ہر ایک کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ معاشرتی آمیزش سے ایک نئی دنیا وہاں پیدا ہو رہی ہے جس کی بنیاد قوم کے ایک گروہ عظیم کے مصائب اور قربانیوں پر رکھی گئی ہے۔ یہ ایک دیکھنے کے لائق اور یاد رکھنے کے قابل منظر ہے۔"

کیا ۲۰۳۹ء میں ہر شخص پاگل ہو جائیگا؟

ڈاکٹر فرانسس ہارڈنگ نے جو ایک مشہور خاتون ڈاکٹر ہیں کوٹا کلب سڈنی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "اگر موجودہ رفتار سے دیوانگی بڑھتی گئی تو ۲۰۳۹ء تک ہر مرد۔ عورت اور بچہ پاگل نظر آئے گا۔

گزشتہ دس سال کے دوران میں دیوانوں میں تیس فی صدی کا اضافہ ہوا ہے۔ پریشانی اور جنگ اس کا باعث تھے۔ اگر شرح دیوانگی یہی ہے تو آخر کار ہم سب اپنے حواس کھو بیٹھیں گے ہمیں پریشان تو نہیں ہونا چاہئے کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی اس وقت موجود نہ ہوگا۔ لیکن یہ صورت حالات صحیح دماغی میلانات کا تقاضا ضرور کرتی ہے۔"

انھیں وجوہ کی بنا پر انھوں نے عورتوں کو اپنے سامان آرائش مثلاً غازوں وغیرہ کے معاملے میں نہایت محتاط ہونے کی تاکید کی۔ ان کو اپنے لباس کے متعلق عقل و ہوش سے کام لینے کا مشورہ دیا۔ اور اونچی ایڑی والے جوتے پہننے سے منع کیا جو صحت کے لئے مضر ہیں۔

ترکی لڑکیوں کی فوجی تربیت

اگر آئندہ جنگ میں ترکی کو بھی شامل ہونا پڑا تو اس ملک کی عورتیں اس جنگ میں ایک نمایاں حصہ لیں گی۔

ترکی کی وزارت تعلیم نے احکام جاری کئے ہیں کہ مدارس میں لڑکیوں کو لازمی طور پر فوجی تعلیم دی جائے۔ نصاب میں آتشیں اسلحہ کا استعمال اور فوجی ورزشیں شامل کردی گئی ہیں۔ لڑکیوں کو گھوڑے کی سواری اور موٹر چلانی بھی سیکھنی پڑے گی۔ یہ صراحت کردی گئی ہے کہ اگر کوئی لڑکی ان اسباق میں سے کسی ایک میں کچھ نہ کچھ قابلیت نہ دکھائے تو اسے پاس نہ کیا جائے۔ بعض مدارس میں ہوابازی کے لئے بھی طالبات کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

سعدی فکر شعر میں

یہ دلکش تصویر پنجاب کے نوجوان اور ہونہار مصور جوگندر ناتھ سینی کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ سینی ایک سرگرم صناع ہیں۔ انہوں نے تھوڑے سے عرصے میں بہت سا کام کیا ہے، اور خاصی ترقی کی ہے۔ گزشتہ ماہ انہوں نے از راہ نوازش اپنی چند تصویریں مرحمت فرمائی تھیں جن میں سے ایک اس ماہ شائع ہو رہی ہے۔ اس تصویر میں انہوں نے شیراز کے حکمت نواز شاعر کو ایک ایسی کیفیت میں پیش کیا ہے جب اس کا طائر تخیل ایک شعر کے لئے مضمون کی تلاش میں آسمان کی بلندیوں پر پرواز کر رہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ آئندہ بھی "ادبی دنیا" کو اپنی تصویروں سے مزین فرماتے رہیں گے۔

منصور احمد

عہدِ رفتہ

مری غزل میں فسانہ ہے عہدِ رفتہ کا
نوائے شوق ترانہ ہے عہدِ رفتہ کا

مرے سخن کو دیا اس نے سوز و سازِ دوام!
عجیب چیز بہانہ ہے عہدِ رفتہ کا

دکھا رہا ہے تجھے جلوہ ہائے دور و دراز!
تصور آئینہ خانہ ہے عہدِ رفتہ کا

نہ ذکرِ حال کا سودا، نہ فکرِ مستقبل!
زباں پہ سب کی فسانہ ہے عہدِ رفتہ کا

حکایتیں ہیں دلآویز و دل نشیں اس کی!
فریب خوردہ زمانہ ہے عہدِ رفتہ کا

حدیثِ رنج و الم، داستانِ عیش و طرب!
ہر ایک نقش یگانہ ہے عہدِ رفتہ کا

حفیظ دل پہ نظر ڈال یادِ ماضی میں!
نہاں اسی میں خزانہ ہے عہدِ رفتہ کا

حفیظ ہوشیارپوری ایم اے

دوسری بیوی

جاڑوں کی ایک برفانی صبح تھی، رات سے سفید برف سڑکوں مکانوں اور درختوں پر روئی کی طرح ہلکے ہلکے گالوں کی تہ جما رہی تھی۔ سردی کا یہ عالم تھا کہ ساری فضا منجمد ہوئی جاتی تھی۔ آئرین اپنے کمرے میں کھڑکی کی چوکھٹ پر ہاتھوں کے سہارے جھکی ہوئی سنسان گلی کی جانب نظر جمائے کھڑی تھی۔ باہر کی طرف شیشے پر برف کے گالے پھسل پھسل کر چوکھٹ پر جمتے جاتے تھے، آئرین نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں کے اندر آنسو کے قطرے بھی منجمد ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ اس وقت جذبات کے ایک بے پایاں سمندر میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ اس کی شادی کو ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا۔ وہ اپنے شوہر کی دوسری بیوی تھی۔ ہنری اس کا نوجوان شوہر اس کی محبت میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ ہنری کی پہلی بیوی روزا نے طلاق حاصل کر لی تھی کیونکہ دونوں کے درمیان تعلقات نہایت بے کیف تھے، یہی وجہ تھی کہ آئرین کے بہی خواہوں نے ہنری کی شریک زندگی بننے میں اس کی سخت مخالفت کی تھی لیکن اس کو ہنری کی محبت پر پورا اعتماد تھا اور دونوں کی ازدواجی زندگی کے ابتدائی ایام بھی نہایت خوش گوار ثابت ہوئے لیکن بہت جلد آئرین نے محسوس کر لیا کہ روزا ایک نامعلوم طریقے پر اس کے عیش کو منغص کر رہی ہے۔ اس احساس نے اسے نہایت فکر و تردد میں مبتلا کر رکھا تھا۔ آج وہ بہت مضطرب تھی۔ اس کے دل میں بیسیوں قسم کے جذبات موج زن تھے۔ وہ سوچتے سوچتے یک لخت کھڑی ہو گئی۔ پھر کچھ سوچ کر لکھنے کی ایک میز کی طرف بڑھی جو دیوار کے سہارے لگی ہوئی تھی۔ وہ اس کے پاس آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس میز کی دراز سے اس نے ایک کتاب نکالی جس کی جلد طلائی تھی اور بند ریشمی فیتہ کے تھے۔ یہ اس کا روزنامچہ تھا۔ اس کے اندر اس نے اپنی شادی کے روز سے لے کر آج تک کے تاثرات قلمبند کئے تھے۔ اس طلائی جلد کے اندر اس نے اپنی آتش حسد کے لئے بہت سا ہیزم مہیا کر رکھا تھا۔ پہلے تو وہ بند علیحدہ کر کے غیر ارادی طور پر ورق الٹ پلٹ کرتی رہی۔ آخر چند منٹوں کے بعد ایک یادداشت جو اس نے شادی کے بعد ہی قلم بند کی تھی اس کی تمام توجہ کو مرکوز کر لینے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے پڑھنا شروع کیا۔

"۱۶۔ اپریل سنہ ۱۹۳۶ء۔ میں بے حد خوش ہوں کہ میری سہیلیوں کی توقع کے خلاف میری زندگی کا آغاز مسرتوں کے ساتھ ہوا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ روزا ہنری کے مزاج کو پہچان نہ سکی۔ ورنہ علیحدگی غیر ممکن تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے اس معاملے میں غلطی نہیں کی۔ میں اس کے مزاج اور عادات سے بخوبی واقف ہو گئی ہوں اور کبھی اس کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ دوں گی۔

"میں نہیں جانتی کہ ہنری کو روزا اور اس کی ننھی بچی کی یاد اب بھی آتی ہے یا نہیں، آج وہ ایک ننھی سی بچی کو گود میں لے کر پیار کر رہا تھا میں اپنے پیارے ہنری کے دل کو اپنی محبت سے اس قدر معمور کر دوں گی کہ اس میں کسی غیر کے لئے گنجائش ہی نہ رہے گی۔

"میں اس خیال سے بہت مسرور ہوں کہ آج سے قبل ہنری یہاں کبھی نہیں آیا تھا۔ پہلی شادی کے بعد اس نے "ماہِ عسل" کا زوال میں گزارا تھا۔ دنیا کی کوئی چیز بھی مجھے وہاں جانے کی ترغیب نہیں دے سکتی اگر خدانخواستہ مجھے وہاں جانا پڑا تو پھر قدم قدم پر روزا سے مڈبھیڑ ہو جانے کا اندیشہ لگا رہے گا۔ دنیا ہم دونوں کے لئے بہت زیادہ وسیع ہے۔

"ہنری آج کی ڈاک لے کر آیا ہے۔ آج وہ کتنا حسین ہے میں نہیں سمجھ سکتی کہ کوئی عورت اس کی بیوی بن کر کیوں کر ناخوش رہ سکتی ہے ایسی عورت خود قابلِ الزام ہے۔

"ہنری کے یہاں آ جانے سے قبل مجھے یہ یادداشت لکھنا ختم کر دینا چاہیے۔ وہ میرے روزنامچے کو "دفترِ خواب" کہہ کر ہنستا ہے۔ میرے پیارے رفیقِ زندگی تمھیں کیا معلوم کہ میرے کتنے سارے خواب سچے ثابت

ہوئے ہیں۔"

آئرین نے آہستہ آہستہ ورقوں کو اُلٹنا شروع کیا۔ ان کے اندر اس نے اپنی رنج و خوشی کی گھڑیوں کا نقشہ کھینچا تھا بعض یادداشتوں کو جو حال ہی میں قلمبند کی گئی تھیں اس نے بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔

"دوشنبہ ۱۹ر جولائی - آج کی رات ہنری لکھنے کی میز پر ایک گھنٹہ کام کرتا رہا۔ میرے اس سوال پر کہ وہ کیا لکھ رہا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ چند ضروری خط لکھنے ہیں۔ کھانے کے وقت میں نے اندازہ کیا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے لیکن جب میں نے سبب دریافت کیا تو اس نے مسکرا کر گرمی کی شکایت کی۔ اس وقت وہ اپنا خط ڈاک میں چھوڑنے گیا ہے۔ ہاں خطوں کے ساتھ ایک پیکٹ بھی تھا۔ اُف۔ اب مجھے یاد آیا۔ کل رَوزنا کی بچی کی سالگرہ کا دن ہے۔ پانچ برس کی ننھی بچی ہے خوب ہوا کہ وہ پیکٹ نہیں بھولا۔ لیکن آخر یہ پیکٹ میری یاد سے محو کیوں نہیں ہوتا۔ ہنری نے اس بچی کو خط بھی لکھا ہوگا۔ اور یقین ہے کہ اس خط کا جواب اس کی ماں لکھے گی۔ پانچ برس کی بچی بھلا خود کیا لکھ سکتی ہے۔

"اب مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ اس عورت کو جس نے ہنری ایسے مرد سے شادی کی ہو۔ چند قربانیاں کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے میں خوب سمجھتی ہوں کہ اس میں نہ ہنری کا قصور ہے اور نہ اس کی پہلی بیوی کا۔ لیکن میں اپنے دل کو کیا کروں کہ یہ حسد سے باز نہیں آتا۔ میں اُن گزشتہ ایام سے جن کی ساعتیں دونوں کی یک جائی میں گزری ہیں، حسد کئے بغیر نہیں رہ سکتی جس وقت ہنری مجھے اپنی آغوش میں لے کر میرے لبوں پر مہرِ محبت ثبت کرتا ہے تو میں اس خیال سے کانپ اُٹھتی ہوں کہ وہ رَوزنا سے بھی اسی طرح اظہارِ محبت کرتا ہوگا۔ ہاں اسی رَوزنا سے جو میری مانند اس کی شریکِ زندگی رہ چکی ہے۔ یہ خیال نہایت ناگوار ہے۔ مجھے اس سے نفرت ہوتی ہے۔ بلکہ خود اپنے آپ سے نفرت ہوتی ہے کہ میں نے ایسے لغو خیالات کو اپنے دل میں جگہ دی۔ لیکن میں معذور ہوں۔ آہ! بالکل معذور۔ ہنری۔ پیارے ہنری مجھے بتاؤ کہ میں تمھارے لئے کیا چیز بن جاؤں جو رَوزنا نہ بن سکی۔ اللہ میری اس جستجو میں مدد کرو۔ میں تم سے بے حد الفت رکھتی ہوں۔"

"پنجشنبہ ۲۲ر جولائی - آج کی ڈاک میں رَوزنا کا خط بھی دکھائی دیا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اسی کا خط ہوگا۔ اگرچہ میں نے اس کی طرزِ تحریر نہیں دیکھی ہے۔ بڑے بڑے اور صاف حروف لفافے کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیلے ہوئے تھے سوسن ڈاک لائی تھی۔ ہم دونوں اُس وقت ناشتے کی میز پر تھے۔ میں نے اپنے خطوط چھانٹ کر باقی ہنری کی طرف بڑھا دیئے۔ اس نے بے پروائی سے سبز رنگ کا لفافہ اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ میں نے کچھ نہ پوچھا۔ اس نے بھی ایک پیالی کافی مانگنے کے سوا اور کوئی بات نہ کی۔ مجھے تعجب ہے کہ اسے یہ کیوں معلوم نہ ہو سکا کہ میرا کلیجہ اس وقت کتنی شدت کیساتھ دھڑک رہا تھا، نہیں، شاید اسے اس کا علم نہ ہو سکا۔ مرد بیوقوف شتر مرغ کی مانند ہیں جو اپنا سر ریت کے اندر ڈال کر یہ سمجھ لیتا ہے کہ اُس نے اپنے آپ کو دُنیا کی نظروں سے بالکل چھپا لیا ہے۔ لیکن مجھ ایسی لغو باتوں کو سوچ کر فکر مند نہ ہونا چاہئے۔ . . . . . .

"رَوزنا نے اپنی بچی کی طرف سے تحفے کے شکریہ کا خط لکھا ہوگا۔ پر یہ تحفے کے بھیجنے اور شکریے کے خط کے آنے کا سلسلہ تو ہر سالگرہ کے موقع پر جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ یہ ایک لازمی چیز بن جائے گا میری زندگی کا ایک حصہ جس کا خود مجھے بھی خوگر ہونا پڑے گا . . . . . .
کیا میرے لئے ایسی باتیں سوچنا مناسب ہے یا نہیں؟ میں یہ جاننا نہیں چاہتی۔"

"یکشنبہ ۱۵۔ اگست۔ میں یہاں ایک گھنٹے سے بیٹھی ہوئی یہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہی ہوں کہ عورت کو یہ بات کیوں ناپسند ہے کہ اس کا شوہر کسی غیر عورت سے چاہے وہ اس کی زنِ مطلقہ ہی کیوں نہ ہو۔ رسم و راہ پیدا کرے۔ ہمارے دلوں میں یہ خواہش کیوں پیدا ہوتی ہے کہ شوہر پر صرف ہمارا قبضہ ہو۔ ہماری زندگی صرف اس شبہ ہی سے کہ وہ فلاں غیر عورت سے محبت کرتا ہے کیوں تلخ ہو جاتی ہے۔ نہ معلوم یہ ہمارے کمینہ نفس کی شرارت ہے۔ یا ہماری فطرت ہی ایسی واقع ہوئی ہے؟ ڈاکٹر ریمزن جو فطرتِ نسوانی کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ "عورت تعددِ ازدواج کو اس لئے ناپسند کرتی ہے کہ اس کی شفقتِ مادری کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ شوہر صرف اسی کے بچوں سے محبت رکھے اور اس محبت میں اس کی سوکنوں کی اولاد حصہ نہ بٹائے اگرچہ خود عورتوں کو اس حقیقت کا علم نہیں ہے لیکن سوکنوں سے حسد کرنے کا مادہ اسی جذبے کے ماتحت پیدا ہوتا ہے

. . . . . مگر ان لغو باتوں کو سوچ سوچ کر میں کیوں فکرمند ہوئی جاتی ہوں۔ سبز رنگ کے لفافوں کو دیکھ کر اتنے دنوں تک مضطرب رہنا اور ایسے لغو خیالات کو دل میں جگہ دینا نادانی نہیں تو اور کیا ہے۔ ڈاکٹر کا نظریہ ہی غلط ہے یا خود میں ہی سر غلط ہوں۔ میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی"

"دوشنبہ۔ ۱۶۔ اگست۔ آج میں نے اپنے حسد کا کفارہ ادا کیا ہے۔ ہنری کے پاس ایلین (روزا کی بچی) کی تصویر ہے۔ جسے وہ ہمیشہ اپنی میز کی دراز میں بند رکھتا ہے۔ شاید وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس تصویر کو دیکھ کر مجھے روحانی اذیت ہوگی۔ آج صبح میں نے وہ تصویر نکال کر چاندی کے چوکھٹے میں لگا دی۔ بھولی بھالی بڑی پیاری بچی ہے۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ پتلے نازک ہونٹ۔ لیکن ہنری کی صورت سے بالکل الگ۔ اس تصویر کو میں نے لباس بدلنے کی میز پر رکھ دیا تھا ہنری کی نظر فوراً اس پر پڑ گئی اور میرے پاس آکر وہ بڑی محبت کے ساتھ میرے بالوں سے کھیلنے لگا۔

"آئرین تم نے خوب کیا" اس کی آواز جذبات سے معمور تھی۔ لیکن نہ معلوم یہ جذبات میرے متعلق تھے یا ایلن کے۔ مگر میں اس کی حرکت سے مبہم طور پر مطمئن تھی۔ بڑے افسوس کی بات ہے"

"شنبہ ۴ ستمبر۔ . . . . دوسری بیوی بننا آسان نہیں ہے' مرد شادی کے بعد چند باتوں کا عادی ہو جاتا ہے۔ وہ بعض امور کو ایک خاص طریقے پر انجام پذیر ہوتے دیکھ دیکھ کر اسی طریقے کا خوگر ہو جاتا ہے لیکن یہ ایک ناممکن بات ہے کہ دو افراد میں ہر طرح سے یکسانیت پائی جائے۔ میں اکثر محسوس کرتی ہوں کہ ہنری اپنے ذہن میں مقابلہ کیا کرتا ہے۔ گو میرے کہنے پر وہ یہ بات ماننے کو تیار نہ ہوگا۔ لیکن مجھے اس کا اچھی طرح یقین ہے کہ وہ بارہا یہ سوچا کرتا ہے کہ فلاں کام کو روزا اس طرح کیا کرتی تھی۔ یا اس طرح نہیں کیا کرتی تھی' یا فلاں امر کے متعلق اس کا ایسا خیال تھا۔ یہ احساس مجھے خوفناک طریقے پر متوحش کئے دیتا ہے' جب وہ مجھ سے کہتا ہے کہ "اسکاٹ کے ناول پڑھا کرو" یا یہ کہ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انسان کو صبح سویرے اٹھ کر تفریح کا کیا سامان مل سکتا ہے" تو میرا دل گواہی دیتا ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے وہ کسی دوسرے کے خیالات کا عکس ہے جن کو اس نے غیر معلوم طریقے پر اپنا بنا لیا ہے۔ میں ہرگز اسے یہ جتانا نہیں چاہتی کہ میں ان ساری باتوں سے آگاہ ہوں۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ تھوڑے عرصے میں یا تو وہ میری عادتوں سے مطابقت پیدا کرے گا یا میں ہی اس کے خیالات سے ہم آہنگ ہو جاؤں گی۔ شادی کے بعد کچھ دنوں تک اختلافِ خیال کا ہونا لازمی ہے۔ میں نے گرجا جانا ترک کر دیا ہے۔ کیونکہ وہ اس کی کچھ زیادہ پروا نہیں کرتا ہے۔ میں نے سبز رنگ کا ایک گون خریدا ہے۔ گو مجھے اس کا رنگ پسند نہیں ہے۔ لیکن اس لئے پہنتی ہوں کہ اس کی نظروں میں یہ مجھے بہت زیب دیتا ہے' میں نے اس کو حلوہ کا مزا پسند کرنا سکھایا ہے۔ آج صبح اس نے تھوڑا کھایا بھی تھا۔ آیندہ کے متعلق تو بہت کچھ امیدیں نظر آتی ہیں"

"دوشنبہ۔ ۱۲ ستمبر' آج پھر ہنری کے نام سبز رنگ کا لفافہ آیا ہے اس رنگ کے تمام لفافوں سے مجھے نفرت ہوگئی ہے' . . . . . میں اس وقت سینما جانا چاہتی ہوں"

"۲۸ ستمبر۔ آج شام کو سارا مجھ سے ملنے آئی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ روزا اسٹیج پر ایک رقاصہ کی حیثیت سے ظاہر ہونے والی ہے۔ وہ کہتی تھی کہ روزا میں بہت سی خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے وہ اس پیشے میں یقیناً کامیاب ثابت ہوگی۔ مگر کچھ دنوں قبل لوگوں کا خیال تھا کہ وہ جیمس سے جو یہاں کا ایک بڑا تاجر ہے ضرور بیاہ کرلے گی کیونکہ دونوں کے تعلقات نہایت گہرے ہو رہے ہیں۔ خدا کرے کہ پچھلی بات سچ ہو' میں کبھی اس خیال کو اپنے دل میں جگہ نہیں دے سکتی کہ وہ پھر ہنری کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھائے گی۔ اگر وہ جیمس سے شادی کرلے تو خوب ہو۔ میں نے سنا ہے کہ وہ بہت دولتمند ہے لیکن اگر روزا نے رقاصہ کا پیشہ اختیار کیا اور اس میں کامیابی حاصل کرلی تو ہنری کو اس سے ملنے کا موقع برابر ملتا رہے گا اور ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی اُس بیوی سے تغافل برتنے لگے جو اپنے لمحاتِ فکر و تردد میں اپنے تبسم سے اس کو خوش کرنا چاہتی ہے۔ جو صبح سویرے اُٹھ کر اس کی چائے تیار کرتی ہے اور اس کی پسند کے مطابق شوربا بناتی ہے۔ اور بارش کے دنوں میں یہ یاد دلاتی ہے کہ آفس جاتے وقت وہ اپنی برساتی ساتھ رکھ لے۔ اس نے کچھ دن پہلے یہ شکایت کی تھی کہ روزا فرائض خانہ داری سے بے پروائی کرتی تھی۔ ہاں اس نے یہ بھی کہا تھا کہ میں تم سے اس لئے محبت کرتا ہوں کہ تم صحیح معنوں میں ایک عورت کہی جا سکتی ہو۔ ایسی عورت جس پر ایک مرد بھروسہ کر سکے میں نہیں سمجھ سکتی کہ اس قسم کی قابلِ اعتماد بیوی بننا دانائی ہے یا نہیں۔ مجھے تو یہ خوف ہے کہ کہیں وہ مجھے اپنے اُس موٹر کی طرح قابلِ اعتماد

نہ سمجھنے لگے جو اس کی روزانہ تگ و دو میں اس کا ساتھ دیتا ہے۔ لیکن جس سے وہ اسی قدر اکتا گیا ہے جتنا گزشتہ سال کے کیلنڈر سے۔

"میں نے یہ کیا بیہودہ بکواس لگائی ہے۔ بے شک ہنری مجھ سے محبت کرتا ہے اور مجھے کبھی یقین نہیں ہو سکتا کہ ہنری کے دل میں روزا کے متعلق اب بھی اگلے سے جذباتِ الفت پیدا ہوتے ہیں۔ دھوبی آیا ہے ایسا نہ ہو کہ میں یہ بھول جاؤں کہ گزشتہ ہفتہ وہ ہنری کی قمیص نہیں لایا تھا۔

"۲۰۔ نومبر۔ آج صبح میں نے خدا کی نعمتوں کا شکریہ ادا کیا ہے یہ خوش ہونے کی بات ہے لیکن اس وقت میرا دل بہت رنجیدہ ہو رہا ہے اور شام بہت اُداس معلوم ہو رہی ہے۔ پر یہ میرا اپنا تصور ہے۔ میں نے کیوں آج سینما جانے پر اصرار کیا۔ ہم دونوں تماشہ دیکھنے گئے تھے۔ وہاں روزا اور ایلن بھی موجود تھیں۔ روزا اگبس میں چند کارکنوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ میں چُپ چاپ بیٹھی رہی لیکن یہ جانتی تھی کہ ہنری گھبرا سا گیا ہے اور اسے بھی معلوم تھا کہ میں نے اس کی حالت کا اندازہ کر لیا ہے۔ تماشے کا سارا مزا کرکرا ہو گیا۔ میں بہت شوق سے تماشہ دیکھنے گئی تھی لیکن وہاں معاملہ ہی کچھ اور نکلا۔ میری نگاہ بار بار بکس کی طرف اُٹھ جاتی تھی۔ اور میرا دماغ اس زندگی کی خیالی تصویر کھینچنے میں مشغول تھا جو اس نے ہنری کے ساتھ گزاری تھی۔ میں بے حد رنجیدہ تھی، ہنری نے مجھ سے صرف اتنا پوچھا۔ "دنیا کتنی تنگ ہے۔ ہے نا؟" میں چُپ رہی اور کوئی جواب نہ دے سکی میں نے اس کو یہ دیکھنے کا موقع نہ دیا کہ اس وقت میری آنکھیں پُر آب ہو رہی تھیں حالانکہ رونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔"

"۹۔ دسمبر۔ ہنری مانچسٹر گیا ہوا ہے۔ اس لئے میں آج دن بھر تنہا رہی۔ سارا چائے کے وقت مجھ سے ملنے آئی تھی۔ اس نے اخبار سے کٹا ہوا ایک ٹکڑا دکھایا جس میں روزا کے متعلق تعریفیں چھپی تھیں معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ ہفتہ اس نے اپنے فن میں بہت شہرت پیدا کی اور آج کل اس کی کمپنی مانچسٹر میں ہے۔ میں خوب جانتی ہوں کہ ہنری کو ایک مقدمے کے سلسلے میں مانچسٹر جانا پڑا ہے۔ اس سے قبل بھی وہ ایک دو مرتبہ جا چکا ہے۔ لہٰذا کسی قسم کے شبہے کو دل میں جگہ دینا بالکل نامناسب ہے لیکن میں معذور ہوں۔ سارا کے دریافت کرنے پر جب میں نے یہ بتایا کہ ہنری مانچسٹر گیا ہوا ہے تو وہ معنی خیز طریقے پر مسکرائی اور بولی عجب اتفاق ہے، ہے نا؟" میں نے ہنری کی مجبوری کا حال بیان کیا۔ اس پر بھی وہ مسکراتی رہی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔ اس کو رخصت ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو چکا ہے۔ تب سے میں اب تک رو رہی ہوں میں بھی کس قدر بے وقوف ہوں۔"

"نصف شب۔ کاش ہنری یہاں موجود ہوتا۔ میں بالکل سو نہیں سکتی۔ کیونکہ ہنری کے ساتھ میری نیند بھی رخصت ہو چکی ہے۔ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ آج کی رات ہنری مجھے چھوڑ دینے والا ہے تو میں نہیں کہہ سکتی کہ میں کیا کروں۔ شاید ہنری کے ساتھ روزا بھی آئے۔ لوگوں کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ وہ ایک ایسی فضا میں جا بسیں جہاں انھیں دائمی خوشی میسر ہو سکے لیکن اس فضا میں پہنچنے کے بعد انھیں پتہ چلتا ہے کہ جس زندگی کو وہ چھوڑ آئے ہیں وہی زیادہ کامیاب تھی۔ اگر روزا پھر ہنری کی آغوشِ محبت میں آنا چاہے تو میری محبت ہرگز دونوں کی راہ میں حائل نہ ہوگی .... مگر اس کا یقین کیسے آسکتا ہے؟"

"۱۰۔ دسمبر۔ میں اس وقت گزشتہ رات کی قلمبند کی ہوئی یادداشت پڑھ رہی ہوں اور پڑھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ میں نہایت بیوقوف عورت ہوں۔ ہنری میرا دلدادہ ہے اور مجھے کوئی حق نہیں ہے کہ اس کے متعلق شکوک پیدا کر کے اپنی زندگی تلخ بنا لوں۔ یہ وہم دونوں ہی کے لئے مضرت رساں ہے۔ آئینہ دیکھنے سے مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں روزا سے کہیں زیادہ دلفریب ہوں اور پھر عمر میں بھی اس سے دس سال چھوٹی ہوں اور سن کا فرق بھی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آج میں بہت مسرور ہوں کیونکہ کھانے کے وقت ہنری یہاں پہنچ جائے گا۔"

"۱۱۔ دسمبر۔ گزشتہ رات جب ہنری مانچسٹر سے واپس آیا تو وہ بُری طرح خستہ و پریشان ہو رہا تھا۔ سر میں شدید درد تھا اور بھوک تو مطلق نہ تھی میرا اہتمام سے پکایا ہوا کھانا برباد گیا۔ وہ بہت سویرے سو رہا اور میں دیر تک ایک معمولی سا رسالہ پڑھتی اور بہت سی باتیں سوچتی رہی۔"

"۱۵۔ دسمبر۔ آج ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔ ہنری نے تحفہ میں مجھے ایک نہایت خوشنما و بیش قیمت بروچ لا کر دیا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتی کہ اتنے لغو خیالات اور شبہات کو دل میں جگہ دینے کے بعد بھی میں اس کے تحفوں کی مستحق ہوں یا نہیں۔"

"۳۔ مئی۔ موسم بہار کا آغاز ہو چکا ہے۔ ہمسایہ کے مکانات صاف ہو رہے ہیں۔ میں بھی آج بہت خوش ہوں۔ کیونکہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ روزا کے متعلق لغو خیالات سے اپنے دل کو پاک و صاف کر لوں گی جس طرح

دنیا کی اور عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ مسرت کی زندگی گزارتی ہیں،
میں بھی ویسی ہی مسرور زندگی بسر کروں گی۔ ہنری درحقیقت میرا شیدائی ہے
ورنہ آج اس کی زبان سے ہرگز یہ بات نہ نکلتی کہ "کاش اللہ نے ہمیں
بھی ایک بچہ عطا کیا ہوتا!" اگر عورت اپنے شوہر سے وفاشعاری کی امید رکھے
تو وہ حق بجانب ہے لیکن اس کے عوض اسے بچوں کی نگہداشت کے لئے
تیار رہنا چاہئے۔ سارا کہتی ہے کہ مجھے اولاد کی تمنا نہیں ہے۔ لیکن اگر
اس کا شوہر بھی اس کا ہم خیال ہو جائے تو پھر آسمان سر پر اٹھا لے گی
مجھے بھی بچوں سے محبت کرنی چاہئے۔ روزا کی بھی ایک بچی ہے۔ میں جو
اس سے حسد کرتی ہوں تو شاید اس کی بڑی وجہ یہی ہے۔ اب مجھے احساس
ہونے لگا ہے کہ گرم چائے، سامان آرائش اور ایک خوب صورت بلی گھر
کی رونق کے لئے کافی نہیں ہے۔"

"۱۸۔ جون۔ آج شام کو ہنری بہت متفکر نظر آیا۔ مجھے اتنی جرأت نہ
ہوسکی کہ وجہ دریافت کروں۔ فکرمند ہونے کے بہت سے اسباب ہوسکتے
ہیں۔ شاید آئلین بیمار ہو۔ روپے پیسے کا کوئی معاملہ ہو۔ یا وہ کمپنی جس میں اس کی
بیوی ملازم ہے تباہ ہوگئی ہو۔ کیونکہ چند مہینوں سے مجھے اس کی کوئی خبر نہیں
ہے لیکن میں نے "اس کی بیوی" کیوں لکھ دیا۔ ہنری کی بیوی تو میں ہوں۔
درحقیقت میں کبھی کبھی یہ سمجھنے لگتی ہوں کہ ہنری کی دو بیویاں ہیں۔ معلوم نہیں کہ ہم
دونوں کب ملیں گی۔ قیامت سے قبل تو یہ خیال ناممکن ہے۔ میرا خیال ہے
کہ ہم دونوں میں گہری دوستی ہوسکتی ہے۔ لیکن نہیں۔ میں اپنے آپ سے یہ
امید نہیں کرسکتی۔ میں بہت تنگ دل واقع ہوئی ہوں اور میری تنگ دلی
اُس وقت بڑھ جاتی ہے جب ہنری معقول وجہ بتائے بغیر رات کو بہت
دیر تک باہر رہتا ہے۔ کاش میں فلورنس کی طرح فراخ دل ہوتی۔ وہ کہتی ہے
کہ میرا شوہر چاہے کتنی ہی بیویاں کیوں نہ کرے۔ مجھے اس وقت تک کوئی
خوف و پرواہ نہ ہوگی جب تک وہ ان کی تعریف بھی میرے سامنے نہ کرنے
لگے۔ فلورنس کے خیالات آزاد ہیں لیکن مجھے ابھی آزادی کی تمنا نہیں ہے
ورنہ میں شادی ہی کیوں کرتی۔

"ابھی ایک گھنٹہ ہوتا ہے کہ ہنری نے میز کی داہنی جانب والے دراز
میں کوئی چیز بند کی ہے۔ نہ معلوم اس میں کیا ایسی بیش قیمت شے ہے جس کے
لئے وہ دراز کو ہمیشہ مقفل رکھتا ہے۔ یہ اس کا پوشیدہ باغ ہے جس میں سیر
کرنے کی مجھے بالکل ممانعت ہے۔ اونہہ۔ مجھے اس کی پرواہ نہ کرنی چاہئے
سچ ہے کہ محبت کے معاملے میں عورت ناقص العقل ثابت ہوتی ہے۔

"۲۰۔ اکتوبر۔ آج صبح ہنری کے نام پھر ایک سبز رنگ کا لفافہ آیا ہے،
جسے لے کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور جب وہ باہر آیا تو اس کا چہرہ اُترا
ہوا تھا۔ چلتے وقت وہ مجھ سے رخصت ہونا بھی بھول گیا۔ ضرور کوئی ایسا واقعہ
رونما ہوا ہے جس میں میری شکست اور ناکامی پنہاں ہے۔ اب میری برداشت
سے باہر ہوگیا ہے۔ میں آج ہنری سے صاف صاف کہہ دوں گی کہ وہ
روزا کو خط لکھنا بند کردے۔ ورنہ اس قسم کے توہمات مجھے دیوانہ بنا کر
چھوڑیں گے۔

"لیکن میرے کہنے کا فائدہ کیا ہوگا؟ وہ دفتر کے پتے سے خط لکھا
کرے گی۔ پھر مجھے کبھی ان کے تعلقات سے واقفیت نہ ہوگی۔"

"۱۲۔ نومبر۔ سہ پہر۔ ہنری نے ابھی ابھی ٹیلیفون سے اطلاع دی ہے
کہ کھانے کے وقت وہ گھر نہیں آسکے گا۔ میں وجہ سننے کا انتظار کرتی رہی لیکن
اس نے کوئی سبب نہیں بتایا۔ اور میرے نسوانی غرور نے مجھے دریافت
کرنے سے باز رکھا۔ دریافت کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ آج صبح جو اسے
خط ملا۔ اس پر ریجنٹ پارک کی مہر تھی۔ اے اللہ اب میں کیا کروں!"

آئرین نے روزنامچہ بند کردیا۔ یہ یادداشت جسے اس نے آخر میں
پڑھا تھا۔ اسی دن سہ پہر کو قلمبند کی گئی تھی۔ کاغذ پر جا بجا جو دھبے تھے اُن سے
صاف ظاہر تھا کہ لکھتے وقت اس کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے ٹپک پڑے
تھے۔ اس وقت سے اب تک رنج و غم کے آٹھ طویل گھنٹے گزر چکے تھے۔ باہر
بارش کے قطرے ایسی سست رفتاری سے گر رہے تھے جیسے رو کر تھکی ہوئی آنکھوں
سے آنسو۔ اس نے لپک کر اپنا قلم اٹھایا۔ اور آج کے روزنامچے کو مکمل کرنے
میں مشغول ہوگئی۔

"نصف شب۔ آج ہنری گھر آئے گا، کیونکہ کسی نہ کسی وقت تو اُس کا
گھر آنا ضروری ہے۔ تو اس سے صاف صاف پوچھوں گی کہ آیا وہ روزا کے
یہاں گیا تھا یا نہیں۔ اور اگر اس نے جواب اثبات میں دیا تو میں کہہ دوں گی
کہ میں تم سے علیحدہ ہوئی جاتی ہوں۔ میں ایسا کر کے رہوں گی۔ اب سے قبل
میں نے کبھی ایسا سوال نہیں کیا ہے۔ کیونکہ تمام واقفیت اور ثبوت کے
باوجود میں نے اس پر ہمیشہ بھروسہ کیا ہے، لیکن اب وہ مزید اعتماد کے قابل
نہیں رہا۔ میں جانتی ہوں کہ وہ اس وقت روزا کے یہاں ہے۔ اگر اس نے
انکار کیا تو میں کبھی یقین نہ کروں گی۔ ..."

جب دو ہستیاں ازدواجی رشتے میں منسلک ہوجاتی ہیں تو ان کے
درمیان کسی تیسری ہستی کا رہنا ناممکن ہوتا ہے۔ ہنری نے غلطی کی۔ مجھ سے

شادی کی درخواست کرنے کے قبل اسے اپنی گزشتہ زندگی کو بھول جانا چاہئے تھا۔ اگرچہ ایسا کرنے میں اسے تکلیف ہی کیوں نہ ہوتی - اسے یہ حق حاصل نہیں تھا کہ اپنی گزشتہ ساعتوں کو میری زندگی سے وابستہ کر کے میری راحت میں خلل ڈالے۔ میں نے ہمیشہ چشم پوشی کی ہے - اس کے پوشیدہ باغ سے الگ رہنا چاہا ہے اس کے رازِ سربستہ کی عزّت کی ہے حالانکہ اس کی وجہ سے مجھے روحی اذیت ہوئی ہے لیکن اب میں حقیقت کے انکشاف پر مجبور ہوں۔ زندگی کا وہ دروازہ جس کو مقفل رہنا چاہئے تھا اب کھلنے کو ہے ہنری کی زندگی میں ہم دونوں کے لئے جگہ نہیں ہے۔ اسے انتخاب کرنا چاہئے۔ دل کو مضبوط کر کے اسے ہم دونوں میں سے کسی ایک کو منتخب کر لینا چاہئے۔

"میں نہیں جانتی کہ وہ گھر آنے پر اپنی غیر حاضری کا کیا سبب بتائیگا مجھے توقع ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولے گا۔ اپنے کسی دوست کی بیماری یا کسی کاروباری جلسہ کا بہانہ نہیں کرے گا۔ ہنری ایسی باتوں سے بالاتر ہے تو کیا وہ یہ کہے گا کہ میرے ساتھ شادی کرنے میں اس نے غلطی کی اور اب اس نے رَوز کی طرف مراجعت کرنے کا قصد کر لیا ہے ؟ میں ڈرتی ہوں کہ شاید وہ ایسا ہی کہے گا۔ اچھا تو میں بھی تیار ہوں۔ میں اس کی مرضی کے خلاف اسے قید میں رکھنا پسند نہیں کرتی - یہ اصول ہمیشہ غیر مفید ثابت ہوتا ہے۔ میں رونے سے بھی اپنی آنکھوں کو روکوں گی۔ کیونکہ رونے کے لئے پھر بہت سا وقت ملتا رہے گا -

"لیکن آہ ہنری ! ایسا کیوں ہوگا ! کیا میری محبت سے تمھیں تشفی نہیں ہوتی ؟ کیا اس لئے کہ رَوز مجھ سے زیادہ حسین اور ہوشیار ہے ؟ یا بچّی کی خاطر ؟ خدا جانتا ہے کہ میرا دل خود ننھی ننھی آواز سننے کے لئے بے قرار رہتا ہے۔ خاموشی کے عالم میں ننھے ننھے قدموں کی چاپ میرے کانوں میں آتی ہے۔ شاید یہ آواز تمھارے کانوں میں بھی پہونچتی ہوگی جس وقت تم گھر آ کر اپنے پر تکلف بستر، اپنی تصویروں اور لذیذ کھانوں کو دیکھتے ہوگے تو شاید تمھیں ایک چیز کی کمی محسوس ہوتی ہوگی، اور میں سمجھتی ہوں کہ صرف میری محبّت ہی تمھاری زندگی کو کافی سے زیادہ دلچسپ بنا سکتی ہے۔ آہ ! میں بھی کس قدر بیوقوف ہوں -

"جو جذبات میرے دل میں اس وقت پیدا ہو رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ آج کی رات تم نے مجھے تنہا چھوڑ دیا ہے۔ ان تمام واقعات سے جنھیں میں نے اپنے روزنامچے میں قلمبند کیا ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ میرا غم وا اندوہ بتدریج ترقی کرتا رہا ہے، اور اس کی ابتدا شادی کے روز ہی ہوگئی تھی اب میں زیادہ برداشت نہیں کر سکتی میرا طرزِ عمل چاہے غلط ہو یا صحیح میں اب اس طرح نہیں رہ سکتی۔ میں خوش ہوں کہ فیصلہ کرنے کی ساعت آپہنچی، چاہے یہ فیصلہ میرے خلاف ہی کیوں نہ ہو تیقن، اس روح فرسا شبہ سے خوش تر ہے۔ کیا اس کا دل مجھ سے پھر گیا ہے ؟ کیا وہ رَوز سے پھر محبت کرنے لگا ہے ؟ کاش مجھے کسی طرح یہ معلوم ہو جائے۔"

آئرین کی کانپتی ہوئی انگلیوں سے قلم گر پڑا۔ وہ اپنی تحریر کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کا عزم صمیم اس کے بشرے سے ظاہر ہو رہا تھا۔ "کیوں نہیں" اس نے اپنے آپ سے سرگوشی کی "مجھے اس کے جاننے کا حق حاصل ہے۔" اس نے تیزی کے ساتھ میز کا ایک دراز کھولا۔ اور اس میں سے ایک بکس نکال کر اسے خوف زدہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ گویا یہ سوچ رہی کہ نہ معلوم اس کے اندر کیا چیز بند ہے وہ ڈر رہی تھی۔

اُس نے اپنی حریص انگلیوں سے بکس کو کھولنا چاہا لیکن قفل نے اسے باز رکھا۔ حالانکہ وہ بہت کمزور تھا۔ آئرین نے کسی آلے کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی - ایک وزنی کٹار جو قدیم جنگوں میں استعمال ہوتی تھی دیوار سے لٹک رہی تھی۔ آئرین اسے اتار لائی اور اس کے دستے کا سرا ڈھکنے کے اندر ڈال کر ایک ہلکا سا جھٹکا دیا جس سے قفل کھل کر الگ جا گرا۔ اور بکس کی اندر کی کل چیزیں سامنے میز پر ڈھیر ہوگئیں -

ایک لمحے کے لئے آئرین ہچکچائی، اس کی خوف آلودہ نگاہیں بکس کے گوشے گوشے کا جائزہ لے رہی تھیں لیکن بکس کا سرمایہ مختصر تھا۔ خط کے پتلے پتلے کاغذ قابل نفرت سبز لفافوں میں۔ دو تین تصویریں۔ ننھے جوتوں کا ایک جوڑا جس کے چمڑے کا رنگ ماند ہوگیا تھا چند باتصویر کرسمس کارڈ جن پر کسی بچّی کے ہاتھ کا پتہ لکھا ہوا تھا اور سب کے نیچے چند قانونی مسودات جن کو آئرین نے فوراً سمجھ لیا کہ یہ طلاق کے مقدمے کے متعلق ہیں۔ بکس کے اندر سے ایک پژمردہ گلاب کی پنکھڑیوں کی ہلکی باس نکل کر اُن واقعات کی طرف اشارہ کر رہی تھی جو اب یاد سے محو ہوگئے تھے۔ سبز لفافے جن پر پتہ بہت نمایاں طور پر لکھا ہوا تھا حال کے واقعات کی یاد دلا رہے تھے۔ اس نے خط کے پلندے کو اٹھا لیا۔ اور اس کے فیتے کو کھول کر الگ کیا۔ "ان خطوں سے وہ بات معلوم ہو جائے گی۔ جو میں جاننا چاہتی ہوں۔" اس نے اپنے دل میں کہا -

پلندے میں صرف چار خط تھے اور تاریخ موصول کے اعتبار سے

ترتیب وار ایک پر ایک رکھے ہوئے تھے۔ پہلا خط بہت مختصر تھا اور اس میں الگ ایک گلابی پرزی بھی لگی ہوئی تھی۔

"پیارے ہنری (خط کا مضمون تھا) ایلن تمھاری بھیجی ہوئی گھڑی کا شکریہ ادا کرتی ہے۔ میں نے یہ گھڑی اس کے لئے اٹھا رکھی ہے کیونکہ ابھی وہ اس قابل نہیں ہے کہ اس کی حفاظت کر سکے۔ اس کی سالگرہ کی تقریب ہنسی خوشی کے ساتھ گزر گئی۔ اس نے شکریے میں تمھیں یہ پرزی لکھی ہے۔"

"روزا"

جس وقت آئرین نے ایلن کی پرزی کو اٹھا کر پڑھنا شروع کیا تو اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ بڑے بڑے اور کچے حروف میں لکھا تھا "پیارے ابا" آئرین آنسوؤں کو نہ روک سکی لیکن ان آنسوؤں میں وہ عنصر نہ تھا جس سے حسد کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس وقت اس کے دل پر ایک پریشان کن احساس طاری تھا۔ وہ پشیمان ہو رہی تھی کہ اس نے کیوں ایسے معاملات میں دخل اندازی کی جو اس کی زندگی سے علیحدہ تھے لیکن پھر دونوں میں اس ناقابلِ برداشت ارتباط کا کیا مطلب تھا؟ جس طرح اس خط میں روزا نے "پیارے ہنری" لکھ کر مخاطب کیا تھا۔ اسی طرح وہ پہلے بھی لکھا کرتی ہوگی۔ آئرین تعجب کر رہی تھی کہ اگر آج رات کے واقعات کی بنا پر اسے ہنری سے علیحدہ ہو جانا پڑے تو وہ کیا لکھ کر مخاطب کرے گی۔ اسے یاد آیا کہ یہ طلاق محض ایک رسمی علیحدگی تھی۔ لہذا روزا کا ہنری کو ان الفاظ میں مخاطب کرنا چنداں نامناسب نہ تھا۔ تاہم آئرین کو ناگوار معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے پھر دوسرا خط کھولا۔ یہ بھی مختصر تھا اور اس کا مضمون یہ تھا۔

"شکریہ۔ ہنری تمھاری دعاؤں کا شکریہ! میں اپنی کامیابی سے اس لئے خوش ہوں کہ ایلن کا مستقبل بن جائے گا۔ اب وہ اچھی ہے۔ اسے انفلوانزا ہو گیا تھا۔ وہ تمھیں پیار کرتی ہے۔"

آئرین غور سے یہ خط پڑھ رہی تھی اور خط کے ختم ہو جانے پر بھی چند سکنڈ تک وہ خاموشی کے ساتھ کچھ سوچتی رہی۔ ہنری نے روزا کو فنِ رقص میں کامیابی حاصل کرنے کی دعائیں دی تھیں۔ وہ ضرور روزا کی آئندہ زندگی میں دلچسپی لے رہا تھا۔ ورنہ ان دعاؤں کا کیا مطلب تھا لیکن کیا یہ ایک مرد کی فطرت سے بعید ہے کہ وہ ایک بچی کی خاطر ماں کی کامیاب زندگی کے متعلق دعا کرے۔ آئرین نے خط الگ رکھ دیا۔ وہ بالکل کھوئی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ اب تک اسے وہ چیز نہیں ملی تھی جس کی اسے تلاش تھی۔

تیسرا خط اور بھی مایوس کن تھا۔ اس کا مضمون حسبِ ذیل تھا۔

"پیارے ہنری۔ ایلن کی آئندہ زندگی کے متعلق چند ایسے اہم امور ہیں جن میں تمھارے مشورے کی ضرورت ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ اپنے وکیل کو تمھارے پاس بھیجوں لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اگر ہم دونوں مل کر مشورہ کریں تو جلد کسی مناسب فیصلے پر پہنچیں گے۔ ممکن ہے کہ اس میں ہم دونوں کو تھوڑی تکلیف ہو لیکن اس بچی کی خاطر ہمیں یہ تکلیف برداشت کرنی ہی پڑے گی۔

"آئندہ ہفتے میں برائیٹن جاؤں گی اور اس کے ایک ہفتہ بعد منچسٹر جانا ہوگا جہاں ہمارا قیام ایک ماہ تک رہے گا۔ اگر ان دنوں تم منچسٹر جاؤ (کیونکہ مجھے یاد آتا ہے کہ تمھیں اکثر کاروبار کے سلسلے میں منچسٹر جانا ہوتا ہے) تو مجھے اطلاع دو۔ تاکہ میں ملاقات کا انتظام کر سکوں۔ منچسٹر میں ایلن میرے ساتھ ہوگی لیکن اس کے بعد وہ کہاں جائے گی بس اسی کے متعلق تم سے کچھ ضروری صلاح لینی ہے۔ مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ وہ میرے ساتھ رہے کیونکہ اس زندگی میں بڑی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ راتوں کو دیر تک جاگنا ہوتا ہے۔ وقت کا زیادہ حصہ ٹرینوں میں صرف ہوتا ہے۔ کھانا ہوٹلوں میں کھانا پڑتا ہے۔ اس کے لئے کوئی اسکول زیادہ مناسب ہوگا۔ اگر میرا کوئی ایسا رشتہ دار موجود ہوتا جس کے سپرد میں ایلن کو کر سکتی تو تمھیں تکلیف نہ دیتی۔ لیکن بدقسمتی سے خالہ برتھا کے سوا اس دنیا میں میرا اور کوئی رشتہ دار نہیں۔ تم سے جو اس کو عداوت تھی وہ تمھاری بچی کے ساتھ بھی جاری ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم منچسٹر میں مجھ سے ضرور ملو گے۔ مجھے معلوم نہیں کہ ہمارا قیام کہاں رہے گا لیکن تم ہمارے تھیٹر کے ذریعے مجھ تک پہنچ سکتے ہو۔

"اچھا تمھارے دن کیسے گزرتے ہیں۔ میں امید کرتی ہوں کہ تمھیں وہ مسرت مل گئی ہوگی جس کو بہم پہنچانے میں میں ناکامیاب رہی۔ . . . . .

ہمیشہ کی چاہنے والی تمھاری روزا"

جس وقت آئرین نے یہ خط ختم کیا۔ اس کی آنکھوں سے آتشِ غضب کی تیز شعاعیں نکل رہی تھیں۔ کیا یہ مکار عورت ایلن کے ذریعے ہنری پر ہمیشہ اپنا قبضہ رکھنا چاہتی ہے۔ وہ ہنری سے ملاقات کا بہانہ ڈھونڈھتی ہے ورنہ آج یک بیک صلاح و مشورہ کی کیا ضرورت پیش آئی۔ وہ طلاق کی قیمت میں بچی کی پرورش چاہتی تھی۔ ایلن روزا کی بیٹی تھی۔ لیکن اب وہ ہنری کو اپنے یہاں بلاتے وقت لکھتی ہے کہ "تمھاری بچی" اُفوہ! یہ چال بازی! اچھا تو ہنری اس سے منچسٹر میں ملا ہوگا۔ اب آئرین نے سمجھا کہ جس رات ہنری منچسٹر سے واپس آیا تھا۔ اس نے بھوک کی کمی کی شکایت کیوں کی تھی اور دردِ سر کے بہانے کا مطلب کیا تھا۔ اور اس کی اُس رات کی بے تابی اور گریہ وزاری کا زمانہ

کون تھا۔ ان باتوں کو یاد کرکے آئرین کے دل کو سخت چوٹ لگی۔ اسے دھوکا دیا گیا تھا۔ دونوں نے مل کر اسے دھوکا دیا تھا۔ آہ کس قدر صدمے کی بات ہے۔ اگر ہنری پھر روزا کی طرف جانا چاہتا ہے تو چلا جائے ان فریب بازیوں کی کیا ضرورت ہے۔ روزا نے ہنری کی خانہ دوخرم زندگی کے متعلق جو سوال کیا تھا۔ اس سے ایک استہزا آمیز رشک ظاہر ہو رہا تھا۔ آئرین نے غصہ سے اس خط کو الگ پھینک دیا۔ اور آخری لفافہ کھولا۔ اس پر ریجنٹ پارک کی مہر تھی۔ آئرین کو یاد آیا کہ یہ وہی خط ہے جو آج صبح ہنری کو ملا تھا۔ وہ پڑھنے لگی۔

"پیارے ہنری۔ میں آج کل لندن میں ہوں اور بہت دنوں سے بیمار ہوں۔ میرے دل کا پرانا زخم جس کا تمھیں بھی علم ہے کمپنی کے ٹوٹ جانے اور فکر و تردد کے باعث پھر اُبھر آیا اور روز بروز تکلیف میں زیادتی ہے۔ میں تم سے ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ ایلن کے مستقبل کا خیال مجھے بے حد پریشان کر رہا ہے۔ ڈاکٹر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ میں مہینوں تک کسی کام کے قابل نہ ہوسکوں گی۔ اور مجھے اس ناموافق آب وہوا سے جلد چلا جانا چاہیئے۔ میں نہیں جانتی کہ اس نازک موقع پر تمھارے سوا اور کس سے مدد لوں۔ شاید تمھیں تکلیف پہونچے لیکن ہنری میں تم سے صاف صاف کہنے پر مجبور ہوں کہ میں تم سے زیادہ کسی کا خیال نہیں کرتی میں جانتی ہوں کہ یہ اعتراف نہایت خوفناک ہے لیکن کیا کروں۔ میں بالکل معذور ہوں کیونکہ حقیقت یہی ہے۔ پیارے ہنری۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں تمھاری خوبیوں کو نہ سمجھ سکی۔ امید کرتی ہوں کہ تمھاری موجودہ بیوی مجھ سے زیادہ عقلمند ہوگی۔ میں نے چاہا تھا کہ زندگی کو کامیاب بناؤں لیکن جو لوگ کامیابی کے خواہشمند ہیں انھیں بسا اوقات ناکامی کے تلخ گھونٹ پینے پڑتے ہیں۔ کامیابی کے لمحے مختصر ہوتے ہیں۔ بہت مختصر۔

"ہاں' میں نے بڑی بے وقوفی کی۔ مجھے خود اس کا اعتراف ہے۔ اگرچہ اب وقت نکل چکا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ تم ایک ایسی ہستی کے ساتھ جو تمھاری خوبیوں کو سمجھتی ہے مصروفِ عیش ہو۔ ہم دونوں نے بھی چند دن عیش کے گزارے ہیں۔ یہ میں اس لئے لکھ رہی ہوں کہ گزشتہ زندگی کے یہی چند لمحات ہیں جن کی یاد مجھے ایک گونہ مسرور رکھتی ہے۔ براہِ خدا ایسا نہ خیال کرنا کہ میں تمھیں الزام دے رہی ہوں۔ میں خود قصوروار ہوں حالانکہ اس سے پہلے میں تمھیں ہی الزام دیتی تھی' میں جانتی ہوں کہ یہ باتیں بالکل لغو ہیں اور میرے قلم سے بے ارادہ نکل گئی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم معاف کردوگے۔

"میں اس وقت تنہا ہوں۔ بے کس ہوں۔ بیمار ہوں اور ایلن کا خیال مجھے رہ رہ کر ستا رہا ہے۔ کاش کسی طرح ایلن کے مستقبل کا فیصلہ ہوگیا ہوتا۔ یہاں ایک نرس ہے جو میری اور ایلن دونوں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ اگر میں تبدیل آب وہوا کے لئے یہاں سے باہر چلی جاؤں تو موسم بہار تک تندرست ہوسکتی ہوں'

"ہنری میرے دل پر رنج وغم کا بادل چھا رہا ہے۔ یہ اس لئے کہ میری زندگی ناکامیاب ثابت ہوئی تمھیں میں اپنے اندوہ وغم میں شریک بنانا چاہتی ہوں جیسا کہ پہلے میرا دستور تھا اس وقت میں تم سے ایک ضروری کام میں مدد لینا چاہتی ہوں۔ ایلن کے متعلق تمھارا مشورہ درکار ہے میں اس کو ساتھ لے کر دکھن کو چلا جانا چاہتی تھی' لیکن میرے پاس اتنا کافی روپیہ نہیں ہے کسی اسکول کے بورڈنگ ہوس میں وہ زیادہ اچھی طرح رہ سکتی ہے' تمھارا کیا خیال ہے؟ مجھے تمھارے مشورے کی ضرورت ہے اگر تم آسکتے ہو تو جلد آؤ۔ کیونکہ جس وقت مجھے ذرا بھی صحت ہو جائے گی میں یہاں سے روانہ ہوجاؤں گی' میرا کمرہ تیسری منزل پر ہے۔ یہاں برقی زینہ نہیں ہے۔ تاہم مجھے امید ہے کہ تم میری خاطر سیڑھیوں پر چڑھنے کی تکلیف گوارا کرلوگے۔ آنے لگو تو ٹیلیفون کے ذریعے اطلاع کر دینا۔ تاکہ میں تمھارے خیر مقدم کو تیار رہوں۔ میں زیادہ تر بستر پر پڑی رہتی ہوں کیونکہ ڈاکٹر کا حکم ہے کہ مجھے آرام کرنا چاہیئے۔

"تم ضرور آؤ۔ شاید تمھاری بیوی ہماری اس ایک دفعہ کی ملاقات کا کچھ خیال نہ کرے گی۔ ایلن تم سے مل کر بہت خوش ہوگی۔

روزا"

آئرین نے ایک اضطراری حرکت کے ساتھ خط کو موڑ کر لفافہ کے اندر رکھ دیا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نصف بند تھیں۔ اس نے اپنے دماغ میں ایک تصویر کھینچنی چاہی کہ اس کا شوہر روزا کے بستر پر پہلو میں بیٹھا ہوا ہے اور اس کی ناکامیابی پر اظہارِ ہمدردی کر رہا ہے بلکہ کبھی اسے اپنے آغوش میں لے کر تسلی دینے لگتا ہے۔ اس آخری خط نے معاملہ بالکل صاف کردیا تھا۔ وہ ہنوز اس ذہنی تصویر کے کھینچنے میں مشغول تھی کہ دور سے گرجا کی گھڑی کے بجنے کی صدا اس کے کانوں میں پہنچی یکبارگی وہ لرز گئی خطوں کو جلد جلد لفافوں میں رکھ کر کل چیزوں کو اس نے بکس میں بند کردیا اور پھر بکس کو دراز میں اپنی جگہ پر رکھ دیا۔ شدتِ غضب سے وہ بالکل مغلوب

ہو رہی تھی۔ رات کا ایک بج چکا تھا۔ اور اس کا شوہر ابھی تک اپنی آشنا
کے پہلو میں بیٹھا ہوا۔ اس کی بچی کے مستقبل کے متعلق مشورہ کر رہا تھا آئرین
نے زور سے ایک قہقہہ لگایا جس میں رنج والم۔ حسد وعداوت اور غیظ وغضب
کی تلخی ملی ہوئی تھی۔ آہ! وہ کتنی بے وقوف تھی کہ اس نے مرد پر اعتبار کیا تھا
اب اسے احساس ہوا کہ ہنری اپنی برات میں چاہے کیسا ہی معقول عذر
کیوں نہ پیش کرے اس کے دل پر سے رنج والم کا بار ہٹ نہیں سکتا۔
اگر ایک یا دو گھنٹے کی بات ہوتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ بنصف شب تک
بغیر کسی معقول سبب کے غائب رہنا یقیناً ناقابل معافی ہے۔ آئرین کی دلی
خواہش تھی کہ اب وہ صبح سے قبل واپس ہی نہ آئے۔

باہر دروازے کا قفل کھلنے کی ایک ہلکی سی صدا بڑے ہال سے
گزرتی ہوئی اس کے کانوں تک پہنچی۔ آئرین اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے
دونوں ہاتھوں کو زور سے بھینچ لیا۔ یہاں تک کہ اسے تکلیف معلوم ہونے لگی
قدموں کی چاپ سے اس نے پہچانا کہ ہنری آرہا ہے۔ کچھ سوچ کر وہ فوراً
سایہ میں چھپ گئی۔ تاکہ ہنری اس کے اندوہناک چہرے کو نہ دیکھ سکے
پردہ ہٹا۔ اور اس کا شوہر اندر داخل ہوا۔ اس کا سفید چہرہ صاف نظر
آرہا تھا غم وغصے کی حالت میں بھی آئرین کو اس کے چہرے پر زردی اور
نگاہوں میں تردد وفکر کے آثار نمایاں معلوم ہو رہے تھے۔ آئرین نے سمجھ لیا کہ
اب وہ نازک موقع جس کا اسے انتظار تھا آپہنچا ہے۔

ہنری کے چہرے سے کسی طرح یہ ظاہر نہ ہوتا تھا کہ وہ دل میں
پشیمان ہو رہا ہے اور معافی کا خواستگار ہے۔ بلکہ اس کے برعکس وہ مقابلے
کے لئے تیار نظر آتا تھا۔ آئرین کے دماغ میں یہ خیال نہایت سرعت کے
ساتھ پیدا ہوا کہ وہ اس وقت اس سے یہ کہنے آیا تھا کہ "مجھے تمھاری ضرورت
نہیں ہے۔ میں روزا کی طرف واپس جا رہا ہوں۔" آئرین نے اس کی
نگاہوں کا نہایت دلیری سے مقابلہ کیا لیکن اس کے دل پر بڑی ہیبت
طاری تھی۔

"آئرین" اس نے کہنا شروع کیا۔ "مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔"
"اگر تمھیں یہ کہنا ہے کہ تم اس وقت اپنی آشنا کے پاس سے چلے
آرہے ہو تو فضول ہے کیونکہ مجھے پہلے ہی اس کا علم ہو چکا ہے۔"
ہنری کو آئرین کی بات سن کر کوئی تعجب نہیں ہوا۔ ظاہراً اسے یہ
احساس ہی نہیں ہوا کہ شام کے واقعات سے آئرین کو واقفیت ہے یا نہیں
اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ آئرین کو اس کا علم کیسے ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ
گویا وہ اس سے زیادہ اہم معاملے کے متعلق سوچ رہا ہے۔

"نہیں، یہ نہیں" اس نے ایک ایسی متانت اور سنجیدگی سے جواب
دیا جو ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ "وہ بات اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔"
"اس سے زیادہ اہم؟" آئرین کی آنکھوں میں ایک خوفناک
چمک پیدا ہونے لگی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ آپے سے باہر ہوئی جا رہی
ہے۔ "کیا اس سے بھی زیادہ کوئی اہم بات ہو سکتی ہے کہ وہ اسے تنہا چھوڑ کر
رات کسی دوسری جگہ بسر کرے۔" "اس وقت تک اس سے زیادہ کوئی
دوسری چیز اہم نہیں ہو سکتی جب تک کہ تم مجھ سے قطع تعلق کر کے اپنی آشنا کے
جانہ ملو۔"

"آئرین، ایسا نہ کہو۔" اس نے نہایت نرمی سے کہا۔ "اگر میں ایسا
کرنا بھی چاہوں تو اب ممکن نہیں۔ ایک گھنٹہ ہوا کہ وہ چل بسی"
کمرے میں ایک یاس آمیز خاموشی چھا گئی۔ آئرین کے سر میں کچھ
سا محسوس ہونے لگا۔ اس نے سہارا لینے کے لئے میز کا کنارہ پکڑ لیا۔
اس افسوسناک واقعہ کے سامنے اسے اپنا معاملہ بالکل ہیچ اور بے بنیاد
معلوم ہو رہا تھا۔

"وہ صدموں کو برداشت نہ کر سکی۔" اس نے ہنری کو کہتے ہوئے
سنا۔ "لوگوں نے اس کو مرض کے متعلق دھوکے میں رکھا لیکن مجھے معلوم تھا
میں نے اس کے ڈاکٹر سے گفتگو کی تھی۔ پیاری آئرین!"
اس نے فرط محبت میں آئرین کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔
"تم جانتی ہو کہ میں نے تمھارے مقابلے میں اس سے زیادہ محبت
نہیں کی۔ تم میرے دل اور جان کی مالک ہو۔ اگر میں وقتاً فوقتاً اس سے
ملنے چلا گیا تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ میرے دل میں اس کی محبت از سرنو
پیدا ہو رہی ہے بلکہ اس لئے اور صرف اس لئے کہ مجھے اس کی صحت کے متعلق
شبہہ ہو رہا تھا۔ اگر میری جگہ تم بھی ہوتیں تو شاید اس سے کم نہ کرتیں کیوں؟
میری پیاری آئرین؟ !——"

آئرین نے اپنا سر ایک معنی خیز انداز میں ہلایا اور یکبارگی اس کی
آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"آج رات جس وقت میں نے اسے دیکھا" ہنری نے اپنی گفتگو
جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تو میں نے یقین کر لیا کہ عنقریب اس کا خاتمہ
ہونے والا ہے۔ دس بجے اس کی حالت ایسی بگڑی کہ پھر سنبھل نہ سکی یہاں تک
کہ اس کی روح پرواز کر گئی۔ نرس۔ ڈاکٹر۔ ایلن اور میرے سوا وہاں کوئی موجود

نہ تھا۔ لہٰذا میرا وہاں ٹھیر جانا ضروری تھا۔ میں نے چاہا کہ تمھیں ٹیلیفون سے اطلاع کر دوں۔ مگر وہ اس کے بسترِ مرگ کے قریب رکھا ہوا تھا۔ اس وجہ سے میں مجبور رہ گیا۔"

آئرین کے دماغ میں دو باتیں تیزی کے ساتھ چکر لگا رہی تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ عورت جس سے وہ حسد کرتی تھی اب دنیا میں موجود نہ تھی۔ دوسرے یہ کہ اب وہ اپنے شوہر کی تنہا مالک تھی لیکن ان دونوں باتوں میں وہ کسی سے بھی خوش نہ تھی۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ اس مردہ عورت میں ایک بار پھر جان ڈال دیتی۔ اگرچہ اس کی خاطر اس کو اپنی محبوب ترین چیز قربان کیوں نہ کرنی پڑتی لیکن اب یہ ناممکن تھا جس محبت بھرے انداز سے ہنری اس کے ہاتھوں کو دبا رہا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ہمیشہ سے آئرین کا تھا۔ اور اس کے تمام شکوک و شبہات اور حاسدانہ خیالات بالکل مہمل و بے بنیاد تھے۔

"ہنری ہنری" اس نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ اس سے زیادہ بولنے کی اس وقت اس میں سکت نہ تھی۔ ہنری نے اس کی طرف دیکھا۔ ابھی تک اس کی نگاہوں سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔

"ابھی ایک بات اور ہے آئرین" اس نے کہا۔ "بچی ابھی تک موجود ہے۔ میں نے اس کے متعلق بہت کچھ غور و فکر کیا ہے۔ اس معاملے میں مجھے تمھاری مدد کی ضرورت ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایلین یہاں ہمارے ساتھ رہے"

معاً آئرین کے ہاتھ چھوٹ کر لٹک گئے۔ روز کے متعلق سوچنے میں وہ اس قدر از خود رفتہ ہو رہی تھی کہ اسے ایلین کا ذرا بھی خیال نہ آیا تھا۔ اب اسے معلوم ہوا کہ اس سے کیا امید کی جا رہی ہے۔ اس سے یہ کہا جا رہا تھا کہ اسی بچی کو اپنے ساتھ رکھ لے۔ وہ اپنی ماں کی یادگار بن کر برابر ان کے ساتھ رہے گی۔ اور ہر وقت ہنری کو روز کی یاد دلایا کرے گی آئرین ایک لمحے کے لئے بھی یہ خیال دل میں نہ لا سکتی تھی ہنری کو یہ حق نہ تھا کہ وہ اس سے اس قسم کی درخواست کرے۔ اگرچہ آئرین اس کو تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی لیکن واقعہ یہ تھا کہ اس کی عداوت ماں سے ہٹ کر بچی کی طرف منتقل ہو رہی تھی۔ اب وہ ہنری کے خیالات اور روز کی یادگار سے بھی حسد کرنے لگی تھی۔

آئرین کے دماغ میں خیالات کا جو طوفان اٹھ رہا تھا۔ اس کا ہنری نے اندازہ کر لیا۔ اس نے مڑ کر دروازے کا رخ کیا۔ جب وہ چوکھٹ پر پہنچا تو ایک ہاتھ سے پردہ تھام کر کہا "پیاری اس پر غور کرو میں ابھی آتا ہوں"۔ یہ کہہ کر اس نے پردہ چھوڑ دیا۔ اور باہر نکل گیا۔

آئرین میز کے کنارے کا سہارا لئے ہوئے بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ اب اسے کیا کرنا چاہئے؟ اس کی جگہ پر اگر کوئی دوسری عورت ہوتی تو اس کا طرز عمل کیا ہو سکتا تھا؟ خط سے اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اس بچی کا دنیا میں کوئی رشتہ دار نہیں ہے جو اس کی پرورش کا ذمہ دار ہو۔ اگر ہوتا بھی تو یہ بات بالکل فطرت کے مطابق تھی کہ ہنری ایلین کو اپنے ساتھ رکھنے کی خواہش کرے۔ کیا اس یادگار کی موجودگی میں دونوں کو سچی خوشی میسر آ سکتی تھی۔ ایک مرتبہ ہنری نے کہا تھا کہ ایلین ہو بہو اپنی ماں کی تصویر ہے۔ کیا وہ اسے ہر روز دیکھ کر روز کو یاد کئے بغیر رہ سکے گا؟

آئرین ہنوز ان ہی خیالات میں منہمک تھی اور کسی فیصلے پر نہیں پہنچی تھی کہ ہنری پردہ ہٹاتا ہوا اندر داخل ہوا۔

آئرین نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ جھجک گئی کیونکہ اس کا شوہر اس دفعہ اکیلا نہیں تھا ایک ہاتھ سے وہ ایک بچی کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ بچی کے جسم سے پھول کی سی نزاکت اور چہرے سے حور کی سی معصومیت ٹپک رہی تھی۔ اس کی پھٹی پھٹی نگاہوں میں جن میں سحرانہ خوف کی جھلک تھی آنسو کے قطرے تیر رہے تھے۔ اس نے آئرین کی طرف نگاہ کی اور پھر جیسے کوئی بچہ خوفناک چیز دیکھ کر ماں کی آغوش سے چمٹ جاتا ہے۔ وہ ہنری کے ہاتھوں سے چمٹنے لگی۔ ہنری نے مہرِ سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

"پیاری آئرین۔ دیکھو یہ ایلین ہے" اس کا لہجہ بہت نرم و نازک تھا۔ "ماں کی آغوش چھوٹنے کے بعد اب اس کے لئے کہیں ٹھیرنے کی جگہ نہیں ہے۔ اس لئے میں اسے ساتھ لے آیا ہوں۔ وہ بہت خستہ ہو رہی ہے۔"

بات ختم کر کے اس نے اپنی نگاہیں آئرین پر جما دیں۔ شفقت اور رحم کی ایک لہر آئرین کی روح میں دوڑ گئی۔ یکبارگی وہ آگے کو بڑھی۔ اس کی آغوش اس بن ماں کی بچی کے لئے کھلی ہوئی تھی۔

"پیاری بچی۔ پیاری بچی" کہہ کر وہ گھٹنوں کے بل جھک گئی اور اس نے ایلین کو سینے سے چمٹا لیا۔ "ہنری۔ اسے تھوڑا سا گرم دودھ دینا چاہئے۔ ایلین۔ یہاں اپنے ابا اور میرے ساتھ رہو گی؟"

بچی نے نہایت سنجیدگی اور خاموشی سے سر ہلا دیا اور پھر رونے لگی۔ آئرین نے اسے سینے سے لگا کر خوب بھینچ بھینچ کر پیار کیا۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت مسرت کی ایک چمک پیدا ہو رہی تھی۔

"ہنری۔ جلدی سے دودھ لاؤ" شفقت اور الفت سے بھری ہوئی آواز میں اس نے کہا "میرے پیارے میں ہمیشہ اسے خوش رکھنے کی حتی الامکان کوشش کروں گی۔"

ہنری جھک کر آئرین کی زلفوں کا بوسہ لینے لگا۔

"میں جانتا تھا کہ تم ایسا کرو گی۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "میں نہیں کہہ سکتا کہ میں اس وقت کس قدر مسرور ہوں۔" (ترجمہ)

سید حسن، ام۔ اے

جگر پارے

اب کہاں زمانے میں دوسرا جواب اُن کا
فصلِ حسن ہے اُن کی موسمِ شباب اُن کا

ہم سے پوچھ اے ناصح دل گرفتگی اُن کی
ہم نے چھپ کے دیکھا ہے عالمِ نقاب اُن کا

کیا اسی کو کہتے ہیں ربط و ضبطِ حسن و عشق
شوقِ نارسا اپنا نازِ کامیاب اُن کا

یوں ہی کھلتے جاتے ہیں حسن و عشق کے اسرار
اک نفس سوال اپنا اک نفس جواب اُن کا

اور کس کی یہ طاقت اور کس کی یہ جرأت
عشق آپ آڑ اپنی حسن خود حجاب اُن کا

عرضِ غم نہ کر اے دل دیکھ ہم نہ کہتے تھے
رہ گئے وہ "اُنھ" کہہ کر سُن لیا جواب اُن کا

تو جگر جو رسوا ہے تو ہی آہ رسوا رہ
نام تو نہ کر رسوا خانماں خراب اُن کا

جگر مرادآبادی

مرسلہ شہزادہ ایاز از بمبئی

شاعر کی دعا

مرے غمزدہ دل کی جانِ نشاط رہے عشرتوں سے ترا ارتباط
تری روح ناواقفِ غم رہے لہو میں تپش، شوق میں دم رہے
تری زلف کا عشق انگیز رنگ حسیں انکھڑیوں کا جنوں خیز رنگ
ترے روح پرور لبوں کا گداز ہے تخلیق کو جن کی صنعت پہ ناز
کشادہ جبیں کی صباحت کا سحر حسیں انگلیوں کی نزاکت کا سحر
وہ باتیں تری جن کو میں کیا کہوں لطیف اور جذبات آرا کہوں
وہ باتیں جو انساں کی باتیں نہیں جو اِس بزمِ ویراں کی باتیں نہیں
وہ باتیں، وہ گفتار کی ساحری وہ باتیں خجل جن سے نظمیں مری
تکلم میں مے، گفتگو میں شراب سلامت رہے آہ! تیرا شباب
ترے حُسن کی، دلربائی کی خیر تُو فطرت کا شہکار ہے تیری خیر
بڑی تلخ ہے گو مری یہ دعا مگر میں ہوں انجام سے آشنا!
پہنچ کر جوانی کے معراج پر نہ ہو تیری شب آشنائے سحر
تُو رخصت ہو پہلے ہی تخریب سے فنا کی غم انگیز تقریب سے

اور اک غیر فانی کہانی بنے
جوانی تری جاودانی بنے

عدم

سیاسی انقلابات اور شاعری

سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ گردوپیش کی ساری چیزیں بدل جاتی ہیں۔ حکومت علم وفن اور فضل وکمال کی ترقیوں کا مرکز ہے جس حکومت میں علم وفن کو ترقی دینے کی کوشش کی جائے گی۔ جہاں کے حکمرانوں کو علم وفن سے دلچسپی ہوگی۔ وہاں کے عوام میں بھی یہ مذاق دن بدن ترقی کرتا رہے گا۔ اور عوام میں دلچسپی پیدا ہو جانے کے بعد علم وفن سب سے زیادہ ترقی کر سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے اگر حکومت علم وفن کی طرف سے بے نیاز ہے۔ حکمرانوں کو فنون سے ذرا بھی دلچسپی نہیں۔ وہ اہلِ کمال اور علم وفن کے دلدادگان کی قدر نہیں کرتے تو ایسی سلطنتوں میں علوم وفنون کا جنازہ نکل کر اُن میں ایک طرح کا جمود پیدا ہو جائے گا۔

یہ بیان کسی ثبوت کا محتاج نہیں۔ ہر ملک اور ہر قوم کی حکومت پر نظر ڈالنے کے بعد ہم اس بات کا اندازہ آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ جب حکومت نے علم وفن میں دلچسپی لی تو انھوں نے ہر جگہ بے حد ترقی کی ہے۔ یہ بات مان لینے کے بعد کہ حکومت کی توجہ اور بے توجہی علوم وفنون کی ترقی اور تنزل کی ضامن ہے، دوسری چیز جو ہمارے سامنے آتی ہے یہ ہے کہ جب حکومت فنون کی ترقی میں کوئی نمایاں حصہ لینا شروع کرتی ہے تو صاحبِ فن اُس کو ترقی دینے کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ فن کی موجودہ شکل حکومت کے مذاق کے ہم آہنگ ہو خصوصاً شخصی حکومتوں میں یہ اثر زیادہ گہرا نظر آتا ہے۔ ہندوستان میں جب سے اردو شاعری شروع ہوئی شخصی حکومت کا دور دورہ رہا۔ اور گولکنڈہ۔ بیجاپور۔ دہلی لکھنؤ۔ مرشدآباد۔ رام پور اور حیدرآباد کی چھوٹی اور بڑی سب ریاستوں میں علم کی ترقی کسی نہ کسی شخصی حکمران کی توجہ کی محتاج رہی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری میں جہاں مختلف سیاسی تبدیلیوں سے ایسے اثرات رونما ہوئے جو فطری طور پر ہونے لازمی تھے وہاں دوسری طرف مختلف دوروں کی شاعری کے مذاق میں بھی تبدیلی ہوتی گئی اور بعض اوقات ایک ہی زمانے میں دو مختلف مقامات پر ایسی شاعری کا دور دورہ رہا کہ دونوں اپنے اپنے مذاق میں ایک دوسرے سے جداگانہ تھیں۔ دونوں کے مذاق میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ بات صرف یہ تھی کہ دو مختلف مقامات کا سیاسی مذاق جداگانہ تھا۔ شاعرانہ فطرتیں اس کی پیروی کرتی رہیں اور ایک ہی زمانے میں دو مختلف مذاق کی شاعریاں پیدا ہوگئیں۔

لکھنؤ اور دہلی پر نظر ڈالنے کے بعد اس بات کا اندازہ اچھی طرح ہو سکتا ہے کہ سیاسی انقلابات اور حکمراں کا مذاق اور ذہنیت شاعری کے مذاق میں کس طرح تبدیلی کر سکتے ہیں۔

یہ تو ایک عام اصول ہے۔ اب دیکھنا یہ چاہئے کہ ملک کے سیاسی حالات شاعری پر کس کس طرح اثر ڈال سکتے ہیں اور ان مختلف سیاسی تبدیلیوں کے نقوش کس طرح مختلف دوروں میں شاعری پر باقی رہ جاتے ہیں اور کس طرح کوئی ناواقف شخص ان سیاسی تبدیلیوں کو شاعری کے ذریعے سے محسوس کر سکتا ہے؟

شاعر پر کسی سیاسی انقلاب کا پہلا اثر تو یہ پڑتا ہے کہ یکایک وہ اس انقلاب کی وجہ سے اپنے گردوپیش میں جو تبدیلی محسوس کرنے لگتا ہے اسے شعر کا لباس پہنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے اور یہ سیاسی انقلاب کی پہلی تصویر ہوتی ہے۔ اردو شاعری میں ان انقلابات کی مصوری یا تو مثنویوں اور قصیدوں میں ہوئی ہے اور یا اُن نظموں میں جو مختلف دور کے شاعروں نے شہر آشوب کے نام سے لکھیں۔ ایسی نظموں کے پڑھنے کے بعد ہمیں حکومت کے انقلاب کے حالات تو معلوم ہوتے ہی ہیں لیکن اس سے کہیں زیادہ مفصل طریقہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سیاسی تبدیلی سے ملک کے رہنے والوں کی زندگیوں میں کیا انقلاب ہو گیا۔ امیر غریب ہو گئے۔ اور غریب اتنے غریب ہوئے کہ فاقہ مست بن گئے

شرافت لوگوں سے دور بھاگ گئی۔ رہنے سہنے کے طریقوں میں عظیم انقلابات رونما ہو گئے اور ان سب سے زیادہ شدید بات یہ ہے کہ ملک کے لوگوں کے اخلاق میں خاص قسم کی تبدیلیاں پیدا ہوگئیں۔ یہ تبدیلیاں عموماً مائل بہ پستی ہوتی ہیں اور اس لئے آنے والے دور کی شاعر ان تبدیلیوں کو خوشی آیندہ نہ سمجھ کر وعظ و پند کے دفتر لکھ لیتے ہیں اور اس سلسلے میں جو شاعری جلوہ گر ہوتی ہے اس کا انداز اس طرح کا ہوتا ہے کہ اس سے لوگوں کی اس اخلاقی پستی کا اندازہ بالکل اچھی طرح ہو جاتا ہے جو اس سیاسی تبدیلی کی وجہ سے ان میں پیدا ہوگئی ہے؛

اس مضمون میں سیاسی انقلابات کے سلسلے میں مختلف قسم کی شاعریوں کے جو نمونے پیش کئے جائیں گے انھیں مختصر طور پر ان چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) مختلف زمانوں میں جو سیاسی انقلابات ہوئے ان کی مصوری شاعروں نے کس کس طرح کی؟

(۲) ان سیاسی تبدیلیوں نے لوگوں کی معاشرت۔ ان کے تمدن یا رہنے کے طریقوں میں کیا اور کیسی تبدیلیاں کیں؟

(۳) ان سیاسی انقلابات سے لوگوں کے اخلاق اور اخلاقی زندگی میں کیا کیا فرق پیدا ہو گئے؟

(۴) اردو شاعری کے مختلف دوروں میں عام مذاق شاعری میں کس کس طرح تبدیلیاں ہوئیں اور ان سے اردو شاعری پر کیا اثر پڑا؟

ان چار عنوانوں کے تحت میں اردو شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ سیاسی انقلابات کی وجہ سے کس طرح شاعری میں مقامی رنگ کی جھلک اور اس کا گہرا اثر پیدا ہو جاتا ہے۔

دکن کے ابتدائی دورِ شاعری کو چھوڑ کر اگر ہم دہلی کی شاعری پر نظر ڈالیں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ اس شاعری کے جتنے اہم دور ہوئے انھیں مختلف سیاسی تبدیلیوں سے دوچار رہنا پڑا۔ ولی سراج۔ داؤد۔ اور ان کے ہم عصروں کو دہلی سے بہت قریبی تعلق نہیں رہا۔ اس لئے اُن کی شاعری اس رنگ سے متاثر نہیں ہوئی۔ اس لئے سیاسی حالات کا گہرا اثر ہمیں سب سے پہلے میرؔ اور سوداؔ کی شاعری پر نظر آتا ہے ان دونوں شاعروں کے کلام میں ہمیں جابجا ایسے اشارات اور تفصیلات ملتی ہیں جن میں اس زمانہ کی سیاسی حالت کی مصوری کی گئی ہے۔ سوداؔ اور میرؔ کا زمانہ وہ تھا جب تیموری شان و شوکت ختم ہو جانے کے بعد شاہ عالم برائے نام بادشاہ رہ گئے۔ تھے تخت و تاج صرف نام کے لئے باقی تھا مرہٹوں کا اتنا زور تھا کہ بادشاہ ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے۔ امراء کی حالت ان سے بھی زیادہ نازک تھی۔ شان و شوکت حشم و خدم سب روپے کی بدولت ہے۔ روپیہ ان سے دور بھاگ گیا تھا۔ اس لئے یہ سب چیزیں بھی معدوم تھیں۔ زمانہ کی اس حالت کی منظوم تصویریں ہمیں سوداؔ اور میرؔ کی نظموں میں ملتی ہیں۔ اور انھیں پڑھ کر ہم اُس زمانے کی سیاسی حالت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

میرؔ اپنی ایک مثنوی میں ایک امیر کی حالت بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک سرائے میں جا کر اترے اور بھٹیاری سے کھانا طلب کیا تو اس نے یہ جواب دیا ؎

سُن کے اک دل سے کھینچی اُن نے آہ — اور بولی کہ واہ صاحب واہ
ہم تو جانا تھا آدمی ہو بڑے — چار پانچ آدمی ہیں پاس کھڑے
کچھ یہ کھاویں گے کچھ کھلاویں گے — ہم کچھ ان کے سبب سے پاویں گے
سو تو نکلے ہو کورے بالم تم — ہو گدا جیسے شاہ عالم تم

ان چار شعروں سے امراء کی حالت کا جو اندازہ ہوتا ہے۔ وہ تو ہے ہی لیکن آخری مصرعے سے شاہ عالم کی حالت کی سچی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

میرؔ نے ایک شہر آشوب میں امیروں کی حالت کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے ؎

پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال — ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال
بادشاہ و وزیر سب قلاش

جتنے ہیں یاں امیر بے دستور — بہر بخشش و سلوک سب مشہور
پہنچنا ان تلک بہت ہے دور — بات کہنے کا واں کسے مقدور
حاصل ان سے نہ دل کو غیر خراش

چار بچے ہیں مستعد کار — دس تلنگے جو ہوں تو ہو دربار
ہیں وضیع و شریف سارے خوار — لوٹ سے کچھ ہے گرمیٔ بازار
سو بھی قندِ سیاہ ہے یا ماش

امیروں کی حالت کا نقشہ سوداؔ نے مخمس شہر آشوب اور قصیدہ شہر آشوب میں کھینچا ہے مخمس میں کہتے ہیں ؎

سپاہی رکھتے تھے نوکر امیر دولتمند — سو آمد اُن کی تو جاگیر سے ہوئی بند

کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند   جو ایک شخص ہو یا بیش صوبے کا خاوند
رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداری کول

سیاسی حالات کی یہ مختصر مصوری مقامی اثر کے اس پہلو کو نمایاں کرنے کے لئے کافی ہے ۔ اور حقیقت میں یہ کچھ زیادہ اہم بھی نہیں ۔ اصل چیز عام لوگوں کی زندگی ہے ۔ اسے دیکھ کر ان تبدیلیوں کے انقلاب اثر پہلوؤں کا اندازہ ہوتا ہے اور لوگوں کی حالت دیکھے بغیر پڑھنے والے سیاسی انقلاب کا نقشہ اپنی نظروں میں بٹھا سکتے ہیں ۔ یہ سماجی تبدیلیاں سودا اور میر کے زمانے سے لے کر برابر ہمارے موجودہ دورِ شاعری تک جلوہ نما ہوتی رہیں اور ہمارے شاعروں نے قریب قریب ہر زمانے کی حالت کا نقشہ کسی نہ کسی شہر آشوب میں کھینچا ہے ۔ میر اور سودا کے شہر آشوب مخمسوں اور قصیدوں کے کچھ شعروں سے جن میں عام زندگی کے عبرت انگیز پہلوؤں کا ذکر ہے اس انقلاب کو نمایاں کیا جاسکتا ہے ؎

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی   تنخواہ کا پھر عالمِ بالا پہ نشاں ہے
گزرے ہے سدا یوں علف و دانہ کی خاطر   شمشیر جو گھر میں تو سپر بنئے کے یاں ہے
سوداگری کیجے تو ہے اس میں یہ مشقت   دکھن میں بکے وہ جو خریدِ صفہاں ہے
شاعر جو سنے جاتے ہیں مستغنی الاحوال   دیکھے جو کوئی فکرِ تردد کو تو یاں ہے
گر عید کا مسجد میں پڑھے جا کے دوگانہ   نیت قطعہ تہنیتِ خانِ زماں ہے
تاریخِ تولد کی رہے آٹھ پہر فکر   گر رحم میں بیگم کے سنے نطفہ نہاں ہے
ملائی اگر کیجے ملا کی ہے یہ قدر   ہوں دور دیہہ اس کے جو کوئی مرثیہ خواں ہے

(سودا)

زندگانی ہوئی ہے سب پہ وبال   کنجڑے جھینکے ہیں روتے ہیں بقال
پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال   ایک تلوار بیچے ہے یک ڈھال

(میر)

نظیر اکبرآبادی نے اپنے ایک مخمسِ شہر آشوب میں اپنے زمانے کی سوسائٹی کی حالت دکھائی ہے اور لوگوں کی زندگی کی زیادہ چھوٹی جزئیات کا ذکر کرکے ان کی حالت کی مصوری زیادہ مؤثر طریقے سے کی ہے ؎

بے روزگاری نے یہ دکھائی ہے مفلسی   کوٹھے کی چھت نہیں ہے یہ چھائی ہے مفلسی
دیوار و در کے بیچ سمائی ہے مفلسی   ہر گھر میں اس طرح سے بھر آئی ہے مفلسی
پانی کا ٹوٹ جاوے ہے جوں ایک بار بند

اب آگرہ میں جتنے ہیں سب لوگ ہیں تباہ   آتا نظر کسی کا نہیں ایک دم نباہ
مانگو عزیزو ایسے برے وقت سے پناہ   وہ لوگ ایک کوڑی کے محتاج اب ہیں آہ
کسب و ہنر کے یاد ہیں جن کو ہزار بند

مارے ہیں ہاتھ ہاتھ پہ سب یاں کے دستکار   اور جتنے پیشہ دار ہیں روتے ہیں زار زار
کوٹے ہے تن لوہار تو پیٹے ہے سر سنار   کچھ ایک دو کے کام کا رونا نہیں ہے یار
چھتیس پیشے والوں کا ہے کاروبار بند

نظیر نے اس کے بعد تفصیل سے بساطی ۔ نائی ۔ نان بائی ۔ مالی اور بہت سے پیشہ والوں کی حالت بیان کی ہے ؎

آمد ہی خادموں کی نہیں مقبروں کے بیچ   بامن بھی سر پٹکتے ہیں سب مندروں کے بیچ
عاجز ہیں علم والے بھی سب مدرسوں کے بیچ   حیراں ہیں پیرزادے بھی اپنے گھروں کے بیچ
نذر و نیاز ہو گئی سب ایک بار بند

کیا چھوٹے کام والے وکیا پیشہ ور نجیب   روزی کے آج ہاتھ سے عاجز ہیں سب غریب
ہوتی ہے بیٹھے بیٹھے ہی جب شام عنقریب   اٹھتے ہیں سب دکاں سے یہ کہہ کر کہ یا نصیب
قسمت ہماری ہو گئی بے اختیار بند

یہ حالت تو غدر سے کچھ سال پہلے کی ہے ۔ غدر کے زمانے میں جو حالت ہوگی اس کا اندازہ کرنا تو اور بھی دشوار ہے البتہ غدر کے بعض حالات اور اس کے اثرات کا اندازہ اسی قسم کی چند نظموں سے کیا جاسکتا ہے ۔ راسخ عظیم آبادی داغ ۔ حالی اور بعض دوسرے شاعروں نے دہلی کی اس حالت پر جو نوحہ کیا ہے وہ دیکھنے میں ان شاعروں کے آنسو ہیں لیکن ان آنسوؤں کے پردے میں سیاسی انقلابات کے تباہ کن نتائج کی تصویریں ہیں جنھیں پڑھ کر ہم ان حالات کا اندازہ کرتے ہیں ۔ حالی نے دہلی کے ان انقلابات پر غم کے آنسو بہائے ہیں ۔ اس طویل مسدس کے چند بند ملاحظہ ہوں ؎

لیکن آخر طبعِ دوراں کا ہے جیسا اقتضا   ہر ترقی کی ہے حد پر ابتدا کی انتہا
جب کہ دورہ اپنا تو دنیا میں پورا کر چکا   وقت اے جانِ جہاں تیرا بھی آخر آئیگا

تجھ پہ اے دار الخلافہ انقلاب آنے لگے   غیب سے تجھ کو تباہی کے خطاب آنے لگے
طالعِ شفق کے پیغامِ عتاب آنے لگے   تیرہ بختی کے نظر یاروں کو خواب آنے لگے
دولت و اقبال کا بندھنے لگا رختِ سفر
تجھ سے اے دار العلوم اٹھنے لگا علم و ہنر

جاہ و مکنت قوم کی گو تجھ میں کچھ باقی نہ تھی   پر نہ کی عرضِ ہنر میں تو نے اب بھی کوتہی
اس بزرگی سے گزاری تیرھویں تو نے صدی   پھر گئی آنکھوں میں پھر تصویرِ دورِ اکبری
علم و دین و شعر و حکمت طب و تاریخ و نجوم
ڈال دی پھر اپنی تو نے چار سو عالم میں دھوم

اس کے بعد حالی نے مختلف پیشوں کے ماہرین اور علوم و فنون کے فاضلوں کا ذکر کیا ہے اور آخر میں اس کا نوحہ اس طرح کرتے ہیں ؎

یا یہ اب پہنچی ہے ہم میں نوبت قحط الرجال ایک اٹھ جاتا ہے دنیا سے اگر صاحب کمال
دوسری آتی نہیں دنیا میں پھر اسکی مثال ذات باری کی طرح گویا کہ تھا وہ بے ہمال

ظاہرا ب وقت آخر ہے ہماری قوم کا
مرثیہ ہے ایک کا اب نوحہ ساری قوم کا

حالی کے علاوہ بعض دوسرے شاعروں نے دہلی کی تباہی کے جو مرثیے لکھے ہیں۔ ان میں سے بھی چند شعر نقل کر دینے بے محل نہ ہوں گے ؎

معطل ہے ہر کوئی بے کار ہے فقط مفلسی بر سر کار ہے
گدائی کا کاسہ لئے دربدر ہیں آوارہ ارباب فضل و ہنر
مشائخ جو ذی عز و تعظیم ہیں دل ان کے بھی صدمہ کش سیم ہیں
غم قوت ہے یاں تلک بر زباں کہ ہیں رشتۂ سبحہ ساں ناتواں
گئے سارے ورد و وظائف کو بھول کیا ایسا فکر شکم نے ملول

وظیفہ ہے ان کا بس اب حرف قوت
کئے دانے تسبیح کے صرف قوت

بعض شاعروں نے ان سیاسی انقلابات کو غزل کے پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ انداز وہی غزل کا ہے لیکن حقیقت میں دل کے غم نے مرثیہ کہلوایا ہے۔

اکبر نے اپنی بعض غزلوں میں اس انداز کے شعر کہے ہیں ؎

وہ مطرب وہ ساز وہ گانا بدل گیا نیندیں بدل گئیں وہ زمانہ بدل گیا

اکبر ہماری عہد کا اللہ رے انقلاب گویا وہ آسمان نہیں وہ زمیں نہیں

وہ ہوا نہ رہی وہ چمن نہ رہا وہ گلی نہ رہی وہ حسیں نہ رہے
وہ فلک نہ رہا وہ سماں نہ رہا۔ وہ مکاں نہ رہے وہ مکیں نہ رہے

نظروں میں بسا ہے رنگ چمن آنکھیں وہی گلشن ڈھونڈھتی ہیں
موسم وہ نہیں ہے اے اکبر جو بات تھی کل وہ آج کہاں

فلک نے دور بدلا۔ دور نے انسان کو بدلا
گئے ہم تم بدل، قانون بدلا سلطنت بدلی

اس انقلاب کی تصویریں موجودہ دور کے شاعروں میں سے اکثر کے یہاں ملتی ہیں جنھوں نے سیاسی انقلابات اور ان کی مختلف روشوں کو غزلوں میں نظم کیا ہے۔ مولانا محمد علی اور حسرت موہانی کی بہت سی غزلیں اس انداز کی ہیں بعض غیر معروف شاعروں کی غزلوں میں بھی سیاسی رنگ موجود ہے لیکن ان چیزوں کا ذکر اس سلسلہ میں آئے گا جب ہم مختلف دوروں کی شاعری پر سیاسی انقلابات کا اثر دکھائیں گے۔ اس ذکر کو سلطنت تیموریہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ کی غزل کے چند شعروں پر ختم کیا جاتا ہے ان شعروں میں بادشاہ نے سیاسی انقلابات کا شکار ہو کر اپنے دلی جذبات کو لفظی جامہ پہنایا ہے ؎

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں
میں نہیں ہوں نغمۂ جاں فزا کوئی سُن کے مجھ کو کرے گا کیا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا میں بڑے دکھی کی پکار ہوں
مرا بخت مجھ سے بچھڑ گیا، مرا رنگ روپ بگڑ گیا
جو چمن خزاں سے اُجڑ گیا میں اُسی کی فصل بہار ہوں
کوئی پھر فاتحہ آئے کیوں، کوئی شمع لا کے جلائے کیوں
کوئی چار پھول چڑھائے کیوں کہ میں بے کسی کا مزار ہوں

سیاسی انقلابات جہاں لوگوں کے طرز زندگی میں نمایاں تبدیلیاں کر دیتے ہیں مختلف پیشوں، علوم و فنون، تجارت، ملازمت، شاعری، ہر چیز پر ان کا اثر پڑتا ہے لیکن سب سے زیادہ مہلک نتیجہ ان انقلابات کا وہ ہے جو اخلاقی پستی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ لوگ زمانہ کے ہاتھوں مجبور ہو کر اخلاق کی اُن پست گہرائیوں میں پہنچ جاتے ہیں جہاں اخلاق کا نام اخلاق باقی نہیں رہتا حُسن کے بجائے عیب اس کی زینت بن جاتے ہیں۔ بد اخلاقی حکمران ہو جاتی ہے۔ آنکھیں بدیوں کو نیکیاں سمجھنے لگتی ہیں۔ اور لوگ ان پر عامل ہو جاتے ہیں۔

جس دلی کے متعلق حالی نے اپنے مسدس میں یہ لکھا ہے ؎

جس طرح تھا فضل و دانش میں ترا مشہور نام
تھے تمدن میں بھی پیرو تیرے جمہور انام
آدمیت سیکھنے آتے تھے تجھ سے خاص و عام
شہری و بدوی تری تقلید کرتے تھے مدام
رسم میں آئین میں اوضاع میں اطوار میں
طرز میں انداز میں رفتار میں گفتار میں
رہ گیا باہر سے آکر جو کہ تجھ میں چند سال
ڈھل گئے سانچے میں گویا اس کے عادات و خصال

آکے بن جاتا تھا یاں نقصان انسان کا کمال
تیرے پرچھاویں سے موتی بن کے جاتی تھی سفال
آتے ہی انسان کی کایا پلٹ جاتی تھی یاں
چار دن میں اور ہی صورت نکل آتی تھی یاں

یا یہی دلی سیاسی انقلابات کے تند و تیز تھپیڑوں سے ایسی پستی کی حالت میں نظر آنے لگتی ہے ؎

گر گئے آداب اور اخلاق سب تجھ سے سفر
گر گیا نظروں سے تیرا سب جلال و جاہ و فر
جھڑ گئے تاج شرف سے تیرے سب لعل و گہر
تجھ کو اے دارالخلافت کھا گئی کس کی نظر

سودا نے بھی اسی کا رونا رویا ہے ؎

گر خان و خواتین کی ہے کوئی وکالت
اس کا تو بیاں کیا کروں تجھ سے کہ عیاں ہے
ہر عمدہ کے دروازے پہ زیں پوش ہے بیٹھا
پوچھے ہے ابھی مرد ہے نواب کہاں ہے
دیوان کے بخشی کے بیوتات کے حاضر
مانند کنھیا کے جہاں دیکھو نہاں ہے
ہر بات پلپٹا ہی رہے صبح سے تا شام
پیپل کے پتے کی طرح منہ میں زباں ہے

میر بھی اس پستی کی تصویر یوں کرتے ہیں ؎

در پہ شہدوں کے روز و شب شر و شور
حرف یکسر فریب و رشوت و غور
بے لئے دیکھیں نے کسو کی اور
مردہ شو پہ وہ سب کفن کے چور

ہے تجھیں کچھ بھی رویت دربار — سوز بہ بندہ مکری و غدار
کاذب و مفت بر ہے دلآزار — ڈول ان کا ہے یہ کہ کرے خوار
کام اُن کا ہے یہ خراش و تراش

ان انقلابات کا جتنا گہرا اثر غدر کے بعد ظاہر ہوا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس لئے اس دور کے شاعروں میں سے قریب قریب ہر ایک نے قوم کی اس حالت پر آنسو بہائے ہیں لیکن اس جگہ ہم صرف دو شاعروں کے کلام سے مثالیں لے کر اس اخلاقی پستی کے چند پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی کوشش کریں گے۔ حالی اور اکبر دونوں کے کلام کا انداز جداگانہ ہے لیکن دونوں نے سیاسی پہلوؤں کو نظر میں رکھ کر برابر اپنی قومی پستی کا اظہار کیا ہے۔ ایک نے آنسو بہائے ہیں۔ دوسرا ان پر ہنستا ہے۔ مقصد اس کا بھی یہ ہے کہ قوم کو اپنی پستی کا احساس ہو۔ اور دوسرے نے بھی جو کچھ کہا ہے اس کا مقصد بھی یہی ہے۔ ان شعروں کو پڑھ کر ہمیں مقامی اثر کا ایک گہرا رنگ شاعری پر نظر آنے لگتا ہے۔ حالی کی مختلف نظموں کے مختصر اقتباسات اس مقامی روش کے اندازے کے لئے درج کئے جاتے ہیں۔ پہلے تمہید کے طور پر ان کے چند شعر ان کے بلند مقصد کی ترجمانی کے لئے پیش کرنے بے محل نہ ہوں گے ؎

ختم جب اقبال کا ہوتا ہے دور — سارے بگڑ جاتے ہیں قوموں کے طور
خصلتیں ان کی نہیں رہتیں درست — فرض ادا کرنے میں رہتے ہیں سست

ایسی قوم اپنے ادبار کی حالت میں کیا کیا کرتی ہے ؎

اُسے جانتے ہیں بڑا اپنا دشمن — ہمارے کرے عیب جو ہم پہ روشن
نصیحت سے نفرت ہے ناصح سے اَن بن — سمجھتے ہیں ہم رہنماؤں کو رہزن
یہی عیب ہے سب کو کھویا ہے جس نے
ہمیں ناؤ بھر کر ڈبویا ہے جس نے

نفاق اس پستی کی ایک پہچان ہے ؎

قوم میں جو دیکھئے چھوٹا بڑا — چھنتا ہے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد جدا
سوجھتی ملت کی نہیں کوئی بات — یہ جو کہے دن تو وہ کہتا ہے رات
زید کا ہے عمرو سے ظاہر ملاپ — دل میں بھرا دونوں کے لیکن ہے پاپ

قوم جب اتفاق کھو بیٹھی — اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی
ایک کا ایک ہو گیا بدخواہ — لگی غیروں کی تم پہ پڑنے نگاہ
پاؤں اقبال کے اکھڑنے لگے — ملک پر سب کے ہاتھ پڑنے لگے
کبھی چڑھ کر کسی نے گھر لوٹا — کبھی آ کر کسی نے زر لوٹا
کبھی اس نے ہے قتل عام کیا — کہیں اس نے ہے آ غلام کیا
ملک روندے گئے ہیں پیروں سے
چین کس کو ملا ہے غیروں سے

اس قسم کی بعض اخلاقی کمزوریوں کی وجہ سے قوم اپنے ملک۔ دولت اور اقبال سب سے ہاتھ دھو بیٹھی ہے۔ تصنع کی زیادتی۔ خلوص کی کمی ؎

دوست اس کے ہیں نہ اس کے آشنا   گو بظاہر سب سے ہیں شیر و شکر

کرنی پڑتی ہے کسی کی مدح جب   کرتے ہیں تقریر اکثر مختصر
گر کسی کا عیب سن پاتے ہیں ہم   کرتے ہیں رسوا اسے دل کھول کر

بنتے ہیں یاروں کے ناصح تا کہ ہو   عیب ان کا ظاہر اور اپنا ہنر
دوست اک عالم کے پر مطلب کے دوست
ایسے یاروں سے حذر یار و حذر

معاش کی حالت ؎

نوکری ٹھیری ہے لے دے کے اب اوقات اپنی
پیشہ سمجھے تھے جسے ہو گئی وہ ذات اپنی
اب نہ دن اپنا رہا اور نہ رہی رات اپنی
جا پڑی غیر کے ہاتھوں میں ہر اک بات اپنی

تنگ ہوتے ہیں تو تقدیر کا کرتے ہیں گلا   کبھی ٹھیراتے ہیں گردش کو زمانے کی برا
کبھی سرکار کو کہتے ہیں کہ ہے بے پروا   کبھی فرماتے ہیں یہ ہو کے مشیت سے خفا
وعدۂ رزق میں سنتے تھے کہ ہوتی نہیں دیر
پھر جو نوکر نہیں ہوتے تو یہ ہے کیا اندھیر

قومی ہمدردی کی کمی ؎

نہ رنج ان کے افلاس کا ان کو اصلا   نہ فکر ان کی تعلیم اور تربیت کا
نہ کوشش کی ہمت نہ دینے کو پیسا   اڑانا مگر مفت ایک اک کا خاکا
کہیں ان کی پوشاک پر طعن کرنا
کہیں ان کی خوراک کو نام دھرنا

حالی نے مختصر طور پر قوم کی جن پستیوں کا ذکر کیا ہے۔ ان سے جو ذہنی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے، وہ بظاہر سیاسی انقلابات کا اثر نہیں معلوم ہوتی لیکن اکبر کے کلام میں قدم قدم پر ایسے شعر ہیں جہاں ہم ہندوستان والوں کی ذہنی پستیوں کے عبرت آموز مرقعے دیکھتے ہیں۔ ہم میں زمانہ نے اتنی تبدیلی پیدا کر دی کہ قومی اخوت و ملت کی محبت تک دلوں میں باقی نہیں رہی ؎

ملت کا ادب اُٹھ گیا جس قوم کے دل سے   اقبال کی سمت اس نے کبھی راہ نہ پائی

جنھیں ہے شرک سے نفرت خدا کو ایک کہتے ہیں
یہ ان میں کیوں ابھی تک جنگ اور تکرار باقی ہے

لوگوں کی سیاسی ذہنیت میں بلندی و ایمان داری کا نام نہیں۔ اس سے بڑی پستیِ اخلاق اور کیا ہو سکتی ہے۔ لوگوں میں قومی محبت نہیں۔ سیاسی زندگی صرف اس لئے بسر کرتے ہیں کہ یہ شہرت کا زینہ ہے۔ بڑے بننے کا ایک ذریعہ ہے ؎

قومی ترقی کی راہ ھا پیاری   بیٹھی ہے پہنے جوڑا بھاری
لائی ہیں سکھیاں بھر بھر جھولی   خوب کھلی ہے برج میں ہولی
جمع ہیں ممبر بھولے بھالے   جاڑوں کا موسم پھولے پھالے
آنکھیں پھاڑے دانت نکالے   چندہ دے کر پھنسنے والے
دیکھ کے ایک باضابطہ بھپکی   دنیا آپ کی جانب لپکی
آپ نے سب کی دولت ہپ کی   بزم جمالی خالی گپ کی
دیکھتا ہے اک عمر سے بندا   بس یہی باتیں اور یہی پھندا
ہوتا ہے کچھ کام نہ دھندا   لاؤ چندا لاؤ چندا

رزولیوشن کی یورش ہے مگر اس کا اثر غائب
پلیٹوں کی صدا سنتا ہوں اور کھانا نہیں آتا

زورِ بازو نہیں تو کیا اسپیچ   ہاتھ بھی دے خدا زبان کے ساتھ

غدر کے سیاسی انقلاب نے ہم میں جو چیز سب سے زیادہ مہلک پیدا کر دی تھی وہ ذہنی غلامی تھی۔ اس کے بعد موجودہ سیاسی انقلابات نے پھر بیداری پیدا کر دی ہے ۔ اور اقبال۔ جوش اور بعض دوسرے شاعر آزادی کی تعلیم دے رہے ہیں۔ اکبر کی زبانی غلامی کی زنجیروں کی جکڑ بند کا اندازہ کیجئے ؎

اب اور چاہئے نیٹو کے واسطے کیا بات   یہی بہت ہے مشرف ہوئے سلام ہم

پاؤں کانپا ہی کئے خوف سے ان کے در پر   چست پتلون پہننے سے بھی پنڈلی نہ تنی

وہ کہتے ہیں یہ ٹھیک ہے۔ ہم کہتے ہیں ہاں ٹھیک
بالفعل تو ہم اس کے سوا کچھ نہیں کہتے

حکم خاموشی ہے اور میری زبان   آپ کی باتیں ہیں میرا کان ہے

موجیں مری طبیعت میں گو اٹھ نہیں سکتیں دریا ہے مرے دل میں مگر بہہ نہیں سکتا

ہے عجب انقلاب دنیا میں کیا کہوں بات بھائی صاحب کی
اب وہ تسبیح پر بجائے درود پڑھ رہے ہیں دہائی صاحب کی

نہ کچھ انتظارِ گزٹ کیجئے جو افسر کہیں بس وہ جھٹ کیجئے
کہاں کا حلال اور کیسا حرام جو صاحب کھلائیں وہ چٹ کیجئے
بہت شوق انگریز بننے کا ہے تو چہرے پر اپنے کلٹ کیجئے

میری نصیحتوں کو وہ شوخ سن کے بولا نیٹو کی کیا سند ہے صاحب کہیں تو مانوں

ہوا آج خارج جو میرا سوال کہا میں نے صاحب سے با صد ملال
کہاں جاؤں اب میں ذرا یہ بتاؤ وہ جھنجھلا کے بولے جہنم میں جاؤ
یہ سن کر بہت طبع غمگیں ہوئی مگر اس تصور سے تسکیں ہوئی
کہ جب اہلِ یورپ میں بھی ذکر ہے تو بے شک جہنم بھی ہے کوئی شئے

یہی ذہنی غلامی ہے جس کا اثر جب انسان کی زندگی پر پڑتا ہے تو وہ اپنے پرانے طریقوں کو چھوڑ کر نئی باتیں اختیار کر لیتا ہے۔ بلندی سے پستی کی طرف آجاتا ہے اور اس سلسلے میں سب سے پہلی چیز جسے وہ اختیار کرتا ہے۔ وہ فیشن ہے ؎

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر

واعظ کی نصیحتیں نہ مانیں اکبرؔ پتلون کی تاک میں لنگوٹی بھی گئی

خواہ صاحب کو تم سلام کرو خواہ مندر میں رام رام کرو
بھائی جی کا فقط یہ مطلب ہے جس میں روپا ملے وہ کام کرو

مرعوب ہو گئے ہیں ولایت سے شیخ جی اب صرف منع کرتے ہیں دیسی شراب کو

شیخ کے دامن کو اکبرؔ نے دیا بوسہ جو کل ہم نے برکت کے لئے اک مس کا دامن چھو لیا

شغل کرتے کی بیٹ سوٹے کی واہ کیا دھج ہے میرے بھولے کی

میرے لئے شراب یہاں بھی ہے کیا حرام اس شہر میں تو کوئی مجھے جانتا نہیں

یہ موئی تکریم باہمی ہے نہ پیار باقی ہے اب دلوں میں
یہ صرف تحریر میں ڈیئر سر ہے یا جنابِ مکرمی ہے

پا کر خطاب ناچ کا بھی ذوق ہو گیا سر ہو گئے تو بال کا بھی شوق ہو گیا

تہمد میں تن جب سے لگے جب دھوتی سے پتلون اُگا
ہر پیڑ پہ اک پہرا بیٹھا ہر کھیت میں اک قانون اُگا

مغربی ذوق ہے اور وضع کی پابندی بھی اونٹ پر چڑھ کے تھیٹر کو چلے ہیں حضرت

قاصد بلا جان سے وہ کھیلتے تھے پولو خط رکھ لیا یہ کہہ کر اچھا سلام بولو

چیز وہ ہے بنے جو یورپ میں بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے

ان باتوں کا اثر قومیت اور مذہب پر پڑتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان قوم اور مذہب کی قدیم روایات سے دست بردار ہو کر ایک ایسی زندگی بسر کرنے لگتا ہے جو اپنے ملک کی نہیں بلکہ دوسرے ملک اور قوم کی معلوم ہوتی ہے۔ ملکی خصوصیات کا نام بھی باقی نہیں رہتا ؎

خدا سے منکر نبی سے غافل کہاں کے پیر اور امام صاحب
انھیں کے در پر جھکی ہے خلقت سلام صاحب سلام صاحب

حریفوں سے لگاوٹ کرتے ہیں آپس میں لڑتے ہیں
یوں ہی بربادیاں آتی ہیں۔ یوں ہی گھر بگڑتے ہیں

ٹٹو پہ جس طرح سے ہو تازی کا ساز بوجھ یوں بابوانِ ہند پہ اب ہے نماز بوجھ

شاید کہ یہی ترقی قومی ہے ہر شخص بجائے خود بنا ہے اک قوم

نہ نماز ہے نہ روزہ۔ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے
تو خوشی پھر اس میں کیا ہے کوئی جنٹ کوئی جج ہے

اپنے بھائی کے مقابل کبھی تن جائیے غیر کا جب سامنا ہو بس قلی بن جائیے

اے شیخ جب نکیل نہیں دستِ قوم میں پھر کیا خوشی جو اونٹ مرے ریل ہو گئے

گنگاجی کا بہاؤ تو یکساں ہے　　آفت ہے مگر پراگ والوں کی جنگ

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

کہتے ہیں سچ کیا ہے جو باریک ہے وہ پل　　بائیسکل پہ گزریں گے ہم پل صراط سے

ہے نورِ خدا بھی طالب رزق کا دست　　ڈاڑھی بھی تو پیٹ کی طرف جاتی ہے

یہ چیزیں ایسی ہیں جو قوم کے بعض سماجی طریقوں پر بھی اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ ہندوستان والوں نے اس سیاسی انقلاب کے دور میں مغرب والوں سے جو کچھ اثر لیا اس کا اثر سیاست۔ مذہب۔ طرزِ معاشرت۔ تمدن۔ اخلاق اور عمل ہر چیز پر پڑا لیکن ہندوستان میں خصوصاً دو چیزیں ایسی ہیں جن کا اثر عام زندگی پر زیادہ نمایاں ہے۔ پردہ اور تعلیم کے قدیم اور جدید مفہوم میں بعید فرق ہوگیا ہے اور اس فرق نے زندگی کے طریقوں میں بھی کافی فرق پیدا کر دئیے ہیں۔ اکبر کی شاعری ان دونوں تبدیلیوں کے بہت کامیاب اور مقامی رنگ میں ڈوبے ہوئے مثل نمونے ہمارے سامنے پیش کرتی ہے ؎

مردِ حنبلین ہوکر پارہے ہیں جب عروج　　بیبیاں پھر گھر میں رنج کس بہر سہیں کیوں ہیر

پردہ کا مخالف جو سنا بول اٹھیں بیگم　　اللہ کی مار اس پہ علی گڈھ کے حوالے

نہ یہ قیدِ شریعت ہے نہ یہ غفلت کا پردہ ہے　　رواج و مصلحت کی بات ہے حکمت کا پردہ ہے

حسرت بہت ترقیِ دختر کی تھی انھیں　　پردہ جو اٹھ گیا تو وہ باہر نکل گئی

اٹھ گیا پردہ تو اکبر کا بڑھا کونسا حق　　بے پکارے جو مرے گھر میں چلا آتا ہے
بے حجابی مری ہمسایہ کی خاطر سے نہیں　　صرف حکام سے ملنے میں مزا آتا ہے

نئی تہذیب کی عورت ہیں کہاں دین کی قید　　بے حجابی جو ہو اس میں تو قباحت کیا ہے
نورِ اسلام نے سمجھا تھا مناسب پردہ　　شمعِ خاموش کو فانوس کی حاجت کیا ہے

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم　　رنگِ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

انجن آیا نکل گیا زن سے　　سن لیا نام آگ پانی کا

اب پڑھا ہیں سکھائیں اگر　　تب کریں شکر مہربانی کا

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے　　جنابِ ڈارون کو حضرتِ آدم سے کیا مطلب

نظر ان کی رہی کالج میں بس علمی فوائد پر　　گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے　　مگر یونہی کہ گویا آبِ زمزم مے میں داخل ہے

نوکر کو سکھاتے ہیں میاں اپنی زباں　　مطلب یہ ہے کہ سمجھے ان کا فرماں

ہم اردو شاعری کو ادب اور زبان کے ارتقا کے لحاظ سے مختلف دوروں میں تقسیم کرتے ہیں۔ زبان کا ارتقا تو خیر ایسی چیز ہے کہ وہ سیاسی انقلابات کے بغیر بھی ہوتا رہتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی ایسے انقلابات آتے ہیں کہ وہ زبان کے انداز میں بھی یکبارگی ایک نمایاں تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں۔ مثال کے لئے موجودہ دور کو لیا جا سکتا ہے۔ اور اس کی مثال میں ہم خاص طور پر اکبر کے کلام کو پیش کر سکتے ہیں لیکن جہاں تک خیالات اور شاعری کے مختلف دوروں کا تعلق ہے ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہر زمانہ کی تبدیلیاں شاعری پر بھی برابر اپنا اثر کرتی رہتی ہیں اور ان چیزوں کو چھوڑ کر جو شاعری میں محض مادی شکل میں داخل ہو جاتی ہیں شاعروں کے مطمح نظر اور اندازِ تخیل میں بھی نمایاں فرق نظر آنے لگتا ہے۔ ہم اردو شاعری کے سب دوروں کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد مختلف شاعروں کے ذہنی رجحانات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ عموماً یہ ذہنی رجحانات سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ میر کی شاعری کے انداز میں سیاسی انقلابات کا اثر ہے۔ اس کے بعد کے دور کی شاعری جس میں انشا۔ رنگین اور جرأت کی شاعری خاص طور پر اہمیت رکھتی ہے۔ اسی سیاسی انقلاب کا اثر ہے کہ شاعر لکھنؤ کے دربار سے وابستہ ہو گئے اور اس دربار کے شاعروں کے رجحانات اور ان کے میلانِ طبع سے متأثر ہو کر ایسی شاعری کی جس کا انداز دہلی کی شاعری سے الگ ہے۔ ریختی کو بھی اسی خاص سیاسی تبدیلی کا مرہونِ منت سمجھنا چاہئے۔ غدر کے بعد کی شاعری پرانے شاعرانہ رنگ سے بالکل الگ ہے۔ غزلوں تک نے اس سیاسی تبدیلی کا اثر محسوس کیا اور شاعروں نے غزلوں کے علاوہ مستقل نظموں میں اپنے ان خیالات کا اظہار نئے نئے طریقوں سے کیا۔ حالی اکبر چکبست اور اقبال کی شاعرانہ کوششیں ایسی ہیں جن میں قدم قدم پر ان

تبدیلیوں کا اثر نمایاں ہے۔

شاعروں نے قوم کی گرتی ہوئی حالت کو دیکھ کر اسے ابھارنے کی کوشش کی۔ وطن کی محبت کا جوش ان کے دلوں میں طرح طرح سے پیدا ہوا۔ شعروں میں انھوں نے اس محبت کا اظہار مختلف طریقوں سے کیا۔ کہیں قدیم سورماؤں کے جذبۂ وطن پرستی کا بیان کیا۔ کہیں قوم کی قدیم عظمتوں کا ذکر کیا کہیں ایثار و قربانی کا سبق دیا اور کہیں وطن پر فدا ہونے کی تعلیم۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری کے اس دور میں وطنی شاعری کے گہرے نقوش نظر آتے ہیں اور اردو کا کوئی شاعر ایسا نہیں جس کے کلام میں اس جذبہ کا نمایاں اثر نہ ہو۔ اکبرؔ کی وطن پرستی کے جذبے کا اظہار تو ان تمام مثالوں سے ہو سکتا ہے جو مختلف موقعوں پر اس مضمون میں پیش کی گئی ہیں لیکن دوسرے شاعروں کے یہاں سے مختصر مثالیں لے کر اس کا اندازہ اور بھی بہتر طریقے سے ہو سکتا ہے چکبستؔ کا نام ایسے شاعروں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے ان کی نظمیں تو سرتاپا اس جذبے میں ڈوبی ہوئی ہیں لیکن اس موقع پر غزلوں کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ اس سے اور زیادہ اندازہ ہوگا کہ غزل جیسی صنف بھی اس اثر سے محفوظ نہیں رہ سکتی ؎

جنونِ حبِ وطن کا مزا شباب میں ہے ۔۔۔ لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہی
جو مانگنا ہے ابھی مانگ لو وطن کیلئے ۔۔۔ یہ آرزو کی جوانی رہے رہے نہ رہے

مٹنے والوں کی وفا کا یہ سبق یاد رہے ۔۔۔ بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور دل آزاد رہے

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں ۔۔۔ میرے خیال کو بیڑی پنھا نہیں سکتے
چراغ قوم کا روشن ہے عرش پر دل کے ۔۔۔ اسے ہوا کے فرشتے بجھا نہیں سکتے

غرور و جہل نے ہندوستاں کو لوٹ لیا ۔۔۔ بجز نفاق کے اب خاک بھی وطن میں نہیں
زباں سے جوشِ قومی دل میں پیدا ہو نہیں سکتا
ابلنے سے کنواں وسعت میں دریا ہو نہیں سکتا
ہم پوجتے ہیں باغِ وطن کی بہار کو ۔۔۔ آنکھوں میں اپنی پھول سمجھتے ہیں خار کو

لایا ہے کیا پیامِ وطن پوچھتا ہوں میں ۔۔۔ غربت میں دیکھتا ہوں جو ابرِ بہار کو

دل کے تسخیر بخشا فیضِ روحانی مجھے ۔۔۔ حبِ قومی ہو گیا نقشِ سلیمانی مجھے

قوم کا غم مول لے کے دل کا یہ عالم ہوا ۔۔۔ یاد بھی آتی نہیں اپنی پریشانی مجھے

اس جذبہ کی مثالیں ہمیں سرورؔ۔ محرومؔ۔ مہرؔ۔ نظرؔ۔ حفیظؔ۔ جوشؔ۔ اخترؔ اور اس کے علاوہ اکثر شاعروں کے یہاں ملتی ہیں۔ اقبالؔ کا کلام اس رنگِ تخیل سے بھرا ہوا ہے۔ ان کی شاعری کا ایک دور ایسا ہے جس میں ہندوستان کی حبِ وطن کا جذبہ موجود ہے۔ ایسی نظموں میں "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" سب سے زیادہ مشہور ہے۔ ان کی شاعری کے متوسط اور آخری دور کا انداز بالکل ہی جداگانہ ہے۔ متوسط دور میں ان کی سیاسیات پر پیغامِ عمل کا غلبہ ہے۔ اور اسے بھی کسی حد تک ہندوستان کی سیاسی فضا کا اثر سمجھنا چاہیئے۔

موجودہ دورِ شاعری پر اس حیثیت سے سیاسیات نے جو گہرا اثر کیا ہے اس کی اگر صرف مثالیں ہی جمع کی جائیں تو دفتر کے دفتر جمع ہو جائیں اس لیئے اس دور کی شاعری کے ان اثرات کو نمایاں کرنے کے لیئے اور مثالوں کا لکھنا فضول سا ہے۔

اب تک ہم نے سیاسی انقلابات کے تحت میں شاعری کے جن جن پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے انھیں دیکھ کر اچھی طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سیاسی تبدیلیاں کن کن مختلف طریقوں سے شاعری پر اپنا اثر ڈالتی ہیں ٭

سیّد وقار عظیم

رباعی

تسبیح کو مدتوں سنبھالا ہم نے
خرقہ برسوں گلے میں ڈالا ہم نے
اب آخرِ عمر میرؔ جی کی خاطر
سجادہ گرو رکھنے نکالا ہم نے

میرؔ

غزل

تقدیر بگڑتی جاتی ہے گو بات بنائے جاتے ہیں
وہ اُتنے ہی رُوٹھے جاتے ہیں ہم جتنا منائے جاتے ہیں

وہ جاکے نہیں اب آنے والے طور یہ پلٹے جاتے ہیں
ہنستے ہیں تسلّی دینے کو پر اشک بھی آئے جاتے ہیں

صد شکر کہ فرقِ حُسن و عشق اعجازِ وفا نے میٹ دیا
میں جلووں میں کھویا جاتا ہوں وہ مجھ میں سمائے جاتے ہیں

محفل بھی وہی ساقی بھی وہی قسمت ہے مگر اپنی اپنی
کچھ ہیں جو بلائے جاتے ہیں ہم ہیں کہ اٹھائے جاتے ہیں

ہے باغ سے ہم کو کیا مطلب اب پھول کھلیں یا آگ لگے
جن تنکوں نے رشتہ جوڑا تھا چُن چُن کے جلائے جاتے ہیں

بیتاب نگاہیں لوٹ رہی ہیں پردۂ در پر حسرت سے
اور آنے والے آنکھ بچا کر دل میں سمائے جاتے ہیں

ہے پیرہنِ صد پارہ میں خوشبو یہ کسی کے گیسو کی
بیگانہ ہوا جاتا ہوں جہاں سے غش پہ غش آئے جاتے ہیں

باتوں سے مروت کے رشتے وہ توڑ رہے ہیں ہنس ہنس کر
آنکھوں سے محبت کے ساغر بھر بھر کے پلائے جاتے ہیں

رہ رہ کے دھڑک اُٹھتا ہے کلیجہ سانس اُلجھتی جاتی ہے
اے موت ٹھہر تعجیل نہ کر دم بھر میں وہ آئے جاتے ہیں

کیفی کوئی اس کو جی سے مرے پوچھے کہ شبِ وعدہ میں چراغ
کس طرح جلائے جاتے ہیں کس طرح بجھائے جاتے ہیں

سید اطہر حسین رضوی کیفی اعظمی

کیا تمہیں یاد نہیں؟

شدت کی گرمی تھی۔ بوڑھا سکھو دُکان سے ایک پیسے کا تمباکو لینے گیا تھا۔ اب گھر کو واپس جانا اسے بہت دشوار معلوم ہو رہا تھا۔ آخر ایک ہاتھ میں چلم اور دوسرے میں سوٹا لئے وہ چل پڑا۔

"مجھے افسوس ہے" وہ بڑبڑایا "کہ میں نے لڑکوں میں سے کسی ایک کو کیوں نہ تمباکو لینے بھیجا"

چلتے چلتے وہ یک دم ٹھہر گیا۔ جمائی لی اور پھر کہنے لگا "لیکن انہوں نے پیسہ خود رکھ کر تمباکو کی بجائے مجھے ٹکا سا جواب دینا تھا۔ ہائے میرے اپنے گھر میں ہی میری کوئی قدر نہیں۔ اُف گرمی سے تن بدن پھنکا جاتا ہے ذرا دم لے لوں پھر چلوں گا"

اس کی عمر ستر برس سے زاید تھی۔ کبھی وہ قوی جثے اور گٹھیلے بدن کا جوان تھا لیکن اب تو سکڑا ہوا اور اس کا جسم کمزور و ناتواں ہڈیوں کا ایک مجموعہ بن کر رہ گیا تھا۔ اس کی ناک بیٹھ گئی تھی اس کا نچلا لب ایک طرف لٹک رہا تھا اس کی آنکھوں سے تقریباً ہر وقت پانی بہتا رہتا تھا۔ اس کے کپڑے غلیظ تھے اور جا بجا مختلف رنگوں کے پیوند لگے ہوئے تھے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس کے نوجوان بیٹوں کی کریپ اور بوسکی کی قمیصیں گاؤں بھر میں مشہور تھیں۔

تھوڑی دور چل کر ایک بڑ کے درخت کے سائے میں سستانے بیٹھ گیا۔ اس نے پاؤں پھیلا کر ایک ٹانگ دوسری کے اوپر رکھی۔ دھوپ اس کے گھٹنوں تک پہنچ رہی تھی۔ لیکن اس کے جسم کا باقی حصہ محفوظ تھا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

"ہائے" اس نے کہا۔ "جسمانی طاقت کھو کر انسان کتنی بے بسی کے عالم میں ہوتا ہے"!

ایک سوکھی ٹہنی لے کر وہ چلم صاف کرنے لگا۔ اچھی طرح کھرچ کر اس نے چلم کے پچھلے حصے پر منہ رکھ کر پھونک ماری۔ ساری میل کچیل اڑ کر سامنے جا گری۔ چلم کو زمین پر رکھ کر وہ کرتی کی جیبیں تمباکو نکالنے کے لئے ٹٹولنے لگا۔ لیکن پڑیا میں بندھے ہوئے آدھی چھٹانک تمباکو کا کہیں پتہ بھی نہ تھا۔ کھڑے ہو کر اس نے پگڑی اتار کر جھاڑی۔ کرتی اتار کر دیکھی۔ پرنے کو کاندھے سے اتارا۔ دھوتی میں تلاش کیا لیکن تمباکو نہ ملا۔

"چور کے بچے رامو نے پیسہ بھی رکھ لیا اور تمباکو بھی۔ بنئے کی ذات ہی ایسی ہے۔ اپنی گرہ کے پکے اوروں کا دیوالہ نکال دیں"۔

زمین پر گرے ہوئے پرنے کو پھر ٹٹولا۔ نیچے پڑیا محسوس کی اور چلا اٹھا "یہ رہا میرا تمباکو۔ کون جان سکتا تھا یہ یہاں ہوگا"۔ پرنے کو اٹھاتے ہوئے پڑیا نیچے لیتا ہوا وہ بیٹھ گیا۔ پرنے کو دیکھا تو پڑیا ندارد۔

"رام۔ رام یہ پھر کون تمباکو اٹھائے گیا۔"؟

سوٹے سے زمین کوٹتے ہوئے اس نے تلاش از سرِ نو جاری کی

ایک بوڑھی عورت سامنے سے گزر رہی تھی ٹھٹکی ہو کر بوڑھے کی حرکات کو غور سے دیکھنے لگی۔ اس کی عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ لیکن خدوخال اور چہرے کا شگفتہ پن اب بھی بہانگ دہل اعلان کر رہے تھے کہ وہ جوانی میں کتنی کافر جمال ہوگی۔ اس کے تناسب اعضا سے پتہ چلتا تھا کہ ان کی مالکہ بھی بے حد حسین تھی۔ کالا دوپٹہ اوڑھے تھی۔ گھونگٹ نکال رکھا تھا۔ اگرچہ جیٹھ کا مہینہ تھا لیکن اس کے پیروں میں کوئی جوتی نظر نہیں آتی تھی۔

وہ بوڑھے کے عین مقابل آکر کھڑی ہو گئی اور دفعتاً اسے پہچان کر گھونگٹ اٹھاتے ہوئے اس نے ہاتھوں کو ڈرامائی انداز میں آگے لے جا کر پھر پیچھے کیا۔

"ایشور نہ کرے" وہ بولی "تم سکھ لال تو نہیں ہو؟۔ رام رام سکھو بھائی"

"رام۔ رام کونسے گاؤں سے آ رہی ہو"؟

"ارے تم نے مجھے پہچانا نہیں"۔

"ہوں"۔ بوڑھا بولا "میں کسی کو بھی آج کل نہیں پہچانتا۔ ہر کوئی میرا مذاق اڑانے پر تُلا ہوا ہے۔ کونسے گاؤں کا تم نے نام لیا"؟

"کیا تمہارا مطلب ہے۔ تم نے مجھ کو ——— سکھ دئی کو نہیں پہچانا"؟

"اوہو۔ اچھا یہ تم ہو۔ گھر سب راضی خوشی ہیں نہ؟"

"واہ رے۔ کیا تمہیں اچھی طرح معلوم نہیں کہ میں اکیلی رہتی ہوں اور میرا کوئی عزیز رشتے دار دنیا میں نہیں؟"

"سوگند لے لو اگر میں نے تمہیں پہچانا ہو تو۔"

"تم جان بوجھ کر ایسا کر رہے ہو۔" بوڑھی اپنے ہاتھوں کو جھٹکا دیتے ہوئے بولی "اور یہاں کیا ڈھونڈ رہے تھے؟"

"ہوں۔ میں کیا ڈھونڈ رہا تھا؟"

"میں نے تمہیں زمین پر اِدھر اُدھر کچھ ڈھونڈتے دیکھا ہے۔"

"اجنبیوں کی متجسس المزاجی مشہور ہے اور تم مجھے کھیلتے دیکھ رہی تھیں؟"

"بڑے ناراض معلوم ہوتے ہو۔"

"اور کیا تمبا کو کھو کر شادیانے بجاؤں؟"

"ٹھیک"۔ بوڑھی نے باہیں اپنی کمر کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔ "میرا بھی یہی خیال تھا کہ تم کچھ کھو بیٹھے ہو۔ تبھی تو سوٹے کو زور زور سے زمین پر پٹک رہے تھے۔ اہا تمہارا سارا رنگ روپ کدھر گیا؟"

"ابھی پڑیا میرے ہاتھ میں تھی اور اب نجانے اسے کون اٹھا لے گیا؟"

"ذرا ٹھہرو۔ مجھے تلاش کرنے دو۔"

بوڑھی نے اِدھر اُدھر آنکھیں گھمائیں اور ایک بٹن اٹھاتے ہوئے بولی۔ "یہ کیا ہے؟"

"یہ بٹن ہے۔ لاؤ مجھے دے دو۔ منو کو دوں گا۔ بڑا خوش ہو گا۔"

"پڑیا تو کہیں نظر نہیں آتی تم ذرا اُدھر ہٹو نا۔"

اس نے بوڑھے کو کندھے سے پکڑ کر پرے ہٹایا۔ پڑیا نیچے پڑی تھی۔ وہ اُسے اٹھا کر فتحمندانہ نگاہوں سے بوڑھے کی طرف دیکھنے لگی لیکن بوڑھے نے شکریے کا ایک لفظ کہے بغیر پڑیا لے لی۔ وہ اس کی بائیں طرف ایڑیوں کے بل بیٹھ گئی۔ بوڑھا تھوڑا سا تمبا کو لے کر ہتھیلیوں سے ملنے لگا اور پھر اس کی طرف کوئی توجہ نہ دیتے ہوئے چلم میں تمبا کو ڈالنے لگا۔ وہ اُسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ اُس کے دانتوں سے ہٹے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں آدھی کھلی اور آدھی بند تھیں۔ پھر دوپٹے کو چہرے سے ہٹاتے ہوئے بولی۔

"سکھو۔ سچ سچ بتانا کیا تم مجھے جانتے نہیں؟"

بوڑھے نے لاپروائی سے اس پر نگاہ ڈالی اور بولا۔

باتیں بنانا کوئی تم ہی سے سیکھے۔"

"تو کیا تم مجھے سچ مچ بھول چکے ہو؟" بوڑھی نے ذرا پریشان سا ہو کر کہا۔ "ہے پرماتما! سکھو پچیس برس ہوئے جب میں نے تمہیں آخری بار دیکھا۔ اور تم تب مجھے خوب جانتے تھے۔ اگرچہ تم تیوری چڑھائے میرے پاس سے گزر گئے۔ وہی تیوری جو میری شادی کے بعد تمہارے ماتھے پر اکثر نظر آتی تھی۔ مجھ پر جو جو تکالیف گزریں وہ تمہارے دل سے کدورت دور نہ کر سکیں اور اب آج شاید تمہارا حافظہ کمزور ہو چکا ہے کہ مجھے پہچانتے تک نہیں رہا۔ تم تھے کیا اور ہو کیا گئے۔ تمہارا جسم روندے ہوئے پودے کی طرح ہے! مجھے وہ دن بھول نہیں گئے جب تمہارے سنہری گھنگریالے بال تمہارے ماتھے پر لہرایا کرتے تھے۔ تمہاری آنکھیں ایک بے پایاں سمندر کی مانند تھیں جس پر سورج کی کرنیں متبسم ہوں۔ کہتے ہیں ماضی کی خوشگواری اور حال کی تلخی کا ذکر کرنا بے سود ہوتا ہے۔ لیکن سکھو تمہیں اس حالت میں دیکھ کر میرے دل پر جو گزر رہی ہے وہ میں ہی جانتی ہوں۔"

کوئی دلچسپی نہ لیتے ہوئے بوڑھے نے ایک دیا سلائی جلائی اور چلم پر رکھ کر کش لگانے لگا۔ کش لگاتے ہوئے اس کے کھوکھلے رخسار ابھر آتے۔ تمبا کو نے جب اچھی طرح آگ پکڑ لی تو دیا سلائی ایک طرف پھینک کر اس نے بھی کا [illegible] نہ تو آستین سے پونچھ [illegible]

"کیسی لایعنی گفتگو!" اس نے خشک لہجے میں کہا۔ "تم ہو کون؟"

بوڑھی نے ایک طرف گرے ہوئے دوپٹے کو احتیاط سے سر کے گرد لپیٹا اور آہستہ سے چھینک ماری۔ آنچل سے ناک صاف کی۔ بوڑھا اس اثنا میں چلم منہ سے ہٹا کر اس کی طرف بہ نگاہِ غائر دیکھ رہا تھا۔ پھر تھو کا۔ کچھ بڑبڑایا اور پگڑی کو آنکھوں پر اور جھکا لیا۔

"کیا تمہیں یاد نہیں۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ کبھی تم مجھ پر جان دیتے تھے۔" بوڑھی نے قدرے مشتعل ہو کر کہا۔ "میں تمہاری طرح نہیں۔ مجھے سب کچھ اچھی طرح یاد ہے۔ گزشتہ واقعات آن کی آن میں میری آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتے ہیں۔ سچ مچ تمہیں یاد نہیں؟ واقعی تم فراموش کر چکے ہو۔؟۔ وہ دن ـــــ اس دن میں گائے کا دودھ دوہ رہی تھی جبکہ تم گھوڑے پر سوار پاس سے گزرے۔ تم پیاسے تھے۔ میں نے تازہ دودھ کا ایک پیالہ بھر کر دیا۔ تم مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ وہاں اور تب سے میں تمہاری داسی بنی۔ کیا تمہیں وہ شام یاد نہیں؟"

"ہوں۔ ہوں۔" بوڑھے نے ہاتھ سے پیشانی کا پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا۔ "کونسی شام کا تم ذکر کر رہی ہو؟"

"سکھو۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ ہم جوہڑ کے پاس، میرے باپ کے کنوئیں سے بائیں جانب، کیکر اور بھلاہی کے درختوں کے نیچے ملا کرتے تھے۔ میں ہر رات وہاں آتی۔ تم میرا انتظار کیا کرتے تھے یا نہیں؟"

"میں کب گھر سے باہر نکلتا ہوں؟ میں تمہارا انتظار کیا کرتا تھا؟ وہ کس لئے؟"

"میں آج یا کل کی باتیں نہیں کر رہی۔ یہ تو چوالیس سال پیشتر کا واقعہ ہے مجھے خوب یاد ہے۔ میں سولہ اور تم چھبیس برس کے تھے۔ سکھو یہ صرف شراب پینے اور ہر وقت لڑتے رہنے کا نتیجہ ہے کہ تم اس کمزور حالت میں ہو۔"

"آر۔ رر۔ میں نے کبھی شراب نہیں پی۔ دو چار قطرے چکھ لینے سے آدمی شرابی نہیں بن جاتا۔"

"اور تم چار دفعہ جیل بھی ہو آئے ہو نہ؟ یاد نہیں جب تم اپنے ساتھیوں سمیت آئے اور مجھے میرے گھر سے نکال لے گئے اور تم نے ہنسو کو لاٹھی سے اس بری طرح پیٹا کہ اس نے تین مہینے ہسپتال میں گذارے اور تمہیں چھ ماہ کے لئے قید کر دیا گیا؟"

"کون؟ میں؟" بوڑھے نے چلم پیتے پیتے رک کر کہا۔ "میں قید ہوا؟ کب؟ کیسے؟"

"ارادۂ قتل اور اغوا کرنے کے جرم میں۔"

بوڑھے کے چہرے پر شکنیں نمودار ہوئیں۔ اس کا منہ بے ساختہ کھل گیا۔ اس نے دایاں ہاتھ زور سے ران پر مارا۔

"ہاں۔ ہاں۔" اس نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔ "مجھے پاجی ہنسو یاد ہے میں نے اسے پیٹا۔ وہ اس کا مستحق تھا۔ سر سے پاؤں تک ریاکاری کا مجسمہ! میں نے اسے پیٹا۔ اور خوب پیٹا۔ مجھے اپنی قسم۔ مجھے پروا نہیں خواہ کوئی بھی سن لے۔ ایک دن تھا جب میں نہتا گاؤں کے مسلح مشٹنڈوں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔"

"لیکن کیا تمہیں وہ رات یاد نہیں جب تم ہمارے گھر آئے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا اور تھوڑی دیر ٹھہر کر بولا۔

"گرمی کسی قدر زیادہ ہے۔ تن بدن میں آگ سی لگ رہی ہے۔"

"کتنے انجان بن رہے ہو۔ تم اپنے چچا اور گاؤں کے دو آدمیوں کے ساتھ آئے۔ میرا رشتہ مانگا لیکن میرے باپ نے انکار کر دیا۔" ایک شرابی کو جس کے پاس اپنا بدن ڈھانکنے کے لئے کپڑا میسر نہیں میں اپنی بیٹی دے دوں؟" اس نے کہا تھا۔ ہمارے پاس تب چار بھینسیں اور دو گائیں تھیں۔ ہم امیروں کے زمرہ میں شمار ہوتے تھے۔ یہ بھی سب کو معلوم تھا کہ میرے باپ کی ساری جائیداد کا وارث میرے سوا اور کوئی نہ تھا۔ وہ مجھے نمبردار کے لڑکے ہنسو سے بیاہنا چاہتا تھا اور آخر ہنسو ہی سے میری شادی ہوئی۔"

"ارے یہ کیا؟ تمباکو اتنی جلدی جل گیا! میری چلم بجھ چکی ہے۔" بوڑھے نے ذرا متحیر ہو کر کہا۔

"بجھنے دو۔" بوڑھی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "خواہ تمہیں یاد نہیں لیکن یہ حقیقت ہے جو میں بیان کر رہی ہوں۔ اتنی مدت بعد تم سے باتیں کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ جب انہوں نے میری شادی ہنسو سے کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تو میں نے تمہیں آ کر بتایا۔ تم نے کہا خواہ کچھ بھی ہو تمہارے ہاتھوں سے مجھے کوئی چھین کر نہیں لے جا سکتا۔ برات آئی ڈھول بجے۔ دیگیں چڑھیں لیکن دفعتہً گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں تم نے مجھے زور سے پکارا۔ اب تک رات ہو چکی تھی۔ تمہارا چچا اور بیس تیس آدمی تمہارے ساتھ تھے۔ تم نے کواڑ لاٹھیاں مار مار کر توڑ ڈالے۔ ایسا واقعہ نہ پہلے اور نہ اب کبھی سننے میں آیا ہے۔ تم اس کمرے میں لاٹھی گھماتے آن گھسے جہاں میں اپنی ماں اور دوسری عورتوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ کوئی بھی تمہیں روک نہ سکا اور میں بھی تمہارے ساتھ جانے میں خوش تھی۔ تم مجھ کو گھوڑے پر بٹھا کر لے بھاگے اور اپنے گاؤں لے آئے۔ دوسرے دن پولیس آئی۔ ہم تمہارے چچا کے گھر چھپے ہوئے تھے۔ ہر ایک کو گرفتار کیا گیا۔ مجھے واپس میرے گھر پہنچایا گیا۔ آہ۔ وہ رات کتنی خوفناک تھی سکھو اور تم کہتے ہو مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔"

بوڑھے نے چلم از سر نو صاف کی۔ نیا تمباکو ڈالا۔ بوڑھی کی طرف دیکھا اور پھر کچھ جواب دئے بغیر اسے سلگانے میں مشغول ہو گیا۔

"تم پھر چھ ماہ کے لئے قید کئے گئے۔" بوڑھی حلق صاف کرتے ہوئے بولی۔ "ہنسو کے صحت یاب ہوتے ہی ہماری شادی ہو گئی۔ میں اور کر ہی کیا سکتی تھی۔ ایسا کرنے پر میں مجبور کی گئی۔ میں دن رات روتی رہتی تھی۔ سارے فساد کی جڑ میں تھی۔ لیکن تقدیر کے اٹل فیصلے کے سامنے سر جھکانا پڑا۔ سب کچھ اتنی جلد ظہور پذیر ہوا کہ کچھ سوچنے یا کرنے کا موقعہ ہی نہ ملا۔ ہنسو کے ساتھ میری ازدواجی زندگی کتنی تلخ اور ناخوشگوار تھی اور میری اور تمہاری

محبت کا انجام اس افسوسناک طریق پر ہوا۔ داستانِ الفت کی یاد فرسودہ ہونے کے ساتھ ساتھ بے رس ہوتی چلی گئی۔ ہنسو بدقماش تھا۔ جلد ہی اندرونی بیماریوں نے اس کا خاتمہ کر دیا۔"

یہ کہتے کہتے بوڑھی کے آنسو نکل پڑے جنہیں وہ دوپٹے سے صاف کرنے لگی۔ بوڑھا بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا اور گاہے گاہے اس کی طرف دیکھتا جاتا تھا۔ اس کو روتے دیکھ کر وہ ہمدردانہ لہجے میں کہنے لگا۔

"بیچاری۔ دکھیا۔ بڑی مصیبت زدہ دکھائی دیتی ہو۔"

"آہ" بوڑھی نے اور بھی زیادہ رو کر کہا "آج تمہیں دیکھ کر بجھی ہوئی آگ ایک ہی دفعہ بھبک کر جل اٹھی ہے۔ دل پر اک بوجھ سا پڑ گیا ہے۔ باتیں کرنے سے یہ اور بھی گراں بار ہو گیا ہے۔ کاش میں تمہیں دیکھے بغیر تمہارے پاس سے گزر جاتی۔"

وہ اُٹھ بیٹھی۔ بوڑھے کی طرف ایک دفعہ اور اس نے مشتاق نگاہوں سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور اس کے لب بے رنگ تھے۔

"میں اب جاتی ہوں۔ سکھو کیا مجھ سے ایک لفظِ محبت بھی نہ کہو گے جس سے میں سمجھ سکوں کہ تم نے مجھے معاف کر دیا ہے۔"

بوڑھے نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"رام تمہارا بھلا کرے۔"

"پرمیشر تمہیں سکھی رکھے۔" اس نے جواب دیا اور چل پڑی۔ جب تک وہ نظر آتی رہی وہ اُسے دیکھتا رہا۔ اس کے نگاہوں سے اوجھل ہونے کے بعد اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور آہستہ سے کہا۔

"یہ کیا کہہ رہی تھی!"

اس کے چہرے پر چند لمحوں کے لئے ذہنی کشمکش کے آثار نمودار ہوئے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن بہت غور و خوض کرنے کے بعد بھی اسے چنداں کامیابی نہ ہوئی۔

وہ لڑکھڑا کر اٹھا اور سوٹا سنبھالتے ہوئے گھر کی طرف چلنے لگا۔

اقبال

کوئل

اے مُرغِ چمن، مُرغِ حزیں، مُرغِ الم ریز
شوریدہ و آشفتہ و بیزار و سحر خیز

غمناک گلستاں میں فقط تو ہی نہیں ہے
کیا تجھ کو خبر ہے کہ مرا دل بھی حزیں ہے

پُر درد یوں ہی نغمہ کا انداز ہے میرا
غمخانۂ عالم میں تو ہم ساز ہے میرا

تعمیر ہے اس بستیٔ کہنہ کی الم سے
اس ساز کا ہر تار ہے پُر نوحۂ غم سے

لبریز مَے درد سے ہر گُل کا سبُو ہے
رگ ہائے گُلِ تر میں مرے دل کا لہو ہے

اندوہ کا بے تھاہ سمندر ہے زمانہ
رسوائیِ فطرت ہے مسرت کا ترانہ

مسعود شاہد

رشک

"میرے کپڑے جلدی نکالو"

"رات کے نو تو بج چکے ہیں۔ اب کہاں جاؤ گے"

"سنیما اور کہاں"

"میں اس وقت کپڑے نہیں نکال سکتی"

"کیوں"

"مجھے نیند آ رہی ہے"

"اگر سنیما نہ جاؤں تو تمھاری نیند کھل جائے گی"

"زیادہ باتیں مت کرو۔ مجھے سونے دو"

"تمھیں شرم نہیں آتی۔ گستاخ کہیں کی"

"سنیما تمھیں جانا ہے اور کپڑے میں نکالوں"

"کپڑے نکالو"

"خود نکالو۔ مجھے نیند آ رہی ہے"

"اچھا لاؤ۔ دو چابی میرے بیگ کی"

"میرے پاس نہیں ہے"

"اور کس کے پاس ہے۔ شام کو تمھیں نے میرے بیگ میں ثانیاں رکھی تھیں"

"مجھے یاد نہیں کہاں رکھ بیٹھی ہوں"

"ڈھونڈو پھر اٹھ کر"

"مجھے مت ستاؤ۔ مجھے سونے دو"

"دیکھو پیاری سوا نو کا وقت ہے جلدی کرو۔ ورنہ مجھے دیر ہو جائے گی۔ اٹھو اچھی زرینہ"

"میں تو بری زرینہ ہی اچھی ہوں۔ روز رات کے بارہ بارہ بجے آتے ہو اور پھر طرز کلام تو دیکھئے"

"پیاری زرینہ آج جب میں سنیما سے واپس آؤں گا تو تم بڑی خوش ہو گی"

"ہاں مجھے کانوں کے کانٹے جو مل جائیں گے"

"تم اٹھو تو سہی"

"پھر وہی بات"

"اچھا سو رہو آرام سے میں بھائی سلیم کے ہاں جاتا ہوں۔ وہ لوگ تاش کھیل رہے ہوں گے بس رات کٹ جائے گی زرینہ تم فکر نہ کرو میں سنیما نہیں جاؤں گا"

"نہیں نہیں۔ پیارے رشید میں کپڑے نکالتی ہوں تم سنیما چلے جاؤ"

"اب میں وہیں جاؤں گا اور صبح آؤں گا۔ تاکہ تمھاری نیند میں خلل انداز نہ ہوں"

"خدا کے لئے وہاں مت جاؤ"

"کیوں نہ جاؤں"

"اس لئے کہ میں تمھیں دل و جان سے چاہتی ہوں۔ اس کی بیوی جادوگرنی ہے کہیں تمھیں کوئی تعویذ نہ کھلا دے۔ ریحانہ کہتی تھی کہ اس نے بلقیس کے خاوند کو کچھ کھلا دیا تھا۔ اب وہ بیمار پڑا ہے"

"میں ان باتوں پر اعتقاد نہیں رکھتا میں ضرور جاؤں گا"

"تمھارے قدموں پر گر کر کہتی ہوں کہ خدا کے لئے وہاں نہ جاؤ۔ مجھے میری گستاخی کی معافی دے دو اور سنیما چلے جاؤ۔ آخر میرا مطلب تو یہی تھا کہ تم سنیما نہ جاؤ گے تو میرے پاس رہو گے"

"اچھا لاؤ۔ دو چابی"

"نہیں رشید۔ میں خود کپڑے نکال کر دیتی ہوں"

"اب اپنے بھی نکالو"

"کیوں"

"آج سلیم نے BOX کا پاس بھیجا ہے۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔ مگر تمھیں تو نیند آ رہی ہے"

"نہیں پیارے کہیں تمھیں تو نہیں آ رہی اب؟"

عزیز مسعود

جام صہبائی

(۱)

نقش ہیں حسن کی درخشانی ہے
نغمہ ہے سرودِ سازِ ربانی ہے
مسحور ہیں چشم و گوش مستی ہے دل
کیا نغمہ و نور کی فراوانی ہے

(۲)

جالب ہیں یہاں ہزار سامانِ جنوں
ہنگامۂ فصلِ گل سے طوفانِ جنوں
کیا دامنِ عقل کے اڑے ہیں پرزے
جاری ہے دلوں پہ آج فرمانِ جنوں

(۳)

باغوں میں ہیں یا جمع گلعذارانِ بہار
فردوس میں جلوہ گر ہیں حورانِ بہار
جلوے ہیں کہ رنگ و بوئے میخانہ ہیں
نظریں ہیں کہ ہیں سیاہ مستانِ بہار

(۴)

اخلاص و وفا کو عام کر دے یارب
یا ایک دلوں میں نور بھر دے یارب
ہر چیز میں دیکھے جو تیرا جلوہ
دیدۂ دل کو وہ نظر دے یارب

اثر صہبائی

فاروقِ اعظمؓ کا ایک سفر

[حضرتِ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے واقعاتِ سفر کی طرف آپ کے اردو سوانح نگاروں نے بہت کم اعتنا کی ہے۔ حتیٰ کہ آپ کی جامع اور مکمل سوانح حیات **الفاروق** میں بھی علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے حالاتِ سفر قلم انداز فرما دیئے ہیں۔

حضرت فاروق اعظم اپنے زمانہ جاہلیت کے واقعاتِ سفر اکثر قصّے کے طور پر بیان فرمایا کرتے تھے۔ ہم عہدِ جاہلیت میں آپ کے سفرِ شام کا ایک دلچسپ واقعہ جو آپ نے اپنی زبانِ مبارک سے بیان فرمایا تھا دمشق کے مشہور اور بلند پایہ عربی مجلّہ المجمع العلمی ۱۹۲۹ء سے اردو میں منتقل کرتے ہیں۔ طوالت کے خوف سے اسناد و رواۃ قلم انداز کئے جاتے ہیں۔ "یحییٰ"]

حضرتِ فاروقِ اعظم فرماتے ہیں :۔

ایک مرتبہ میں نے تجارت کی غرض سے ملکِ شام کے لئے رختِ سفر باندھا اور قبیلۂ قریش کے ایک قافلے کے ساتھ جس میں ابوسفیان بن حرب بھی تھے ہم عازمِ شام ہوئے جس وقت ہمارا قافلہ شام میں داخل ہوا۔ تمام بازار اُٹھ چکے تھے۔ اب صرف ہمارے سامان تجارت باقی رہ گئے تھے۔ لوگوں نے ہمیں صلاح دی کہ اگر تم دمشق چلے جاؤ تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہو۔ ہم نے دمشق کا رخ کیا۔ وہاں پہنچے۔ بازار لگایا۔ سامانِ تجارت فروخت کیا اپنے شہر کی ضروریات کے مطابق چیزیں خریدیں اور واپسی کیلئے روانہ ہو پڑے۔ ہمارے قافلے نے ابھی تھوڑی ہی مسافت طے کی ہو گی کہ مجھے اپنی کمر سے بندھی ہوئی سونے کی تھیلی کا خیال آیا۔ یہ سونا ہماری ایک قرابتدار غریب خاتون نے دیا تھا۔ اور مجھ سے درخواست کی تھی کہ اسے فروخت کر کے اس کے لئے کپڑے وغیرہ لیتا آؤں۔ میں نے اپنے رفقائے سفر سے کہا کہ آپ لوگ میری واپسی تک اس جگہ انتظار کریں اور اپنی وہ ضرورت بیان کی جس کی خاطر میرا پھر دمشق جانا ضروری تھا۔ ہمارے رفقائے سفر نے کہا :۔ "اچھا جاؤ! ہم تمہارا یہاں انتظار کریں گے۔ مگر بھائی ہمیں یہاں مقیّد ہی نہ کر دینا!"

میں وہاں سے روانہ ہوا۔ اور جس وقت دمشق پہنچا شام ہو چکی تھی وہاں ایک سرائے میں اقامت اختیار کی کہ رات بسر کر لینے کے بعد صبح کو جس مقصد سے آیا ہوں اسے پورا کروں گا۔

اس اثنا میں کہ میں وہاں سویا ہوا تھا ایک شخص آیا اور اپنے پاؤں سے مجھے ہلایا۔ میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس نے پوچھا "تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟" میں نے کہا "ایک مسافر ہوں ایک ضرورت سے یہاں آیا ہوں"

اس نے کہا "میرے ساتھ میرے گھر چلو!"

میں اس کے ساتھ اس کے مکان پر گیا۔ اس نے میری نہایت پر تکلف ضیافت کی۔ میں نہایت عافیت سے اس کے ہاں شب باش ہوا۔ میں تو اپنے بستر پر دراز ہو گیا اور وہ تمام رات نمازیں پڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ صبح کر دی۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا :۔ "تم بازار اس وقت تک ہرگز نہ جانا جب تک میں تمہارے ہمراہ نہ چلوں۔ دیکھو! میری معیت میں اپنی ضرورت پوری کرنا!" (اس نے یہ اس لئے کہا تھا کہ وہ مہمانوں کے مال و اسباب کی حفاظت بھی لٹ جانے کے خوف سے کیا کرتا تھا) حضرت فاروقِ اعظم فرماتے ہیں کہ پھر وہ سو گیا کیونکہ اس نے ساری رات شب بیداری میں گزاری تھی۔ میں اس کا جگانا نامناسب سمجھ کر اور یہ خیال کر کے کہ اگر اس کے جاگنے کا انتظار کرتا ہوں تو اپنے رفقائے سفر سے چھوٹ جاؤں گا عجلت سے کام لے کر بازار چلا آیا۔ یہاں پہنچ کر دیکھتا ہوں کہ اہلِ بازار ابھی نہیں آئے ہیں اُن کا انتظار کرنے لگا،

ناگاہ ایک رومی بطریق سامنے نظر آیا۔ اس کے ساتھ اس کے ملازموں کی ایک جماعت تھی وہ مجھے اس حال میں دیکھ کر سمجھ گیا کہ میں مسافر ہوں اور اپنے ملازموں کو حکم دیا: "اس کو پکڑ لو!" یہ گرجے کا کام بہت اچھی طرح کر سکتا ہے۔ وہ مجھے پکڑ کر گرجے تک لائے۔ اس کی عمارت کچھ گر گئی تھی۔ مجھے ہتھوڑا دے کر کہنے لگے اس کو توڑ دو! میں تمام دن کام کرتا رہا جب شام ہوئی تو مجھے چھوڑ دیا۔ میں پھر اپنی اسی سرائے میں آیا اور نہایت شکستہ حالی میں بیٹھا ہوا تھا کہ وہی شخص جس نے اپنے گھر مجھے مہمان رکھا تھا پہنچا اور کہنے لگا۔

"تم کہاں تھے۔ کیا تمہارا کام ہو گیا؟" میں نے اپنی داستان مصیبت سنائی تو وہ بولا: "میں نے تم سے نہیں کہا تھا۔ تم مجھے ہمراہ لے کر بازار جانا۔ میری عدم معیت میں ہرگز نہ جانا۔" میں نے کہا: "تم ساری رات عبادت میں مصروف رہے اور شب بیداری کے باعث صبح کے وقت نہایت مضمحل تھے اور مجھے عجلت تھی۔ کیونکہ میرے ہم سفر میرے منتظر تھے۔ میں نے یہ پسند نہ کیا کہ تمہیں جگاؤں۔"

اس نے کہا: "اچھا اب میرے ساتھ چلو۔ وہ اپنے گھر لایا۔ نہایت پُر تکلف ضیافت کی اور نصیحت کی کہ اب میں ایسا نہ کروں اور جب بازار جاؤں اس کے ہمراہ جاؤں۔"

وہ پھر گزشتہ شب کی طرح عبادت میں مشغول ہو گیا جب وز کا تڑکا ہوا حسب معمول پھر سو رہا۔ میری شامت جو آئی تو پھر بازار کی طرف نکل گیا۔ سوء اتفاق دیکھئے کہ آج بھی ناگاہ میری نگاہ اس بطریق پر پڑ گئی۔ میں اسے دیکھتے ہی بدحواس ہو گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: "ہاں دیکھنا یہ کل والا آدمی پھر مل گیا ہے اس کو جلد پکڑ لو۔" وہ لوگ مجھے پکڑ کر پھر اسی گرجے تک لائے اور مجھے کام کرنے پر مجبور کیا میں برابر دیوار توڑنے کے کام میں مشغول رہا۔ جب دوپہر ہوئی اور سخت گرمی پڑنے لگی تو سب لوگ چلے گئے اور اس جگہ کوئی نہ رہا۔ میں انہی دیواروں کی چھاؤں میں ذرا آرام لینے کے خیال سے بیٹھ گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ چپکے سے اس بطریق نے میرے سر پر پہنچ کر ایک کوڑا تڑاق سے جما دیا۔ نہایت سخت چوٹ آئی۔ اس نے نہایت غصے میں کہا "کام چھوڑ کر بیٹھ رہا!" میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی جب دیکھا اور کوئی نہیں ہے۔ اس کو اس زور سے کھینچا کہ وہ اپنے گھوڑے سے نیچے گر گیا۔ پھر اس کے سر پر ہتھوڑے کی بارش شروع کر دی وہ چیختا اور واویلا مچاتا رہا۔ مگر سننے والا کوئی نہ تھا۔ میں نے دیوار کا ایک بھاری ٹکڑا اس پر گرا کر اس کا کام تمام کر دیا اور وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر نکل بھاگا۔ میں فرط خوف سے پیچھے مڑ کر دیکھتا بھی نہ تھا کہ مبادا کوئی میرے تعاقب میں آ رہا ہو اور مجھے پکڑ لے۔

میں نے مصلحتاً اس راستے کو جس میں میرے رفقائے سفر تھے چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کیا۔ جب شہر سے دور نکل گیا۔ مجھے ایک رومی شخص ملا اس نے اپنی زبان میں مجھ سے گفتگو شروع کی جسے میں مطلق نہ سمجھ سکا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور سلسلہ گفتگو طویل کرتا گیا لیکن میں اس کی ایک بات بھی نہ سمجھ سکا۔ وہ بھی میری زبان سمجھنے سے بالکل قاصر تھا۔ اثنائے گفتگو میں جب اس نے اپنی تلوار کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں سمجھ گیا کہ یہ مجھ پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ فوراً میں نے اس پر غالب آنے کی کوشش کی۔ اس کو اس کے خچر سے زمین پر گرا کر ایک تلا ہوا ہاتھ مارا اور کام تمام کر دیا۔ اور خود اس کے خچر پر سوار ہو کر اور مال غنیمت سمجھ کر لے چلا۔

اس جگہ سے روانہ ہو کر میں ایک دیر کے قریب پہنچا۔ یہاں نصاریٰ کی ایک جماعت مقیم تھی۔ میں دیر کے اندر داخل ہوا تو مجھے دیکھتے ہی اہل دیر میرے ارد گرد جمع ہو گئے۔ اور مجھ سے میرے حالات کے متعلق استفسار شروع کر دیا۔ میں نے ٹالنے کے طور پر گفتگو کا رُخ بدل دیا اور دیر کے متعلق سوال کیا کہ یہ کس نام سے مشہور ہے؟ ایک نے جواب دیا اسے دیر العدس کہتے ہیں۔

پھر وہ اسقف کے پاس گئے اور میرے وارد ہونے کی خبر سنائی۔ وہ میرے پاس آیا اور مجھے نہایت غور سے دیکھ کر کہنے لگا:

"تمہارے چہرے سے خوف کے آثار ظاہر ہوتے ہیں؟"

میں نے کہا: "تم نے مجھ میں خوف زدہ ہونے کی کونسی علامت دیکھی؟" اس نے کلام کا پہلو بدل کر کہا:

"آپ یہاں جس طرح چاہیں قیام کریں۔ خدائے تعالےٰ نے آپ کو تمام خوف و ہراس سے پناہ دے دی۔ آپ ہر طرح کے خدشے سے مامون ہو گئے۔ کیونکہ اب آپ ہماری حمایت اور حفاظت میں آ گئے ہیں۔ اسقف نے مجھے اپنے گھر میں بحیثیت مہمان رکھا اور میری نہایت خاطر مدارات کی۔ پھر میرے حالات دریافت کئے کہ آپ کون ہیں؟ کس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں؟ میں نے مختصر طور سے بتایا۔ وہ مجھے نہایت غور سے دیکھتا تھا۔ اور بار بار میرے متعلق مزید استفسارات کرتا تھا۔ میں نے

اس کے ہاں رات نہایت آرام سے بسر کی۔ صبح ہوئی تو مجھ سے سوال کیا :۔"آپ کا ارادہ قیام پذیر ہونے کا ہے یا رختِ سفر باندھے گا؟" میں نے کہا "میں عازمِ وطن ہوں گا"۔ وہ اپنا نہایت شاندار گدھا جو بہت ہی خوش رنگ اور نہایت تیز رفتار تھا لے آیا۔ اس پر پالان کسا۔ خرجیں لادیں جو لذیذ ترین کھانے کی چیزوں اور قیمتی تحائف سے بھری ہوئی تھی۔ پھر میری طرف مخاطب ہوا۔ اور بولا۔ آپ اس پر سوار ہو جائیں اور روانہ ہوں۔ جب آپ راستے میں کسی عیسائی کے مکان سے گزریں گے۔ اور وہ آپ کو اس گدھے پر سوار دیکھے گا تو آپ کی تعظیم و تکریم اور خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھے گا۔ پھر اسقف نے میرا ہاتھ پکڑا اور خلیہ میں لے جا کر کہنے لگا :۔

"اے عمر! تم پر میرا حق واجب ہو گیا"۔ میں نے کہا "بے شک!" اس نے کہا :۔ "تم ایک معزز قوم کے فرد ہو۔ میری ایک غرض تم سے وابستہ ہے۔ کیا تم پوری کر دو گے؟" میں نے کہا "بیان کرو لیکن تعجب ہے کہ تمھارے جیسی صاحب اثر اور ذی احتشام شخصیت مجھ جیسے ایک پریشاں حال مسافر سے کوئی غرض اور ضرورت رکھتا ہو!"——

سردار نے نہایت متانت و وقار سے کہا سنو! میں ایک آدمی ہوں جسے خدا نے آسمانی کتابوں کے علم سے سرفراز فرمایا ہے۔ میں نے تمھاری ذات میں بہت سی ایسی علامتیں پائی ہیں جن سے میں تمھارے متعلق پیشن گوئی کرنے پر مجبور ہوں کہ جب زمانہ اپنی ایک معیّن مدت پوری کر چکے گا تو حالات میں ایک انقلابِ عظیم رونما ہو گا۔ دنیا ایک نئی کروٹ لے گی اور حالات و واقعات ایک نئے قالب میں جلوہ گر ہوں گے۔ عمر! یقین مانو کہ تم اس وقت ان تمام شہروں کے امیر و والی ہو جاؤ گے اور صرف تمھارے ادامر و احکام یہاں نافذ ہوں گے ———— سردار نے اپنی آستین سے دوات قلم اور کاغذ نکالا اور کہا کہ "میری غرض یہ ہے کہ آپ مجھے ایک نوشتہ تحریر فرما دیں جس کا مضمون اس دیر کے جزیہ کی معافی ہو"۔

میں نے کہا :۔ "کیا تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو؟" اس نے کہا "کیا تم میرے متعلق سوءِ ظن سے کام نہیں لے رہے ہو؟ قسم ہے اُس ذات کی جس نے عیسٰیؑ ابنِ مریمؑ پر انجیلِ مقدس نازل فرمائی کہ میں آپ سے جو کچھ عرض کر رہا ہوں وہ حرف بحرف حق ہے۔ امید ہے کہ ازراہِ کرم آپ میری درخواست قبول فرمائیں گے اور نوشتہ تحریر فرما دیں گے!"

مجھے کیا عذر ہو سکتا تھا۔ میں نے بلا تامل جو کچھ اس نے فرمائش کی لکھ دیا اور وہاں سے کوچ کر کے نصاریٰ کی ایک جماعت کے پاس پہنچا۔ انھوں نے جب مجھے اسقف کے گدھے پر سوار دیکھا تو میری خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ پھر اس جماعت کے بعض افراد نے نصاریٰ کی دوسری جماعت تک میری رفاقت کی۔ غرضیکہ جہاں بھی میں پہنچتا یہ قوم مجھے اس گدھے پر سوار دیکھ کر سراپا نیاز و عقیدت بن جاتی اور میری تعظیم و تکریم اور مہمان داری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتی میں اسی طرح مہمان بنتا ہوا۔ اور نصاریٰ کی مختلف جماعتوں میں منزلیں طے کرتا ہوا تبوک[1] تک پہنچ گیا۔ خدا کی شان میرے رفقائے سفر (ابوسفیان وغیرہ) رکی[2] کے قریب منزل کئے ہوئے تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی میری جانب دوڑ پڑے اور میرے پہنچ جانے سے بے حد مسرور ہوئے اور کہنے لگے۔ اے ابن خطاب! تم نے تو ہم لوگوں کو اُس مقام پر جہاں چھوڑ کر گئے واقعی مقید کر ڈالا تھا۔ جب ہم لوگ تمھارا انتظار کرتے کرتے بالکل مایوس ہو گئے تو اس مقام سے کوچ کیا۔ مگر تمھاری جانب سے ہمیں سخت اضطراب اور قلق تھا۔ اب یہ بتاؤ کہ تم کس حالت میں رہے؟ میں نے انھیں اپنے تمام واقعات سے آگاہ کیا لیکن اسقف سے اور مجھ سے جو گفتگو ہوئی تھی وہ بالکل ظاہر نہ کی اور میرے نہ بیان کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں اسے کم زوری اور ضعیف الاعتقادی پر محمول کرتا تھا۔

ابوسفیان نے مجھے اس گدھے پر سوار دیکھ کر کہا :۔ "ارے تم لوگ اس نوجوان کے اقبال کو نہیں دیکھتے! اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ اگر یہ بے آب و گیاہ بیابان میں بھی چھوڑ دیا جائے تو پتھر شق ہو کر اس کے لئے خود بخود رزق مہیا کر دیں"———— چونکہ اسقف نے کہا تھا کہ جب میں اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ جاؤں اور گدھے کی ضرورت سے بے نیاز ہو جاؤں تو اس کی رسّی خرجین میں رکھ کر اور خرجین کو گدھے پر مضبوط باندھ کر گدھے کو جہاں پر ہو اسی جگہ چھوڑ دوں میں نے ایسا ہی کیا۔ یہ دیکھ کر ابوسفیان نے مجھ سے کہا :۔ "ارے یہ کیا کر رہے ہو؟ میں نے پوچھا "کیا دیکھا"؟ ابوسفیان نے کہا "تم نے گدھے کو ایسی جگہ چھوڑ دیا جو چوروں اور درندوں کی گذرگاہ ہے"۔

میں نے کہا :۔ "اس کے مالک نے مجھے ایسا ہی کرنے کا حکم دیا ہے۔ وہی اس کے عادات و اطوار سے زیادہ واقف ہے"۔

اب وہ جگہ اور اس جگہ کا کنواں "رکی الامان" کے نام سے

---

[1] تبوک۔ مکہ معظمہ اور شام کے درمیان ایک مقام ہے۔
[2] رکی۔ تبوک کے قریب ایک مقام اور کنوئیں کا نام ہے۔

مشہور ہے یعنی گدھے والا کنواں۔

وہاں سے روانہ ہو کر ہمارا قافلہ مکہ معظمہ پہنچا۔ میرے اور اسقف کے مابین جو گفتگو ہوئی تھی وہ میرے دل میں خلجان پیدا کرنے لگی مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں نے اپنا یہ راز اپنی ایک مربیہ سے بیان کیا۔ وہ بڑی عقلمند سمجھدار اور عالمہ تھی۔ اس نے مجھ سے کہا:۔

"اے ابن خطاب! میں تمھارے بچپن ہی کے زمانے سے تم میں نیک آثار دیکھتی ہوں ------ تم جب بہت کم سن تھے میں نے ایک دفعہ خواب دیکھا کہ تم لانبے ہوتے چلے جا رہے ہو۔ اور تمھارا قد اتنا لانبا اور طویل ہوگیا ہے کہ اس نے آسمان کو چھو لیا۔ یہ دیکھ کر میں نے نیند ہی میں کہا۔ ارے میرے بچے کی یہ کیا حالت ہے؟ تو مجھے کسی نے جواب دیا۔ یہ لڑکا عنقریب دنیا اور آخرت کی بھلائی پائے گا۔

عہد جاہلیت میں اس قسم کی باتوں کا کوئی مطلب میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ مکہ میں ایک شخص اہل کتاب میں سے تھا جو بہت گم نام تھا اسکی حالت کسی پر آشکارا نہ تھی۔ ہاں اکابرین قریش اسے پہچانتے تھے اور اس کی دل سے عظمت کرتے تھے۔ وہ جب کسی اہم معاملہ میں اس سے مشورہ کرتے تو وہ ان سے نہایت خلوص سے باتیں کیا کرتا تھا۔ میں دوپہر کے وقت اس کے یہاں گیا۔ اور اس کے مکان پر پہنچ کر آواز دی" ذرا دروازہ کھولئے مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے اور ایک خاص اور اہم بات عرض کرنی ہے" اس نے دروازہ کھول دیا۔

میں نے کہا" میں آپ سے دو باتیں بیان کرنا چاہتا ہوں اور ان کو آپ کے دل میں راز بنا کر رکھتا ہوں۔ آپ کسی کو شمۃً بھی اس سے مطلع نہ کریں گے" اس نے وعدہ کیا تو میں نے اپنی ساری سرگزشت اور وہ تمام باتیں جو اسقف یعنی سردار دیرعدس سے ہوئی تھیں من و عن بیان کر دیں اور اپنی مربیہ کے خواب کا بھی تذکرہ کیا جب میں اپنی ساری گفتگو ختم کر چکا تو وہ میری جانب متوجہ ہوا اور کہنے لگا:۔

"اے ابن خطاب! وہ اسقف جس نے تم سے یہ قول و قرار کیا۔ عہد حاضر کے تمام علمائے نصاریٰ میں سب سے زیادہ عالم اور صاحب بصیرت ہے۔ جو کچھ اس نے کہا وہ حرف بحرف حق ہے اور عنقریب تم اس کو حقائق کی صورت میں جلوہ گر دیکھو گے اور خواب کی تعبیر تو کھلی ہوئی ہے کہ مکہ میں ایک انقلاب عظیم رونما ہوگا اور زمانہ ایک نیا روپ اختیار کرے گا۔ آنے والے دور کے آسمان و زمین بدل جائیں گے اور دنیا ایک نئے طریقے سے سجائی جائے گی۔

اے ابن خطاب! تم اس آنے والے عہد کے اوائل ہی میں میرے پاس آنا۔ کیونکہ وہی ان تمام پیش گوئیوں کے پورے ہونے کا زمانہ ہوگا جو اسقف نے تم سے بیان کی ہیں۔

میں نے اس کی ذرا تفصیل پوچھی تو اس نے کہا" تم تو خود ہی مشاہدہ کر لو گے"

میں اس کے یہاں سے اپنے گھر چلا آیا۔ اور اس کی ساری باتیں برابر اپنے دل میں لئے رہا۔ وہ تھوڑی مدت کے بعد دارالبقا کو سدھارا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ادھر ادھر کچھ چہ میگوئیاں اور چرچے سنے جانے لگے۔ اہل قریش آپ کے بارے میں اکثر گفتگو کیا کرتے اور مضحکہ اور استہزا کے طور پر آپ کا آپس میں تذکرہ کرتے میرے دل میں خود بخود یہ بات بعض وقت کھٹکتی کہ حالات و واقعات کچھ مختلف اور عجیب نظر آ رہے ہیں اور میں جو کچھ سن رہا ہوں اسے اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تو یہ وہی باتیں معلوم ہوتی ہیں اور اسی پیش گوئی کا پیش خیمہ کہی جا سکتی ہیں جس کی طرف آسمانی کتاب کے اس عالم نے اشارہ کیا تھا۔

ابھی زیادہ مدت نہ گزرنے پائی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام ظاہر فرمایا

اسلم سے روایت ہے کہ جب حضرت فاروق اعظم نے اپنے عہد خلافت میں عنان توجہ شام کی جانب مبذول فرمائی اور آپ نے اپنے قدوم سے ارض شام کو شرف بخشا تو ایک بہت بوڑھا آدمی جس کے بال برف کی مانند سفید ہو چکے تھے نصاریٰ کی ایک جماعت کے ساتھ آپکی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ اور عرض کی" یا امیرالمومنین! کیا آپ مجھ نہیں پہچانتے؟" آپ نے فرمایا" اگر تم دیرالعدس والے میرے دوست اسقف ہو تو میں تمھیں پہچانتا ہوں" اس نے عرض کی" جی ہاں میں وہی اسقف ہوں۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ میں نے تم سے اس وقت جو عہد کیا تھا۔ وہ علیٰ حالہٖ قائم اور مستحکم ہے۔ تم بہت بوڑھے ہو گئے۔

ہاں اللہ تعالیٰ نے ہم میں اسلام مبعوث فرما کر اس سچے دین سے ہمیں سرفراز کیا۔ تم تو اہل کتاب ہو اور تم ہی نے مجھے ان باتوں کی بشارت دی تھی تمھیں اسلام میں داخل ہونے سے کون سا امر مانع ہو سکتا ہے!

حضرت عمر نے اپنے اس" نوشتہ" کے مطابق دیرالعدس کا جزیہ معاف کر دینے کا حکم صادر فرمایا۔ اور اب وہ ساعت سعید آگئی تھی کہ دیرالعدس کا اسقف اپنی پوری جماعت کے ساتھ اسلام کی لازوال دولت سے سرفراز ہو!

سید یحییٰ حسن ندوی

پیارے موہن کی یاد میں

علامہ کیفی کے صاحبزادے پنڈت پیارے موہن کی جواں موت کا غم نہ صرف مرحوم کے دوستوں کا غم ہے بلکہ ساری قوم کا غم ہے لیکن جو شخص ساری قوم کا غم کھانے والا ہو اس کا غم اپنے پیارے بیٹے کے لئے کیسا ہوتا ہوگا اس کا اندازہ آپ کو ان اشعار سے ہوگا۔ حضرتِ علامہ نے یہ شعر لکھے نہیں بلکہ جذبۂ بے اختیار نے ان سے لکھوائے ہیں۔ ان میں وہی خیالات ہیں جن کا اظہار وہ اپنے دوستوں سے کرتے رہے ہیں۔

منصور احمد

ہے رسمِ خط جو غلط ہوں بنائے جاتے ہیں
درست نقش جو ہیں کیوں مٹائے جاتے ہیں

جو نو فروغ تھے ہونے کو شمعِ بزمِ عمل
وہ شام ہی سے دیے کیوں بجھائے جاتے ہیں

جوان کو ہونا ہے کھلنے کے ساتھ پژمردہ
تو غنچے باغ میں پھر کیوں کھلائے جاتے ہیں

جو فرطِ ضعف سے اٹھ سکتے تھے نہ بستر سے
وہ سوئے خلد قدم اب بڑھائے جاتے ہیں

ستم ظریفیاں غیب و حضور کی دیکھو
وہ چھپ کے آنکھ سے دل میں سمائے جاتے ہیں

یہ کون کس سے کہے اُن کو کس پہ چھوڑا ہے
غمِ جدائی میں جو بلبلائے جاتے ہیں

وہ امرِ ربی ہے، لافانی ہے یہ مان لیا
یہ داغ مسلوں سے کب مٹائے جاتے ہیں

حیات و موت کا ہے فلسفہ ہمیں معلوم
خواصِ قلب کے کس سے گنوائے جاتے ہیں

دل و جگر نہیں بالا عمل سے فطرت کے
جبھی تو لختِ دل اشکوں میں پائے جاتے ہیں

ہو جن دلوں میں محبت تمام خلقت کی
وہ ایسے حال میں پتھر بنائے جاتے ہیں

عمل سے کیفرِ کردار کے ہیں ناواقف
جو آسمان کسی کو بنائے جاتے ہیں

جگر کے دل کے لئے راہِ چشم کیا تھی تنگ
یہ سے قتلے حلق تلک کیسے آئے جاتے ہیں

کسے ہے حشر سے انکار، کیا قیامت ہے
سمے جور و زجزا کے دکھائے جاتے ہیں

غمِ وطن تھا مگر کم شرر فشانی کو
پھنکے ہوئے ہیں جو دل کیوں جلائے جاتے ہیں

جو آپ ہی غمِ اہلِ جہاں سے ہے صد چاک
اُسی جگر پہ یہ آرے چلائے جاتے ہیں

ربوبیت کی ہے اک شان یہ بھی، کیا کہئے
کسی کو دکھ نہیں جن سے ستائے جاتے ہیں

بنایا تھا سو بگاڑا، یہ حکم اب ہے سنبھال
یہ چوٹ دے کے پھوکے لگائے جاتے ہیں

یہ سچ ہے جلوہ بھی تیرا، حجاب بھی تیرا
یہی کرشمے تو جی کو جلائے جاتے ہیں

یہ کس کو شان ہے پوچھے اجاڑنا ہے اگر
تو پھر یہ کس لئے ساماں سجائے جاتے ہیں

یہ رحمِ خاص ہے کھا کر اُسے تمام کریں
یہ غم وہ ہیں کہیں انساں سے کھائے جاتے ہیں

جسے مٹایا ہے یاد اُس کی بھی مٹا دل سے
الٰہی توبہ ابھی لب تک آئے جاتے ہیں

یہ غم دیا، تو اٹھانے کی اس کے طاقت دے
یہ بوجھ بے مددِ غیب اٹھائے جاتے ہیں

نہ سہل دوست نہ کم دل ہیں آپ اگر کیفی
تو روکے یاروں کو پھر کیوں رلائے جاتے ہیں

برجموہن دتاتریہ کیفی

عجیب انتقام

۱۴ ستمبر

ایک دکان دار نے ایک شخص کو چوری کرتے ہوئے دیکھا۔ اس کی چور سے ہاتھا پائی بھی ہوئی، مگر وہ بچ نکلا۔ اس واقعہ کے ایک ماہ بعد ملزم گرفتار کر لیا گیا۔ دکان دار نے عدالت میں ملزم کی شناخت کی۔ گناہ ثابت ہو چکا تھا، صرف صفائی کے گواہوں کا بیان باقی تھا۔

ایک نوجوان لڑکی شہادت دینے کے لئے پیش ہوئی۔ یہ لڑکی رنگیل تھیٹر میں روزانہ پروگرام تقسیم کرنے پر ملازم تھی۔ وہ خوب صورت تھی۔ اور صاف ستھرا لباس زیب تن کئے تھی۔ وہ ہمیشہ خوش وخرم نظر آیا کرتی تھی۔ لیکن جب وہ بیان کے لئے عدالت میں حاضر ہوئی تو اس کے چہرے سے حسرت وغم کے آثار نمایاں تھے۔ اس کی ٹانگوں میں لڑکھڑاہٹ تھی اور نگاہوں میں خوف وہراس کے جذبات!

"میں استغاثہ کے متعلق چند سوالات آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں"

جج نے ایک تجسسانہ نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

لڑکی نے جواب دیا "بہت اچھا"

"میرا خیال ہے کہ آپ کی نسبت ملزم سے ہو چکی ہے"

"جی ہاں"

"میرا خیال ہے۔ آپ کو ملزم سے محبت ہے" —

"بے شک" لڑکی کے چہرے پر نسوانی حیا کا گلابی رنگ دوڑ گیا۔

کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ آپ ۱۲۔ جولائی، جمعہ کے دن تین بجے بعد دوپہر کو کہاں تھیں۔

"میں مسٹر چارلی کے ہمراہ وکٹری پکچر ہاؤس میں تھی"

"ملزم کے ساتھ"

"جی ہاں"

"کیا یہ بالکل درست ہے۔ یاد رکھئے آپ نے حلف اٹھایا ہے۔ ہر ایک بات درست کہنی ہو گی۔ بالکل درست!"

"اس بات کو عرصہ ہو گیا ہے۔ میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتی لیکن میرا خیال ہے۔ میں صحیح کہہ رہی ہوں"

"آپ جواب دینے سے پہلے خوب سوچ لیں۔ کیا آپ یقینی طور پر کہہ سکتی ہیں کہ آپ ۱۲۔ جولائی کے دن تین بجے ملزم کے ساتھ تھیں"

"ہاں —— میں پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں"

اس دن آپ سیر کو تو نہیں گئی تھیں۔ کیا آپ کے دماغ میں کسی اور دن کے واقعات تو نہیں"

"اس دن کو گزرے بہت مدت ہو گئی ہے —— تمام دن ایک جیسے معلوم ہوتے ہیں" —— میں اچھی طرح یاد نہیں کر سکتی —— میں یقینی طور پر کچھ بھی نہیں کہہ سکتی —— صرف میرا خیال ہے"

جج نے جیوری کی طرف پُر معنی انداز سے دیکھا۔ جیسے وہ پوچھ رہا ہے کہ کیا وہ ایسے بیان کو تسلیم کریں گے جو صرف وہم اور شک پر مبنی ہو۔ کیا یہ بیان اپنے ہونے والے شوہر کو رہا کرانے کے لئے تو نہیں دیا جا رہا؟

تھوڑی دیر بعد جیوری کے ممبران کی رائے لینے کے بعد جج نے ملزم کو چھ ماہ قید بامشقت کی سزا دی۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر تمام لوگوں کو یہ مقدمہ فراموش ہو گیا۔ سوائے ملزم اور رنگیل تھیٹر کی پروگرام تقسیم کرنے والی لڑکی کے جن کے لئے واقعہ واقعہ نہ تھا ایک المناک حادثہ تھا

۱۵۔ مارچ

مسز شارٹر سے ملازمہ نے کہا "آپ کو کوئی فون پر بلا رہا ہے"

"کون صاحب ہیں؟"

"وہ اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔ صرف اتنا کہا ہے کہ

ایک ضروری کام ہے۔"

مسز شائر ایک خوش قسمت عورت تھی۔ اس کا خاوند سائمن شائر ایک خوش خلق اور محنتی جج تھا۔ جو اپنی قابلیت کی وجہ سے روز افزوں ترقی کر رہا تھا۔

"فرمائیے" مسز شائر نے ٹیلیفون کا ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ مسز شائر ہیں"

"جی ہاں مسز شائر ہی بول رہی ہے۔ فرمائیے کیا کام ہے"

"جب آپ کا شوہر آج گھر آئے تو اس سے دریافت کیجئے کہ وہ ۹ - نومبر جمعرات کے دن شام کے وقت کہاں تھا"

"کیا ؟" مسز شائر نے حیرانی سے پوچھا۔

"آپ اپنے شوہر سے پوچھیں کہ ۹ - نومبر کو شام کے وقت وہ کہاں تھے۔ اور ان کے ہمراہ کون تھا۔ مجھے امید ہے کہ وہ کبھی آپ کو تمام حالات سے مطلع نہیں کریں گے اور کہیں گے اس بات کو اتنا عرصہ ہوگیا ہے کہ میں یاد نہیں رکھتا۔ مگر آپ ایک بھی نہ سنیں اور ان سے صاف صاف کہہ دیں کہ آپ اس کا جواب چاہتی ہیں مکمل جواب اور ثبوت"

مسز شائر نے ٹیلیفون کا رسیور رکھ دیا۔ اس کی شادی کو آج پانچ برس کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس نے کبھی اپنے خاوند کو کوئی بات پوشیدہ رکھتے نہیں دیکھا تھا۔ پھر کیونکر ممکن تھا کہ وہ ۹ - نومبر کے واقعات اس سے پوشیدہ رکھے۔

جو شکوک خاوند کی طرف سے اس کے دل میں بیٹھ چکے تھے۔ اس نے ان کو دل سے محو کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ وہ رہ رہ کر سوچ رہی تھی کہ اس لڑکی کا یہ سوال پوچھنے سے کیا مطلب ہے ؟ معلوم ہوتا ہے یہ لڑکی خود سب کچھ جانتی ہے۔ ورنہ وہ مجھے اس سے پوچھنے کا مشورہ کیوں دیتی ؟

اس نے خود بھی اس دن کی شام کے متعلق سوچنے کی کوشش کی لیکن اس کو کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ نومبر کے تمام دن ایک جیسے معلوم ہوتے تھے وہ نو۔ آٹھ۔ دس نومبر میں تمیز نہ کر سکتی تھی۔ وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔

اس کے دل سے پھر آواز آئی "تم ان دونوں میں تمیز نہیں کر سکتیں کیونکہ تمہارا دل آئینہ کی طرح صاف ہے۔ تمہارے دل میں کسی قسم کی کدورت نہیں اس لئے تم ان دونوں میں تمیز نہیں کر سکتی ہو"

سائمن جب عدالت سے واپس آیا تو اس نے اپنی بیوی میں خاص تغیر دیکھا۔ پہلے وہ ہمیشہ چہکتی رہتی تھی۔ آج خاموش تھی اور اس کی طرف ترچھی نگاہوں اور پرمعنی انداز سے دیکھ رہی تھی۔

سائمن کو حیرت ہوئی۔ اس نے پوچھا کیا بات ہے ؟ مغموم کیوں نظر آتی ہو ؟ کیا کوئی تکلیف ہے ؟"

وہ یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ اسے اپنے شوہر پر کسی قسم کا شک ہے۔

"کچھ نہیں" اس کی بیوی نے جواب دیا اور دردِ سر کا بہانہ کر کے پلنگ پر لیٹ گئی۔

سائمن کو اور بھی تعجب ہوا۔

۱۶ مارچ

ناشتے کے وقت مسز شائر کے چہرے سے گھبراہٹ کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے تمام رات کروٹیں بدل بدل کر کاٹی ہے۔

سائمن نے ہمدردی سے کہا: "دیکھو کتنی کمزور نظر آتی ہو تمہارے لئے تبدیلی آب و ہوا اشد ضروری ہے۔ اب کہو جنوبی فرانس کی طرف جانے کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے "

"کیا آپ بھی ساتھ چلیں گے ؟"

"میں نہیں جا سکتا۔ اس سال مجھے کام زیادہ ہے "

اس کی بیوی کے دل میں خیال آیا کہ میرا شوہر کسی خاص وجہ سے یہاں رہنا چاہتا ہے۔ ممکن ہے اس میں وہی راز مضمر ہو جس کے متعلق مجھ سے کسی لڑکی نے فون پر کہا تھا۔ وہ اور بھی پریشان ہوگئی۔ اس کا جی چاہتا تھا پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔

اسی اثنا میں کسی نے اس کو ٹیلیفون پر بلایا۔ ایک لڑکی کی آواز آئی "آپ کی بات سن کر وہ آپے سے باہر تو نہیں ہوگئے تھے۔ آپ بھولکر بھی ایسی باتوں میں نہ آئیں۔ اور اس سوال کا صحیح۔ درست۔ صاف جواب حاصل کرنے کی کوشش کریں"

مسز شائر کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اس نے رسیور کو میز پر دے مارا اور کرسی پر لیٹ گئی۔

اس کا خاوند دوڑتا ہوا آیا "کیا بات ہے۔ کچھ تو ـــــــ"

وہ اس کے قریب آکر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کے رخسار زرد پڑ گئے تھے

اور وہ ٹھنڈے ٹھنڈے سانس لے رہی تھی۔

"سائمن" اس نے منت آمیز لہجہ میں پوچھا "تم ۹۔ نومبر کو شام کے وقت کہاں تھے اور اُس وقت تمھارے ہمراہ کون تھا؟"

"تم کس قسم کی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو؟" اس کے خاوند نے متعجبانہ نگاہ ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

اس کی بیوی نے سنی اَن سنی کر دی اور پھر وہی سوال دریافت کیا "بتاؤ نا! تم ۹۔ نومبر کو کہاں تھے؟"

"میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ اس بات کو اتنا عرصہ گزر گیا ہے کہ مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔ یہ فضول سوال کس نے تمھارے دماغ میں بھر دیا ہے"

"مانا کہ یہ فضول سوال ہے۔ مگر تم اس کا جواب کیوں نہیں دے دیتے معمولی بات ہے؟"

"لیکن ۹۔ نومبر کیوں؟ یکم اپریل کیوں نہیں"

"کل ایک لڑکی نے مجھے ٹیلیفون پر بلاکر تم سے یہ سوال پوچھنے کو کہا تھا اس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تمھارا شوہر اس کا جواب نہ دے گا بلکہ ٹال دے گا کہ مجھے بالکل یاد نہیں"

"لیکن ——— سائمن نے غصہ میں آتے ہوئے کہا۔

"یہی تو میں محسوس کرتی ہوں" اس کی بیوی نے بات کاٹتے ہوئے جواب دیا "یہ سوال فضول معلوم ہوتا ہے۔ میں نے اسے اپنے دل سے محو کرنے کی کوشش کی مگر ناکامیاب رہی۔ میرے دل میں اس لڑکی کے طعن آمیز الفاظ رہ رہ کر چبھ رہے ہیں۔ میں خود نادم ہو رہی ہوں ——— مگر اپنے دماغ سے وہ شکوک رفع نہیں کرسکتی۔ اب بھی اسی لڑکی نے مجھے ٹیلیفون پر بلاکر کہا ہے کہ تمھارا شوہر طرح طرح کے بہانے بنائے گا اور کہے گا اس بات کو عرصہ گزر چکا ہے۔ اب مجھے کیا معلوم میں اُس دن کہاں تھا اور میرے ساتھ کون تھا؟"

"ارے تم ایک اجنبی احمق لڑکی کا اعتبار کرسکتی ہو کیا ———"

"اس لڑکی کے اس سوال میں کوئی راز ہے اور سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اسے معلوم ہے کہ تم ۹۔ نومبر کو کہاں تھے۔ تم بجائے غصہ ہونے کے میرے سوال کا جواب دو اور معاملہ کو ختم کر دو"

"تم کس طرح امید کرسکتی ہو کہ میں اتنا پرانا واقعہ یاد رکھ سکتا ہوں ———"

"اس لڑکی نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم بہانے بناؤ گے"

"کیا تم بتا سکتی ہو کہ تم ۹۔ نومبر کو کہاں تھیں"

"میں نے لاکھ کوشش کی کہ کچھ سوچ سکوں مگر میری قوتِ حافظہ کام نہیں کرتی"

"اگر تمھیں مجھ پر اتنا ہی شک ہے تو اس لڑکی سے خود ہی پوچھ لو اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ جو کچھ کہے گی وہ غلط اور افترا ہوگا۔ یقیناً اسے مجھ سے کوئی دشمنی ہے" یہ کہہ کر سائمن باہر چلا گیا۔

۱۹۔ مارچ

اس کے بعد کوئی گفتگو نہ ہوئی۔ سائمن اور اس کی بیوی میں نفرت بڑھنے لگی۔ پہلے کی محبت خدا جانے کہاں چلی گئی۔

کبھی کبھی سائمن کی بیوی اپنے شکوک پر نادم بھی ہو جاتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنے شوہر سے معافی مانگ لے مگر ایک آواز تھی جو اس کے دل کی گہرائیوں سے اُٹھتی تھی اور اس کا ارادہ بدل دیتی تھی۔ سائمن خود بھی حیران تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ کس طرح اپنی بیوی کے دل سے یہ شکوک نکال دے اس پر یہ اچھی طرح واضح تھا کہ انھیں جاودانی خوشی کبھی حاصل نہیں ہوسکتی جب تک کہ یہ معلوم نہ ہو جائے کہ ۹۔ نومبر کو کون سے واقعات ظہور پذیر ہوئے تھے لیکن یہ ایسا راز تھا کہ کسی طرح کھلتا نہ تھا۔

وہ لڑکی ہر روز مسز شائر کو ٹیلیفون پر بلاتی اور اسے مجبور کرتی کہ وہ صداقت معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ وہ اسے یہ بات فراموش نہیں ہونے دیتی تھی۔

ایک دن ٹیلیفون پر اس لڑکی کا پیغام آیا جو پہلے تمام پیغامات سے مختلف تھا۔ پیغام یہ تھا:

"اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ آپ کا شوہر ۹۔ نومبر کو کہاں تھا۔ تو کل بوقت گیارہ بجے سٹون بلڈنگ لنکن ہوٹل میں تشریف لائیں"

مسز شائر نے وہاں جانے کا تہیہ کر لیا کیونکہ وہ ہر ایسا کام کرنے کے لئے تیار تھی جو اس معاملے کو اختتام تک پہنچا دے جس سے اس کی روح مسرت حاصل کرسکے۔

جب وہ دوسرے دن سٹون بلڈنگ میں پہنچی تو اس کا شوہر بھی وہیں موجود تھا۔ مسز شائر سمجھ گئی کہ جس نے مجھے یہاں بلایا ہے۔ اس نے اس کو بھی بلایا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف خاموشی سے دیکھتے رہے۔

"لارڈ" ریگل تھیٹر کی پروگرام تقسیم کرنے والی لڑکی نے جو دیوار کے

پیچھے مسز شائر کا انتظار کر رہی تھی اور اس کے آنے پر سائمن کے بالمقابل آ کر کھڑی ہو گئی تھی کہا۔ "آپ کا فیصلہ غلط تھا"۔

خاوند۔ بیوی۔ دونوں اس لڑکی کا منہ تکنے لگے۔

"مجھے آپ بھول گئے ہیں" لڑکی نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا "کیا آپ کو یاد نہیں۔ گزشتہ سال ہی ستمبر میں بطور ایک صفائی کے گواہ کے آپ کے سامنے پیش ہوئی تھی۔ اور آپ نے مجھ سے سوال کیا تھا کہ تم ۱۲ ار جولائی بروز جمعہ دوپہر کے وقت کہاں تھیں اور جب میں نے جواب دیا کہ مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ کیونکہ اس بات کو کافی عرصہ گزر چکا تھا تو آپ نے جیوری کو ایک خاص اشارہ کیا تھا جس کی وجہ سے مجھ سے منسوب شدہ شخص کو چھ ماہ قید با مشقت کی سزا ہو گئی لیکن اس وقت آپ کی باری تھی اب میری باری ہے، جب چارلی اپنی سزا کے چھ ماہ گزارنے کے بعد جیل سے رہا ہو گیا۔ تو اس نے میری ذرا پروا نہ کی۔ اس نے کہا" بس اب ہماری تمہاری نبھ چکی۔ اُس وقت مجھے خیال آیا کہ آپ نے ایک فضول سوال پوچھ کر میری زندگی تباہ کر دی۔ تب جوش غضب میں میں نے عہد کر لیا کہ آپ کی زندگی بھی تباہ کر کے چھوڑوں گی۔ میں آپ سے ایسا انتقام لوں گی جو آپ کو ساری عمر نہ بھولے۔ میں دیکھوں گی آپ کس طرح اُن سوالات کا جواب دے سکیں گے۔ جن کے جوابات کی توقع کرنا ناممکن ہے۔ چنانچہ میں نے آپ کی بیوی کے دل میں زہر کے بیج بو دیئے اور نتیجہ وہی نکلا جو میں چاہتی تھی لیکن اب میری اور چارلی کی پھر صلح ہو گئی ہے۔ اب ہم پھر شادی کرنے والے ہیں ——— دیکھئے آپ دونوں میں سے کوئی بھی نہیں بتا سکتا کہ آپ ۹۔ نومبر کو کہاں تھے؟"

اب بھی وہاں اسی طرح ویسی ہی خاموشی طاری تھی۔ پُرسحر ہیبت ناک مسلسل۔

لڑکی نے ایک قہقہہ لگایا اور ایک ہینڈ بیگ کھولا۔ "یہ دیکھئے" اس نے کہا "شاید اس سے آپ کو کچھ واقفیت مل سکے"

اس نے فائل سے ریگل تھیئٹر کے دو ٹکٹ نکالے جن پر C11 اور C12 نمبر درج تھے اور ۹۔ نومبر کی مہر لگی ہوئی تھی اور کہا "جو سوال آپ نے اُس دن مجھ سے عدالت میں پوچھا تھا آج میں نے اس کا جواب دے دیا"

میاں بیوی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرائے +

روشن لال روشن نکودری

تمہیں یاد ہے؟

اے میری جائے پیدائش!
تیری شیریں یاد کے نقوش میرے دل پر کتنے گہرے نقش ہیں!

میری بہن!
کتنے اچھے وہ دن تھے۔
جو ہمارے پیارے ملک فرانس میں گزرے؟
تمہیں یاد ہے نا
کہ اس چھوٹے سے کچے مکان میں
ہماری ماں ہم دونوں کو سینہ سے چمٹا لیتی تھی
اور ہم اس کے بالوں کو۔
لمبے اور سنہری بالوں کو ——
چوما کرتے تھے!
بہن! تمہیں یاد ہے وہ قلعہ
دریائے ڈوور کے کنارے پر
اور وہ پرانا مینار جس پر گھنٹے بجا کرتے تھے۔ صبح کی واپسی کے اعلان کے لئے!
اور تمہیں یاد ہے وہ خاموش جھیل
جس کی ساکت سطح آب کو
پرندے چومتے ہوئے گزر جاتے تھے!
اور تمہیں یاد ہے وہ ہوا
جو مغرور درختوں کے سر جھکا دیتی تھی
اور غروب آفتاب کا وہ دلکش نظارہ جھیل کی ساکت سطح آب پر!
آہ! مجھے اب کون واپس دے گا میری بہن!
وہ پہاڑ، اور سر بلند درخت!
جن کے خیال سے میرے دل میں ایک درد ہوتا ہے۔
ایک ٹیس اٹھتی ہے
اے میرے ملک فرانس!
تیری شیریں یاد کے گہرے نقوش
میرے دل پر ہمیشہ ثبت رہیں گے!

(ترجمہ) ایم بقابا

غزل

پھر مجھے عیش کا پیغام سنا دے ساقی
پھر کوئی ساغرِ اندوہ رُبا دے ساقی

بھول جاؤں غم و آلام ہمیشہ کے لئے
آ، مجھے ہوش سے بیگانہ بنا دے ساقی

مجھ کو انجام کی مطلق کوئی پروا نہ رہے
غمِ فردا کو مرے دل سے بُھلا دے ساقی

تجھ کو تسخیرِ دو عالم کوئی دشوار نہیں
اک ادائے نگہِ مست دکھا دے ساقی

دیکھنا ہے تری اعجاز نگاہی کا اثر،
آج کونین کو نظروں سے گرا دے ساقی

مجھ کو آزادیٔ فطرت کا یقیں ہو جائے
پردۂ وہم نگاہوں سے ہٹا دے ساقی

نگہِ لطف کو اک جنبشِ ادنیٰ دے کر
کلفتِ گردشِ ایام بھلا دے ساقی

اپنی ہستی کی حقیقت کی قسم دیتا ہوں
آج ہر خوف مرے دل سے مٹا دے ساقی

تیرے مستوں کا کہیں فرق نہ رسوا ہو جائے
اور کچھ قیدِ تعیّن کو بڑھا دے ساقی

رندی و زہد کی تفریق مٹا دے یکسر
دین و دنیا کی کشاکش سے چھڑا دے ساقی

تشنگی دل کی بجھائے نہ بجھے گی تجھ سے
ہاں، جو ممکن ہو تو اک آگ لگا دے ساقی

ذرّے ذرّے کی زباں پر ہو گواہی تیری
چپّے چپّے پہ مے فیض بہا دے ساقی

خس و خاشاک بہم نغمہ سرا ہو جائیں
جوشِ مستی سے جہاں بھر کو جگا دے ساقی

مجھ کو اس کشمکشِ زیست سے چین آ جائے
کوئی گزرا ہوا افسانہ سنا دے ساقی

تجھ سے نسبت ترے حرماں کے لئے کافی ہے!
یہ ترا فیض، پلاتا ہے، پلا دے ساقی

حرماں خیرآبادی

ڈونا جُلیانہ

تعارف | ڈونا[1] جلیانہ کا نام تاریخ میں غیر معروف ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ ڈونا اٹھارہویں صدی عیسوی کے ہندوستان کی ایک ممتاز عورت ہے جس زمانہ میں ڈچ سپاہ نے کوچن کے بندرگاہ پر قبضہ کیا ہے۔ ڈونا کا باپ جس کا نام اگاسٹنو ڈیاس[2] ڈیکاسٹا تھا۔ کوچن میں تجارت کرتا تھا اور طبقۂ تجار میں ذی حیثیت خیال کیا جاتا تھا۔ وہ پرتگالی تھا۔ سقوطِ کوچن نے اس کو تباہ و برباد کر دیا۔ سامانِ تجارت۔ گھر بار سب لوٹ لیا گیا۔ اور وہ دنیا میں نانِ شبینہ کو محتاج زندہ چھوڑ دیا گیا۔ آخر کار عسرت سے تنگ آ کر وہ گوا آیا۔ مگر جب یہاں بھی قسمت نے یاوری نہ کی تو بنگال کا رُخ کیا۔ بنگال سے آگرہ پہنچ گیا۔ اور نہ معلوم کس طرح سے دربارِ شاہی میں رسوخ پا کر منصب داری کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہو گیا مشہور رہے کہ ڈی کاسٹا کو کچھ فنِ طب میں بھی دخل تھا اور ولایتی جڑی بوٹی سے علاج کرنا جانتا تھا۔ یہ زمانہ اورنگ زیب کا تھا جو کمال کی قدر جانتا تھا۔ شہنشاہ نے شہزادہ[3] اعظم کے درباری طبیب کی خدمت اس کو سپرد کر دی جلیانہ جو غالباً بن ماں کی لڑکی تھی باپ کے ساتھ تھی اور جہاں تک تاریخ سے پتہ چلتا ہے جوان تھی۔ اس کے بعد بہت انقلابات ہوئے۔ شہزادہ معتوب ہوا اور نظر بند کر دیا گیا اور ڈیکاسٹا شاہی عساکر کے ساتھ مہم دکن پر بھیج دیا گیا۔ جہاں وہ محاصرۂ گولکنڈہ میں مقتول ہو کر کام آ گیا۔ شہنشاہ نے باپ کی وفاداری کا صلہ دختر کو یہ دیا کہ اس کو شاہی محلات کی طبیبہ مقرر کر دیا۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جلیانہ نے باپ سے طبابت کو حاصل کیا تھا۔ اور وہ خود بھی مریضوں کا علاج کر سکتی تھی۔ مرتے دم تک جلیانہ اس عہدے پر عزت کے ساتھ مقرر رہی اور اس نے اپنے کسی فعل سے اُس وقار کو جو اس کو دربارِ شاہی میں حاصل ہو گیا تھا کم نہ ہونے دیا۔

[1] DONA JULIANA

[2] AGOSTINO DIAS DA CASTA

[3] بہادر شاہ ۱۷۰۷ء سے ۱۷۱۲ء تک۔

تذکرہ نگاروں کی متضاد روایات | جو یورپین مورخین اکبر اعظم کی ایک مسیحی بیگم کے وجود کے قائل ہیں ان کی رائے میں ڈونا جلیانہ اکبر کی سالی تھی۔ یہ سراسر لغو و بے بنیاد ہے۔ کیونکہ نہ اکبر کی کوئی مسیحی بیوی تھی اور نہ سالی[1]۔

ایک شخص اسمٰعیل[2] گریسس نے جو گوا کا رہنے والا تھا۔ انگریزی میں ایک کتاب[3] لکھی ہے جس میں وہ ڈونا جلیانہ کو ان دو لڑکیوں میں سے ایک بتلاتا ہے جو لسبن دار السلطنت پرتگال کے یتیم خانہ سے وسط سولھویں صدی عیسوی میں ہندوستان بھیجی گئی تھیں لیکن ڈاکٹر ووگل[4] جس نے ڈچ سفیر متعینہ لاہور ۱۹۱۱-۱۲ء کے تذکرہ کا ترجمہ کیا ہے۔ اور تذکرہ مذکور تاریخی نقطۂ نظر سے بہت مستند و معتبر ہے ڈونا کے صحیح واقعات کو ہمارے پیش نظر کر دیتا ہے۔ اس موقع پر تذکرہ کا حسبِ ذیل اقتباس بہت مفید ہوگا۔ اور اس سے نہ صرف ڈونا بلکہ کثیر التعداد مسیحیوں کا وجود دربارِ شاہی میں ثابت ہو سکے گا۔ بادشاہ اس وقت شالامار باغ میں فروکش تھے۔ وہ لکھتا ہے:۔

> "شالامار میں سفارت کا خیر مقدم ایک منصب دار نے کیا جو چند نفیس تحائف اور گھوڑے اپنے ساتھ لایا تھا۔ یہ تحائف لیڈی ڈونا جلیانہ نے بھیجے تھے جو شاہی محلات کی طبیبہ اور دربارِ مغلیہ کی ایک ممتاز خاتون تھی۔ دوسرے دن مسٹر مارٹن شاہی طبیب مع تیس مسیحیوں کے آ کر ملے۔ ان کے ساتھ چھ سو سوار اور چھ سو پیادے تھے۔"

اب جلوس روانہ ہوتا ہے:۔

[1] میں نے اپنے مضمون "اکبر کی مسیحی بیگم" میں یہ ثابت کیا ہے کہ اکبر کے کوئی مسیحی بیوی نہ تھی۔

[2] ISMAIL GRACIAS

[3] (A PORTUGESE LADY AT THE COURT OF THE GREAT MOGOL

[4] DR. VOGEL

"آگے آگے سات ہاتھی تھے جن پر طلائی ہودج اور زرنگار جھولیں پڑی ہوئی تھیں۔ ہر ہاتھی پر ایک یوروپین سپہ سالار اور ایک رومیلا بندوقچی بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد نقارچی تھے اور ان کے ساتھ سات عربی گھوڑے جو شہنشاہ کے لئے تحفہ تھے۔ بعدہٗ دو چار گھوڑوں کی نفیس پالکی گاڑیاں تھیں جو شاہی محلات کی سواری کے لئے بھیجی گئی تھیں۔ ان گاڑیوں میں بیش قیمت تحائف کے صندوق لدے ہوئے تھے۔ یہ سب سامان براہِ راست یورپ سے بادشاہ کے لئے آیا تھا۔ چار گھوڑوں کی گاڑی میں ارمنی بشپ اور پادری سوار تھے۔ جن کے جلو میں تیس سپاہی مسلح سوار زرق برق وردیاں پہنے چل رہے تھے۔ ان کے پیچھے اونٹوں کی ایک لانبی قطار تھی جن میں کچھ پر طبل و نقارے تھے اور کچھ پر تحائف کے صندوق۔ اونٹوں کی حفاظت کا گارد ۲۴ ردسیلہ تلم برداروں اور ۳۰ ڈچ شہسواروں پر مشتمل تھا۔ اور ان کے قائد گولفریڈ بائتھرڈ۔ سرجنٹ آٹو وان بلو اور کارپورل آرنلڈ وان سولنز[1] تھے۔ شاہی کیمپ سفارت کی قیام گاہ سے ایک میل کے فاصلہ پر تھا۔ شہنشاہی خیام میلوں تک دریائے راوی کے کنارے کنارے نصب تھے اور ایک عجیب دلفریب شان دار سماں پیش کر رہے تھے۔"

سفارت کا جو حشر ہوا۔ اس سے بحث نہیں۔ اس اقتباس میں مفید مطلب صرف ڈونا جلیانہ کا ذکر ہے۔ اب اگر تذکرہ کو مستند تسلیم کیا جاوے تو اسمٰعیل گرسیس کا افسانہ ایک صدی پرانا ہو جاتا ہے اور تاریخ کی نظروں سے بے بنیاد ہو کر بالکل گر جاتا ہے۔ نتیجہ اس بحث کا یہ نکلا کہ ڈونا کا وجود اٹھارہویں صدی عیسوی میں تھا۔ نہ کہ سترھویں یا سولھویں صدی عیسوی کے وسط میں۔

ڈونا جلیانہ دربارِ شاہی میں | شہزادہ کی نظربندی کے زمانہ میں ڈونا جلیانہ نے جو خدمات انجام دی تھیں۔ ان کو شہزادہ نے سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد فراموش نہیں کیا اور جلیانہ کا وہ اعزاز کیا جو کسی یوروپین عورت یا مرد کو کبھی دربارِ مغلیہ میں نصیب نہیں ہوا۔ وہ محلات میں خانم صاحبہ کہلاتی تھی۔ اور اس کی تنخواہ ڈھائی ہزار سکۂ وقت[2] تھی لیکن شہزادہ نے مسندِ حکومت پر متمکن ہونے کے بعد اس کی تنخواہ چھ ہزار پانسو سکہ رائج الوقت کر دی تھی۔ تذکرہ میں یہ بھی تحریر ہے کہ اس کا رتبہ محلات[3] کے برابر تھا اور جب اس کی سواری کہیں جاتی تھی تو دو ہاتھی جن پر سرخ نشان اور ان کے شکم میں سفید صلیب بنی ہوتی تھیں جلو میں رہتے تھے۔ اس کو مخصوص اختیارات بھی حاصل تھے منجملہ ان کے ایک اختیار یہ بھی تھا کہ تخمیناً دو سو یوروپین و ہندوستانی مسیحیوں میں سے جو گولہ اندازوں۔ توپچیوں اور انجینیروں پر مشتمل تھے جس کو جی چاہے رکھے اور جس کو جی چاہے برطرف کر دے۔ جان وہو[4] اس کا بھتیجا انجینیر تھا اور تین ہزار پانسو روپیہ سکہ رائج الوقت تنخواہ پاتا تھا۔ وہ محلات میں بہت ہر دلعزیز تھا اور امرا و اعیانِ سلطنت سب اس کا احترام کرتے تھے۔ بادشاہ پر وہ جان و روح سے فدا تھی۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ شہنشاہ اس کو "جلیانہ فدویہ۔ دعا گو" کہا کرتا تھا۔ اس کی مُہر میں بھی جلیانہ سے پہلے "فدویہ بہادر شاہ" کے الفاظ تھے۔ اس کی بہادری کی ایک تمثیل تذکرہ میں درج ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جنگ برادران میں ایک معرکہ کے موقع پر وہ شہزادہ معظم کے ساتھ ہاتھی پر بیٹھی ہوئی تھی اور شہزادے کی نہایت دلیری کے ساتھ حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔

بہادر شاہ کی وفات (۱۷۱۲ء) کے بعد اس نے ملازمت ترک کرنا چاہی لیکن درباری مسیحیوں کے اصرار سے ارادہ کو فسخ کر دیا۔ نئے شہنشاہ نے اس کی کوئی بے حرمتی نہیں کی۔ بلکہ صاحبِ تذکرہ تو یہاں تک مبالغہ کرتا ہے کہ بادشاہ نے اس کو تاج پوشی کا موروثی حق عطا فرما دیا تھا۔

اخلاق و عادات | وہ بڑی مذہبی عورت تھی اور مسیحیت پر مرتے دم تک قائم رہی وہ بہت خوش اخلاق تھی اور ہر شخص سے خندہ پیشانی سے ملتی تھی۔ وہ بہت سخی تھی چنانچہ اس کی سخاوت کے چرچے اس کی موت کے برسوں بعد تک دہلی اور آگرہ میں رہے۔ کسی تذکرہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس کی شادی کسی کے ساتھ ہوئی تھی۔ البتہ اس کی بھتیجی کی شادی فرانسیسی شمشیرزن جنٹل[5] کے ساتھ ہوئی تھی جو ۱۷۶۱ء میں صوبہ دارِ اودھ کی سپاہ میں ایک مشہور کمان دار تھا۔ جلیانہ کی کثیر جائداد دہلی و آگرہ میں ہو گئی تھی۔ اس کا ایک باغ دہلی کے قریب تھا جو "لیڈی جلیانہ باغ" کے نام سے موسوم تھا۔

وفات | ڈونا جلیانہ نے ستتر سال کی عمر میں ۱۷۳۴ء میں انتقال کیا۔ دارالسلطنت

[1] ENSIGN GOLFRIED BYTHARD, SURGENT OTTO VAN BULOW, AND THE CORPORAL ARNOLD VAN SWILLENZ.

[2] اس واقعہ کی صداقت میں کلام ہے ممکن ہے کہ تنخواہ کے بجائے جلیانہ کو جاگیر عطا کر دی گئی ہو جس کی ماہانہ آمدنی چھ ہزار سکہ رائج الوقت ہو۔

[3] یہ بھی قرینِ قیاس نہیں محلات کی طبیبہ کا اعزاز بیگمات کے برابر نہیں ہو سکتا۔ صاحبِ تذکرہ کو صحیح مطالعہ کا موقع نہیں ملا۔ اس وقت اس کی عمر پچپن سال کی تھی۔ لہٰذا اس کی پیدائش تقریباً ۱۶۵۷ء میں ہوئی ہو گی۔

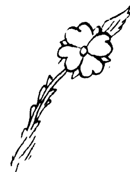
[4] JOHN WILHOE

[5] GENTIL

میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کو اس کی موت پر افسوس نہ ہوا ہو۔ تاریخ محمد یعنی تذکرۂ عہد محمد شاہ" میں اس کا ذکر موجود ہے۔ خود اس کا خویش جنبش اس کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہ پرتگالی نسل سے تھی اور اس کا خاندان ہندوستانیوں سے اختلاط سے محفوظ رہا تھا۔ اس نے مرتے دم تک شادی نہیں کی اور ساری عمر عفت و عصمت سے گزار دی۔ دربار میں اس کا وہ وقار تھا کہ بعض تذکرہ نگاروں کو مغالطہ ہو گیا۔ اور انھوں نے اس کو شاہ عالم کی حرم خیال کیا۔ یہ خیال بالکل غلط و بے بنیاد تھا۔ اور بہادر شاہ کی وفات کے بعد ہی شاید حقیقت کے چہرے سے نقاب اُٹھ گئی اور اس کی پاک دامنی سامنے آگئی۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ بہادر شاہ سے اس کو ایک روحانی محبت تھی اور ہمیشہ اس کا دم بھرا کرتی تھی۔ مرتے دم تک یہ حالت تھی کہ جب اپنے ولی نعمت کا نام آجاتا تو آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔ اور آہ وزاری کا اثر اس قدر ہوتا کہ وہ پہروں کوئی کام کاج نہ کر سکتی۔

مغلوں کی تاریخ بھی گوناگوں واقعات کی بنا پر ایک عجیب و غریب تاریخ ہے۔ اور ڈونا جلیانہ کا دربار شاہی میں وجود بھی تاریخ کا ایک عجیب واقعہ ہے۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ عہد بہادر شاہ اور محمد شاہ کی کوئی عورت خواہ وہ ہندوستانی ہو یا ولایتی ڈونا جلیانہ سے شہرت۔ ناموری۔ عزت و وقار میں گوئے سبقت لے جا سکی ہے۔ وہ دربار میں رہ کر اس پاک دامنی سے اپنی ستر سالہ زندگی گزار گئی کہ برسوں تک دہلی کے بچہ بچہ کی زبان پر اس کی عصمت و عفت کی داستان رہی۔

شہنشاہ حسین رضوی



غزل

نہاں کسی سے وہ مستِ شباب ہو نہ سکا
حجاب لاکھ کیا پر حجاب ہو نہ سکا

تمہاری آنکھ سے ہر چند بجلیاں برسیں
ہمارے داغِ دروں کا جواب ہو نہ سکا

مرا دماغ جو ہے مثلِ بوئے مے آزاد
رہینِ فکرِ عذاب و ثواب ہو نہ سکا

ہمارا شوقِ معاصی ارے معاذ اللہ
تمہارے عفو کا لیکن جواب ہو نہ سکا

ملی نہ داورِ محشر سے داد تک شارق
عذاب میرے گنہ کا جواب ہو نہ سکا

سید ابن حسن شارق دہلوی

گل فروش

جب گل فروش کا بیٹا "میٹرک" پاس کر چکا تو بوڑھے باپ نے بیٹے کے ہاتھ میں ایک سائیکل دے کر یوں کہا "جا بیٹا، نوکری تلاش کر!" بالکل اسی طرح جیسے قرونِ وسطیٰ کا ناول نویس اپنے قصے کے ہیرو کو اپنی محبوبہ کی تلاش میں کسی بے آب و گیاہ خطۂ صحرائی میں چھوڑ دیتا ہے۔ چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی، بے چارے لڑکے کے سائیکل چلاتے چلاتے ٹخنے زخمی ہو گئے، ہونٹوں پر پیپڑیاں جم گئیں، وہ معصوم پھول سا چہرہ کملا گیا، مگر نوکری کہیں نہ ملی، گوہرِ مقصود نہ ہاتھ آیا پر نہ آیا۔

آخر ہار مان کر اور سائیکل کا ہنڈل توڑ کر گلفروش کے بیٹے نے اپنے بوڑھے باپ سے کہا، "ابا نوکری کہیں نہیں ملتی، یہاں تو اس کے لئے بڑے بڑے مارے مارے پھرتے ہیں۔ میں غریب کیا کروں؟"

بوڑھے باپ نے چلم پر سے راکھ جھاڑی اور رک رک کر بولا "کرنا ۔۔۔ کیا ۔۔۔ ہے؟ دکان پر بیٹھ جا ۔۔۔ گلفروش کا بیٹا بھی گلفروش ہے ۔۔۔ پھول بیچ اور گذارہ کر ۔۔۔ مولوی ٹھیک کہتا تھا، اس لونڈے کو انٹرنس کیوں پڑھاتے ہو۔ لمبے بال رکھے گا اور عورتوں کی طرح مانگ نکالے گا، کل سے یہ زلفیں کٹا دے اور ہار بنا! ۔۔۔ سنا تو نے؟"

اتنا کہنے کے پانچ سال بعد بوڑھا گلفروش راہیِ عدم ہوا۔

بوڑھے باپ کے مرنے پر گلفروش نے اپنی دکان انارکلی کی نکڑ پر کر لی۔ انگریزی تعلیم نے اسے جدت پسند بنا دیا تھا۔ اُس نے ہار اور گجروں کے نئے نئے نمونے ایجاد کئے، اور مشہور و معروف فلم ایکٹرسوں پر ان کے نام رکھے، گوہر آبدار، کجن ادا، گل گار ربو، سلوچنا ہار وغیرہ اور بھی کتنے ہی دلربا اور دلکش نمونے تھے جو تعلیم یافتہ طبقوں میں مقبول ہوئے۔ اس کی دُکان بہت چمک اٹھی، اب اس نے ہاتھ بٹانے کے لئے دو تین ملازم بھی رکھ لئے، ریڈیو بھی لگا دیا، اخباروں میں اشتہار بھی دینے لگا، چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

نرگس کا سیزن آگیا ہے۔

ہماری دُکان پر تشریف لا کر نرگسی ہاروں کے "اپ ٹو ڈیٹ" ڈیزائن ملاحظہ فرمائیے۔

گریٹا گاربو کی نئی پکچر کی تقریب پر گل گاربو کے گجرے پہنئے!

پھولوں کے خوشنما آویزے آپ کے حسن کے بہترین محافظ ہیں!

پردے کا خاص انتظام ہے!

گلفروش کی مساعیٔ جمیلہ کا نتیجہ نہایت خوشگوار نکلا، ہار، گجرے، وغیرہ پہننے کا پرانا دستور ہندوستانی سوسائٹی میں از سرِ نو زندہ ہو گیا پہلے تو تہواروں پر بھی لوگ ہار کم پہنتے تھے، مگر اب کلرک، بابو، منشی لوگ دفتر بھی پھول لے کر جانے لگے۔ چنانچہ سیاہی سے گندی میزیں اور قلمدان پھولوں سے سج گئے، دفتر گلستان بن گئے، ہر طرف اک مہک سی اُڑی پھرتی تھی، کالج کے طلبہ نوہاروں کے اس قدر شیدائی ہوئے کہ پھولوں کے ہار بھی اپنی ٹائی یا سوٹ کے رنگ کی مناسبت سے چننے لگے، عورتوں اور پھولوں کا میل تو یوں بھی آنکھوں کو بہت بھلا معلوم ہوتا ہے مگر اب تو حد ہی ہو گئی، اگر ایک خاتون سراپا "نرگس" بنی ہوئی جا رہی ہے، تو دوسری "موتیا کی ڈالی" ایک زعفران زار تھی، تو دوسری دھان کا کھیت، جس کی بھینی بھینی خوشبو اور خوشنما ہریاول آنکھوں کو طراوت بخشتی تھی۔ ہونے کو تو یہ سب کچھ ہوا، لیکن ہندوستان کی ان قدیم روایات کو تازہ کرنے والے کا دل ہمیشہ غمگین و محزوں ہی رہا، نوجوان گلفروش ہمیشہ

یہی سوچا کرتا، کہ اگر وہ پھول نہ بیچتا، تو اس وقت تک کم از کم بی اے پاس کر لیتا، اور پھر اُس کو نوکری کہیں مل ہی جاتی، ـــــ اور پھر اُس کی شادی بھی کسی تعلیم یافتہ حسین لڑکی سے ہو جاتی اور یہ بالکل اغلب تھا لیکن . . . اب . . . اب، وہ لمبے سانس بھرتے ہوئے سوچتا اب اُس کی زندگی اس پھولوں کی دُکان پر ریڈیو سُن کر اور گجرے بیچ کر برباد ہو گئی تھی، اب وہ محض ایک ویران شکستہ، کھنڈراتی زندگی کا مالک رہ گیا تھا، آثارِ قدیمہ کے محکمہ کی طرح تعلیم یافتہ لڑکی تو اُس کے طبقے میں دو ہزار تنبیوں والا بجلی کا قمقمہ لے کر ڈھونڈنے پر بھی دستیاب نہ ہو سکتی تھی اور جو لوگ اپنی لڑکیاں سکولوں اور کالجوں میں پڑھانے تھے غالباً اُن کا یہ منشا ہرگز نہ تھا کہ ان کی لڑکی کسی پھول بیچنے والے کے پلّے باندھ دی جائے، وہ سماج کا اچھوت تھا، ہری جن . . . ہری جن . . . اب ان اونچے طبقے والے لوگوں نے ایک نیا لفظ اسی پرانے خیال کو ادا کرنے کے لئے اختراع کیا ہے، کچھ بھی ہو، وہ اپنی زندگی ایک اجڈ اور پھوہڑ بیوی کے ساتھ نہیں بسر کر سکتا تھا۔ جسے نہ تو باڈیس پہننے کا سلیقہ ہے نہ ساڑھی لگانے کا قرینہ اور نہ ہی اخبار پڑھنے کی عادت جو تمام دن اپنا سر چولھے میں دئے رکھتی ہے۔ اوہ . . . وہ تو کسی "عورت" سے شادی کرنے کا خواہشمند تھا، ایک باورچن سے نہیں! لیکن اس کے باوجود وہ دیگر امور میں ایک سادہ مزاج جوان سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً وہ اپنی بوڑھی ماں کی بہت عزت کیا کرتا تھا اور گو یہ بہت حیرت کی بات ہے۔ پھر بھی یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اُسے اپنے ننھے بھائی سے بہت محبت تھی اور گو وہ ریشم کی خوب صورت قمیصیں پہنتا تھا جن پر لمبی لمبی خوشرنگ دھاریاں ہوتی تھیں اور عطر پھلیل لگاتا تھا، پھر بھی اُسے شراب، سگرٹ اور رنڈیوں سے بہت نفرت تھی، سینما تھیئٹر دیکھنے پر بھی اُس کے چال چلن میں کچھ فرق نہ آیا تھا، اُس کے دوست اکثر اس پر تعجب کا اظہار کیا کرتے، آخر ایک پھول بیچنے والا کیونکر شریف رہ سکتا ہے!

اس کی بوڑھی ماں کو بھی یہی شک تھا، یوں تو وہ اس پر جان چھڑکتی تھی۔ مگر ڈرتی تھی کہ کہیں اس کا "انٹرنس پاس بٹیا" آوارہ نہ ہو جائے، جو نوجوان پھول بیچتا ہو اور سینما دیکھتا ہو اس کے لئے شریف رہنا بہت مشکل ہے، آخر کب تک! اسی لئے بوڑھی ماں اس کی شادی پر مصر تھی، مگر نوجوان گل فروش نہیں مانتا تھا، اُس کے ناتجربہ کار، شاعرانہ دل نے پڑھی لکھی لڑکی کی ایک خیالی حسین مورت بنا رکھی تھی وہ اُسی کو پوجتا تھا اور اسی سے شادی کا خواہاں تھا۔

بس یہی جھگڑا تھا، ماں ایک میٹھی، نرم مزاج، دیہاتی بہو کے حق میں تھیں اور ان کی نگاہ اپنے ہی قبیلے میں ایک قبول صورت، غریب طبیعت لڑکی پر تھی، گلفروش اس کے برعکس ایک ساڑھی نواز، سینما پسند، تیتری کی تلاش میں تھا . . . مگر آہ، یہ وہ تیتریاں تھیں جو اُس کے گلوں پر کبھی بیٹھنا پسند نہ کرتیں، کیا وہ سوسائٹی کا اچھوت نہ تھا . . . محض ایک گلفروش!

~~~~~~~~

ایک سنیچروار کی دل کش شام کا ذکر ہے، اس دن نشاط تھیئٹر میں وکٹر ہیوگو کا لافانی شاہکار "لے مسزرابلز" دکھایا جانا تھا اور گلفروش دُکان کو جلد بند کرنے اور وہاں جانے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ اتنے میں ایک چھوٹی سی "مارس" گلفروش کی دکان کے سامنے آ کھڑی ہوئی اس میں ایک جوان لڑکی اور ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہوئی تھیں، گلفروش دکان کی سیڑھیاں اتر کر موٹر کے قریب گیا اور بوڑھی عورت کو مخاطب کر کے کہنے لگا! "میم صاحبہ، کیا حکم ہے"؟ اس پر جوان لڑکی نے موٹر کا پٹ کھولتے ہوئے کہا "ہمیں کچھ ہار اور گجرے چاہئیں"۔

"آیئے، دُکان کے اندر تشریف لایئے"۔

لڑکی نے بہت سے ہار خریدے، بہت سے گجرے، چند ایک گلدستے، چلتے وقت کہنے لگی، "کل ہمارے ہاں ایک 'ڈانس' ہے بال روم کو سجانا ہوگا، کل اپنے آدمیوں کو ساتھ لے آؤ، کوئی چار بجے شام کو اور دو گھنٹوں میں کام ختم کر دو، ٹھیک ہے"؟

گلفروش نے جواب میں سر جھکایا۔

جب وہ موٹر میں بیٹھ چکی تو نوجوان گلفروش نے پھر جھک کر سلام کیا اور انگریزی میں نوجوان لڑکی سے پوچھا، "سرکار آپ کا پتہ"؟

لڑکی کی آنکھوں میں حیرت کی ایک خفیف سی جھلک، اس کے لبوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، اس نے گردن کو ایک طرف جھٹکا کر کہا "۱۰، فلبش روڈ، پلینز!"

نوجوان گلفروش نے چلتی ہوئی موٹر کو جھک کر ایک فرشی سلام کیا، اور آہستہ سے کہا "۱۰، فلبش روڈ، پلینز!"

~~~~~~~~

اس واقعے کے تین چار روز بعد گل فروش کی بوڑھی ماں کو
محسوس ہوا کہ اس کا بیٹا غیر معمولی طور پر اُداس ہے۔ نہ وہ صرف
کھانا کم کھانے لگ پڑا تھا بلکہ اب وہ اکثر کھانا کھاتے ہوئے منٹوں
ایک طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگ جاتا تھا، ایک نوالہ منہ میں، ایک نوالہ
ہاتھ میں لئے وہ کچھ سوچنے لگ جاتا پھر کچھ یاد آ جانے پر ایک آہِ سرد
بھر کر جلدی جلدی نوالے اٹھانے شروع کر دیتا، کبھی وہ چھپا کی چاندنی
جیسی سہین اور نازک کلیوں کو زریں تاروں میں پروتے ہوئے یکایک
رک جاتا، مسکرا پڑتا۔ پھر یکایک غمگین ہو جاتا، اُس کی موٹی موٹی آنکھوں
میں آنسو چمکنے لگتے اور جب اُس کی ماں اُس سے دریافت کرتی۔ کیا
بات ہے بیٹا؟ تو وہ اس دوسرے سوال کے جواب میں ایک کھسیانی
ہنسی ہنس دیتا اور کہتا کچھ بھی تو نہیں، اماں!

اور اماں دل میں سوچتیں، ضرور کسی لڑکی نے اس کے دل کو
موہ لیا ہے، یا اللہ وہ کون ہو گی؟ ۔ میرے بیٹے کو کیا ہو گیا ہے؟

خود بے چارے گلفروش کو بھی ٹھیک معلوم نہیں تھا کہ اُس
کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، وہ ہر روز حسین عورتیں دیکھتا تھا، اُس نے
تو سینکڑوں کے ہاتھوں میں گجرے پہنائے تھے، نازک اندام کلائیوں
میں گجرے پہننے کے نئے نئے انداز سکھائے تھے، کتنی شوخ نگاہوں
کے وار سہے تھے! ہزاروں متبسم لبوں سے شہد کی طرح میٹھی بولیاں سُنی
تھیں، کسی کے گداز بازوؤں کے سڈول پن نے اُسے اتنا متاثر نہ
کیا تھا، اور قوس قزحی ساڑھیوں کے خوشنما رنگ اُس کے معصوم
دل پر ہمیشہ سائے کی طرح گزر جاتے تھے، لیکن اب یکایک یہ کیا ہو
گیا تھا۔ ۔ ۔ جب بال روم کو سجاتے وقت وہ بھی اس کے پاس
آ کر ایک دم کے لئے کھڑی ہو گئی تھی تو اس کی آنکھیں کیوں جھپک
گئی تھیں، سانس کیوں ایک لمحے کے لئے رک گئی تھی اور جب وسطی
فانوس کو لمبے لمبے ہاروں سے مزین کرتے وقت اُس کی انگلیاں اُس کے
ہاتھوں سے چھو گئی تھیں، تو اُس کی رگوں کا خون کیوں ایک آتشیں سیال
بن گیا تھا، اور پھر ۔ ۔ ۔ جب ۔ ۔ ۔ اُسے بال روم سجاتے دیکھ کر وہ
ایک دم پیانو کی طرف چلی گئی تھی تو وہ کیوں یکایک بے تاب ہو گیا تھا
اور یہ کس قدر عجیب احساس تھا کہ اُسے پیانو بجاتے دیکھ کر اُسے معلوم
ہوا کہ کسی نے گویا اس کے دل کی تاروں پر اپنی انگلیاں رکھ دی ہیں
اور اُن میں سے ایک رنگین و حزیں نغمہ پیدا ہو گیا ہے۔

شاید یہی احساسِ محبت تھا، وہ احساس جو عمر میں صرف ایک
بار پیدا ہوتا ہے، شاید اسی لئے گلفروش کی آنکھوں میں آنسو بھر
آئے تھے، اور اس نے جلدی سے ایک کونے میں جا کر اپنے آنسو
پونچھ ڈالے تھے،

اس امر کا صحیح اندازہ لگانا گو مشکل ہے کہ لڑکی کے دل پر گلفروش
کے جذبات نے غیر شعوری طور پر کیا تاثرات پیدا کئے، مگر یہ کہنے میں تو
ذرا تامل نہیں، کہ اب وہ اکثر اُس کی دکان پر آیا کرتی تھی، پھولوں کے
آویزے خریدنے کے لئے، گلدستے، گجرے پسند کرنے کے لئے لیکن
یہ تو ایک اتنی معمولی سی بات تھی جسے کوئی وقعت نہیں دی جا سکتی تھی،
کالجوں کی کتنی ہی لڑکیاں روزانہ گلفروش کی دکان پر آیا کرتی تھیں،
لیکن اس کا مطلب یہ کیسے لیا جا سکتا ہے کہ وہ سب گلفروش سے محبت
کرتی تھیں، پھولوں سے محبت کرنے کا نتیجہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ باغ کے
اجڈ مالی سے محبت کی پینگیں بڑھائی جائیں، ایسی حماقت کون کرے
گا؟ اور صنفِ نازک تو ایسے معاملوں میں ہمیشہ مردوں کے مقابلے میں زیادہ
دانشمندی کا ثبوت دیتی ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ گلفروش کبھی عقلمند تھا،
لیکن اب تو نہ جانے اُس کی عقل پر کیا پردہ پڑ گیا تھا، جب وہ سفید ساڑھی
باندھے ہوئے دکان میں داخل ہوتی تو اس کا دل خوشی سے زور زور
سے دھڑکنے لگتا، وہ سمجھتا کہ وہ خفیف سی مسکراہٹ جو اس کے رنگین
لبوں پر کبھی کبھی آ جاتی تھی صرف اُسی کے لئے تھی، اُس کی صندلی کلائیوں
میں پڑی ہوئی نقرئی چوڑیوں کی میٹھی جھنجھناہٹ اُسی کے کانوں کے
لئے پیدا ہوتی تھی، اور سفید ساڑھی میں چھپے ہوئے کانوں میں گلاب کے
پھولوں کے جھلملاتے ہوئے سرخ سرخ آویزے شاید اسی کی حریص
نگاہوں کے لئے پہنے جاتے تھے۔ شاید؟ ۔ ۔ ۔ وہ کبھی کبھی خیال کر
لیتا کہ وہ یقیناً اس سے محبت کرتی ہے، کبھی کبھی اندھیری رات میں جب
کوئی اُسے دیکھ نہ سکے، اُس کی کوٹھی کے گرد چکر لگاتا اور مغربی سمت
کے ایک کمرے میں روشنی دیکھ کر خوش ہوتا اور پھر جب کبھی ایک چھریرا
سا سایہ اُس روشنی میں ایک طرف سے ہو کر دوسری طرف کو گزر جاتا
تو اُس کے دل کی حرکت یک بارگی تیز ہو جاتی اور وہ یکایک بجلی کے
کھمبے کا سہارا لینے کی ضرورت محسوس کرتا، پھر وہ دیر تک کھڑکی کی طرف
ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہتا حتیٰ کہ روشنی بجھ جاتی اور اس کے دل میں ایک

اندھیرا سا چھا جاتا اور وہ گھبرائے ہوئے مسافر کی طرح جو اپنا راستہ بھول گیا ہو گھر کی راہ لیتا۔

اور اماں بے چاری دل میں روز کڑھتیں، ہائے اللہ میرے بیٹے کو کیا ہو گیا ہے؟ رات دن کس فکر میں غلطاں رہتا ہے، کہیں کسی کی نظر تو نہیں لگ گئی، کوئی آسیب؟ . . . پھر یکایک اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیتی اور سر جھکا کر چادر کاڑھنے لگ جاتی۔

اسی طرح چھ مہینے گزر گئے۔

ایک ابر آلود شام کو وہی موٹر جو آئی تو گلفروش نے دیکھا کہ بوڑھی عورت اکیلی بیٹھی تھی، گل فروش کے جھک کر سلام کرنے پر بوڑھی عورت نے مسکراتے ہوئے کہا "کل دن کو بہت سے پھول اور ہار وغیرہ درکار ہوں گے اور رات کو کوٹھی بھی سج جائے . . ."

بہت اچھا سرکار، گلفروش نے یہ کہہ کر ایک تیز نگاہ موٹر کی خالی سیٹ پر ڈالی،

بوڑھی عورت نے پھر مسکرا کر کہا "کل مس ہرمز جی کی شادی ہے نا، بہت سے پھول چاہئیں"۔

موٹر چل دی، غریب گلفروش سر جھکائے رہ گیا۔

دوسرے دن گلفروش کو ایسا معلوم ہوا کہ اُسے ہلکا سا بخار ہے۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ مگر اُسے آج تو بہت کام کرنا تھا، وہ بہت سویرے اٹھا اور دُکان پر چلا گیا، آج وہ نہایت تیزی سے کام کر رہا تھا، اس کی محبوبہ کی شادی تھی! آج اُس نے وہ وہ خوب صورت ہار اور گجرے تیار کئے جو اس سے پہلے کبھی نہ کئے تھے آج اس کی محبوبہ کی شادی تھی!! اُس نے پھولوں کو زریں تاروں میں الجھا کر نازک چادریں بنائیں حسین گلدستے، کلیوں کے چندن ہار تیار کئے اور موتیا کے نیم وا پھولوں سے ایک خوب صورت مُکٹ تیار کیا۔ آج اُس کی محبوبہ کی شادی تھی!!!

گلفروش نے کوٹھی کا کونہ کونہ پھولوں سے سجا دیا، وہ آج نہایت انہماک سے کام کر رہا تھا۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر، بھاگا پھر رہا تھا، اپنے ملازموں کو ہدایات دیتا جاتا تھا، کتنی گہما گہمی کتنی رونق تھی! بوڑھی عورت مسکراتی ہوئی اِدھر سے اُدھر نکل جاتی اور ایک سفید داڑھی والا گوری رنگت کا آدمی پہیوں والی آرام کرسی میں بیٹھا ہوا کرسی کو ہنڈل گھما کر اِدھر اُدھر دھکیلتا ہوا لے جا رہا تھا، ایک کمرے میں اُس نے اپنی محبوبہ کو بھی دیکھا تھا، وہ اپنے قبول صورت بھائی کے پاس بیٹھی ہوئی جھکی ہوئی آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھی اور پھر وہ دونوں آہستہ سے ہنس پڑے تھے، بھلا اُسے دیکھ کر وہ گھبرا کر کیوں کھڑی ہو گئی تھی! ایک لمحہ —— صرف ایک لمحہ کے لئے گلفروش نے اُسے ملامت بار نگاہوں سے دیکھا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا، کیا لڑکی کے نازک رنگیں لب نرگس کی طرح زرد نہ ہو گئے تھے اور کیا گلفروش نے واقعی اُس کی نگاہ کی خطاواریاں دیکھ لی تھیں؟ شاید یہ اُس کا وہم ہی تھا، کیونکہ دوسرے لمحہ ہی میں وہ اپنے بھائی سے باتیں کرنے میں مشغول ہو گئی تھی۔

کام کرتے کرتے شام ہو گئی، آسمان پر تارے نکل آئے، کوٹھی میں برقی قمقمے روشن ہو گئے، آج دن بھر سے گلفروش بھوکا تھا، بھوکا؟ نہیں۔ اُسے بھوک لگی ہی نہ تھی، اب اُس کا کام ختم ہو گیا تھا۔ کوٹھی سج چکی تھی، بینڈ بج رہا تھا، گلفروش باغ کے ایک کونے میں بیٹھ کر سوچنے لگا کہ وہ کدھر جائے؟ اُسے چاروں طرف اندھیرا نظر آ رہا تھا، اُس کا دل بیٹھا جا رہا تھا، . . . وہ جانے سے پہلے اپنی محبوبہ کو ایک لمحہ کے لئے دیکھ لینا چاہتا تھا، اُس نے ایک نیلے سے رومال میں موتیا کے پھولوں کا بنا ہوا مکٹ لپیٹ رکھا تھا، کاش وہ اپنے ہاتھوں سے یہ مکٹ اُسے پہنا سکتا اور پھر اُس کے قدموں میں گر جاتا ——
بے وقوف گل فروش!

رات کے نو بجے فلیش روڈ سے موٹریں چلنا شروع ہوئیں آگے آگے نوشہ کی کار تھی پھولوں سے سجی ہوئی اس میں دولہا اور دُلھن بیٹھے تھے، اس کے پیچھے پیچھے بیس تیس موٹریں شور مچاتی ہوئی آ رہی تھیں، فلیش روڈ سے ٹرنگٹن روڈ تک تو لوگوں کا بہت ہجوم تھا بلند قہقہے، اور ہارنوں کے دل خراش نغمے، موٹروں کے انجنوں کی دھیمی آواز اور کسی آوارہ کتے کا بھونکنا . . . خدا خدا کر کے جب ٹرنگٹن روڈ گزر گئی تو موٹروں نے تیز ہونا شروع کیا اور جب فاپ ڈو آ گئی تو نوشاہ کی کار خوشی سے اُڑی جا رہی تھی، یہاں ایک خوشگوار سا اندھیرا تھا، بجلی کے کھمبے بھی دُور دُور تھے اور دو رویہ گھنے درخت

کھڑے تھے۔

یکایک نوشاہ کو سامنے سے ایک شخص بھاگتا ہوا نظر آیا، اُس کے بازو کھلے تھے اور وہ عین موٹر کی سمت دوڑتا ہوا آرہا تھا، نوشاہ نے زور سے ہارن بجائے، نوشاہ نے موٹر کو ایک طرف کرنا چاہا، نوشاہ نے بریک دبائی، مگر آہ یہ سب کچھ بہت دیر سے ہوا، وہ پاگل شخص موٹر کے نیچے آچکا تھا، اُس کی چھاتی اور بائیں بازو سے خون بہ رہا تھا۔

دلہن ایک دلخراش چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔

نوشاہ اور موٹروں میں بیٹھے ہوئے اور لوگ کر بھی کیا سکتے تھے، اُسے اٹھا کر اُسی دم ہسپتال لے گئے، زخمی کو فی الفور آپریشن روم میں لے جایا گیا، باہر کمرے میں سب لوگ بیٹھے ہوئے سوچنے لگے، آہ بے چارے کو بہت چوٹ آئی ہے، وہ کیوں موٹر کے نیچے آ گیا؟ وہ کون ہے؟ کیا وہ بچ جائے گا؟ آخر ایک صدیوں کے لمبے عرصے کے بعد ڈاکٹر باہر آیا اور نوشاہ کو کہنے لگا "آخری لمحوں پر ہے، تمہاری مسز کو بلاتا ہے"

گلفروش بستر پر لیٹا ہوا تھا، چھاتی پر پٹی بندھی تھی جو خون سے سُرخ ہو چکی تھی، لڑکی کو دیکھ کر اس کے زرد چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، اس نے لڑکی کی جانب اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا آہ اس ہاتھ کی لرزتی ہوئی انگلیوں نے اُسی موتیا کے کنٹھے کو تھام رکھا تھا، کنٹھا خون آلودہ تھا، پھول والے نے اپنے پھولوں کے ساتھ خون کی ہولی کھیلی تھی، کس لئے؟ کیا اس ملاقات کے لئے؟ ——

بے وقوف گل فروش!

لڑکی نے ایک قلیل وقفہ کے لئے گل فروش کی طرف دیکھا، پھر اس کا سر اُس کی چھاتی پر جھک گیا اور لڑکی نے دونوں ہاتھ بڑھا کر کنٹھے کو اپنے بازوؤں میں لے لیا، جیسے کوئی کسی معصوم یتیم بچے کو اپنی گود میں لے لے گلفروش کا بازو آہستہ سے بستر پر گر گیا۔ اُس نے اپنی روح کی پوری قوت سے لڑکی کی طرف دیکھا، پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں، شاید وہ کچھ سوچ رہا تھا، اُس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر ایک ہلکا سا تبسم نمودار ہوا، یہ چراغ سحری کی جھلملاتی ہوئی لو تھی۔

گلفروش کا اکھڑا ہوا سانس مدھم ہو گیا، ڈاکٹر نبض پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا، گلفروش کے لب کانپے، ہلکی ہلکی ایک دو ہچکیاں آئیں۔

چراغ بجھ گیا!

لڑکی رونے لگی

"یہ کون تھا؟" ڈاکٹر نے آہستہ سے پوچھا

کوئی اس کے نام سے واقف نہ تھا . . . نوشاہ روتی ہوئی دلہن کو بازوؤں میں تھام کر باہر لے گیا۔

ڈاکٹر نے اپنے شانوں کو ایک خفیف سی حرکت دی اور نرس سے بولا "دوسرا مریض لاؤ!"

دنیا کے اس بھرے ہسپتال میں یہی ہوتا ہے جب ایک مریض مرجاتا ہے تو دوسرا اُس کی جگہ فوراً آجاتا ہے۔

اس حادثے کے چند دنوں بعد گل فروش کا ننھا بھائی اپنی دکان پر (انارکلی کے نکڑ کے قریب) توتلی زبان میں گجرے اور پھول بیچ رہا تھا، اور ایک چھوٹی سی لڑکی اپنے باپ کی انگلی پکڑے ہوئے اُسے نہایت دلآویز لہجے میں مجبور کر رہی تھی کہ وہ اُسے ننھے گلفروش کی دکان سے چنبیلی کے پھولوں کے دو ننھے آویزے خرید دے۔

(طبعزاد)

کرشن چندر ایم اے

آزاد ملاح

مشرق کے دریچہ سے جب سورج صبح سویرے جھانکتا ہے
دریا سے اٹھتی موجوں پر اک رنگیں سایہ کانپتا ہے

سورج کی روپہلی کرنیں میری پیشانی کو چومتی ہیں
آزاد ہوا کے جھونکوں میں نورانی پریاں جھومتی ہیں

جس کشتی میں شب گزری ہے موجوں کے تھپیڑے کھاتی ہے
لہروں کی زد سے بچتی ہے ساحل سے جا ٹکراتی ہے

دریا کی لہروں کے نغمے ایسے سننے میں آتے ہیں
جیسے میری بےفکری کی نیندوں سے وہ شرماتے ہیں

کیا وقت سہانا ہوتا ہے یہ فطرت کے نظاروں کا
ہر موج لئے ہوتی ہے پرتو رخصت ہوتے تاروں کا

میں ایسے میں جاگ اٹھتا ہوں اٹھ کر انگڑائی لیتا ہوں
منظر پہ نگاہیں ہوتی ہیں ہنستے ہوئے کشتی کھیتا ہوں

لہروں کے نغمے سنتا ہوں دریا کو گیت سناتا ہوں
فطرت کی پرستش کرتا ہوں آزاد ترانے گاتا ہوں

میں خود فطرت کا حصہ ہوں آزاد ہوا میں پلتا ہوں
میں طغیانی پر ہنستا ہوں میں طوفانوں سے لڑتا ہوں

منجدھار میں جب لہروں کے طوفاں کشتی سے ٹکراتے ہیں
یہ اونچے اونچے پربت میری ہمت سے شرماتے ہیں

بادل برسے بجلی چمکے طغیانی یا طوفان آئے
ناممکن ہے ماتھے پر بل ہمت میں فرق اک آن آئے

جب بادل گھر کر آتے ہیں میں خوابوں میں کھو جاتا ہوں
کشتی کو بہاؤ پر چھوڑے سستاتا ہوں سو جاتا ہوں

یہ کشتی میری دنیا ہے میں دنیا کا پابند نہیں
ہر چیز میسر ہے مجھ کو سو شکر کہ حاجت مند نہیں

جب تک ہیں توانا یہ بازو میں کشتی کھیتے جاؤں گا
ہر روز نئے منظر ہوں گے آزادی کے گن گاؤں گا

دن رات اسی میں بیتے ہیں دن رات اسی میں بیتیں گے
سب کھیل ہیں یہ آزادی کے کیا ہاریں گے کیا جیتیں گے

بچپن میں فسانے سنتا تھا کس شوق سے ایک جزیرے کے
(پریوں کے جھرمٹ کے جھرمٹ سیلاب زدہ کشتی گھیرے)

اک روز مری کشتی بھی یونہی سیلاب زدہ کہلائے گی
دنیا کے لئے میری ہستی اک افسانہ بن جائے گی

نذیر میرزا برلاس

کیموره

ہندوستان میں بہت کم آدمی کیموره کے نام سے آشنا ہوں گے یہ دنیا میں سب سے زیادہ خطرناک خفیہ سوسائٹی ہے۔ گو پچھلے دنوں میں اس کی سرگرمیاں ایسی زیادہ سننے میں نہیں آئیں۔ لیکن اس کے ممبر بدستور متمول اطالویوں کو جو اٹلی اور ریاستہائے متحدہ یا دوسری جمہوریتوں میں آباد ہیں اپنا شکار بنا کر لوٹ رہے ہیں۔

یہ قدرت کی ایک عجیب ستم ظریفی ہے کہ اس سوسائٹی کی بنا اُن چند مخیر اور متمول ہستیوں نے ڈالی جن کا عندیہ دراصل رہا شدہ قیدیوں کی امداد کرنا تھا۔ ابتدا میں یہ سوسائٹی موسوم بھی، رہا شدہ قیدیوں کی امدادی سوسائٹی کے نام سے تھی۔ لیکن اس وقت اُن ہمدردانِ بنی نوعِ انسان کو کیا علم تھا کہ یہی سوسائٹی کچھ دنوں میں اٹلی کے نامی مجرموں کا اکھاڑہ بن جائے گی۔

قیدی جیل سے رہا ہو کر آتے اور دوبارہ قید ہونے تک اس سوسائٹی کے بانیوں کی سخاوت سے فایدہ اٹھاتے۔ رفتہ رفتہ اس سوسائٹی کے مخلص کارکنوں نے نہایت خلوص نیتی سے اپنے ایک جلسے میں منظور شدہ قرارداد کے مطابق ان رہا شدہ قیدیوں میں سے چند ایک کو اپنی مجلسوں میں شریک ہونے کی اجازت دے دی اور چونکہ وہ چند مجرم اور سزا یافتہ ہونے کے ساتھ ہی ایک اعلیٰ دماغ کے مالک بھی تھے اس لئے انہوں نے ایک قلیل عرصے میں اپنے محسنوں کو نکال باہر کیا اور خود ان کی جگہ پر مسلط ہو گئے۔ جب ایسا کر چکے تو سوسائٹی کے کاغذات سے حاصل کردہ اطلاعات کو استحصال بالجبر کا ذریعہ بنا لیا اور اپنے ایجنٹوں کی وساطت سے جو ہر قصبہ ہر موضع اور ہر شہر میں موجود تھے۔ اٹلی کی تمام تر جرائم پیشہ آبادی کو اپنے حلقۂ اثر میں لے لیا۔

یہ مختصر طور پر اس سوسائٹی کی تاریخ ہے۔ اس سوسائٹی میں داخلہ کے وقت امیدوار کو طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی ہیں اور اس کا خون نکالا جاتا ہے۔ یہ تمام رسوم ایک تجربے میں ادا ہوتی ہیں اور ان کا مقصد امیدوار کی قوتِ برداشت کا امتحان لینا ہوتا ہے۔ اگر اس امتحان میں امیدوار پورا اترے تو سوسائٹی کی طرف سے گویا اُسے اس بات کا لائسنس مل جاتا ہے کہ وہ مجرمانہ زندگی کو اپنا ذریعۂ معاش بنا سکتا ہے، اور سوسائٹی اس کی نگراں ہے۔ پابندی جو عاید کی جاتی ہے۔ وہ صرف یہ ہے کہ اپنی آمدنی کا فی صدی کچھ حصہ سوسائٹی کو باقاعدگی سے ادا کرتا رہے۔

کیموره کی طاقت۔ اقتدار اور دبدبے کا اندازہ ہمیں ونسنزو بوریلی (Vincenzo Boreilli) کی زندگی کے نشیب و فراز سے ہو سکتا ہے اس شخص کو قدرت نے ایک غیر معمولی دماغ ودیعت کیا تھا۔ اس کی علمی استعداد اس بات سے ظاہر ہو سکتی ہے کہ ابھی اس کی عمر پچیس سال سے کم ہی تھی کہ وہ یونیورسٹی کا پروفیسر انتخاب کیا جا چکا تھا۔ لیکن جہاں اس کا دماغ اس پایہ کا تھا۔ اس کی فطرت ابتدا ہی سے چوری کی طرف مائل تھی۔ جب اس کے طالب علموں کی بہت حقیر سی مالیت کی متعدد چوریوں کا سراغ اس تک پہنچا تو اسے بہت بے آبروئی سے یونیورسٹی سے علٰحدہ کر دیا گیا۔ وہ اس وقت سے پانچ سال قبل کیموره کا ممبر بن چکا تھا۔ اب چونکہ اس کا یہ ذریعۂ معاش منقطع ہو چکا تھا اس نے چوری کو جو اس سے پہلے اس کے لئے محض ایک شغل تھا بطور پیشے کے اختیار کرنے کا تہیہ کر لیا۔

بوریلی کے اس اقدام نے اطالوی پولیس میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ روم۔ نیپلز اور دیگر شہروں کی پولیس کو بہت جلد آگاہی ہو گئی کہ دنیائے جرائم میں ایک نہایت خطرناک شخصیت کا اضافہ ہو گیا ہے لیکن اس مجرم کی شناخت جسے ہر دستخط کی نقل اتارنے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ان کے لئے ناممکن تھا اور وہ مجرم بجز بوریلی کے اور کوئی دوسرا نہ تھا۔ بوریلی کی راہ میں جتنی مشکلیں پیش آئیں ان کا دور کرنا کیموره کے ذمے تھا۔ اس کے کارکن اسے تمام ان آدمیوں کے نام اور پتے بہم پہنچاتے جن کا کاروبار روپے کا لین دین تھا۔ یا جن کا بنکوں میں کثیر تعداد میں روپیہ جمع تھا۔ اس کے

ساتھ ہی مختلف کاروباری فرموں اور بنکوں کے نام سے بھی مطلع کرتے۔ ایسا کرنے والے ان متمول آدمیوں کے یا تو نجی ملازم ہوتے یا بنکوں کے کلرک اور مینیجر۔ کیونکہ اس وقت تک اس سوسائٹی میں حکومت کے وزراء، کروڑپتی سوداگر، بنکوں کے مینیجر۔ پولیس کے افسران۔ غرضکہ ہر طبقہ اور ہر خیال کے آدمی شامل ہو چکے تھے اور کہ فی الواقع ایسا ہی تھا۔ اس کے ثبوت کا خود بوریلی کی زندگی کا ایک واقعہ شاہد ہے۔

بوریلی نے رات کی تاریکی میں ایک امریکن کروڑپتی (جو نیپلز کے قرب میں رہتا تھا) کے گھر میں داخل ہو کر اس کی تجوری کھولی اور اپنی پتلون۔ کوٹ۔ واسکٹ قمیص کی جیبیں نوٹوں سے بھر لیں جتنے وقت جتنے زیورات اس کے ہاتھ سنبھال سکتے تھے وہ بھی لے لئے اور نہایت اطمینان سے ٹہلتا ہوا مکان سے نکل کر باہر سڑک پر آ گیا۔ ابھی وہ کچھ دور نہ گیا تھا کہ دو پولیس مینوں نے اُسے پیچھے سے آن دبوچا۔ بوریلی کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ایسی حالت میں یقیناً بدحواس ہو جاتا۔ لیکن وہ انہیں دیکھ کر مسکرایا۔ انہیں کیس کھول کر سگرٹ پیش کئے اور ان کے انکار پر خود سگرٹ جلا کر کہنے لگا "میں کیمورسٹ (یعنی کیمورہ کا ممبر ہوں) تمہیں بھی لازم ہے کہ ہماری جماعت میں داخل ہو جاؤ" ان دونوں پولیس والوں کے لئے بوریلی ایسے مجرم کو گرفتار کرنا بام ترقی و شہرت پر پہنچنے کے مترادف تھا۔ ان میں سے ایک نے جواب دیا "ایسی صورت میں تو ہمارا محکمہ سے نکال دیا جانا یقینی ہے" بوریلی نے اس پر ایک بہت زور سے قہقہہ لگایا اور کہنے لگا "مجھے تمہاری اس سادگی پر حیرانی ہے۔ واللہ تم تو بالکل احمق معلوم ہوتے ہو۔ تمہارا افسر اعلیٰ تو ہماری سوسائٹی کا ایک سرگرم کارکن ہے اور علیٰ ہذا القیاس اس کے چیدہ چیدہ ماتحت بھی۔ کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں۔ بہت اچھا۔ مجھے اس کے پاس لے چلو اور خود اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کر لو۔"

بوریلی پولیس چوکی پہنچا۔ وہاں اس نے دو تین گھنٹے اپنے تین ممبروں کے ساتھ خوش گپیوں میں گذارے اور چونکہ وہی تین ممبر اس چوکی کے افسر اعلیٰ تھے اس لئے یہ بات کچھ ایسی تعجب انگیز نہیں کہ وہ صبح سے پیشتر اپنے بستر استراحت پر نہایت سکون سے خراٹے لے رہا تھا۔

چند سال میں ونکنزو بوریلی باستثنائے سردار اعلیٰ اٹلی کا سب سے زیادہ مالدار مجرم بن گیا تھا۔ یہ سابقہ پروفیسر اس وقت بارہ مرکزوں میں سے ایک کا سردار تھا اور اس کی آمدنی کا ذریعہ نہ صرف اس کے اپنے جرائم تھے بلکہ وہ نذرانہ بھی تھا جو کم درجہ کے مجرم اسے ادا کیا کرتے تھے دولت کی اس فراوانی سے اس کے دل میں وہ امنگیں پھر عود کر آئیں جو کبھی اس کی شریفانہ زندگی میں اس کے دل میں جاگزیں تھیں۔ اسے وہ وقت یاد آیا جب وہ ذی عزت لوگوں کا ہم جلیس تھا۔ اس کے ضمیر کا تقاضا اب یہ تھا کہ وہ مجرمانہ زندگی ترک کر کے اعلیٰ طبقہ کی سوسائٹی میں رسوخ پیدا کرے اور چونکہ اس کے پاس دولت موجود تھی۔ اس لئے اس کے لئے یہ بات کوئی مشکل نہ تھی۔ اس نے اب مصمم ارادہ کر لیا کہ اس وقت سے بعد اسے جرائم پیشہ سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔ اس ارادے کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے اس نے نیپلز سے ۴۰ میل کے فاصلے پر ایک مکان تیار کیا اور وہاں بڑے تزک و احتشام سے رہنے لگا۔ اس کی ظاہری شان اور سخاوت نے لوگوں کو اس کا گرویدہ بنا لیا۔

اس کے دو سال بعد پارلیمنٹ کے الیکشن کا وقت آیا۔ بوریلی اپنے حلقہ سے بطور امیدوار کھڑا ہوا۔ اس کا مقابلہ ایک سابقہ وزیر کے ساتھ تھا لیکن اس کی ذات اس وقت تک کچھ ایسی اہمیت پکڑ گئی تھی کہ اس نے کثیر التعداد ووٹوں سے اپنے مقابل پر فتح پائی۔

پارلیمنٹ میں آ کر سابقہ پروفیسر نے اپنی علمی قابلیت کے ایسے جوہر دکھائے کہ وزیراعظم کی نظر انتخاب اس پر پڑی اور اس نے بوریلی کو ایک ڈنر کے دوران میں اشارۃً جتا یا کہ وہ مستقبل قریب میں کسی وزارت کے لئے امید رکھے۔

وزیراعظم کے اس امید دلانے پر بوریلی کا حوصلہ بڑھا اور وہ اپنی منزل مقصود کے قریب پہنچتا ہوا معلوم ہونے لگا۔ اس سابقہ پروفیسر نقب زن اور جعل ساز نے اپنے ماضی اور مستقبل کا جائزہ لیا۔ وہ ابھی تک کیمورہ کا ممبر تھا اور اس کے احکام کا پابند۔ وہ بظاہر ایک سیاست دان تھا۔ لیکن کیمورہ کا سالانہ چندہ باقاعدہ ادا کر رہا تھا۔ چندہ کی ادائیگی اسے کسی طور گراں نہ گزرتی تھی۔ اگر اس ادائیگی پر ہی بس ہوتی تو بوریلی کبھی کوئی خطرناک قدم نہ اٹھاتا۔ لیکن جو بات اسے پریشان کر رہی تھی وہ یہ حقیقت تھی کہ جوں جوں وہ ترقی کی منزلیں طے کرتا چلا جائے گا اس کے خفیہ دوستوں کی فرمائشیں بڑھتی چلی جائیں گی اور ہر جرم میں خواہ وہ کیسا ہی تباہ کن کیوں نہ ہو ان کی امداد کرنا اس کا فرض اولین ہو گا۔ اس کے ہمراز اس سے یہ امید رکھیں گے کہ وہ اپنا اثر ان کی بہبود کے لئے بروئے کار لائے۔ ان تمام باتوں کے معنی یہ ہوں گے کہ اسے اپنی یہ ترقی کچھ دیر

کے لئے [illegible] کرے گی لیکن آخر بہت جلد وہ وقت آجائے گا جب وہ اپنے دوستوں کے تقاضے پورے نہ کرسکے گا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے رفقاء اسے مطعون کرنے کے بعد اسے قعرِ مذلت میں دھکیل دیں گے۔ وہ یہ خوب جانتا تھا کہ جس ممبر کے خلاف ایک مرتبہ کیمورہ کے کارکن ہو جائیں اس کا ٹھکانہ اس دنیا میں قبر ہی ہو سکتا ہے۔

ان خطرناک نتائج سے گریز کی راہ بھی ویسی ہی پُرخطر تھی۔ بہت تفکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر اسے اپنے ساتھیوں کے پنجے سے رہا ہونا ہے تو اس کے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ کیمورہ کے ممبروں سے غداری کرے اور حکومت کے سامنے اپنے تمام پرانے رفیقوں کے نام پیش کر دے اور بیک وقت ان سب کو گرفتار کرا کر ان سے گلوخلاصی کرا لے۔ وہ یہ جانتا تھا کہ اگر وہ سب ایک مرتبہ بھی جیل کی کوٹھڑی میں مقید ہو گئے تو حکومت کبھی بھی انہیں آزاد نہ کرے گی اور اگر وہ خود قدرے ہوشیاری اور چالاکی سے کام لے گا تو اطلاع دہندہ کا نام بجز اس کی اپنی ذات کے اور وزیراعظم کے کسی دوسرے کو معلوم نہ ہو سکے گا۔

چنانچہ ایک شب جب وہ وزیراعظم کے ساتھ تخلیہ میں کھانا کھا رہا تھا۔ اس نے قہوہ پینے کے دوران میں اپنے افسر کے سامنے کیمورہ کے لیڈروں کی فہرست پیش کرکے اسے حیران کر دیا۔ اس فہرست کے ساتھ ہی اس نے ان لیڈروں کی جائے رہائش کا پتہ بھی دیا۔

بوریلی اب خوش تھا اور دل میں کہہ رہا تھا کہ اب اس کی ترقی کی راہ میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی اور اب اس کی سیاسیات میں کامیابی یقینی ہے۔ انہیں خوش خیالیوں میں اپنے ہوٹل پہنچا۔ وزیراعظم کی ملاقات کو ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ جونہی اس نے اپنے کمرے میں قدم رکھا ہوٹل کے خادم نے (جو خود بھی کیمورسٹ تھا) اسے اطلاع دی کہ کیمورہ کے سردارِ اعلیٰ نے ونکنزو بوریلی کو غداری کے جرم میں قتل کر دینے کا حکم جاری کر دیا ہے۔

یہ سنتے ہی بوریلی کے اوسان خطا ہو گئے۔ اب اس کی خیریت اسی میں تھی کہ وہ اسی دم بغیر ایک لحظہ بھی ضائع کئے اگر اس کے لئے ممکن ہو تو اٹلی سے نکل جائے۔ چنانچہ وہ الٹے قدموں ہوٹل سے باہر نکلا اور سیدھا سوہو (انگلستان) میں جا کر دم لیا۔ یہاں وہ ایک گمنام سے ہوٹل میں اپنا نام تبدیل کرکے قیام پذیر ہوا۔ اس نے اس خاص مقام کو کئی وجوہات کی بنا پر انتخاب کیا تھا۔ سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ سزائے موت اٹلی کی تعزیرات سے اڑائی جا چکی تھی۔ لیکن انگلستان کی تعزیرات میں قتلِ عمد کی سزا موت ہی تھی اور بوریلی جانتا تھا کہ اس کے ہم وطن رفیقوں میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو سردارِ اعلیٰ کے احکام کی تعمیل میں تختۂ دار پر لٹکنے کے لئے تیار ہو۔ پس جب تک وہ انگلستان کی سرزمین میں موجود ہے کوئی کیمورسٹ اس کے قتل کا مرتکب ہونے کی جرأت نہ کرسکے گا۔ اس لئے گو لندن میں جتنے بھی کیمورسٹ تھے ان سب کو یہ علم تھا کہ وہ دراصل کون ہے اور اس کے خلاف سردارِ اعلیٰ نے کیا حکم صادر کر رکھا ہے۔ لیکن بوریلی محفوظ رہا اور کسی نے اسے کوئی گزند نہ پہنچایا۔ اس کی نگرانی چوبیس گھنٹے کی جاتی تھی اور فی الحال اسی پر اکتفا کیا گیا تھا۔

یہ تمام باتیں بوریلی کے حق میں تھیں لیکن اس سے یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی موت کا حکم دینے والے انجان تھے اور حکم دینے سے بیشتر بوریلی کے فرار ہونے کا امکان ان کے تصور میں نہ تھا۔ وہ خود اطالوی تھے اور اطالوی فطرت سے کما حقہٗ واقف تھے۔ انہیں علم تھا کہ ایک اطالوی جس کی جیب میں پیسہ ہو۔ وطن سے زیادہ عرصہ تک دور نہیں رہ سکتا اور پھر بالخصوص لندن میں۔ جہاں کی کہر آلود فضا اور مرطوب ہوا ایک اطالوی کو ہر وقت اپنے وطن کی یاد دلاتی رہتی ہے۔ جس کے پُرفضا پہاڑوں اور میدانوں پر سورج چمکتا رہتا ہے۔

بوریلی پارلیمنٹ سے غیر حاضر رہنے کی وجہ سے اخبارات کی نکتہ چینیوں کا آماجگاہ بن چکا تھا اور کچھ اس وجہ سے اور بہت حد تک اپنی فطرتی کمزوری کے باعث (جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے) آخر کیمورہ کی توقعات کے عین مطابق انگلستان میں صرف چند ماہ گزرنے کے بعد اٹلی واپس آیا۔ اسے خیال تھا کہ شاید اس کے پرانے رفیقوں کی دھمکیاں بے اثر ہو گئی ہیں اور وہ اس کے درپے آزار نہیں لیکن یہ خیال اس کا محض غلط تھا کیونکہ اس کی آمد کے دوسرے ہی دن جب وہ نیپلز میں سڑک پر سے گزر رہا تھا ایک شخص بنام اسپاسٹنو نے اسے نہایت اطمینانِ قلبی سے پستول کی گولی کے ذریعے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بوریلی کے زمین پر گرتے ہی قاتل کو چاروں طرف سے اس کے مداحوں نے گھیر لیا۔ عورتوں نے وقتی جوش کے زیرِ اثر اس کا منہ بے تابانہ طور پر کئی کئی مرتبہ چوما۔ اس کے پاؤں کے تلے پھول بچھائے گئے اور پولیس اور قاتل کے درمیان اس قدر ہجوم تھا کہ پولیس والوں کو ہجوم کے پیچھے ہٹانے کے لئے ایک خاصی لڑائی لڑنی پڑی۔ وہ "اسپاسٹنو زندہ باد" کے نعرے لگاتے گئے۔ وہ بلند آواز سے کہہ رہے تھے کہ وہ اسے زیادہ دیر جیل میں نہ رہنے دیں گے۔ عورتیں اسے [illegible] اس سینٹ میں [illegible] سے تمام قوم پرستوں کے ساتھ مشابہت دے رہی تھیں۔

حکومت نے اس سلسلے میں ۸۷ کیمورسٹوں کو گرفتہ

تھوڑے وقت کے لئے سزائے قید دی۔ ان میں سے ایپاسٹو کو ۸ سال قید ہوئی لیکن وہ چار سال قید بھگت کر باہر آگیا۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جس دن ایپاسٹو نے معرکہ مارا تھا اس دن اس کے نام مختلف بنکوں میں بے شمار روپیہ جمع کیا گیا تھا۔ اس لئے کہ اس نے کیمورہ کے سردار اعلیٰ کے حکم کی تعمیل کی ہے اور یہی روپیہ تھا جس سے اس نے اپنی رہائی کے بعد بے طرح عیش اُڑانی شروع کر دی تھی۔

کیمورہ کے نام کے ساتھ جوزف پریسٹنو کا نام بھی وابستہ ہے یہ ایک اٹلی نژاد تھا جس نے امریکہ میں جاکر خفیہ پولیس میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ امریکا جانے سے پہلے اسے کیمورہ کے متعلق ہر قسم کی واقفیت ہو چکی تھی۔ اس کی بنا پر اس نے وہاں جاکر وہاں کے کیمورسٹوں کی بیخ کنی کا بیڑا اٹھایا اور ایک حد تک کامیاب بھی رہا۔ اس کی کامیابی کا سن کر اطالوی حکومت نے بھی اس کی خدمات حاصل کرنے کی استدعا کی۔

پریسٹینو پہلی مرتبہ جب اٹلی آیا تو اس جگہ کیمورسٹوں کو اس کی آمد نے بہت متوحش کیا۔ اس نے اپنا لائحہ عمل حکومت کے سامنے پیش کیا اور اس پر کاربند ہونے کے لئے زور دیا۔ وہ اٹلی میں بھی کامیاب رہتا لیکن یہاں اس کے لئے دشواری یہ تھی کہ پولیس میں ایسے آدمی کم تھے۔ جو اول تو کیمورسٹ نہ ہوں یا جو کیمورہ سے مخوف نہ ہوں یا جو کم از کم کیمورہ والوں کی دولت کے فریب میں نہ آئیں تاہم اس نے اطالوی پولیس میں سے اکثر کیمورسٹوں کو نکال دیا اور کسی حد تک پولیس کا معیار بھی بلند کر دیا لیکن کامل کامیابی ناممکن تھی۔

اس کی پہلی آمد کے دوران میں کیمورہ والوں کا داؤ نہ چل سکا۔ اور وہ بخیر و خوبی امریکا جا پہنچا۔

جب دوبارہ پریسٹینو کو اطالوی حکومت نے بلایا تو اس کی موت سر پر منڈلا رہی تھی۔ کیمورہ والے اس بات پر تُلے ہوئے تھے کہ اس دفعہ وہ اسے کسی صورت میں بھی زندہ نہ چھوڑیں گے۔ اٹلی کے بندر پر قدم رکھنے کے چند گھنٹے بعد ہی کیمورہ والوں نے اُسے موت سے ہمکنار کر دیا۔

اس کا قتل دن دہاڑے شارع عام میں اس کے ہوٹل کے سامنے ہوا۔ یورپی کے قاتل کی طرح پریسٹینو کا قاتل مداحوں سے گھیرے جانے سے پہلے ایک پولیس مین کی جو وہاں ڈیوٹی پر موجود تھا گولی کا نشانہ ہو گیا۔ کچھ دیر کے لئے پریسٹینو کے قتل نے اطالوی پبلک میں ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔ کیمورہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی اور اس سوسائٹی کو دنیا کے تختے سے نابود کر دینے کا حکومت سے مطالبہ ہوا۔ لیکن یہ جوش محض ہنگامی تھا اور گو بظاہر اطالوی حکومت نے کیمورہ کو نیست کر دینے کے لئے بہت جدو جہد کی۔ لیکن نتیجہ آخر میں سوائے چند ایک گرفتاریوں کے اور کچھ نہ ہوا۔

زمانہ حال میں بھی تقریباً ہر بیس سال کے بعد کیمورہ کے ممبروں کی گرفتاری کے لئے عام اعلان صادر ہوتا ہے اور بہ صرف زر کثیر ان کے کئی ایک گروہ گرفتار کئے جاکر معمولی سے وقت کے لئے قید بھی کئے جاتے ہیں لیکن یہ سزا بذات خود غیر موثر ثابت ہوتی ہے۔ ایسے مقدمات میں سے حال ہی میں ایک مقدمے کی سماعت اٹھارہ ماہ ہوتی رہی اور جیسا کیمورہ والے امید کرتے تھے۔ اتنے دراز عرصے میں پبلک کی ہمدردی بجائے حکومت کے ساتھ ہونے کے ملزموں کی طرف تھی۔ کیونکہ پبلک کو ملزموں کا اتنے عرصے تک مقدمے کی سماعت کی مصیبت جھیلنے دینے میں سراسر گورنمنٹ کا قصور نظر آتا تھا۔ در پردہ یہ کیمورہ کے سردار اعلیٰ کی ایک چال تھی جس کی کوشش سے مقدمہ کو اس قدر طول دیا گیا تھا۔ کیمورہ والے اپنے ہم قوموں کے جذبات سے واقف تھے اور وہ اطالوی پبلک کی ہمدردی اپنی طرف حاصل کرنا چاہتے تھے۔

اس مقدمے میں بے دریغ روپیہ ملزموں کی طرف سے خرچ کیا گیا تھا اور اس روپے کا ذریعہ وہ فنڈ تھا جس میں ہر کیمورسٹ کا نذرانہ جمع ہوتا ہے۔ ان ملزموں میں اٹلی کے فاضل ادیب۔ بڑے بڑے عالم، ذی عزت اور با اقتدار اشخاص بھی شامل تھے۔

باوجود حکومت کی کوشش کے کیمورہ کی سرگرمیاں اسی طرح جاری ہیں۔ آج کل بھی یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ ایک قاتل جو کیمورہ کا ممبر ہو۔ وہ ایک کیمورسٹ جج کے سامنے پیش ہو۔ اس کے مقدمے میں رائے دینے والی جیوری کے تمام کے تمام ممبر کیمورسٹ ہوں اور وہ ایسے جیل خانے میں سزا بھگتے جس کا سٹاف داروغہ جیل سے لے کر معمولی سے معمولی چپڑاسی تک کیمورسٹوں پر مشتمل ہو۔

(ترجمہ)

محمد منظور الٰہی بی اے۔ ایل ایل بی

نوائے فراق

ایک آنکھوں کا اثر، تاثیر اک رفتار کی
موجِ مے کا لڑکھڑانا۔ بے خودی میخوار کی

پارسا کی پارسائی، مستیاں مے خوار کی
وہ فقط حسرت، یہ شان و کیفیت دیدار کی

کنجِ زنداں میں تو مجھ کو وسعتِ صحرا کی یاد
حسرتیں صحرا میں زنداں کے در و دیوار کی

بن چکے ہیں وصل و فرقت اک پیامِ بیخودی
مل چکی ہیں سرحدیں اقرار سے انکار کی

کیا کہیں، کیونکر کہیں، کیا ہے وہ چشمِ نیم باز
مست کی مستی بھی، ہشیاری بھی ہی ہشیار کی

حسن رسوا۔ اور رسوائے جہاں ہوتا رہے
تھی یہی ساری حقیقت نکہتِ گلزار کی

دُکھتے دِل سے نغمۂ سازِ محبت چھیڑ دے
آپ رُک جائیں گی نبضیں کافرِ دیندار کی

جن کی تاثیروں سے اہلِ دہر کی آنکھیں کھلیں
غفلتیں تھیں کچھ وہ تیرے محرمِ اسرار کی

آشتی جس پر تصدق۔ دوستی جس پر نثار
وہ چڑھی تیوری تھی اک آمادۂ پیکار کی

آہ، اے دردِ فراقِ یار اے جانِ فراقؔ
کیفیت تجھ میں ہے اک بھولے ہوئے اقرار کی

فراقؔ گورکھپوری

نقد و نظر

ہندوستان اور ملت

"مصنفہ ایک پنجابی" ہر سیاسی یا سماجی تحریک کی تہ میں کچھ معاشی حالات ہوتے ہیں مختلف خیالات کی تحریک بھی کسی ایسی ہی معاشی ضرورت یا سیاسی حالت کی بنا پر ہوتی ہے۔ ہندوستان کی موجودہ فرقہ دارانہ ذہنیت یعنی مذہبی، نسلی، لسانی اور تمدنی اختلاف کا نتیجہ اکثر و بیشتر ہندو مسلم فسادات ہوتا ہے ملت ہندیہ کے قیام کے نصب العین سے قوم کے خیالات کا یہ تضاد خود دار اور حساس افراد کے لئے ایک ذہنی کش مکش کا باعث ہے۔ کتاب ہندوستان اور ملت اس ذہنی کش مکش کا ایک خوشگوار نتیجہ ہے۔ کتاب ہذا میں جن موضوعات پر تفصیلاً تبصرہ کیا گیا ہے اُن میں سے بعض تو اہم تحریکات کا منبع بن چکے ہیں۔ مثلاً زبان مذہب اور تہذیب و تمدن کے اختلافات کی بنا پر کئی ایک تحریکیں ملک میں جاری ہوئیں اور اب تک جاری ہیں نسل۔ زبان۔ مذہب ذات پات کی تمیز اور ایسے ہی جاپان کے حالات پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ ان سے متعلقہ مسائل کو بیان کر کے اُن کی اصلیت اور حل دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جماعتوں کے آیندہ رجحانات کا بھی اشارۃً ذکر کیا گیا ہے۔ مشترکہ ملکی خصوصیات اور عامۃ الناس کو ان کی طرف بیش از بیش توجہ دلانے کی ضرورت نقصان دہ اعمال کو روکنے اور اُن کی بجائے سود مند تحریکات کو شروع کرنے کے متعلق چند مفید مشورے بھی کتاب میں درج ہیں۔

ان موضوعات کے علاوہ نیشلزم کے نظریے پر ایک علیٰحدہ باب میں تفصیلاً بحث کی گئی ہے۔ ملیت کے ضروری عناصر پر روشنی ڈال کر ان کی موجودگی یا عدم موجودگی کے اثرات کو بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان کا ملیت سے کیا تعلق ہے مثلاً نسل مذہب زبان اور تہذیب و تمدن کی یکسانیت یا غیر یکسانیت سے ملیت کیونکر اور کہاں تک اثر پذیر ہوتی ہے۔ اس سلئے درسیہ نکات کو قوموں اور ملتوں کے ارتقاد فنا یا حیات کی مثالیں پیش کر کے واضح کیا گیا ہے۔

کتاب کے آخر میں مغربی تہذیب اور جمہوریت پر عمیق نکتہ نظر سے بحث کی گئی ہے، مغربیت کی تہ میں جو اصول کارفرما ہیں مثلاً مساوات شہامت نفس۔ فرد کی اہمیت۔ احترام قانون وغیرہ ان کی حقیقت تربیت اور رفاد کو مختصراً لیکن مرصع طور پر بیان کیا گیا ہے۔ جمہوریت پر چند ملفوظات حوالۂ قلم کئے گئے ہیں اور چند صفحوں میں اصول جمہوریت، جمہوریت کے نقصان دہ رجحانات۔ فایدے اور مقاصد کو بیان کیا گیا ہے۔ کتابت طباعت کاغذ وغیرہ آپ اپنی مثال ہے۔ صفحات پونے تین سو قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے غیر مجلد دو روپے۔ ملنے کا پتہ۔ راما کرشنا اینڈ سنز انارکلی لاہور یا ادبی دنیا لاہور

دنیائے ادب

ہماری قومی زبان

بابل کے مینار کا قصہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔ ہمارے ملک کا بھی کچھ ویسا ہی حال ہے۔ ہندوستان کی زبانوں کی پڑتال جو گریرسن نے کی ہے اُس کی رُو سے اس ملک میں ۱۷۹ زبانیں اور ۵۴۴ بولیاں بولی جاتی ہیں[1]۔ یہ زبانیں اور بولیاں سب ایک گھرانے کی نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق چھ گھرانوں سے ہے جن کے نام یہ ہیں:۔ آسٹری، مان، کارن، تبتی چینی، دراوڑی، اور انڈویورپین۔ دو زبانیں ایسی بھی ہیں جن کے گھرانے کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ان میں سب سے بڑا گھرانا انڈویورپین زبانوں کا ہے۔ ان زبانوں کے بولنے والے اس ملک میں ۲۶ کروڑ کے قریب ہیں، دوسرا بڑا گھرانا دراوڑی زبانوں کا ہے جس کے بولنے والے کوئی ۷ کروڑ ہوں گے، باقی سب زبانوں کے بولنے والے مل کر دو ڈھائی کروڑ سے زیادہ نہیں ہیں[2]۔ زبانوں اور بولیوں کی اتنی بڑی گنتی سن کر آپ کو اچنبھا ضرور ہوا ہوگا لیکن ان میں سے صرف گیارہ زبانیں ایسی ہیں جو لکھنے پڑھنے کے کام آتی ہیں اور ان میں سے بھی تین ایسی ہیں جن کا ادب ابھی بالکل ابتدائی حالت میں ہے۔ جن کا ادب کافی ترقی کر چکا ہے اُن کے نام یہ ہیں۔ بنگالی، گجراتی، مرہٹی، تامل، تلگو، ملیالم، کنٹری اور ہندوستانی جس کی دو شاخیں ہندی اور اردو کے نام سے مشہور رہیں۔

ہندوستان میں جب سے قومی تحریک شروع ہوئی ہے اُسی وقت سے یہ خیال بھی پیدا ہوا ہے کہ ہمیں ایک قومی زبان کی بھی ضرورت ہے۔ شروع میں تو اس تحریک میں زیادہ تر ایسے ہی لوگ حصہ لیتے تھے جو انگریزی جانتے تھے اس لئے تمام سیاسی کاروبار انگریزی میں ہوتا تھا لیکن جب سے جنتا نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا ہے اس وقت سے قومی زبان کے سوال پر زیادہ زور دیا جانے لگا ہے۔ بڑی لڑائی کے بعد جب کانگرس کی کایا پلٹ ہوئی تو اسی کے ساتھ ساتھ یہ تجویز بھی منظور ہوئی کہ ہندوستان کی قومی زبان ہندوستانی ہے اور تمام کاروبار اُسی میں ہونا چاہیئے مگر ابھی تک اس پر پورا عمل نہیں ہوتا۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ دکن کے سیاسی کام کرنے والوں میں سے بہت سے آدمی ہندوستانی کو اچھی طرح نہیں جانتے اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ بہت سے لوگ ابھی تک اس بات کو دل سے مانتے ہی نہیں کہ ہندوستانی کو قومی زبان ہونا چاہیئے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جن کے دماغ میں رہ رہ کر یہ بات آتی ہے کہ انگریزی سے ہمارا کام نکل سکتا ہے۔ لیکن وہ ایسے لوگ ہیں جو بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ڈیڑھ سو برس کی انگریزی حکومت کے بعد بھی اس وقت ہندوستان بھر میں صرف تین لاکھ سے کچھ ادھر آدمی انگریزی بول سکتے ہیں[3]۔ اس کے مقابلے میں ہندوستانی بولنے والوں کی تعداد ۱۲ کروڑ سے زیادہ ہے اور اگر ان لوگوں کو بھی ملا لیا جائے جو تھوڑی بہت ہندوستانی سمجھ لیتے ہیں تو یہ تعداد ۲۰ کروڑ سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس لئے یہ بحث تو فضول ہے کہ ہندوستانی کے علاوہ کوئی دوسری زبان بھی ہماری قومی زبان بن سکتی ہے لیکن مشکل ایک دوسری آن پڑی ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ ہندوستانی کوئی زبان نہیں ہے۔ یہ ایک فرضی نام ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں ہے بلکہ سیاسی کارکنوں نے ایک ڈھونگ کھڑا کر رکھا ہے۔ اس لئے اس سوال سے بحث کرنے کی سخت ضرورت ہے ـــــ!

ہندوستانی اصل میں اُس علاقے کی زبان ہے جس کو پرانے زمانے میں ہندوستان کہتے تھے۔ اس علاقے کی چوحدی یہ ہے:۔ اتر میں ہمالیہ، دکھن میں وندھیا، پچھم میں پنجاب اور پورب میں بنگال۔ یہ نام سب سے پہلے گلکرائسٹ نے ۱۷۸۷ء کے قریب استعمال کیا تھا[4] اور اسی وقت سے برابر استعمال ہوتا ہے۔ گریرسن کی تقسیم کے مطابق اس علاقے میں چار زبانیں بولی جاتی ہیں یعنی بہاری، پوربی ہندی، پچھمی ہندی اور راجستھانی۔

ہندوستانی زبان کی ابتدا کب ہوئی اور کیسے ہوئی؟ یہ سوال بہت کٹھن ہے[5]۔ نویں اور دسویں صدی عیسوی میں جو پراکرتیں مدھ دیس میں رائج

1. Linguistic Survey of India, Vol. I, Part I, p. 27.
2. Census of India, 1931, Vol. I, Part I, p. 351.
3. Census p 322,
4. Linguistic Survey Vol. IX, Part I, p. 43
5. Encyc. Britt. 14th Ed. Hindustani Literature, by Sir J.C. Lyall.

تھیں انہی کے میل جول سے یہ زبان بنی ہوگی۔ اس زبان کو وشنو دھرم کے بھگتوں سے بہت مدد ملی بھگتی کی تحریک اصل میں برہمنوں کے خلاف بغاوت کا اعلان تھا۔ یہ عوام کی تحریک تھی اس لئے اُس نے عوام کی زبان کو استعمال کیا اور سنسکرت کو چھوڑ دیا۔ راجپوتانے کے درباری بھاٹ اور کوی بھی یہی زبان استعمال کرتے تھے۔ پرتھوی راج کے زمانے میں اس زبان نے کافی ترقی کر لی تھی۔ آلھا کھنڈ اور پرتھوی راج راسو اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ آگے چل کر کبیر کے دوہے، تلسی داس کی رامائن اور ملک محمد جائسی کی پدماوت اسی زبان میں لکھی گئیں اور اب تک اسی ذوق اور شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ میرا بائی نے بھی اسی زبان میں اپنی کبتائیں لکھیں سکھوں کے "آدی گرنتھ" کا ایک بڑا حصہ بھی اسی زبان میں ہے جس میں کبیر کی چوپائیاں، گرو نانک کے بول اور بابا فرید کے اشعار شامل ہیں۔ اس میں کچھ ایسے بھگتوں کا کلام بھی ہے جن کا کسی دوسری جگہہ ذکر نہیں ملتا۔ اکبر بادشاہ کے زمانے میں جہاں ہندوستان کی اور بہت سی چیزوں نے ترقی کی وہاں ہندوستانی زبان بھی بہت پھلی پھولی۔ اکبر کے درباریوں میں راجہ بیربل جو کبی رائے کہلاتے تھے، عبدالرحیم خانخاناں جن کے دوہے اور کبتائیں اب تک زبانوں پر ہیں اور فیضی ہندوستانی کے شاعر تھے۔ اس زمانے میں گوکل یعنی متھرا کے آس پاس کرشن کے پجاریوں کا بہت زور اور دبدبہ جاریا اور وٹھل ناتھ کے آٹھ شاگردوں نے جو اشٹ چھاپ کہلاتے ہیں، اپنے بھجنوں سے بڑا نام پیدا کیا۔ ان میں سورداس سب سے زیادہ مشہور رہے۔

ادبی ہندوستانی کی بنیاد برج بھاشا پر رکھی گئی جو آگرہ اور دہلی کے آس پاس بولی جاتی تھی۔ یہ علاقہ مغل بادشاہوں کا مرکز تھا اور جوں جوں اُن کی حکومت بڑھتی گئی ساتھ ہی ساتھ ہندوستانی کا رواج بھی بڑھتا گیا۔ اسی زبان کا ایک نام اردو زبان بھی پڑ گیا اس لئے کہ یہ مغلوں کی فوجی بازاروں کی زبان تھی جس کو اردو یا اردوئے معلیٰ کہتے تھے۔ لیکن اس زبان کا عام نام اس زمانے میں ہندی تھا یعنی ہند کی زبان۔ یہ نام ان لوگوں کا رکھا ہوا ہے جو ابھی تک فارسی میں تمام کاروبار کرتے تھے۔ اکبر کے زمانے میں جب سنسکرت کتابوں کے ترجمے فارسی میں ہونے لگے تو دونوں ادبوں کا میل ہوا اور ملکی زبان پر فارسی کا اثر بڑھنے لگا۔ اس زبان کی ترقی میں اس وقت زیادہ ہاتھ مسلمانوں کا نہیں تھا کیونکہ وہ تو فارسی سے اپنا کام نکالتے تھے بلکہ ہندوؤں کا تھا جن میں کائستھ اور کھتری آگے آگے تھے جو درباری ضرورتوں کے لئے فارسی سیکھتے تھے اور اپنی بول چال میں فارسی عربی کے الفاظ بے طرح استعمال کرتے تھے۔ یہ زبان شمالی ہند کی فوجوں کے ساتھ دکن بھی پہنچی۔ اور گولکنڈا اور بیجاپور کے درباروں کی زبان بنی اور وہیں پروان چڑھی۔ شمالی ہندوستان کے مسلمان شاعر جب ہندوستانی زبان استعمال کرتے تھے، وہ پرانی پراکرتی بحریں بھی استعمال کرتے تھے لیکن جب یہ زبان دکن میں پہنچی تو وہاں آس پاس دراوڑی زبانیں بولی جاتی تھیں۔ شمالی ہند والوں نے جو وہاں بالکل اجنبی تھے۔ فارسی بحروں کا استعمال شروع کیا اور فارسی شاعروں کی طرح قصیدے، غزلیں، مرثیئے، مثنویاں اور رباعیاں لکھنے لگے۔ ہندی اردو کا فرق اسی میں یہیں سے شروع ہوا۔ لیکن یہ فرق صرف نظم میں تھا نثر میں وہی برج بھاشا کی گریمر قایم رہی اور فارسی ترکیب کے جملے کبھی استعمال نہیں کئے گئے۔ غالباً دکن میں ہی شاعروں کی اس نئی زبان کا نام ریختہ پڑا اور ولی نے جو بابائے ریختہ کہلاتا ہے اس کا معیار قایم کیا۔ ۱۷۱۹ء میں ولی کا دیوان دہلی پہنچا اور حاتم دہلوی نے دہلی کی زبان میں اس کی نقل شروع کی۔ اس طرح دہلی اسکول کی بنیاد پڑی۔ جب دہلی اجڑ گئی اور وہاں کے شاعر لکھنؤ پہنچے تو لکھنؤ اردو کا مرکز ہو گیا۔

ہندوستانی نثر کی بنیاد اصل میں انگریزی حکومت شروع ہونے کے بعد پڑی۔ انیسویں صدی کے شروع میں جب فورٹ ولیم کالج کلکتہ کا انتظام ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کے ہاتھوں میں آیا تو انہوں نے ہندوستانی زبان کے ادیبوں کی ایک جماعت کو اس کام پر لگایا کہ وہ نثر میں کالج کے لئے درسی کتابیں لکھے۔ اس میں شک نہیں کہ گلکرائسٹ نے ہندوستانی زبان کی بڑی خدمت کی لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک بہت بڑی غلطی کی جس کا خمیازہ ہم کو نہ جانے کب تک بھگتنا پڑے گا جو چیز اب تک صرف نظم میں تھی اس کو انہوں نے نثر میں بھی شروع کرا دیا۔ بجائے اس کے کہ وہ سادہ ہندوستانی زبان کو رواج دینے کی کوشش کرتے انہوں نے ایک طرف تو میر امن اور افسوس وغیرہ کو ایسی زبان لکھنے پر لگایا جس میں فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت ہے اور دوسری طرف سری للّولال سے اُن کے مقابلے میں ایسی زبان لکھوائی جس میں سنسکرت کے شبدوں کی بھرمار ہے۔ یہ تو کیسے کہا جائے کہ انہوں نے جان بوجھ کر ایسا کیا لیکن ہندی اردو کے جھگڑوں میں ہماری حکومت کی جو پالیسی رہی ہے اور اب تک سیاست میں جس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑانے کی کوشش ایک زمانے سے کی جا رہی ہے اس کو دیکھ کر یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید وہ پہلی کوشش بھی اسی خیال سے تھی۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو لیکن اسی وقت سے

ہندی اور اردو جو ہندوستانی کی دو شاخیں ہیں اپنی اپنی راہ لگ گئیں اور آہستہ آہستہ ان میں دُوری بڑھتی گئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ آج کل کی اردو کو سمجھنے کے لئے فارسی اور عربی میں کافی مہارت کی ضرورت ہے اور اسی طرح ہندی کو سمجھنے کے لئے سنسکرت کا عالم ہونا ضروری ہے۔ فورٹ ولیم کالج تو ختم ہو گیا لیکن اس کی روح ابھی تک زندہ ہے اور آج کل بھی سرکارِ دولت مدار کی طرف سے ہم پر جو احسان ہمارے ادب کو ترقی پہنچانے کا کیا جا رہا ہے اور جس کا مرکز اب الہ آباد ہے اس میں بھی وہی خرابی موجود ہے۔ نام تو شاید عام ہوا کے اثر سے "ہندوستانی اکیڈیمی" رکھا گیا ہے لیکن ایک ایسی زبان کو بڑھانے کی کوشش کہیں نظر نہیں آتی جو واقعی ہندوستانی کہلا سکے بلکہ دو الگ الگ خانے بنائے گئے ہیں جن کو ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں اور ایک میں اسی سنسکرت آلودہ ہندی کو بڑھایا جا رہا ہے اور دوسرے میں مفرس اور معرب اردو کی ترقی کی کوشش کی جا رہی ہے۔

کانگرس نے ہندوستانی کا نام تو لے لیا لیکن اس کے لئے کام کچھ نہ کیا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کام سیاسی جماعتوں کا نہیں ہے لیکن کانگرس صرف ایک سیاسی جماعت نہیں ہے۔ اس نے سماج سدھار کے بہت سے کاموں کا بیڑا اٹھا رکھا ہے تعلیم کے معاملے میں بھی اس نے دخل دیا ہے، اس لئے زبان کے معاملے میں بھی اُس کو کچھ کرنا چاہئے تھا۔ کانگرس کے بہت سے کارکن ہندی ساہتیہ سمیلن کے بھی کارکن ہیں لیکن اس کام میں انہوں نے تعصب کو چھوڑا نہیں ہے اور چاہتے ہیں کہ وہی ہندی رائج ہو جائے جو سنسکرت کی غلام ہے۔ اس طرح ہندوستان کی ایک بڑی جماعت کو ان لوگوں سے شکایت پیدا ہو گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شکایت کرنے والوں میں زیادہ تر ایسے لوگ ہیں جو خود متعصب ہیں اور اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ ہی بنانا چاہتے ہیں لیکن جو لوگ قوم پرستی کا دعوےٰ کرتے ہیں ان کا تو یہ فرض ہے کہ ایسی چیز کو اٹھائیں جو ٹھیک ہو۔ بھارت ساہتیہ پریشد کے قائم ہونے کی خبر سے یہ امید بندھی تھی کہ شاید وہ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے اور جب اس میں اردو کے ادیب بھی بلائے گئے تو یہ امید اور بڑھی لیکن اس کے پہلے ہی جلسے میں "ہندی اتھوا ہندوستانی" کی ایک عجیب و غریب اصطلاح ایسی تراشی گئی کہ جھگڑا کم ہونے کی جگہ اور بڑھ گیا اور جو لوگ قریب آ رہے تھے وہ بھی بدک گئے۔

یہ مانا کہ ہندی اور اردو کی اصطلاحیں ہندوستانی سے پہلے کی ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ ان میں سے کوئی بھی مشترک زبان کے لئے نہیں استعمال کی جا سکتی۔ اسی مشکل کو دور کرنے کے لئے گلکرائسٹ نے ہندوستانی کی اصطلاح بنائی اور وہ چل نکلی اور ہندی اور اردو اس کی دو شاخیں مانی گئیں۔ ہندی کی تعریف یہ ٹھہری کہ وہ ہندوستانی کی وہ قسم ہے جو ناگری لپی میں لکھی جاتی ہے اور جس میں سنسکرت کے شبد بہت ہوتے ہیں اور اردو ہندوستانی کی وہ قسم ہے جو فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور جس میں عربی فارسی کے الفاظ کی کثرت ہوتی ہے۔ اصل زبان ہندوستانی ہے جو ہندوستان بھر میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جو دونوں رسم خطوں میں آسانی سے لکھی جا سکتی ہے[1]۔ یہ زبان بولی زیادہ جاتی ہے اور لکھی بہت کم جاتی ہے، پھر بھی اس میں ادب موجود ہے جس کا ایک نمونہ انشا کی "رانی کیتکی کی کہانی" ہے۔ یہ ابھی تک ادبی زبان نہیں ہے لیکن جو لوگ ایک قومی زبان کے خواب دیکھتے ہیں اُن کو چاہئے کہ ٹھیٹھ ہندوستانی کو ادبی زبان کے درجے تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ سنسکرت، عربی، فارسی یا یورپ کی زبانوں کے جو لفظ ہماری زبان پر چڑھ گئے ہیں ان کو اپنی زبان سے نکالنا نہ تو ممکن ہے اور نہ ضروری لیکن باہر کی زبان کے لفظوں کی بھرمار نہ صرف کانوں کو بری معلوم ہوتی ہے بلکہ ہمارے ادب کی ترقی کو بھی روکتی ہے۔ ایسی بولی سے فایدہ ہی کیا جو کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔

"شاہجہاں"

ڈاکٹر محمد عبد العلیم ایم اے پی ایچ ڈی

1. Linguistic Survey, Vol. IX, Part. I. p. 47.

فہرستِ مضامینِ ادبی دنیا لاہور

بابت ماہِ مارچ ۱۹۳۷ء

جلد ۱۵ — تصویر: معصومیت — **نمبر ۵**

سالانہ چندہ چار روپے سات آنے محصول اور وی پی نو آنے کل پانچ روپے ممالکِ غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا کرشن بلڈنگس مال روڈ لاہور سے شائع ہوا

بزم ادب

مہاتما گاندھی سے بات چیت ٹھیٹ اردو میں

مندرجہ بالا عنوان سے مولانا سید ابوالقاسم صاحب کا ایک بے مثل مضمون اس نمبر میں شائع ہو رہا ہے یہ مضمون سیاست حاضرہ اور اردو زبان کے پیش نظر مسائل پر ایک گراں بہا تحقیقی تبصرہ ہے۔ ان موضوعات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ خاص توجہ کا محتاج ہے۔ مولانا موصوف نے اس میں فارسی، سنسکرت، عربی، اردو، اور ہندی کے ماخذوں کی تحقیق کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ فارسی اور سنسکرت کا ماخذ ایک ہی ہے اور ان دونوں میں تفرقی کرنا لاعلمی پر مبنی ہے۔ عربی زبان کے الفاظ جہاں اردو میں رائج ہو گئے ہیں وہاں دوسری ہندوستانی زبانوں میں بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اردو ان سب زبانوں کے ملاپ سے پیدا ہوئی ہے اور ہندوستان کے اتحاد کے قیام کے لئے اس سے بہتر زبان ممکن نہیں ہے۔ اس امر کو تو ہندو بھی سمجھتے ہیں کہ زبان قوموں کے اتحاد میں بڑا حصہ لیتی ہے۔ لیکن ان کی کوششیں اس وقت تخریبی ہیں تعمیری نہیں۔ مولانا نے ایک نیا تعمیری پروگرام پیش کیا ہے۔ جو بلاشبہ قابل عمل اور ممکن العمل ہے اردو زبان کی وسعت اور قوت بیان کا ثبوت انہوں نے خود اپنی تحریر سے دے دیا ہے۔ یہ تحریر نہ صرف عربی اور فارسی الفاظ سے قطعاً پاک ہے بلکہ اس میں غیر مانوس سنسکرت الفاظ سے بھی مدد نہیں لی گئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان الفاظ کی دولت سے کتنی مالا مال ہے۔ اس میں اپنے اس قدر الفاظ ہیں کہ دوسری زبانوں سے کچھ مستعار لئے بغیر ہر مفہوم ادا ہو سکتا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ نہ صرف مہاتما گاندھی اسے غور سے پڑھیں گے اور اس کے نکات پر تدبر فرمائیں گے بلکہ اردو اور ہندی کے مسائل پر فکر کرنے والے اس سے بصیرت حاصل کریں گے۔

آتش نمبر

آتش نمبر کی تجویز طے ہو گئی ہے اور ماہ جون کا پرچہ آتش نمبر ہوگا۔ جون کے مہینے کی مناسبت سے نکلنا بھی اسی آتشیں مہینے میں موزوں تھا۔ ہندوستان کے مشہور افسانہ نگار اور نقاد حضرت مجنوں گورکھپوری، حضرت یاس، یگانہ چنگیزی لکھنوی، حضرت فراق گورکھپوری، اور جناب شہنشاہ حسین صاحب رضوی اس پرچے کے لئے خاص محنت اور کاوش سے مضامین لکھ رہے ہیں۔

مندرجہ ذیل موضوعات اس نمبر کے لئے تجویز ہوئے ہیں۔

(۱) آتش اور اردو شاعری

(۲) آتش اور ایشیائی تہذیب اور کلچر

(۳) آتش اور لکھنو سکول

(۴) آتش کا اثر اردو شاعری پر

(۵) آتش اور خودی۔

(۶) آتش اور حجازیت اور عجمیت

(۷) آتش کا سلسلہ شاگردان اور متبعین

آٹھواں موضوع آتش اور غالب تجویز کیا گیا تھا جس پر خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

جو اصحاب ان موضوعات میں سے کسی ایک موضوع پر قلم اٹھانا چاہیں وہ براہ مہربانی ہمیں اپنے ارادہ سے مطلع فرمائیں۔ تمام مضامین اپریل کے وسط تک دفتر میں پہنچ جانے چاہئیں۔

ساقی اور شاہجہاں

دہلی کے یہ دونوں رسالے جناب مولانا شاہد احمد صاحب بی اے آنرز کی ادارت میں اردو ادب اور زبان کی بیش بہا خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ساقی میں مختلف اور متنوع مضامین شائع ہوتے ہیں اور شاہجہاں زیادہ تر ترقی پسند مصنفین کی انجمن دہلی کی سرگرمیوں اور خیالات کو ملک کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ساقی نے جہاں ضخامت طباعت وغیرہ میں ترقی کی ہے وہاں ایک خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ دنیا کے بلند پایہ اور منتخب ادب کو نہایت سرعت اور فراوانی کے ساتھ اردو میں منتقل کر رہا ہے۔ چنانچہ ۱۹۴۳ء کے سالنامے میں بھی دو مبسوط اور بہترین کتابیں ترجمہ کی گئی ہیں۔ اول فاؤسٹ جو خود حضرت مدیر کے گلکار قلم کا ایک دلکش نقش ہے اور دوسرے ہملیٹ جسے مولانا عنایت اللہ صاحب بی اے دہلوی سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد دکن نے اردو کا جامہ پہنایا ہے یہی دو کتابیں کسی ایک رسالے کی تکمیل کے لئے کم نہ تھیں لیکن انہوں نے ۳۲ کے قریب دوسرے مضامین بھی بہترین اہل قلم سے حاصل کر کے اس پرچے کی زینت بنائے ہیں۔ حجم ۳۰۰ صفحات کے قریب ہے اور قیمت ایک روپیہ چار آنے

منصور احمد

آئینۂ عالم

تصویری زبان

قریباً پانچ سال کا عرصہ ہوا کہ وائنا میں حقائق کو بیان کرنے کا ایک نیا طریقہ ایجاد ہوا ـــــ یہ طریقہ اس وقت اس قدر وسیع پیمانے پر رائج ہو رہا ہے کہ اب اس کے موجد کا نام تک یاد نہیں رہا۔ سرخ اور نیلی فوجوں کی طاقت کا اندازہ اگر دو سپاہیوں سے کیا جائے جن میں سے ایک سرخ اور طویل قد بنایا جائے اور دوسرا نیلا اور پستہ قد، تو کسی صحیح نتیجے پر پہنچنا بہت مشکل ہے۔ اس کے بجائے اگر بارہ سرخ سپاہی بنائے جائیں اور پانچ نیلے اور ایک سپاہی ۲۰۰۰۰ کے برابر ہو تو ایک ہی نظر میں معلوم ہو جائے گا کہ سرخ فوج کی تعداد دو لاکھ چالیس ہزار ہے اور نیلی فوج کی ایک لاکھ۔

حقایق کو جلدی، آسانی اور صحت کے ساتھ صرف تصاویر کے ذریعے سے پیش کرنے کا یہ ایک بالکل نیا طریقہ ہے ـــ اور یہ عام طور پر یہ لوگوں کو معلوم نہیں ـــــ کہ یہ اُس "بین الاقوامی زبان" کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے جو الفاظ کے بجائے تصاویر کے ذریعہ لکھی جاتی ہے

اس کے موجد ڈاکٹر آٹو نیورتھ معاشرتی سائنسدان اور فلسفی ہیں جنھوں نے اسے وائنا کے معاشرتی اور اقتصادی عجائب خانے میں ترقی دی ڈاکٹر موصوف نے دس سال ہوئے اس عجائب خانے کی بنیاد رکھی تھی اور اس عرصہ میں خود ہی اس کے نگران کار رہے ہیں۔

تصاویر پر ان کا یقین اتنا پختہ ہے کہ وہ اپنے دستخط کے بجائے "ہاتھی" کی تصویر بناتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ آپ بہت بھاری بھرکم آدمی ہیں۔ (آپ کا وزن پلے ۲ من ہے) اور ممکن ہے ـــــ اس لئے کہ آپ بہت عقلمند انسان ہیں۔

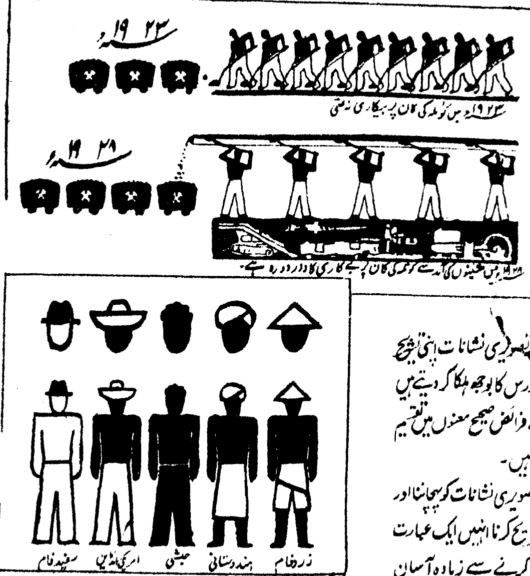
ابھی سے ان بڑھتے ہوئے تصویری نشانات کی لغات بن رہی ہے۔ انہیں کے ذریعے سے مشینیں، شہروں کے نقشے، اعداد و شمار، آبادی کی ترقیاں، تاریخی واقعات، گندم، لوہے اور سیمنٹ وغیرہ کی پیدائش اور لاگت کے تفاوت بیان کئے جاتے ہیں بعض اوقات ایک کتاب کا مضمون ایک چھوٹے سے تصویری قرطاس پر سما جاتا ہے۔

جن لوگوں کو یہ الفاظ اور ان کی قواعد از بر ہے ان کے لئے فقرے بنائے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر نیورتھ کے تصویری نشانات الفاظ کے ہم معنی ہیں۔ اُن کھیل کی اینٹوں کی طرح جنہیں جوڑ جوڑ کر بچے عمارتوں کے نمونے کھڑے کر لیتے ہیں، ان نشانات کو جوڑ کر حقائق اور خیالات بیان کئے جا سکتے ہیں۔ ان نشانات کی بنی ہوئی ایک ہی تصویر دیکھنے والے کے دل سے ایک کہانی بیان کر دیتی ہے۔

تصویری زبان کا ہر نشان نہایت سادہ اور عام فہم ہوتا ہے۔ غیر ضروری تفصیلات نظر انداز کر دی جاتی ہیں۔ ہر چیز کا انتہائی درجہ تک اختصار کیا جاتا ہے۔ انسانی تصاویر کے چہرے نہیں بنائے جاتے ـــ صرف سر کافی سمجھا جاتا ہے، ہاتھ غیر ضروری سمجھے جاتے ہیں ـــ صرف بازو بنائے جاتے ہیں۔ ٹوپی کی موجودگی یا غیر موجودگی کسی کو سفید فام، لاطینی، امریکی انڈین، ہندوستانی حبشی یا منگولی ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے۔ جوتی کی شکل پوری سپاہی میں۔ کارخانے کی ایک مستطیل خاکہ اور اس پر چمنی کا نشان۔ جوتی کو مستطیل میں رکھ دیجئے تو اس کا مطلب ہوا "جوتی کا کارخانہ" اور چمنی سے دھواں نکلتا ہوا دکھائی دے اور دروازے کھلے ہوں تو کارخانہ مصروف کار ہے۔ اگر دھواں نہ نکل رہا ہو اور دروازے بند ہوں تو کارخانہ بیکار پڑا ہوا ہے۔ ٹیلیفون کے آلے کی تصویر اور ایک تیر کا نشان دنیا کے کسی حصے میں یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ اس جگہ سے ٹیلیفون کیا جا سکتا ہے۔ سکوں کو اوپر تلے جوڑ کر رکھنے کے معنی ہیں "روپیہ"۔ ہوائی جہاز پر ایک چٹھی کی شکل کا مطلب ہے "ہوائی ڈاک"۔

بیرونِ ملک میں تصویری نشانات کی تعلیم، قدر و قیمت ابھی سے

معلوم ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر نیورتھ کہتے ہیں کہ "اچھی تصاویر کی موجودگی میں اچھے معلموں کی ضرورت نہیں رہتی۔ نیز اس کے ذریعے سے بُرے معلم کے نقصانات کا اندیشہ نہیں رہتا۔" دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ بچے اعلیٰ درجے کی تصاویر کی مدد سے ادنیٰ درجہ کے مدرسوں سے بھی صحیح تعلیم حاصل کرسکتے ہیں یہ اس لئے کہ تصویری نشانات اپنی تشریح خود کرکے مدرس کا بوجھ ہلکا کر دیتے ہیں اور تعلیم کے فرائض صحیح معنوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔



تصویری نشانات کو پہچاننا اور ان کی تشریح کرنا انہیں ایک عبارت میں منسلک کرنے سے زیادہ آسان ہے۔ عبارت لکھنے کے لئے کچھ عرصہ باقاعدہ تعلیم لینی پڑتی ہے۔ لیکن اس کے نتیجے میں ایک ایسی تصویری زبان پر مہارت حاصل ہو جاتی ہے جو دنیا کی تمام زبانوں کے مقابلے میں زیادہ عالمگیر، آسان اور جلد تر سمجھ میں آنے والی ہوتی ہے۔ اس کی تشریح کے لئے صرف چند الفاظ کہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً — "ایک تصویر . . . . ۲۰۰ آدمیوں کو ظاہر کرتی ہے" اور یہ الفاظ ملکی زبان ہی میں لکھے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے نیورتھ کی تصاویر جغرافیائی نقشوں کی طرح ہیں جنہیں بہت کم تفصیل کی ضرورت ہوتی ہے۔

عام طور پر کسی عبارت کو بیان کرنے کے لئے تصاویر سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن بعض اوقات تصاویر کو واضح کرنے کے لئے عبارت کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور یہ سلیس اور سادہ عبارت اپنی تصویر کے ساتھ ضروری تعلقات ظاہر کرنے کے لئے نہایت اختصار کے ساتھ استعمال کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر نیورتھ نے یورپ میں آلہ نشر الصوت پر کئی فی البدیہہ تقریریں کی ہیں جن کا تمام تر مواد صرف تصویری زبان میں اس کے پاس ہوتا تھا اور اس کی یہی تقریریں سادہ ترین اور مشہور ترین ثابت ہوئیں

۱۔ جوتی
۲۔ کارخانہ
۳۔ جوتی کا کارخانہ
۴۔ مشین سے بنی ہوئی جوتی
۵۔ ہاتھ " " "

جس طرح کوئی معمار عمارت بناتے وقت ایک ایک اینٹ نیلے رنگ کے نقشے کی ہدایات کے مطابق رکھتا ہے اسی طرح تصویری زبان کو لکھنے والا کوئی حق نہیں رکھتا کہ اپنے تخیل یا مرضی سے اس کی ترتیب میں دخل دے۔ وہ صرف ایک اوزار ہے اس ماہر فن کے ہاتھ میں جس نے اس بات کا اچھی طرح مطالعہ کرلیا ہے کہ ہر سائنسدان، مورخ یا ماہر اقتصادیات کو اپنے پیغامات کس طرح لکھنے ہیں اور اس نے فیصلہ کرلیا ہے کہ ہر ضرورت کے لئے کون سے اشارات استعمال کئے جائیں گے اور مطلوبہ مطلب واضح کرنے کے لئے کم از کم دماغی کاوش کے ساتھ انہیں کس طرح ترتیب دیا جائے گا۔

اس عمل کا نام "تبدیل ہیئت" ہے۔ ماری ریڈمیسٹر اس عمل میں سب سے زیادہ ماہر ہے۔ تصویری اشارات کے بنانے میں جرٹ اَنٹز اور اروِن برنتھ کامل ترین ہیں۔

اس تحریر کی تصاویر ہمیشہ جذبات سے معرا، ٹھوس، حقیقی اور ہمیشہ ایسی عملی ہوتی ہیں جیسے ہتھوڑا یا دانتوں کا برش۔ جذبات کو بالکل خارج کر دیا جاتا ہے۔ اگر عام کتابیں ایسی ہی حقائق پر منطبق ہوں

تو انسان اکتا جاتا ہے، اور تصاویر سے انسان اتنی جلدی تنگ نہیں آتا۔ لیکن ان کی ترتیب اور استعمال میں بدرجہ غایت احتیاط کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ مطالب ذرا سی بے احتیاطی سے بدل جاتے ہیں" ڈاکٹر نیورتھ کہتے ہیں۔ اسی لئے وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ نشانات نہایت سادہ اور کم از کم خطوط پر مشتمل ہونے چاہئیں۔ غیر ضروری اور تزئینی تفصیلات سے کلیتۂ احتراز کرنا چاہئے۔ اُن کے قواعد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "کوئی چیز صرف اس لئے شامل نہ کرو کہ وہ تمہیں دلچسپ یا خوب صورت معلوم ہوتی ہے اور اپنی مصورانہ قابلیت کا اظہار نہ کرو"

تصویری تحریر بڑے بڑے مصوروں کے شاہکاروں سے ایک بالکل مختلف چیز ہے۔ ان شاہکاروں کو تم جتنے غور کے ساتھ دیکھو گے ان میں نئی نئی خوبیاں یا برائیاں ظاہر ہوں گی لیکن تصویری تحریر میں ایسے عمق فوراً ختم ہو جاتے ہیں۔ پہلی ہی نظر میں تمام روئیداد آپ پر منکشف ہو جائے گی، دوسری نظر میں کچھ معمولی سے نکات، تیسری میں کچھ اور زوائد جو لکھنے والے نے ڈال دئیے ہوں گے اور اگر چوتھی نظر کی بھی ضرورت ہے . . . تو ڈاکٹر نیورتھ گرج کر کہتے ہیں "اسے اٹھالو۔ اس میں بے ہودہ تفصیلات ہیں"

یہ نشانات ہر تعلیمی ضرورت کے لئے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ سائنس کی ترویج کے لئے، جنگ کے اثرات اور سرد بازاری کو دور کرنے کے لئے دباؤں کے استیصال کے بہترین طریقے بتانے کے لئے اور غیر ملکی زبانوں کی تعلیم کے لئے۔ بچے بھی بجائے کھلونوں سے کھیلنے کے ان سے تعلیمی کھیلیں کھیل کر مستفید ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر نیورتھ نے پچیس اور جوڈی کی کھیلیں انہیں تصاویر سے تیار کی ہیں۔ ان کا طریقہ نہ صرف آسان فہم اور جامع ہے بلکہ زمانے اور عام تعلیمی طریقوں سے بالکل جداگانہ اور آزاد ہے۔

اس زبان کی تحریر اور تقریر استعمال کرنے والے طبقے کی استعداد کے مطابق مختلف ہے۔ طبع شدہ پیغامات، بچے کے قاعدہ میں، اخبار کے صفحات میں، کیمیا کے کورس میں، سادہ ترین صورت سے مشکل ترین فنی اصطلاحات تک بدلتے چلے جاتے ہیں۔ اقتصادیات کے کسی نظریئے پر لکھی ہوئی کتاب مزدور کی فہم سے یقیناً بالا ہو گی۔

تصویری تحریر کا اولین مقصد اس عقلی خلیج کو قابل عبور بنانا ہے جو کالج کے پروفیسر اور عام طبقے میں حائل ہے تاکہ وہ اپنا مدعا ان پر واضح کر سکے اور یقیناً پروفیسر مدرسہ کی معمولی تعلیم کے مقابلے میں تصویری تحریر سے بہت کچھ زیادہ اخذ کر سکے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک ذہین اور حساس ناول نویس کسی غیر شہر میں گھومتے ہوئے اس شہر کی عبادت گاہوں، دکانوں اور راہ گیروں میں وہ کچھ دیکھتا ہے جو ایک وہیں رہنے والے مزدور کو کبھی نظر نہیں آتا۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی ممکن ہے کہ تصاویر میں سے شہر اور اس کے نظاروں کی طرح مزدور کو وہ کچھ حاصل ہو جائے جو ناول نویس کو نظر نہیں آیا۔

تصویری تحریر کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ اسے لکھنے کے عام رائج طریقوں کے بجائے استعمال کیا جائے۔ اس کا استعمال محدود ہے ــــ الفاظ اور نظرات سے بھی زیادہ محدود۔ وہ اپنے مطالب و معانی کے بیان اور زود فہمی میں یکتا ہیں۔

نیورتھ کا باصری تعلیم کا یہ طریقہ ابھی سے وسیع پیمانے پر استعمال ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں ریاست ہائے متحدہ سب سے پیش پیش ہیں۔ لیکن اس کی تعلیم اور استعمال میں یکسانیت ملحوظ نہیں رکھی جاتی۔ ہر مدرس، مشتہر، مصور، سرکاری محکمہ یا کاروباری دفتر اپنے اپنے طریقے پر بلا لحاظ قواعد او ہجا کے اس میں ترمیم و تنسیخ کر لیتا ہے۔ اگر تصویری تحریر کو فرانسیسی اور چینی کے لئے ایک ہی سے معانی کا حامل بننا ہے تو اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ قواعد کی قطعی طور پر پابندی کی جائے ـــ ایک حکم مقرر کیا جائے جو اس بات کا فیصلہ کیا کرے کہ کون سے نشانات استعمال کئے جائیں اور انہیں کس طرح جوڑا جائے۔

اس نئی بین الاقوامی تصویری زبان کی ترویج اور اس کے نشانات کی لغات بنانے کے لئے ہالینڈ کے شہر ہیگ میں ایک انجمن کی بنیاد ڈالی گئی ہے جس کے صدر ایم فیلڈرس ہیں۔ اسی ملک میں ایک ایسے مرکزی مدرسہ کی بنیاد بھی رکھی جانے والی ہے جہاں تصویری نشانات تیار ہوں گے اور اس طریقے کے معلموں کو تیار کیا جائے گا۔

ایک جامع اللغات بھی بنے گی ـــ جو عجیب ترین اور مفید ترین جامع ہو گی۔ یہ لغات تمام تر ڈاکٹر نیورتھ کے تصویری اشارات پر مشتمل ہو گی اور عام الفاظ صرف اتنے ہوں گے جن سے اشارات کی توضیح کرنا مقصود ہو گا۔ یہ جامع کسی زید بکر کو دیجئے یا آئن سٹائن کو۔ دونوں پانچ منٹ میں اس سے اتنا استفادہ حاصل کر لیں گے جتنا معمولی لغاتوں میں سے کروڑوں الفاظ پڑھ کر حاصل کیا جاتا ہے

"نیویارک ٹائمز"

حیات بعد الموت ؟

"ادارہ حیات ثانیہ" میں محیر العقول تجربات عمل میں لائے جا رہے ہیں۔ یہاں مرے ہوئے پھر جی اٹھتے ہوئے اور اپنی بقایا زندگی حسب معمول گزارتے ہیں۔

لیکن ابھی تک —— جیسا کہ اس قسم کے تجربات کا قاعدہ ہے —— ان تجربات کے معمول بے زبان جانور ہیں جنہیں پہلے تو اپریشن کے میز پر ڈال کر مار دیا جاتا ہے اور پھر انہیں دوبارہ زندہ کیا جاتا ہے۔

لیکن کیا —— ان بے زبانوں پر ظلم کیا جاتا ہے یا یہ سب کچھ رحم اور نرمی سے عمل میں آتا ہے؟ اس کے متعلق جو حقائق حکومت روسیہ کے ایک افسر نے لندن میں ایک نمایندۂ اخبار سے بیان کئے حسب ذیل ہیں۔ اب قارئین اسے پڑھ کر اس عمل کے موقوف بہ رحم یا عقلمندی کے متعلق خود فیصلہ کرلیں، لیکن یہ بات یقینی ہے کہ یہ عمل موجودہ زمانے میں سائنس کی تحقیقات کے سلسلے میں سب سے زیادہ محیر العقول ہے۔

یہ تجربات ماسکو کے "ادارہ حیات ثانیہ" میں ڈاکٹر سرجی برو خانکو کے زیر عمل ہیں۔

اس قابل ڈاکٹر نے ایک آلہ ایجاد کیا ہے جو مردے کو دوبارہ زندہ کر دیتا ہے۔ یہ آلہ اصل میں ایک مصنوعی دل ہے۔

کچھ عرصہ ہوا رائل انسٹی ٹیوٹ لندن میں ایک ڈاکٹر نے ایک مرے ہوئے کتے کے دل کو دوبارہ متحرک کرکے دیکھنے والوں کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ ڈاکٹر برو خانکو اس سے کچھ اور آگے بڑھ گئے ہیں۔

آپ نے ایک کتے کا سر جسم سے کاٹ کر الگ کر دیا اور پھر اسے اپنی مشین کے ساتھ جوڑ کر چھ مہینے تک زندہ رکھا۔ دوران خون مصنوعی طور پر اس میں جاری رکھا گیا۔

اس کے بعد دوسرا قدم پورے جسم کو زندہ کرنا تھا۔ کتے کو مارنے کے کافی دیر بعد دوران خون پیدا کیا گیا اور کتا دوبارہ زندہ ہوگیا۔

ڈاکٹر کے تحقیقاتی کام میں مدد دینے کے لئے حکام نے ایک خاص معمل تیار کر دیا ہے جس کا سرکاری نام انسٹی ٹیوٹ آف اکسپیریمنٹل فزیالوجی اینڈ تھیراپی ہے۔

اس معمل میں اس وقت پانچ کتے اپنی دوسری زندگیاں گزار رہے ہیں۔ گزشتہ اگست میں بعض کو زہر دے کر اور بعض کو خون نکال کر ہلاک کیا گیا تھا۔

ایک کتیا آج کل ہی میں بچے دینے والی ہے یہ اور اس کا جوڑا دونوں دوبارہ زندہ کئے ہوئے جانوروں میں سے ہیں۔

ان تجربات سے ڈاکٹر برو خانکو کو یقین دلا دیا ہے کہ انسانی اجسام پر بھی پوری کامیابی کے ساتھ یہی عمل کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا قول ہے کہ "موت عجیب و غریب طبیعی عمل ہے جو متعدد درجات پر منقسم ہے۔ ہم اس بات کے معلوم کرنے کی کوشش میں ہیں کہ کس درجہ پر ہم زندگی لوٹا لانے پر قادر ہیں اور کہاں ہم بے بس ہو جاتے ہیں۔

ہم ان مدارج میں سے ہر ایک کی مدت عمل معلوم کرنے کی کوشش میں ہیں۔ اس سے قبل یہ سمجھا جاتا تھا کہ اگر موت اور عمل حیات ثانیہ کے درمیان پانچ منٹ سے زیادہ عرصہ گزر جائے تو عمل حیات بیکار رہے لیکن اس وقت جانور کو مارنے کے بعد معینہ مدت سے بہت زیادہ وقفہ گذار دیا جاتا ہے۔"

انسانی اجسام پر ان تجربات کے ہونے پر جب کبھی بھی وہ عمل میں آئیں بہت سے اختلافات کے پیدا ہونے کا امکان ہے۔

"لندن گزٹ"

"لندن گزٹ" جس کا ایک خاص ضمیمہ ۱۲ر جنوری کو تاجپوشی کی تاریخ مشتہر کرنے کے لئے شائع ہوا۔ انگلستان کا سب سے پرانا اخبار ہے۔

یہ اخبار سب سے پہلے، ۷ر نومبر ۱۶۶۵ء کو آکسفورڈ سے شائع ہوا تھا کیونکہ اس وقت لندن میں پلیگ کی وبا پھیل رہی تھی اور دربار آکسفورڈ میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اس وقت سے ہفتہ میں دو مرتبہ منگل اور جمعہ کے روز شائع ہوتا رہا ہے یا جب کبھی خاص ضمیمہ کی ضرورت محسوس ہوئی ۱۹۲۳ء میں مزدور طبقے کے کسی جھگڑے کی وجہ سے ۲۵۰ سال میں پہلی مرتبہ اس کی اشاعت رک گئی۔

حکومت کے عام اعلانات "گزٹ" کے ذریعے سے شائع ہوتے ہیں اور قانون کا مدعا پورا کرنے کے لئے چند اشتہارات بھی شائع کرنے پڑتے ہیں ۱۸۴۷ء میں جب انگلستان میں ریلوے کا جنون ہو رہا تھا اور ریلوے کمپنیوں کے اعلانات کی بھرمار تھی گزٹ کی ہفتہ وار اشاعت کا حجم ۳۰۰۰ صفحات تک بڑھ گیا تھا

گذشتہ بدھ ۳ر فروری ۱۹۳۷ء کے روز اس کی اشاعت کا نمبر ۲۴۳۶۷ تھا۔

منصور احمد

مہاتما گاندھی سے بات چیت ٹھیٹ اردو میں

مہاتما جی۔ پرنام۔ ڈاکٹر تارا چند جی سے میں نے جو باتیں کیں وہ آپ نے سنی تو ہوں گی۔ انہیں باتوں میں بھارتیہ ساہتیہ پریشد پرچار کی بات چیت بھی چھڑ گئی تھی جس پر میں نے اُن سے یہ بھی کہا تھا۔ میں کبھی کھُل کر اس پر گاندھی جی سے الگ باتیں کروں گا۔ اسے کئی مہینے ہو چکے۔ جب سے اب تک آپ سے باتیں کرنے کا رہ رہ کر دھیان تو آتا رہا پر ادھر اُدھر کے بکھیڑوں میں ایسا پھنسا جو ادھر آنا چاہئے یہ بھی اب تک نہ آسکا۔ کچھ دنوں سے ان جھمیلوں سے چھٹکارا ملا ہے۔ آج چاہتا ہوں جو کچھ جی میں ہے اور جو اب تک نہ کہہ سکا وہ سب ایک سانس میں آپ سے کہہ دوں۔ پرماتما کرے آپ ٹھنڈے جی سے اسے دیکھ سکیں۔ کس نے کہا اسے دیکھنے والے تو بہت ہیں اور کیا کہا اس کے پرکھنے والے بہت تھوڑے ہوئے اور ہیں اور ہوں گے۔ کون کہہ رہا ہے اسے چھوڑ کر کیا کہا جا رہا ہے اسی کو جانچئے اور پرتالیئے۔

پہلے یہ جتا دینا چاہتا ہوں:۔ دیس کے پیچھے آپ نے اپنا سُکھ چین سب کچھ کھو دیا۔ اسی کے لئے آپ نے جوگ سادھا۔ نئے نئے ڈھب سے اس سنسار نے آپ کو جھنجھوڑا اور دُکھ پہ دُکھ دیئے۔ دوسرا ہوتا تو سٹ پٹا جاتا اور ہڑبڑا کے نہ جانے کیا کر بیٹھتا۔ پر آپ ٹس سے مس بھی نہ ہوئے اور آپ نے یہ دکھا دیا۔ نہیں لگتی ہے جونک پتھر کو۔ دیس کے سدھرنے کے لئے جو آپ نے اپنے جی میں ٹھان لی، اٹھتے بیٹھتے وہی دھیان ابھی تک ہے اور اپنا سب کچھ تج کے اُسی کے پیچھے آپ دھونی رمائے بیٹھے ہیں۔ ایسا بات کا دھنی اور دُھن کا پکا ہونا ہنسی کھیل نہیں۔ ہند ماتا کی دکھ بھری کہانی میں سے یہ آپ کی باتیں کسی کے بھُلائے سے بھلائی نہیں جا سکتیں۔ یہ میں نے اس لئے لکھا کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں لکھنے والا مجھے اور آج تک جو میں نے کیا اُسے جانتا ہی نہیں جو کچھ کہنا ہے وہ تو پھر کہوں گا پہلے یہ اک کہانی سُن لیجے:۔

اک برہمن، اک چھتری، اک ویش، اک شودر یہ چاروں الگ الگ گھرانوں کے نہ جانے کیسے ایک جگہ اکٹھے ہو کے جی بہلانے جنگل چلے۔ چلتے چلتے پیاس لگی۔ اِدھر اُدھر ڈھونڈنے پہ بھی کہیں پانی کی اک بوند تک نہ ملی، اور آگے بڑھے تو سامنے اک اکھ دکھائی دی۔ لمبے لمبے اور موٹے موٹے پونڈے کھڑے جھومتے دیکھ کر سبھوں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ لپک کے ایک نے چٹاخ سے ایک گنا توڑ لیا۔ دوسرے نے پٹاخ سے دوسرا۔ جو دو رہ گئے تھے۔ انہوں نے بھی ساتھیوں کی دیکھا دیکھی بڑھ بڑھ کے اپنے اپنے لئے اک اک توڑ لیا۔ گنے توڑتے ہی ایک دوسرے کو سراہنے لگا بھئی کیا کہنا اتنا موٹا اور ایسا لمبا گنا ایک ہی جھٹکے میں یوں جڑ سے اکھیڑ پھینکا۔ کیوں نہ ہو ہونا، برہمن۔ برہمن نے کہا اور تم اپنے چھتری پن کو تو کہتے ہی نہیں۔ کتنا بڑا بانس کا بانس گنا کس پھُرتی سے اکھیڑ لیا۔ ویش اور شودر میں بھی ایسی ہی باتیں ہوئیں۔

اکھ والا دہیں کہیں آڑ میں کھڑا یہ سب سُن رہا تھا۔ سنتے ہی جی ہی جی میں کہنے لگا۔ ارے یہ تو سب کے سب الگ الگ گھرانوں کے ہیں۔ ان سے گنے چھین لینا کوئی بڑی بات نہیں یہ کہہ کے چلا اور ٹھٹکا پھر کچھ سوچ ساچ کے اک لمبا سا چکر کاٹ کے ان چاروں کے سامنے آتے ہی ڈنڈوت کی اور ڈنڈوت کر کے ایک سے یہ کہنے لگا:۔ آپ تو ہمارے مائی باپ برہمن ہیں۔ دھرم اور اس کی پوجا پاٹ آپ ہی سے ہے۔ آپ نہ ہوں تو جگ میں دھرم پرچار کا اجالا ہی نہ رہے اور پورے سنسار میں ایسا اندھیرا گھُپ ہو جائے جو ہاتھ سے ہاتھ نہ سجھائی دے پھر چھتری سے بولا آپ ہی کے بھروسے پر راج جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے آپ ہی کی تلوار کی چھاؤں میں راج پاٹ پھولتا پھلتا ہے۔ یہ چھاؤں نہ ہو تو وہ جھُلس جائے۔ آپ لوگوں سے بھلا میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ویش سے کہا تمہاری کھیتی باڑی کا کھٹن دھندا بھی ایسا نہیں جو کوئی اس کا گن نہ مانے اسی سے سارا جگ بھلا چنگا دکھائی دے رہا ہے۔ نہیں تو گھڑی بھر میں ادھ موا ہو جائے۔ میں تم سے بھی کچھ نہیں کہتا۔ تم نے دو کہا اچھا کیا۔

اب ایک شودر ہی رہ گیا تھا۔ اسے گھور کے کہنے لگا۔ کیوں بے پاجھ تیری یہ دھشانی۔ تجھے تو کچا ہی چبا جاؤں گا۔ ارے بتا۔ تو نے کیا سمجھ کے گنا توڑا۔ یہ کہتے ہی اُسے کھینچتا اور گھسیٹتا ہوا اپنی جھونپڑی میں لے جا ہاتھ پاؤں باندھ کے ڈال آیا۔

چار میں سے ایک کی تو یوں چھٹی ہوئی جو تین بچے وہ اپنے اپنے گنّے لئے لمبے لمبے ڈگ رکھتے آگے بڑھ ہی رہے تھے جو وہ ایکھ والا جھپٹ کے ویش سے آگے بڑھ گیا اور ڈانٹ کے کہنے لگا۔ او بل چلانے والے تجھے بھی یہ دن لگے جو دن دہاڑے یوں ڈاکا ڈالنے لگا۔ یہ گنے کیا تیرے ماتا پتا کے لگائے ہوئے ہیں۔ برہمن، چھتری یہ تو ہمارے مائی باپ ہیں۔ ہم ان کے منگتا اور انہیں کا دیا کھاتے ہیں۔ لو، تو نے بھی پیٹ سے پاؤں نکالے، اور ان کی ریس کرنے لگا۔ یہ کہہ کے اُسے بھی پکڑ دھکڑ کے لے گیا۔

جب وہاں سے وہ جھپٹ ہوا تو برہمن، چھتری دونوں کے دونوں یہ کہتے ہوئے آگے بڑھنے لگے: یہ چلو ہماری تو کرکری نہیں ہوئی یہ کہہ ہی رہے تھے جو وہ پھر دوڑتا ہوا آگے بڑھ کے چھتری سے جا بھڑا اور اُسے روک کر کہنے لگا۔ کیوں جی کیا تم چھتری ہو۔ چھتری کیا ایسے ہی لٹیرے ہوا کرتے ہیں۔ بڑے آئے وہاں سے چھتری بن کے۔ ایسے چھتری دتری بہت سے دیکھے ہیں۔ یہ کہتے کہتے اس کی بھی کوئی بھرلی۔ چھتری نے بہت ہیر پھیر کی اور پنڈت جی نے بھی بہت چھڑانا چاہا پر اس نے کسی کی بھی۔ نہ مانی اور اسے بھی جھونپڑی میں لے جا باندھ بوندھ کے ڈال آیا۔

برہمن کہنے لگے۔ ساتھی گئے تو گئے ہم تو بچ گئے۔ وہ کانٹیاں ہتھ چھُٹ اور منہ پھٹ ایکھ والا بھلا ایک کو کیسے چھوڑ دیتا۔ پنڈت جی ہانپتے، کانپتے بھاگوں بھاگ پیچھے چلے جا رہے تھے جو وہ پھر جھونپڑی سے نکلا اور نکلتے ہی وہیں سے للکارا۔ للکارتا ہوا جھپٹا اور جھپٹ کے پنڈت جی کو بھی جا دبوچا۔

کہنے کو تو یہ ایک کہانی ہے۔ پر سمجھ والوں کے لئے اسی میں بہت سی سیکھنے کی باتیں چھپی ہوئی ہیں۔ اپنی اپنی پڑی ہونے سے اک دُھن کے پکے نے اپنے سے چوگنوں کو کیسے باندھ کے ڈال دیا۔ ان میں اتنا ہی ایکا ہوتا جیسے یہ سب مل کے ساتھ آئے تھے تو بھلا ایک تو ایک دُگنے تگنے بھی ایسے جھٹ پٹ ان کا بال بیکا نہیں کر سکتے تھے۔

آج کل دیس میں بھی ایسی ہی آپا دھاپی کی ہولی کھیلی جا رہی ہے راج نے کسی کو ڈھیل دی اور کسی کو جکڑ دیا۔ جدھر ڈھیل آئی ادھر والے اپنے آپے میں نہیں، ―――― مونچھوں کو تاؤ دے دے کے لگے بنکا رنے اور ٹوپیاں اُچھالنے۔ یہ دھیان ہی نہیں آتا۔ ڈھیل دی تو کیا ہوا ہیں تو سب کے سب بندھے ہوئے۔ اس کا بھروسہ ہی کیا آج کی ڈھیل کل کھینچ بھی تو سکتی ہے۔ ایک جگہ کا اٹھنا بیٹھنا، رہنا سہنا۔ اس پر آپس میں آئے دن کی دانتا کلکل۔ "ساہتیہ پریشد" میں جو آپ نے کہا کوئی اور اس سے بڑھ کر بھی کہتا تو اُسے کوئی دیکھتا بھی نہیں۔ اچھا تو اسی کا ہے۔ آپ کے منہ سے ایسی ایسی باتیں نکلیں جو کوئی دوسرا کہے تو سب انہیں انکل پچو سمجھیں۔

پہلے تو یہی دیکھ لیجئے۔ دیس کے لئے ابھی کیا کچھ کرنا نہیں۔ آپ برسوں سے نیند کے ماتوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کے جگانا چاہتے ہیں۔ پھر کیا سب کے سب جاگ اٹھے؟ بہت سے بہت ہوا تو یہی گھوڑے بیچ کے سونے والوں نے آپ کے جھنجھوڑنے سے ہوں ہوں کرکے کروٹیں لیں۔ ہاتھ ادھر جھٹکے، پاؤں اُدھر پٹکے، جمائیوں پہ جمائیاں اور انگڑائیوں پہ انگڑائیاں لیتے لیتے پھر آنکھیں میچیں اور پھر خراٹے لینے لگے اور آپ کا جھنجھوڑنا ان کے لئے لوری بن گیا۔

"ساہتیہ پریشد" کی دھوم دھام بیتا رہی ہے۔ دیس کے لئے جو کچھ ہونا چاہئے تھا وہ سب ہو چکنے سے سب کے سب انند اور نچنت ہو کر نئی بھاشا کے پرچار میں لگے ہوئے ہیں۔ بھاشا واشا کی دیکھ بھال جانچ پڑتال، ناپ تول کا کھٹراگ اُس گھڑی کے لئے ہے۔ جب کٹھن باتوں میں سے ایک ایک کر کے سب کی سب پوری ہو چکی ہوں۔

دیس کس جنجال میں پھنسا ہوا ہے۔ کنگلاپن کتنا بڑھتا چلا جاتا ہے اور پورا دیس کیسا اپاہج ہو کے رہ گیا ہے۔ اپنے بل بوتے پر آج تک نہ یہ کچھ کر سکا اور آپس میں یہی "تناریری" رہی تو آگے بھی یہ کچھ کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ جب ابھی تک دیس کی کسی بات کا بھی ٹھیک ٹھاک نہیں تو سب چھوڑ چھاڑ کے پہلے دیس ہی کو سدھارئیے پھر جو جی چاہے وہ کیجئے۔

گھر میں تو پُتّن پڑی ہے۔ کہرام مچا ہوا ہے۔ بھیانک چیخوں سے کان پھٹے جا رہے ہیں جیسے بھیڑوں کا ریوڑ تتر بتر ہو کے اِدھر اُدھر مارا مارا پڑا پھرتا ہو۔ ایسے ہی دیس والے بھی ہیں۔ آپس میں جوتی پیزار، گالم گلوچ اور بھوگ سنائے جا رہے ہیں۔

ایسے دنوں میں "بھارتیہ ساہتیہ پریشد" کی نیو رکھنا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اس کے پرچار پر اڑنا ایسا ہی ہے جیسے کسی گھر میں تو آگ لگی ہوئی ہو، دھڑ دھڑ گھر جل رہا ہو اور اُس کے رہنے والے آگ بجھانے کی جگہ نئے گھر کا ڈیزائن، چھت کی اونچائی، چھپت کی بناوٹ انگنائی کی چوڑائی، جھروکوں، کھڑکیوں کی لمبائی اور پورے گھر میں کہاں کہاں پھول پتیاں بنائی جائیں گی، گھر سجنے کے لئے اور کیا کیا ہونا چاہئے۔ ایسی ایسی باتیں کھڑے سوچتے رہیں۔ گھر بنے تیجے اس کے سجنے کے لئے آپ جو چاہیں کریں کوئی ٹوک نہیں سکتا گھر بننا کیسا ابھی تو بھرا گھرا اجڑ رہا ہے اور اس کے بننے کی گھڑی آنے تک نہ جانے ابھی کیا کیا ہونا ہے تو ایسی کھچڑی پکانا آپ کے لئے تو ٹھیک نہیں۔

یہ تو سوچئے۔ آپ کدھر جا رہے تھے اور لوگوں کے بہکانے سے بھٹک کے کدھر چلے آئے۔ پہلے آنے میں تو کچھ نہ تھا۔ پر اڑنا اور یہیں جم کے بیٹھ جانا تو اچھا نہیں۔

کوئی بڑا بکیت، جیالا پھکیت، منچلا سورما اپنا سب کچھ لٹا کے دُہری، تہری بیڑیوں، ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے دیس والوں کے چھڑانے کی دُھن میں ہٹ پٹ اٹھ کھڑا ہوا اور لڑائی کی بھڑکتی ہوئی آگ میں کود کے ——— سوجھ بوجھ اور نت نئی گھاتوں سے جم کے ایسا لڑے جو دوسروں کے دانت کھٹے کر دے اور چھکے چھڑا دے۔ پھر وہی ایکا ایکی لڑائی بھڑائی چھوڑ چھاڑ گھومتا گھامتا بھاشا کے پرچار کرنے والوں میں آ بیٹھے اور ان کے سکھانے پڑھانے سے انہیں کا ساتھ دینے پر اڑ جائے تو اسے یہاں بیٹھا دیکھ کے دیکھنے والے اپنی اپنی سی کہنے لگیں گے۔ کوئی کہے گا لڑائی بھڑائی کے جوکھوں میں پڑنا منہ کا نوالا نہیں جو چپ چاپ نگل لیا جائے۔ دیکھا نا، جو کہتے تھے وہی ہوا۔ پہلے کیسی اکڑ مکڑ دکھائی اور پھر ٹائیں ٹائیں فش۔ جب وہاں نہ ٹھہرا گیا تو لڑائی سے جی چرا کے یہاں بیٹھنا ہی پڑا۔

دوسرا کہے گا۔ نہیں بھئی یہ بات نہیں۔ لڑائی کو بھی تو دیکھو۔ گھنٹے دو گھنٹے، ایک دن دو دن، مہینے دو مہینے کی نہیں برسوں ہو چکے۔ ہاتھ پاؤں کب تک چل سکتے ہیں۔ گھڑی بھر اُنگلی ہلا کے تو دیکھو کتنی سوجھتی ہے۔ لڑتے لڑتے ہاتھ پاؤں تھک کے چور ہو گئے ہوں گے سستانے کے لئے کہیں بیٹھنا بھی کیا بودا پن ہے۔ تیسرا کہے گا بیٹھنا تو بودا پن نہیں پر جم کے بیٹھنا وہ نہیں تو پھر کیا ہے۔

جتنے منہ اتنی باتیں ہوں گی۔ ساتھ ہی سوجھ بوجھ والے بھی یہی کہیں گے۔ ایسے منچلے کے لئے سب سے پہلے دیس ہی کی سیوا چاہئے۔ دیس کے پورے بندھن جب کُھل چکیں تو بھاشا واشا کا پرچار سب کچھ اس سے کہیں بڑھ چڑھ کے ہو سکتا ہے اور جب تک دیس نہ سنبھلے تب تک ایسے اُلجھاوے میں اُلجھنا نہ چاہئے۔

بکسر کی لڑائی سے ایک بانکے منہ موڑ کے چلے۔ دیکھنے والوں نے ٹوکا۔ ہائیں یہ کیا۔ آپ کی تیغ بھکیتی کی تو دھوم تھی۔ بڑے بڑے جیالے لوہا مانتے تھے۔ جب آپ ہی نہ جم سکے تو پھر کون جمے گا اور اس گڑھی کو پھر کون جیتے گا۔ اس ٹوکنے پہ بانکے پلٹے اور جھنجھلا کے کہنے لگے۔ کیا کہتے ہو۔ تم کیا جانو۔ نہیں تو یہی آتا ہے جو منہ میں آیا بک دیا۔ کیا کہیں ان آنکھوں سے کیا کیا دیکھ لیا۔ ایسے ایسے تیغے جو نک سک سے ٹھیک۔ ڈیل ڈول کے اچھے پورے اور ایسے سجیلے جدھر سے نکل جائیں دیکھنے والوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جائیں اور چھوٹے بڑے سب کی ٹکٹکی بندھ جائے۔ ان میں کا ایک ایک سیکڑوں پہ بھاری۔ رہتا بھی ہو تو لاکھوں کے ٹڈی دل میں گھس کے دانتوں سے بوٹیاں کاٹ کاٹ کے تھوک دے اور منچلوں کا پتا پانی کر دے۔

ایسے ایسے جیالوں کے دھڑ گولیوں سے چھلنی چھلنی ہوتے ہوئے دیکھے۔ اس سب کچھ ہونے پر بھی دیکھنے کی بات یہ ہے۔ جس جگہ ان کے پاؤں جم گئے پھر وہاں سے نہ ہٹے اور وہیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کے ٹھنڈے ہو گئے۔ بھلا یہ بھی کوئی لڑائی ہے۔ اس سے تو ہیجڑوں کی لڑائی اچھی کوئی کوس بھر سے ٹھائیں ٹھائیں ہونے لگی اور یہاں جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی۔ تلوار کے دھنی تھے تو منہ کیوں چھپایا۔ آمنے سامنے ہو کے دو دو ہاتھ ہمارے بھی دیکھ لئے ہوتے۔ کھیرے ککڑیاں جیسے کٹتی ہیں، ایسے ہی گھڑی بھر میں پرے کے پرے کاٹ کے نہ رکھ دیتے تو یہ اپنی مونچھیں منڈا ڈالتے۔ اب یہ جگہ منچلوں کے ٹھہرنے کی نہیں اور سچ تو یہ ہے اب جینا دوبھر ہو گیا۔

پہلے کبھی بانکوں کی بڑی دھاک تھی اور مرتے بھی تھے بڑے تلوریے۔ پھر بھی ان میں ادل جلول پن بہت ہوا کرتا تھا پر آپ تو ایسے نہیں۔ آپ میں جو سمجھ، سوجھ بوجھ اور اچھی اچھی باتیں پرمیشر نے اکٹھی کر دی ہیں۔ وہ پہلے کے بانکوں میں کہاں۔ آج آپ ہی ہند ماتا کے اکلوتے

بلکے ہیں۔ دیس کا اکھاڑا کھدا ہوا ہے اور اس میں برسوں سے راج کے ساتھ آپ کی گتھم گتھا ہو رہی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو رگید رگید کے جیت کرنے کی گھات میں لگے ہوئے ہیں۔ دیکھنے والوں کے جتھے کے جتھے اور ٹولیوں کی ٹولیاں پرا جمائے آپ کے اس بھڑنے کو بڑے اچنبھے سے دیکھ رہی ہیں۔ پر کچھ دنوں سے جو آپ اس اکھاڑے سے نکل کر دوسرے دھندے میں لگ گئے۔ اس پر اپنے پرائے سب میں کانا پھوسی ہو رہی ہے اور کہا جا رہا ہے۔ مہاتما جی سیدھے جاتے جاتے یہ کدھر مڑ گئے۔

آپ کے ادھر آنے سے دیس کی بات کہیں ادھوری ہو کے رہ گئی تو پھر ادھر ہی جائیے نا اور دیس ہی کے لئے جو بن پڑے وہ کیجئے۔ رہا بھاشا کی گتھیاں سلجھانا اسے پھر کبھی کے لئے اٹھا رکھئے۔ بھاشا کیا کہیں بھاگی جا رہی ہے جو اس کی روک تھام ابھی ہو سکتی ہے پھر نہ ہو سکے گی۔ جدھر آپ جا رہے تھے اس کے سامنے بھاشا واشا ہے کیا۔ انت ہو کے ایسے سیکڑوں کھیل کھیلے جا سکتے ہیں۔

گاؤں میں دیکھا ہوگا جو ہاٹ آج بھرا، پھر سات دن تک یونہی سنسان پڑا رہتا ہے۔ اس سنسار میں جو جو دھندے لوگ کر رہے ہیں کچھ ہی دنوں کے لئے ان دھندوں سے انہیں الگ رکھا جائے تو وہ پہلے سے نہیں رہتے۔ سینے پرونے والوں سے سلائی، بڑھئیوں سے لکڑی کی چیر چاڑ، لوہاروں سے لوہے کی پیٹ پاٹ، کمہاروں سے مٹی کی تھوپ تھاپ، لکھنے پڑھنے والوں سے لکھت پڑھت، سوچ بچار بہت نہیں تھوڑے ہی دنوں کے لئے یہ ان سے چھڑا کے دیکھ لیجئے۔ ان میں سے کسی میں بھی پہلے کی سی بات نہیں رہے گی۔

آج جو کرنا ہے اُسے کل کے لئے اٹھا رکھنے پر بات آئی گئی ہو جاتی ہے۔ آج کا دھندا آج ہی کے ساتھ ہے اسے آج ہی پورا ہو جانا چاہئے۔ کل کا دھندا آج سے الگ ہوگا۔ آج کی بات کل پر چھوڑ دی تو کل کی پرسوں اور پرسوں کی اترسوں پر چھوٹتی رہے گی اور یونہی چھوٹتے چھوٹتے پھر وہ بات ہی چھوٹ جائے گی۔ بات ادھر ٹھنڈی پڑی تو پھر دھیان بھی تتر بتر ہو جاتا ہے۔ ابھی دیس کی بات ٹھنڈی نہیں پڑی ہے۔ یہ سماں ابھی ایسا ہے جس میں بھاشا واشا کو چھوڑ چھاڑ کے پھر آپ دیس کو پکڑ سکتے ہیں اور اس کے لئے [illegible] دوڑ دھوپ کر سکتے ہیں۔ آپ کی دوڑ دھوپ باسی کڑھی کا ابال [illegible] جو کچھ نہ ہو سکے۔ آج کچھ

نہیں ہے تو کل کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا اور آگے بڑھ کر آنکھیں یہ سہانا سماں دیکھیں گی۔

دیس میں میل ملاپ کے جھنڈ کے جھنڈ ایسے چھائے ہوئے ہیں جن کی گھنی چھاؤں میں پریم جل انگڑائیاں لیتا بہہ رہا ہے۔ ایک کے من کی ٹہنیاں دوسرے کے من میں گتھی ہو رہی ہیں۔ پیار کی بیل میل جول کے کھسکتے ہوئے پودوں پر چڑھتی جا رہی ہے۔ پریم کے پھولوں کے گچھے کے گچھے ادھر ادھر لٹک رہے ہیں۔ سکھ چین کے پھولوں کی بھینی بھینی باس سے دیس کا دیس بسا ہوا ہے۔ ہن برسانے والی گھنگھور گھٹائیں سنسار کی آنکھوں میں کاجل لگا رہی ہیں۔ کالے کالے بادلوں کے بھاٹ رہ رہ کے دیس کے گیت گا رہے ہیں۔ کوئل کی کوک، موروں کی جھنکار، پپیہوں کی پکار، ہلکی ہلکی پھوار، سلونی سلونی گھٹاؤں کے اندھیرے گھپ میں رہ رہ کے بجلی کی چمک جیسے کسی جوبن کی متوالی کے بھیگے ہوئے بال سکھانے کے لئے جھٹکنے میں گھڑی گھڑی منہ پہ آ جاتے ہیں۔ ایسے دھندلکے میں دیس کے سپوت آپ کے چرنوں میں جھکے ہوئے چڑھاوے چڑھا رہے ہیں اور آپ دیس کی ہری بھری پھلواری کے منڈوے میں ایسی شبھ گھڑی کو دیکھ دیکھ کے مسکرا رہے ہیں۔

اچھا لگے ہاتھوں اپنی اس نئی بھاشا کو بھی دیکھتے چلئے جس کے پرچار کی دھن میں آپ اپنا اب تک کا کیا کرایا سب اکارت کر دینا چاہتے ہیں۔ اردو میں عربی، فارسی بولوں کی بہتات سے ایسا دھوکا کھایا کہ کھلم کھلا آپ یہ کہہ اٹھے:-

> "اردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے، قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔"

یہ آپ سے کس نے کہہ دیا۔ کہاں مسلمانوں کے دھرم کی بھاشا اور کہاں اردو۔ دونوں میں کوئی لاگ بھی ہے۔ ایسی بات منہ سے نکلنے سے پہلے آپ نے پنڈت جواہر لال نہرو ہی سے پوچھ لیا ہوتا۔

ہندی اردو کے جھگڑے پر پنڈت جواہر لال نہرو نے ڈاکٹر سید محمود کو جو ایک لمبی چوڑی چٹھی لکھی تھی۔ اسی میں ایک جگہ پنڈت جی یہ لکھتے ہیں:-

> "عجیب بات تو یہ ہے کہ نہ جانے ہمارے ملک میں کتنی چیزیں ہیں جو فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر لیتی ہیں۔ زبان کا مسئلہ بھی مذہبی بن

گیا اور بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر تسلیم کر لیا گیا ہے اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ میں بصد ادب عرض کروں گا کہ میں اسے ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اردو کو اپنی زبان سمجھتا ہوں جسے میں بچپن سے بولتا چلا آیا ہوں۔"

لیجئے پنڈت جی تو اردو کو اپنی ایسی بھاشا سمجھ رہے ہیں جسے وہ بچپن سے بولتے چلے آتے ہیں اور آپ اسے مسلمانوں کے دھرم کی بھاشا کہنے پر اڑے ہوئے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے۔ سننے والا کس کا کہا مانے۔ کسے جھٹلائے اور کسے سچ جانے۔ اسی کے ساتھ ساتھ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے مسلم یونیورسٹی یونین میں اردو کانفرنس کے اسٹیج پر "اردو ہماری زبان" کہہ کر جو لمبی چوڑی اسپیچ پڑھی اُسے بھی کہیں نہ کہیں سے سُن لیجے۔ پنڈت جی اسی میں ایک جگہہ یہ کہتے ہیں:۔

"اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ اردو قوموں کے میل جول اور دیسی بدیسی زبانوں کے اختلاط سے پیدا تو ہوگئی لیکن کیا بعد میں بھی ہندو اس کو اپنی زبان سمجھتے رہے اور اس کو استعمال کرتے رہے۔ حضرات میں اس تنقیح کو گُھتھم میں رکھنا پسند نہیں کرتا۔ سنئے ہندوؤں میں تبلیغ مذہب تو عرصے سے بند ہو چکی تھی۔ قریباً دو ہزار برس کے بعد اب پھر تازہ ہوئی ہے۔ اس واقعہ کو نظر میں رکھ کر دیکھنا یہ ہے کہ ہندوؤں میں دھرم پرچار کے سلسلے میں اردو اختیار کی گئی یا نہیں اگر تحقیق سے اس کا جواب اثبات میں ملے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اردو کو ہندوؤں نے اپنے ہندو بھائیوں کی دینی ہدایت کے لئے استعمال کیا۔ انیسویں صدی عیسوی کے اول برسوں میں اچھوت ادھار اور بے تر جنوں کی تبلیغ یا شدھی کا نام تک کوئی نہ جانتا تھا۔ مگر ۱۸۱۹ء میں سمرتو بھاگوت کا دسواں اسکند یعنی باب اردو کی ایک ضخیم مثنوی مسمی آئینہ مسنوی کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یہ کئی سو صفحے کی قلمی کتاب میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ یہ مذہبی اور اعتقادی کتاب ایک ہندو اپنے ہندو بھائیوں کے لئے اچھی اردو نظم میں تصنیف کرتا ہے۔"

پھر پنڈت جی نے ہندو دھرم کی لائبریری میں سے ایسی بہت سی چھوٹی بڑی اردو لکھتوں کا اتا پتا دیا ہے جو پوری کی پوری ہندو دھرم کی باتوں سے بھری پڑی ہیں۔ گھر کے بھیدی کی یہ باتیں بھی سننے کی ہیں:۔

"سنسکرت اور ہندی بھاشاؤں کے ہوتے ساتے ہندوؤں نے اردو کو اور اردو وظائف سے یا زیادہ احتیاط سے یہ کہئے کہ مذہبی اور ملی نظریوں سے خارج نہیں کیا۔ شکت چالیسی ایک اردو کی کتاب اسطوتر یعنی وظیفہ کی ہے۔ یہ اردو کے مخمس ترجیع بند کی صنف سے ہے۔ ہر بند کے چار مصرعے ٹھیٹ اردو میں ہیں اور ترجیع کا مصرعہ "نس نگی" چار بار آتا ہے۔ اس کو میں نے پوجن کے سلسلے میں وظیفہ یا مناجات کی طرح پڑھتے ہوئے دیکھا ہے اور یہ دھیان میں رکھنے کی بات ہے کہ تلسی داس رامائن لکھ چکے تھے اس کی کتھا برابر ہو رہی تھی۔ مہابھارت اور بہت سے پُران اور دوسری مذہبی کتابیں ہندی میں منتقل ہو چکی تھیں لیکن اپنے اہالی ملت میں دھرم پرچار کی کمی محسوس ہوئی جب تک کہ اردو سے کام نہیں لیا گیا۔ اس ضمن میں وہ تمام اردو دنیا کے شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے مہابھارت، رامائن، گیتا، مہاتم شوپران، گنیش پران اور رجانگی بیجے وغیرہ دھرم پستکیں اردو میں تصنیف و ترجمہ کیں۔ یہ کتابیں منشی نول کشور کے مطبع سے چھپ کر آج تک شائع ہو رہی ہیں اور ہندوؤں میں ان کے مذہب کی تلقین اور روایات ملی کے زندہ رکھنے کا زبردست آلہ ہیں۔ ان نظم کی کتابوں کے علاوہ بہت سے اپنشد اور چھنوں شاستر اور سمرتیاں اردو نثر میں منتقل ہو کے شائع ہوئیں اور آج تک ان کی مانگ برابر جاری ہے۔ یہی حال آریہ سماج کے لٹریچر کا ہے۔"

یہ کہانی کہتے کہتے پنڈت جی نے کہی ہوئی باتوں کو پھر ایک جگہہ اکٹھا کر کے اک چیلنج بھی دیا ہے جس کا نچوڑ یہ ہے:۔

"آپ نے دیکھا کہ اردو کی تعمیر و تدوین اور ترویج میں ہندوؤں کا کتنا مقتدر حصہ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ہندوؤں کی مذہبی اور ملی کتابیں کس کثرت سے اردو میں لکھی گئیں اور آپ دیکھتے ہیں کہ بھگوت گیتا کے ایک سے زیادہ نئے ترجمے اور تفسیریں اردو نظم اور نثر میں ہر سال بلاناغہ شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی ہندی والا (میرا مطلب ہے اردو ہندی کے جھگڑے کا علمبردار) اس وقت یہاں موجود ہے تو سامنے آکر بتائے کہ جو واقعات ابھی پیش کئے گئے ان میں سے کونسا صداقت سے محروم ہے۔"

پنڈت کیفی کی باتیں سنتے سنتے آپ اکتا گئے ہوں گے۔ یہاں تک تو آپ سن ہی چکے۔ گنتی کی دو ڈھائی باتیں اور سن لیجئے۔ یہ لکھت کسی

مسلمان کی ہوتی تو ٹھیک مانتے اس میں سے دو بول بھی کبھی زبان نہ نکلتا۔ پر اس کا لکھنے والا ہندو اور ہندو بھی ایسا ویسا نہیں۔ بڑی سوجھ بوجھ کا پنڈت ہے جس کی آنکھیں سچائی پر جمی ہوتی ہیں۔ اپنے ساتھ کے بیٹھے ہوؤں کو پکار پکار کے ادھر ہی بلانا چاہتا ہے جدھر سچائی کا اجالا ہے۔ اس کی لکھت کے ایک ایک بول سے یہی دکھائی دیتا ہے جن باتوں سے دیس بدحال ہوتا جا رہا ہے۔ ان پر دہ جی ہی جی میں کڑھ رہا ہے، اونٹ رہا ہے اور بھنا رہا ہے اس لکھت میں جی کی بھڑاس نکالی ہے اور سچے پتے کی باتیں ایسی ایک جگہ اکٹھی کر دی ہیں جنہیں کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ اسی میں ایک جگہ پنڈت جی نے یہ بھی لکھا ہے۔

"جب مہاتما گاندھی نے اپنے سابرمتی کے آشرم کی بھجناولی مرتب کرنے کا حکم دیا۔ اس وقت بھارتیہ ساہتیہ کا یہ نظریہ جو اب ناگ پور میں ہنگامہ آرا ہوا کہاں چلا گیا تھا۔ یہ معلوم کرنا دلچسپی کا موجب ہوگا کہ مہاتما جی کے مرحوم سابرمتی آشرم کے بھجنوں کے اس ہندی کے مجموعے میں کل ۱۸۱ بھجن ہیں جن میں ۱۰۲ بھجنوں کو ہندوستانی نام دیا گیا ہے۔ باقی ۷۹ بھجن گجراتی، مرہٹی وغیرہ دوسری زبانوں کے ہیں اور یہ واضح رہے کہ ان ۱۰۲ ہندوستانی بھجنوں میں کئی غزلیں بھی ہیں جیسے :۔

ہے بہارِ باغِ دنیا چند روز ٭ دیکھ لو اس کا تماشا چند روز

یہ بھجناولی ہندی میں چھپی ہے۔ اب اگر اردو کے لفظ سے کسی وجہ سے بے اعتنائی ہو گئی تھی تو بھارتیہ ساہتیہ میں ہندوستانی ہی سے کام رکھتے۔"

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی کیا یہ سب باتیں ٹھیک ہیں۔ اچھا انہیں چھوڑیئے۔ بیچ میں بات میں سے بات نکل آئی اور جو کہنا چاہتا تھا نہ کہہ سکا ہیں یہ کہہ رہا تھا اردو میں آپ نے عربی، فارسی بولوں کی ریل پیل دیکھ کے اسے مسلمانوں کے دھرم کی بھاشا سمجھ لیا۔ دیکھئے بات یہ ہوئی۔ اردو کی جب نیو ڈالی جا رہی تھی تو یہاں کے چھوٹے بڑے جتنے سب ہی اس میں لگے ہوئے تھے اور مسلمانوں کا راج تھا اس لئے عربی، فارسی کے بول اردو میں آئے اور بہت آئے اور جو مسلمان راج کی جگہ کوئی اور راج ہوتا تو اسی راج کی بھاشا کے بولوں کی بھیڑ کی بھیڑ اردو میں لگ جاتی۔ کسی بھاشا میں اور دوسری بھاشا کے بولوں کی بھرمار دیکھ کے بے سوچے سمجھے کہہ دینا یہ بھاشا اس جتھے کے دھرم کی بھاشا ہے سوچئے تو یہ کتنی بڑی بھول ہے

آج کل اردو میں انگریزی۔ بول بڑھتے جا رہے ہیں۔ کوئی نہ جاننے والا انگریزی بولوں کی بہتات دیکھ کر اردو کو انگریزوں کے دھرم کی بھاشا کہنے لگے تو سچ کہئے اس کے اس کہنے پر کیا آپ اپنی ہنسی روک سکیں گے

دھرم اور بھاشا ان دونوں کے ڈانڈے الگ الگ ہیں ان دونوں کے گھال میل کو جس سے پوچھئے یہی کہے گا یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ جب دھرم اور بھاشا کا آپس میں گڈمڈ کرنا ٹھیک نہیں کہا جاتا تو منہ سے جو کہا جا رہا ہے وہ کیا کیوں نہیں جاتا۔ چبا چبا کے باتیں کرنا کس لئے۔ دونوں کا میل جول اچھا لگتا ہے تو کھل کر کہہ دیجئے۔ دھرم اور بھاشا کو ہم الگ الگ نہیں دیکھ سکتے اور دونوں کو ملا دینا چاہتے ہیں۔ اس کہنے پر بھی کوئی آپ کو ٹوکے تو اُسے جو جی چاہے کہئے۔ پر جب تک آپ منہ سے یہ نہ کہیں گے تب تک پوچھا گچھی کی گئے بڑھتی ہی رہے گی۔

پہلے پہل جو بھاشا کے جھگڑے کی بھنک کانوں میں پڑی تو میں نے جی میں کہا کہیں ایسا تو نہیں نئے نئے مولوی، ملّا اپنی بڑائی جتانے کے لئے چھانٹ چھانٹ کے ایسے موٹے موٹے اور بھاری بھاری عربی فارسی بول کے بول بات چیت میں ٹھونستے ہیں جو بہت سے ہندو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ بات ہند ودُں کو بُری لگی ہو اور جھلّا کر انہوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ چُننے کی ٹھان لی ہو۔ ساتھ ہی یہ بھی دھیان آیا ایسا تھا بھی تو اس کا یہ توڑ تو نہ تھا جو کیا جا رہا ہے۔ وہ بات ہی کیا تھی۔ دونوں جگہ کے لکھے پڑھے سمجھ والوں کو بلا لیا ہوتا یہ سب ایک جگہ بیٹھ بٹھا کے گھڑی دو گھڑی میں یہ جھگڑا چکا دیتے۔

یہ بھی آج کل کا اک نیا ڈھکوسلا ہے۔ جسے دیکھئے "اردو اور ہندی" کا منتر پڑھ رہا ہے اور اسی کی مالا جپ رہا ہے۔ بہت سے پڑھے لکھوں سے یہ پہیلی بوجھی جا چکی۔ میرا پوچھنا یہی تھا اور ہے۔ جب اردو کا ڈیل ہندی ہی کی مٹی سے بنا ہے تو پھر اردو کے ساتھ اور ہندی لکھنا کس لئے۔ اردو میں ہندی ایسی بیری ہوئی ہے جو کبھی اس سے الگ ہی نہیں ہو سکتی اور کیسے الگ ہو سکتی ہے۔ جب اردو کی کھال، چمڑا، ہڈیاں، ڈھانچہ جو کچھ ہے وہ ہندی ہی ہے۔ اپنی اپنی سب کہہ رہے ہیں اور اسے کوئی دیکھتا ہی نہیں یہ ہے کیا۔ جانچئے تو گھڑی بھر میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ دکھائی دینے لگے گا۔ اس کے پرکھنے اور جانچنے کا ڈھب یہ ہے :۔

دو اچھے پڑھے لکھے سامنے بٹھا کے ایک سے کہئے تم ایسی اردو لکھو جس میں عربی، فارسی بولوں ہی کی ریل پیل ہو اور بھولے سے بھی کہیں ہندی کا ایک آدھ بول تک نہ آئے۔ ہندی کے کسی بول کے نہ آنے پر بھی پوری لکھت اردو ہی رہے۔ دوسرے سے کہا جائے تم عربی، فارسی کو ہاتھ نہ لگاؤ اور ایسی اردو لکھو جس میں عربی، فارسی بولوں کی کہیں چھاں نہ آئے اور پوری کی پوری لکھت ٹھیٹ اردو رہے تو پہلا ایسے ڈھائی بول بھی نہیں لکھ سکتا جس میں اردو پن رہ سکے۔ پہلے لکھنے والے کی لکھت عربی، فارسی بولوں کی ایسی کھچڑی ہو کے رہ جائے گی جسے اردو سے نہ کوئی لگاؤ ہو گا اور نہ کوئی اسے اردو کہہ سکے گا۔

دوسرا لکھنے والا عربی، فارسی بولوں کی بھیڑ چیرتا، ہٹاتا آگے بڑھ کے ٹھیٹ اردو لکھ سکتا ہے تو اردو لکھنے اور بولنے میں ہندی سے کترا کے کوئی کتنا ہی نکلنا چاہے کبھی نہیں نکل سکتا اور کیسے نکل سکتا ہے جب اردو کے پتلے میں پوری مٹی ہندی ہی کی لگی ہوئی ہو۔ باہر والی بولیوں میں سے عربی، فارسی بول اس میں بہت سہی پر ہندی کے آگے وہ ایسے ہی ہیں جیسے موسلا دھار مینہ کے سامنے پانی کی کچھ بوندیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا جو ہندی کو نہ چھوا جائے اور عربی، فارسی بولوں ہی کی الٹ پلٹ سے اردو لکھت اور بات چیت ہو سکے۔ ہندی کو ہاتھ نہ لگانے اور عربی فارسی بولوں کے اکٹھا کر دینے سے اردو نہیں رہ سکتی۔ اردو میں سے عربی، فارسی بول نکال کے یوں لکھا جا سکتا ہے جیسے لکھنے کا یہی ڈھنگ جس میں آپ سے باتیں کی جا رہی ہیں۔ جب کسی جتن سے بھی ہندی کو اردو سے الگ نہیں کیا جا سکتا تو پھر اردو کے ساتھ ساتھ "اور ہندی" کا ٹکڑا کس لئے بڑھایا جا رہا ہے۔ کیا آپ یہ بتا سکیں گے۔

اور سنئے۔ پھُل گیندا نہ مارو لگت کلیجوا میں چوٹ، سائیں سے سچا رہو اور بندہ سے سَت بھاؤ، مو پہ ڈار دیو سارے رنگ کی گگری۔ یہ سب اور لکھنے کا یہ ڈھب جس میں بات چیت ہو رہی ہے۔ ان میں سے آپ کسے ہندی کہیں گے یہ تو ہو ہی نہیں سکتا جو ایک لاٹھی سے سب کو ہانک دیں اور کسی کو بھی آپ ہندی نہ کہیں۔

اچھا ان میں سے آپ جسے بھی ہندی کہیں اپنے بنارس کے "ہنس" کو اس سے ملا کے تو دیکھئے۔ ہنس کی لکھت کیا اس کی سی ہے۔ آپ اس کی لکھت کے ڈھب کو کٹھن نہیں سمجھتے نہ سمجھئے اوروں سے پڑھوا کے تو دیکھئے۔ اسے سب پڑھ بھی تو نہیں سکتے اور کیسے پڑھ سکیں گے۔ اس کی ایسی نرالی لکھت ہے جو پہلے اور آج کل کے ہندوؤں کی لکھت سے میل ہی نہیں کھاتی۔

"ہنس" اور کچھ ہنس والوں کو چھوڑ کے ہندوؤں ہی میں سے کیا دو ایک کی بھی ایسی لکھت آپ دکھا سکیں گے۔ ہنس میں ادبا کے ایسے ایسے من مانے کڈھب سے کڈھب بول ٹھونسے جا رہے ہیں اور ایسے بھولے بسرے بولوں کی بھرمار کی جا رہی ہے جن کے سمجھنے کے لئے مسلمان تو مسلمان ہندوؤں کو بھی سنسکرت کی ڈکشنری اٹھانی پڑتی ہے۔ آج کل کے نئے ہندی لکھنے والوں کی نہ کہئے یہ سب ادوان کے نوتے ہیں۔ کچھ لکھنا لکھانا ہوا، جھٹ سے سنسکرت کی ڈکشنری گھسیٹ لی۔ اسے سامنے رکھ کر آئیں بائیں شائیں جو جی میں آیا بھولے بسرے بول سے بول دیکھ دیکھ کے لکھتے چلے گئے۔ یہ میں نہیں کہتا ان کے لکھنے کا ڈھب آپ پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔

سنسکرت کا ہندو دھرم کی بھاشا ہونا اور اس بھاشا کا کبھی نہ پڑنا ہوا پھیلاؤ کون ایسا پڑھا لکھا ہے جو نہیں جانتا اس میں دیکھنے کی جو بات ہے وہ یہی ہے سنسکرت جب سہاگن تھی اور راج کی چہیتی بھاشا بھی جاتی تھی تب بھی چھوٹے سے لے کر بڑے تک سب اسے نہیں بول سکے۔ کچھ ہی لوگ تھے جو اس میں بات چیت کر سکتے تھے تو راج کی بھاشا ہونے پر بھی جب یہ سب کی بھاشا نہ بن سکی تو اب کیا بن سکتی ہے۔ راج کے پانی ہی سے جو پودا نہ پھیک سکا۔ وہ بھوبل میں کیا پھل پھول سکتا ہے۔ پھلواری کی دیکھ بھال اور اس کے ٹھیک ٹھاک ہونے پر بھی جو پھول نہ کھل سکے تو اب پت جھڑ میں کیا کھلیں گے۔ جس پچھی بھون کو راج بھی نہ بنا سکا تو راج کی دھوپ ڈھل چکنے پر وہ کیا بنتا۔ جب دانت تھے تبھی جو چنے نہ چب سکے تو دانت ٹوٹنے پر وہ کیسے چبائے جا سکتے ہیں۔ وہ پرانے ڈھنگ کے سڈول موتی جو راج کا سنگھار ہونے پر بھی مٹی میں اٹے رہے اب ٹوٹ پھوٹ پر ان کی جھاڑ پونچھ ہوئی بھی تو کیا۔

ن کا

پھر یہ بھی دیکھئے۔ آج جس نئے گھر کی نیو رکھی جا رہی ہے سمجھا کرتی تھی۔ یہ بنتا بھی رہا تو کب تک پورا بن سکے گا۔ بھاشا کا گھر اور گھروں کا سا ان میں کوئی نہیں جو کچھ دنوں میں بن بنا کے پورا ہو گیا اور اس میں گھر والے کا سا بسنے لگتے، بسنے لگے۔ بھاشا کا گھر بنانا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے اور بھ

جتھے کے ہونے کا روگ نہیں۔ اس کے بنانے کے لئے سب کا ایکا اور بڑی سوجھ بوجھ چاہئے۔ یوں ہی سی آنکھ بچی اور کچھ کا کچھ ہوگیا یونہی سی چوک ہوئی اور کی کرائی باتوں پر پانی پھر گیا۔

نہ ماننے اور اپنی بات کی پچ کرنے کی تو اور بات ہے پر ٹھنڈے جی سے دیکھئے تو آپ کی اردو میں وہ سب باتیں پائی جا رہی ہیں جو بڑھنے والی بڑی سی بڑی بھاشا میں ہونا چاہئیں اور جو سچ کہنا کوئی پاپ نہ ہو تو مجھے یہ کہنے دیجئے۔ اردو میں کچھ پھیلاؤ کی ایسی ایسی باتیں بھی چھپی ہوئی ہیں جو اوروں میں نہیں۔ ابھی اس کا چھٹپنا ہے۔ اس چھٹ پن ہی میں بھولی بھولی باتوں کے ساتھ ساتھ وہ وہ چیتی تلی گہری گہری باتیں بھی اس میں ہیں جنہیں دیکھ کر اچمبا ہوتا ہے۔ بڑے بوڑھوں نے سچ کہا ہے۔ بہو کے بول گھونگٹ میں اور پوت کے پاؤں پالنے میں۔ اس پوت کے پاؤں پالنے میں دیکھئے تو، جب ابھی سے اس کی ادھ کٹی باتیں جی موہے لیتی ہیں تو آگے کیا ہوگا۔ کسی بھاشا کے پھیلاؤ کے جانچنے کے اور بہت سے ڈھبوں میں سے ایک ڈھب یہ بھی ہے:۔

جگ میں لوگوں کی چھٹائی بڑائی ایک سی نہیں ہوتی۔ سنسار میں یہی ہوتا آیا ہے۔ کوئی چھوٹا ہے تو کوئی بڑا۔ کوئی بہت چھوٹا ہے تو کوئی بہت بڑا۔ کوئی راجہ ہے تو کوئی مہاراجہ۔ کوئی اس کی چوکھٹ کا منگتا ہے اور کوئی اس منگتا کے گھر کا بھکاری۔ ایسے ہی ایسی بہت اونچ نیچ اور سیکڑوں اتار چڑھاؤ لوگوں میں پائے جاتے ہیں تو جس بھاشا میں ایسے اتار چڑھاؤ کے لئے الگ الگ بات کرنے کے ڈھب جتنے بہت ہوں اس بھاشا کا پھیلاؤ ماننا پڑے گا۔

عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی ان سب میں سے کسی میں بھی یہ بات کرنے کے ڈھب بہت سے بہت نکلیں گے تو تین چار انہیں کے سامنے اب اپنی اردو کا پھیلاؤ دیکھئے۔ گننے گا تو ان کی گنتی اردو میں پندرہ سولہ تک پہنچے گی اور پورا پورا سوچ بچار کیا جائے تو ایسے اور اور بول بھی نکل سکیں گے۔ انہیں دیکھ کے کہیں یہ نہ کہہ اٹھئے گا یہ بول ہیں کہاں کہاں کے۔ جہاں کے بھی ہوں اب یہ سب کے سب اردو ہی کے ہیں۔ اردو کوئی ایک بھاشا تو نہیں پچ میل مٹھائی ہے۔

آئے، تو، تم، آپ، جناب، جناب من، جناب مکرم، جناب محترم، جناب راج کی بھناب، عالی جناب، سرکار، حضور، پیر و مرشد، جلالت مآب اور دوسری بعض معظم، شہنشاہ جہاں پناہ، یہ موتی جن جن سیپیوں کے ہیں کیا یہ بھاشا اس Form of Addr کے

وہاں بھی انہیں ایک جگہہ ایسا ہی اکٹھا کر لیا گیا ہے جیسے ان بکھرے ہوئے موتیوں کی اردو نے چمکتی ہوئی لڑیاں بنا دیں۔ یہ آپ جب چاہیں دیکھ سکتے ہیں۔

تو جس ندی کا پاٹ اتنا چوڑا ہو چکا ہو۔ جس کا اتھلا پن گہرے پن میں چھپتا جا رہا ہو اسے پاٹنے کی دھن میں دن رات نئے نئے جتن کرنا اور الگ سے اک نئی ندی نکالنے کے سوچ بچار میں آئے دن کھکیڑیں اٹھانا کیا کوئی سمجھ والا اسے اچھا سمجھ سکتا ہے۔

عربی کو آپ ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے اچھا نہ سہی۔ پر فارسی سے آپ کی یہ چڑ کیسی۔ فارسی اور سنسکرت یہ دونوں تو ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ ان دونوں کے کچھ بول لکھتا ہوں ان کا ملا جلا ہونا دیکھئے۔

فارسی اور سنسکرت کے ملتے جلتے بول

فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت
مہ	مہا	شلخ	شاکھا	ترس	تراس
کافور	کرپور	آستاں	ستھاں	بیوہ	ودھوا
بیم	بھیم	بار	بھار	بروت	بھروت
نیاس(عبادت)	اپسیا	کرباس	کپاس	جندال	چنڈال
مگرمچ	مگرمچھ	انگارہ	انگار	موش	موشک
باش	باس	فرمان	پرمان	ریشم	رشمی
است	استی	داغ	داگھ	کف	کپھ
خشخاش	کھس کھس	بند	بندھ	ابرو	ابھرو
زانو	جانو	انگشت	انگشٹ	ادرک	آدرک
آتش	آتشن	اشتر	اشٹر	سرشت	سرشٹی
خسر	سوسر	خر	کھر	سخت	شکت
بادام	باتام	دیر	دھیر	سریر	شریر
میغ(ابر)	میگھ	نیلوفر	نیلوتپل	کان	کھان
کنج	کنج	گرم	گھرم	کام	کامنا
در	دوار	گرہ	گرہ	تن	تنو
ماست(دہی)	متو	یک	ایک	شام	شائم
برشگال	برشاکال	بارش	برشا	جنگل	جنگل
میش	مہش	ارج	ارج	بوم	بھوم
شغال	سرگال	گاؤ	گئو	ماہ	ماس

فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت
روز	روچ	گندم	گودھوم	شیر (دودھ)	کشیر
جو	یو	پارینہ	پورانا	چرم	چرم
خون	شون	پدر	پتر	مادر	ماتر
برادر	بھراتر	پور	پتر	دختر	دہتر
سرین	شرونی	بخش (حصہ)	بھکش	ہستہ (ہستہ گٹھلی)	استھی
پُر	پورن	ششم	ششٹم	پنجم	پنچم

آپ نے ان بولوں کا ملا جلا ہونا تو دیکھ لیا اب فارسی اور سنسکرت کے پرانے میل ملاپ کی کچھ اور کڑیاں بھی ساتھ ہی ساتھ دیکھ لیجے۔ یوں تو انگریزی اور جرمن بھاشا کے بھی کہیں کہیں سے اکا دکا کچھ بول سنسکرت سے ملتے جلتے ہیں پر جو بات پرانی فارسی اور سنسکرت کے بولوں کو آمنے سامنے رکھنے پر دکھائی دیتی ہے وہ اور کسی بھاشا میں نہیں۔ اسی سے تاڑنے والے نہ رہ سکے اور یہ کہہ اٹھے:۔

ایران کے کیانی، زردشتی اور ہند ماتا کے سپوت برہمن، چھتری ان سب کے پرکھا، بڑے بوڑھے ایک ہی گھرانے کے تھے جن میں کبھی بڑی گاڑھی چھنتی تھی۔ ایک ہی جگہ سب کا رہنا سہنا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ پرانی فارسی اور سنسکرت ایک ہی بھاشا تھی جب آپس میں پھوٹ پڑنے سے یہ الگ ہوئے تو الگ الگ رہنے سہنے سے اس ایک بھاشا میں پہلے پہل تھوڑا پھر بہت ال بل ہوتا گیا۔ ژنداوستا اور سنسکرت کے بول بہت ایک سے ہیں جنہیں نہ جاننے والا سنے تو ایک ہی سمجھے اور دونوں کو ایک ہی بتلائے۔

پرانی فارسی کو الگ الگ تین نمبروں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک ژنداوستا کی بھاشا۔ دوسرے پہلوی بھاشا جو ژند کے پیچھے بڑھی اور پھیلی تیسرے دری بھاشا جو ساسانیوں کے راج میں پھلی پھولی۔ یہ دری بھاشا ژنداوستا سے بہت الگ اور محمود غزنوی کے راج کی بھاشا سے میل کھاتی ہے۔ ساسانی راج کی بھاشا اور غزنوی راج کی بھاشا جیسے یہ دونوں ملتی جلتی دکھائی دیتی ہیں۔ ایسے ہی ژنداوستا اور سنسکرت ہیں۔ یہی دیکھ کے یورپ کے کھوج لگانے والے یہ کہنے لگے:۔ یونہی سی گھٹ بڑھ سے ویدک گیت اوستا میں اور اوستا کے بول ویدک کے سانچے میں ڈھل سکتے ہیں۔

اوستا کا منترا اور رگ وید کا منترا دونوں کے دونوں ایک ہیں۔ ایسے ہی ژنداوستا کا ستراو ہی ہے جو رگوید کا منترا منتھرا ہے۔ رگوید کا ایرمن دیوتا اور ژنداوستا کا ایریمن یہ دونوں بھی ایک ہی ہیں۔ ایران کی راجدھانی میں پہلے پہلے جن جن کا راج رہا وہ رگوید اور ژنداوستا میں ایک ہی سے ہیں۔ ژنداوستا کا یما خشائتا (جمشید) رگوید میں یما راجہ ہے خشائتا مہاراجہ (بادشاہ) کو کہتے ہیں۔ اس لئے یہ خشائتا اور یما راجہ یہ دونوں ایک ہی ہوئے۔ ژند اور رگوید میں کیکاؤس اور کا دید اشانس دونوں کی باتیں ایسی ایک سی ہیں جن میں رتی بھر ال بل نہیں۔

بھینٹ دینے والے اور چڑھاوے چڑھانے والے کو ژنداوستا میں اترواکہتے ہیں۔ وید میں اسی اتروا کو اتھروان کہا گیا ہے۔ کوی یہ بول ویدوں میں آنے والی باتوں کے جاننے والوں اور بڑے بھاری بھرکم سمجھ والوں کے لئے بولا گیا ہے۔ ایران میں بھی بڑے بڑے راج پاٹ والوں کے لئے یہی بول بولا جاتا تھا۔ جیسے کوی ہسرو (کیخسرو) کوی کوات (کیقباد) ٹوہ لگانے والوں نے تو یہاں تک کھوج لگا لیا۔ پوجا پاٹ میں جو بول منہ سے نکلتے تھے وہ ژند اور ویدوں میں کہیں کہیں یونہی سا ال بل ہو تو ہو، نہیں تو دونوں کے بول ایک ہی سے ہیں۔

وید میں سورج کو گھوڑے والا اور دوڑنے والا بتایا گیا ہے۔ اوستا میں بھی یہی ہے۔ سورج دیوتا کو وید میں اریامن اور اوستا میں ایریامن کہا گیا ہے۔ یہاں وہاں دونوں جگہ اس دیوتا کے منتر بیاہ کی سبھ گھڑی میں پڑھے جاتے تھے۔ انگیرا رشی کی پود سے آگ کی پوجا کا پرچار ہندو مانتے ہیں۔ اوستا میں اسی آگ کی پوجا کا پرچار انگرو اور اس کے گھر والوں سے مانا گیا ہے۔ تریتا کو اوستا میں پہلا بید بتایا ہے۔ رگوید اور اتھرو وید میں بھی تریتا تھریتا، تریتا ہے جو دکھوں سے اچھا کرنے والا دیوتا مانا گیا ہے۔ اگنی ماتا کو جیسے ہندو گھروں میں رکھتے تھے۔ ایسے ہی ایرانی بھی۔ ایرانی آگ پوجنے والوں کے رات دن گانے کے منتر کو گاتا کہتے تھے۔ ہندوؤں میں یہی گاتا گائتری منتر کہلاتا ہے۔ جو لتنے برس ہندو اپنے لڑکوں کو جنیو پہناتے۔ ایرانی بھی اسی برس پہناتے تھے۔

یہاں ندیوں پر جیسے اشنان کے میلے لگتے ہیں۔ ایسے ہی ایران میں آب ریزگی تہوار ہوا کرتے تھے۔ جاڑے آتے جیسے یہاں دوالی کا تہوار ہوتا ہے۔ ایسے ہی ایرانیوں میں جشن آتاں کی دھوم دھام ہوا کرتی تھی۔ ہولی سے اگلے دن یہاں ہندو جو کیا کرتے ہیں یہی سب ایران میں کوسہ برنشیں کے تہوار میں کیا جاتا تھا جس سمے میں یہاں بسنت کا میلا لگتا ہے

ایران میں بھی اُسی مہینے جشنِ گُل کو بی منایا جاتا تھا۔ ان باتوں سے یہی پتا چلتا ہے پہلے پہل یہاں کے آریہ جب ایرانیوں سے الگ ہوئے تو یہ اور ایرانی ایک ہی دھرم رکھتے تھے۔ پرانے لکھنے والوں میں سے کچھ نے ایران سے آریوں کے نکلنے کی باتیں یوں لکھی ہیں۔

ان میں کا ایک جتھا دھرم کی باتوں میں کچھ کتر بیونت کرکے دھرم کو بگاڑنا چاہتا تھا۔ اس سے اک آگ بھڑک اٹھی اور دھرم کے بچاؤ کے لئے تلواریں ٹیک ٹیک کے سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ بڑا رن پڑا۔ لڑائی بھڑائی ہو چکنے پر آپس میں ایسی تھم تھپا ہوئی جو پھر کبھی ایک جگہ مل جُل کے نہ بیٹھ سکو۔ ہارا ہوا جتھا ٹھوکریں کھاتا ادھر آ نکلا اور یہیں رہ پڑا۔

۵۰، ابیں پُرانی دُھرانی لکھت کے کچھ ٹکڑے کسی پارسی کے ہاتھ سے نکل کے یورپ پہنچے۔ پھر پرانی لکھت کے کھُدے ہوئے کئی ٹکڑے ڈھونڈنے والوں کو ایران سے ملے۔ ان سب کو دیکھ بھال اور جانچ پڑتال کے بال کی کھال نکالنے والوں نے سوچ بچار سے ان بکھری ہوئی کڑیوں کی لڑیاں بنا دیں۔

ان باتوں کا پھیلاؤ یہاں نہیں سما سکتا اسی لئے انہیں چھوڑتا ہوں۔ فارسی اور سنسکرت کے کبھی کے میل جول پر جو لکھا گیا وہ اتنا بھی نہیں جتنا کہ بہتی ہوئی ندی سے چلّو بھر پانی۔ پھر بھی آپ نے یہ تو دیکھ ہی لیا ہوگا۔ فارسی اور سنسکرت ایک ہی پیڑ کی ڈالیاں، ایک ہی پھلواری کے پھول، ایک ہی سیپی کے موتی اور ایک ہی منہ کی دو آنکھیں ہیں۔ جب ان دونوں کا میل ملاپ آپ دیکھ چکے تو اب فارسی بدیسی بھاشا کہاں رہی یہیں کی ہوئی اور جب یہیں کی ہوئی تو پھر اس کے بولوں کو ٹھکرانا کس لئے۔

فارسی اور سنسکرت کے مٹے ہوئے پریم کی کہانی میں آریوں کے باہر سے یہاں آنے کی بات چھڑ گئی ہے تو یہیں وہ جھگڑا بھی چکا دینا چاہیئے جو مسلمانوں اور ہندوؤں میں چلا آرہا ہے۔ ان دونوں جتھوں میں چلی کٹی اور جو نوک جھونک چلی آتی ہے اس میں سب سے بڑھ کر ہندوؤں کی یہ ہنکار ہے:۔ ہند ہمارا دیس اور ہمارا ہی جنم بھوم ہے۔ دیس کا جھولا ہمارے ہی لئے ہے اور ہمیں اس میں جھولتے رہیں گے۔ پہلے سے ہمیں یہاں کے رہنے والے ہیں۔ باہر سے آنے والے جو ساتھ رہ پڑے یہ کبھی یہاں کے نہیں بن سکتے۔ دیس کے اکلوتے سپوت ہمیں ہیں اور رہیں گے۔ یہ دیس کبھی دوسرے کا نہیں ہو سکتا۔

گونڈ، بھیل، لباڑے یہ بات کہیں تو سچ یہ ہے انہیں کوئی جھٹلا نہیں سکتا اور ہے بھی یہی۔ انہیں گونڈ، بھیل، لباڑوں کی یہ جگہ جنم بھوم ہے اور انہیں کے جتھے دیس والے ہیں جو ننگے دھڑنگے پہاڑوں بنوں، جنگلوں میں مارے مارے پڑے پھر رہے ہیں۔ انہیں چھوڑ کے دیکھئے تو پھر کوئی دیس والا ہی نہیں رہتا۔ آگے پیچھے سب باہر ہی سے آئے ہوئے ہیں۔

کیسی ہی پرانی سی لکھت اٹھا کے کیوں نہ دیکھئے یہی پتا ملے گا۔ آریہ پہلے سے یہاں کے رہنے والے نہیں۔ یہ باہر ہی سے آئے اور یہاں رہ پڑے جیسے آریہ باہر سے یہاں آئے ایسے ہی مسلمان بھی آ دھمکے۔ دونوں کے یہاں آنے میں بھی بڑا ابل تھا۔

آریہ جو آئے تو آتے ہی اپنی دھاک بٹھانے کے لئے انہوں نے یہاں کے بسنے والوں کا مار مار کے ایسا کچومر نکالا جو گیگلے دیس والے یہاں کا رہنا سہنا چھوڑ چھاڑ بھاگ بھوگ کر اندھیری گھاٹیوں میں منہ چھپا کے بیٹھ رہے اور جو نہ بھاگ سکے شودر کہلائے یہ اور ان کی پود، داس بن کے باہر والوں کی سیوا کرتی رہی۔ گھر بنانا، چھپر چھانا، گھر کی جھاڑ پونچھ، کوڑا کرکٹ اٹھا اٹھا کے پھینکنا، چکیاں پیسنا، برتن باسن مانجھنا، لکڑیاں چیرنا، گائے بھینسوں کو چرانا، گوبر اٹھانا، اُپلے تھاپنا انہیں دھندوں میں ان دیس والوں کے دن رات کٹتے تھے۔ یونہی سی بھول چوک پہ ان کی وہ درگت بنتی جس کے دھیان سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر یہ لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے۔ مندروں میں آنا جانا کیسا۔ ان کی پرچھائیں سے پوجا پاٹ کی ستھری جگہ پاپ کی کیچڑ میں لتھڑ جاتی تو ایسے پلید وہاں کیسے پھٹک سکتے تھے۔

یہ اندھیر دیکھ کے سنسار نے کروٹ لی اور وہ ڈری ہوئی بھیڑیں جو آئے دن کی مار دھاڑ سے چپ چاپ رہتی تھیں۔ اب سب کی سب مل کے چیخ اٹھیں ایسے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر اب آنکھیں کھلیں اور انہیں چمکار چمکار کے روکا تھاما جا رہا ہے اور ان کے اپنے سے الگ نہ ہونے کے لئے سیکڑوں جتن کئے جا رہے ہیں اور یہ جو کچھ بھی کیا جا رہا ہے ان کے لئے نہیں یہ بھی سب اپنے ہی لئے ہے۔ ڈر یہ لگا ہوا ہے کہیں یہ پورا ریوڑ کا ریوڑ کسی اور گلے میں جا کے نہ مل جائے اور اس کے ملنے سے دوسرے اپنی بہتات کے گھمنڈ پر آگے بڑھ جائیں اور ہمیں چپ چاپ بیٹھنا پڑے۔

رہے مسلمان تو وہ یہاں ایسے آئے جیسے کوئی اپنے گھر میں آتا ہے۔ کسی نے انہیں دیکھ کے ٹیڑھی ٹوپی کی تو راج نے ڈانٹ ڈپٹ دیا۔

نہیں تو یہاں والوں کو مسلمان اپنے راج کی جگمگاتی سبھائیں ساتھ بٹھاتے رہے۔ بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں ان میں سے اکبر کا تو پوچھنا ہی کیا یہ تو اوتار ہی مان لیا گیا اور دوں کو بھی ہندو اچھا ہی جانتے ہیں۔ برا نہیں کہتے۔ اس لئے ان کی باتیں چھیڑنا نہیں چاہتا۔ ان سب میں سے اک اورنگ زیب ہی ایسا ہے جسے دھرم کا کٹر، بس کی گانٹھ، ہندوؤں کو دُکھ دینے والا، ستانے والا اور نہ جانے کیا کیا اسے ہندو کہا کرتے ہیں۔

یہی اورنگ زیب جو ہندوؤں کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتا تھا جب دکھن کا گورنر تھا تو ہندوؤں کو آگے بڑھانے، انہیں جنجال سے چھڑانے کے لئے اس نے کیا کیا کیا۔ یہ کہانی سر جدو ناتھ سرکار کے منہ سے سننے کی ہے۔ دھرم کا کٹر اورنگ زیب شاہجہاں کو ہندوؤں کے لئے ایسے ایسے ڈھب سے لکھتا تھا جو کبھی کبھی شاہجہاں کی تیوری پر بل پڑ جاتے تھے۔ اس پر بھی اس نے ہندوؤں کا ساتھ دینا نہ چھوڑا اور ان کی جو باتیں اسے سچی دکھائی دیں شاہجہاں کے سامنے ان کے کہنے سے کبھی نہ چوکا۔

دیوگڈھ کا راجہ کیسری سنگھ، راؤ کرن راجپوت، مہیش داس راٹھور، نرسنگھ داس، جیات سنگھ، سارنگدھر، اندرمن یہ اور ایسے اور راد رہن۔ دوں کو سکھ، چین سے بٹھانے کے لئے اورنگ زیب اپنے سے جتن کرتا رہا۔

یہ باتیں تو جب کی ہیں جب یہ پرنس تھا اور اس نے اپنے راج میں ہندوؤں کے ساتھ کیا کیا، انہیں کیسی کیسی جگہیں دیں، ان کی بڑی سی بڑی بھول اور بھاری سی بھاری چوک کو بھی کیسا ٹالا۔ اس کے لئے پیچھے ہٹ کے یہ دیکھنا چاہیئے: کھجوا کی لڑائی میں مہاراجہ جسونت سنگھ نے دارا شکوہ سے مل کے اورنگ زیب کو جو نیچا دکھانا چاہا۔ ایسے ہی اجمیر کی لڑائی میں کنور رام سنگھ سے جو بڑی بھاری چوک ہوئی۔ کوئی اور راج ہوتا تو انہیں پاپی ٹھہرا کے ان کے ایسے کرتوت سے نجانے اُن کی کیا درگت بنا دیتا۔ پر اورنگ زیب نے نہ جب اور نہ لڑائیاں جیتنے پر کسی سے بھی کچھ پوچھ گچھ کی اور جو کچھ ہو چکا تھا اُسے ایسا کر دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

دھیرج۔ راجہ جے سنگھ، بجے سنگھ، راجہ دیبی سنگھ بندیلہ، راؤ دلیپ سنگھ بندیلہ، رائے سنگھ راٹھور، راجہ راج روپ، رائے رایان، راجہ رگھناتھ داس، رام سنگھ ہاڈا، راجہ رام سنگھ کچھواہا، رگھناتھ سنگھ سیسودیہ، یہ اور ایسے اور بہت سے ہندو نکلیں گے جو اورنگ زیب ہی کی دیا سے پھلے پھولے اور پروان چڑھے۔ ان باتوں کے پھیلاؤ کے لئے نہ یہاں جگہ ہے اور نہ یہ ڈھائی لووں میں سما سکتی ہیں۔

تو آپ نے دیکھا باہر سے آنے میں مسلمان اور ہندو دونوں کے دونوں ایک سے ہیں۔ بل اتنا ہی ہے آریوں نے پہلے آ کے ہند میں چھاونی چھائی اور مسلمان آریوں کے پیچھے یہاں آئے۔ آگے پیچھے آنے کا ال بل ایسا نہیں ہوا کرتا جو پہلے آنے والے جس جگہ آ کے ٹھہریں اُسے اپنا تو جنم بھوم سمجھیں اور اپنے پیچھے آنے والوں کو باہر والا ہی سمجھتے رہیں۔

یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے کسی جگہ آگے پیچھے دو جتھے باہر سے آ آ کے ٹھہریں اور پھر وہیں رہ پڑیں۔ ان دونوں میں سے پہلے آنے والا جتھا اپنے پیچھے آنے والوں سے یہی کہتا رہے۔ یہ جگہ ہماری ہی ہے۔ تم ساتھ رہنے سہنے پہ بھی کبھی یہاں کے نہیں بن سکتے اور نہ یہ جگہ کبھی تمہاری ہو سکتی ہے تو اس اڑنے اور ہٹ کرنے کو سمجھ دار بالکل ہٹ کہیں گے۔ بات کا بتنگڑ بنانا کوئی اچھی بات نہیں۔ مسلمان، ہندو جو بھی یہاں آ آ کے رہ پڑے، ہند اب ان سب کا جنم بھوم ہے اور رہے گا۔ منہ سے کہہ دینے سے یہ کسی ایک جتھے کا دیس کبھی نہیں بن سکتا۔

دیس کے باہر اب بھی اک چھوڑ کئی کئی راجدھانیاں مسلمانوں کی ہیں۔ پر ان میں سے کسی میں بھی یہاں کے مسلمانوں کے لئے چونٹی ٹیکنے کی بھی جگہ نہیں۔ جیسے ہندوؤں کا باہر کوئی ٹھکانا نہیں ہے ایسے ہی یہاں کے مسلمان بھی ہیں جن کا رہنا سہنا، اٹھنا بیٹھنا، مرنا جینا جو ہے وہ سب یہیں تو پھر اب یہ باہر والے کیسے ہو سکتے ہیں۔

یہ سچ ہے مسلمان ہندوؤں سے تھوڑے اور بہت تھوڑے پر جب ان کے دُکھ، سُکھ، مرنے جینے کی بات بیچ میں آ پڑے تو پھر تھوڑے سے تھوڑے بھی تھوڑے نہیں رہتے۔ آٹھ کروڑ کا ٹِڈی دل کبھی ایسا نہ بن سکے گا جس کا ہونا نہ ہونا ایک سا ہو کے رہ جائے۔ سانس لینے والا اتنا بڑا جتھا مٹی کا تھوا تو نہیں ہے۔ رہا۔ اس میں کھلونوں کی سی من مانی توڑ پھوڑ کبھی نہیں ہو سکتی۔ ہں کا یہاں رہنا سہنا کیچڑ کا سا دھبہ نہیں ہے۔

جیسے جب چاہا دوڑ دھوپ کے پانی سے دھو دھلا کے چھڑا ڈالا۔

مہاتما جی۔ پرماتما کے لئے دیس والوں سے ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اڑنا ہٹ کرنا چھڑائیے۔ تیری چھوٹی میری موٹی ایسی بے سری الجھی ہوئی تانیں کب تک۔

دیکھئے اسی آپس کی جھنک پٹک، تن پھن سے دیس اب تک کتنے ٹوٹے میں رہا۔ آپ میں بھلائی، اچھائی کی جو جو باتیں ہیں انہیں بھگوان کی دیا سمجھ کے آگے بڑھئے اور جگت گرو بنئے۔ یہ ایک جتھے کا لیڈر بنا کیسا آپ کو تو پورے دیس کا گرو بنا چاہیئے۔ سچ ہے یہ بات ایسی نہیں جس میں نہ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی اور بیٹھے بیٹھے سب کچھ ہو جائے پر آپ تو پاؤں توڑ کے بیٹھنا نہیں چاہتے۔ آپ تو تپا مار چکے ہیں کٹھن سے کٹھن باتیں ہم جیسوں کے سٹ پٹا جانے کے لئے بہت سہی پر آپ کے سامنے تو یہ کچھ بھی نہیں۔ آپ تو دیس ہی کے سدھارنے کی ادھیڑ بن میں رہے اور ہیں تو دیس والوں کو بھی ایسا بنا دیجے جو آپ کی دیکھا دیکھی یہ سب بھی دیس کے بروگی بن جائیں اور یہ جو اب تک آگ لگا کے پانی کو دوڑتے رہے ہیں ایسی اندھا دھند دوڑ دھوپ سے اکتا کر آپ کے ساتھ ساتھ اس چوڑی سڑک پہ چلنے لگیں جو پریم نگر پہنچا دیتی ہے۔ ان کے من کی انگیٹھیوں میں پریم کی دبی ہوئی چنگاریوں کو کرید کرید کر منتروں کے پنکھے سے دھونک دھونک کے ایسی بھڑکتی ہوئی آگ بنا دیجئے جو بھول چوک کے پانی کے چھینٹوں سے بھی نہ کبھی بجھے اور نہ کبھی کجلائے۔

ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، یہودی، پارسی پرماتما نے ان سبھوں کو ایک سا ڈیل ڈول، ہاتھ پاؤں، آنکھیں، ناک کان دئیے ہیں۔ جیسے اس دین میں سب کو ایک سا رکھا وہ چاہتا تو کیا بڑی بات تھی جو سارے جگ میں ایک ہی دھرم —— پرچار کا ڈنکا بجتا۔ ایک ہی دھرم کے مندر میں سب مل جل کے ایک ہی ڈھب پر اس کی پوجا کرتے۔ پر بھگوان نے ایسا نہیں کیا۔ کسی نے اُسے ایک ڈھب پر پوجا۔ دوسرے نے اس کے پوجنے کا اور ڈھنگ نکالا تیسرے نے کسی اور ڈھب سے اُس سے لو لگائی۔ سب دھرموں کو دیکھئے تو یہ سب کے سب چھوٹی بڑی الگ الگ سڑکیں ہیں جو اسی ایک کے پاس پہنچانے کے لئے کھلی ہوئی ہیں جس کے راج کا پھیلاؤ چھوٹے بڑے لاکھوں کروڑوں ان گنت سنساروں سے بھی آگے نکلنے کہاں تک یوں ہی گھیرے ہوئے ہے۔ ایسے سنسار اُسے نہ پائیں اور اس کے پوجنے کا دھاگا سب مل کے توڑ تاڑ کے رکھ دیں جب بھی اُس کے امٹ راج میں سے ایک رتی بھی کبھی گھٹ نہیں سکتی۔ ایسے ہی انہیں جگمگاتے سنساروں کے رہنے والے کیسی ہی بڑھ چڑھ کے اُس کی پوجا پاٹ کیوں نہ کریں۔ پر اس سے اُس کا راج رتی بھر بڑھ نہیں سکتا۔

دھرموں کے ماننے نہ ماننے کی بھلائی برائی جو بھی ہے وہ دھرم والوں ہی کے لئے ہے۔ وہ ماں باپ سے بڑھ کے پیار کرنے والا پرماتما ان باتوں سے ایسا الگ تھلگ ہے جو یہاں کے دکھ سکھ کی دھوپ چھاؤں اس پر پڑ نہیں سکتی۔ اس کے نہ ٹلنے والے راج کی چوکھٹ اتنی اونچی ہے جو یہ سنسار اپنے پہاڑوں کے ہاتھوں سے بھی اُسے چھو نہیں سکتے۔ ہمارے دھیان کا پھیلاؤ اور پھرتی جس کے سامنے بجلی کا چھلاوہ پن بھی پانی بھرتا ہے اور جو گھڑی بھر میں اونچی سی اونچی جگہ کو روند کر اس کی اونچائی ناپ تول کے رکھ دیتا ہے۔ وہاں تک پہنچنے میں یہ بھی اپاہج ہے۔ رات دن سے گھرے ہوئے سنسار اُس کے راج کے پھیلاؤ کو کبھی نہیں پا سکتے جب سب کے سب اُسی ایک کو اپنے اپنے من کی ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں۔ اپنے اپنے ڈھنگ پر اُسی کے آگے چڑھاوے چڑھا رہے ہیں اور اُسی کے دھیان میں دھونی رمائے بیٹھے ہیں تو الگ الگ دھرم ہونے پر دھرم کے لئے آپس میں یہ ارے ترے کرنا کیسا۔ دھرم الگ الگ ہیں ہوا کریں۔ اس سے کیا ہوتا ہے جو دھرم ہے وہ اپنی جگہ اچھا کسی کو بھول کے بھی یہ نہ چاہیئے جو دوسرے کے دھرم کو برا کہے۔ برا کہنا کس لئے۔ ایک کے دھرم کی پوچھ گچھ دوسرے سے تو ہونے سے رہی جو جس کا دھرم ہے اس کا بوجھ اُسی کے کاندھوں پر ہے۔ اس کے پیچھے آئے دن آپس میں لڑنا جھگڑنا بڑی بُری بات ہے۔

مسلمانوں اور ہندوؤں کا ایک دن دو دن کا تو ساتھ نہیں۔ پہلے بھی یہی مسلمان تھے اور یہی ہندو، یہی مسجدیں تھیں اور یہی مندر، یہی دکھ کا اندھیرا تھا اور یہی سکھ کا اجالا، یہی سنہری دن تھے اور یہی روپہلی راتیں، باجا گاجا مسجدوں کے سامنے بھی بجتا تھا اور مندروں کے بھی۔ اس پر نہ کبھی مسجد والے بھڑکے اور نہ کبھی مندر کے پجاری بڑبڑائے۔ آپس میں مل جل کے رہتے اور جس سے جتنی جان پہچان ہو جاتی۔ مرتے مرتے اسے نباہتے اور اس میں کچھ بل نہ آنے دیتے تھے۔ بڑے بوڑھوں سے ہندو، مسلمانوں کے میل ملاپ کی جو کہانیاں کان سن چکے ہیں وہ اب ساری کی

ساری من گھڑت اور زٹل دکھائی دینے لگیں۔

آج کل کے مسلمان اور ہندو تو ایسے ہو گئے جیسے توے سے روٹی الٹ جاتی ہے۔ بات بات میں آپے سے باہر۔ یونہی سی کچھ بات ہوئی اور بھڑک اٹھے۔ پھر کیا تھا جیم چاخ بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھی جو یہ آپس میں گتھ گئے۔ سمجھ والے اجڈوں کی گتھم گتھا الگ تھلگ ہو کے دیکھنے لگے آپس کی لاگ ڈانٹ کی آگ بجھانے کا دھیان کسی کو بھی نہیں۔

یہ سنتے سنتے کان جھنّانے لگے۔ آج یہاں جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا، کل وہاں لاٹھی چلی، پرسوں اس جگہہ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ سیکڑوں کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے، لہو لہان ہوئے، بیسیوں مارے گئے۔ جب لڑتے لڑتے دونوں تھک کے ہانپنے لگے تو راج نے پکڑ دھکڑ کے جیل میں ڈال کے بیچ بچاؤ کر دیا۔ بیٹے بیائے الگ، چھوٹنے کی دوڑ دھوپ میں جو کچھ انٹی میں تھا وہ ہاتھ سے الگ نکل گیا۔ جن دھندوں سے چار پیسے ہاتھ میں آرہے تھے وہ دھندے الگ چھٹے اور گانٹھ میں ایک جھنجی کوڑی بھی نہ رہی۔ بیٹھے بٹھائے جو اکڑ تکڑ کا دھیان آگیا تھا اس کا یہ پھل مل گیا۔ چلئے چھٹی ہوئی۔

یہ آئے دن کی جھڑپ، بات بات میں تڑ پھس، گھڑی گھڑی کا ٹرّاپن۔ دیس والوں کی ایسی سمجھ پر تیل ماش اتارے اور جیسے بنے انہیں اس بچّے پن سے روکئے۔ بے سمجھ کے ہیٹے، کانوں کے کچّے آپس میں گتھے چلے جاتے ہیں اور ان کی جھپیٹ میں دیس کا ستیاناس ہوتا جارہا ہے آپس کی نوچ کھسوٹ اور لوٹم لاٹ نے دیس کے لنگوٹی بندھوا دی۔ مہاتما جی۔ آپ کے سامنے ایسی باتیں کرنا سورج کو دیا دکھانا ہے پر یہ بھی دیکھا گیا ہے کبھی کبھی بڑے بڑے سمجھ والوں سے بھی سامنے کی باتیں دیکھنے سے رہ جاتی ہیں۔

اب پھر اسی بھاشا کو لیجئے۔ کٹھن باتیں چھوڑ چھاڑ کے نئی بھاشا بنانے کے جنجال میں پھنسنا او رنجھی منجھائی بھاشا کو ٹھکرا کے منہ پھیر لینا یہ بھی نئی بات ہے۔ میں جانتا ہوں دیس کے کچھ ٹکڑوں کی بولیاں ایسی الگ الگ ہیں جو ایک دوسری سے نہیں ملتیں او ر ایک ٹکڑے کی بولی بولنے والا دوسرے کی بولی نہیں سمجھتا۔ پر یہ سب کی سب بولیاں ایسی چھوٹی چھوٹی سی ہیں جو دیس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں ہی میں بولی جاتی ہیں باہر انہیں کوئی جانتا بھی نہیں ان سب میں اکیلی اردو ہی ایسی ہے جو سارے دیس میں بولی اور سمجھی جاتی ہے دیس کی پوری بولیوں میں سے اک اردو ہی کا ایسا پھیلاؤ ہے جو ٹھیکم ٹھیک پورے دیس کی بھاشا بننے کا بل بوتہ رکھتا ہے۔

کسی بھاشا میں باہر والی بولیوں کی بہتات سی بہتات جتنی بھی ہو۔ پرکھنے والے اسے تو بھاشا کی بڑھوتری سمجھتے ہیں اور آپ نہ جانے کیا چاہتے ہیں جو عربی، فارسی بول اردو میں دیکھ نہیں سکتے اور یہ بھی نہیں بتاتے یہ کیوں آپ کو برے لگتے ہیں کیا آپ کوئی بھی ایسی آگے بڑھنے والی بھاشا بتا سکیں گے جو باہر کی بولیوں کو ٹھکرا کے اپنے ہی گنے چنے ڈھائی بول لئے بیٹھی رہی ہو اور انہیں کے سہارے آگے بڑھ کے یہ ٹھیٹ پونجیا بھاشا ایسی پھولی پھلی ہو جو دوسری بڑھنے اور پھیلنے والی بولیوں کے لگ بھگ کہی جا سکے۔ عربی، فارسی بولوں کے نکال ڈالنے سے اردو کی بڑی لمبی چوڑی انگنائی گھٹ گھٹا کے بالشت بھر رہ جائے گی۔ یہ سچ ہے۔ ہندوؤں کو چوڑی چکلی انگنائیاں اچھی نہیں لگتیں اور اسی لئے وہ اپنے اپنے گھروں کی انگنائی چھوٹی چھوٹی سی رکھا کرتے ہیں۔ پر یہ گھر اور بھاشا کا گھر دونوں کے دونوں ایک سے تو نہیں ہو سکتے۔ جس بھاشا کی بڑھوتری دن دونی رات چوگنی ہو اور جس کی دوڑ پھیلاؤ سے پھیلاؤ کو بھی روندتی چلی جارہی ہو۔ اسے آپ ٹھکرانا چاہتے ہیں۔ اسے تو کلیجے سے لگا کے رکھئے۔

آپ سے یہ تو کوئی نہیں کہتا۔ عربی، فارسی کے نئے نئے من من بھر کے بھاری سے بھاری بول اردو میں آپ ٹھونستے چلے جائیں جو یہ کہے اسے سٹری سمجھئے۔ پر ان دونوں بولیوں کے وہ بول جنہیں پڑھے لکھے تو پڑھے لکھے، ان پڑھ گاؤں والے اور گنوار تک دن رات بولتے چالتے ہیں انہیں اردو میں سے نکالنے کے جتن کرنا تو ٹھیک نہیں۔

دیکھئے وہ ہل جوتنے والے جو پو پھٹتے ہی تاروں کی چھاؤں میں اپنے اپنے دھندوں میں لگے تو سورج ڈوبنے پہ سستانے کے لئے ٹھہرتے ہیں۔ وہ بھاشا واشا کے کھڑاک کو کیا جانیں۔ پر یہ اردو کا پھیلاؤ دیکھنے کا ہے جو وہ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے عربی، فارسی کے سیکڑوں بگڑے ہوئے بول کے بول بے جھجک بولتے چالتے ہیں۔ اچھوتوں کے لئے جب آپ گاؤں گاؤں پھر رہے تھے تو یہ سب کچھ آپ سن چکے ہوں گے جو اب آپ کو سنایا جارہا ہے:۔

عربی، فارسی کے وہ بگڑے ہوئے بول جو گاؤں والے اور گنوار رات دن بولتے ہیں۔

مرجی (مرضی) نارا ج (ناراض) کھپار (خفا) منجور (منظور) تکدیر (تقدیر) جمین (زمین) بھیت (صفت) منائی (منع) کبالہ (قبالہ) کھزانہ (خزانہ) تکھا

(تنخواہ)، مجوری (مزدوری)، کھون (خون)، بید کھلی (بے دخلی)، دستاویج (دستاویز)، کاگج (کاغذ)، کلم (قلم)، کاجی (قاضی)، راجی (راضی)، کھتا (خطا)، جلم (ظلم)، کابل (قابل)، کبول (قبول)، جکام (زکام)، جلزلہ (زلزلہ)، بکھار (بخار)، رجا (رضا)، بھیج (بیج) محمد (فیض)، کھیرات (خیرات)، کیامت (قیامت)، اجاب (عذاب)، ناجک (نازک)، کمبکھت (کمبخت)، ہاجر (حاضر)، کھالی (خالی)، کسور (قصور)، سجا (سزا)، سورت (شہرت)، زلدی (جلدی)، ترا (طرح)، طرح، مجود (موجود)، مالوم (معلوم)، نکد (نقد)، مالا (معاملہ)، گلت (غلط)، مدرسہ (مدرسہ)، نالت (لعنت)، رونک (رونق)، مولی صاب (مولوی صاحب)، ہمیسہ (ہمیشہ)، کمجور (کمزور)، کھساند (خوشامد)، ریسم (ریشم)، جمانت (ضمانت)، جامن (ضامن)، مکدما (مقدمہ)، کھارج (خارج)، دسکھت (دستخط)، کواب (کباب)، ساری (شادی)۔

یہ کچھ بول تو یونہی لکھ دئے ہیں۔ سوچ بچار کیا جائے تو اور ایسے سیکڑوں بول کے بول نکل آئیں گے۔ عربی، فارسی کے بگڑے ہوئے کچھ بول ابھی آپ نے سنے اب انہیں بولیوں کے وہ بول بھی دیکھ لیجئے جنہیں ان پڑھ سے ان پڑھ گاؤں والے اور گنوار جوں کا توں بولتے ہیں۔

جیسے مکان، دکان، میدان، جان، ران، تکیہ، لتہ، صورت، بدن، گردن، سینہ، پلک، کمر، آدمی، عورت، بچہ، اگر، مگر، کتاب، سردی، گرمی، بادام، ادرک، کام، نام، کمان، تیر، لگام، مال، عینک، گلاب، بہار۔

میرا کہنا یہی ہے یہ اور ایسے اور اور عربی، فارسی کے وہ بول جو اردو میں پورے سما چکے ہیں جنہیں چھوٹے بڑے سب بولتے ہیں انہیں ہاتھ نہ لگائیے۔ ایسے ہی ہندی کے وہ گھلے ملے بول جو سب کی بات چیت میں چلے آرہے ہیں۔ ان سب کو ملا جلا کے اردو کو اور آگے بڑھانے کے نئے نئے ڈھب نکالئے۔ ہند جیسے، ہندو مسلمان سب کا جنم بھوم ہے ایسے ہی اردو بھی ان میں سے کسی ایک کی بھاشا نہیں یہ ان سب کی بھاشا ہے۔ سب کی بھاشا اس لئے کہہ رہا ہوں۔ اردو کے آگے بڑھنے اور پنپنے کے لئے مسلمان اور ہندو دونوں ساتھ ساتھ اب تک اپنے اپنے سے جتن کرتے رہے۔

یہ کہہ چکا ہوں ہند کے چپے چپے کی چھوٹی چھوٹی بولیاں ایسی بہت سی ہیں جو دیس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں الگ الگ بولی اور سمجھی جاتی ہیں ان میں دیکھئے اور ڈھونڈئے تو عربی فارسی بول چھپے چھپائے ملیں گے بل اتنا ہی ہوگا کسی میں بدیسی بولیوں کے بول بہت ہوں گے کسی میں تھوڑے، اور کسی میں بہت تھوڑے۔ دیس کی سب بولیوں کے گنتی ہی کے کچھ کچھ بول یہاں لکھے جائیں تو یہ لکھت بڑھ کے نہ جانے کہاں تک پہنچے۔ اس لئے وہ سب تو نہیں اک مرہٹی بھاشا ہی کے کچھ بول لکھتا ہوں:۔

عربی، فارسی بولوں کی ریل پیل مرہٹی میں

ائین (آئین)، اکل (عقل)، اکھتیار (اختیار)، اکھر (آخر)، اکھیر (اخیر)، بیسھائی (صفائی)، عجب، اجمت (عظمت)، اجماس (آزمائش)، اجار (آزار)، اجاری (آزاری)، اتر (عطر)، عدالت، عداوت، انامت (امانت)، ابھکرا (اجرہ)، اپھوا (افواہ)، اباد (آباد)، ابماری (عماری)، ابھر (ابر)، عیب، مارکھ (عرق)، ارج (عرض)، الاہیدا (علیحدہ)، اول (اوّل)، آتس باجی (آتش بازی)، آپ گرجی (خود غرضی)، آمیج (آمیز)، آواج (آواز)، اشک (عشق)، آشک (عاشق)، اشک باج (عشقباز)، اکرار (اقرار)، اکھلاس (اخلاص)، اجت (عزت)، ایجا (ایذا)، انبار (اعتبار)، اتلا (اطلاع)، انساپھ (انصاف)، انام (انعام)، ارادہ، عنایت، امان (ایمان)، عادت، انگشتان (انگشتانہ)، عالم، آلی سان (عالیشان)، عبرت، الاکھا (علاقہ)، علاج، علت، عمدہ، عمر، ادا، ادب، امین، امرا، ابھدوار، اولاد۔

مرہٹی کی بات چیت پر اک بھولی ہوئی بات دھیان میں آئی بہت دن ہوئے جو مرہٹی کے اک اناڑی کھلاڑی سے مڈبھیڑ ہوئی۔ اس کا اوڑھنا بچھونا جو تھا وہ مرہٹی اور انگریزی، اور کوئی بھاشا واشا جانتا نہ تھا۔ کچھ لوگ آپس میں کسی بھاشا کے پھیلاؤ پر کچھ کہہ سن رہے تھے۔ مرہٹی کا نیا کھلاڑی جو سب سے الگ بیٹھا تھا۔ یہ بات چیت سن کے نہ رہ سکا اور وہیں سے تڑسے بولا ہماری بھاشا کا سا پھیلاؤ دیس کی کسی بھاشا میں نہیں۔ چار دن سے اردو جو بڑھ چلی ہے یہ بھی ہماری بھاشا کے بل پر۔ بجلانے مرہٹی نے اردو کی کیسی سیوا کی جو اس کے سیکڑوں بول اردو میں آگئے جنہیں اردو والے اپنے یہاں کا سمجھ رہے ہیں۔ وہ بول کون کون سے ہیں اس پوچھنے پر وہ سکرا کے کہنے لگا۔ ایک دو؟ سیکڑوں — یہ کہہ کے اوپر لکھے ہوئے بولوں میں سے کئی بول اس نے سنائے۔ جس پر جاننے والے ہنس پڑے اور وہ ہکا بکا ہو کے ایک ایک کا منہ دیکھنے لگا۔ اس میں ہنسی کی کون سی بات ہے اسی پر اسے اچنبھا ہوا۔

مظفر پور میں ہندی ساہتیہ سمیلن کے اک بڑے بھاری بھرکم پنچ نے جو وہاں — پڑھ کے سنایا۔ اس کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا یہاں لکھتا ہوں

"ہماری ہندی کے کویوں کویوں کی متی گتی بالکل نرالی ہے۔
وہ کبتا کی گاڑی کے دھرے اور پہیے بھی بدل رہے ہیں۔
اپنے اُدبھت جھگڑے میں نیچے کی اور ریل توجوت کر گنتو پتھ
پر پہنچا یا چاہتے ہیں۔ یہ اتنی نہیں منو نکھتا کا لکشن ہے۔ اس سے کبتا
کا سدھار نہیں سنگھار ہو رہا ہے"۔

کیا ایسی ہی ان گھڑ بھاشا سارے دیس کی بھاشا بن سکتی ہے کیا ایسی ہی انوکھی بولی پورے دیس میں پھیل سکتی ہے۔ کیا ایسی ہی لکھت کے پر چار پر آپ اڑے ہوئے ہیں۔ کیا یہی سب جنم بھوم والوں کی اکیلی بھاشا بن سکے گی اور کیا اسے ہی سب چھوٹے بڑے بول سکیں گے۔ دیکھئے تو یہ کیسا اودھم مچا ہوا ہے۔ عربی، فارسی کے گھلے ملے بول جو سب بولتے چالتے ہیں جان جان کے انہیں چھوڑ چھاڑ اور چھانٹ چھانٹ کر کویوں، متی گتی، کبتا، اُدبھت، گنتو پتھ، منو نکھتا، لکشن۔ ان بھدے بسرے بولوں کو ٹھونسا گیا ہے۔ باہر والی بولیوں سے کترا کے اور بچ بچا کے نکلنے پر بھی بدیسی بولوں سے یہ لکھت نہ بچ سکی اور گنتی ہی کے سہی پر کئی بول اس میں آ ہی گئے۔ کچھ فلم بنانے والی کمپنیاں بھی اپنے یہاں کے ڈراموں میں ایسی ہی ٹھونس ٹھانس کر رہی ہیں۔ یہ جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے۔ دیس کے ماتھے کے لئے کلنک کا ٹیکا ہے۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اس نئی اپج کو دیکھ کے نہ رہ سکے اور انہیں یہ کہنا ہی پڑا۔

"یہ زبان کیوں کر کل ملک کی زبان ہونے کا دعوےٰ کر سکتی ہے
اور کوئی مذاق سلیم اور اردو میں شعور رکھنے والا اردو کو چھوڑ کر
اسے کس طرح اختیار کر سکتا ہے"۔

فارسی کے رسیا بھیم سین کائستھ، پٹن کے البسری داس، پٹیالے کے سبحان رائے، جگ جیون داس، کیول رام اگروال، منشی بھوپت رائے، منشی چندر بھان، اودے رائے، منشی ٹیک چند بہار یہ اور ایسے اور اور ہندوؤں کی فارسی لکھتیں۔ دیکھنے کو آپ سے نہیں کہا جاتا۔ پر وہ نئے پرانے اردو لکھنے والے ہندو جنھوں نے اردو کی ایسی سیوا کی جس پر اتنا لکھا جا سکتا ہے جو لکھتے لکھتے بڑا ــــ ڈھیر لگ جائے۔ ان کی لکھتوں کو تو دیکھ لیجے۔

پنڈت دیا شنکر نسیم، پنڈت بینڈو لال زار، پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت نوبت رائے نظر، پنڈت بشن نرائن در آبر، پنڈت برج نرائن چکبست، منشی درگا سہائے سرور، منشی پریم چند، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، پنڈت امرناتھ جھا، پنڈت گنگا ناتھ جھا، پنڈت آنند نرائن ملا، پنڈت کشن پرشاد کول، پنڈت منوہر لال انتقی، مسٹر رگھوپتی سہائے فراق، مسٹر اقبال ورما سحر، مسٹر رام پرشاد کھوسلہ ناشاد، مسٹر کرشن سہائے، مسٹر تلوک چند محروم، مسٹر مہاراج بہادر برق، چودھری جگت موہن لال رواں، پروفیسر سری رام شرما، مسٹر رام دیال سکسینہ، ٹھاکر جے آر رائے، لالہ روشن لال، مسٹر رام سرن نگم، مسٹر سری نرائن نگم، مسٹر دیا نرائن نگم، مسٹر سورج نرائن مہر، مسٹر سدرشن، مسٹر شیام موہن لال جگر، یہ سب کے سب ہندو اور پکے ہندو۔ اس پر بھی ان کی لکھتوں کا ڈھیر ایسا ہے جس میں نویں، متی گتی، کبتا، اودبھت، گنتو پتھ، منو نکھتا لکشن، سمپتی، شکتی، رچھا، نویدن، آشا، دشا، سمبندھ، کلاہل، ویاکرن، ہنوں ایسے ایسے بولوں کا پتا بھی نہیں اور ڈھونڈے سے بھی ایسے کڈھب بول ان میں کہیں نہ مل سکیں گے۔

ان ہندوؤں کی لکھت کا وہی ڈھنگ ہے جو مسلمانوں کا ـــ دونوں میں بال بھر اول بل نہیں اور اول بل ہو کیسے جب ہندو مسلمانوں نے مل جل کے اب تک اردو کو یہاں تک سدھارا جوڑ اج کے بل پر بڑھنے والی بولیوں کے لگ بھگ دکھائی دینے لگی۔ اب تک پہلا سا نہ سہی اسی اردو کے بولنے چالنے ہی میں تھوڑا بہت جو بھی ہے ہو تو ایکا یہی ایکا آگے بڑھ کے جب من سیدھی ہو گی تو پورا بھی ہو سکتا ہے اور جو یہ تھوڑا بھی نہ رہا تو پھر رہا کیا۔ اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ۔

ہند ماتا کا گہنا پاتا جو بھی تھا ایک ایک کرکے سب کا سب کب کا لٹ لٹا چکا اور آئے دن کی نوچ کھسوٹ اور لوٹم لاٹ نے ایک چھلا بھی نہ چھوڑا۔ لے دے کے یہی اردو ہندو مسلمانوں کے ملاپ کی اک پرانی انگوٹھی دیس کے ہاتھ میں پڑی رہ گئی تھی۔ آج کل اس کی بھی چھینا جھپٹی ہو رہی ہے اور دیس کی انگلی سے اسے بھی اتارنے کے جتن کئے جا رہے ہیں۔ یہ پرانی انگوٹھی بھی چھن گئی تو پھر کیا ہو گا یہ آپ سوچئے۔

اردو کو مسلمانوں کے دھرم کی بھاشا آپ کہہ چکے ہیں اس لئے یہ ڈر لگتا ہے کہیں اس بات چیت سے آپ یہ نہ سمجھ لیں۔ اپنی بھاشا کی پرچک لی جا رہی ہے اور اس کے بچاؤ کے لئے یہ باتیں بنائی جا رہی ہیں۔ کسی کے دھیان پر روک ٹوک کیسے ہو سکتی ہے جس کا جو جی چاہے سمجھ لے۔ پر سچی بات تو یہ ہے دیس کے لئے یہ باتیں چھیڑنی پڑیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ دیس کے منہ پہ کیسی جھریاں پڑتی چلی جا رہی ہیں یہ کیسا

نڈھال ہوتا جا رہا ہے۔ آپا دھاپی کے کیسے جھگڑے چل رہے ہیں۔ ایسا اندھیاؤ ہے جو آنکھیں کھولنا دوبھر ہو گیا ہے۔ دیس کے اندھیرے گھپ میں بگاڑ کا لمبا ترنگا بھوت، ہاتھ پھیلائے، دانت نکالے کھڑا ہنس رہا ہے۔ اس کے پرچھائیں سے یہاں والے سڑی بن کے آپس میں لڑتے مرتے ہیں۔ کوئی بڑا منتر پڑھنے والا ایسا منتر پڑھے اور ٹونا کرے جس سے دیس پر سے یہ بھوت اتر جائے اور بھوت اتر جانے سے یہاں کے ساتھ رہنے سہنے والوں کی ایسی آنکھیں کھلیں جو سب مل ملا کے سانس لینے کے یہ ڈھائی دن آپس میں ہنس بول کے کاٹ دیں۔ بھوت اتارنا ہنسی کھیل نہیں اس کے لئے بڑی پڑھنت پھونک چاہیئے جسے آپ ہی کر سکتے ہیں۔

یہی اردو تو اب یہ مٹنے مٹانے کے جوکھوں سے نکل چکی۔ اس کا پودا اب پودا نہیں رہا جو لو کے تھپیڑوں اور ٹھنڈک سے جھلس اور ٹھٹھر کے رہ جائے۔ یہ پودا پیڑ بنا اور بن رہا ہے۔ اس کی جڑیں آگے تک پھیلیں اور پھیل رہی ہیں۔ اس کی بڑی بڑی ڈالیاں، موٹے موٹے ٹہنے اور ہری بھری ٹہنیوں سے موٹی پتلی اور اور ـــــ ٹہنیاں نکل نکل کے ان میں نئی نئی کونپلیں پھوٹتی چلی جا رہی ہیں۔ اس کا تو اب کچھ ڈر ہی نہیں۔ اس میں ایک یہی بات دیکھنے کی ہے جس دھندے کو سب اب تک مل جل کے کر رہے تھے۔ اب ان میں پھوٹ پڑنے اور الگ تھلگ ہو جانے سے ایک ہی جتھے کو وہ پورا بوجھ اٹھانا پڑے گا۔ جسے پہلے سب مل ملا کے اٹھا رہے تھے۔ اس سے بڑھتی ہوئی چال دھیمی پڑ جائے گی اور پہلی سی پھرتی نہیں رہے گی۔ پہلے جو بات دنوں میں پوری ہوتی تھی وہ اب مہینوں پہ جا پڑے گی۔ پرنھے تو یہ دکھائی دیتا ہے۔ پورے ہندو بھی کبھی اپنی اردو کو چھوڑ نہیں سکتے اور اپنے بڑے بوڑھوں کے گاڑھے پسینے سے سینچی ہوئی اس ہری بھری کھیتی سے کبھی ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔

مہاتما جی۔ دیکھیئے تو آپ کی اردو کسی بھاشا سے بھی ہیٹی اور دبتی ہوئی نہیں۔ وہی باتیں وہی گھاتیں ایک ایک کر کے اس میں دیکھ لیجئے تو نئی بھاشا کی جگہ اپنی اسی اردو کو ایسے ہی آگے بڑھائیے نا جیسے آج تک ہندو مسلمان سب مل جل کے اسے بڑھاتے اور سدھارتے چلے آئے۔

اس کے پرچار کے لئے پہلے ایسی ریڈریں لکھوائی جائیں جن میں عربی، فارسی، ہندی ان سب کے دھلے گھلے ملے بول ہوں جنھیں سب بولتے ہیں۔ جیسے عربی، فارسی کے کڈھب بول ان میں جگہ نہ پا سکیں ایسے ہی ہندی کے بھولے بسرے بول بھی ان میں کہیں نہ آنے پائیں اسی بات میں آگے بڑھ کے یہ دیکھ بھال بھی کرنا پڑے گی۔ اردو کے پھیلاؤ اور بڑھانے کے لئے کہاں کہاں سے، اور کون کون سے بول چنے جائیں یہ گتھی ایسے لوگوں کے اکٹھا کرنے سے سلجھ سکتی ہے جو بھاشا کی بناوٹ اس کا اتار چڑھاؤ، لوچ، گھلاوٹ اور بولوں کی ناپ تول، ان کا بھدا پن ہلکا پن یہ اور ایسی اور اور باتوں کو پرکھ سکتے ہوں۔

جیسی جگہ ہو ویسے ہی چن چنا کے وہاں بولوں کا جڑنا اور بٹھانا جانتے ہوں۔ سب لوگ بھاشا کا سترا نہیں بنا سکتے۔ بڑی سی بڑی سبھا میں سے بھی چھانٹیئے گا تو ایسے لوگ کچھ ہی نکلیں گے۔ عربی، فارسی، ہندی ان میں سے نئے بول جس کے بھی ہوں پورے سوچ بچار سے جانچ جانچ کے ان کا چنا اور انہیں اپنی اپنی جگہ ایسا جمانا جو وہ پھر نہ اکھڑ سکیں۔ ایسے ڈھب انہیں لوگوں کو آتے ہیں جو بھاشا کے پورے ٹھکانے جانتے ہوں۔ ایسے لوگوں کی دیکھ بھال سے یہ ریڈریں ایسی لکھی جائیں گی جن میں نہ بھاری بھاری عربی، فارسی کے بول ہوں گے اور نہ ہندی کے بھولے بسرے بھدے بھیلے بول۔ ان میں نہ مولویوں، ملاؤں کے ان گھڑ بول دکھائی دیں گے اور نہ پنڈتوں کے کٹھن اور کڈھب بول۔ ان میں نہ ٹھیٹ ملا پن ہوگا اور نہ ٹھیٹ پنڈت پن۔ یہ ریڈریں ٹھیٹ مولویوں اور ٹھیٹ پنڈتوں کی لکھنوں سے الگ ہوں گی۔

ان کے لکھنے کا ڈھب ایسا سمویا ہوا، موتی سا چمکتا، میٹھا پانی ہوگا جس میں بھولے بسرے بولوں کی ٹھونس ٹھانس کا کوڑا کرکٹ اور گدلا پن کچھ بھی نہ رہ سکے گا اور یہ سوجھ بوجھ بڑھانے والا امرت جل آنکھوں سے پیا جائے گا۔ جس سے من ڈھلتے ڈھلتے چمک اٹھیں گے اور آنے والی پود پہلے ہی سے یہ پریم جل پی کے سمجھ کی پوری آنکھ کھلنے تک ایسے ستھرے من کی ہو جائے گی جسے پھرتی سے آگے بڑھنے اور دیس کے سنبھالنے میں کوئی رکاوٹ ہی نہ رہے گی۔

پہلے ہی سے عربی، فارسی، ہندی ان سب کے ملواں بول ساتھ ساتھ پڑھنے لکھنے سے پھوٹ ڈالنے والا یہ دھیان کبھی بھولے سے بھی پھر کسی کو نہ آئے گا۔ اس لکھت میں بدیسی بولیوں کے اتنے بول ہیں اور ہندی کے اتنے۔ ان میں سے انہیں چھوڑ کر انہیں چن لینا چاہیئے۔ سب بولوں کو ساتھ ساتھ دیکھتے دیکھتے اور پڑھتے پڑھتے ان سب کا پیار، پریم جی میں جڑ پکڑتا چلا جائے گا اور سب اسی اردو کو اپنی بھاشا سمجھیں گے اور اس کے اور اور

بناؤ سنگھار کے لئے سوچ سوچ کے نئے ڈھب نکالتے رہیں گے تو اس جتن سے بھاشا الگ پھلے پھولے گی اور آج کل کی سی چھیڑ چھاڑ جس سے دیس کو گھن لگتا جا رہا ہے یہ بات بھی پھر نہ رہے گی، سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے اس کہاوت کو سچا کر کے دکھا دیجئے اور جو اوپر لکھا جا چکا اس کا پرچار ایسا کیجئے جس سے گھڑی گھڑی کے جھگڑے ٹنٹے کا سانپ بھی مر کے رہ جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹنے پائے۔

بھاشا کے لکھنے کا ڈھنگ کون سا رکھنا چاہئے۔ یہ بھی اک بڑی الجھی ہوئی گتھی ہے۔ اس پر بھی یہیں لکھنا چاہتا تھا۔ پر اس لئے چھوڑتا ہوں ایک تو یہ بات کٹھن ہے اور اس کے کٹھن ہونے سے بہت پھیلنا پڑے گا۔ دوسرے یہاں تک جو کچھ لکھا جا چکا ابھی یہ بھی دیکھنا ہے اسے دیکھ کے آپ کہتے کیا ہیں۔ یہ باتیں آپ نے کان دھر کے سن لیں تو پھر کبھی اس پر بھی جو جو باتیں دھیان میں ہیں ایک ایک کر کے سب لکھوں گا اور بتاؤں گا اس کے لئے کیا کرنا چاہئے۔

یہاں تک ادھ کٹے بولوں میں جو بھی کہا جا چکا ٹھنڈے جی سے اسے آپ نے سنا اور سوچ بچار کی آنکھوں سے دیکھا تو سمجھوں گا یہ لکھت ٹھکانے لگی اور جو یوں ہی دیکھ دکھا کے ڈال دیا تو بات آئی گئی ہوئی۔ اچھا چلتے چلتے یہ ایک بات اور سن لیجئے:۔

اب تک میں نے جو بھی کہا اسے آپ نہیں سنتے اور نہیں مانتے۔ نہ سنئے اور نہ مانئے۔ عربی، فارسی بولوں کو آپ ہاتھ لگانا نہیں چاہتے۔ نہ لگائیے۔ ان بدیسی بولیوں کے بول آپ نہیں دیکھ سکتے نہ سہی۔ اچھا ٹھیٹ اردو لکھنے کا یہی ڈھب جو آپ کے سامنے ہے اسی کو برتئے اور اس کا پرچار کیجئے۔ عربی، فارسی بول جن سے آپ کو چڑ ہے دیکھ لیجئے اس میں ان کا پتا بھی نہیں تو پھر کویوں، ستی گتی، کبتا، اومنت، گننو تپھ، منو نکھنا، لکشن، کرتویہ، ساہتیہ، سوبھاؤ، سمئے، جیون آشا، وشواشکتی، شکشا، سمبندھ، ایکتا، ہتوں، ابھیاس، وشئے، شبد، رکھشا، نشچے، کلاہل، ویاکرن، اودئے، راج نیتی۔ ایسے ایسے بھولے بسرے بولوں کی ٹھونس ٹھانس سے نئی بولی بنانے کی کھکیڑیں اٹھانے سے کیا یہ اچھا نہیں جو آپ اسی ٹھیٹ اردو لکھت کے پرچار کی حامی بھریں اور اسی کو پھیلائیں اور اسی کو آگے بڑھائیں۔

آپ سے باتیں کرنا تھیں اور آپ کو بدیسی بولیوں سے چڑ۔ تو پھر لکھنے کا یہ ڈھب نہ رکھتا تو کیا کرتا عربی، فارسی، ہندی بولوں کو سمو کے لکھتا جیسے لکھا کرتا ہوں تو اس کے دو بول بھی آپ نہ دیکھتے۔

اسے دیکھ چکنے پہ جو سچی بات آپ کو دکھائی دے۔ وہ آپ لکھ بھیجیں، پرماتما کرے آپ انند ہوں۔

سید ابوالقاسم سررشتہ دار التراجم
حیدرآباد دکن

غزل

تو وہ عہدِ رفتہ کی یاد ہے کہ نہ جس کو دل سے بھلا سکوں
میں وہ بھولا بسرا سا خواب ہوں کہ کسی کو یاد نہ آسکوں

کوئی پوچھتا ہے حال دل تو میں سوچتا ہوں کہ کیا کہوں
ترا احترام ہے اس قدر کہ زبان تک نہ ہلا سکوں

یہ تری جفا کی ہے انتہا کہ تو مجھ کو یاد نہ کر سکے
یہ مری وفا کا کمال ہے کہ نہ تجھ کو دل سے بھلا سکوں

مرے جذبِ عشق کو کیا ہوا، وہ کہاں گئی کششِ وفا
مجھے کوئی یاد کرے گا کیا جو تمہیں کو یاد نہ آسکوں

حفیظ ہوشیارپوری
ایم اے

دختِ کُش

دخترِ مادرِ ہندی ہے زبانِ اُردو
"دُختِ کُش" اس کی تباہی کے اٹھاتے ہیں سوال

یہ دکن میں ہوئی پیدا تو پلی دِلّی میں
لکھنؤ میں ہوئی دوشیزۂ سلملائے جمال

کچھ دنوں خطۂ دلچسپِ اودھ میں ٹھہری
اور پنجاب میں پہنچی بہ سرِ اوجِ کمال

یعنی پنجاب میں اک نسیم کا ساگر بن کر
گوشہ گوشہ کو دیا مژدۂ احساسِ وصال

سنسکرت اس کی ہے دادی تو ہے پوتی اردو
(اتحاد) باعثِ حسن ہیں ایران و عرب کے خد و خال

لوچ الفاظ میں ــ لہجے میں نزاکت آئی
کھو دیا فیضِ فصاحت نے ثقالت کا وبال

سعیٔ مشاطۂ معنیٰ نے سنوارا ہے مگر
وہی عفت وہی عصمت وہی قد ہے وہی چال

نہیں پہچان کچھ اپنوں کی بھی ہٹ دھرموں کو
وائے بر ضعفِ بصر ہائے تعقّل کا زوال

سچ ہے یہ قول کہ اردو کی فنا "ممکن" ہے
مگر ایسے بھی ہیں "ممکن" کہ جو ہوتے ہیں محال

ہے یہ جاں دادۂ اردو کی زباں پر جاری
"دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال

ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا"

شاد عارفی



ایک فراموش شدہ باغ کو دیکھ کر

(سانیٹ)

یہیں پر اُس کو میں نے کھیلتے دیکھا تھا پھولوں میں
فرشتے جس طرح فردوس کی رنگیں بہاروں میں
ادائے بے خودی سے کھیلتے ہیں مرغزاروں میں
وہ جُھولے جھولتی تھی چاند کی کرنوں کے جھولوں میں
فضائے قدس اب تک اس کے نورانی تبسم سے
محبت سے بھرے دل کی طرح معمور رہتی ہے
سرود و کیف کی اک نہر سی دنیا میں بہتی ہے
متاعِ دلبری سے سرمدی کیفِ ترنم سے
فضا میں اب بھی اُس کے آسمانی گیت رقصاں ہیں
جو اُس نے کہکشاں کے نغمہ زاروں میں بکھیرے تھے
جو غلمانوں کے قدسی لالہ زاروں میں بکھیرے تھے
ہواؤں میں ابھی تک ایک شعلہ بن کے پرّاں ہیں
مرے دل کو ابھی تک اُس کی بو آتی ہے پھولوں سے
جواں ہو کر مری ہر آرزو آتی ہے پھولوں سے

تابش صدیقی

گڑیا

"مجھے ایک گڑیا چاہیئے" عورت نے کہا اور دکاندار نے اس کی ظاہری حالت سے اندازہ لگا کر کہ کتنی قیمت ادا کر سکتی ہے اسے دو شلنگ کی ایک گڑیا دکھائی۔

یقیناً مس مورڈنٹ امیر نہ تھی اور اس کے لباس سے بھی اسے کوئی امیر نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس کے کپڑے بہت معمولی تھے۔ صرف اس کی آنکھیں خوبصورت تھیں اور بال کالے اور لمبے تھے جن کی وجہ سے اس کے بہت سے عیب ڈھک جاتے تھے بجائے بالوں کو کاٹنے کے وہ جوڑا باندھا کرتی تھی۔ اس کی عمر تینتیس سال کی تھی اور وہ ایک ہفتے میں تیس شلنگ کماتی تھی

مگر دو شلنگ کی گڑیا اس کو پسند نہیں آئی۔ "یہ گڑیا تو کچھ اچھی نہیں ہے" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"اگر آپ کو یہ پسند نہیں تو میں دوسری دکھلائے دیتا ہوں" دکاندار نے کہا۔ مس مورڈنٹ نے گڑیا کو ہاتھ میں لے کر اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ مگر وہ اُسے پسند نہیں آئی۔

"یہ تو . . . " اس نے کہا "یہ تو لڑکی کو پسند نہیں آئے گی۔ اسے اس سے بڑی گڑیا چاہیئے" وہ یہاں بات کرتے کرتے اس لئے رکی کہ اسے دھوکا دینا نہیں آتا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ گڑیا کی ضرورت کسی چھوٹی سی لڑکی کو نہ تھی اور اسی لئے وہ جھوٹ بولتے ہوئے گھبرا سی گئی۔

آخر میں مس مورڈنٹ نے جو ہفتے میں تیس شلنگ کماتی تھی آٹھ شلنگ کی گڑیا خریدی۔

"بڑی خوب صورت گڑیا ہے" دکاندار نے اسے کاغذ میں لپیٹتے ہوئے کہا اور اس کو ڈبے میں بند کر دیا۔ "اس سے کھیلنے میں یقیناً بچی کو بہت لطف آئے گا" ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسے دینا نہیں چاہتا۔ بعد میں دکان دار نے بہت سے دوسرے قسم کے کھلونے دکھائے۔ مگر مس مورڈنٹ نے کہا کہ اسے اور کچھ نہیں چاہیئے۔

وہ گڑیا کے ڈبے کو لے کر دکان سے نکلی۔ ڈبے میں اٹھانے کے لئے ڈوری کا پھندا لگا ہوا تھا۔ مگر مس مورڈنٹ نے بجائے اس پھندے کو پکڑنے کے ڈبے کو احتیاط سے بغل میں دبا لیا۔

سڑک پر آج غیر معمولی طور پر بہت شور تھا موٹر کے ہارن سائیکلوں کے غل غپاڑے سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی کوچوان نے ایک کتے کو چابک مارا۔ اُس نے چیخ چیخ کر سارے بازار کو سر پر اٹھا لیا۔ اخبار بیچنے والوں نے الگ شور مچا رکھا تھا۔ اس شور میں جو کچھ مس مورڈانٹ نے گڑیا سے کہا کوئی نہ سن سکا۔ "ہمارا گھر اب بہت دور نہیں ہے" اس نے کہا۔

مگر وہ پاگل نہ تھی۔ اگر وہ پاگل ہوتی تو اتنے بڑے دفتر میں تیس شلنگ فی ہفتہ کس طرح کما سکتی تھی۔ جب وہ پہلے نوکر ہوئی ہے تو اسے صرف اٹھارہ شلنگ ملتے تھے۔ صرف چار سال میں اس نے اتنی ترقی کر لی تھی۔ وہاں کے مینیجر کا خیال تھا کہ وہ اپنے فرائض سے زیادہ کام کرتی ہے۔ مسٹر فورٹ جو دفتر کا حساب کتاب رکھتا تھا اس کا خیال تھا کہ مس مورڈانٹ ذرا تیز مزاج ہے۔ بوڑھی عورت جو دفتر صاف کرنے پر مقرر تھی سمجھتی تھی کہ وہ بہت با اخلاق عورت ہے اور چپراسی کا خیال تھا کہ ضرورت سے زیادہ پھرتیلی ہے اور ایسے ہی آدمی کو پسند کرتی ہے۔ اس طرح ایک ہی شخصیت کے متعلق لوگوں کے مختلف خیالات تھے۔ مگر یہ تو سب جانتے تھے کہ مس مورڈنٹ پاگل نہیں ہے۔

لیکن سوال یہ تھا کہ جب وہ پاگل نہ تھی تو اس نے اپنے لئے آٹھ شلنگ کی گڑیا کیوں خریدی!

وہ عورت تھی۔ صرف قسمت کے پھیر نے اسے کام کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ بالکل اکیلی تھی اس نے اب تک شادی نہیں کی تھی۔ اس کے عورت ہونے ہی نے اسے گڑیا خریدنے پر مجبور کیا۔ ایسی عورتیں انہیں کاموں کو قربانی اور بہادری کے کام سمجھتی ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ ایک

کم معاش عورت کا آٹھ شلنگ کی گڑیا خریدنا واقعی بہت بڑی قربانی کہلانے کا مستحق تھا۔ ایک چھوٹی سی گلی میں اس نے دو کمرے کرائے پر لے رکھے تھے۔ ان کمروں سے ملا ہوا بالکل چھوٹا سا ایک باورچی خانہ تھا۔ اس کا فرنیچر بہت معمولی تھا مگر صاف ستھرا۔ اسے ان دو کمروں میں بہت آرام ملتا تھا

گھر پہنچ کر اس نے گڑیا کو ڈبے میں سے نکالا اسے پیار کیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگی "تھوڑی دیر یہیں ٹھیرو میری، دیکھو شرارتیں مت کرنا"

اس نے ڈبے کو الماری پر رکھ دیا جہاں اور دفتی کے ڈبے رکھے تھے کہ شاید کبھی کام آجائیں۔ پھر وہ باورچی خانے میں جاکر کھانا پکانے لگی۔ میری اس کے کہنے کے مطابق چپ چاپ بیٹھی سب دیکھتی رہی۔ مس مورڈنٹ کھانا پکاتے ہوئے اس سے باتیں کرتی رہی

"اُن ڈبوں کی قید سے تو یہ گھر اچھا ہے نا؟ تمہیں معلوم بھی ہے میں کھانا کھانے کے بعد کیا کرنے والی ہوں؟ میں تمہارے لئے سفید ریشم کا فراک سیوں گی۔ پھر تم شہزادیوں کی طرح خوبصورت معلوم ہوگی۔ تم اپنی اماں کے پلنگ کے پاس چھوٹے سے پلنگ پر سونا"

مس مورڈنٹ خاموش طبیعت کی عورت تھی۔ اتنے لمبے اور اتنے خوبصورت فقرے تو اس نے عمر بھر نہیں بولے ہوں گے۔ اگر کبھی ٹائپ کرتے کرتے مشین میں خرابی پڑ جاتی تھی تو وہ بالکل مختصر طور پر اس کی خرابی بیان کر دیا کرتی تھی۔ مس مورڈنٹ کے اس مختصر سے فقرے پر مسٹر فورٹ کو اکثر ہنسی آجایا کرتی تھی اور اسے مسٹر فورٹ کی بے جا ہنسی پر غصہ آجایا کرتا تھا۔ مگر کمرہ صاف کرنے والی عورت سے اس کا ذکر کرنے کے سوا اس نے مسٹر فورٹ سے کبھی خفگی کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔

فراک سیتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ میری سے باتیں کر رہی تھی۔ "اب تک میں بالکل اکیلی تھی گو میری بہت سی سہیلیاں ہیں مگر مجھے ایک چھوٹی سی لڑکی کی ضرورت تھی جو میرے ساتھ ہمیشہ رہے۔ میں کتا خرید لیتی مگر مشکل یہ ہے کہ میرے دفتر جانے کے بعد کتے کی حفاظت کون کرتا۔ میری چھوٹی سی بچی کتوں سے بہتر ہے"

خوش قسمتی سے میری کی آنکھوں سے یہ ظاہر ہوتا رہتا تھا کہ وہ ہر وقت ہنستی رہتی ہے۔ مگر لٹانے سے اس کی آنکھیں بند ہو جاتی تھیں اور یہ خوشی غائب ہو جاتی تھی۔ مس مورڈنٹ اس سے کہہ رہی تھی کہ وہ گھر میں دکان کے مقابلے میں زیادہ خوش رہے گی۔ وہ کچھ اور کہنے والی ہی تھی کہ اس کے پڑوس سے پیانو کی ہلکی سی آواز آئی جس نے ان کی گفتگو کو تھوڑی دیر کے لئے روک دیا۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"ہاں دیکھو معلوم ہوتا ہے کہ ساتھ والے کمرے بھی کسی نے کرائے پر لے لئے ہیں اور وہ عورت آج اس میں آگئی ہے۔ اس پیانو کے متعلق اس سے بات چیت کرنی پڑے گی۔ وہ بجاتی تو اچھا ہے مگر اس کے لئے مقررہ اوقات ہونے چاہئیں یہ ہر وقت کی ریں ریں تو ذرا تکلیف دہ ہے اگر یہ اس طرح شور مچاتی رہی تو میں عورتوں کی ادبی مجلس کا جلسہ کس طرح کرسکوں گی۔ سارا دن کام کرنے کے بعد میں آدھی رات تک اس پیانو کے شور کی وجہ سے جاگنا نہیں چاہتی۔ کل دفتر جانے سے پہلے ان بیگم صاحبہ سے ضرور ملوں گی۔ اچھا اب تم یہ فراک پہن کر دیکھو اس میں کیسی لگتی ہو"

لیکن وہ فراک پہنانے ہی والی تھی کہ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ اس نے جلدی سے گڑیا کو اور ان کپڑوں کو سونے کے کمرے میں ڈالا اور مس سٹیفرڈ کے لئے دروازہ کھول دیا۔

مس سٹیفرڈ دبلی پتلی سیدھی سادھی عورت تھی اور حفظانِ صحت کے قاعدوں کا بہت خیال رکھتی تھی۔ سوائے سگرٹ پینے کے وہ کوئی کام صحت کے اصولوں کے خلاف نہیں کرتی تھی۔

"تم اچھی تو ہو۔ کل شام عورتوں کی ادبی مجلس کے جلسے میں کیوں نہیں آئیں؟ میں سمجھی شاید طبیعت اچھی نہ ہوگی!"

"میں بہت تھک گئی تھی اس لئے آنے کو جی نہیں چاہا" مس مورڈنٹ نے کہا۔

"فضول بکواس" مس سٹیفرڈ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "جب تک تم یہ نہ سوچو کہ تم تھکی ہوئی ہو تم تھکان محسوس کر ہی نہیں سکتیں۔ اسی طرح بعض آدمی اپنے آپ کو کاہل بنا لیتے ہیں۔ خیر اب کے اس میں کچھ خاص بات نہیں تھی مارگرٹ جیکسن کو اپنی عادت کے مطابق غصہ آگیا اور اس نے تمہارے متعلق بھی کچھ کہا۔"

"سچ مچ! اس نے کیا کہا؟" مس مورڈنٹ نے گھبرا کر پوچھا۔

"کیا تم مسٹر فورٹ سے شادی کرنے والی ہو؟" مس سٹیفرڈ نے سوال کیا۔

"نہیں ہرگز نہیں! ایسا کبھی نہیں ہوسکتا!"

مارگرٹ جیک سن نے سنا ہے کہ آج کل مسٹر فورسٹم سے بہت خوش ہیں۔"

"تو کل تک وہ اپنا خیال بدل لیں گے۔"

"بہت خوب" مس سٹیفرڈ نے سگرٹ کی راکھ گراتے ہوئے کہا۔ "یہ عمر شادی کرنے کی نہیں ہے۔ اگر ساری دنیا کی لڑکیاں میرے کہنے پر چلیں تو ہم بہت جلدی مردوں کے پھندے سے آزاد ہو سکتے ہیں۔"

مس مورڈنٹ خاموش ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ مسٹر فورٹ بے وقوف آدمی ہے۔ اسے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ آج کل بہت کھیلی کھیلی سی ہے۔ ایک دم سے پیانو کی آواز نے اسے گھبرا دیا۔

"کتنا شور ہے" مس سٹیفرڈ نے کہا۔

"ہاں اس عورت کے پیانو نے میرا بھی ناک میں دم کر دیا ہے۔ میں کل اس سے اس کے متعلق بات چیت کر دوں گی۔ اس کمرے میں بیٹھ کر باتیں کرنا مشکل ہو گیا ہے۔"

مس سٹیفرڈ نے یاد دلایا کہ اس ہفتے عورتوں کی ادبی مجلس کا جلسہ اس کے ہاں ہو گا اور خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد مس مورڈنٹ نے نیا فراک گڑیا کو پہنایا گریبان میں ذرا خرابی تھی اسے ٹھیک کیا اور گڑیا کو اپنے ساتھ پلنگ پر سلا لیا۔

دوسرے دن صبح کو چائے پینے کے بعد مس مورڈنٹ اپنی ہمسائی کے پاس گئی تاکہ اسے آہستہ سے سمجھا دے کہ ہر ایک کام کا ایک وقت ہونا چاہیئے یہ ہر وقت کا باجا ذرا تکلیف دہ ہے۔

اس نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور جب دروازہ کھلا تو اسے بڑا اچنبھا ہوا۔ کیونکہ کمرے میں عورت نہیں تھی بلکہ ایک مرد تھا۔ گفتگو سے معلوم ہوا کہ یہ شخص گویا ہے۔ غصیلا ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اس کے بات کرنے کا ڈھنگ بہت دل چسپ تھا۔ مگر اس کی عادتیں ضدی بچوں کی سی تھیں۔ اس کا نام مسٹر سمتھ تھا۔

ابھی مس مورڈنٹ نے دو فقرے ہی کہے ہوں گے کہ اس نے اس کا مطلب بھانپ لیا۔

اس نے مس مورڈنٹ کو گھور کر دیکھا اور سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر کہنے لگا "میں کیا کروں؟ آپ ہی بتلائیے میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں جتنے گھروں سے نکالا گیا ہوں شاید ہی کوئی اور نکالا گیا ہو گا۔ میرے ہمسایوں نے ہمیشہ مجھ سے یہی شکایت کی۔ اب میں نے سوچا تھا کہ اس مصیبت سے نجات مل گئی۔ پیانو بجانے میں کوئی وقت کی پابندی نہیں کرتا۔ آج تک کسی نے نہیں کی۔ ابھی میں نے ناشتا بھی ختم نہیں کیا کہ آپ نے آکر کہنا شروع کر دیا پیانو جلا دو، جہنم میں جاؤ۔"

مس مورڈنٹ نے بہ مشکل تمام اپنی ہنسی روکی اور کہا "میرا مطلب یہ نہیں ہے بلکہ میں نے یہ کہا تھا کہ آپ صبح چھ بجے سے لے کر شام کے دس بجے تک بجا سکتے ہیں۔ ہاں بعض دنوں میں میں آپ کو شام کے چھ بجے باجا بند کر دینے کو کہہ دوں گی۔

مسٹر سمتھ نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور کہا۔ "ذرا ٹھہرو۔" پھر کہنے لگا "جانے دیجئے جناب۔ میں اتنی باتیں کیسے یاد رکھ سکتا ہوں؟ میں صبح چھ بجے نہیں اٹھتا اور رات کو چھ بجے تک بہت کم جاگتا ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ اگر اتنے نزدیک مکان ہوں تو بہت سی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔" مس مورڈنٹ ذرا گھبرا گئی کیونکہ وہ خود یہی کہنے والی تھی۔ پھر مسٹر سمتھ نے کہنا شروع کیا۔ "میں نے آج تک کسی کی شکایت نہیں کی۔ اوپر کی منزل میں ایک عورت ہے وہ سارا دن مشین چلا چلا کر اتنا شور مچاتی ہے کہ ایک منٹ آرام نہیں ملتا۔ مگر میں آج تک آپ کی طرح چیختا چلاتا اس کے پاس نہیں گیا کہ مہربانی کر کے مشین چلانی بند کر دو۔"

مس مورڈنٹ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ نہ تو وہ چیخی نہ چلائی نہ اس نے پیانو جلانے کو کہا۔ مگر اسے صبح جلدی اٹھنا پڑتا ہے کہ دفتر جانے سے پہلے گھر کا کام کرے۔ اس لئے . . . .

"آپ نے خوب یاد دلایا" مسٹر سمتھ نے چلا کر کہا۔ اس طرح بات کاٹنا بہت بدتمیزی کی بات تھی مگر بچاری مس مورڈنٹ کیا کر سکتی تھی۔ "کیا آپ مجھے کسی ایسی بڑھیا کا پتہ بتا سکتی ہیں جو روز صبح شام آکر میرے گھر کا کام کاج کر جایا کرے"؟

"ہاں ممکن تو ہے" مس مورڈنٹ نے کہا "مگر میں آپ سے یہ کہنے نہیں آئی تھی۔"

پھر اس نے سمجھایا کہ وہ کیا چاہتی ہے اور مسٹر سمتھ نے کہا کہ وہ وقت کی پابندی کرنے کی کوشش کرے گا مگر وعدہ نہیں کرتا اور ساتھ ہی اس نے مس مورڈنٹ سے کہہ دیا کہ ماما بھیجنا نہیں بھولنا۔ اس نے جلدی سے مسٹر سمتھ کو خدا حافظ کہا کیونکہ اسے فکر تھا کہ کہیں دفتر سے دیر نہ ہو جائے۔ وہاں جا

اس نے تھوڑی دیر مسز فاگ سے باتیں کیں جو دفتروں میں جھاڑو دیا کرتی تھی۔
مسز فاگ نے کہا "ہاں اگر ان کو میرا کام پسند آ جائے گا تو میں بھی کرنے کو تیار ہوں۔ اچھا تو یہ بتائیں وہ کیسے آدمی ہیں؟"
"خاصے اچھے آدمی ہیں۔"
"اچھا کل صبح میں خود جا کر دیکھ لوں گی کہ وہ کیسے آدمی ہیں میں کہہ دوں گی کہ آپ نے بھیجا ہے۔"
مس مورڈنٹ آج ضرورت سے زیادہ خوش تھی اور اس نے اس دن مسٹر فورٹ سے بھی بہت ہنس ہنس کر باتیں کیں۔ مسٹر فورٹ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ اس کا خیال تھا کہ وہ اچھی عورت ہے۔ صورت شکل کی بھی اچھی ہے عقلمند بھی ہے مگر مزاج کی ذرا تیز ہے۔ مگر یہ کوئی خرابی نہ تھی وہ اس کو نظر انداز کر سکتا تھا اور کچھ روز سے مس مورڈنٹ کو غصہ بھی نہیں آ رہا تھا۔
آج مسٹر فورٹ نے جو یہ رنگ دیکھا تو اپنا خیال ذرا بدل دیا اور ذرا بے تکلفی سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر پھر مس مورڈنٹ نے اپنا پرانا رویہ اختیار کر لیا۔ اس نے مسٹر فورٹ کی ہر ایک بات کا بہت مختصر سا جواب دیا۔ مگر وہ اسی سے خوش ہو گیا۔ اس نے شام کو اپنے ایک دوست سے کہا کہ عورتیں بھی عجب قسم کی جانور ہیں گھڑی میں خوش گھڑی میں ناخوش
گھر واپس آ کر جیسے ہی مس مورڈنٹ نے سیڑھیوں پر قدم رکھا باجے کی سریلی آواز نے اس کا استقبال کیا۔ مسٹر سمتھ کی آواز بہت اچھی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ اسے گانے کی کافی مشق ہے۔ مس مورڈنٹ کو اس وقت گانا سننے کا شوق ہو رہا تھا مگر جیسے ہی اس نے دروازہ بند کیا گانا ایک دم رک گیا۔ وہ میری سے باتیں کرنے لگی جس طرح مس مورڈنٹ اسے صبح کو بٹھا کر گئی تھی وہ اب بھی اسی طرح گدیلوں میں دبکی ہوئی بیٹھی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے آنے سے خوش ہو کر مسکرا رہی ہے۔
مس مورڈنٹ نے کہا "میری بہت اچھی لڑکی ہے بالکل شرارتیں نہیں کرتی اور مجھے دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔" پھر اس نے باجے کے متعلق باتیں شروع کیں "معلوم نہیں میری انہوں نے باجا کیوں بند کر دیا۔ اگر پورا گیت ختم کر کے بند کرتے تو اچھا تھا بعض لوگ عجب کم عقل ہوتے ہیں۔ بس انہیں بیٹھے بیٹھے غصہ آ گیا ہو گا۔ تم یہ تو نہیں بتا سکتیں کہ وہ سارا دن بجاتے رہے تھے یا نہیں؟"
ہاں یہ ٹھیک تھا بچاری میری کس طرح بتا سکتی تھی۔ اپنے معمول کے مطابق مس مورڈنٹ کھانا تیار کر رہی تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا جب اس نے دروازہ کھولا تو ایک آدمی نے پوچھا "کیا آپ کا نام مس مورڈنٹ ہے۔" اس کے ہاں کہنے پر اس آدمی نے ایک کارڈ اور پھولوں کا گلدستہ اس کو دیا کارڈ پر لکھا تھا "اس کارآمد تحفے کے شکریے میں جو آپ نے صبح کو بھیجا تھا یعنی مسز فاگ" اس نے پہلے سوچا کہ قبول نہ کرے مگر مسٹر سمتھ نے کچھ اس طرح لکھا تھا کہ اسے لینے پڑے اور اس کو پھول پسند بھی بہت تھے۔ مگر وہ خریدتی بہت کم تھی۔ اس نے سفید گلاب کے پھول کھانے کی میز پر رکھے اور خواہش ظاہر کی کہ میری ان کی تعریف کرے پھر وہ کھانا پکانے میں مشغول ہو گئی۔ وہ بھوکی تھی اور خوش بھی تھی۔
کھانا کھانے کے بعد مس مورڈنٹ نے مسٹر سمتھ کو شکریے کا خط لکھا، اور میری کے لئے ایک اور فراک تیار کیا۔

اس طرح دن گزرتے گئے اور جیسے ہی مس مورڈنٹ گھر میں قدم رکھتی تھی مسٹر سمتھ پیانو بند کر دیتے تھے۔ یہ بہت بری بات تھی کہ وہ پیانو اس پھرتی سے بند کر دیتا تھا۔ مس مورڈنٹ نے ارادہ کیا کہ وہ اس کے متعلق اس سے پھر بات چیت کرے گی۔ خاص خاص موقعوں پہ شام کو وہ چھ سے دس تک خاموشی چاہتی تھی۔ معمولی وقتوں میں اگر پیانو رات کے دس بجے تک بجتا رہے تو کچھ مضائقے کی بات نہ تھی۔ عورتوں کی ادبی مجلس کے دن اسے گفتگو کا موقع مل گیا۔
مس مورڈنٹ کے پاس صرف چائے کی چھ پیالیاں تھیں اور اس انجمن کے سات ممبر تھے۔ وہ اپنے کمرے کو سجا رہی تھی کہ اسے خیال آیا کہ ایک پیالی کم ہے۔ اس نے سوچا کہ مسٹر سمتھ سے مانگ لے اور اسے یہ بھی سمجھا دے کہ اسے موسیقی سے نفرت نہیں ہے۔
جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو مسٹر سمتھ نے غصے کے آثار نہیں ظاہر کئے۔ بلکہ اس کو کمرے میں بٹھا کر اس موقعے کے لئے موزوں پیالی تلاش کرنے اندر چلا گیا۔ اس کمرے میں ایک پیانو اور بہت سی کتابیں رکھی تھیں، روسی چمڑے اور ترکی سگرٹ کی بو آ رہی تھی۔
مسٹر سمتھ پیالی لے کر آیا اور پوچھا کہ اب وہ کب سے پیانو رات کے دس بجے تک بجا سکے گا۔
"ان دنوں میں بھی آپ بجا سکتے تھے۔ جب کبھی مجھے ضرورت ہو گی میں خود ہی کہہ دیا کروں گی کہ باجا بند کر دیں۔"

وہ ایک دم گھبرا کر بیٹھ گیا اور پیالی اس کے ہاتھ سے چھوٹنے آتا تھا۔

"ہاں یہ میری ہی غلطی ہے۔ میں ہر دفعہ بات کا الٹا مطلب لیتا ہوں۔ میں سمجھا تھا کہ صرف بعض دن شام کو آپ مجھے دیر تک بجانے کی اجازت دیں گی اور آپ تو مجھ پر بہت مہربان ہیں آپ نے نوکرانی کو بھیجا اور میرے طرح میرے آرام کا خیال رکھا۔ مگر یہاں تو دس بج کر پانچ منٹ والا قصہ ہو گیا۔"

"وہ کیا؟" مس مورڈنٹ نے مسکرا کر پوچھا۔

"مجھے ایک ڈرامے میں دس بج کر پانچ منٹ پر جانا تھا۔ مگر مجھے یہ خیال رہا تھا کہ پانچ بج کر دس منٹ پر جانا ہے۔ میں صبح کو جلدی اٹھا اور بغیر ناشتہ کئے بھاگتا بھاگتا وہاں پہنچا تو سب میرا مذاق اڑانے لگے کہ آپ جناب ڈرامے کی مشق تو دس بج کر پانچ منٹ سے ہو گی اور میں شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا۔"

مس مورڈنٹ نے معافی مانگی۔ مگر اسے مسٹر سمتھ کی باتوں میں بہت مزا آ رہا تھا۔

"میں نہیں سمجھ سکتی کہ اتنا بڑا گویا اتنی معمولی باتیں کس طرح بھول سکتا ہے۔"

"مگر میں تو سمجھتا ہوں کہ گانا بہت بڑا عیب ہے اس نے تو میرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ اب تو مجھے ایک سکرٹری رکھنا پڑے گا جو میری ہر ایک بات کا خیال رکھے۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے صرف میری خاطر اتنی تکلیف اٹھائی۔ آج تو آپ نہیں بجا سکیں گے کیونکہ آج خواتین کی انجمن کا جلسہ ہے۔ مگر کل سے آپ بجا سکتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی میرا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ اچھا خدا حافظ، بہت بہت شکریہ۔"

مس سٹیفرڈ کچھ کاغذ ہاتھ میں لئے دروازے پر کھڑی تھی "میں ذرا جلدی آ گئی ہوں کہ شاید تمہیں کام میں کچھ مدد کی ضرورت ہو۔"

"تمہارا شکریہ میں سب کچھ کر چکی ہوں صرف ایک پیالی مانگنے ساتھ کے گھر میں گئی تھی۔"

"ہاں مجھے یاد آیا کہ تم نے کہا تھا کہ ساتھ کے گھر میں ایک عورت آئی ہے۔ کیا تم نے اس سے کہہ دیا کہ آج باجا نہ بجائے؟"

"ہاں کہہ دیا وہ آج نہیں بجائے گی۔" مس مورڈنٹ نے شرماتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہیں پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے مس مورڈنٹ کو دھوکا دینا نہیں

جلسہ اچھا کامیاب رہا۔ سب نے عورتوں کی تعلیم و تمدن پر چھوٹے چھوٹے لیکچر دیئے۔ چائے پیتے وقت سب نے تو ایک رنگ کی پیالیوں میں چائے پی مگر مس مورڈنٹ نے بالکل مختلف رنگ کی پیالی میں پی۔ رات کو سوتے وقت مس مورڈنٹ نے میری سے کہا۔ "آج کی شام بہت اچھی طرح گزری اور مسٹر سمتھ خوب آدمی ہے۔ اس کو غصہ بہت جلد آ جاتا ہے اور اچھا امیر آدمی معلوم ہوتا ہے۔" میری خاموش بیٹھی اس کی باتیں سنتی رہی مگر ایک دم سے اس کا سر تکئے پر سے پھسل گیا اور اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

دوسرے دن صبح وہ ناشتا کر کے بیٹھی ہی تھی اور میری سے کچھ کہنے ہی والی تھی کہ مسٹر سمتھ کے پیانو نے اسے ایک دم روک دیا۔ وہ بہت شوق سے سن رہی تھی اور جب اس نے بجانا بند کر دیا تو مس مورڈنٹ نے تعریف کے طور پر آہستہ سے تالی بجائی۔

پھر دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی اس نے کنڈی کھولی تو مسٹر سمتھ کھڑے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے۔ مجبور تھی۔ کیا کرتی ان کو اندر بلا لیا۔ مگر وہ میری کو اٹھانا بھول گئی۔ مسٹر سمتھ نے کہا "میں نے آپ کی تالیوں کی آواز سنی تھی۔ آپ کی تعریف کا بہت بہت شکریہ۔ اگر آپ میرے کمرے میں تشریف لے چلیں تو اس سے اچھی طرح سن سکیں گی۔"

مس مورڈنٹ راضی ہو گئی اور بعد میں اسے خود تعجب ہوا کہ اس نے کیوں رضامندی ظاہر کر دی۔ وہاں جا کر وہ ایک آرام کرسی پر بیٹھ گئی اور مسٹر سمتھ نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا بجائے۔ مس مورڈنٹ نے کچھ بتایا اور وہ بجانے لگا۔

"یہ کتنی اچھی سُر ہے" مس مورڈنٹ نے کہا۔ "مگر اب یہ بہت پرانی ہو گئی ہے۔"

"ہاں واقعی بہت اچھی ہے۔ مس مورڈنٹ میں نے آج صبح کافی نہیں پی۔ کیا آپ کافی بنانے میں مجھے مدد دیں گی؟"

"مگر کافی تو بہت بری چیز ہے۔ اگر آپ اس وقت پی لیں گے تو رات بھر نیند نہیں آئے گی۔"

"نہیں مس مورڈنٹ میرا حال عام لوگوں سے بالکل مختلف ہے اگر کافی نہ پیوں تو مجھے نیند نہیں آتی۔"

دونوں نے مل کر کافی تیار کی اور بعد میں مل کر پی۔ مس مورڈنٹ نے کہا کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ تالیوں کی آواز اس تک پہنچے۔

مسٹر سمتھ نے کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ یہ دیواریں بہت پتلی ہیں آپ اپنی سہیلی سے جو باتیں کرتی ہیں میں سن تو نہیں سکتا مگر دھیمی دھیمی آواز ضرور آتی ہے۔"

"کون سی سہیلی؟" مس مورڈنٹ نے گھبرا کر پوچھا۔

"آپ کی گڑیا! اور کون؟" مسٹر سمتھ نے مسکرا کر جواب دیا۔

"اصل بات یہ ہے . . . . "

مسٹر سمتھ نے کہا "میں سب کچھ جانتا ہوں" اگر کوئی اتنا بھی نہ سمجھ سکے تو وہ موسیقی بھی نہیں سمجھ سکتا۔"

اس طرح وہ ایک دوسرے سے ملتے رہے آخر کار اُن کی شادی ہو گئی۔

چند برس کے بعد مسز سمتھ نے اپنی بیٹی کو جس کا نام اس نے میری ہی رکھا تھا۔ ایک گڑیا دینے کا وعدہ کیا اور کہا کہ وہ بہت پرانی گڑیا ہے اور وہ خود اس سے کھیل چکی ہے۔ میری جس نے ابھی حساب سیکھنا شروع ہی کیا تھا سمجھی کہ یہ گڑیا کم از کم سو سال پرانی ہوگی۔

اُس کو میں نے بہت اچھے کپڑے پہنا رکھے ہیں اور اس کا اور تمہارا نام بھی ایک ہی ہے، اور اس کی آنکھیں بند ہوتی اور کھلتی بھی ہیں۔

"اچھا! ذرا مجھے دکھائیے تو سہی"۔ میری نے کہا۔ مسز سمتھ نے گڑیا نکال کر دی۔ میری تھوڑی دیر تک تو غور سے دیکھتی رہی، پھر حیرت سے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگی "اماں جان۔ آپ بچپن میں بہت عقلمند تھیں جو آپ نے گڑیا کے لئے اتنے اچھے کپڑے سی لئے"۔

"مگر میں اُس زمانے میں تم سے بہت بڑی تھی میری"۔

"آپ کتنی بڑی تھیں اماں جان؟"

"اتنی ہی بڑی جتنی اب ہوں"۔ مسز سمتھ نے مسکرا کر جواب دیا

ابھی وہ دونوں باتیں کر رہے تھے کہ مسٹر سمتھ نے پکارا۔

"ادھر سنو گریس مجھے کچھ روپیہ منی آرڈر کرانا ہے بتاؤ کس طرح کرتے ہیں"۔

"اب تک تمہاری یہ عادت نہیں گئی"۔ مسز سمتھ نے ہنس کر کہا۔ "مجھے دے دو میں منی آرڈر کر دوں گی"۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا "میں نے وہ گڑیا میری کو دے دی ہے اور وہ اسے پسند بھی آ گئی ہے"۔

(ترجمہ)

مس معتصمۃ الرحمٰن

غزل

خاک ڈالو مرے شکوے پہ نہ جاؤ پیارے
نیچی نظریں نہ کرو آنکھ اُٹھاؤ پیارے

بعد مرنے کے مرے سوگ سی حاصل کیا ہے
چپ نہ ہو غم نہ کرو جی نہ کڑھاؤ پیارے

پھر کبھی آن ملو گے، یہ بجا ہے لیکن
کوئی صورت بھی تو جینے کی بتاؤ پیارے

تم جو آجاؤ تو تقدیر کا شکوہ نہ رہے
میری سوئی ہوئی قسمت کو جگاؤ پیارے

ضبط سے راز محبت نہ چھپے گا سیفیؔ
ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کو چھپاؤ پیارے

سیفی لوگانوی

میں اور تم

مرے جہانِ محبت کو خواب کہتے ہو، مگر بتاؤ تو پھر اصل زندگی کیا ہے
مرے سرورِ نظر کو حجاب کہتے ہو مگر کھُلا نہ یہ تم پر کہ روشنی کیا ہے

تمہاری زیست ہے کیا انتظار مرنے کا؟ ترس رہے ہو تم اک خوابِ جاوداں کے لئے
مرا جہاں مری رنگینیوں سے ہے پیدا تمہاری بود ہے اوہامِ ناگہاں کے لئے

مرا مقام ثواب و گناہ سے ہے بلند تم اور تمہاری نشیب و فراز کی دنیا
ہے میری دید کو اصل نگاہ سے پیوند ہے مجھ کو وجہِ حقیقت مجاز کی دنیا

مجھے یقیں ہے بہر حال زندگانی میں مگر تمہیں تو کسی بات پر یقیں ہی نہیں
مرے لئے تو مزا ہے اسی کہانی میں مرے جنوں کو تمیزِ چناں چنیں ہی نہیں

مری حیات میں رنگِ شباب رہنے دو
فریبِ حسن سے کچھ بار یاب رہنے دو

حمید عرفانی ایم اے

خندۂ تقدیر

گاڑی ایک منٹ کے لئے راہ والی کے اسٹیشن پر رُکی۔ صرف وہی ایک مسافر تھا جو گاڑی سے اترا۔ بابو نے جو تنہا اس اسٹیشن پر ٹکٹ دینے لینے کے علاوہ دوسرے فرائض بھی انجام دیتا تھا حیرت کی نگاہوں سے اسے دیکھا لیکن وہ خاموشی سے ٹکٹ دے کر شہنائی کا ڈبہ بغل میں دبائے اسٹیشن سے باہر نکل گیا اور ایک پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ اس چھوٹے سے اسٹیشن سے چند فرلانگ کے فاصلے پر اسی نام کا گاؤں آباد تھا۔ دن ڈھل رہا تھا جبکہ شاہنواز نے گاؤں کا رُخ کیا۔ اس کے قدم آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے۔

پگڈنڈی پر مرگ آسا سکوت طاری تھا۔ کھیتوں کے درخت چھوٹے بڑے پودے سب حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ نو وارد اور اجنبی نہ تھا لیکن اس میں اجنبیت پیدا ہو چکی تھی۔ یہ پگڈنڈی۔ یہ درخت اور یہ فضا شاہنواز سے ناآشنا تھی۔ آج سے آٹھ سال قبل یہی چیزیں اسے شاہو کے نام سے جانتی تھیں۔

راستے پر چلتے ہوئے شاہنواز کو آٹھ سال قبل کی زندگی کی تصویریں نظر آ رہی تھیں۔ یہ تو اسے معلوم ہی نہ تھا کہ اس کے والدین کون تھے اور انہوں نے اس کا کیا نام رکھا تھا لیکن اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا وہ گاؤں کے ایک زمیندار کی گائیں بھینسیں چرانے پر مامور تھا۔ زمیندار اور گاؤں کی مختصر دنیا اسے شاہو کے نام سے پکارتی تھی۔

گاؤں کے جس علاقے میں وہ چوپائے چرانے جاتا تھا وہیں ناجو گاؤں کے چودھری کا ریوڑ لے کر آتی تھی۔ ایک دوسرے کے قریب رہنے سے دونوں میں اُنس پیدا ہو گیا۔ سردی کے دنوں میں شاہو خشک اُپلے جمع کرتا اور انہیں آگ لگا کر سورج نکلنے تک شاہو اور ناجو دونوں آگ تاپتے رہتے۔ گرما میں شاہو درختوں کی بڑی بڑی ٹہنیاں کاٹ کر زمین میں گاڑ دیتا اور ناجو اپنی اوڑھنی ان پر پھیلا دیتی اور دونوں اس کے سائے میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے۔ موسم خوشگوار ہونے پر دونوں کھیلتے بھی رہتے۔

بچپن کے معصوم ایام آنکھ جھپکنے میں گذر گئے۔ آغاز شباب نے جہاں ان معصوم بچوں کو جسمانی بلوغت عطا کی وہاں ان کے جذبات میں بھی رومانی عنصر داخل کر دیا۔ کسی ناقابلِ فہم جذبے کے زیر اثر وہ اکثر ایک دوسرے کے پاس رہنے کی خواہش کرنے لگے۔ اُنس نے رفاقت اور رفاقت نے الفت کی شکل اختیار کر لی۔ صبح سویرے آنا اور شام کو دیر سے لوٹنا ان کا معمول ہو گیا۔ زندگی کے یہ لمحات بھی نشاط آوری میں کسی طرح بچپن سے کم نہ تھے۔

پھر دفعتہً صاف مطلع پر غم کی گھٹائیں چھانے لگیں۔ شاہو بدستور مسرور تھا لیکن ناجو کے بے اختیار قہقہے رفتہ رفتہ تبسم میں تبدیل ہو گئے۔ شاہو نفسیات کا ماہر تھا لیکن حساس دل کا مالک ضرور تھا۔ ناجو کی اندرونی کشمکش اس کے لئے ایک عرصے تک راز نہ بنی رہی۔ وہ خود کئی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ کسی بہانے سے اپنے مستقبل کے متعلق ناجو سے کہہ دے اور اس کا عندیہ معلوم کرے کہ وہ کہاں تک اس کی رفیق حیات بننے کی آرزومند تھی۔ لیکن اس مسئلے کا آغاز کرنا اس کے لئے کارِ دشوار بنا ہوا تھا۔ شاہو شاید ابھی کچھ دن اور متذبذب رہتا لیکن ناجو کے رویے میں ناگہانی تبدیلی دیکھ کر وہ عرضِ مدعا کرنے پر مجبور ہو گیا۔

اُس روز صبح سے کئی بار شاہو ناجو سے آنکھ مچولی کھیلنے کے لئے کہہ چکا تھا لیکن وہ کسی نہ کسی عذر پر انکار کر دیتی۔ سہ پہر ہو چکی تھی جب کہ شاہو نے جھنجھلا کر ناجو کے ہاتھ سے وہ ادھوری ٹوکری چھین کر پرے پھینک دی جسے وہ صبح سے بنا رہی تھی اور طیش میں آ کر اس سے کہا:۔

"تو تم میرے ساتھ آج کھیلو گی یا نہیں؟"

"نہیں، آج نہیں بلکہ کبھی بھی نہیں"۔ ناجو نے زمین کریدتے ہوئے دھیمی آواز سے جواب دیا۔

شاہو ھونچکا سا رہ گیا۔ اُس کی تیوری کے بل ایک ایک کر کے اتر گئے اور اس کا دل کسی نامعلوم وجہ سے بیٹھنے لگا۔ ناجو کو بازو سے پکڑ کر اٹھانے کی بجائے وہ خود اس کے پاس بیٹھ گیا اور آہستہ سے بولا:۔

"کیوں ناجو کیا بات ہے؟"

ناجو خاموشی سے زمین کی طرف دیکھتی رہی۔ ایک دو آنسو آنکھوں سے نکل کر پلکوں تک آئے اور وہاں سے سارے دن کی تپی ہوئی زمین پر

گڑگڑ جذب ہو گئے۔ شاہو نے ایک بار پھر کہا :۔

"ناجو کچھ کہو تو سہی"

ناجو نے اپنا سر اوپر اٹھایا۔ دو آنسوؤں سے ہی عمر میں پہلی دفعہ دُکھے ہوئے دل سے غم کا بار ہلکا ہو گیا۔ وہ بند آواز سے بولی۔

"شاہو آج سے میرا تمہارا راستہ الگ ہے۔ میری کل منگنی ہونے والی ہے۔ چودھری میری شادی اپنے ملازم بخشو سے کرنا چاہتا ہے"۔

شاہو کافی دیر تک بیٹھا ہوا ناجو کے چہرے کی طرف تکتا رہا۔ ناجو نے اٹھ کر اپنی ٹوکری اٹھائی اور ریوڑ کی طرف بڑھنے لگی۔ افق پر سورج آہستہ آہستہ ڈھل رہا تھا اور شیشم کے بلند درختوں کے اوپر آسمان پر سُرخی پھیل رہی تھی جیسے روشنی کا خون ہو رہا ہو۔ شاہو نے افق پر دیکھا۔ وہ شاعر نہ تھا لیکن افق کی سرخی اور اپنی امید دل کے خون میں اسے کچھ مطابقت نظر آئی۔ اُس نے مایوس ہو کر افق سے نظریں ہٹا لیں۔ ناجو ریوڑ لے کر دور نکل گئی تھی۔ شاہو بھی اپنے چوپائے جمع کر کے گاؤں کی طرف چلنے لگا۔

نصف رات گزر گئی لیکن شاہو کی آنکھیں ابھی تک وا تھیں۔ اُس کی زندگی میں کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوا تھا جس پر اُسے غور کرنے کا موقع ملا ہو۔ اُس کے لئے زندگی کی یہ پہلی الجھن تھی۔ وہ خیالات میں ربط اور ترتیب پیدا کرنے کا عادی نہ تھا لیکن آج اُسے ان چیزوں کی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ ناجو سے محبت اور عشق پیدا ہوتے ایک عمر کا عرصہ صرف ہو گیا تھا اور آج ایک ہی دن میں اُسے ناجو سے مایوس ہونا پڑا تھا۔ گاؤں میں حکومتِ انگریزی کا تسلط برائے نام تھا۔ کم از کم سماجی قوانین ابھی تک گاؤں کے اپنے تھے۔ گاؤں کے چودھری کے فیصلے کے خلاف آواز بلند کرنا ترکِ وطن کے مترادف تھا لیکن شاہو چودھری کے فیصلے کو تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار نہ تھا۔ آخر کار اُس نے اپنی الجھن کا حل سوچ لیا۔

وہ چپکے سے اٹھا اور اپنی بانسری بغل میں دبا کر گاؤں سے نکل گیا بنسری اور بدن کے کپڑے ہی اُس کی کل کائنات تھی کچھ دیر تک وہ غیر ارادی طور پر حرکت کرتا رہا۔ پھر اُس نے شہر کا رُخ کیا جو وہاں سے دس میل کے فاصلے پر تھا۔

شہر میں دیہات کے آزمائے ہوئے دست و بازو کی بڑی قدر تھی۔ اُسے شکم پُری کے لئے کافی مزدوری مل جاتی۔ شام کو وہ اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر کسی کونے میں بیٹھ کر بنسری بجانے لگتا۔ نہ جانے کیوں اُسے اِس سے کچھ تسکین ہوتی۔ قریب کے محلے کے لڑکے اُس کے گرد جمع ہو جاتے، اُن کا خیال تھا کہ شاہو کی بنسری نہایت سریلی ہے، بچوں سے یہ بات بڑھ کر بڑوں تک پہنچی کبھی کبھار کوئی بڑا آدمی بھی اس کی بنسری سننے کے لئے رُک جاتا۔ رفتہ رفتہ موسیقی کے شائق اسے بنسری سننے کے لئے گھر پر بلانے لگے۔ بچے کھچے کھانے یا ایک دو آنے سے اُس کی تواضع کر دی جاتی اور گھنٹہ دو گھنٹے اس کی بنسری سنی جاتی۔

حسنِ اتفاق سے کچھ دنوں کے بعد اُسی شہر میں تماشا کرنے والوں کا ایک گروہ آیا۔ اس جماعت میں مختلف طرح کے فن کار شامل تھے۔ شاہو کی بنسری کی دھوم اس گروہ کے مالک تک بھی پہنچی۔ تجربے سے معلوم ہوا کہ ان کی جماعت میں شاہو کا اضافہ مفید ثابت ہوگا۔ چنانچہ شاہو کو ایک معقول مشاہرے پر ملازم رکھ لیا گیا۔ اُس کے پھٹے پرانے چیتھڑے اتروا کر اُسے انگریزی لباس پہنا دیا گیا۔ لمبے لمبے گھنگھریالے بالوں کی جگہ اب شاہو کے سر پر صرف چھوٹے چھوٹے انگریزی وضع کے بال رہ گئے تھے۔ اگر شاہو اس نئی فضا سے کچھ خائف خائف سا رہتا لیکن رفتہ رفتہ وہ سب سے گھل مل گیا اور جاہل آدمیوں کی طرح اُسے انگریزی بولنے کا ڈھب بھی آ گیا۔ کمپنی کے مینجر نے ضرورت کے مطابق اس کا نام شاہو سے شاہنواز کر دیا۔ جس بڑے شہر میں کمپنی جاتی، شاہو نہیں بلکہ شاہنواز کی بنسری کی دھوم پہلے پہنچ جاتی۔ وہ اب دیہاتی بنسری کو ترک کر چکا تھا وہ اُس کے نئے نئے راگوں کو بجانے کے لئے ناکافی تھی اور اُس نے اب ایک شہنائی خرید لی تھی۔ کمپنی کے کام کے علاوہ اُسے کئی بار دیگر مجلسوں میں بھی شہنائی بجانے کے لئے بلایا جاتا۔ اُس کی شہنائی میں ایک مخصوص سوز روز افزوں تھا۔ جو آدمی ایک دفعہ اُس سے شہنائی سنتا وہ دوسری دفعہ سننے کا تمنائی رہتا اور دوسری دفعہ سنتا تو پہلے سے زیادہ متاثر ہوتا۔

مغربی وضع کے سماجی اجتماعات میں شاہ نواز کی بڑی قدر ہوتی۔ مردوں کے علاوہ جدید خیالات کی تعلیم یافتہ لڑکیاں اُس سے ملاقات کرنا فخر سمجھتیں۔ کئی شاموں کو سرخ و سفید ساری پوشوں نے شاہو کا پُرتپاک استقبال کیا۔ برقی روشنی میں غازے اور گلگونے کی آرائش سے چمکتے ہوئے چہرے اُس کا دل لبھانے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن صنفِ نازک میں شاہو نے صرف اس قدر دلچسپی لی کہ جب کبھی اسے کوئی چہرہ حسین نظر آیا تو وہ چند لمحوں کے لئے اس کی طرف صرف اس لئے دیکھتا

رہا کہ اس کے چند نقوش ناجو سے مشابہ تھے لیکن اس تماشے کا ردِ عمل نہایت خوفناک ہوتا۔ شاہو کی وہ شام اور بعد میں آنے والی کئی راتیں ایک خلشِ مستقل کی نذر ہو جاتیں۔ وہ اس دنیائے رنگ و بو کو تیاگ کر کہیں دور چلے جانے کے لئے آمادہ ہو جاتا۔ پھر زندگی کی مصروفیتیں اس کے عزائم کو تہ و بالا کر دیتیں۔

آٹھ سال اسی کشمکش میں گزر گئے۔ ایک دن وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہو گیا۔ راہ والی کا شاہو شاہ ہنواز کی شکل میں پھر کسی جذبے کے زیرِ اثر گاؤں آنے کے لئے بے قرار ہو گیا۔

چند فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جب شاہو گاؤں کے نزدیک پہنچا اس وقت شام ہو چکی تھی۔ گاؤں کے ایک دو کتوں نے اس اجنبی شاہ ہنواز کا خیر مقدم بھونک کر کیا۔ لیکن وہ ان کی پروا نہ کرتے ہوئے ایک گلی میں داخل ہو گیا اور ایک جھونپڑے کے قریب جا کر رک گیا۔ ایک نوجوان زمیندار جھونپڑے سے باہر نکل رہا تھا۔ شاہو نے دفعتہً اس سے استفسار کیا۔

"ناجو کس گھر میں رہتی ہے"؟

زمیندار ٹھٹکا۔ گاؤں میں پیدا ہو کر تمام عمر گاؤں میں گزار دینے والی ناجو کو پوچھنے والا یہ شہری کون تھا۔ فرطِ حیرت سے اُس کے مُنہ سے نکلا۔

"ناجو"!

"ہاں"! شاہو نے تائید کرتے ہوئے کہا۔

نوجوان زمیندار اُس وقت تک اپنی حیرت پر غلبہ پا چکا تھا۔ اُس نے نہایت افسوسناک لہجے میں کہا:۔

"ناجو تو دو دن ہوئے مر چکی ہے"۔

"اچھا"! شاہو کے منہ سے دھیمی سی آواز نکلی۔ اُس نے مٹی سے لپی ہوئی دیوار کا سہارا لیا۔ شہنائی کا ڈبہ ایک سرے سے کھسک کر اس کے ہاتھ سے چھوٹنے لگا کہ اُس نے ٹیک دے کر اسے سنبھال لیا۔ اور پیشتر اس کے کہ نوجوان زمیندار اس پر کوئی سوال کرے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا گاؤں سے باہر نکل آیا۔ گاؤں کے مغرب میں کھیتوں کے درمیان گاؤں کا قبرستان تھا۔ شاہو قبرستان میں پہنچ گیا۔ چند ٹوٹی پھوٹی قبروں میں ایک نئی قبر نظر آ رہی تھی۔ کسی محبت بھرے دل نے سرسوں کے چند پھول قبر پر چڑھا رکھے تھے۔ قبر کے ایک سرے پر نیم کا درخت تھا۔ شاہو اس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر تک بیکار بیٹھنے کے بعد شاہو نے ڈبے سے شہنائی نکالی اور اُسے بجانے لگا۔ شہنائی کے مدھم اور باریک سُر رفتہ رفتہ بلند ہوتے گئے۔ دردناک چیخوں نے ہنگامہ خیز گریے کی شکل اختیار کر لی۔ اُس روز جتنے پرسوز نغمے شہنائی سے بلند ہوئے اس سے پہلے کبھی نہیں سے گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شاہو اپنا دل شہنائی میں پھونک رہا ہے۔ نصف شب سے کچھ قریب شاہو شہنائی بجاتا رہا اور پھر شہنائی کی آواز کم ہوتی ہوئی رات کی بھیانک تاریکی میں گم ہو گئی۔

اُس رات باد و باراں کا نہایت خوفناک طوفان آیا۔ ایک دفعہ بجلی اس زور سے کڑکی کہ گاؤں والوں کے دل دہل گئے۔ ساری رات گاؤں والوں نے اللہ اللہ کر کے کاٹی۔

صبح ہونے پر مطلع صاف ہو چکا تھا۔ دوپہر کے قریب ایک چرواہے نے گاؤں میں آ کر اطلاع دی کہ قبرستان میں بجلی گرنے سے ایک درخت جل گیا تھا اور ایک آدمی بھی مر گیا تھا۔ گاؤں کے چودھری نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ گاؤں کا کوئی آدمی کم نہیں ہوا تھا۔ مرنے والے کی شخصیت کے متعلق مختلف چہ مے گوئیاں ہوتی رہیں۔

شام کے قریب ایک نوجوان نے گاؤں والوں سے بیان کیا:۔

"لاش کے قریب جو ڈبہ پڑا ہوا ملا ہے۔ ایسا ڈبہ کل شام ایک آدمی نے اٹھا رکھا تھا، جو ناجو کا پتہ پوچھتا تھا"۔

نسیم رضوانی

غزل

اب سرِبالیں وہ شوخِ فتنہ گر آیا تو کیا
ہو چکا جب حشر، حشر منتظر آیا تو کیا

کب ہوئیں آباد ہستی سے عدم کی وسعتیں
بلبلہ اک سطحِ دریا پر اُبھر آیا تو کیا

روشنیِ امید کی صحرائے ہستی کا سراب
دُور سے بہتا ہوا دریا نظر آیا تو کیا

صبحدم روشن نگاہیں اُس کے جلووں سے ہوئیں
رات بھر آنکھوں میں کٹ کٹ کر جگر آیا تو کیا

جس کی ہیبت سے لرز اٹھی تھی ساری کائنات
میرے سینے میں وہی طوفاں اتر آیا تو کیا

نالہ تو اک پل میں ہفت افلاک کو طے کر گیا
بارگہ سے اُس کی محتاجِ اثر آیا تو کیا

گھر کی ویرانی ہے کچھ صحرا کی ویرانی سے بیش
چھوڑ کر دیوانہ صحرا کو اگر آیا تو کیا

اک نگہ حسرت کی جاتے جاتے اُس نے بھی تو کی
عمر بھر بھولا تو کیا، وقتِ سفر آیا تو کیا

منصور احمد

الوداع

[منظر:۔ پارک کے ایک گوشۂ تنہائی میں ایک مرد اور ایک عورت مست خرام ہیں۔]

عورت۔ لو اب تو بس ـــــ ہمیں جدا ہونا چاہئے۔ میرا ہاتھ چوم لو۔

مرد۔ جو حکم دو۔

عورت۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ زیادہ میل جول اور کثرتِ بوس و کنار سے طبیعت بھر جائے اور ہم ایک دوسرے کے نام سے نفرت کرنے لگیں

مرد۔ بجا کہتی ہو (وہ اس کا ہاتھ چومتا ہے)

عورت۔ میں دائیں ہاتھ کا راستہ لے کر جاتی ہوں۔ تم ایک منٹ کے بعد بائیں ہاتھ کا راستہ لے کر چلے جانا۔ میرا شوہر ہماری ٹوہ نہیں لگا سکتا کیونکہ اب ہم ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں۔

مرد۔ الوداع! (دونوں سرکنے کا نام نہیں لیتے)

عورت۔ تم کیوں نہیں جاتے؟

مرد۔ ابھی مجھے کچھ کہنا سننا ہے۔

عورت۔ کہو ـــــ؟

مرد۔ غالباً تم کو یاد ہوگا کہ ہمارا پہلا آمنا سامنا کرلٹن میں ہوا تھا۔ اس روز تمہارا شوہر تمہارے ہمراہ نہ تھا۔ البتہ چند سہیلیاں تمہارے ہمراہ تھیں۔

عورت۔ ہاں خوب یاد ہے۔

مرد۔ ہمیں الفت کا دم بھرتے ایک مدت ہو گئی ہے مگر آج تک تمہارے شوہر کی زیارت نصیب نہیں ہوئی۔

عورت۔ پھر کیا جتن کروں؟

مرد۔ پچھلے دنوں تم نے ایک کڑیل جوان کی تصویر دے کر کہا تھا کہ یہ تصویر میرے شوہر کی ہے۔ میں نے اُس تصویر کی تعریف ان لفظوں میں کی تھی:۔

بال دھواں دھار ہیں۔ ابرو شمشیر برہنہ ہیں۔ کٹورا سی آنکھیں ہیں۔ ہوا سا منہ ہے۔ چاند سا مکھڑا ہے۔ گردن کا ڈورا دامِ محبت ہے۔ کمر چیتے کی ہے۔ غرض بدن سانچے میں ڈھلا اور کلٹ میں تلا ہوا ہے

عورت۔ مجھے یاد پڑتا ہے۔

مرد۔ قسم ہے کہ اُس رات میری آنکھ لگی ہو کیونکہ میں اُن دنوں تم پر ہزار جان سے فدا تھا۔ بارہا اٹھ اٹھ کر آئینہ میں اپنی شکل و صورت کا مقابلہ اس تصویر سے کرتا تھا مگر کہاں ایک قبول صورت انسان اور کہاں حسن کی ایک منہ بولتی تصویر۔ اس احساس نے مجھے تڑپا دیا اور میں نے حسین بننے کا ارادہ کر لیا۔

عورت۔ میں اس تغیر کو دیکھ رہی ہوں۔

مرد۔ پھر مجھے اس خیال نے ڈھارس بندھائی کہ شاید تمہارا شوہر کوئی گاؤدی اور گیگلا ہے جو تم نے اُس سے منہ موڑ کر مجھے محبت کے لئے تاکا ہے۔ جب تصویر پر پھر نظر ڈالی تو یہ بہتان و گمان بھی جاتا رہا۔ اس حقیقت و آگاہی نے میرا طور بے طور کر دیا۔

عورت۔ میں بھانپ گئی تھی۔

مرد۔ تمہارا دل مول لینے کے لئے میں قیمتی لباس میں ملبوس ہو کر بہتر بن وضع میں تم سے ملنے لگا۔

عورت۔ میں اس حقیقت سے آگاہ ہوں۔

مرد۔ میں اُن دنوں تمہاری ات گت محبت میں اندھا ہو رہا تھا۔ جب تمہارا شوہر ہفتہ بھر کے لئے دہلی گیا تھا تو میں پل بھر تم سے جدا نہ ہوا تھا۔

عورت۔ ہاں وہ دہلی گیا تھا۔

مرد۔ میں نے اُس کی واپسی پر اسے ایک نظر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی مگر تم نے مجھے روک دیا تھا۔ غالباً دوسری بار پھر میں نے یہ خواہش ظاہر کی تھی مگر تم نے سختی کے ساتھ منع کر دیا تھا۔ پھر یہ واقعہ پیش آیا . . .

عورت۔ کون؟

مرد۔ لو سنو! ـــــ ایک روز دوپہر کو میرے ہاں تم نے اپنی ماں کو

ایک خط لکھا تھا۔ جس میں مذکور تھا کہ رات کو میں اپنے شوہر کے ہمراہ تماشہ دیکھنے جاؤں گی۔ راستہ میں تمہیں بھی اپنے ہمراہ لے جاؤں گی۔ یہ خط تم بٹوے میں رکھنا بھول گئی تھیں۔ اتفاق سے میں نے خط کو پڑھ لیا تھا۔

عورت۔ واقعی خط میں بھول گئی تھی۔

مرد۔ موقع کو غنیمت جان کر میں تماشہ دیکھنے چلا گیا تھا۔ وہاں تمہارے شوہر کو دیکھ لیا تھا۔

عورت۔ اچھا۔

مرد۔ کیا اسی بدصورت شوہر پہ ناز تھا؟

عورت۔ اجی تمہیں اس سے کیا —— چپ رہو؟

مرد۔ خدا کے واسطے جھوٹ نہ بولو۔ تمہارا بدشکل شوہر تو کوئی ستر برس کا ہے۔

عورت۔ بھلا تمہیں بات میں فی نکالنے سے کیا حاصل ہو رہا ہے؟ کیوں دل دکھاتے ہو؟

مرد۔ پھر مجھے باتوں میں اڑانے لگی ہو! بوڑھا گھاگ یقیناً تمہارا شوہر تھا۔

عورت۔ وہ میرا شوہر نہ تھا۔

مرد۔ اب تو بات کھل گئی ہے۔ میں تمہارے شوہر کا گھر گھاٹ، ٹھور ٹھکانا اور اَگا تاگا لے چکا ہوں۔

عورت۔ اچھا وہ میرا شوہر تھا۔

مرد۔ پھر مجھ سے یہ فریب کیوں کھیلا تھا —— تصویر کس کی تھی؟

عورت۔ میں نے دہلی میں بکتی ہوئی خرید کی تھی۔

مرد۔ (بھو نچکا ہو کر) کس لئے؟

عورت۔ محض تم کو پریشان کرنے کے لئے —— میرا شکریہ ادا کرو کہ اس تصویر نے تم کو بنا دیا ہے۔ اب تم بانکے ترچھے، چھیل چھبیلے بن گئے ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اُن دنوں تمہارے دام محبت میں بری طرح گرفتار تھی اس لئے ہر پہلو سے تم کو خوب صورت دیکھنا میری دلی آرزو تھی۔

مرد۔ ستم کیا! —— کان پکڑتا ہوں مگر یہ فریب کاٹے پہ کی اوس تھا۔

عورت۔ وہ کیسے؟

مرد۔ اے آفت کی پڑیا! —— تمہارے شوہر کو دیکھ کر میرا دل آپے میں آگیا تھا۔ کیونکہ تمہارا شوہر کسی نوع سے میرا لگا نہیں کھا سکتا تھا۔ اس لئے وہ جذبہ رشک جاتا رہا اور میری آتش شوق ٹھنڈی پڑ گئی۔ اگر تم وہ خط بھول نہ جاتیں تو آج تک میں تمہارے دام محبت میں گرفتار رہتا۔

عورت۔ (صاف گوئی کے ساتھ) تم کس خیال میں ہو، بھلا مجھ ایسی عورت سے جو آسمان میں تھگلی لگا سکے بلا قصد اس قسم کی غفلت سرزد ہو سکتی ہے؟

مرد۔ پھر اس چلتر کا کیا مقصد تھا؟

عورت۔ وہ عورت جو اپنے شوہر کی آنکھ میں خاک جھونک کر اپنے چاہنے والے سے مل سکے وہ اس قدر بے پروا اور آٹے کی آپا نہیں ہو سکتی!

مرد۔ پھر تم عمداً وہ خط چھوڑ گئی تھیں؟

عورت۔ جی ہاں!

مرد۔ (شعلہ بھبوکا ہو کر) وہ کس لئے؟

عورت۔ تمہاری آتش شوق کو ٹھنڈا کرنے کے لئے تاکہ تم موقع پا کر میرے شوہر کو دیکھ لو۔ تمہاری لگی کو بجھانے کا یہی ایک طریقہ رہ گیا تھا —— وہ آندھی جو مجھے چڑھی ہوئی تھی اُتر چکی تھی اور میں تعلقات کا رشتہ توڑنا چاہتی تھی کیونکہ میں ہرجائی ہوں۔

مرد۔ توبہ! —— اب کیا ارادہ ہے؟

عورت میں کسی اور مرد کے ساتھ فریب کھیلنا چاہتی ہوں۔ خفا نہ ہونا، مرد اسی سلوک کے مستحق ہیں۔ خدا حافظ!

—— الوداع!!

[مرد حیرت و استعجاب کی تصویر بن کر رہ جاتا ہے اور عورت دائیں ہاتھ کا راستہ لے کر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے]

(ماخوذ)

صادق ایوبی

فردوس خیال

مرحبا اے دل! کہ وہ جانِ بہار آہی گیا
جس حیات افروز کا تھا انتظار آہی گیا

اک جہانِ رنگ و بُو بر دوش ہے مستِ شباب
ہے جلو میں زندگی، رعنائیاں ہیں ہم رکاب

نوجوانی، جوش اور مستی شرابِ حُسن کی
حل ہوئے سیاب میں تو یہ قیامت ڈھل گئی

حشر برپا کر رہا ہے آج یہ مستِ خرام
ہو نہ جائے منتشر ربطِ عناصر کا نظام

موجزن ہے ہر طرف عالم میں طوفانِ حیات
نشۂ عیش و طرب میں جھومتی ہے کائنات

فیضِ موسم ہے کہ داغِ دل فروزاں ہو گئے
تارِ دامن روکشِ تارِ رگِ جاں ہو گئے

دل کی یہ حالت کہ سازِ نغمۂ بے تاب ہے
جنبشِ موجِ نفس بھی جنبشِ مضراب ہے

اس نگاہِ فتنہ زا کی برق پاشی الاماں!
خون کے بدلے رگوں میں کوندتی ہیں بجلیاں

چہرۂ گلگوں پہ ہے چینِ جبیں کا پیچ و تاب
یا شفق کے جال میں الجھی شعاعِ آفتاب

مدبھری آنکھوں میں یوں کیفِ شرابِ لالہ فام
شوخیِ رفتارِ ساقی جیسے چھلکاتی ہے جام

مسکرانے میں لبوں پر عکسِ دنداں ضو فگن
چومتی ہے منہ کلی کا چاند کی چنچل کرن

اک نظر دیکھے تو دم لعلِ بدخشاں چھوڑ دے
ہونٹ جیسے بارِ شبنم، گل کی پتی توڑ دے

خوش خرامی پر ہوئی موجِ صبا دل سے نثار
پانی پانی ہو رہا ہے شرم سے ابرِ بہار

ہے تری رفتار موجِ قلزمِ طوفانِ حُسن
ہاں! ڈبو دے مجھ کو بھی اے بحرِ بے پایانِ حُسن

دور آنکھوں سے رہا گر آئینہ تو کیا ہوا!
تجھ میں اپنا عکس دیکھوں اس قدر نزدیک آ!

وہ ہنسا تقدیر چمکی، کارگر آہیں ہوئیں
عشق کے شانوں کی زینت حسن کی باہیں ہوئیں

کر چکا آرائشِ منزل فریبِ جستجو
اک طلسمِ خواب تھی یہ کائناتِ رنگ و بو

ظلمتِ شب میں سرابِ آرزو روپوش ہے
میں نے پا کر کھو دیا کچھ، صرف اتنا ہوش ہے

سکندر علی وجد

ٹالسٹائے کا مذہب

ٹالسٹائے عمر کے آخری سالوں میں فلسفیانہ، معاشرتی اور مذہبی مسائل کی طرف زیادہ راغب ہو گیا تھا۔ ۱۸۸۰ء کے بعد اس کی تمام تصانیف میں ان مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ اس نے اپنی کتاب (My Confession) میں اپنے مذہبی تجربات کے مختلف مدارج کو بیان کیا ہے جن میں سے اسے گزرنا پڑا۔ یہ کتاب ۱۸۸۲ء میں جنیوا میں شائع ہوئی تھی۔ ٹالسٹائے اپنے Confession میں اپنی گزشتہ تصنیفات کی حقیقت کھلے طور پر بیان کرتا ہے۔ یہ اس اصول کا ایجاب ہے کہ مذہب کی مقدس فطرت کو جب دوسرے بیرونی لوازم سے علیحدہ کیا جاتا ہے تو یہ زندگی کا ایک قیمتی جزو بن جاتا ہے۔ ذیل میں ہم اس کتاب کا لب لباب قارئینِ ادبی دنیا کے پیش کرتے ہیں۔ (ر۔ م۔ ن)

اگرچہ میری تعلیم و تربیت ایک نہایت ہی راسخ الاعتقاد عیسائی گھرانے میں ہوئی تھی۔ لیکن جب میں اٹھارہ برس کی عمر میں یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہوا تو مذہب کے متعلق جو کچھ بھی مجھے بتایا گیا تھا میں نے اس پر اعتقاد رکھنا چھوڑ دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مذہبی تعلیم سے مجھے شروع ہی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں نے نہ صرف دعا کرنا ہی ترک کیا بلکہ گرجا میں جانا اور روزے رکھنا بھی چھوڑ دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب باوجود خدا کی ہستی کا قائل ہونے کے میرے دل میں خدا کی حقیقت اور یسوع مسیح کی تعلیم کے متعلق کوئی خیال موجود نہ تھا۔

جب میرے دل میں نیک اور پاک طینت بننے کے لئے کوئی خیال پیدا ہوا اور اس کا اظہار کیا گیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لوگ مجھے ہنسی اور تمسخر کا ہدف بنا رہے ہیں۔ لیکن برعکس اس کے میرے برے کاموں کا نتیجہ میری شہرت کی صورت میں نمودار ہوا۔

اب جبکہ میں اپنی گزشتہ زندگی پر ایک عمیق نظر ڈالتا ہوں تو ایک نامعلوم خوف سے تھرا اٹھتا ہوں۔ کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب میں میدان جنگ میں بے گناہ لوگوں کے قتل، قمار بازی، مکر و فریب اور غریبوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی کے لٹانے کا سبب بنا ہوا تھا۔ یہ سلسلہ دس سال تک جاری رہا اس کے بعد میں تالیف و تصنیف کی طرف رجوع ہوا لیکن اس پیشے کا مقصد میرے سامنے کمینگی کے سوا کچھ نہ تھا، کیونکہ میرا مدعا دولت اکٹھی کرنا اور خوشامد پسندی تھا۔

میری آرزوؤں کا قابل قدر صلہ مجھے اس وقت ملا جب میں چھبیس سال کی عمر میں سینٹ پیٹرزبرگ گیا اور وہاں کے شہرۂ آفاق مصنفین نے میری ادبی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے میرا پرمسرت استقبال کیا۔ وہ خونیں جنگ جس کے متعلق رزم گاہ سے واپس آ کر میں نے بہت کچھ لکھا تھا ابھی ختم ہوئی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ خواص (Intellegentia) میں یہ خیال پیدا ہو چلا ہے کہ مصنفوں، فلسفیوں اور شاعروں کا فرض صرف پیغام دینا ہے۔ ان کا یہ فرض ان پر اس لئے عاید نہیں ہوتا کہ وہ جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں بلکہ اس لئے کہ ان میں یہ صلاحیت فطرتی ہے۔ میں نے اس فلسفہ پر عمل کرتے ہوئے ایک شاعر اور فلسفی کی حیثیت سے بہت کچھ لکھا اور اس کا پرچار کیا لیکن میں نہیں جانتا کہ "یہ سب کچھ کیا" ہے۔ میری قلمی کاوشوں کا مجھے شاندار معاوضہ ملا اور تین سال تک میں دل کھول کر عیش و عشرت میں مشغول رہا۔

اس طرح میں علم ادب کے درخشندہ ستاروں میں شمار ہونے لگا اور ایک طویل مدت تک اس ادبی عقیدہ کی صحت میں مجھے کوئی شک نہ ہوا لیکن جب اس رنگ و روپ میں تین سال گذر گئے تو میرے دل و دماغ پر عجیب شکوک طاری ہونے لگے۔ مجھے اس نظریے کی بنیادیں متزلزل معلوم ہونے لگیں۔ اس اصول کے پیروؤں میں اختلاف تھا۔ وہ ایک دوسرے کو دھوکا دینے، گالی گلوچ اور لڑنے جھگڑنے میں مصروف رہتے تھے۔ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو پرلے درجے کے لالچی اور بداخلاق تھے۔ مجھے اپنی ذات اور دوسرے انسانوں سے نفرت ہونے لگی۔ اب

میری غلطی یہ تھی کہ اگرچہ میری آنکھیں میرے اپنے رہنے کی خامیوں کو دیکھ رہی تھیں لیکن پھر بھی میں اس سے علیٰحدہ نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ میں اپنے خیال میں ایک شاعر، فلسفی اور معلم کی حیثیت سے دوسروں کو پیغام دے رہا تھا خواہ اس پیغام کی حقیقت کو میں خود بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس طرح علم و ادب کے ساتھ میرے تعلقات نے میرے گناہوں میں ایک اور قصور کا اضافہ کیا میں جب زندگی کے اس دور پر نظر ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ میری ایک طرح کی دیوانگی کا زمانہ تھا۔ ہم میں سے سینکڑوں لوگوں کو پیغام دے رہے تھے جب کہ ہماری اپنی قلمیں آپس میں ایک دوسرے کے خلاف زہر اگل رہی تھیں۔ چونکہ ہم بے عمل تھے اس لئے ہمارا پیغام لوگوں پر کوئی اثر نہ کر سکا۔ تاہم تمام روس میں ہماری تصنیفات کا ایک سیلاب امنڈ آیا لیکن ہمیں اس بات سے بہت اذیت ہوئی کہ ہماری چیخ پکار صدا بصحرا ہو کر رہ گئی ہے۔

(۲)

میں شادی کرنے سے قبل تمام یورپ کی سیاحت کے لئے نکلا۔ میرے دل میں تمام فنون کی تکمیل کا از حد شوق تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں خواص کے نزدیک یہ مسئلہ بہت اہمیت رکھتا تھا۔ متمدن طبقات "ترقی" (Progress) کے نظریے کے بہت حامی تھے۔ اگرچہ یہ اصطلاح مختلف لوگوں کے نزدیک مختلف معنی کی حامل تھی۔ دوران سفر میں جب میں نے پیرس میں ایک شخص کو پھانسی کے تختے پر لٹکتے دیکھا تو میں بہت خوف زدہ ہوا۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ غلطی اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوئی جو "انسانی خرد" کے لباس میں مستور تھی۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ "نظریۂ تمدن" کی حقیقت ایک وہم سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ میرے اس خیال کو میرے بھائی کی موت کے المناک حادثے سے اور بھی تقویت پہنچی جو ایک سال تک بیمار رہنے کے بعد اس دنیائے فانی سے ہمیشہ کے لئے کوچ کر گیا۔

میرا بھائی ایک نہایت ہی پاک طینت، صاحب خرد اور سنجیدہ نوجوان تھا۔ لیکن وہ اس دنیا سے اس بات کے جاننے کے بغیر ہی چل بسا کہ اس کا دنیا میں آنے کا مقصد کیا تھا اور اس کی موت میں کیا راز پوشیدہ ہے۔ مجھے اس تجربے کے پیش نظر تمام نظریے بے وقعت اور بے فایدہ معلوم ہوتے تھے۔ روس میں واپس آکر میں نے اپنے دیہاتی مکان میں رہائش اختیار کی اور کسانوں کے لئے درسگاہیں منظم کرنے کا کام شروع کیا۔ میں اپنی اس نئی سعی میں حقیقی جوش و خروش محسوس کر رہا تھا۔ کیونکہ میں ابھی تک بڑی حد تک تمدن کے عروج کے لئے ترقی کو ضروری سمجھتا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ گو بڑے متمدن اشخاص کی تعلیم اور خیالات بھی مختلف ہیں اور وہ کسی ایک نقطہ پر بھی متفق نہیں۔ تاہم کسانوں کے بچوں کی تعلیم کی صورت میں اس مشکل کو اس طرح حل کیا جا سکتا ہے کہ ان کی پسند کے مطابق ان کو تعلیم دی جائے۔

میں نے اپنے اخبار کے ذریعے عوام کو ان لوگوں کے غلط نظریوں سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے پوری تسکین قلب حاصل نہ ہوئی میرے دل کو زیادہ ہی زیادہ اذیت پہنچتی گئی۔ یہاں تک کہ پریشان کن خیالات نے میری دماغی طاقتوں کو بہت نقصان پہنچایا۔ میں تازہ ہوا، تندرستی کے دور اور سادہ زندگی کی تلاش میں سٹیپ (Steppe) کے میدانوں کی طرف روانہ ہو گیا۔ جاگیر میں تھوڑا عرصہ قیام کے بعد میں نے شادی کر لی۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا میں اپنے بال بچوں اور بیوی کے آرام و آسائش کے لئے خوشی سے کوشاں رہا۔ پندرہ سال تک "الفرادی تکمیل" کے پرانے خیال کو بھول کر فارغ البال خانگی زندگی بسر کی۔ کیونکہ بال بچوں کی فلاح و بہبود کے خیال نے اس خواہش کی جگہ لے لی تھی۔

لیکن اس دوران میں بھی میں نے تالیف و تصنیف کا کام جاری رکھا جس سے مجھے کافی دولت اور شہرت حاصل ہوئی۔ اس دور میں جو کچھ میں نے لکھا اس میں اس خیال کا پرچار کیا جو میرے نزدیک واحد صداقت" تھا۔ کہ ہماری حیات کا مقصد اپنی خوشی اور اپنے خاندان کی راحت حاصل کرنا ہے۔

لیکن یہ خوشی بھی میرے لئے کوئی ابدی خوشی ثابت نہ ہوئی۔ بلکہ آج سے پانچ سال پہلے مجھے پھر دماغی پریشانی کا شکار ہونا پڑا۔ میں ناامید ہو گیا۔ میری پریشانی بڑھتی گئی "کیوں" اور اس کے بعد "کیا" کے پریشان کن سوالات نے میری دماغی طاقتوں کو بہت اذیت پہنچائی۔ ان سوالات نے بتدریج ایک خاص شکل اختیار کر لی۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا "میرے پاس حکومت سمارا میں چھ ہزار ایکڑ زمین ہے اور تین سو گھوڑے ہیں۔ لیکن پھر کیا؟" باوجود سخت کوشش کے اس سوال کا جواب مجھے نہ مل سکا میرے نزدیک اب زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ یہ ایک بے حقیقت چیز تھی۔ میں ایک تندرست اور فارغ البال آدمی تھا لیکن پھر بھی زندگی مجھے ایک بے مقصد چیز نظر آتی تھی۔ مجھے اکثر خودکشی کا خیال پریشان کرتا تھا اگرچہ میرا اس جرم کے مرتکب ہونے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

(۳)

جب میں نے عمر کے پچاسویں سال میں قدم رکھا تو "زندگی کیا ہے؟" کے سوال نے مجھے بہت مایوس کر دیا تھا۔ اس مرکزی سوال کے گرد اور بہت سے شکوک وشبہات جمع ہو گئے "میرے زندہ رہنے کا کیا مقصد ہے؟" "مجھے کوئی کام کیوں کرنا چاہئے؟" "کیا زندگی میں کوئی ایسی خصوصیت ہے جو موت پر قابو پا سکے؟" یہ تھے سوالات جن کا باوجود سخت تحقیق وتدقیق کے مجھ پر کوئی راز نہ کھل سکا۔ اگر مجھے کچھ معلوم ہوا تو صرف یہ کہ انسانی دماغ ان مسائل کو حل کرنے سے قاصر ہے۔

مجھے معلوم ہوا کہ نہ صرف حضرتِ سلیمان ہی نے زندگی سے نفرت کا اعلان کیا اور کہا کہ تمام دنیوی چیزیں روح کی تکلیف کا باعث ہیں بلکہ ہندوستانی رشی ساکیہ منی بھی پکار اٹھا کہ حیات ایک بڑی "بدی" ہے۔ سقراط اور شوپنہار ان سے بھی ایک قدم آگے بڑھے اور کہا کہ صرف "فنا" ایک ایسی چیز ہے جس کے لئے ہر فردِ بشر کو آرزو مند رہنا چاہئے۔ لیکن نہ ان بڑے فلسفیوں کے خیالات نے اور نہ میری اپنی عقل نے مجھے اپنے آپ کو تباہ کرنے پر آمادہ کیا۔ کیونکہ عین اس کشمکش میں ایک اندرونی آواز نے مجھے "زندگی کے وجود" سے آگاہ کیا۔ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہے۔ اس خیال نے میری مایوسی کو دبا کر مجھے روح کی تکلیف سے چھڑایا۔ میں نے محسوس کیا کہ زندگی کا مطالعہ کرنے اور اس کا مقصد سمجھنے کے لئے مجھے اپنے طبقے کے لوگوں کو چھوڑ کر کروڑوں عوام میں خلط ملط ہونا پڑے گا۔ کیونکہ میرے نزدیک زندگی کا صحیح مطالعہ صرف اس صورت میں کیا جا سکتا ہے جس صورت میں وہ عوام کے درمیان ہے۔ میں آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ علم جو دلائل پر مبنی ہے اور جس کا متمدن لوگوں میں چرچا ہے وہ زندگی کے سربستہ راز کا انکشاف کرنے سے قاصر ہے۔ برخلاف اس کے عوام میں حیات کا ایک غیر مدلل احساس ہے جو حیات کے اعلیٰ ترین مقاصد سے ہمیں آشنا کرتا ہے

یہی غیر مدلل علم وہ عقیدہ تھا جس کو میں ناکارہ سمجھ رہا تھا۔ ایک خدا میں تین خداؤں کا تصور، شیطانوں، عفریتوں، بھوتوں اور فرشتوں کی پیدائش میں اعتقاد رکھنا ایک ایسی چیز تھی جس کو میں نہ دیکھ سکتا تھا نہ سمجھ سکتا تھا یہ چیزیں سراپا خلافِ عقل معلوم ہوتی تھیں۔ میں نے سخت مایوسی کی حالت میں سوچنا شروع کیا کہ شاید میں جن چیزوں کو معقول سمجھ رہا ہوں وہ ایسی نہ ہوں جیسا کہ مجھے دکھائی دیتی ہیں اور جن چیزوں کو خلافِ عقل تصور کر رہا ہوں وہ بھی حقیقت میں ایسی نہ ہوں۔

اب میں اچھی طرح سمجھ گیا کہ علمی تحقیق میرے سوالات کا جواب دینے سے عاجز ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ اگرچہ مذہب خلافِ عقل جوابات دے رہا ہے۔ لیکن یہ جوابات یقیناً ایک اہم مسئلہ کو حل کر رہے ہیں۔ انہوں نے کم از کم میرے لئے "محدود" کا تعلق "غیر محدود" سے منکشف کر دیا۔

مذہب کیا ہے؟ یہ صرف خدا اور غیبی طاقتوں میں انسانی اعتقاد کا نام نہیں ہے بلکہ یہ زندگی کے مقاصد کا سمجھنا ہے۔ یہ زندگی کی طاقت ہے میں نے اس درجے پر پہنچ کر سمجھنا شروع کیا کہ انسانی عقل کے عمیق ترین ماخذ کا پتہ اُن جوابات میں مل سکتا ہے جو مذہب نے پیش کئے ہیں۔ مجھے کوئی حق حاصل نہیں کہ اُن کے خلاف علمِ بغاوت بلند کروں کیونکہ صرف وہی زندگی کے پیچیدہ مسئلے کو حل کر سکتے ہیں۔

(۴)

لیکن پھر بھی مجھے گوہرِ مقصود ہاتھ نہ آیا۔ میرا دل معرفت کے نور سے روشن نہ ہو سکا۔ میں نے بدھ مذہب، اسلام اور عیسائیت کی مقدس کتب کو پڑھا۔ مذہبی پیشواؤں، راہبوں اور صوفیوں کی زندگیوں کا مطالعہ کیا جو صرف خدا کو ہی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے۔ میں نے اُن سے دریافت کیا کہ تم اپنے اعتقادات کی روشنی میں زندگی کی تعبیر کیسے کرو گے! لیکن میں ان میں سے کسی ایک کے عقیدے کا بھی پیرو نہ ہو سکا کیونکہ میں نے دیکھ لیا تھا کہ ان میں سے ایک نے بھی مسئلہ حیات کو حل کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کو اور زیادہ پیچیدہ بنا دیا ہے۔ اس طرح ایک دفعہ پھر مایوسی کا مہیب احساس میرے دل ودماغ پر چھا گیا۔

اُن اشخاص کا عقیدہ مجھے اپنی طرف نہ کھینچ سکا جو بذاتِ خود اُن اصولوں میں مخلص نہ تھے جن کا وہ پرچار کرتے تھے۔ یہ محسوس کر کے کہ وہ علم پر عمل نہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں اور وہ بھی میری طرح نفسانی خواہشات کے غلام ہیں مجھے سخت رنج ہوا۔ میں اُن کی طرف سے منہ موڑ کر سادہ جاہل غربا، کسانوں، جاتریوں اور تارک الدنیا لوگوں کے قریب زندگی کی تلاش میں چلا آیا۔

جتنا زیادہ میں سادہ عوام کی زندگیوں کو سمجھتا گیا۔ اتنا ہی زیادہ میں اُن کے اعتقادات کا گرویدہ ہوتا گیا، اور یہی مذہبی حقیقت میں نے اُن کے لئے اشد ضروری خیال کی۔ کیونکہ یہی دلیل بازی سے پاکیزہ

مذہب وہ چیز تھی جو زندگی کے معنی کو تفصیل سے بیان کرسکتی تھی اور دنیا کو ایک بہشت کی صورت میں پیش کرسکتی تھی۔ جو کچھ میں نے اس پس ماندہ طبقے میں دیکھا وہ میرے اپنے طبقے کے لوگوں کے افعال و اعمال کے بالکل برعکس تھا۔ میرے طبقے میں مذہب کے بغیر زندگی کا امکان تھا۔ یہاں ہزاروں مبلغوں اور واعظوں میں ایک بھی صحیح راستہ پر نہ تھا۔ حالانکہ مزدور جماعتوں میں ہزاروں میں ایک بھی ملحد نہ تھا۔

جتنا زیادہ میں ان مخلص لوگوں کے قریب تر ہوتا گیا اتنا ہی زیادہ میں اُن کو پسند کرنے لگا۔ مجھے حقیقی معنوں میں زندہ رہنا آسان معلوم ہونے لگا۔ دو سال تک میں اُن کے فیض میں رہا۔ مجھے اپنی متمول اور متمدن جماعت کی زندگی بری معلوم ہونے لگی۔ یہ مجھے بچوں کے خالی کھلونوں کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ برخلاف اس کے مزدور جماعتوں کی زندگی اپنی صحیح اور اصلی صورت میں مجھے نظر آنے لگی۔

اب میں سمجھنے لگا کہ میں نے حیات کے مقاصد سمجھنے میں کہاں کہاں غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ میری غلطی یہ تھی کہ میں نے زندگی کے متعلق سوال کے جواب میں اپنی زندگی کو پیش کیا نہ کہ عوام کی زندگی کو۔ میری زندگی میری نفسانی خواہشات کی غلامی میں گزر رہی تھی۔ یہ بے معنی اور بے مقصد تھی۔ اس لئے ایسا جواب زندگی کے مسئلے کا حل نہیں ہوسکتا تھا۔

میں نے دوسروں کی کبھی مدد نہ کی تھی۔ پورے تیس سال تک میری زندگی مزدوروں کے خون پر پرورش پاتی رہی۔ میں مقصد حیات سے ناواقف رہتے پر قانع رہا۔

کائنات کے پس پردہ ایک زبردست طاقت کام کرتی ہے۔ یہی طاقت کائناتی زندگی کا ماخذ ہے۔ اسی بڑی طاقت کے سمجھنے کے لئے ہمیں بغیر کسی حیل و حجت کے اُس کے تابع فرمان ہونا چاہئے۔ مزدور اپنے مالکوں کے خلاف کوئی شکوہ شکایت نہیں کرسکتے۔ جب مالک اُن کی مرضی کے مطابق اُن سے سلوک کرتے ہیں اگرچہ ہم اُن کو درندوں سے تشبیہہ دینے کے عادی ہیں۔ برخلاف اس کے ہم جو اپنے آپ کو صاحب خرد سمجھتے ہیں اور اپنے مالک کی پیدا کردہ اشیا کو اپنے استعمال میں لاتے ہیں کبھی اُن فرائض کو خوشی سے سرانجام نہیں دیتے جو اُس نے ہم پر عاید کئے ہیں۔ ہم ان فرائض کی انجام دہی کو احمقانہ حرکت تصور کرتے ہیں۔ ہماری ایسی حرکت کا کیا مطلب ہوسکتا ہے؟ یہ کہ یا ہمارا مالک بے وقوف ہے یا ہمارا کوئی مالک ہی نہیں۔

(۵)

خیالات کی اس ادھیڑ بن کے بعد میں آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ دلائل پر مبنی علم غلطی کا مرتکب ہوتا ہے اور یہ کہ صداقت کا علم صرف سادہ اور بے عیب زندگی بسر کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ مجھے اب بھیڑیوں کی سی زندگی کے بجائے ایک حقیقی زندگی کا متلاشی ہونا چاہئے اور یہ کہ زندگی کے معنی صرف اس صورت میں سمجھے جاسکتے ہیں کہ بڑے انسانی قبیلہ (Great Human Community) کی مجموعی زندگیوں کا مطالعہ کیا جائے۔

ان تمام تجربات اور مشاہدات کے دوران میں میرے دل کے احساسات ایک اندرونی درد کے ساتھ گھل مل گئے۔ اس تجربے کو میں صرف اس صورت میں الفاظ کا لباس پہنا سکتا ہوں کہ یہ خدا کی تلاش تھی۔ یہ تلاش ایک جذبہ تھا نہ کہ علمی تحقیق۔ یہ وہ جذبہ تھا جو میرے دل کی گہرائیوں سے نکلا تھا اور جو میرے سوچ بچار کے طریقے کے بالکل برعکس تھا۔

کانٹ خدا کی ہستی کو ثابت کرنے سے قاصر رہا۔ لیکن پھر بھی مجھے اپنے گوہر مقصود کے ہاتھ آنے کی امید تھی۔ میں ابھی تک دعاؤں میں اس کو مخاطب کرتا تھا ــ لیکن پھر بھی میں نے اُس کو نہ پایا جس کا میں متلاشی تھا۔

اکثر اوقات میں کانٹ اور شوپنہار کے فلسفہ کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا تھا اور دلائل پیش کرتا تھا کہ علت و معلول کا اُس سلسلے سے کوئی تعلق نہیں جس سے زمان و مکان اور خیال کا تعلق ہے۔ میں نے خیال کیا کہ اگر میں کتم عدم سے معرض وجود میں آیا تو اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہے اور یہی سبب تمام اسباب کا سبب ہے۔ بڑے غور و خوض کے بعد آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ تمام کائنات کا سبب وہی مبدءِ حقیقی ہے جسے لوگ خدا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مجھے ایک بالاتر ذات کی ہستی کا براہ راست پتہ چلا جس نے مجھ میں زندگی کے امکان کا احساس پیدا کیا۔ میں نے اپنے دل سے سوال کیا "یہ سبب کیا ہے؟ اور میرا تعلق اس سبب سے کیا ہے جسے میں خدا کے نام سے پکارتا ہوں؟"

میرے اس سوال کا جواب مجھے وہی پرانا آشنا جواب ملا کہ خدا تمام کائنات کا پیدا کرنے والا ہے اور تمام کی پرورش کرنے والا ہے لیکن یہ جواب پہلی طرح مجھے اب بھی کوئی تسلی نہ دے سکا میں غیر مطمئن اور محزون

رہا جتنی زیادہ میں نے دعائیں مانگیں اتنا ہی زیادہ مجھے یقین ہوا کہ میری آہ و فریاد کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔

لیکن یہ خیال بار بار میرے دل میں پیدا ہوتا رہا کہ جس طاقت نے مجھے اس دنیا میں بھیجا ہے اس کا ایسا کرنے میں کوئی نہ کوئی مطلب ضرور ہے اس طرح خدا کی ہستی کا قائل ہونے کے بعد مجھے اس کے ساتھ اپنے تعلقات کی کھوج ہوئی اور معلوم ہوا کہ وہ اپنے بیٹے (یسوع مسیح) کے ذریعے ہمارا نجات دہندہ ہے لیکن یہ عقیدہ ہی مجھے اپنی ذات اور دنیا سے بہت دور اور الگ تھلگ نظر آیا اور یہ خدا پگھلتی ہوئی برف کی طرح میری آنکھوں کے سامنے سے مٹ گیا۔ ایک دفعہ پھر میں مایوسی کے بے پایاں سمندر میں مخالف ہواؤں کے تھپیڑوں کا شکار بنا۔

اس طرح مدت تک میں کبھی مایوس اور کبھی مسرور ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ جب میں ایک سنسان جنگل میں "آوازیں" سن رہا تھا اور چاروں طرف سناٹے کا عالم طاری تھا۔ ابتدائے بہار کے اس دن جب میں اپنے خیالات کی دنیا میں خدا کی تلاش کر رہا تھا اچانک روحانی مسرت کے ایک چمکارے نے میرے دل کو منور کر دیا۔ اس وقت میں نے سمجھا کہ خدا کا خیال "خدا کی ذات" نہیں تھا میں نے محسوس کیا کہ میں صرف خدا کا حقیقی پرستار بن کر ہی حقیقی زندگی سے لطف اندوز ہو سکتا ہوں۔

خدا زندگی ہے۔

دنیا میں رہنے کا مقصد صرف خدا کی تلاش ہے۔ زندگی کا امکان خدا کے بغیر ناممکن ہے۔ اس وقت جو نور میرے دل میں چمکا وہ مجھ سے کبھی جدا نہ ہوا۔ میں نے اپنے طبقے کی زندگی سے نفرت کا اظہار کیا۔ کیونکہ یہ بے حقیقت تھی اور اس کے افراد کی حد سے بڑھی ہوئی عیاشی نے زندگی کے مقصد کو سمجھنا بہت مشکل بنا دیا تھا۔ میرے اردگرد کے سادہ لوگ اور مزدور جو ہی اصلی روسی قوم ہے انہوں نے مجھے زندگی کے معنی اعلیٰ ترین مقصد سے آشنا کر دیا تھا۔ یہ معنی الفاظ کی صورت میں اس طرح بیان کئے جا سکتے ہیں۔

ہم میں سے ہر ایک کو خدا اس طریقے سے پیدا کرتا ہے کہ اگر انسان چاہے تو اپنی روح کو ضائع کر دے یا بچا لے۔ اگر وہ اپنی روح کو بچانا چاہتا ہے تو خدا کے احکام پر عمل کرے اور عجز و خیرات اور صبر و قناعت کو اپنا شعار بنا لے اور زندگی کی تمام دوسری چند روزہ خوشیوں کو ترک کر دے — یہ ہے عام لوگوں کے لئے تمام مذہبی نظام کا مطلب جو ان کو آباؤ اجداد کی طرف سے ورثے میں ملا ہے۔

محمد یعقوب بی اے

غزل

بہت اغماض بھی اچھا نہیں ہے
ہمارا کوئی حق ہے یا نہیں ہے!

ضرورت تھی کہ تو غافل نہ ہوتا
مگر تقدیر سے ایسا نہیں ہے

مٹانا ہے تو کوتاہی نہ فرما
رسکتا چھوڑنا اچھا نہیں ہے

کسی کو تیری نسبت کیا بتادوں
یہ دیکھا ہے کہ کچھ دیکھا نہیں ہے

کبھی اپنے سلوکوں پر نظر کر
شکایت ہو تو کچھ بے جا نہیں ہے

نگاہ لطف کی تکلیف فرما
کہ ضبط شوق کا یارا نہیں ہے

تعلق جان کو آیا ہوا ہے
ترے ہوتے بھی صبر آتا نہیں ہے

کبھی وہ سنگدل تک مہرباں تھا
اور اب قسمت سے بھی ملتا نہیں ہے

ترے احباب اور یہ کس مپرسی
تجھے کیا واقعی پروا نہیں ہے

ادھر بھی اک نگاہ لطف ادھر بھی
غریب آزاد مستغنی نہیں ہے

حکیم آزاد انصاری

رہزنی

وہ دِل، وہ ذوقِ شعر و نوا کون لے گیا — وہ دن، وہ جشنِ صبح و مسا کون لے گیا

رنگینیٔ بہار کا افسوں کدھر گیا — سرمستیٔ خرامِ صبا کون لے گیا

وہ پرتوِ شراب سے زائد حسیں نظر — اے ساقیٔ فسردہ نوا! کون لے گیا

وہ دل میں جذب ہوتا ہوا نطقِ جانفزا — اس نطقِ جاں فزا کا مزا کون لے گیا

میرے لبوں کی تشنہ مزاجی کدھر گئی — تیرے دہن کا آبِ بقا کون لے گیا

وہ رقصِ گرم جوش، وہ طوفانِ بےخودی — وہ انبساطِ لغزشِ پا کون لے گیا

وہ شغل جن پہ جنتیں قرباں، وہ واقعات — جن کا کوئی جواب نہ تھا، کون لے گیا

وہ سجدہ ہائے مست و دل آویز کیا ہوئے — وہ عرشِ دوست ذوقِ دعا کون لے گیا

وہ گرمیٔ نیازِ جنوں کار کیا ہوئی — وہ حدّتِ خلوص و وفا کون لے گیا

اُس شوخ کے تلوّنِ دلکش کو کیا ہوا — کافر کی خوئے جور و جفا کون لے گیا

وہ رُت، وہ کائنات، وہ اسبابِ زندگی — وہ ہم نفس، وہ آب و ہوا کون لے گیا

دنیا سے کیا، خدا سے بھی پرہیز ہے عدمؔ
مت پوچھ خوئے صبر و رضا کون لے گیا

عدمؔ

اِنتقام

میں ایک معمولی کاشتکار ہوں۔ میری عمر بیالیس کے لگ بھگ ہے انگلستان کے شمال میں ایک چھوٹا سا قصبہ مانٹیر ہے جس میں تھوڑی سی زمین مجھے ورثہ کے طور پر ملی ہوئی ہے جو میرے گزارے کے لئے بہت مشکل سے کفائت کرتی ہے۔ یہ زمین پتھریلی ہے، زرخیز نہیں۔ اس لئے سخت محنت کرنے کے باوجود بھی پیداوار بہت کم ہوتی ہے۔ میں نے چند ایک گائیں بھی رکھی ہوئی ہیں تاکہ ان کا دودھ بیچ کر اپنی آمدنی میں اضافہ کر سکوں۔ مگر یہاں کے مکانات اور خاص طور پر ڈھور ڈنگر باندھنے کے کمرے ایسے بنے ہوئے ہیں کہ ہر سال مرمت طلب ہو جاتے ہیں۔ جس سے میری مالی مشکلات میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ مگر قہر درویش بر جان درویش جس طرح سے بھی ہوتا ہے۔ گزراوقات کرتا ہوں۔

جب میں نے یہ کام سنبھالا تو میں جوان تھا۔ بدن میں طاقت و ہمت تھی۔ اس لئے صبح سے لے کر ستاروں کی روشنی تک میں اپنے کام میں مصروف رہتا۔ میرا بوڑھا باپ بھی کبھی کبھی میرے کاموں میں میرا ہاتھ بٹا دیتا۔ اتوار کا دن میرے لئے آرام کا دن ہوتا۔ میں گاؤں کے اس گرجا میں جاتا جہاں اور میرے جیسے غریب کاشتکار عبادت کے لئے جمع ہوتے۔ میری آواز میں ایک سحر تھا۔ دلکشی تھی۔ اس لئے میں گرجا کی گانے والی پارٹی کا ایک معزز ممبر تھا اور میں اسے اپنے لئے ایک بہت بڑی عزت سمجھتا تھا۔

جب میں بائیس سال کا تھا تو میں نے ایک لڑکی سے شادی کر لی جس کا نام ایڈنا تھا۔ وہ بڑی پیاری لڑکی تھی۔ اس کی بھوری آنکھیں اور سیاہ بال بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ اپنے سر کو ناز سے ایک طرف جنبش دے کر کن انکھیوں سے دیکھنا اس کا ایک خاص انداز تھا۔ جب وہ مسکراتی تو اس کے خوبصورت چہرے پر چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑ جاتے جس سے اس کے حسن میں اور اضافہ ہو جاتا۔

میں نے اسے پہلی بار گرجا میں دیکھا۔ اور ایک ہی نظر میں دل دے بیٹھا۔ وہ مانٹیر میں سیر و تفریح کے لئے اپنی سہیلیوں کے پاس آئی ہوئی تھی۔ میں جتنا وقت بھی اپنے کام میں سے بچا سکتا تھا بچاتا اور اس کی صحبت میں گزارتا۔ اسے بھی مجھ سے عشق ہو گیا تھا۔ میں ایک مضبوط۔ دراز قد اور خوبصورت بالوں والا لڑکا تھا۔ ایڈنا ہارمونیم بجاتی اور میں جذبات سے بھرے ہوئے محبت کے گیت گاتا۔ اور اس طرح ہم دونو کچھ دیر کے لئے محبت کی ایک نئی دنیا بساتے اور اس کی بے پناہ وسعتوں میں اپنے آپ کو گم کر دیتے۔

ایک اداس شام تھی۔ میں اور ایڈنا ایک باغ میں اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسرے دن ایڈنا اپنے گھر واپس جا رہی تھی۔ یہ خیال میرے لئے سوہان روح ثابت ہو رہا تھا۔ جدائی کا طویل زمانہ مستقبل کی تاریکیوں میں مل جل کر ایک مہیب ڈراؤنی شکل پیش کر رہا تھا۔ میں اپنے جذبات میں گم تھا۔ رات کی تاریکیاں آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھیں۔ اگست کا وسط تھا۔ پروانے ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ باغ میں ہر طرف خاموشی تھی۔ مگر دور کوئی گا رہا تھا۔ دھیمی آواز تھی۔ دکھ بھرا لہجہ تھا۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں یہ محبت کا پُر درد گیت میرے جذبات کی دُنیا میں اور بھی ہلچل مچا رہا تھا کہ یکایک ایک ستارہ آسمان سے ٹوٹا۔ ایڈنا کانپ گئی اور خوفزدہ حالت میں میرے قریب ہوتے ہوئے بولی "میری جان! یہ بُری قسمت کی نشانی ہے"۔ میں نے اپنا بازو اس کی کمر کے گرد ڈال دیا اور اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ ایک چھوٹی سی نرم و نازک گڑیا معلوم ہوتی تھی۔ اس کے بالوں سے رات رانی کے کھلے ہوئے پھولوں کی سی خوشبو بکھری پڑتی تھی۔ "نہیں پیاری۔ ڈرو نہیں"۔ میں نے جذبات سے کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔ مگر وہ اپنی ضد پر قائم تھی۔ کہنے لگی "نہیں جان یہ بدنصیبی کی نشانی ہے۔ شاید ہم پھر کبھی ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں"۔

میرے لئے یہ ایک اشارہ تھا۔ میں نے کہا "ایڈنا اگر تم چاہو۔ تو ہم کبھی بھی جدا نہیں ہو سکتے۔ میں تمہیں بہت چاہتا ہوں۔ کیا تم ایک کاشتکار کی بیوی بننا پسند کرو گی۔ پیاری ایڈنا میں تمہارے سوا کسی لڑکی سے شادی نہیں کروں گا"۔ اُس نے اپنے بازو میری گردن کے گرد حمائل کر دیئے اور کہنے لگی "جہاں تم ہو گے وہاں صحرا بھی میرے لئے گلشن ہو گا۔ مگر دوسرے آدمی کے ساتھ مجھے محلات بھی سونے نظر آئیں گے"۔ ان الفاظ سے میرے جسم میں خوشی و مسرت کی لہریں

دوڑ گئیں۔ ستارے مسکراتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

ہوا درختوں میں سے رباب آسا نغمے بکھیرتی ہوئی جا رہی تھی اور میں زندگی کے سہانے خواب دیکھ رہا تھا۔ مگر فراق کی تلخیاں ابھی میری قسمت میں لکھی تھیں۔ ایڈنا کے والدین مصر تھے کہ وہ ابھی شادی نہ کرے کیونکہ ابھی کمسن ہے۔ اس لئے وہ تمام سردیوں کا موسم میں نے ایڈنا کو لمبے محبت بھرے خطوط لکھنے میں گزارا اور جب اس کی یاد بہت ستاتی تو اس کے وہ مختصر سے خطوط جن کے لفظ لفظ سے شرم و حیا کے چشمے اُبلا کرتے تھے، میری تسکین کا باعث بنتے۔

موسم بہار کے آغاز میں اچانک میری والدہ کی موت واقع ہو گئی۔ ایڈنا نے جب یہ سنا تو اُس نے آکر ہمارے گھر کے کام کاج کو سنبھال لیا اور جون کے مہینے میں ہماری شادی ہو گئی۔ زمانہ گزرتا گیا۔ مجھے کھیتوں پر سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔ لوگ اکثر کہتے کہ میں نے شادی کرنے میں غلطی کی ہے۔ مجھے کسی مضبوط جسم کی دیہاتی لڑکی سے شادی کرنی چاہئے تھی۔ جو میرے کاموں میں میری مدد کر سکتی۔ لیکن میرے دل میں میری نازک اور محبت سے بھری ہوئی ایڈنا کے خلاف خیال تک نہ گزرتا۔ اور میں دنیا کی مضبوط اور تندرست لڑکیاں اُس پر قربان کرنے کو تیار تھا۔ وہ کھانا بہت اچھا پکاتی تھی۔ گھر کو صاف اور ستھرا رکھتی اور میرے لئے گویا وہ سورج کی ایک سنہری کرن تھی جس سے میرے گھر کی تاریکیاں دُور ہوتی تھیں۔ اس طرح چند سال بڑے عیش و آرام سے گزرے۔ اب ہمارے ہاں بچہ پیدا ہونے کی توقع تھی۔ ایڈنا ہر وقت چھوٹے چھوٹے کپڑے سینے میں مشغول نظر آتی اور انہیں دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتی۔

اس سال فصلیں بھی بہت اچھی تھیں اور ہمارے مویشی بھی خوب تیار تھے۔ ہر طرف سے زندگی اپنے بیش بہا تحائف ہمارے قدموں پر ڈالتی نظر آتی تھی۔ مگر آہ۔ یہ سب کچھ ایک سطحی سکون تھا۔ جس کے اندر ہزاروں طوفان چھپے ہوئے تھے۔

جولائی کا مہینہ تھا۔ میرے والد باہر کھیتوں میں گھاس کاٹنے کے لئے گئے۔ ایڈنا نے تھوڑے عرصے کے بعد ٹھنڈے پانی کا ایک برتن اُٹھایا اور انہیں پلانے کے لئے گئی۔ لیکن اس کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے میرے والد کو گھاس پر مُردہ پایا۔ ڈاکٹر بلایا گیا جس نے معائنہ کرنے کے بعد کہہ دیا کہ موت حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اور سخت دھوپ میں کام کرنا مرحوم کے لئے جان لیوا ثابت ہوا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس کے بعد کے تین دن کس طرح گزرے۔ ایک طرف میرے باپ کی لاش پڑی تھی اور دوسری طرف ایڈنا جسے ایک کمزور لڑکی وقت سے پہلے پیدا ہو گئی تھی، حیات و موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ میں اس وقت چوبیس سال کا تھا۔ لیکن ان تین دنوں نے مجھے بُوڑھا بنا دیا۔ میری بے پرواہنسی اور گونجتے ہوئے قہقہے سب کافور ہو گئے۔ اور زندگی ایک معمّا بن کے رہ گئی۔

میری لڑکی نے پھُولنا پھلنا شروع کر دیا لیکن ایڈنا اس کے بعد تندرست نہ ہو سکی۔ اس کے اعضا میں خرابی پیدا ہو گئی۔ وہ تھوڑا سا لنگڑاتی تھی۔ اور ہر وقت ایک چھوٹی سی کرسی میں بیٹھی ہوئی سینے پرونے کے کام میں مصروف رہتی۔ ایڈنا کی ایک بوڑھی خالہ تھی جس کا نام ہلڈا تھا۔ وہ ان مصیبت کے ایّام میں ہمارے ہاں آکر ٹھہر گئی اور گھر کا سارا انتظام اس نے اپنے ذمہ لے لیا۔ میری لڑکی رُوت جب بارہ برس کی ہو گئی تو ایڈنا کو گٹھیا کا مرض ہو گیا۔ ہم نے اس کے لئے ایک کمرہ مخصوص کر دیا۔ جہاں وہ ہر وقت بستر پر پڑی رہتی۔ مہینوں گزرنے تک بستر سے نہ اٹھتی۔ عزیز و احباب کا وہ اب بھی تبسّم سے استقبال کرتی۔ لیکن اس تبسم میں ہزارہا حسرتیں جھلکتی ہوئی نظر آتیں۔ میں اس کے پاس کے کمرے میں سوتا، تاکہ وہ مجھے فوراً ضرورت کے وقت آواز دے لے۔

جب اسے درد کا دورہ نہ ہوتا تو وہ پہیوں والی کرسی پر گھر کے صحن میں چکر لگایا کرتی۔ یہ سب کچھ زندگی کو بے کیف بنانے کے لئے کافی سے زیادہ تھا۔ لیکن ان دنوں کے سوا جب ایڈنا کو زیادہ تکلیف ہو جاتی۔ زندگی میرے لئے اتنی بے لطف نہ تھی۔ ہلڈا ایک خوش مزاج عورت تھی اور ہمارا بہت خیال رکھتی تھی۔ میں کاشتکاری بھی کرتا اور دودھ بھی بیچتا تاکہ گزارہ چلتا رہے۔ ان سب تکالیف کو دور کرنے والی اور مجھ میں برداشت کی طاقت پیدا کرنے والی میری لڑکی رُوت تھی جس کی محبت میری زندگی کا سہارا تھی۔ وہ ستاروں بھرے آسمان کی طرح پیاری تھی۔ وہ ایک چھوٹی سی تیتری تھی جو موسم بہار میں پھولوں کی آوارہ خوشبوؤں میں تیرتی پھر رہی ہو۔ جس کی ہستی مجسم محبت اور الفت ہو۔ میں نے آج تک ایسا کوئی انسان نہیں دیکھا جو رُوت کی طرح محبت سے بھرا ہوا اور محبت کا پیاسا ہو۔ میری محبت اس کے ساتھ پرستش کی حد تک بڑھی ہوئی تھی۔ وہ خوبصورت تھی، خوش مزاج اور نیک لڑکی تھی اور اپنی ماں کی طرح چھوٹے سے قد کی تھی۔ مگر مضبوط اور طاقتور تھی۔ میں اسے ہر ایک قسم کا آرام تو نہیں دے سکتا تھا۔ مگر جہاں تک میرے محدود ذرائع مجھے اجازت دیتے اس کی کوئی خواہش رد نہ کرتا۔ جب وہ اپنے نرم و نازک بازو بھولپن سے میرے

تھے میں ڈال کر مجھے پیار سے دیکھتی تو مجھے اپنی قربانیوں کا صلہ مل جاتا۔ میں نے اسے سکول جانے کے لئے ایک بائیسکل خرید دیا۔ وہ اچھے اچھے کپڑے پہننا پسند کرتی اور معمولی معمولی کپڑوں کو بلڈا سے اس طریقہ پر سلواتی کہ وہ اس کے جسم پر بہت بھلے معلوم ہوتے

گرجے کے دھندوں کے سوا مجھے دنیا میں صرف ایک دلچسپی تھی اور وہ بھی گرجا سے۔ میری آواز میں ابھی تک رس تھا۔ لوچ تھا اور جب میں گرجا میں گاتا تو میری لڑکی بڑے فخر سے میری طرف دیکھا کرتی۔ دوسرے لوگ بھی میری اس وجہ سے عزت کرتے اور اس طرح سے اگرچہ میں اس علاقے میں کوئی مشہور آدمی نہ تھا۔ مگر اپنے اس چھوٹے سے گرجے میں ضرور اہمیت رکھتا تھا۔

قرب و جوار کی عورتیں جب میری بیوی کی عیادت کے لئے آتیں تو اس کے لئے مختلف تحائف لاتیں اور مسٹر گریل دکاندار تو مجھ پر بہت مہربان تھے۔ ایک دفعہ جبکہ مانچسٹر سے ایک ماہر ڈاکٹر میری بیوی کو دیکھنے کے لئے آئے تو ان کی فیس مسٹر گریل نے اپنی جیب خاص سے ادا کی۔ اور اگرچہ میں نے اس رقم کو واپس بھی کیا مگر مسٹر گریل نے اسے قبول نہیں کیا۔ مسٹر گریل کے ایک لڑکا پال تھا۔ وہ ایک دراز قد اور خوبصورت نوجوان تھا۔ گاؤں کی تمام لڑکیاں اسے چاہتی تھیں۔ مگر اس کی نظر انتخاب رُوت پر پڑی اور وہ ہمارے کھیتوں میں اکثر اُسے ملنے کے لئے آتا اور اپنی کار میں اُسے سیر کے لئے باہر لے جاتا۔ ایڈنا اور میں بہت خوش ہوتے۔ کیونکہ پال ایک شریف اور محنتی لڑکا تھا۔ وہ ڈاکٹر بننا چاہتا تھا اور اس کا باپ اس کی تعلیم کے تمام مصارف برداشت کرنے کو تیار تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ اگر رُوت اس سے شادی کرے تو اس کا مستقبل بہت شاندار ہوگا۔

ان واقعات کو ایک سال ہی گزرا ہوگا کہ مجھ پر ایک ایسا جنون طاری ہوا جس کے لئے میرے پاس کوئی وجہ نہیں۔ میری بیوی اگرچہ مدت سے مریضہ تھی۔ لیکن میں نے کبھی کسی غیر عورت پر نظر نہیں ڈالی تھی۔ اگرچہ میں جوان تھا۔ لیکن سارا دن سخت کام کرنے اور ہر لحظہ گھر بار کی فکر نے میرے تمام جذبات کو دبا رکھا تھا۔ نیز مجھے اپنی لڑکی سے اتنی محبت تھی کہ مجھے کوئی عورت دلچسپ معلوم نہ ہوتی تھی۔ لیکن جب ان جذبات نے مجھ پر قبضہ کیا تو میں انہیں روکنے سے اتنا ہی مجبور تھا۔ جتنا کہ اپنے خون کی گردش کو اپنے جسم میں روکنے سے۔ اور سب سے زیادہ ندامت کی بات یہ ہے کہ اس واقعے میں جس لڑکی کا ذکر آئے گا۔ وہ اُس رذیل اور پست طبقے سے تعلق رکھتی تھی جن کے نزدیک سے شریف آدمی گزرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ وہ تقریباً رُوت کی ہم عمر تھی۔ اس لڑکی کا نام لارا گلڈنگ تھا۔ اس کا باپ مر چکا تھا۔ ماں کا بیٹی پر کوئی دباؤ نہیں تھا۔ اس لئے لڑکی آزاد اور آوارہ ہوگئی تھی۔ میں نے کبھی اس لڑکی کو دیکھا تک نہیں تھا۔ صرف اتنا جانتا تھا کہ اس نام کی کوئی لڑکی اس گاؤں میں رہتی ہے۔

اپریل کی ایک صبح تھی۔ میں اپنی چھوٹی سی کار میں حسب معمول خریداروں کو گاؤں میں دودھ دینے کے لئے روانہ ہوا۔ مطلع صاف تھا۔ ہوا خوشگوار تھی۔ درخت سیاہ پوش ہو رہے تھے۔ فضا مسرور نظر آرہی تھی۔ ایسے سمے میں میرا دل بھی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ کیونکہ ایڈنا کو اب پہلے کی نسبت آرام تھا۔ اور رُوت ایک عمدہ کام پر مسٹر گریل کی سفارش سے لگ گئی تھی۔ اسے نئی پوشاک خرید کر دینے کے لئے میرے پاس کافی رقم موجود تھی۔ میں نے گانا شروع کر دیا۔ دودھ کی بوتلوں کی کھڑکھڑاہٹ اور انجن کے چلنے کا شور میری ہمنوائی کر رہے تھے۔ شائد یہ موسم بہار کی روح تھی جو مجھ میں نفوذ کر رہی تھی۔ میرے خون میں جوش پیدا ہو رہا تھا۔ اور زندہ دلی کے جذبات کروٹیں لے رہے تھے۔ واپسی پر واپس جانے کے لئے میرے کھیتوں کو گاؤں سے دو راستے جاتے تھے۔ ایک گرجا کے نزدیک سے ریلوے پل کے نیچے سے جاتا تھا۔ دوسرا راستہ لمبا تھا۔ جو مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا جاتا تھا۔ چونکہ پہلے راستے میں مرمت کا کام جاری تھا۔ اس لئے میں نے کار کو دوسرے راستہ سے جانے کے لئے ایک گلی میں ڈال دیا گلی کے موڑ پر 'لارا' کا مکان تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو دوسری طرف سے ایک اور کار آرہی تھی۔ میں نے اپنی کار کو روک لیا۔ لیکن جب دوبارہ چلانا چاہا تو انجن کام نہیں کرتا تھا۔ میں نیچے اترا کہ اسے ٹھیک کروں۔

انسانی زندگی میں متعدد ایسے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں کہ انسان کو مجبوراً تقدیر کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ جب مجھے ان واقعات کے سلسلے پر غور کرنے کی فرصت ملتی ہے جو انجن کے فیل ہونے سے ظہور پذیر ہوئے اور جن سے میری زندگی کے اوراق میں ایک تکلیف دہ حزنیہ باب کا اضافہ ہوا تو میں حیران ہوتا ہوں کہ آیا ان سب معاملات میں حضرت انسان ہی مورد الزام ہے۔ یا کوئی دوسری زبردست طاقت ہمارے اوپر کام کر رہی ہے۔ اور ہمیں اندھا دھند ایسے کام کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

سامنے کے مکان کا دروازہ کھلا اور میں نے اوپر جو نظر اٹھائی تو دیکھا کہ لارا میری طرف آ رہی ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ سورج کی تیز کرنوں میں اس کے گھنگریالے بال چمک رہے تھے۔ اس کی آنکھیں ہرنی

کی مانند تھیں۔ جن پر لمبی لمبی پلکیں سایہ کئے ہوئے تھیں۔ اس کا جسم سڈول اور خوبصورت تھا۔ اس کا چہرہ سرخ تھا۔ میرا خیال ہے کہ اُس نے پینٹ کیا ہوا تھا۔ اس کی ہر ادا میں جاذبیت تھی۔ دلکشی تھی۔ جس سے بچنا محال بلکہ ناممکن تھا۔ اور وہ شائد اس لئے پیدا کی گئی تھی کہ شریف آدمیوں کے ایمان پر ڈاکہ ڈالے۔ وہ میری کار کے پاس کھڑی ہوگئی۔ میں نے اُسے اس طرح سے دیکھنا شروع کیا جیسے میں نے آج تک کسی عورت کو دیکھا ہی نہ ہو اور اُس کے چہرے پر سے نظریں ہٹائے نہ ہٹتی تھیں۔ کیونکہ اس کے نازک لبوں پر ایک ایسا تبسم رقصاں نظر آ رہا تھا جس سے کائنات مسکرا رہی تھی۔

"ہیلو۔ مسٹر جان ڈیویسن" اس نے میری کار کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

"ہیلو۔ لارا" میں نے جواب دیا۔

اس نے مڈگارڈ پر ہاتھ رکھتے ہوئے میری کار کو ہلانے کی کوشش کی اور کہا "بڑی عمدہ کار ہے۔ کبھی کبھی کسی کو سیر ہی کے لئے لے جایا کرو"۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ میں اپنے اندر ایک انقلاب محسوس کر رہا تھا اور وہ جذبہ مجھ میں بھی پیدا ہو رہا تھا۔ جسے برسوں سے میں بھولا ہوا تھا۔ یہ جوانی کی ایک ترنگ تھی۔ اور ایک خوبصورت عورت کے ساتھ عیش و عشرت میں دن گزرنے کی یاد۔

"مجھے تو کوئی انکار نہیں۔ اگر کوئی میرے ساتھ سیر کو جانے کے لئے تیار ہو" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ آہ وہ مدھ بھری آنکھیں جن میں شراب کی سی مستی تھی۔ جو مجھے جوانی کی رنگینیوں کی طرف دعوت دے رہی تھی۔ میں اُن کی بے پناہ رنگینیوں میں سب کچھ کھو بیٹھا۔

میں آج تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ لارا نے مجھے اپنے پھندے میں پھنسانے کی کیوں کوشش کی جب کہ گاؤں میں سینکڑوں نوجوان اور موجود تھے جو اس کے ساتھ ایک شام گزار دینا گویا جنت پا لینے کے مترادف قرار دیتے تھے۔ ایک دنیا اُس کی شیدائی تھی۔ میں ایک غریب مصیبت زدہ زمیندار تھا۔ جس کے چہرے پر جوانی کے چند مٹتے ہوئے نقوش کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ روپیہ میرے پاس نہیں ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ مجھے ایڈنا اور رُوت سے کتنی محبت ہے اور یہ کہ میں گرجا کو جس میں ہر اتوار میرا گانا ہوتا تھا کبھی نہیں بھول سکتا۔ لیکن ممکن ہے کہ میری کشش کے وجوہات ہی یہ ہوں اور شائد وہ اپنے ملکوتی حسن کے غرور میں ایک ایسے جانور کو نیم بسمل دیکھنا چاہتی ہو جو آج تک ایسے حسین شکاریوں کے تیروں سے زخمی نہ ہوا ہو۔ اس دن کے بعد میری زندگی میں ایک تغیر رونما ہونا شروع ہوا۔ مجھ پر ایک نشہ سا طاری رہتا۔ سب ضروری کام بھول گئے۔ صرف اسی کا خیال تھا جسے میں دل میں چھپائے لئے پھرتا تھا۔ دنیا مجھے صرف اسی کے آئینۂ حیات میں منعکس نظر آتی تھی۔

اس پہلی ملاقات کے بعد ایک شام میں گاؤں سے کچھ خریدنے کے لئے گیا۔ واپسی پر میری کار خود بخود اسی راستہ پر مڑ گئی۔ جس پر اس کا مکان تھا۔ تقدیر کی بات ہے کہ لارا مجھے راستہ میں تنہا اپنے گھر کو جاتی ہوئی مل گئی۔ میں نے اُسے کار میں بٹھا لیا۔ اور جب اس کے گھر کے سامنے موڑ کے قریب کار کو روکنے لگا۔ تو وہ بولی "جان تھوڑی دور تک اور چلو۔ دیکھو کتنی پیاری شام ہے" میں نے کار کو ایک سڑک پر ڈال دیا۔ اور چند میل نکل گیا۔ فضا خاموش تھی۔ رات کی تاریکیاں گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ آسمان پر ستارے چشمک زنی کر رہے تھے۔ لارا کا نرم جسم میرے نزدیک تھا۔ جس میں سے خوشبوئیں پھوٹ رہی تھیں۔ یہ قربت میرے لئے سخت اضطراب انگیز تھی۔ میرے تصوّرات کے چھپے ہوئے طوفان سر اٹھا رہے تھے۔ میں نے اس کی گردن کے گرد اپنے بازو حمائل کرتے ہوئے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور جذبات کی فراوانی سے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے اس کے نازک لبوں پر ایک بوسہ دیا۔ اب میں ایک ایسے راستے پر گامزن تھا جس سے واپسی ناممکن معلوم ہوتی تھی۔ اب وہ میری رگ رگ میں پنہاں تھی۔ اور میرے خون کے قطرے قطرے میں بس چکی تھی۔ جسے باہر نکال پھینکنا میرے قبضہ میں نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود جو جذباتِ محبّت ایڈنا اور رُوت کے لئے میرے دل میں موجزن تھے۔ وہ ان جذبات سے کہیں زیادہ بلند اور پاکیزہ تھے۔ یہ ایک جنون تھا۔ ایک وحشت اور میری طاقت سے زیادہ طاقتور۔ ہر رات کو کھانا کھانے کے بعد میں کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کر باہر آ جاتا۔ لارا کو اپنی کار میں بٹھا کر جنگل یا کسی پارک کے تاریک کونے میں لے جاتا۔ جہاں میں اُسے آغوش میں لے کر پیار کرتا۔ حتّٰی کہ میرے خون کا ذرّہ ذرّہ اُبل پڑتا۔ لیکن اس کے باوجود میں اپنے اوپر ضبط رکھتا۔ اس لئے مجھے یہ معلوم نہیں کہ لارا کا اخلاقی معیار کس قدر پست تھا۔ اس تمام دیوانگی کے زمانہ میں میں نے اپنی بیوی کے حقوق سے بے وفائی نہیں کی۔ تھوڑے عرصہ کے بعد میں نے لارا کو تحائف دینے شروع کر دیئے۔ ایک دن میں نے اس کے گلے کے ایک ہار کو توڑ دیا۔ جسے وہ بہت عزیز رکھتی تھی۔ لیکن دوسرے ہی دن اُسے ایک نیا خرید دیا۔ اور اس طرح وہ رقم جو میں نے رُوت کی سالگرہ منانے کے لئے پس انداز کر رکھی تھی۔ خرچ کر دی۔ اور میں اپنی لڑکی کو کلائی کی گھڑی جو کہ میں نے اُس سے

وعدہ کیا ہوا تھا نہ دے سکا۔

گھر کی زندگی میں کوئی خاص تغیّر واقع نہ ہوا۔ پال اس سال کوئی کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ اکثر میرے کھیتوں میں آتا۔ رُوت پروانہ وار اس کے اِرد گِرد گھومتی۔ اس کے لبوں پر تبسّم ہوتا۔ اور اس کی آنکھوں میں محبت کا خمار۔

ایک دن جب مجھے کچھ اپنے تصوّرات سے فرصت ملی۔ تو میں نے رُوت سے پوچھا" بیٹی پال یہاں اکثر آتا جاتا ہے۔ کیا تم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو" اس نے میری گردن کے گرد اپنے بازو ڈالتے ہوئے کہا۔ ابّا ایسی باتیں چھوڑو۔ محبت۔ ہاں۔ ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں" لیکن کچھ دیر کے بعد جب پال کی موٹر دروازہ پر آ کر رُکی تو رُوت کے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی اور وہ ایک چھوٹی سی تیتری کی طرح اڑتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی۔

میرا خیال تھا کہ ایڈنا میرے اور لارا کے رازِ محبت سے ناواقف ہے۔ اور سمجھتا تھا کہ گاؤں میں کوئی بھی میرے اور لارا کے تعلقات کو نہ جانتا ہوگا۔ یہ میری بھول تھی۔ کیونکہ دنیا میں تاڑنے والی آنکھیں اور باتیں تراشنے والی زبانیں بہت ہیں۔ اور محبت کی آگ دھواں دیئے بغیر نہیں جلتی۔ جس کا چھپانا ناممکن ہے۔

اگست کی ایک شام کو میں اِس خواب سے جگایا گیا۔ گرجا میں گانے کی مشق ہو رہی تھی کہ مسٹر گریل میرے پاس آئے اور مجھے تنہائی میں لے جا کر نہائت متانت سے کہا میجان مجھے یہ بات کہتے ہوئے خود ہی نفرت سی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن مجبوراً مجھے کہنا ہی پڑا۔ میں تمہیں بچپن سے جانتا ہوں تم پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹتے رہے ہیں۔ جس کے لئے مجھے بہت افسوس ہے۔ اور جہاں تک مجھ سے بن پڑا۔ تمہاری مدد کرنے سے میں نے کبھی گریز نہیں کیا جب میں نے شروع شروع میں تمہاری بابت بُری افواہیں سنیں۔ تو مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ اور میں اُسے لوگوں کے حسد و بغض پر محمول کرتا تھا لیکن جب یہ چرچے زیادہ عام ہوتے گئے تو میں نے تمہاری حرکات کو بنظرِ غائر دیکھنا شروع کیا اور مجھے بہت قلق ہوا جب میں نے اُن کو حرف بہ حرف صحیح پایا۔ اس لئے گرجا کے منتظمین نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ یا تو تم ایسی آوارہ لڑکی سے قطع تعلق کر لو۔ ورنہ تمہارا نام گرجا میں گانے والی پارٹی سے خارج کر دیا جائے گا۔"

اس رات میں بالکل نہ سو سکا اور بستر پر پہلو بدلتے ہوئے ساری رات آنکھوں میں کاٹی لیکن صبح تک میں نے فیصلہ کر لیا اور میں نے اپنی تمام طاقت کو جمع کر کے قسم کھائی کہ میں اس عورت کے خیال کو اپنے دل سے باہر نکال دُوں گا۔ اور اس جگہ کو جو میں نے گرجا میں معزز آدمیوں کے درمیان حاصل کر رکھی ہے۔ کبھی نہ چھوڑونگا۔

اس شام کو میں لارا سے قصداً ملا تاکہ اُسے بتا دوں کہ اس کے اور میرے تعلقات اب ختم ہو چکے۔ وہ مجھے ہمیشہ محبت اور نرمی سے ملا کرتی تھی لیکن میری باتوں کو سنتے ہی وہ ایک غصے سے بھری ہوئی بلّی کی مانند غرائی جو اپنے پنجوں سے میری آنکھیں نکالنے کو تیار ہو۔

"تم مجھے اس طرح نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ جو دنیا تمہیں مجھ سے اس طرح سے چھین رہی ہے۔ جانتے ہو کہ میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گی۔ کیا تم لوگوں کی باتوں سے گھبرا گئے ہو۔ جو یوں بے وفائی کر رہے ہو۔ یاد کرو کہ تم ایک افسردہ دل انسان تھے جسے میں نے اپنی جوان محبت کی حسین اور دلکش رنگینیاں بخشیں۔ اور تمہاری زندگی کی خزاں کو بہار میں بدل دیا۔ تم اس کا صلہ مجھے یہ دے رہے ہو"۔

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "لیکن لارا! میری تو بیوی بھی ہے اور لڑکی بھی"۔ اور شاید تمہیں اس بات کا علم نہ ہو کہ میں اپنی لڑکی سے اس قدر محبت کرتا ہوں کہ تمہارے ساتھ ایک ہزار سال تک زندگی گزار دینے تک بھی نہیں کر سکتا"۔

لارا آخرکار عورت تھی۔ اور اس نے عورت کا آخری حربہ استعمال کرنا شروع کر دیا۔ وہ رونے لگ گئی۔ ایک حسین عورت کے آنسوؤں سے زیادہ دنیا میں مرد کو پھسلانے کے لئے اور کوئی چیز نہیں اور پھر اُس وقت جب مرد اس سے محبت کرتا ہو یہ طوفان ثابت ہوتے ہیں۔ جس میں مضبوط سے مضبوط ارادے بھی خس و خاشاک کی طرح بہ جاتے ہیں۔ اس نے محبت سے اپنے بازو میری گردن کے گرد حمائل کر دیئے۔ لیکن مجھے اپنی قسم یاد آ گئی۔ میں نے اُسے اپنے سے دُور ہٹاتے ہوئے کہا" لارا۔ ان باتوں کو اب فراموش کر دو۔ میں دیوانہ تھا۔ اور اب میں ہوش میں آ چکا ہوں۔ تم حسین ہو۔ جوان ہو۔ تم کیوں اتنا غم کرتی ہو تم آسانی سے کسی دوسرے کو میری جگہ اپنا بنا سکتی ہو"۔

ان الفاظ میں خدا جانے کیا بات تھی۔ کہ اس نے فوراً رونا بند کر دیا۔ رات ڈراؤنی اور بھیانک معلوم ہو رہی تھی اور تاریکی میں اس کا چہرہ ایک دھبہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن جذبات کا تلاطم اس کے سانس کی تیز آمد و رفت سے بخوبی جانچا جا سکتا تھا۔ وہ ایک زخمی شیرنی کی طرح میری طرف لپکی اور میرے قریب ہوتے ہوئے بولی" بہت اچھا۔ جاؤ۔ میں تمہیں کبھی نہیں روکونگی . . . . . لیکن ٹھیرو۔ میں اس کا انتقام ضرور لوں گی۔ عورت جب محبت کرتی ہے تو اپنا سب کچھ اپنے محبوب پر قربان کر دیتی ہے لیکن جب

اس کی محبت ٹھکرا دی جاتی ہے اور اس کی حسین آرزوئیں۔ رنگین تمنائیں تمہاری طرح دل کی بجائے برف کی قاش رکھنے والے مرد پامال کر دیں تو وہ دنیا کی ہر خوشی کو تیاگ دیتی ہے۔ اور پھر جب وہ انتقام پر تُل جائے تو وہ خیر و شر سے بالکل بے نیاز ہو کر ایک عالم کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ میں بھی انتقام لونگی اور ضرور لونگی اور دنیا دیکھے گی کہ اس گاؤں کی گلیوں میں چلنے والا کوئی شخص بھی اتنا بدنصیب اور غمگین نہیں ہوگا جتنے کہ تم۔"

لارا کا خیال آہستہ آہستہ مدھم پڑتا گیا اور میں اس کے گھر کی طرف جانے سے ایسا بچتا جیسے لوگ پلیگ زدہ علاقہ میں جانے سے گھبراتے ہیں۔ سارا دن کھیتوں میں کام کرتا اور رات ایڈنا کی تیمارداری میں گزار دیتا۔ اسے درد کے سخت دَورے پڑ رہے تھے۔ اُسے سکون دینے کے لئے چھوٹی چھوٹی سفید گولیاں تھیں۔ لیکن کبھی کبھی ان کا اثر بھی نہ ہوتا تھا اور مجھے بہروں اُس کے پاس بیٹھنا پڑتا تاکہ اس کا دل بہلتا رہے۔

خزاں کا آغاز تھا۔ ہلڈا نے مجھے بتایا کہ رُوت بیمار ہے۔ وہ بہت زرد اور کمزور ہوگئی ہے اور اس کی خوراک اتنی بھی نہیں رہی جس سے ایک چھوٹا سا پرندہ بھی زندہ رہ سکے۔ یہ ایک حقیقت تھی۔ رُوت افسردگی کی تصویر تھی۔ میں نے اُسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کو زور دیا مگر اُس نے جانے سے انکار کر دیا۔ میرے اصرار پر ایک مردہ سی ہنسی اس کے لبوں پر ظاہر ہوئی اور اس نے کہا کہ وہ بیمار نہیں ہے۔ ڈاکٹر کے پاس جانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

لیکن کئی دفعہ مجھے ایڈنا کے پاس زیادہ دیر تک بیٹھنے کا اتفاق ہوتا تو میں اوپر کے کمرے میں رُوت کے چلنے کی آواز سنتا اور اکثر آدھی رات گزر جانے کے بعد بھی اس کے کمرے کی روشنی گُل نہ ہوئی تھی۔ پال بھی اب میرے کھیتوں میں نہ آتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ رُوت اس کے لئے غمگین ہے۔ اور یہ ایک ایسی جنگ تھی جس میں اسے خود ہی لڑنا چاہئے تھا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر بہت زیادہ رنج ہوتا کہ میری لڑکی کو اتنی چھوٹی سی عمر میں زندگی کے ان معاملات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔

اکتوبر کی ایک رات مجھے کبھی نہ بھولے گی۔ ہوا چیختی ہوئی مکانوں اور چمنیوں میں سے گزر رہی تھی۔ بارش کی بوچھاڑ دروازوں اور کھڑکیوں سے زور آزمائی کر رہی تھی۔ ایڈنا کو سخت تکلیف تھی۔ اور وہ جاگ رہی تھی۔ اس نے وہی دو سفید گولیاں کھائی تھیں۔ لیکن تسکین نہ ہونے کی وجہ سے اور گولیاں مانگ رہی تھی۔ مگر میں ان گولیوں کو زیادہ مقدار میں دینے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ ڈاکٹر نے مجھے متنبہ کر دیا تھا کہ ان کا مقدار سے زائد کھانا مہلک ہے۔ بہت عرصہ کے بعد ایڈنا سو گئی اور میں نے اپنے بستر پر جانے کے لئے دوسرے کمرے کا رُخ کیا۔ ہوا تھم چکی تھی۔ فضا خاموش تھی۔ میں تھوڑی دیر کے لئے راستہ میں ٹھہر گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی آہیں بھر رہا ہے۔ اُف میری پیاری رُوت اپنے دل کا غم تنہائی میں آہوں کے ذریعے نکال رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ اوپر چڑھا۔ اس کے دروازے پر دستک دی۔ کمرے میں فوراً خاموشی چھا گئی۔ میں کمرے میں داخل ہوا۔ لیمپ جلایا اور میرا دل دھک کرکے بیٹھ گیا۔ رُوت حسرت و یاس کی تصویر بنی بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے بال پریشان تھے۔ اور وہ میری طرف ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جن میں حرماں نصیبی کا وہ منظر تھا۔ جو میں نے آج تک کسی انسان کی آنکھوں میں نہیں دیکھا۔ میں اس کے بستر پر بیٹھ گیا اور اُسے اپنے بازوؤں میں تھامتے ہوئے پدرانہ شفقت سے پوچھا "بیٹی۔ اپنے باپ سے کوئی بات نہ چھپاؤ۔ میں تمہاری تکلیف کو ہر ممکن کوشش سے دور کروں گا۔" وہ میرے ساتھ چمٹ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ وہ کچھ نہ بولی۔ لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد اس نے اپنی زندگی کی سوگوار کہانی سنائی۔ یہ وہ کہانی تھی جو دنیا کی آفرینش سے اب تک ہزاروں بار سنائی گئی ہے اور لاکھوں بار دُہرائی جائے گی۔ جب تک کہ جوانی میں جوش۔ جوش میں مستی اور والہانہ پن ہے۔ جب تک جوان آدمی کی زبان میں رس ہے۔ لوچ ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں مقناطیسی کشش ہے۔ اور جب تک جوان لڑکیاں محبت کی بھوکی انجام سے بے خبر آگ کے شعلوں سے کھیلتی رہیں گی۔ اور اپنی عزیز سے عزیز ترین متاع اس میں بھسم کرکے قربانیاں کرتی رہیں گی۔ یہ کہانی تشنۂ تکمیل ہی رہے گی۔ رُوت کو پال سے محبت تھی۔ عشق تھا۔ اور پال اس سے بے وفائی کر رہا تھا۔ پال کے لئے میرے دل میں نفرت کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔ لیکن جب میں نے اپنے اعمال پر نظر دوڑائی تو مجھے مرد کی محبت کے نظریہ کے متعلق کوئی فیصلہ دینے کا حق نظر نہ آیا۔ یہاں تک کہ میں اس آدمی کی بابت جس نے میری لڑکی کو دھوکا دیا تھا۔ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ نیز اس میں میرا زیادہ قصور تھا۔ میں لارا کے حسن کا دیوانہ ہو کر رُوت کو بالکل بھول بیٹھا تھا اور جس طرح ایک باپ کو اپنی بیٹی کے معاملات میں غور و خوض سے کام لینا چاہئے میں نہیں لے سکا تھا۔ میں نے رُوت کو تسلی دی اور کہا۔ بیٹی غم نہ کرو۔ پال ایسا آدمی نہیں ہے۔ وہ اس غلطی کی ضرور تلافی کرے گا۔ اور اگرچہ وہ تمہیں دو ہفتہ سے نہیں ملا۔ لیکن

صبح میں اُس سے اور اس کے باپ سے ملوں گا اور تمہاری شادی اسی کے ساتھ ہو جائے گی۔ اپنے باپ پر اعتماد کرو اور اب سو جاؤ۔

اس رات میں بالکل نہ سو سکا۔ میرا دل غم سے بھاری تھا۔ صبح کا کھانا کھا کر میں گاؤں میں گیا۔ مجھے اس وقت تک یقین تھا کہ پال رُوت سے محبت کرتا ہے۔ میں مسٹر گریل کے مکان پر پہنچا۔ گھنٹی بجائی۔ لیکن جواب ندارد۔ میں نے دوبارہ گھنٹی بجائی اور تھوڑے عرصہ کے بعد ایک خادمہ دروازے میں ظاہر ہوئی۔ اس کے بال پریشان تھے۔ چہرہ زرد ہو رہا تھا اور اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ کسی سخت پریشانی میں مبتلا ہے۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔

"آپ مسٹر گریل کو نہیں مل سکتے۔ وہ بیمار ہیں۔"

میں نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے۔ لیکن مجھے ان سے ضرور ملنا ہے۔" اور یہ کہہ کر میں اس کے پاس سے گزر کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ مجھے ہال کے عقبی کمرے میں آوازیں سنائی دیں اور میں نے اس طرف کا رُخ کیا۔ دروازے پر پہنچ کر میں یکایک رُک گیا۔ مسٹر گریل کھڑکی میں سے باہر خالی فضا کو تک رہے تھے۔ اور ان کی بیوی ایک چھوٹی سی کرسی پر بیٹھی ہوئی اپنے ہاتھوں سے سر کو تھامے ہوئے رو رہی تھی۔ میں کھانسا۔ مسٹر گریل نے میری طرف مُنہ موڑا۔ اس کا چہرہ بالکل سفید پڑ چکا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں بڑے عجیب سے وقت پر آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔ مگر مجبور ہوں۔ مجھے آپ سے ایک نہائت ضروری کام ہے" میں نے کہا۔

"ہاں۔ کیا بات ہے جان" مسٹر گریل نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

"میری لڑکی بڑی پریشان ہے۔ مسٹر گریل۔ اور اس کی ساری ذمہ داری پال پر ہے۔ میں آپ سے درخواست کرنے آیا ہوں کہ پال کی شادی رُوت سے کر دی جائے۔" میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ گریل کے چہرے پر تشنج کے آثار پیدا ہوئے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ سفید پڑ گیا۔ اس نے خاموشی سے میز پر سے ایک لفافہ اٹھایا اور مجھے دے دیا۔ یہ تار تھا جو لندن سے کل کی تاریخ سے مسٹر گریل کے نام آیا تھا۔ میں نے اُسے کھولا یہ تار پال کی طرف سے دیا گیا تھا۔ اس میں لکھا تھا۔

"میں نے پوشیدہ طور پر لارا کلڈنگ سے شادی کر لی ہے۔ اور اب ہم ماہ عسل منانے کے لئے جا رہے ہیں"۔

آہ۔ لارا نے انتقام لے لیا اور اس نے جان بوجھ کر پال کو اپنے پھندوں میں پھنسایا۔ تاکہ وہ اپنے خداداد حسن کی ستم رانیوں سے میری زندگی کو جہنم بنا دے۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ رُوت مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اور رُوت کو تکلیف پہنچانا میرے دل کو زخمی کرنا تھا۔

جس طرح سے بھی ہو سکا میں گھر پہنچا اور رُوت کو اپنی آغوش میں تھام کر اُسے سارا واقعہ سنایا اور اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی پیاری بیٹی کے نازک دل کو چُور چُور ہوتے دیکھا کیا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں اس کی مدد کروں گا۔ لیکن میں خود نہیں جانتا تھا کہ کیسے اور کیونکر۔

صبح کا وقت تھا۔ بارش ختم ہو چکی تھی مگر کالی کالی بدلیاں اب بھی آسمان پر دوڑ رہی تھیں۔ میں اپنے کھیتوں میں کام میں محو تھا۔ ایڈنا تکلیف کی وجہ سے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ ہلڈا نے کھانا تیار کیا۔ لیکن ہم میں سے کسی نے بھی نہ کھایا۔ رُوت کرسی پر بیٹھی آنکھوں میں یاس کا منظر لئے فضا کے خلا میں سارا دن بے معنی نظروں سے تکتی رہی۔ رات کے نو بجے کے قریب وہ اپنی ماں کے کمرے میں آئی۔ ہم دونوں کو سلام کیا اور اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں سیڑھیوں تک اس کے ساتھ گیا اور اسے آہستہ آہستہ چڑھتے ہوئے دیکھتا رہا۔

"مجھے امید ہے کہ تم اچھی طرح سے سوؤ گی۔" میں نے کہا۔

"ہاں آپ فکر نہ کیجئے میں اچھی طرح سے سوؤں گی"۔

اس نے ہنستے ہوئے میری طرف مُنہ موڑ کر جواب دیا۔ یہ دن میں پہلا موقع تھا۔ کہ اس کے چہرے پر ہنسی دکھائی دی تھی۔ میں تھکان کی وجہ سے سو گیا۔ نصف شب کے قریب ایڈنا نے مجھے جگایا۔ اسے درد کی سخت تکلیف تھی۔ اس نے مجھ سے وہی سفید گولیاں مانگیں۔ میں نیم خوابی کی سی حالت میں اس کے کمرے میں داخل ہوا اور گولیوں کے بکس کو ہر طرف کمرے میں تلاش کیا۔ لیکن وہ مجھے کہیں بھی نہ ملا۔ "شام تک تو وہ یہیں پڑا تھا۔" ایڈنا نے کہا۔

خدا جانے کیوں۔ میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ نیند کا اثر اب دور ہو چکا تھا۔ اور رُوت کا سفید چہرہ میری طرف غور سے تکتا ہوا میری نظروں میں گھوم رہا تھا۔ "ہاں۔ میں اچھی طرح سے سوؤں گی۔" اس نے کتنی حسرت آمیز آواز سے کہا تھا۔ میں جلدی سے اوپر چڑھا اور روت کے کمرے میں داخل ہوا۔ لیمپ ابھی تک دھیمی دھیمی روشنی بکھیر رہا تھا۔ وہ اپنے بستر میں آنکھیں بند کئے لیٹی ہوئی تھی۔ چہرے پر عجیب قسم کی طمانیت برس رہی تھی۔ اس کے کالے کالے بال تکئے پر بکھرے پڑے تھے اور سفید گولیوں کا بکس فرش پر خالی پڑا تھا۔ ہاں۔ وہ سو رہی تھی۔ اور اب وہ اس دنیا کے غم والم سہنے کے لئے کبھی نہ جاگے گی۔

اب پھر بہار کا موسم ہے۔ پھول کھلے ہوئے ہیں۔ درخت نئی کونپلیں نکال رہے ہیں۔ میں پچھلے سال کی طرح اب بھی ہل چلاتا ہوں اور فصلیں بوتا ہوں۔ ایڈنا سارا دن بستر پر پڑی رہتی ہے۔ اس کی سیاہ آنکھیں اندر کو دھنس گئی ہیں۔ اب بھی کبھی کبھی ایک مسکراہٹ سی اس کے چہرے پر پھیلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس مسکراہٹ کے نیچے زخمی اور خون شدہ دل آہیں بھرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ہلڈا گھر کے کام کاج میں اسی طرح بھاری بھاری قدموں سے مصروف ہے۔ لیکن رُوت جو اس گھر کی روح رواں تھی جس سے یہ زندگی زندہ رہنے کے قابل تھی نہیں ہے۔

(ترجمہ) **عبد العزیز میانوی**

رباعیات

برسات کے دریا

دریا امڈے، بہا طلا رسیال
بکھرے موجوں کے جا بجا زریں جال
انسان کی کیا مجال نظروں کا کبھی
اس پار سے اُس پار پہنچنا ہے محال

چمیلی کے پھول

تھے چادرِ ابر میں جو مستور نجوم
دلدادۂ فطرت کی نظر تھی مغموم
قدرت نے کھلا دیئے چمیلی کے پھول
پیارے پیارے حسین نازک معصوم

مرزا عباس بیگ محشر

سہ آتشہ

حضرتِ فراقؔ گورکھپوری نے یہ سہ غزلہ لکھ کر اپنی اس غیر معمولی قدرتِ بیان کا ثبوت دیا ہے جو اُن کو شاعری میں حاصل ہے۔ اتنی طولانی اور سیر حاصل غزلیں کہنا قدیم رسم تھی جس کی طرف موجودہ شعرا بہت کم توجہ کرتے ہیں۔ اب یہ پرانی طرز بھی اپنے اندر ایک جدت رکھتی ہے۔

(۱)

نو بنو داغِ محبت کا نمایاں ہونا
خوابِ ہستی کا وہ اک خوابِ پریشاں ہونا

چاکِ دل چاکِ جگر چاکِ گریباں ہونا
وحشیو یہ تو نہیں عاشقِ جاناں ہونا

اُسے دیکھا بھی تو اس طرح کہ دیکھا ہی نہیں
اُف وہ سر تا بقدم عشوۂ پنہاں ہونا

بے قرارِ دل کو ہے اب اک خلشِ پنہاں بھی
غمِ دوراں کو مبارک غمِ جاناں ہونا

فرشِ رہ دیدہ و دل ہیں ترے مشتاقوں کے
تیری آمد میں کوئی ساز نہ ساماں ہونا

چپے چپے میں ہے گلزار کے صد دشتِ جنوں
ذرّے ذرّے سے نمایاں ہے بیاباں ہونا

ٹھوکریں ہیں در و دیوار کی اور تیرے اسیر
سخت دشوار ہے شایستۂ زنداں ہونا

نوعِ انساں کو دو عالم میں سکوں مل سکتا
غمِ ہستی کو نہ آیا غمِ پنہاں ہونا

اپنا انجام اگر عشق سمجھتا ہے تو پھر
حسن کا کس لئے شرمندۂ احساں ہونا

اب تو تنگ آ گئے اس کشمکشِ پنہاں سے
دل کے شیرازہ کو آیا نہ پریشاں ہونا

سازِ بے سوز سے دنیا نہیں بدلا کرتی
کارِ ہر نعرہ نہیں نعرۂ مستاں ہونا

وحشتِ عشق کا بڑھنا تو عدم ہو جانا
سمٹ آنا تو سراپردۂ امکاں ہونا

سربسر برقِ فنا عشق کے جلوے ہیں فراقؔ
خانۂ دل کو نہ آباد نہ ویراں ہونا

(۲)

ہے ابھی جوہرِ ہستی کو نمایاں ہونا
حسنِ آفاق کو ہے روکشِ انساں ہونا

سربسر جسم کے امکان میں ہے جاں ہونا
رگِ ہستی کو نہ آیا ابھی لرزاں ہونا

سازِ بے سوز ہے لے عشق یہ نظمِ ہستی
ان حجابوں کو سکھا شعلہ بداماں ہونا

رازِ سربستہ ہے شیرازۂ دل کی ترکیب
بیک انداز اسے یک جا و پریشاں ہونا

دلِ سوزاں شبِ غم پیکرِ بے خبری ہے
نہ شبستاں نہ اسے شمعِ شبستاں ہونا

ہم بھی یوں قول سے غالبؔ کے ہیں واقف لیکن
تا بکے حد سے بڑھے درد کا درماں ہونا

بات یہ ہے کہ ہیں آباد بھی برباد بھی ہوں
عقدۂ عشق کو دشوار نہ آساں ہونا

ذرہ اپنا بھی ہے خورشید قیامت لیکن
مجھے منظور نہیں چاک گریباں ہونا

وہ سیہ کارِ محبت ہوں میں واعظ کہ کبھی
قبلۂ دیں تو کبھی کعبۂ ایماں ہونا

غفلتیں دیکھ زمانے کی نہ دیکھا ہو اگر
گیسوئے شاہدِ ہستی کا پریشاں ہونا

کس طرح عشق کی مشکل کو کوئی سہل کرے
جس میں آساں کو بھی آیا نہیں آساں ہونا

نزع میں دادِ وفا مل گئی بیمارِ دل کو
تیری تاخیر کا تاخیر پشیماں ہونا

اور عالم ہے مری وادیٔ وحشت کا فراقؔ
اسے زنداں نہ بیاباں نہ گلستاں ہونا

(۳)

خود نما ہو کے نہاں چھپ کے نمایاں ہونا
الغرض حسن کو رسوا کسی عنواں ہونا

کبھی صحرا کبھی گلشن کبھی زنداں ہونا
اور عالم کو کبھی میرا گریباں ہونا

یوں تو اکسیر ہے خاکِ درِ جاناں لیکن
کاوشِ غم سے اُسے گردشِ دوراں ہونا

حدِ تمکیں سے نہ باہر ہوئی وہ برقِ نگاہ
آج تک آ نہ سکا حسن کو حیراں ہونا

چارہ گر درد سراپا ہوں مرے درد نہیں
باور آیا تجھے نشتر کا رگِ جاں ہونا

مجھ سے بچنا ہی ترا ٹھیک ہے اے دامنِ دوست
کیا تجھی کو ہے فقط میرا گریباں ہونا

دفترِ رازِ محبت تھا ملال دل پر
وہ سکوتِ نگہِ ناز کا پرساں ہونا

اب تو مجھ کو بھی مرے حال کا احساس نہیں
مشکلِ عشق مبارک تجھے آساں ہونا

رشکِ صد لطف و کرم ہے یہ نیرنگِ ستم
کچھ نہیں جان سکے تیرا پشیماں ہونا

اُف وہ نیرنگِ جنوں چاک گریبانوں کے
کبھی خنداں کبھی گریاں کبھی حیراں ہونا

اسے جو کچھ کوئی سمجھے اسے جو کچھ جانے
غمِ جاناں کو مگر کفر نہ ایماں ہونا

نگہِ شوخ نے چھیڑا ہے رگِ سازِ مجاز
دیکھ اب حسنِ حقیقت کا نمایاں ہونا

ہیں امیدیں بھی تغافل سے ترے گو ہیچ ہے
اسے ہمراز نہ دمساز نہ پرساں ہونا

کتنی بے لاگ لگاوٹ نگہِ ناز کی تھی
یوں ملی جیسے اسے درد نہ درماں ہونا

آج در پردہ جنوں سلسلہ جنباں ہے فراقؔ
کھل گیا گیسوئے پرخم کا پریشاں ہونا

رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری

مُصوّر

"جی ہاں! آج کل اس لطیف فن کی قدر ہی نہ رہی جبھی میں اس قدر غریب ہوں"۔ مصوّر نے ایک سرد آہ بھر کر اجنبی سے کہا۔ اجنبی نے کمرے کی ہر چیز کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔

کمرے کا بوسیدہ اور مختصر سا سامان مصوّر کی غربت کا آئینہ دار تھا۔ جو چیز تھی میلی، شکستہ اور بے ترتیب تھی اور زبان حال سے مصوّر کی پریشاں حالی کی داستان سنا رہی تھی۔ ایک کونے میں ایک چھوٹی سی ٹوٹی ہوئی الماری تھی جس میں موٹے کاغذ کے چند تختے، آٹھ دس کتابیں، تین چار شیشیاں اور چار پانچ ٹوٹے ہوئے ڈبے تھے۔ دوسری طرف دیوار کے ساتھ ایک چھوٹی سی کہنہ میز دھری تھی۔ اس پر چند شیشیاں دو ایک ڈبے تین پیالیاں اور آدھ درجن کے قریب برش منتشر حالت میں پڑے تھے۔ اور اس قدر گرد آلود جیسے مہینوں سے انہیں کسی نے چھوا بھی نہ ہو۔ میز کے ساتھ ہی ایک پرانی ٹوٹی ہوئی کرسی تھی۔ جس کی ایک ٹانگ تو تھی ہی نہیں اور دوسری نیم شکستہ تھی۔ ایک طرف چارپائی تھی جس پر پھٹے پرانے کپڑوں کا ایک ڈھیر تھا۔ کھڑکی کے پاس ایک گرد آلود شمعدان تھا اور اس کے پاس ہی ایک مٹی کا چراغ فرش پر الٹا گرا ہوا۔ ایک پرانی اور بوسیدہ دری جس میں متعدد سوراخ تھے کمرے کے وسط میں بچھی ہوئی تھی۔ اس پر گرد و غبار کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا مدت سے اس کمرے کو جھاڑو کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا ہو۔ دیواروں پر گرد سے ڈھکی ہوئی چند تصویریں تھیں جن کے اوپر اور ارد گرد مکڑیوں کے بے شمار جالے لٹک رہے تھے۔ چھت میں جا بجا گرد و غبار کی جھالریں آویزاں تھیں۔

اجنبی کمرے کی ہر چیز کو بغور دیکھتا ہوا اور مصوّر کی حالت کا جائزہ لیتا ہوا دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ اس وقت کمرے میں قبرستان کی سی خاموشی تھی۔ البتہ کبھی کبھی الماری کے پیچھے یا چارپائی کے نیچے کسی چوہے کے دوڑنے کی کھٹ کھٹ سے اس سکوت میں انتشار سا پیدا ہو جاتا تھا۔ یا چھت پر سے کسی چمگادڑ کی کرخت آواز اجنبی کی توجہ میں مخل ہوتی تھی جو کبھی مصور کی طرف دیکھتا اور کبھی حسرت بھری نگاہیں ادھر اُدھر دوڑاتا۔

مصوّر شرم سے گڑھا جا رہا تھا۔ اُس کی نمناک آنکھیں اجنبی کے سامنے نہ اٹھتی تھیں۔ دل میں تلاطم مچا ہوا تھا اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ شرمندہ تھا کہ وہ آج ایک اجنبی کے سامنے جو وضع قطع سے امیر معلوم ہوتا ہے کتنا ذلیل ہوا۔ سارا جسم پسینوں میں شرابور تھا اور خشک ہونٹوں پر بار بار زبان پھیرتا ہوا ٹھنڈی آہیں بھر رہا تھا۔

اجنبی نے ایک سگار سلگایا اور ایک لمبا کش لگاتے ہوئے مصوّر سے انتہائی ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ "اپنی تصویریں کسی نمائش میں کیوں نہیں بھیجتے؟"

مصوّر نے آنکھیں اجنبی کی طرف اٹھا کر پھر جھکا لیں اور خشک گلے کو کھانس کر تر کرتے ہوئے جواب دیا۔ "آج کل غریبوں کی کون پوچھتا ہے۔ ہر جگہ زر داروں کا بول بالا ہے"۔

اجنبی کے چہرے پر اطمینان کی جھلک سی نمودار ہوئی۔ اس نے سنجیدہ ہو کر جواب دیا۔ "درست ہے"۔

کمرے میں پھر ایک بار خاموشی چھا گئی۔ مصور کی آنکھیں زمین پر گڑھی ہوئی تھیں اور اجنبی ـــــ وہ سگار کے کش پر کش لگا رہا تھا اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے سر کے بال پریشان کر رہا تھا۔ جیسے کسی بھولی ہوئی بات کو ذہن میں لانے کی کوشش کر رہا ہو۔ آخر اس نے خاموشی کو توڑتے ہوئے پھر کہا۔ "آپ کو میری ایک تجویز منظور ہو تو میں امید کرتا ہوں کہ آپ اس مصیبت سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کر سکیں گے"۔

غریب مصوّر نے محسوس کیا کہ اجنبی کے ان الفاظ میں ہمدردی مہربانی اور امید مضمر ہے اُس نے شکریے کے طور پر سر جھکا کر کہا۔ "آپ کی عنایت ـــــ ارشاد!"

"میں تجارت پیشہ آدمی ہوں اور کم و بیش ہر شہر کے معززین میرے واقف ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میں اپنی شہرت اور رسوخ کی بدولت

آپ کی تصویروں کے لئے قدر دان خریدار پیدا کر سکوں گا۔ آپ سر دست میرے ہی مکان پر نگار خانہ قایم کر کے مستعدی کے ساتھ کام شروع کریں۔ فی الحال آپ کو پچاس روپے ماہوار دے سکوں گا۔ اس کے علاوہ رہائش اور کھانا مفت"۔

غریب مصوّر کے چہرے پر مسرت کی لہر سی دوڑی اور آنکھوں میں امید کی جھلک آگئی جیسے کالے بادلوں میں یکایک بجلی چمک اُٹھے۔ پچاس روپے ماہانہ! لمحہ بھر میں اُس کی امیدوں کی دنیا نئی روشنی سے چمک اٹھی۔ چشم تصور میں روشن مستقبل کا نقشہ بندھ گیا اور خشک ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑا اور اجنبی کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔ "منظور ہے"۔

اجنبی نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے جیب سے ایک ملاقاتی کارڈ اور دس روپے کا نوٹ نکالے اور مصور کو دیتے ہوئے کہا "یہ میرا پتہ ہے۔ اور یہ سفر خرچ۔ میں ایک ہفتے تک آپ کا انتظار کروں گا"۔ "بہت اچھا" مصوّر نے تشکر آمیز لہجے میں کہا اور ادب کے طور پر بیرونی دروازے تک اپنے محسن کے پیچھے پیچھے گیا۔

واپس آکر مصوّر نے اجنبی کا دیا ہوا کارڈ دیکھا۔ لکھا تھا "سیٹھ جمنا لال ملک النجار مال روڈ لاہور"۔

مصوّر گو غریب تھا۔ لیکن قدرت نے اُسے دلفریب حسن کی دولت عطا کی تھی۔ وہ جوان تھا اور خوبصورتی اس کے پھٹے پرانے کپڑوں میں سے پھوٹ پھوٹ کر نکلتی تھی جیسے بادلوں کے پیچھے سے چاندنی۔ اس کے چہرے میں قدرتی نور پرکشش، آنکھوں میں جادو اور آواز میں شیرینی تھی۔ ہر عضو سے ذہانت ٹپک رہا تھا۔ مصوری کا پیشہ اُسے ورثہ میں ملا تھا اور اس فن میں اُسے کافی دسترس اور پوری مہارت حاصل تھی۔ اگر وہ ترقی اور روشنی کی دنیا سے دور ـــــ ایک گاؤں میں پیدا نہ ہوتا اور وہ بھی ایک غریب کے ہاں تو شاید دنیائے مصوری میں اس کا نام بڑی عزت کے ساتھ لیا جاتا اور آج وہ بے شمار دولت اور عالمگیر شہرت کا مالک ہوتا۔ مگر اب ایک ایسے گاؤں میں جہاں اس کی حوصلہ افزائی کا ایک بھی ذریعہ موجود نہ تھا وہ فلاکت کے دن گزار رہا تھا۔ شاید اُسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ اس کے ہاتھ میں وہ جدت اور تخیل میں وہ بلندی موجود ہے جس سے مصوری کے لطیف فن کو چار چاند لگ سکتے ہیں۔ اُسے اس قسم کے وسائل بھی بہم نہ تھے کہ گاؤں سے نکل کر اِدھر اُدھر دوڑ دھوپ کر لیتا۔ ہاں البتہ جب دیوالی کے دن اس گاؤں کی ایک پہاڑی کے دامن میں میلہ لگتا اور لوگ نزدیک و دُور سے آکر یہاں جمع ہو جاتے تو یہ بھی سال بھر کی محنت کے دو چار بہترین نمونے لے کر وہاں چلا جاتا اور سو ڈیڑھ سو روپیہ کما لاتا۔ یہی اس کا واحد ذریعۂ معاش تھا۔

سیٹھ جمنا لال ایک مشہور امیر آدمی تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ڈیڑھ ایک کروڑ کے مالک ہیں۔ اپنے کئی کارخانے جاری تھے۔ متعدد کمپنیوں کے سرمائے میں ان کا حصہ تھا۔ اب کے جو نئی ریلوے سکیم مرتب ہوئی تھی اُس کا ٹھیکہ سیٹھ صاحب ہی کے نام منظور ہوا تھا۔ بڑی کمپنیوں کے مالک اِن کے قرضدار تھے۔ ان کا عالی شان مکان اور وسیع باغ قابلِ دید تھا۔ مال روڈ پر کی اکثر دکانیں انہی کی ملکیت تھیں۔

سیٹھ صاحب کی نسبت دو باتیں مشہور تھیں۔ ایک یہ کہ وہ بڑے طامع ہیں اور دوسرے یہ کہ انتہا درجہ کے خوددار ہیں۔ یہ دونوں باتیں بہت حد تک درست بھی تھیں۔ کیونکہ جہاں سیٹھ صاحب کی عمر ۶۵ سال سے بھی تجاوز کر گئی تھی۔ وہاں ان کی کاروباری سرگرمیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اب آخری وقت میں کمائی ہوئی دولت ہی پر اکتفا کر کے عاقبت کی فکر میں لگ جاتے خصوصًا جب ایک لڑکی کے سوا اُن کا کوئی وارث بھی نہ تھا۔ خودداری کا یہ حال تھا کہ اپنی عمر میں ان کا سر کسی کے سامنے نہ جھکا تھا۔ بے شمار دولت کمائی۔ لیکن کبھی کسی کی خوشامد نہ کی اور کسی کے زیر بارِ احسان نہ ہوئے۔ کوئی اُن کی ذات یا نیت پر حملہ کرتا تو اس سے بدلہ لئے بغیر دم نہ لیتے۔ اُن کے ناموس پر ذرا بھی حرف آجاتا تو شاید خودکشی پر آمادہ ہو جاتے۔

یہ سیٹھ صاحب کے طامع ہونے ہی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے اپنے مکان میں ایک نگار خانہ قایم کرنے کی ٹھان لی تھی اور غریب مصور کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرنے کا دراصل مطلب ہی یہ تھا کہ اُسے دولت کمانے کا آلۂ کار بنایا جائے۔ گو اس میں اُس کا فایدہ بھی ضرور تھا۔

سیٹھ جمنا لال کی نظرِ التفات اس غریب اور گمنام مصور ہی پر کیوں پڑی۔ اس میں بھی ایک راز تھا۔ جب وہ گزشتہ مہینے کسی کاروباری سلسلے میں بمبئی گئے تو حسبِ معمول ایک پرانے دوست چودھری رام لال کے ہاں اُترے۔ چودھری صاحب مصور تو نہ تھے۔ لیکن اس فن کے بڑے دلدادہ تھے۔ یوں تو وہ پہلے ایک متوسط الحال آدمی تھے لیکن اب کے ان کی کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ وہ ایک ہی سال میں اِتنے امیر ہو گئے تھے کہ ایک اچھی خاصی

کوٹھی تیار کر لی تھی اور نوکر چاکر بھی رکھ لئے تھے۔

ایک رات کو چودھری جی نے باتوں باتوں میں سیٹھ صاحب کو بتایا کہ انہوں نے اس سال آل انڈیا آرٹس اگزیبیشن میں ایک گمنام مصوّر سے خریدی ہوئی تصویر کی بدولت پچاس ہزار روپے کا انعام حاصل کیا۔ سیٹھ صاحب کب چوکنے والے تھے۔ جلنے نے دل ہی دل میں چٹکیاں لیں آخر انہوں نے کرید کرید کر باتیں کرتے ہوئے مصوّر کا پتہ پوچھ ہی لیا۔ اور یہ سُن کر اُن کی حیرانی کی حد ہی نہ رہی کہ یہ گمنام مصوّر اُن کے اپنے وطن کے ملحق ہی ایک گاؤں میں رہتا ہے اور اس کا نام گوپال ہے۔

سیٹھ جمنالال صبح کے وقت اپنے صحن کے باغیچے میں گئے۔ اس وقت نسیم سحری کی سُبک خرامی ماحول میں ہلکا سا تبسم پیدا کر رہی تھی۔ خوشبو ہوا کے کندھوں پر اٹکھیلیاں کرتی ہوئی چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ سورج کی شعاعیں پھولوں کا عطر کھینچ رہی تھیں۔ نوخیز کلیاں گھونگھٹ کھول کر نمایش حُسن میں مصروف تھیں اور خوش الحان پرندوں کے نغمے فطرت کو وجد میں لا رہے تھے۔ سیٹھ صاحب ایک روش سے دوسری روش کو کچھ گنگناتے ہوئے مستانہ وار ٹہل رہے تھے۔ اتنے میں صحن کا دروازہ کھلا اور ایک حسین نوجوان میلے کچیلے کپڑے پہنے اندر آیا۔ سیٹھ صاحب نے گوپال مصوّر کو جھٹ پہچان لیا اور اسے اپنی آراستہ بیٹھک میں لے گئے۔

دونوں آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ دروازے کی طرف سیٹھ صاحب کی پیٹھ تھی اور گوپال کا مُنہ۔ اِدھر اُدھر کی موسمی گفتگو کے بعد معاہدہ کا ذکر چھڑ گیا۔ گوپال بار بار سیٹھ صاحب کی مہربانیوں کا شکریہ ادا کر رہا تھا اور سیٹھ صاحب اسے محض انسانی فرض بتا کر اپنی کسرِ نفسی کا ثبوت دے رہے تھے۔ آخر سیٹھ صاحب گوپال کے لئے ملازمت کا حکمنامہ لکھنے لگے۔

اسی وقت ایک دوشیزہ حسن کی تمام دلفریبیوں میں لپٹی ہوئی جھک کے دروازے پر آکر ٹھٹھک گئی۔ وہ مسکراہٹ کے پھول بکھیر رہی تھی۔ اُس کے کالے اور لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ موٹی موٹی ساغر نما آنکھوں میں محبت کا سرمہ جھلک رہا تھا۔ ہر ادا سے شباب کی مستی ٹپک رہی تھی اور ہونٹ گلاب کی پتیوں کی مانند سرخ اور شگفتہ تھے۔ اس کی نظریں گوپال پر پڑیں تو پھول سے چہرے پر دفعتہً سرخی سی دوڑی اور دل میں میٹھی سی خلش محسوس ہوئی۔ جیسے کسی نے اس پر جادو سا کیا ہو۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اُس کے دل کی گہرائیوں میں سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کر دیا ہو۔ گوپال نے بھی دوشیزہ کی ترچھی نگاہوں کا اپنی دزدیدہ نظروں سے مقابلہ کیا تو اُس کے سارے جسم میں میٹھی سی حرارت پھیلی۔ دل میں گدگدی سی پیدا ہوئی اور اُسے ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے کسی نے اُس کے دل کا سکون لوٹ لیا ہو۔ دوشیزہ کی گردن پانی کی لہر کی طرح بل کھا کر جھک گئی۔ پھر وہ دفعتہً دبے پاؤں دروازے سے ہٹ گئی۔ جیسے چاند اپنا جلوہ دکھا کر بادلوں میں چھپ جائے۔ مصوّر کی آنکھیں اُسی طرف کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔

سیٹھ صاحب حکمنامہ لکھنے میں مشغول تھے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ اُن کی پیٹھ کے پیچھے اور منہ کے سامنے کیا کیا گُل کھلے۔

سیٹھ جمنالال کے مکان کے ساتھ ہی ایک وسیع باغ تھا جس میں اُس نے ایک دو طبقہ دیوانخانہ بنوایا تھا اور جہاں وہ کبھی کبھی گھر کے شور و غل سے دُور ۔۔۔ تنہائی میں بیٹھ جاتے اور اپنے کاروبار کی نسبت پیچیدہ باتیں سوچ لیا کرتے۔ اسی دیوانخانے کی پہلی منزل میں نگار خانہ قائم ہوا اور سیٹھ صاحب نے مصوّر کو ہدایت کی کہ وہ ایک ماہ کے اندر اندر ایک ایسی تصویر تیار کرے جو اس کا شاہکار ہو۔ اور جب تک یہ مکمل نہ ہو جائے وہ نگار خانے سے باہر قدم نہ رکھے۔ گوپال کو کسی چیز سے واسطہ نہ تھا۔ روٹی وغیرہ سیٹھ صاحب کا ملازم وقت پر وہیں لے آتا۔ وہ صبح اور شام کے وقت اکثر تصویر کشی میں منہمک رہتا اور کبھی کبھی دن میں تھوڑی دیر کے لئے باغ کی سیر سے فرحت حاصل کرتا۔ یا چارپائی پر آنکھیں بند کئے ہوئے کچھ سوچنے لگتا۔ یہاں تک کہ تصور کی دنیا میں گم ہو جاتا۔ سچ پوچھئے تو وہ سیٹھ صاحب کا بے زنجیر قیدی تھا۔

گوپال نے اُس واقعے کو بھول جانے کی بہت کوشش کی۔ جو سیٹھ صاحب کے مکان میں قدم دھرتے ہی اُس کے پیش آیا تھا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے محسن کے ساتھ غداری کرے اور اُس کی مہربانیوں کا یہ بدلہ دے کہ اُس کی لڑکی کے عشق کا دم بھرے۔ لیکن ۔۔۔ وہ اس میں بالکل ناکام رہا۔ کیونکہ اُس حُسن اور شباب کے تڑپتے ہوئے مجسمہ کی محبت آنکھوں سے اتر کر دل کی گہرائی میں پہنچ چکی تھی اور خون کے ساتھ تحلیل ہو کر رگ رگ میں سما چکی تھی۔ وہ اُس کی یاد میں محو ہو جاتا اور پھر اٹھ کر جھومنے لگتا۔ رات کو اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ حسینہ اُس کے سرہانے کھڑی نور بکھیر رہی ہے۔ اور اپنے تبسم سے ماحول کو وجد میں لا رہی ہے۔

اُسے اپنی حالت کو بھی پورا پورا احساس تھا۔ گو اس نے ساری

عمر عزت میں گزاری تھی لیکن اسے اس طرح چار دیواری میں نظر بند رہنے کا کبھی موقع نہ ملا تھا۔ سیٹھ صاحب نے اسے مکان اور باغ سے باہر قدم رکھنے سے کیوں منع کیا۔ یہ اس کے لئے ایک معما تھا۔ کبھی کبھی اسے خیال ہوتا کہ شاید وہ اس قید سے کبھی آزاد نہ ہو سکے گا اور وہ گھبرا سا جاتا۔ اس نے کئی دفعہ وہاں سے بھاگ نکلنے کا تہیہ کر لیا۔ لیکن پھر اسے کوئی خیال سا آ جاتا اور وہ اپنا ارادہ ترک کر دیتا۔

سیٹھ جمنالال کی لڑکی رادھا اکثر شام کے وقت باغ کی سیر کے لئے نکلتی اور دیر تک وہیں گلگشت میں مصروف رہتی۔ وہ عموماً ایک سرو کے درخت کے نیچے بیٹھ جاتی جو اس نگار خانے کے بالکل قریب تھا جہاں اس وقت گوپال دین و دنیا سے بے خبر تصویر کشی میں محو ہوتا۔ وہ درخت کے سایہ سے اسی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتی اور کسی خیال میں کھو سی جاتی۔ کبھی کبھی اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا اور آنکھیں موتی پروتیں۔ اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ کوئی قیمتی چیز کھو بیٹھی ہے۔

جب ہر طرف شام کا دھندلکا پھیل جاتا۔ تاریکی ہر سو روشنی کا تعاقب کرنے لگتی اور ہر چیز اندھیرے میں گم ہو جاتی تو وہ اٹھ کر دبے پاؤں نگار خانے کے پاس جاتی اور کھڑکی کی چلمن سے اندر جھانکتی۔ اس کی نظریں سیدھی اس تصویر پر پڑتیں۔ جسے گوپال سب کچھ بھول کر کھڑکی کی طرف پیٹھ کئے روشنی کے سامنے تیار کرنے میں ہمہ تن مصروف ہوتا۔ وہ دفعتہً چونک سی پڑتی۔ اس کے چہرے کی رنگت بدل جاتی اور دل بلیوں اچھلنے لگتا۔ پھر لمبے لمبے سانس بھرتی اور مڑ مڑ کر دیکھتی ہوئی لوٹ آتی۔ اس وقت اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اس سے کوئی پیاری چیز چھینی جا رہی ہے۔

سیٹھ جمنالال چاہتے تھے کہ تصویر جلد تیار ہو جائے کیونکہ آل انڈیا آرٹس اگزیبشن عنقریب کلکتہ میں منعقد ہونے والی تھی۔ جب دوپہر کو گوپال روٹی کھانے کے لئے دالان میں نکلتا تو سیٹھ صاحب اکثر اس کے پاس جاتے اور تصویر کی نسبت دریافت کر لیتے۔ انہوں نے نگار خانے میں جانے کی کبھی کوشش نہ کی۔ کیونکہ گوپال نے انہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ تصویر کو تکمیل سے پہلے دکھانا قواعد فن مصوری کے خلاف ہے جب گوپال انہیں اطمینان دلاتا کہ تصویر مقررہ وقت پر ضرور مکمل ہو جائے گی تو ان کے چہرے پر مسرت کی جھلک نمودار ہو جاتی اور وہ نہایت فراخ دلی کے ساتھ معقول انعام کا وعدہ کرتے جب پورے تیس دن گزر گئے تو سیٹھ صاحب شام کے وقت باغ میں گئے اور گوپال کو باہر بلایا۔ گوپال کے آتے ہی سیٹھ صاحب نے بے تابی سے پوچھا۔ "کیوں! تصویر تیار ہو گئی؟ آج آخری دن ہے۔" "جی ہاں" گوپال نے اطمینان اور سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ "میں اسے کب دیکھ سکوں گا؟" سیٹھ صاحب نے پھر پوچھا۔ "کل صبح" گوپال نے جواب دیا۔

گوپال نگار خانے میں واپس آیا تو تصویر کے سامنے بیٹھ کر اپنی قابلیت کو خود سراہنے لگا۔ وہ اپنی کامیابی پر بے حد خوش تھا۔ کیونکہ اس کے خیال میں اس کا شاہکار تیار ہو چکا تھا۔ اس کی انتہائی رعنائی اور دلکشی کو دیکھ کر وہ خود شک کرنے لگا کہ آیا ایسی لطیف اور حسین چیز واقعی اسی کے تخیل کا نتیجہ ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ سارا ماحول مسکرا رہا ہے اور اس کے درمیان وہ تصویر بھی مسکرا رہی ہے ۔۔۔ تب ۔۔۔ گوپال خود بھی مسکرا دیا۔

علی الصبح جب مرغ سحر نے کائنات کو بیداری کا پیغام سنایا۔ سیٹھ صاحب بستر استراحت سے اٹھے اور سیدھا نگار خانے کا رخ کیا۔ وہاں پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ گوپال اس وقت تصویر کے سامنے بیٹھا کچھ گنگنا رہا تھا۔ آواز سن کر چونک سا پڑا۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سیٹھ صاحب نے اندر آ کر بے تابی کے ساتھ پوچھا۔ "تصویر کہاں ہے؟" گوپال نے آگے بڑھ کر تصویر پر سے پردہ اٹھا لیا اور داد لینے کی خاطر سیٹھ صاحب کے سامنے فاتحانہ انداز کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

سیٹھ صاحب نے تصویر پر نظر ڈالی تو دھک سے رہ گئے۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ غصہ سے سارے جسم میں ارتعاش پیدا ہوا اور سانس پھولنے لگا۔ نتھنے پھڑکنے لگے اور ہونٹ خزاں زدہ پتوں کی مانند ہلنے لگے۔ انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے انہیں کنوئیں میں دھکیل دیا ہو۔ انہوں نے خشم آلود نگاہوں سے گوپال کی طرف دیکھا جیسے ایک خونخوار شیر بکری کو تک رہا ہو۔ لیکن گوپال ہنس رہا تھا اور اپنی مست نگاہوں سے تصویر کی طرف ٹکٹکی باندھے کھڑا تھا۔

سیٹھ صاحب کے غصے کو وہ بالکل نہ سمجھ سکا۔ اسے خود معلوم نہ تھا کہ عشق کی بے خودی میں اس نے ان کی بیٹی رادھا کو اپنے شاہکار کا موضوع بنا رکھا تھا اور یہ تصویر اسی کی تھی۔

دیناناتھ داریکو شاہد کاشمیری

جرمِ سنگین

چھوڑ اے دوست خیالی باتیں — دل بہلانے والی باتیں
اپنے نہیں یہ بیگانے ہیں — مال و زر کے دیوانے ہیں
یہ سرمایہ دار ہیں سارے — دولت کے بیمار ہیں سارے
اپنی دُھن میں جھوم رہے ہیں — عیش کے پاؤں چوم رہے ہیں
اُن کے شیشوں میں جو مے ہے — جانتا ہے تو یہ کیا شئے ہے
رنگِ ہوس کی گلکاری ہے — نشہ نہیں ہے بیماری ہے

دیکھ غریبوں کو تو جا کر — بیٹھے ہیں کیا ناوک کھا کر
چہرے زرد، لبوں پر آہیں — اشکوں سے نمناک نگاہیں
فاقوں سے یہ حال ہوا ہے — جینا ایک وبال ہوا ہے
راہ قضا کی دیکھ رہے ہیں — شان خدا کی دیکھ رہے ہیں
دیکھ کے حال اِن مظلوموں کا — بھولے بھالے معصوموں کا
روحِ سکوں مضطر ہوتی ہے — چرخ کی آنکھ لہو روتی ہے
پتھر کا دِل موم بھی گر ہو — بے رحموں پر کچھ نہ اثر ہو
عیش کی گود میں جو سوتا ہے — کیا جانے غم کیا ہوتا ہے

اُن کا جرم معاف نہ ہوگا
ہوگا تو انصاف نہ ہوگا

خاور

دنیائے ادب

ادبیات سنہ ۱۹۳۶ء میں

تمام متمدن دُنیا کی پورے سال بھر کی ادبیات کا جائزہ لینا سمندر کی لہروں کو گننا ہے۔ کیونکہ نئی کتابوں کا کوئی شمار نہیں ہو سکتا۔ اور ادبی تحریکات سیاسی واقعات کی طرح نمایاں نہیں ہوتیں۔ وہ عموماً معاشرت یعنی سوسائٹی کی سطح کے نیچے کام کرتی ہیں۔ اور بہت مدت کے بعد ابھرتی ہیں۔ سالِ گذشتہ میں ادبی دنیا کی کیفیت اور حالات پر سرسری نظر ڈالنے سے کسی ایسی تحریک کا سراغ نہیں ملتا۔ جس کو خاص طور پر اس سال سے منسوب کیا جا سکے۔ اور نہ اس سال کے اندر بڑے مصنفین کی فہرست میں کسی نئے نام کا اضافہ ہوا۔ یورپ میں عام ادبیات کی روش وہی ہے۔ جو جنگِ عظیم کے بعد سے رہی ہے۔ جنگ کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ تمام دُنیا کے تجارتی، مالی اور معاشرتی انتظام میں خلل پیدا ہو گیا۔ سوسائٹی کے بعض طبقوں میں افلاس اور بے کاری بڑھ گئی اور اس کی وجہ سے وہ مخالفت جو سرمایہ دار اور مزدور جماعتوں کے درمیان پہلے سے موجود تھی اور زیادہ سخت ہو گئی۔ لیکن تعلیم یافتہ آدمیوں کو جنگ کے نتائج میں سے جس چیز کا سب سے زیادہ خیال پیدا ہوا وہ لاکھوں جانوں کا نقصان تھا۔ اور اس خیال کی وجہ سے ان کے دلوں میں امن پسندی اور صلح جوئی کے جذبات اور قوی ہو گئے۔ چونکہ کتابوں میں وہی باتیں لکھی جاتی ہیں جو انسان اپنے دل میں سوچتے ہیں۔ ان خیالات اور جذبات کا عکس یورپ کے ادبیات میں پایا جاتا ہے۔ ادبی مقاصد مختلف زبانوں میں مختلف ہوتے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں ادب کو سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی مسائل کی آمیزش سے پاک رکھنے کا خیال بہت عام تھا۔ لیکن اب یہ بات نہیں ہے۔ اور ہر قسم کی ادبی تصانیف یہاں تک کہ شاعری، ناول اور ناٹک میں بھی ان تمام سوالات سے آگاہی اور دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ جو یورپ کے اپنے معاشرتی اقتصادی اور سیاسی زندگی کی جدید تنظیم میں درپیش ہیں۔ انیسویں صدی کے مقابلے میں آج کل کے ادبی مقاصد کا ایک اور اہم اختلاف یہ ہے کہ اب عقل اور عقل کے بنائے ہوئے سائنس پر اتنا بھروسہ نہیں کیا جاتا جتنا اس وقت کیا جاتا تھا۔ بلکہ عقل کے ساتھ وجدان کو بھی جگہ دی جاتی ہے جس کو ان تمام فطری محرکات کا مجموعہ خیال کرنا چاہیئے۔ جو انسان اور دوسرے حیوانات میں مشترک پائے جاتے ہیں۔ یا جو انسان کے لئے مخصوص ہیں۔ ان محرکات میں ایک نہائت زبردست محرک جنسی کشش ہے۔ یعنی عورت اور مرد کا فطری لگاؤ جس پر یورپ کے مصنف اب ایسے کھلے الفاظ میں گفتگو کرتے ہیں جو انیسویں صدی میں خلافِ تہذیب اور خلافِ اخلاق خیال کئے جاتے۔ اس بارے میں جس مصنف کا انگریزی ادبیات پر سب سے زیادہ اثر پڑا وہ D. H. Lawrence ہے۔ اور لارنس کی وفات کو چھ سال سے زیادہ گزر گئے۔ لیکن اس کی نظم و نثر کا اب بھی بہت چرچا ہے اور ہر سال اس کے متعلق نئی نئی کتابیں نکلتی رہتی ہیں ۱۹۳۶ء میں اس کے متفرق مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے۔ جن میں سے اکثر اس کی اپنی زندگی میں اشاعت سے محروم رہ گئے تھے۔ اس مجموعے کا نام Phoenix ہے اور اس میں بہت سے ایسے مضامین ہیں۔ جن کو Lawrence کے فلسفۂ حیات اور اسلوبِ بیان کا بہترین نمونہ خیال کیا جا سکتا ہے۔

انگریزی زبان کے ایک مشہور ادیب و شاعر W. B. Yeats کا قول ہے کہ گذشتہ پچاس سال میں انگلستان میں شاعری کا جتنا زور رہا ہے وہ سوائے سترہویں صدی کے نصف اوّل کے اتنی مدت میں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ خود Yeats کے علاوہ جن شعراء کے کلام پر ۱۹۳۶ء میں سب سے زیادہ توجہ کی گئی ہے۔ ان میں Robert Bridges خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اگرچہ انہوں نے اس سال کے اندر اپنی کوئی نئی اہم نظم شائع نہیں کی۔ لیکن سال کے شروع میں ان کی نظموں کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا۔ Bridges کی شاعری میں علاوہ بعض فنی جدتوں کے اس زمانے کی تمام ادبی، علمی اور معاشرتی تحریکات کی جھلک موجود ہے۔ اور یہ اثر یورپ اور امریکہ سے گزر کر مشرق میں بھی محسوس ہوا ہے ہمارے ملک

میں بنگال کے بعض شاعر جو دیسی شعراء کی بہ نسبت مغربی ادبیات سے
زیادہ باخبر معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً سدھیندرا ناتھ دتا، مسٹر پریم اندرا ناتھ مترا
اور مسٹر سمر سین [illegible] کی شاعری سے بہت متاثر معلوم ہوتے
ہیں۔ یورپ میں ناول نئے خیالات کی ترجمانی اور اشاعت کا ایک بہت
مفید ذریعہ قرار پا گیا ہے۔ اور بہت کم ناول ایسے لکھے جاتے ہیں۔ جن کا قصہ
سے زیادہ کوئی مقصد نہ ہو۔ انگلستان میں گذشتہ سال جتنے ناول شائع
ہوئے۔ اُن میں Sparken Broke کا Morgan
اور Eyeless in Gaza کا Mr. Aldous Huxley
بعض لحاظ سے شاید سب سے زیادہ وقیع خیال کئے جا سکتے ہیں۔

Mr. Morgan کا ناول بظاہر حسن و عشق کی ایک داستان
ہے لیکن اس کے ضمن میں شاعر طبع انسان کی ذہنیت کا جو خاکہ کھینچا گیا ہے
وہ بہت سے باریک فلسفیانہ پہلو رکھتا ہے۔ اور Mr. Aldous Huxley
کے ناول کے متعلق یہ کہنا دشوار ہے کہ اس زمانہ میں سیاسی، معاشرتی اور
معاشی مسائل میں سے کونسا ایسا مسئلہ ہے جس کا کچھ ذکر اس کتاب میں موجود
نہ ہو۔ اگرچہ ناول کی ایجاد کا فخر انگلستان کو حاصل ہے لیکن زمانۂ حال میں اس
کے بہترین نمونے غالباً اور ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر
میں فرانس اور روس کے ناول نویسوں کی بہت شہرت تھی۔ اس لئے یہ دیکھنا
چاہیئے کہ ۱۹۳۶ء میں ناول نویسی کے فن میں ان ملکوں کا کیا پایہ ہے۔
فرانس میں Flaubert اور Balzac کے زمانے سے Realism
یعنی واقعیت کا تسلط رہا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ قصہ کے پیرائے میں روزمرہ
زندگی کی تصویر پیش کی جائے جس میں زندگی کا سیاہ و سفید یعنی سب اچھی
اور بری چیزیں یکساں نمایاں ہوں۔ گذشتہ سال فرانس میں جو معرکۃ الآرا
ناول شائع ہوئے ہیں۔ اُن میں یہ رنگ بدستور قائم ہے۔ ان میں شاید سب
سے زیادہ دلچسپ ناول Jules Romain کا ضخیم ناول
Men of good will ہے جس کے بعض حصے گذشتہ سال
اور بعض اس سے قبل شائع ہوئے تھے۔ جن میں بہت سے مردوں اور عورتوں
کے کردار ہیں۔ جن کو اس زمانہ کے شہر پیرس کے باشندوں کی تصویریں خیال
کیا جا سکتا ہے لیکن چونکہ ابھی مصنف نے اپنے قصے کو پورا نہیں کیا۔ اس لئے
یہ کہنا دشوار ہے کہ اس کا اصلی مقصد کیا ہے۔ واقعیت کے اس غلبہ کے خلاف
بغاوت کے بھی کچھ آثار فرانس میں نمودار ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں کئی
ایسے ناول بھی شائع ہوئے۔ جن کے مصنفین نے جو عموماً نئی پود کے لوگ ہیں۔
واقعات حاضرہ سے قطع نظر کر کے یا تو محض خیالی افسانے لکھنے کی کوشش
کی اور اپنے ملک کی گذشتہ معاشرت اور پرانی عمارتوں کو اپنے قصوں کی بنیاد قرار
دیا۔ موجودہ دور کی اُلجھنوں سے مخلصی حاصل کرنے کا ایک طریقہ گذرے ہوئے
زمانے کی یاد اور دور افتادہ ملکوں کی سیر بھی ہے۔ اور اس پر سفرناموں اور تاریخی
افسانوں کی دلچسپی قائم ہے۔ ۱۹۳۶ء کے بہترین تاریخی افسانے غالباً مشہور جرمن
مصنف Feucht Wanger اور اسکے ہم وطن Thomas Mann
کی وہ تصانیف ہیں۔ جن کا ماخذ یہودیوں کی پرانی تاریخ ہے۔ یہ دونو مصنف یہودی
نسل سے ہیں۔ جنہوں نے جرمن حکومت کی موجودہ سیاسی روش کے دباؤ سے
ترکِ وطن کیا ہے۔ اس سیاسی روش اور فلسطین میں عربوں کی مخاصمانہ
جدوجہد کی وجہ سے یہودیوں کی روایات، اُن کی تاریخ اور اُن کے مستقبل میں
یورپ کی دلچسپی از سر نو تازہ ہو گئی ہے۔ اور ۱۹۳۶ء میں یورپ اور امریکہ میں بہت
سی کتابیں ان مضامین کے متعلق شائع ہوئی ہیں۔ جن میں سے بعض یہودیوں کے
موافق اور بعض اُن کے مخالف ہیں۔

روسی افسانہ نگاری کا آخری مشہور علمبردار M. Gorky تھا۔
جس کا ابھی حال میں انتقال ہوا ہے۔ گورکی اگرچہ روس کے موجودہ اشتراکی خیالات
کا معتقد اور Stalin کا ذاتی دوست تھا۔ لیکن اس کی بہترین تصانیف
اس معاشرت اور تمدن سے متعلق تھیں۔ جس کو بالشویکی انقلاب نے فنا کر دیا
ہے۔ انقلاب کے بعد سے روسی ادبیات بالشویکی عقائد کی تبلیغ کے لئے وقف ہو
گئی ہیں۔ اور کسی ایسے مصنف یا تصنیف کا نام لینا دشوار ہے جس نے سالِ
گذشتہ میں کوئی خاص امتیاز حاصل کیا ہو۔ دراصل اشتراکیت کسی قسم کے
بھی غیر معمولی امتیاز کو پسند نہیں کرتی۔ اور اس کے حامیوں کا یہ خیال ہے کہ
آئندہ اور صنعت و حرفت کے مانند تصنیف و تالیف بھی باہمی تعاون کے اصول
پر کی جائے۔ یعنی یہ کہ کوئی کتاب ایک آدمی کی بنائی ہوئی نہ سمجھی جائے۔ بلکہ
اس کے بنانے میں بہت سے آدمیوں کا ہاتھ ہو۔ جہاں تک مزدوروں اور
کسانوں کی تنظیم کا تعلق ہے۔ روسی خیالات کا اثر دور دور کے ملکوں پر پڑا ہے۔
۱۹۳۶ء کے آغاز سے امریکہ کی ادبیات خصوصاً مختصر افسانوں میں اشتراکی
خیالات کا بہت اثر پایا جاتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ جنگ سے
پہلے امریکہ ایک مالدار ملک سمجھا جاتا تھا۔ لیکن تجارتی اور مالی نظام کی برہمی نے
وہاں بھی افلاس اور بیکاری کا ناگوار مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ اور لحاظ سے بھی
امریکہ کی ادبیات میں وہی سب میلانات پائے جاتے ہیں جن کا یورپ میں
سراغ ملتا ہے۔ اور براعظم کے مصنفین میں Eugene O. Neill

کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس کے مختلف ناٹکوں کی شہرت ۱۹۲۰ء سے سنی جاتی ہے۔ لیکن حال میں نوبل پرائز کے مل جانے سے اس شہرت پر مہرِ ثبوت لگ گئی ہے۔ امریکہ کے مقابل بحرالکاہل کے دوسرے ساحل پر بھی روس کے اشتراکی عقائد کا کچھ پرتو دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ چین کے نوجوان مصنفین کے جو ترجمے یورپین زبانوں میں شائع ہوئے ہیں۔ ان میں یہ میلان خاصہ نمایاں ہے۔

انگلستان، فرانس اور جرمنی کے علاوہ یورپ کے اور ملکوں میں بھی ادبیات کو سیاسی، مذہبی اور معاشرتی معاملات سے کافی دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ اور جس طرح تہذیب و تمدن کے ظاہری کوائف کے اعتبار سے مغربی دنیا کی سب اقوام ایک دوسرے سے مشابہ معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح ان کے خیالات میں بھی ایک حد تک یگانگت پائی جاتی ہے۔ اُن ملکوں کے وہ مصنفین جو گذشتہ بیس پچیس سال میں ادبی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ (مثلاً ناروے کی مشہور ناول نویس Segreed Undset یا اٹلی کا ڈرامہ نویس Pirandello) ۳۶ء میں بھی بیکار نہیں رہے۔ لیکن ان کی کوئی تصنیف بھی جو اس سن میں شائع ہوئی ہے۔ اُن کے اسلوبِ تحریر میں کسی نئے پیرائے کا آغاز یا اُن کی شہرت میں کوئی خاص اضافہ نہیں کرتی۔

مغربی ادبیات کا ایک رُجحان جو ہمارے لئے خاص طور پر دلچسپ ہے۔ مشرق اور مشرقی خیالات کا ذوق ہے۔ جو اب کئی سمت میں دکھائی دیتا ہے۔ ۳۵ء میں کرنل لارنس کی Seven Pillars of Wisdom نے جو ہل چل ادبی دُنیا میں پیدا کر دی تھی۔ وہ اس ذوق کا بیّن ثبوت ہے اور اس وقت سے لے کر آج تک اس کتاب کی مانگ برابر بڑھ رہی ہے۔ ۳۶ء میں بھی جن سفرناموں نے زیادہ مقبولیت حاصل کی اُن میں مشرقی سیاحت کی کتابوں کی تعداد غالب معلوم ہوتی ہے۔ یورپ میں مشرقیت کا شوق کوئی نئی چیز نہیں۔ لیکن پہلے یہ شوق صرف خاص لوگوں تک محدود تھا۔ اب عوام کو بھی اس سے دلبستگی ہوتی جاتی ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ یورپ کے بعض ایسے لوگ جن کو جدید ترین خیال کا ترجمان خیال کیا جا سکتا ہے۔ مشرقی نظریات خصوصاً مشرقی روحانیات کو مہذب انسانوں کی دماغی تربیت کے لئے مفید خیال کرنے لگتے ہیں۔ Mr. Bernard Shaw اور Mr. Aldous Huxley جیسے ہر دلعزیز لکھنے والے بھی اب اپنی تصنیف کو مشرقی سامانِ آرائش سے مزیّن کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے اور بعض کم عام پسند مصنّفین تو مشرقی خیالات کے بہت ہی گرویدہ معلوم ہوتے ہیں۔ مشرقیت کے ذکر نے مجھے Rudyard Kipling کی وفات کی یاد دلا دی۔ جو ۳۶ء کے شروع دنوں میں واقع ہوئی تھی۔ Kipling گو چند سال سے تصنیف و تالیف کو عمداً ترک کر چکے تھے تو بھی انگلستان کے ادبی حلقوں اور انگلستان کے باشندوں کے دل میں اُن کی خاص جگہ تھی۔ ان کا اکثر ادبی سرمایہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے تجربہ سے فراہم کیا گیا تھا۔ اور اگرچہ اس ملک کی تعلیم یافتہ جماعت ان کی کہانیوں اور نظموں کو نسلی تعصّب کی وجہ سے ناپسند کرتی تھی۔ لیکن ہم کو یہ بات نہ بھولنی چاہیئے کہ ایک مدت تک انگلستان کے طبقہ عوام کو ہندوستانیوں کا جو کچھ بھی علم تھا۔ وہ ان ہی کہانیوں اور نظموں کی بدولت تھا۔

"ساقی"

(پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب ایم اے آئی ای ایس)

رُباعی

دل کس کی جانب رجوع ہوتا ہوں میں
ستانہ قدس پر خضوع ہوتا ہوں میں
جب مہر مبیں غروب ہو جاتا ہے
پیمانہ بکف طلوع ہوتا ہوں میں

(جوشؔ)

"کلیم"

ترانۂ بہار

پھر دامنِ صبا میں ہے مے خانہ آج کل — پھر ہر نفس ہے گردشِ پیمانہ آج کل
پھر عقل میں ہے عنصرِ وحشت کی خواجگی — پھر فقر میں ہے شوکتِ شاہانہ آج کل
پھر جوش پر ہے موسمِ برنائیِ جمال — پھر باڑھ پر ہے عشوۂ ترکانہ آج کل
پھر صدرِ بزمِ حسن ہے عشقِ زمانہ سوز — پھر کارسازِ شمع ہے پروانہ آج کل
پھر لائقِ سجود ہے مینائے زرنگار — پھر قابلِ طواف ہے خمخانہ آج کل
پھر فرش پر ہے جلوۂ افلاک ان دنوں — پھر عرش پر ہے نعرۂ مستانہ آج کل
پھر زندگی زمان و مکاں پر ہے حکمراں — پھر وقت میں ہے خوئے غلامانہ آج کل
پھر ہر خدا پرست ہے آوارۂ بتاں — پھر ہر خرد فروش ہے دیوانہ آج کل
پھر ہر روش ہے ایک گلستانِ زلف و رخ — پھر ہر کلی ہے ایک صنم خانہ آج کل
پھر ہر کلہ ہے تاجِ ملوکانہ ان دنوں — ہر ہر خزف ہے گوہرِ یک دانہ آج کل
پھر ہر غلامِ دہر ہے آقائے بحر و بر — پھر ہر کنیزِ شہر ہے سلطانہ آج کل
پھر شادماں ہے جذبۂ گستاخ ان دنوں — پھر کامراں ہے جرأتِ رندانہ آج کل

جس پر نثار کون و مکاں کی حقیقتیں
پھر کہہ رہا ہے جوش وہ افسانہ آج کل

(جوش) "کلیم"

نقد و نظر

جواہرِ سخن جلد دوم

جواہرِ سخن اردو شعرا کے کلام کا انتخاب ہے جسے فاضل ادیب اور شاعر مولوی محمد امین صاحب چریاکوٹی نے چھ جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ جلد دوم اُس دورِ شاعری پر مشتمل ہے جو ۱۱۵۰ھ سے شروع ہو کر ۱۲۵۰ھ کے قریب ختم ہوتا ہے۔ اس میں ۳۸ اساتذہ اور دوسرے قابلِ ذکر شعرا کے مختصر حالات اور انتخاب کلام درج ہے اور تقریباً ساڑھے آٹھ سو صفحات پر ختم ہوئی۔ شاعری کی تاریخ میں یہ دور بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ میر، سودا، درد، میر حسن، جرأت، انشا، مصحفی، شاہ نصیر، قائم جیسے باکمال شعرا کا زمانہ تھا، جنہوں نے اردو شاعری میں ترقی اور نشو و نما کی روح پھونک دی، زبان کو مانجھا اور وسعت دی، مختلف اصنافِ سخن کو اردو میں ایک اعلیٰ مرتبے پر پہنچایا، کئی نئی اصنافِ شعر ایجاد کیں اور اپنے بلند فکر و تخیل سے اردو شاعری کو آسمان پر پہنچا دیا۔ کلام کے انتخاب میں فاضل مرتب نے بڑی خوش ذوقی کا ثبوت دیا ہے اور عموماً حسن کلام کو وجہ انتخاب ٹھہرایا ہے۔ یہ ایک بے حد مشکل کام ہے اور صرف ایک ذوقِ سلیم رکھنے والے شاعر ہی سے ممکن ہے۔ لیکن اگر وہ اُس زمانے کی زبان اور روش دکھانے کے لئے بعض ایسے شعر بھی درج کر دیتے جن سے ذوق و وجدان تو لطف نہ اٹھا سکتے لیکن معلومات میں اضافہ ہو سکتا تو کتاب کی افادی حیثیت بڑھ جاتی۔ مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم اے نے اس کتاب پر نظرِ ثانی کی ہے اور ابتدا میں ایک پرمغز دیباچہ لکھا ہے۔ کتاب عربی ٹائپ میں نہایت صاف چھپی ہے لیکن طباعت کی غلطیاں کثرت سے رہ گئی ہیں۔ قیمت آٹھ روپے۔ مجلد کے لئے آٹھ آنے زائد۔ ملنے کا پتہ۔ ہندوستانی اکیڈیمی صوبہ متحدہ، الہ آباد۔

نقش و نگار

یہ حضرتِ جوش ملیح آبادی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے اکثر نظمیں اہلِ ذوق کے لئے نئی ہیں اور کچھ رسائل و اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔ جوش اس عہد کے تنہا ہندوستانی شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں مقامی اثرات کی اتنی روانی ہے جو ہم کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں دیکھتے۔ ان کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر ادنیٰ و ادنیٰ اور راہم و غیر اہم شئے میں حسن کا مشاہدہ کر لیتے ہیں اور اپنی شاعرانہ قدرت سے دوسروں کو بھی اس حُسن کا احساس کرا سکتے ہیں ان کے کلام کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی زبان کے ہر لفظ کو اپنے دلکش شعروں میں استعمال کر کے حسین بنا دیا ہے۔ گویا اپنے ملک اور ماحول سے وہ ہمیں محبت کرنا سکھاتے ہیں۔ وہ ہمیں ان چیزوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں جن کو ہماری سطحی نگاہیں نظر انداز کر دیتی ہیں انہوں نے ہمارے لئے الفاظ میں ایسی شاعری پیدا کر دی ہے کہ شعرا کو انہیں اب اپنے اشعار میں استعمال کرنے سے عار نہیں آتی یہ تو تھیں اس بے بہا مجموعہ کی علمی خوبیاں ذوقِ وجدان کے لئے بھی اس میں کیف و اثر کا بہت سامان ہے۔ ہماری رائے ہے کہ یہ مجموعہ جدید شاعری کے ہر قدردان کے پاس ہونا چاہئے حجم دو سو صفحات سے زاید ہے۔ آغاز میں لطیف الدین احمد صاحب اکبر آبادی کا ایک مبسوط اور فاضلانہ مقدمہ بھی شامل ہے قیمت مجلد دو روپیہ اور بے جلد ایک روپیہ آٹھ آنہ۔ جامعہ ملیہ یا دفتر کلیم دہلی سے طلب کریں

"میثاق النبیین"

مولفہ جناب مولانا عبدالحق صاحب فاضل سنسکرت و عبرانی۔ انبیاء عالم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ حضور نے تمام انبیاء عالم کی تصدیق کی ہے اور انبیاء ما قبل پر ایمان لانا ایک مسلمان کے لئے جزو ایمان ٹھہرایا ہے۔ اس کے بالمقابل حضور کی ایک اور امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انبیاء عالم نے بھی آپ کی تصدیق کی ہے اور اپنی اپنی امتوں سے آپ پر ایمان لانے کا میثاق (مضبوط عہد) لیا ہے۔ حضور صلعم کی اس دوسری شان کو کتاب میثاق النبیین میں دکھایا گیا ہے اور حضور کے متعلق ژند اوستا، وید اور صحف اولیٰ اور صحائف انبیاء بنی اسرائیل سے صدہا پیشینگوئیاں دکھائی گئی ہیں اور ان کتب مقدسہ کے بعض حوالجات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک محمد و احمد اور حضور کے واقعاتِ زندگی کا تذکرہ بطور پیش خبری بیان ہوا ثابت کیا گیا ہے پیشینگویوں کا ژندی۔ سنسکرت اور عربی عبارت میں عکس دیا گیا ہے۔ بشارات کے کل حوالجات ساتھ ہیں اور ان کے ایک ایک لفظ کا ترجمہ الگ الگ دیا گیا ہے بحیثیت مجموعی اس موضوع پر اردو زبان میں یہ سب سے پہلی تصنیف ہے جس کے لئے قابل مؤلف مستحق مبارکباد ہے ضخامت کتاب ۲۷۵ صفحات کتابت، طباعت دیدہ زیب کاغذ عمدہ لگایا گیا ہے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے محصول ڈاک آٹھ آنے مینجر دار الکتب اسلامیہ احمدیہ بلڈنگس لاہور۔

منصور احمد

ڈاک کے ڈاکو ہر ماہ ہمیں خریداروں کی طرف سے بیسیوں شکایتیں موصول ہوتی ہیں کہ انہیں پرچہ نہیں ملا اور بیسیوں خریدار ایسے بھی ہیں جو شکایت نہیں کرتے لیکن یہ فرض کر لیتے ہیں کہ پرچہ دفتر نے نہیں بھیجا حالانکہ پرچہ چھپا ہوا دیکھ کر کسی خریدار کو نہ بھیجنا بالکل پن اور تجارتی خودکشی سے کم نہیں۔ دفتر ادبی دنیا ہمیشہ ... تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے۔ اگر ... تاریخ تک آپ کو پرچہ نہ ملے تو سمجھ لیجئے کہ کسی ڈاک کے ڈاکو کی نذر ہوا۔ پس ایک شکایتی کارڈ اپنے حلقہ کے سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس کو لکھئے اور ایک ہمیں لکھئے تاکہ آپ کو پرچہ دوبارہ بھیجا جائے اور محکمہ ڈاک کے دروازہ پر ایک اور دستک دی جائے۔

فہرستِ مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہِ اپریل ۱۹۳۷ء

جلد ۱۵ — تصاویر:- (۱) الہام موسیقی (۲) رخصت — **نمبر ۶**

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے (صہ) ممالکِ غیر سے دس (۱۰) شلنگ

(گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا کمرشل بلڈنگس مال روڈ لاہور سے شائع ہوا۔)

آئینۂ عالم

سوٹ کیس میں پوری لائبریری

ایک وکیل اپنی پوری لائبریری سوٹ کیس میں بند کرکے حاضر عدالت ہو سکتا ہے۔ قصبے کا چھوٹے سے چھوٹا سکول برٹش میوزیم کی تمام کتابیں خرید سکتا ہے۔ ابھی سے اچھی کتاب دو ڈھائی آنے میں فروخت کی جاسکتی ہے۔

لائبریرین پیشین گوئی کر رہے ہیں کہ مائکرو فوٹوگرافی کے ذریعے سے یہ انقلاب عنقریب آنے والا ہے۔ ۱۹۳۷ء میں ہی یہ عمل تجارتی حیثیت اختیار کرلے گا اور آیندہ دو ہزار صفحات کی کتاب کا حجم ایک صفحہ کے برابر ہو جائے گا۔ ابھی سے نیویارک پبلک لائبریری، برٹش میوزیم اور لاس انجلیز کی ہنٹنگڈن لائبریری نے اس کا استعمال شروع کر دیا ہے۔

واشنگٹن کا صیغۂ مردم شماری ۱۹۳۰ء کی مردم شماری کے ۵۰۰۰۰۰۰۰ ناموں کی فہرست کو ایک چھوٹی سی جلد میں منتقل کر رہا ہے۔ کتاب کا ورق کھول کر ایک متحرک گاڑی پر رکھ دیا جاتا ہے جو اونچائی پر رکھے ہوئے کیمرے کے نیچے ایک لائن پر چلتی ہے۔ کیمرے میں سے ایک لیمپ کتاب پر روشنی کی عمودی کرن ڈالتا ہے ایک لڑکی کیمرے کو صحیح بلندی پر لاتی ہے۔ دو سو واٹ کی ۴ بتیاں روشن کرتی ہے اور ایک ہتھے کو دباتی ہے ایک "کرک" کی آواز آتی ہے اور کیمرا دوسرے صفحے کی طرف حرکت کر جاتا ہے۔ اسی طرح آگے اور پیچھے کیمرہ حرکت کرتا رہتا ہے تاآنکہ پوری کتاب کی تصاویر اتر آتی ہیں۔

بڑی سے بڑی لغات کے دگنے حجم کی کتاب جس کا وزن ۱۲½ سیر ہے اور جس میں ۰۰۰۰۰ ۷ نام ہیں، چار انچ قطر کی فلم میں سما جاتی ہے اس طرح مردم شماری کا پورا ریکارڈ چھوٹی سی الماری میں سما جائے گا۔ پرانے اخبار اور اس قسم کے دوسرے ریکارڈ مائکرو فوٹوگرافی کے ذریعے سے محفوظ کئے جا رہے ہیں۔ نیویارک کی پبلک لائبریری میں لوگ نیویارک "ہیرلڈ ٹریبیون" کی پوری اشاعت چند فٹ لمبی فلم پر سے پڑھ سکتے ہیں۔ یہ فلم ایک مشین میں داخل کی جاتی ہے جس کی شکل متحرک تصاویر کے کیمرے سے مشابہ ہوتی ہے اس کا عکس کیمرے کے پیچھے ایک پردہ پر ظاہر ہو جاتا ہے جو اصلی سائز سے بڑا اور اتنا ہی صاف دکھائی دیتا ہے۔

یہ مشین اتنی گراں قیمت نہیں کہ چھوٹے چھوٹے کتب خانے اسے خرید نہ سکیں۔ واشنگٹن کی "سائنس سروس" ایک سنٹ فی صفحہ کے حساب سے عکس اتار دیتی ہے۔ اگر یہ اجرت زیادہ سمجھی جائے تو تصویر اتارنے اور پڑھنے کی دونوں مشینیں ۵۰ ڈالر میں خریدی جاسکتی ہیں۔

بڑے بڑے اداروں کے لئے سب سے قیمتی آلہ پانچ ہزار ڈالر کا ہے۔ فلم پڑھنے کے لئے خوردبینی آلہ ابھی سے بازار میں فروخت ہو رہا ہے۔ ½۱ ڈالر میں فرانس کا بنا ہوا آلہ دستیاب ہو جاتا ہے اور امریکہ کی ایک کمپنی بڑھیا قسم کا آلہ ۵ ڈالر میں فروخت کر رہی ہے۔ ایسٹ مین کوڈک کمپنی کا آلہ جو اس وقت نیویارک لائبریری میں زیر استعمال ہے ۱۸۵ ڈالر کا ہے اور یہ اپنی قسم کا بہترین آلہ متصور ہوتا ہے جو پتلی سے پتلی فلم کے الفاظ کو نہایت صفائی سے واضح کرتا ہے۔ ان آلوں میں "پردے" پہلے سے لگے ہوئے ہیں لیکن کم قیمت آلوں میں پردے نہیں ہوتے بلکہ ان میں خوردبین کی طرح جھانکنا پڑتا ہے۔

ہیروں کے اجارہ دار

لندن کے ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے دو شخص دنیا کی سب سے بڑی تجارت یعنی روئے زمین کے ہیروں کے واحد اجارہ دار ہیں۔

ڈائمنڈ کارپوریشن کی دلچسپ داستان اور اس کے حصوں کی روز افزوں مانگ کی وجہ ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ اخبار کے ایک نمایندہ کو بتایا گیا ہے کہ ہیروں کی مانگ دن بدن کیوں بڑھ رہی ہے اور صنعتی "بادشاہ" کس طرح دولت کے انبار لگا رہے ہیں۔ یہی وہ دو شخص ہیں جو ۱۲۰۰۰۰۰۰ روپے کے ہیرے بازار میں بیچ کر دنیا کو ششدر کر رہے ہیں۔

سر ارنسٹ آپن ہیمر گول چہرے والے خاموش طبیعت انسان جنوبی

افریقہ کے رہنے والے ہیں اور مشہور زمانہ ہیرے "جانکر" کے سابق مالک ہیں۔ آپ لائبریری کی کتابیں مسلسل پڑھتے رہتے ہیں۔

مسٹر جیک برنیٹو جوئل، ۷۴ سالہ کروڑپتی اور گھوڑدوڑ کے گھوڑوں کے مالک ہیں۔ آپ جنوبی افریقہ کے آبادکار بارنے برنیٹو کے بھانجے ہیں۔

یہ دو اصحاب اور ان کے مددگار دنیا کے ہیروں کی قیمتیں مقرر کرتے ہیں اور روئے زمین کے ہیروں کی پیدائش میں ۹۵ فی صدی کے مالک ہیں۔

انہیں کے اعلیٰ انتظام کی وجہ سے بڑے بڑے انقلاب اور جنگ و خونریزی کے زمانے میں بھی ہیرا روپے کی بہترین ضمانت سمجھا جاتا ہے۔ سلطنتوں کے تختے الٹ جائیں، سکوں کی قیمتیں بدل جائیں لیکن ہیرے کی قدر وقیمت اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے۔

اس کارپوریشن کو ہیرے کی برآمد پر بھی قابو حاصل ہے۔ چنانچہ مانگ سے زیادہ ہیرا بازار میں نہیں لایا جاتا اور یہ امر بالکل محال ہے کہ کسی وقت ہیرے کی بہتات اس کا نرخ گرا دے۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس وقت روئے زمین کے مجموعی ہیروں کی قیمت قریباً ۴ کھرب پونڈ ہے اور تمام کے تمام ۱۲ مربع فٹ کے ایک ڈبے میں بند کئے جا سکتے ہیں۔ دنیا میں ہیروں کے سب سے بڑے ذخیرے ہندوستانی ریاستوں میں ہیں۔

کارپوریشن کے بڑے دفتر میں کانوں سے آئے ہوئے ٹکڑے اپنی قدر وقیمت کے لحاظ سے مختلف درجوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ دنیا کے تمام حصوں سے ہیروں کے دلال جو ہیروں کو تراشنے اور آب دینے والے کارخانوں کے نمائندے ہوتے ہیں خصوصاً انٹورپ اور ایمسٹرڈم کے کارخانوں کے، کارپوریشن کے دفتر میں جمع ہو کر ہیروں کو "دیکھتے" ہیں۔

قیمتوں کے متعلق کوئی دلیل یا عذر نہیں سنا جاتا کیونکہ ہر ٹکڑے کی قیمت پہلے سے مقرر ہوتی ہے۔ دلال "خریدیں یا چھوڑ دیں"۔

وہ ہیرے جو کیمیائی طور پر خالص کاربن پر مشتمل ہوتے ہیں عورتوں کے زیورات میں استعمال ہوتے ہیں۔ آج کل تجارتی فروغ اور شہنشاہ انگلستان کی تاجپوشی کی وجہ سے ہیروں کی مانگ بڑھ گئی ہے۔

گزشتہ چند سالوں سے صنعتی ضروریات کی وجہ سے ہیرے کی مانگ قریباً دگنی ہو گئی ہے۔ بے آب اور بدرنگ ہیروں کے سب سے بڑے خریدار صنعتی کارخانے ہیں۔ ہیرا چونکہ دنیا کی سخت ترین چیز ہے اس لئے شیشے اور دھات کے کاٹنے اور سخت چیزوں پر کھدائی کا کام دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ تار کھینچنے، بجلی کے لیمپ کی بتی بنانے، سنگ خارا میں سوراخ کرنے اور انجنیئری کے ایسے ہی ہزاروں کاموں میں استعمال کئے جاتے ہیں۔

جاپانی گیشاؤں کی سٹرائیک

کچھ عرصے سے دنیا کے ہر حصے میں اور کاروبار کے ہر شعبے میں سٹرائیک کا دور دورہ ہو رہا ہے۔ لیکن جاپان کی ۳۰۰ گیشا لڑکیوں نے، پہاڑ کی چوٹی پر بنے ہوئے ایک مندر میں پناہ گزین ہو کر سٹرائیک کرنے والوں میں ایک نئے طبقے کا اضافہ کیا ہے۔

یہ لڑکیاں اپنے مرد دوستوں کو خود منتخب کرنے کا حق طلب کر رہی ہیں اور اپنے مالکوں کے احکام کے ماتحت ہر کہ ومہ کو باریاب کرنے کے خلاف احتجاج کر رہی ہیں۔ اس کے علاوہ گیشا یونین کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔

بیکار امیروں کے "عیش مقام" یعنی اوساکا سے نکل کر یہ لڑکیاں فرازکوہ پر گیا کوزہ کے مندر میں پناہ گزین ہو گئی ہیں۔ مندر کے پروہتوں نے ان کی نمایندگی پر آمادگی ظاہر کی ہے۔ لڑکیوں کو کھانا، شراب، سٹرائیک کی تنخواہ اور سابق عشاق یہاں بھی مہیا ہیں اور وہ اپنا وقت اپنے مستقل خریداروں کو محبت آمیز خطوط لکھنے میں صرف کرتی ہیں۔

ہر روز علی الصباح گیشائیں نزدیک کے جنگلوں میں جا کر کنوؤں کے یخ بستہ پانی میں برہنہ ہو کر اپنے بدن کو پاک کرنے کے لئے نہاتی ہیں۔

فلو کومیا موتو نامی ایک حسین ترین گیشا جس کی عمر ۲۲ سال تھی ننگی گیشاؤں کو مہاتما بدھ کی پرستش کرتے ہوئے دیکھ کر اتنی متاثر ہوئی کہ اس نے چپکے سے شہر جا کر زہر کھا لیا۔ اس کی لاش پولیس کو ایک قہوہ خانے میں سے ملی ہے۔

تمام گیشاؤں نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ ان کی بہن کا جنازہ جو جاپانی تاریخ میں عورتوں کی سب سے پہلی سٹرائیک کی اولیں ہیروئن ہے، قومی اعزاز کے ساتھ اٹھایا جائے۔

گیشا کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

بے شمار لوگ گیشا لیڈر کی تقریر سننے کے لئے مندر میں آئے تقریر کا ملخص یہ تھا کہ "گیشائیں سستے جاپانی کھلونے نہیں ہیں"۔

خیال کیا جاتا ہے کہ یہ سٹرائیک جاپان کے طول و عرض میں پھیل جائے گی۔

بیماریوں کے علاج اور جڑی بوٹیاں

محمد عالم قندھاری کو آسٹریلیا سے باہر بہت کم لوگ جانتے ہیں لیکن یہی وہ شخص ہے جو نہایت کامیابی کے ساتھ طب جدید اور جراحی کو ہر جگہ شکست دے رہا ہے۔ یہ شخص جنوبی آسٹریلیا کے باشندوں کی آنکھ کا تارا ہے ۴۵ سال سے متواتر وہ ہر قوم، فرقہ اور مذہب کے بے شمار مرد، عورت اور بچوں کا جڑی بوٹیوں کے ذریعے سے علاج کر رہا ہے۔ بنی نوع انسان کے دکھوں کو دور کرنا اس کا نصب العین ہے۔ ہر روز وہ چھ سو مریضوں کو دیکھا کرتا ہے جن میں دنیا کی تمام بیماریوں کے مریض ہوتے ہیں۔

پہلے پہل اسٹریلیا کے اخبارات نے اسے کوئی وقعت نہ دی لیکن اس کے بڑھتے ہوئے طالبوں نے طبیبوں کو سیخ پا کر دیا اور اسے بدنام کرنے کے لئے ہر قسم کے ذرائع استعمال ہونے لگے لیکن وہ اپنے مریضوں کے دلوں کو مسخر کر چکا تھا کیونکہ ان میں سے ایک بھی ناکام و نامراد واپس نہ جاتا تھا۔ اس کے علاج کے نتائج میں "افاقہ" اور "عارضی صحت" کے الفاظ کبھی استعمال نہیں ہوتے۔ اپریشن یا ناخوشگوار ادویات کا کبھی نام تک نہیں سنا چند منٹ کی تشخیص، چند بوٹیاں بس یہ علاج ہے اور اس کے نتیجے میں شفائے کلی اس کے مریضوں کی فہرست میں بڑے بڑے اُمرا، اسٹریلیا کے سیاستدان اور حاکم موجود ہیں جن میں سے ایک ایڈلیڈ کا پولیس کمشنر بھی ہے طبقہ اطبا کی شدید مخالفت کی وجہ سے کچھ عرصے کے بعد وہ آزردہ ہو گیا اور اپنے وطن قندھار کو واپس چلا گیا۔ آسٹریلیا کے باشندوں نے ایک عظیم الشان عرضداشت جس پر انیس ہزار آدمیوں کے دستخط تھے اسے واپس بلانے کے لئے قندھار بھیجی۔ اس عرضداشت پر آسٹریلیا کے گورنر کی بیوی اور کمشنر پولیس کے دستخط بھی ثبت تھے۔ اس عرضداشت سے وہ بے حد متاثر ہوا اور اپنے گوشۂ عافیت سے نکل کر ایک دفعہ پھر اسٹریلیا میں وارد ہوا۔

لوگ کہتے ہیں یہ انسان ہے یا مجسم معجزہ"۔ وہ طب جدید اور جراحی کو علی الاعلان دعوت مقابلہ دیتا ہے۔ اس کے مطب میں مرد اور عورتوں کا اتنا ہجوم رہتا ہے کہ ہارلے سٹریٹ کے ماہر اطبا مجموعی طور پر بھی اتنے مریضوں کا خواب نہیں دیکھ سکتے۔ اگر اس کی دواؤں کا اثر فوری، یقینی اور مستقل نہ ہوتا تو شاید اب تک وہ کئی مرتبہ عدالت میں رگیدا گیا ہوتا۔

تھوڑے ہی دن ہوئے توہین عدالت کے جرم میں ایڈلیڈ کی عدالت میں اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ لیکن جج نے اسے ۲۶ پونڈ خرچہ دلائے جانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنے وکیل کو عدالت سے روپیہ وصول کرنے سے روک دیا، یہاں تک کہ وکیل کو بل میں سے بھی وہ رقم وضع نہ کرنے دی اور پورا بل ادا کر کے چلا آیا۔

وہ آسٹریلیا کے ایک غریب ترین علاقہ میں رہتا ہے اور اس وقت تک اٹھارہ ہزار پونڈ خیرات کر چکا ہے۔

وہ اپنی ادویات کی قیمت بھی وصول نہیں کرتا۔ اس کے میز پر ایک برتن پڑا رہتا ہے جس میں مریض اظہار تشکر کے طور پر چند سکے ڈال جاتے ہیں اور وہ انہیں جمع کر کے غربا میں تقسیم کر دیتا ہے۔

محمد عالم اب تک کئی پیشے اختیار کر چکا ہے۔ مغربی اسٹریلیا میں سونے کی کانوں پر وہ خانچہ لگاتا تھا۔ وسطی آسٹریلیا میں ساربانی کا کام کرتا رہا ہے۔ کوئنس لینڈ میں قلی اور چوکیدار رہا ہے۔ ملاحی اور کان کنی کا کام بھی کر چکا ہے۔

وہ قندھار کے ایک معزز خاندان کا فرد ہے اور گزارے کے لئے اس کے پاس کافی سہارا ہے۔ اس وقت اس کی عمر ۷۷ سال ہے لیکن بمشکل ۵۰ سال کا معلوم ہوتا ہے۔ وہ دن میں بیس گھنٹے کام کرتا ہے، اسلام کا سچا پیرو ہے اور کسی طرح بھی امیر بننے پر رضامند نہیں ہوتا۔

جوانی کے دنوں میں بھی وہ بڑا مخیر تھا اور جڑی بوٹیوں کے علاج میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ ہندوستان میں اس وقت بھی بہت سے لوگ بوٹیاں جمع کرتے ہیں لیکن نیم حکیموں نے اخلاص سے کام کرنے والوں کو بھی بدنام کر رکھا ہے

افغانستان میں ہندوستان کی طرح یہ علم سینہ بہ سینہ نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا چلا آتا ہے۔ محمد عالم کا ایمان ہے کہ خدا نے ہر مرض کے لئے بوٹیوں میں تاثیریں ودیعت کر رکھی ہیں اور جراثیمی یا ادویاتی ٹیکوں، دواؤں اور عمل جراحی کی ضرورت ہی نہیں۔ اس نظریے کو ثابت کرنے کے لئے انہوں نے طب جدید کو دعوت عام دے رکھی لیکن ابھی تک کسی شخص نے اس دعوت کو قبول نہیں کیا۔

اُن کو یقین ہے اور انہوں نے لاکھوں مریضوں کے علاج میں

پیش آئیں کر دیا ہے کہ بوٹیوں کا اثر براہ راست بیماری پر حملہ کرتا ہے اور اسے جڑ سے اکھیڑ کر ہمیشہ کے لئے تباہ کر دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب نیولے کو سانپ ڈستا ہے تو وہ بھی بوٹی کی تلاش میں دوڑتا ہے تاکہ اس تریاق کے ذریعے سے سانپ کے زہر کو باطل کرے۔ سائنسدان بھی اس بوٹی کی تلاش میں رہے ہیں لیکن ابھی تک اسے حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

عالم کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ مریض کو بیماری کے متعلق سوالات نہیں کرتے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تیز سی نگاہیں جسم کو چیر کر بیماری کو تلاش کر لیتی ہیں۔

آسٹریلیا سے رخصت ہوتے وقت آپ نے فرمایا:۔

"لوگ اکثر مجھے ساربان کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ہمیشہ نئی سے نئی سرزمین میں "خدا کی ان نعمتوں" کی تلاش میں پھرتا رہا ہوں۔ میں نے دنیا کے ہر حصے سے بوٹیاں جمع کی ہیں اور ان کی شفا بخش تاثیر کا ثبوت یہ ہے کہ میرے زیر علاج آج دس ہزار مریض ہیں۔

"میری محنت رائگاں نہیں گئی کیونکہ اس وقت میرے پاس ہزارہا سرٹیفکیٹ موجود ہیں۔ قدرت نے ہمارے دکھوں کے لئے خود علاج تجویز کیا ہے بوٹیاں خودبخود پیدا ہوتی ہیں اور ہر سال خود بخود سوکھ کر ہمارے استعمال کے لئے تیار ہو جاتی ہیں۔ اس جراثیمی مواد کی طرح جو بے زبان جانوروں پر ظلم ڈھا کر حاصل کیا جاتا ہے اور جس نے بنی نوع انسان کے دکھوں کو مٹانے میں ابھی تک کوئی کامیابی نہیں دکھائی میری ادویات ایسے کسی ظلم کا نتیجہ نہیں ہیں۔

"زندہ جانوروں کو چیر پھاڑ کرنے والا نامرد ہے۔ وہ مفروضہ جس کے ذریعے لوگوں کو یقین دلایا جاتا ہے کہ جراثیمی مواد یا عمل جراحی فوری اثر دکھلاتے ہیں۔ بالکل غلط ہے۔ ان کا نتیجہ پہلے سے زیادہ سخت بیماریوں کی صورت میں نکلتا ہے۔

"جسم انسانی میں ان ادویات اور زہروں کا اثر یقیناً فوری ہوتا ہے اور اطبا کی جیبیں پُر کرنے میں کافی مدد دیتا ہے لیکن بنی نوع انسان کے دکھ اور درد میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

"جراثیمی مواد ایک بیکار چیز ہے۔ صرف بیکار ہی نہیں بلکہ نقصان دہ شے ہے۔ میں کہتا ہوں کہ سائنسدانوں کے دماغ جو اسے ترقی دینے پر غور کر رہے ہیں غلط راستہ پر گامزن ہیں۔ طب کے اس شعبے کو صفحۂ دنیا سے اس طرح مٹا دینا چاہئے جس طرح آج سے سو سال پہلے کے کارہا کو بیا میں گندہ دواؤں اور نفعولیات کے نام مٹا دئے گئے تھے۔

"مختلف افراد اور ادارے اندھا دھند اور دیوانہ وار انعام و اکرام کی خواہش میں ہزاروں اور لاکھوں بے زبان جانوروں پر شب و روز بے پناہ ظلم ڈھا رہے ہیں۔ کیا اس کے نتیجے میں بنی نوع انسان کا کچھ بھلا ہوا ہے!

اور اگر کچھ نتائج پیدا ہوئے ہیں تو میرے خیال میں وہ ایک غریب خرگوش کی جان کا بدل بھی نہیں ہیں۔ برلن، پیرس، بوڈاپسٹ اور ویانا میں جراثیمی علاج نے مرض کی شدت میں کوئی فائدہ نہیں دیا۔ اس لئے خبردار ہو جاؤ اور ان افعال شنیعہ سے احتیاط برتو، اپنے اجسام کی حفاظت کرو اور صحت کے قدرتی طریقے اختیار کرو جو شافی مطلق نے ہمارے لئے تجویز فرمائے ہیں اور یقیناً وہ انسانی طبیبوں سے زیادہ حاذق ہے۔

چند سال ہوئے آپ دوبارہ قندھار چلے گئے لیکن اس دفعہ پھر تیس ہزار باشندگان آسٹریلیا نے عرضداشت بھیج کر آپ کو واپس بلا لیا۔

محمد عالم کے پاس اس وقت تیس ہزار سے زیادہ سندات ہیں اور آپ ان میں سے کسی ایک کو غلط ثابت کرنے پر پانچ سو پونڈ خیرات کے لئے دینے کا اعلان کرتے ہیں۔ ایسے بے شمار واقعات ہیں جہاں ڈاکٹروں اور جراحوں نے مریض کو لاعلاج کر دیا لیکن آپ کے علاج سے مریض صحت یاب ہو گیا۔

محمد عالم شہرت اور دولت کے بھوکے نہیں ہیں۔ اُن کے گزارہ کے لئے جدی جائیداد کافی ہے۔ وہ صرف غریبوں کے دکھ دور کرنا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی گاڑھے پسینے کی کمائی نام نہاد دواؤں کے عوض لُٹ نہ جائے۔

ایڈلیڈ میں آپ شہر کے غریب ترین حلقہ میں رہتے تھے اور یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ سوائے جمعہ کے جس روز آپ چھٹی کرتے تھے ہر روز آپ کے پاس چھ سو سے زائد مریض آتے تھے۔ آپ کے دروازے پر آپ کے نام کا بورڈ تک نہیں تھا اور یہ مشہور تھا کہ آپ سے ملنے کے لئے لوگوں کے انبوہ کے پیچھے پیچھے چلے جاؤ۔"

آپ ادویات خود بناتے ہیں جس کا اثر فوری ہوتا ہے یہاں تک کہ سخت سے سخت بیماری چند ہفتوں کے استعمال سے رفع ہو جاتی ہے۔

آپ کا مقصد زندگی خیر کثیر اور تعداد کثیر ہے۔
آج کل آپ لکھ رہے ہیں۔

دنیا کے امیر اور غریب

حال ہی میں امریکی سینیٹ میں ایک اعلان ہوا ہے جس کے ضمن میں کئی ہزار ایسے امریکنوں کے نام معلوم ہوئے ہیں جنہوں نے ۱۵۰۰۰ ڈالر سے زیادہ رقوم، تنخواہ، بونس یا کمیشن کے طور پر ۱۹۳۵ء میں کمائی ہیں۔

سب سے زیادہ آمدنی رکھنے والے پہلے دس نام یہ ہیں:

نام	آمدنی
۱۔ ولیم رینڈ لف ہرسٹ، ناشر	۵۰۰۰۰۰ ڈالر
۲۔ مے ویسٹ، ادا کار فلم	۴۸۰۸۳۳ "
۳۔ سی ڈبلیو گتھزیب، لوہے کا بیوپاری	۳۹۸۸۰۸ "
۴۔ الفریڈ پی سلون، جنرل موٹرز کا صدر	۳۷۴۵۰۵ "
۵۔ مارلین ڈورڈ بیش، ادا کار فلم	۳۶۸۰۰۰ "
۶۔ ونفیلڈ شیہن، فاکس فلم کا صدر	۳۴۴۲۲۰ "
۷۔ ولیم نڈسن، جنرل موٹرز کا نائب الصدر	۳۲۵۸۶۹ "
۸۔ بنگ کراسبے، گویا	۳۱۸۹۰۷ "
۹۔ پی ڈی ملر، ودلو تھ کمپنی کا صدر	۳۰۹۸۰۸ "
۱۰۔ تھامس جے واٹسن صدر انٹرنیشنل بزنس مشین کارپوریشن	۲۹۶۵۲۸ "

انگلستان میں ۱۰۰۰۰ پونڈ سالانہ کمانے والوں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے۔ اس وقت ۳،۹۰۰ آدمی ایسے ہیں جو ۱۰۰۰۰ پونڈ سالانہ سے زیادہ کما رہے ہیں۔ ایک لاکھ اور نوے ہزار آدمی ۱۰۰۰ سے ۲۰۰۰ پونڈ تک سالانہ کماتے ہیں۔ ایک لاکھ کی آمدنی ۲۰۰۰ سے ۱۰۰۰۰ پونڈ تک ہے۔ دس ہزار کی آمدنی ۱۰۰۰۰ پونڈ سے زیادہ ہے۔

ان میں سے کئی اصحاب اب Super Tax کی زد میں آنے والے ہیں کیونکہ نئے بجٹ کی رو سے ۲۰۰۰ کی بجائے ۱۵۰۰ کی آمدنی پر Super Tax عائد ہوا کرے گا۔

ایک ہزار پونڈ سالانہ سے زیادہ آمدنی رکھنے والی عورتوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔ اگرچہ ان کی صحیح تعداد ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی لیکن اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ تجارت اور صنعت و حرفت کے انتظامی شعبے سے تعلق رکھنے والی عورتوں کی آمدنی چار ہزار سالانہ تک پہنچ رہی ہے۔

دس ہزار پونڈ سالانہ سے زائد آمدنی رکھنے والوں میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جن کی آمدنی ۵۰۰۰۰ سے ۱۰۰۰۰۰ تک ہے۔ ان کی اوسط آمدنی بیس ہزار پونڈ بنتی ہے۔

ادنیٰ طبقوں میں پانچ لاکھ افراد سے زائد ایسے ہیں جو ۵ سے ۱۰ پونڈ ہفتہ وار کماتے ہیں۔ ۵ سے ۱۰ پونڈ تک ہفتہ وار کمانے والوں کی تعداد پندرہ لاکھ سے زائد ہے۔

ان کے نیچے ۲½ پونڈ سے ۵ پونڈ تک ہفتہ وار کمانے قریباً ۵۰۰۰۰ (پانچ لاکھ) ہیں اور ان سے بھی نیچے قریباً ایک کروڑ بیس لاکھ ایسے ہیں جن کی آمدنی ۲½ پونڈ ہفتہ وار سے کم ہے۔

شہنشاہ حبشہ جلاوطنی میں

سنڈے ایکسپریس کے ایک نامہ نگار نے شہنشاہ کے پست قامت اور چاق و چوبند سیکرٹری نے معذرت آمیز انداز میں استقبال کرتے ہوئے کہا "معاف کیجئے کہ ہم آپ کی مہمانداری کے فرائض پوری طرح سرانجام دینے سے معذور ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام دربار روزے سے ہے اور سوگ میں بھی ہے۔ پچھلے دنوں ہم نے چالیس یوم کا روزہ رکھا تھا، لیکن اب کے صرف دو یوم کا ہے۔ ہر ہفتے ہم دو روز کا مسلسل روزہ رکھتے ہیں۔

عنقریب ہی ہم ایسٹر کا سالانہ روز کا روزہ شروع کرنے والے ہیں اس دوران میں سوائے تھوڑی سی اُبلی ہوئی سبزی کے اور کچھ نہ کھایا جائے گا اور پینے کے لئے سادہ پانی۔ امید ہے کہ آپ ہمیں معذور تصور کریں گے۔"

میں نصف گھنٹہ تک فیر فیلڈ کے برآمدے میں کھڑا رہا۔ یہی سابق شہنشاہ حبشہ کا موجودہ مکان ہے۔ باتھ سے دو میل کے فاصلے پر۔

سیکرٹری کا نام سیرک ہیر وئے ہے۔ آپ شہنشاہ کے وزیر خارجہ کے ۲۶ سالہ نوجوان فرزند ہیں۔

جنگ حبشہ کے دوران میں آپ ادیس ابابا کے دفتر خارجہ میں اہم خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔

مسٹر ہیر وئے نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

انگریزی، فرانسیسی اور اطالوی اخبارات فرش پر بکھرے پڑے تھے۔ ان کے عنوانات دربار کے سوگ میں ہونے کی تشریح کر رہے تھے۔ ان میں شہنشاہ کے داماد راس دستا کے قتل کی خبر شائع ہو رہی تھی جو شہنشاہ کے آخری سرداروں میں سے تھے اور ابھی تک اطالویوں کے خلاف مصروف پیکار تھے۔

مسٹر ہیروے نے مجھے ایک سگرٹ پیش کرتے ہوئے کہا "یہاں کا ماحول اداس ہے۔ ہمارا گھر حقیقی معنوں میں غمخانہ بنا ہوا ہے۔ ہمارا در راس دستا کی موت سے قطع نظر بھی اس گھر میں مسرت کا وجود ناپید ہے اور ہم بے خانماں لوگوں کے دلوں میں مسرت آئے بھی کیسے؟ ہم میں سے صرف شہنشاہ کے بچے مسرور ہیں"۔

اس کے بعد مسٹر ہیروے نے مجھے بتایا کہ اس وقت اس بادشاہ ہول کے بادشاہ کا دربار کن کن افراد پر مشتمل ہے۔

آپ نے فرمایا:۔

"شہنشاہ یہاں اپنی ملکہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کا بارہ سالہ بچہ شہزادہ ہرار باتھ کے بورڈنگ سکول میں ہے اور ہر ہفتے چھٹی گزارنے کے لئے یہاں آتا ہے۔ وہ فٹ بال کھیلتا ہے، کمہ بازی اور بائیسکل چلانے کا شوقین ہے اور انجن ڈرائیور بننا چاہتا ہے۔ شہزادہ کا چھوٹا بھائی جس کی عمر پانچ سال ہے یہیں رہتا ہے اور اس کی بہن جو لندن کے ایک ہسپتال میں نرس کا کام سیکھ رہی ہے کبھی کبھی یہاں آتی ہے۔

شہنشاہ کا نواسہ یعنی راس دستا کا بیٹا ناٹن کے سکول میں پڑھتا ہے اور ہفتہ وار چھٹی گذارنے یہاں آتا ہے۔ شاہی خاندان کے دوسرے بچوں کے علاوہ ہمارے ساتھ راس کاسا بھی رہتے ہیں جو جنگ کے دنوں میں سپہ سالار تھے۔ آپ پکے مذہب پرست ہیں اور جلاوطنی کی مصیبت کو سب سے زیادہ محسوس کر رہے ہیں۔ بہت سے لوگ شکست کا تمام تر الزام انہیں کے سر تھوپتے ہیں"۔

فیرفیلڈ کے عملے کے متعلق سوال کرنے پر مسٹر ہیروے نے کہا ہمارے پاس ایک انگریزی خانساماں ہے لیکن ہمارے متواتر روزوں کی وجہ سے اس کا کام بہت ہلکا رہ گیا ہے۔ تین موٹروں کے لئے ایک انگریز شوفر ہے اور ایک انگریز مالی۔ باقی عملہ حبشیوں پر مشتمل ہے جن میں چار مرد تین خدمتگار عورتیں ہیں اور ان کے علاوہ میں اور ایک دوسرا سیکرٹری۔ شہنشاہ جلد سو جاتے ہیں اور علی الصبح بیدار ہوتے ہیں۔ وہ صبح آٹھ بجے ہی اپنی سیاہ ٹوپی اور سیاہ کیپ (Cape) میں ملبوس سڑکوں پر سیر کرنے نکل جاتے ہیں۔ ۹ بجے کے قریب وہ خط و کتابت میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

ایک عزیزانہ سے ناشتے کے بعد دو گھنٹے تک دعا اور مراقبے میں مشغول رہتے ہیں۔ تیسرے پہر ملاقاتیوں کو باریاب فرماتے ہیں اور پھر خطوط پر دستخط کرتے ہیں۔

شاہِ اشوریا کے خطوط

شاہ زمریلین کے خطوط کا ترجمہ حال ہی میں ایک فرانسیسی عالم ایم۔ ڈودسن نے علمائے کتبات قدیمہ کی ایک مجلس کے سامنے پیش کیا ہے۔ زمریلین ولادت مسیح سے ایک ہزار سال پہلے اشوریا پر حکمران تھا۔ یہ کتبے تل ہریری کے مقام سے مشہور ماہر آثار قدیمہ ایم پیرٹ نے برآمد کئے تھے۔ کسی زمانے میں اس مقام پر شہر ماری آباد تھا۔

ایم ڈودسن کا بیان ہے کہ اب یہ خطوط جو ممالک غیر کے حکمرانوں، درباریوں اور ایلچیوں کے نام لکھے گئے تھے آسانی کے ساتھ پڑھے جا سکتے ہیں اور اسی طرح پرانے تاریخی حالات اور تجارتی معاہدے علماء کے مطالعے کے لئے آسان ہو گئے ہیں۔ ان معلومات کی مدد سے اشوریا کی تین ہزار سال قبل کی جیتی جاگتی تصویر اتاری جا سکتی ہے۔

ادارہ

غزل

جاتے ہوئے اک بار تو جی بھر کے رُلائیں
ممکن ہے کہ ہم آپ کو پھر یاد نہ آئیں

ہم چھیڑ تو دیں گے ترا محبوب فسانہ
کھنچ آئیں گی فردوس کی مدہوش فضائیں

پھر تشنہ لبی زخم کی دیکھی نہیں جاتی
پھر مانگ رہا ہوں ترے آنے کی دعائیں

پھر بیت نہ جائے یہ جوانی، یہ زمانہ
آؤ تو یہ اجڑی ہوئی محفل بھی سجائیں

پھر لوٹ کے آئیں گے نہیں قافلے والے
اُٹھتی ہیں افق سے کئی غمناک صدائیں

شاید یہی شعلہ مری ہستی کو جلا دے
دیتا ہوں میں اڑتے ہوئے جگنو کو ہوائیں

اے کاش ترا پاس نہ ہوتا مرے دل کو
اُٹھتی ہیں پہ رک جاتی ہیں سینے میں صدائیں

اک آگ سی بھر دیتا ہے رگ رگ میں تبسم
اس لطف سے اچھی ہیں حسینوں کی جفائیں

معبود ہوا اُن کے ہی تصوّر کی تجلّی
اے تشنہ لبو آؤ نیا دَیر بنائیں

ہم سنگِ درِ یار پہ بے ہوش پڑے ہیں
کہہ دے کوئی جبریل سے، بہتر ہے نہ آئیں

ہاں، یاد تو ہو گا تمہیں راوی کا کنارا
چاہو تو یہ ٹوٹا ہوا بربط بھی بجائیں

توبہ کو ندیم آج تو قربان کرو گے
جینے نہیں دیتیں مجھے ساون کی گھٹائیں

احمد ندیم قاسمی بی اے



الهام موسیقی

نظریۂ مادیت کی فلسفیانہ اہمیت

مادیت سے میری مراد وہ وجودیاتی (ontological) نظریہ ہے جو حقیقت کے وجود اور ماہیت کے سوال کا جواب دیتا ہے کہ حقیقت بذاتِ خود ایک جسم ہے جس کے صفات امتداد (Extension) اور عدم تداخل (Impenetrability) ہیں۔ اس کی فعلیت کی ابتدائی اور اصلی صورت حرکت ہے۔ لہٰذا اسی اصول سے حقیقت کے تمام افعال و اعمال کی اور خاص کر شعور کے حالات کی توجیہہ ہونی چاہیئے۔ مادیت اس بات کا دعویٰ کرتی ہے کہ تعددِ مظاہر (Multiplicity) کی توجیہہ بیدار واحد (جو اس کے نزدیک مادہ ہے) سے ہو سکتی ہے۔ مادہ تمام چیزوں کی اصل ہے۔ روح کا وجود مادے سے علیحدہ نہیں۔ روح یا ذہن یا نفس، اس دائم التغیر مادے کی بے شمار صورتوں میں سے ایک صورت ہے۔ مادیت کا اہم جزو ذہنی اعمال کی عضوی یا مادی اعمال میں تحویل ہے۔ مادیت کی حمایت میں مندرجہ ذیل ثبوت پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ طریقیاتی ثبوت (Methodical Proof)

یہ مفروضہ کہ ہم میں ایک غیر مادی روحی جوہر ہے جو جسم کا محتاج نہیں اور اس سے علیحدہ ہے اور دائم الوجود ہے غیر حکیمانہ ہے اور ایام جاہلیت کی نشانی ہے۔ اس نظریے کا ماننے والا وحشیوں کی سی ذہنیت رکھتا ہے جو فطرت کے ہر عمل کو ایک غیر مرئی دیوتا کا عمل تصور کرتا ہے۔ تجربے سے ہمیں سوائے جسم اور اس کے اعضا کے اور کسی چیز کا پتہ نہیں چلتا۔ اس عضویت کے ہر عمل کو اور جو بھی اس عضویت میں گذرے ان تمام کو خود اسی عضو کے مختلف اعضاء کے تفاعلات (Functions) خیال کرنا چاہیئے۔ ایک روحانی جوہر کا مفروضہ مابعد الطبیعیاتی اوہام ہے جو ناقابلِ یقین اور بے معنی ہے۔ سائنس کو چاہیئے کہ اس کو تعلیم یافتہ کے ذہن سے دور کر دے۔ ہر سائنس کے طریقے کو اس طریق عمل سے جو سائنس سے پہلے استعمال کیا جاتا تھا محض اس طرح ممیز کر سکتے ہیں کہ سائنس مظاہر کی توجیہہ انواع، ذوات و اعیان (Essences & Powers) سے نہیں کرتی بلکہ مقدم (Antecedent) یا متوالی (Contiguous) مظاہر سے کرتی ہے۔ اب حالاتِ شعور بھی مقدم یا متوالی مظاہرِ دماغ اور نظامِ عصبی کے عضوی اعمال ہیں۔ حکیمانہ نفسیات دراصل عضویات (Physiology) ہے جو ذہنی اعمال کو محض عضوی اعمال تصور کرتی ہے۔ وہی عضوی قوت جو معدے کے ذریعہ غذا حل کرتی ہے، دماغ کے ذریعے فکر کرتی ہے۔ پروفیسر کارل واشٹ فکر کی تعریف میں کہتا ہے "دماغ فکر کو اسی طرح پیدا کرتا ہے جس طرح کہ جگر صفرے کو اور گردے پیشاب کو۔ دماغ سب سے زیادہ عجیب و غریب سب سے زیادہ نازک اور لطیف عضو ہے اس کا وظیفہ یا عمل مخصوص فکر ہے لہٰذا نفس و حیات، فکر و ضمیر، تمام مادے کی پیداوار ہیں اور اگر کوئی خدا ہے تو وہ بھی بقول ہیکل گیسی دیوِ ہوا ہے۔"

۲۔ آلی ثبوت (Mechanical Proof)

مادیت کی حمایت میں دوسرا آلی ثبوت پیش کیا جاتا ہے جو علومِ فطریہ کا مسلمہ اصول ہے۔ اس اصول کا حاصل یہ ہے کہ کائنات میں قوت یا ازجی کی مقررہ مقدار پائی جاتی ہے جو نہ زیادہ کی جا سکتی ہے اور نہ کم بلکہ ہمیشہ اتنی رہتی ہے۔ اس کو قانونِ بقاءِ توانائی کہتے ہیں۔ آلی اصول کی صداقت میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا۔ تکون (Change) اس توانائی کی محض دوسری صورتوں میں تقسیم ہے۔ مثلاً حرکت حرارت میں بدل جاتی ہے اور حرارت حرکت میں۔ ایک مقناطیسی رو کو اگر پانی میں سے لے جائیں تو کیمیائی نتائج پیدا ہوتے ہیں اور یہ مفروضہ کہ نئی توانائی کی تخلیق ناممکن ہے کائنات کی تمام میکانیت (Mechanism) کو بہت سادہ اور صریح بنا دیتا ہے۔ اب اگر ہم ایک دوسرے جوہر کا وجود فرض کریں جو جسم سے علیحدہ شے ہو اور جو اعصاب میں تناؤ پیدا کرتا ہو تو لازم آئے گا کہ دنیا کی موجودہ ازجی میں اضافہ ہو رہا ہے اور نئی ازجی کی تخلیق ہو رہی ہے لہٰذا یہ مفروضہ قانونِ بقاءِ توانائی کے خلاف ہے جس کو علومِ فطریہ

(Natural Science) نے قبول کر لیا ہے۔ اس لئے یہ غیر حکیمانہ ہونے کی وجہ سے قابلِ تردید ہے۔

۳۔ کونیاتی ثبوت (Cosmological Proof) کسی زمانے میں ہماری زمین محض ایک روشن گیسی جنابہ (Nebula) کی صورت میں تھی۔ ایسی حالت میں حیاتِ عضوی کا وجود ناممکن تھا لیکن جب زمین رفتہ رفتہ سرد ہوئی اور حیاتِ عضوی کے موافق حالات پیدا ہوئے تو نباتی اور حیوانی زندگی کا وجود ممکن ہوا اور بعد میں چل کر انسان بھی جلوہ نما ہوا۔ لہٰذا ذہنی زندگی عضوی زندگی کے ساتھ پیدا ہوئی ہے اور اپنے شرائط کے لحاظ سے عضوی زندگی کے ساتھ محدود ہے۔ یہ فرض کرنا کہ ذہن عضویت سے کوئی علٰحدہ شے ہے بے معنی ہے کیونکہ اس کی ابتدا کا تعلق عضویت سے ہے اور دونوں ایک ساتھ فنا ہوں گے لہٰذا ظاہر ہے کہ حقیقی وجود صرف مادے اور حرکت کا ہی ہے اور جس عجیب و غریب لباس میں حرکت چند لحظوں کے لئے نمودار ہوتی ہے وہ کائنات کے لئے کچھ نہیں ایک لغز کا دو روزہ رقص ہے جو ابدیت اور لامحدودیت کے سمندر پہ ہو رہا ہے۔

تنقید

طرتفیاتی ثبوت کی تردید ایک روحی جوہر کے مفروضہ کی مخالفت میں جدید نفسیات مادیت کا ساتھ دے گی۔ ذہنی اعمال کا خاصہ ہے کہ یہ ہمیں محض وقائع (Occurances) کے طور پر نظر آتے ہیں۔ یہ وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں کسی عمل یا جوہر کا وجود ہی ناممکن ہے۔ اگر باوجود اس کے ہم کسی روح یا جسم کا ذکر کرتے ہیں تو ہماری اس طرزِ گفتگو کا مدار ہمارے ادراک (Apperception) پر ہوتا ہے یعنی جب قوتِ تصدیق ہم میں پیدا ہوتی ہے تو ہم ہر موادِ فکر کو موضوع اور محمول کی صورت میں سوچتے ہیں جب تک نفسیات روح کے تصور کو اس معنی میں استعمال کرتی ہے جس معنی میں کہ ایک عالمِ طبیعات مقناطیست اور برقیت کو استعمال کرتا ہے۔ یہاں مقناطیسی اور برقی جواہر کا ہی صرف علم ہوتا ہے۔ جب تک روح ذہنی اعمال کا موضوع سمجھی جاتی ہے اور ایک قائم بالذات جوہر نہیں خیال کی جاتی اُس وقت تک ہم اس طرزِ گفتگو کو غیر حکیمانہ نہیں کہہ سکتے

ہر جوہر ذہن کے لئے کسی نہ کسی قدر مادی پہلو رکھتا ہے خواہ کتنی ہی کوشش کے ساتھ ہر طرح کی مادیت اس سے دور کی جائے جس چیز کا بھی وجود ہوگا وہ ہمارے طریقِ تفکر کی وجہ سے ضرور مکان پر حاوی ہوگی اور اس لئے مادی ہوگی۔ مادیت جس جوہر کے مفروضہ کی اس شدت کے ساتھ مخالفت کرتی ہے وہ بالآخر ہمیں مادیت کی طرف لے جاتا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ مادی واقعات کو چھوڑ کر اپنی توجہ ذہنی اعمال و وقائع پر مرکوز کریں اور کسی روحی جوہر کو فرض نہ کریں۔ صرف یہی وقائع جن کا کوئی عمل نہیں مادے سے اصلاً مختلف ہو سکتے ہیں۔

سائنس کے سخت طریقہ کو اگر مدنظر رکھا جائے جو صرف واقعات کو بیان کرتا ہے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہمارے معمولی تجربات اور عمیق جذبات میں کوئی شے ایسی ضرور ہے جو ہر مدرک بالحواس شے اور ہر مادی شے سے اصلاً مختلف ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ جس طریقۂ علم کی طرف مادیت اپیل کرتی ہے وہ ہمیں اس نظریے کے خلاف راہ دکھلاتا ہے۔

(۱) مادیت کا دعوے ہے کہ حالاتِ شعور دماغ کے مادی حالات کے سوا کچھ نہیں یا

ب۔ حالاتِ شعور مادی حالات کے نتائج ہیں

۱۔ اول الذکر خیال مہمل ہے کیونکہ مادی حالات حرکت کی صورتیں ہیں لیکن شعور حرکت کی صورت نہیں۔ ممکن ہے کہ ذہنی حالات اور عضوی حالات میں معیت (Co-existence) ہو لیکن معیت کا علاقہ عینیت (Identity) کا علاقہ نہیں ہو سکتا۔ سایہ متحرک گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑتا ہے لیکن سایہ گاڑی نہیں۔ اسی طرح افکار گو دماغی حالات کے ساتھ چلتے ہیں لیکن اُن سے عینیت کا رشتہ نہیں رکھتے۔ کسی چیز کا تصور، تصویر کی طرح امتداد نہیں رکھتا اور نہ ہی وہ دماغی مکسرات (Molecules) کا مجموعہ ہو سکتا ہے۔

ب۔ لہٰذا مادیئین دوسرے خیال پر اتر آتے ہیں کہ حالاتِ شعور اور دماغی افعال میں عینیت تو نہیں مگر اول الذکر ثانی الذکر کا نتیجہ ہیں لیکن یہاں بھی وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شعور کے بعض مادی شرائط ضرور ہیں۔ دماغ میں چند عضوی اعمال کے وقوع کے بغیر شعور ناممکن ہے لیکن شرائط علت نہیں ہو سکتے۔ ہم شعور کی توجیہہ محض مادی شرائط سے ہرگز نہیں کر سکتے۔ فکر کا یہ بنیادی قانون ہے کہ معلول اپنی علت سے متوافق ہونا چاہئے لیکن حالاتِ شعور دماغی حالات سے مختلف ہوتے ہیں۔ دماغ کا اعلیٰ ترین علم بھی ہم کو سوائے مادے کے (جو حرکت میں ہے) اور کسی چیز کا علم نہیں بخشتا لہٰذا یہ کہنا کہ شعور محض دماغی عمل کا نتیجہ ہے بالکل ناقابلِ فکر ہے

لہ Commensurate

میکانکی ثبوت کی تردید۔ عوام اور حکما کی اکثریت اس ثبوت کو بہت یقین آور خیال کرتی ہے، لیکن یہ ثبوت بالکل کمزور ہے۔ قانونِ بقاءِ توانائی کا اطلاق صرف طبعی اور کیمیائی اعمال پر ہوتا ہے اور یہ قانون انہی کی حد تک صحیح ہے بلکہ بعض مشہور علمائے طبیعات ایسے بھی ہیں جو اس دائرے میں بھی اس قانون کی پوری صداقت کو نہیں مانتے بہر حال یہ قانون حیاتیاتی اعمال (Vital functions) کی توجیہہ کے لئے بالکل ناکافی ہے۔ عضوی موجودات کی مرکزی عضویتوں کے تمام حصص کا مقصدِ واحد کے لئے آپس میں تطابق یہ ایسی چیزیں ہیں جو طبعی کیمیائی حدود میں نہیں سمجھائی جاسکتیں۔ حتیٰ کہ عضویت کا حیاتی ارتقا تخلیقی فعلیت کو ظاہر کرتا ہے اور جب ہم ذہنی اعمال کے ارتقاء پر غور کرتے ہیں تو اس امر پر مجبور ہوتے ہیں کہ وونٹ (Wundt) کے ساتھ نفسی توانائی کے ازدیاد کو بطور اصول موضوعہ مان لیں۔ کیونکہ قانونِ بقاءِ توانائی کو ذہنی ارتقاء پر منطبق کرنے کی کوشش تجربے کے بعض بدیہی واقعات کی توجیہہ نہیں کرسکتی۔

سچ تو یہ ہے کہ مادئین نے جو میکانکی ثبوت پیش کیا ہے اُسے اگر اچھی طرح پرکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ثبوت نہیں بلکہ ایک مفروضِ تسابق (Presupposition) ہے کیونکہ اگر ہم پہلے ہی سے فرض کرلیں کہ ہر عمل (حیاتی، نفسی وغیرہم) طبعی و کیمیائی قوانین کے موافق سمجھایا جاسکتا ہے تب کہیں قانونِ بقاءِ انرجی کی خلاف ورزی کا احتجاج درست ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر ہم واقعات پر نظر کریں اور اُن کے مطابق عمل پیرا ہوں بجائے اس کے کہ کسی خاص نظریے کو پہلے سے ہی فرض کرلیں تو ہم کو ماننا پڑے گا کہ قانونِ بقاءِ انرجی سے ان واقعات کی مطلقاً کوئی توجیہہ نہیں ہوسکتی جو نفسی اور عضوی اعمال کے دائرے میں پائے جاسکتے ہیں۔ جن واقعات کو اب تک ثابت کیا گیا ہے اور ذہنی ارتقا اب تک جس درجے کو پہنچا ہے ان تمام کی توجیہہ کے لئے ایک بالکل مختلف اصول کی ضرورت ہے۔ اس کا اعتراف بعض مشہور حکماء نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ وونٹ کہتا ہے کہ "یہاں ایک ترکیب تخلیقی سرگرم عمل ہے جس کی ماہیت اور جس کے اصول کے متعلق زیادہ غور و فکر سے تحقیق کی جانی چاہئے۔ میکانکی ثبوت کی قوت بالکل جاتی رہتی ہے جب ہم مادی مفروضات کو ترک کرکے تجربے کے نادِ فروع واقعات پر غور کرتے ہیں۔

کونیاتی ثبوت کی تردید۔ کونیاتی ثبوت ایسے مفروضہ سے بحث کرتا ہے جس کی تصدیق بہت مشکل ہے۔ حیاتِ ذہنی کی تکوین (

اور اس کی غائت کا تجربہ نہیں ہوسکتا اگر ہم یہ ثابت بھی کردیں کہ حیاتِ نفسی کے لئے بعض مادی شرائط ضروری ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ صرف انہی شرائط کے تحت پائی جاتی ہے ایک بات تو یقینی ہے کہ حیاتِ نفسی۔ حیاتِ من حیث الکل کی طرح خود اپنے قوانین پر چلتی ہے جن کو ہم لاعضوی (Inorganic) مادے سے حاصل نہیں کرسکتے۔ آیا کبھی کائنات بغیر حیاتِ نفسی کے ہوگی اور کیا اس طرح کی کائنات کا وجود ممکن بھی ہے ایسی باتیں ہیں جو ہمارے تجربے سے ماورا ہیں۔

تنقیدِ بالا سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تمام براہین ذہنی اعمال کے وجود پر جن کو ہم مادی اعمال سے بالکل مختلف پاتے ہیں کسی قسم کا اثر نہیں کرتے برگساں نے اس مسئلے کو اچھی طرح سمجھایا ہے اور ایسے امور بیان کئے ہیں جو ان اعمال کے سمجھنے میں بے حد مدد دیتے ہیں۔ جن لوگوں نے ذہنی اعمال کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے وہ کسی طرح مادیت سے مطمئن نہیں ہوسکتے۔ مادیت نہ صرف ایک بنیادی اصول کے ناقابلِ قبول ہے بلکہ یہ اپنے نتائج کے لحاظ سے بھی سخت مایوس کن ہے۔ یہ ہر قسم کے مذہب کے مخالف ہے اس کا میلان الحاد کی طرف ہے۔ کیونکہ یہ مادہ کے سوائے ہر چیز کا انکار کرتی ہے۔ مادہ سے مملو فضا میں دیوتاؤں۔ ارواح اور شیاطین کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ مادیت کے ایک مصنف کا قول ہے کہ مافوق الفطرت واقعات کی اصل، مشاہدۂ فطرت کے اصلی طریقوں میں التباس و توہم اور پادریوں کے دھوکوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کے نتائج اخلاق کے لئے سخت تباہ کن ہیں۔ مذہب کی بیخ کنی کے ساتھ یہ اخلاق اور نصب العین کے تعین کا بھی خاتمہ کئے دیتی ہے۔ مادیت کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ اس کے نزدیک نیکی ایک بے معنی چیز ہے ضمیر ایک جنون ہے۔ قانونِ اخلاق پادریوں کی ایجاد ہے۔ اصل دانائی یہ ہے کہ زندگی خوشی سے بسر کی جائے اور جو کچھ لذت بہم حاصل ہوسکے اٹھائی جائے۔

چودھری اکبر علی بی اے
(عثمانیہ)

سیٹھ چودھری برکت علی سوداگر

اُمیدِ موہوم

اے سراسر سحرِ رنگیں! اے سراپا دلبری! ۔۔۔ اے کہ تجھ کو دیکھ لینا ہے سرورِ سرمدی

اے کہ تجھ سے دُور رہنا موت سے کچھ کم نہیں ۔۔۔ اے کہ تیرا قرب ہے اِک جاودانی زندگی

اے کہ تیری انگلیوں کے لوچ کی لمسِ خفیف ۔۔۔ اک اِرم مدہوشیوں کا اِک بہشتِ بےخودی

اے ترے انفاس میں پوشیدہ وہ موجِ طرب، ۔۔۔ خشک شاخیں زندگی جس سے ہوتی ہیں ہری

اے ترے اندام میں خوابیدہ وہ نازِ حیات، ۔۔۔ بخشتا ہے جو محبت کو حیاتِ دائمی

اے ترے لبہائے شیریں پر وہ حرفِ شکّریں ۔۔۔ انگبیں جس کی سماعت سے ہے تلخِ زندگی

اے تبسّم تیرا ہے جس روح کو ایمائے رقص ۔۔۔ اے تکلم تیرا جاں کو دعوتِ رامش گری

اے تری رفتار جس سے آرزوئیں پائمال، ۔۔۔ اے تری گفتار جس سے زخم کی چارہ گری

اے کہ تو دوشیزۂ فطرت کا اک خوابِ حسیں ۔۔۔ اے کہ تو تخئیلِ شاعر کی مجسّم دلکشی

اے سراپا رنگ و بُو! اے پیکرِ حسن و جمال! ۔۔۔ اے غرورِ دلربائی، نازشِ سیمیں بری!

کس قدر بدمست وہ شب ہوگی جس شبِ ناگہاں ۔۔۔ خواب سے بیدار ہوگی میری خفتہ اختری،

بے تکلف تو مرے پہلو میں ہوگا محوِ ناز

اور مرے شانوں پہ مچلے گی تری زُلفِ دراز!

سعید احمد اعجاز

باپ کا گناہ

(ایک سچی کہانی)

ہارلٹن کا قصبہ جہاں مجھے بطور ڈسٹرکٹ نرس کام کرتے ہوئے آٹھ سال ہو گئے ہیں، ایک وادی میں واقع ہے اس وادی کے ہر چہار طرف بلند پہاڑ ہیں جنھوں نے اس جگہ کے باشندوں کی روحوں کو گویا مقید کر رکھا ہے۔ بظاہر یہ لوگ نہایت خاموش اور خود پسند ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے نشیب و فراز سے واقف نہیں اور جذبات سے بالکل معرا ہیں۔ لیکن میرا ذاتی مطالعہ یہ ہے کہ ان کے پہلو میں بھی ایک دل ہے اور اس میں محبت اور نفرت کے احساسات اسی طرح موجزن ہیں جس طرح ہم باقی دنیا والوں کے دلوں میں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہم جن جذبات کا اظہار فی الفور کر دیتے ہیں۔ یہ ان کو ایک عرصے تک دبائے رکھتے ہیں۔

ان میں سب سے زیادہ دلچسپ ماں بیٹے کا وہ جوڑا تھا، جو ہر اتوار گرجے میں عبادت کے لئے آتا تھا۔ مجھے نہ تو ان سے بات کرنے کا کبھی موقعہ ملا اور نہ کبھی مجھے ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ دونوں بریلے خاندان کے فرد تھے۔ ماں مسز بریلے ستر سال کی تھی اور لڑکا جان بریلے تقریباً پچاس برس کا تھا۔ ہر اتوار جان بریلے اپنی ماں کو گرجا لاتا، عبادت کے بعد اسے سہارا دے کر اپنی گاڑی میں بٹھاتا اور واپس لے جاتا۔ کسی نے آج تک انہیں آپس میں بولتے نہ دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی میں نے ہارلٹن والوں کو ان کا تذکرہ کرتے سنا جس کا مطلب شاید یہ تھا کہ ان کے لئے یہ بات تعجب انگیز نہ تھی۔

ایک رات دس بجے کا وقت تھا، میں اپنی خواب گاہ کی طرف سونے کے لئے جا رہی تھی کہ میرے دروازے پر موٹر کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ کچھ دیر میں ٹام ہیپسن میرے سامنے کھڑا کہہ رہا تھا۔ مس براؤن جلد میرے ساتھ آیئے۔ ڈاکٹر صاحب کہیں باہر گئے ہوئے ہیں جان بریلے موٹر کے نیچے دب کر مر گیا ہے اور اس کی موت کی اطلاع اس کی ماں تک آپ ہی کو پہنچانی ہوگی۔ کوئی مرد یہ جرأت نہیں کر سکتا کہ اس ضعیفہ کو اس کے بیٹے کے مرنے کی اطلاع دے"۔

میں ٹام کی موٹر پر سوار ہو کر مسز بریلے کے گھر پہنچی۔ میری دستک سے پہلے ہی دروازہ کھلا اور پتلی دبلی بڑھیا مسز بریلے نے ہاتھ میں چراغ لئے ہوئے دروازہ کھولا۔ یعنی وہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ ایسے بے وقت میرا وہاں کیا کام تھا

مسز بریلے، میں نے کہا۔ میں تمہیں بہت بری خبر دینے کے لئے آئی ہوں۔

اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور کچھ جواب نہ دیا۔

تمہارے لڑکے کے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا ہے۔ اس کی گاڑی کا تصادم ایک موٹر کے ساتھ ہوا جس سے اس کی گاڑی الٹ گئی۔ لوگ اس کے پاس صرف ایک گھنٹہ ہوا پہنچے ہیں۔ وہ۔ وہ"

"میں جانتی ہوں وہ مر گیا ہے، اس نے نہایت سکوت سے جواب دیا "وہ مر گیا ہے۔ یہی نا"

جان بریلے کی لاش گھر لائے جانے کے بعد میں تمام شب مسز بریلے کے ساتھ رہی۔ ڈاکٹر کو مسز بریلے کی اس خاموشی سے خدشہ تھا کہ مبادا اس کا دماغ اس صدمے کا متحمل نہ ہو سکے۔

چونکہ میں وہاں کی ڈسٹرکٹ نرس تھی۔ اس لئے لاش کے پاس تمام رات بیٹھنا میرا ہی فرض تھا۔ لیکن خلاف قیاس جب نشستگاہ کے پردے گرا دیئے گئے تو مسز بریلے مجھے سونے کے کمرے کی طرف لے چلنے کے لئے اٹھی۔

"اس کی خبرگیری میں کروں گی، اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا "میں موت سے خوف نہیں کھاتی۔ مس براؤن لاش کے پاس آپ کے بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔

میں نہ سمجھ سکی کہ اسے کیا جواب دوں۔ اس ضعیفہ کا سکوت کچھ بے تعلقی پر مبنی معلوم ہوتا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ میں سو جاؤں اور اسے

لاش کے پاس اکیلا بیٹھنے کے لئے چھوڑ جاؤں۔

مجھے حیران دیکھ کر اس نے پھر اپنی پہلی بات دہرائی اور کہنے لگی
تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ جان اور میں آپس میں تیس برس سے نہ بولے تھے۔

تیس برس، میں نے تعجب سے پوچھا

ہاں کامل تیس برس بعض آدمی بوڑھے ہو کر مر جاتے ہیں اور بعض عین شباب میں ہی مر جاتے ہیں۔ لیکن انہیں زندہ رہنا پڑتا ہے۔ جان آج نہیں مرا بلکہ اسے مرے آج تیس سال ہو گئے ہیں"۔

میرا خیال تھا کہ شدتِ غم سے بڑھیا کے دماغ کا توازن غلط ہو گیا ہے۔ لیکن وہ اپنا سر ہلا کر مسکرائی جس کا مطلب تھا کہ اس نے میرے خیالات کو بھانپ لیا ہے۔

میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں، اس نے کہا کہ جان دراصل میرا بیٹا نہ تھا۔

جان تمہارا بیٹا تھا، مسز بریلے یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔

ہاں۔ وہ میرا بیٹا نہ تھا۔ اسے مجھ سے دور کا تعلق بھی نہ تھا۔ لیکن اگر میں آج زندہ ہوں تو اسی کی وجہ سے۔ اس نے میری جان بچائی تھی۔

اب شاید تم سمجھ سکو تیس برس خیال تو کرو۔ کتنا لمبا عرصہ ہے۔ اب میں اس سزا کو اور زیادہ برداشت نہ کر سکتی تھی۔ ہم دونوں کو آپس میں گفتگو کئے تیس سال گذر چکے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت کے بعد بولنے کی چنداں حاجت بھی نہ رہی تھی۔ ایک مردہ آدمی کو بولنے کی خواہش نہیں ہوتی مس براؤن کیا تم میرے ساتھ متفق نہیں"۔

"بہتر ہوتا کہ تم مجھے لاش کے پاس بیٹھا رہنے دیتیں" میں نے کہا

"نہیں میں دیوانی نہیں اس نے جواب دیا۔ اگر تم بیٹھنا فرض سمجھتی ہو تو آؤ نیچے اتر آؤ۔ میں تمہیں جان کی موجودگی میں بتاؤں گی۔ آخر مجھے بھی کسی نہ کسی سے کہنے کا حق ہے۔ شاید وہ سن سکے۔ وہ مرنے کے بعد بھی تیس سال زندہ رہا۔

میں اس کے ساتھ ہی نیچے اتر آئی۔ جب وہ اپنی کہانی ختم کر چکی تو صبح نمودار ہو چکی تھی۔

میں اس کی کہانی کا صرف خلاصہ پیش کر سکتی ہوں جو اسی کے الفاظ میں ہوگا لیکن اگر میں نے کبھی انسانی دل کو پہلو سے چیرا ہوا اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا ہے تو وہ نظارہ میرے روبرو اسی رات پیش ہوا۔

مسز بریلے کی کہانی اسی کی زبانی

جب میں نے بریلے سے شادی کی۔ میری عمر انیس سال کی تھی۔ میرے ماں باپ ولٹشائر میں خوشحال زمیندار تھے سکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد میرے والد کا ارادہ تھا کہ میں کالج میں داخل ہو کر معلمہ بننے کی اہلیت پیدا کروں۔ لیکن عین اس وقت میری رائے بریلے سے ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں کو پہلی ہی ملاقات میں ایک دوسرے سے عشق ہو گیا تھا۔ وہ مجھ سے عمر میں چھ سال بڑا تھا۔ وہ مردانہ حسن کی تصویر تھا۔ ہمارے قصبہ میں وہ ایک زراعتی مشین بنانے والی کمپنی کا نمائندہ بن کر آیا تھا۔ وہ یہاں چار دن ٹھیرا جس کے دوران میں اس نے مختلف زمینداروں سے مشینیں خریدنے کے آرڈر لئے۔ اس کا طرزِ عمل کچھ ایسا تھا کہ عورت اور مرد اس کی طرف کھنچے جاتے تھے۔ میرے والد نے اسے پانچ سو پاؤنڈ کا آرڈر دیا۔

ہمارے گاؤں میں کوئی ایسی لڑکی نہ تھی جو سراسر اس کی محبت میں گرفتار نہ ہو۔ رائے میں ایک خاص انداز کی بے نیازی اور جوش تھا جس کو دیکھ کر بے اختیار یہ جی چاہتا تھا کہ تن من دھن اس پر نچھاور کر دیا جائے۔ اس کی ہمراہی میں میرا کوئی ایسا لمحہ نہ گذرتا۔ جب میں یہ احساس نہ کرتی کہ میں نے دنیا میں وہ چیز پائی ہے جس کی قیمت متعین نہیں کی جا سکتی۔

میرے والد نے اسے شام کے کھانے پر مدعو کیا ہوا تھا۔ اس نے پہلی ہی ملاقات پر میرا منہ چوم لیا۔ اس نے مجھے کہا کہ وہ ایک مہینے کے اندر اندر پھر واپس آئے گا اور اس میلہ میں مجھے لے چلے گا جو کچھ دنوں میں وہاں منعقد ہونا تھا۔

اس کے چلے جانے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس نے میرے علاوہ کئی اور لڑکیوں سے بھی یہ حرکت کی تھی۔

یہ اطلاع پا کر اوّل اوّل تو مجھے بہت غصہ آیا اور میری غیرت کو سخت ٹھیس لگی۔ میں نے حلف اٹھایا کہ میں رائے کو اس حرکت کا مزا چکھا کر رہوں گی۔ پہلے اس کا دل مٹھی میں لوں گی۔ اور پھر اس کا تمسخر اڑاؤں گی تم ایک ۱۹ برس کی لڑکی کے جذبات کا اندازہ لگا سکتی ہو۔

رائے نے میلہ پر میرے ساتھ چلنے کا وعدہ کیا تھا۔ رائے میں یہ وصف بدرجہ اتم تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو وہ اپنے وعدے کو ضرور پورا کرتا

اس کے ایفا میں کوئی جذبہ۔ احساس۔ فرض۔ ذمہ داری حائل نہ ہو سکتی تھی۔

میرے والد کی ذاتی رائے یہ تھی کہ اس نے رائے جیسا ایماندار آدمی کبھی نہ دیکھا تھا یہی وجہ تھی کہ اس نے رائے کو ایسی بھاری رقم کا آرڈر دیا تھا۔ رائے صاف گو تھا اور اپنی بات کا دھنی۔ جب وہ کہتا کہ وہ ایک بات کرے گا تو وہ کر کے رہتا۔ وہ جوانی کے نشے میں مخمور رہتا اور زندگی اس کے لئے ایک کھیل تھی۔

رائے اپنے وعدے کے مطابق واپس آیا۔ میرے والد نے اس کا استقبال اس طرح کیا۔ جیسے کوئی ہمارا دیرینہ شناسا ہو۔ میں جس انتقام کے منصوبے اتنے عرصے سے باندھ رہی تھی، اس کے دیکھتے ہی بھول گئی۔ اب مجھے صرف یہ احساس تھا، کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں اور کوئی چیز مجھے اس سے باز نہیں رکھ سکتی۔ میں یہ سن کر پھولی نہ سماتی تھی کہ وہ خاص طور پر اس لئے آیا ہے، کہ مجھے اپنے ساتھ میلے میں لے چلے۔

اس میلے میں کوئی لڑکی ایسی نہ تھی جو رائے کو اپنا دل نہ دے چکی ہو۔ مجھے رائے کی ہمراہی میں دیکھ کر ہر ایک کو رشک آرہا تھا۔ شام سے قبل ہی وہ میری زندگی کا ایک اہم جزو بن گیا۔ جب وہ کسی دوسری لڑکی سے مصروفِ گفتگو ہوتا، میں کن انکھیوں سے اسے دیکھتی اور فخر کرتی کہ ہم ایک دوسرے سے محبت تھی۔ گو اس محبت کا نشان صرف وہ پہلا بوسہ ہی تھا۔

رائے اس رات ہمارا مہمان تھا۔ جب میلہ ختم ہو گیا تو ہم گاڑی میں بیٹھ کر واپس گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ آدھے فاصلے تک ہم دونوں خاموش رہے۔ یکایک اس نے گھوڑے کی لگام تھام لی اور میری کمر میں باہیں ڈال کر کہنے لگا۔ 'یونی مجھے بوسہ دو'۔

'کیوں، میں نے جواب دیا 'تم یہاں کئی ایک لڑکیوں کا بوسہ لے چکے ہو'۔

'اوہ! وہ اور بات تھی۔ اس نے کہا۔ مجھے تم سے محبت ہے کیا تمہیں مجھ سے نہیں'۔

'ضرور ہے، میں نے کہا' لیکن میں اس وقت تک تمہیں بوسہ نہ دوں گی۔ جب تک تم مجھ سے شادی نہ کرو گے'۔

یہ بات مجھ پر اب واضح ہوتی ہے کہ مجھ سے شادی کرنے کا خیال اس کے دماغ میں کبھی نہ آیا تھا۔ اس وقت میں اس بات سے بالکل ناواقف تھی کہ رائے کے لئے یہ زندگی محض ایک دلچسپ کھیل کی حیثیت رکھتی ہے۔

'کیوں نہیں، اس نے مجھے جواب دیا' میں ضرور تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ دیگر لڑکیوں کا اور تمہارا مرتبہ میرے دل میں ایک ہی ہے۔ کیا وہ تمہارے رتبے کو پہنچ سکتی ہیں۔ ان کا بوسہ لینا تو محض ایک خوش آئند مذاق تھا۔ اس کے بعد میں ایسا نہ کروں گا'۔

میرے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے پیوست ہو گئے اور میں اپنا انتقام بھول گئی۔

دو ماہ کے بعد ہم دونوں کی شادی ہو گئی۔ ہنی مون گذارنے کے بعد ہم دونوں بوسٹن میں جہاں اس کی فیکٹری تھی۔ ایک گھر لے کر رہنے لگ گئے۔ گو میں اس وقت نہ جان سکی، لیکن اب مجھ پر یہ روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ شادی کے بعد بھی میں رائے کی محبت کما حقہٗ اپنی طرف مبذول نہ کر سکی تھی اس کے لئے میں ان لڑکیوں میں سے ایک تھی جن کا منہ اس نے پہلے دن ہمارے گاؤں میں آکر چوما تھا۔ اس کے دماغ میں یہ خیال کبھی نہ آیا تھا کہ شادی سے ایک مرد پر ایک ذمہ داری عاید ہو جاتی ہے۔ اس کے لئے محبت محض ایک جسمانی کشش کا نام تھا۔

رائے ملازمت کے سلسلے میں زیادہ عرصہ باہر رہتا۔ لیکن بالعموم وہ ہفتہ کے دن گھر پہنچ جاتا۔ ہم دونوں بہت خوش تھے۔ اس کا سلوک میرے ساتھ نہایت شریفانہ رہا۔ جب کبھی ہم دونوں اکٹھے سیر کو نکلتے تو وہ ایک نہایت خوش کن ہمراہی ثابت ہوتا۔ اس کا دھیان ہر وقت میری طرف رہتا۔ اس کی طبیعت میں شامل تھا کہ وہ اپنی ہمراہی میں دوسرے کو بشاش رکھے اور یہ بات کچھ میرے لئے مخصوص نہ تھی۔ ایک مرد ہمراہی کے ساتھ بھی اس کا سلوک ایسا ہی ہوتا۔ اس کے جذبات ابھی بیدار نہ ہوئے تھے۔ میں اپنا عندیہ صرف الفاظ میں ہی بیان کر سکتی ہوں۔

ان تمام باتوں کے باوجود میرے دوست مجھ پر رشک کرتے۔ میں خیال کرتی تھی کہ شاید شادی اسی کو کہتے ہیں۔ محبت کی کمی جو میں شروع ہی سے رائے کی طرف سے محسوس کر رہی تھی اب بھی ویسی ہی تھی لیکن میں نے اپنے آپ کو اس بات سے تسلی دے لی تھی کہ ایک آدمی ہر چیز اپنی خواہش کے مطابق حاصل نہیں کر سکتا۔ میرے لئے تو کافی کچھ مہیا تھا۔ کاش میں رائے کی اصل شخصیت پہچان سکتی۔ رائے کی طرف سے

سرد مہری بعض وقت میرے لئے پریشان کن ثابت ہوتی۔ لیکن جب مجھے احساس ہوا کہ میں ایک بچے کی ماں بننے والی ہوں تو میں سب کچھ بھول گئی اور اس وقت کے خواب دیکھنے لگی جب یہ بچہ میری گود میں ہوگا اور رائے کی طرف سے جو محبت کی کمی ہے اسے پورا کر دے گا۔

مجھے معلوم نہیں کہ کس شخص نے مجھے اخبار سے کاٹ کر وہ کتر بھیجی جس نے میرا تمام خیالی قلعہ یک لخت زمین پر گرا دیا۔ رائے کو باہر گئے ہوئے قریباً دو ہفتے ہوئے تھے۔ اس کتر سے ظاہر تھا کہ ایک لڑکی نے رائے پر دعویٰ دائر کیا ہے کہ وہ اس کے چھ ماہ کے لڑکے کا باپ ہے۔ رائے کا پتہ اور نام اس وضاحت سے چھپا ہوا تھا کہ شک کی گنجائش ہی نہ تھی۔

اگرچہ عدالت سے دعویٰ خارج ہو چکا تھا لیکن رائے کا تعلق اس لڑکی کے ساتھ ثابت تھا۔

رائے چوتھے دن واپس آیا۔ میں نے یہ تین دن نہایت اضطراب میں گزارے تھے۔ مجھے دیکھ کر اس نے متعجب ہو کر پوچھا "لیونی تم اداس کیوں ہو؟" اور مجھے بغل میں لے لیا۔

میں نے جھٹکا دے کر خود کو اس سے علیحدہ کیا اور میز پر پڑے ہوئے اخبار کی کتر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "ذرا پہلے اسے پڑھ لو۔"

میں اس خیال میں تھی کہ وہ اسے دیکھ کر گھبرا جائے گا۔ لیکن وہ خوب زور سے ہنسا "وہی پرانی بات۔ میں چاہتا تو نہ تھا کہ تمہیں اس کا علم ہو۔ یہ تو اس زمانے کی بات ہے جب میں نے تمہیں دیکھا بھی نہ تھا۔ یہ میرے خلاف پیش نہیں کی جا سکتی۔"

"کیوں نہیں،" میں نے جواب دیا "میں تمہارے پاس پاک دامن آئی تھی اور شادی کے وقت میں اپنے خاوند سے بھی یہی امید رکھتی تھی۔"

اس پر رائے نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ جیسے میں نے اسے ایک بہترین لطیفہ سنایا ہو۔

"اگر تمہارا یہ خیال ہے،" اس نے کہا "تو معلوم ہوتا ہے کہ تم زندگی کی اصلیت نہیں سمجھتیں۔ اگر میں فرشتہ ہوتا تب شاید یہ ممکن تھا۔ لیکن فرشتے دنیا میں موجود نہیں۔ جانِ من! بے وقوف مت بنو۔"

اس نے مجھے آغوش میں لے لیا۔ رائے میں ایک کشش تھی جیسا کہ میں بیان کر چکی ہوں، جس سے گریز ناممکن تھا۔ اس کے لئے یہ بات باعثِ شرم نہ تھی۔ اسی لئے اس نے معافی کی ضرورت بھی نہ سمجھی۔ میں یہ محسوس کرنے لگی کہ میں اس کے سامنے قدیم زمانے کے پادری کی حیثیت میں کھڑی رہی ہوں جسے صرف احمق تعین کر سکتے ہیں۔

جوں جوں دن گزرتے گئے۔ اس واقعہ کی اہمیت کم ہوتی گئی اور میں نے فرض کر لیا کہ تمام مرد ایسے ہی ہوتے ہیں اور رائے اس بات میں کچھ ایسا زیادہ موردِ الزام نہیں گردانا جا سکتا۔

کچھ دن بعد میرے ہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ میں نے اپنی لڑکی کا نام میمی رکھا۔ ابتدا سے ہی رائے کو اس کے ساتھ بہت محبت تھی اور وہ بھی اس کی ایسی گرویدہ ہو گئی کہ دو سال ہی کی عمر میں وہ رائے کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتی۔ بعض اوقات تو میں خود اس کی اس بڑھتی ہوئی محبت سے حسد کرنے لگتی۔

اس دوران میں مجھے ایک بات مشوش کئے رکھتی تھی۔ گو رائے کی تنخواہ کمیشن ملا کر خاصی معقول رقم پر مشتمل تھی۔ بایں ہمہ گھر میں کسی قسم کی فارغ البالی نہ تھی۔ رائے نہ تو شرابی تھا اور نہ ہی جوا باز۔ اس کے دوست بھی بظاہر شریف معلوم ہوتے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ میرے پاس کبھی اس کی تنخواہ سالم کی سالم نہ آتی تھی۔ جب کبھی میں اس کے متعلق دریافت کرتی۔ رائے مجھے ٹال دیتا۔ کبھی کہتا فلاں چیز کی قیمت اس ماہ ادا کی گئی۔ کبھی یہ کہ اس نے اس ماہ اپنے ماتحتوں کو پارٹی دی ہے۔ غرض میں اس دن کے انتظار ہی میں رہتی جب میں اس کی پوری تنخواہ لوں گی اور خرچ کر سکوں گی۔

میری شادی کا پانچواں سال تھا۔ میمی مشکل سے تین سال کی تھی کہ ایک دن رائے جب گھر واپس آیا تو اسے شدت سے بخار تھا۔ اس کے چہرے سے بشاشت مفقود تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ مشکل سے گھر پہنچ سکا ہے۔

ڈاکٹر کی تشخیص تھی کہ بخار نے تپ محرقہ کی صورت اختیار کر لی ہے اس کے مشورے کے مطابق رائے کو ہسپتال میں لے گئے۔ شروع ہی سے اس کے اس بیماری سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔

تیسرے ہفتے ایک رات مجھے اطلاع دی گئی کہ رائے صبح تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ جب میں اس کے پاس پہنچی اس کے حواس کلیتہً بجا تھے۔ میں اس کے پلنگ کے پاس دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔ میں نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر ازراہِ محبت دبایا۔ یہ قدرت کا ایک عجیب کرشمہ ہے کہ میں رائے کو اگر سمجھ سکی اس کے آخری وقت میں۔

جو کچھ اس رات اس نے بسترِ مرگ پر مجھ سے کہا۔ وہ ایک حکایت سی تھی یہ موقعہ اس سے ناراض ہونے کا نہ تھا۔ کون آدمی اس دنیا میں ایسا سنگ دل ہے جو دوسرے سے اس وقت ناراض ہو سکے جب وہ

بستر پر پڑا اپنے آخری سانس گن رہا ہو۔

"جانِ من" اس نے کہا "اگر میں جانبر نہ ہو سکا تو میں تم سے ایک فرض کی ادائیگی چاہتا ہوں ہم یہ سن کر خفا تو ہو گی۔ لیکن مجھے اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ تمہیں بابی کو اپنے پاس رکھنا ہو گا اور اس کی پرورش کی تم ذمہ دار ہو گی۔

"بابی کون" میں نے استفسار کیا۔

"میرا لڑکا" اس نے جواب دیا۔ اس کی ماں اس کی پیدائش کے چند ماہ بعد ہی مر گئی تھی۔ لیونی گھبراؤ نہیں۔ یہ برداشت کرنے کی کوشش کرو"

"تو کیا بابی کی ماں تمہاری منکوحہ تھی، میں نے پوچھا۔

"نہیں" میں اس سے ضرور شادی کر لیتا۔ لیکن شادی کی مقرر کردہ تاریخ سے دو ہفتے پہلے میری تم سے ملاقات ہو گئی۔ وہ کوشش کرتی رہی کہ مجھے تم سے علیحدہ کر دے۔ لیکن اس کی یہ کوشش رائیگاں گئی۔ میں طبعاً کمزور واقع ہوا ہوں میں نے اس سے قطع تعلق کر لیا۔"

"اس وقت بابی کی کیا عمر ہے"

وہ میسی سے چند ماہ ہی پہلے پیدا ہوا تھا" اس نے جواب دیا۔ میں لاچار تھا۔ کچھ نہ کر سکتا تھا۔" ہاں بیشک تم اس کا چارہ نہ کر سکتے تھے، میں نے اس سے متفق ہو کر کہا۔

اس لمحہ میں مجھ پر یہ روشن ہوا کہ کیوں رائے کی تنخواہ میں ہر ماہ کمی ہوتی تھی۔ بابی اپنی خالہ کے ہاں پرورش پا رہا تھا اور اس کے اخراجات کا کفیل رائے ہی تھا۔

"میری خواہش ہے، رائے پھر بولا کہ تم میسی کے ساتھ ہی اس کی پرورش کرو اور کبھی اس پر اس کی پیدائش کا حال ظاہر نہ کرو۔ اس کو یہ یقین دلانا کہ تم نے اسے گود لیا ہے۔ لیونی تم مجھ سے وعدہ کرتی ہو نا؟"

آخری وقت میں بھی اس کا ذاتی سحر مجھ پر اپنا وار کر گیا اور میں نے اسے اپنا قول دے دیا۔

صبح سے پہلے ہی رائے اس دنیا کو خیرباد کہہ گیا۔

رائے کے مرنے کے بعد میں بابی کو اس کی خالہ سے لے آئی اور رائے کی زندگی کے بیمہ کی رقم سے میں نے کیسک میں ایک ہوٹل جاری کیا اور یہاں میں دونوں بچوں یعنی میسی اور بابی کے ساتھ رہنے لگی۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ مجھے بابی سے شروع میں انتہائی نفرت تھی۔ اسے دیکھ کر میں اس کی مرحوم ماں سے حسد کرنے لگتی۔

موسم سرما کے آغاز میں دونوں بچے سکول میں داخل کر دیئے گئے۔ بابی جوں جوں بڑھتا گیا۔ اس کی رائے سے مشابہت زیادہ ہوتی گئی۔ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا کہ رائے ہی ایک بچے کی شکل میں میرے سامنے چل پھر رہا ہے اور یہی ایک بات تھی جو میرے لئے سب سے زیادہ تکلیف کا موجب تھی میں اس صدمے سے گو دیوانی نہ ہوئی لیکن میرے دماغ پر ایک غبار سا چھا گیا جس کا دور کرنا میرے لئے امر محال تھا۔ میری ہمیشہ سے یہ خواہش تھی کہ میں مرحوم رائے کی خدمت کرتی۔ لیکن رائے کو یہ کبھی منظور نہ ہوا اور اب جبکہ رائے میرے سامنے بابی کی صورت میں ایک چھوٹا بچہ بن کر آ گیا تھا میرا وہ جذبہ رفتہ رفتہ عود کرنے لگا اور بابی سے میری وہ ابتدائی نفرت الفت میں تبدیل ہوتی گئی۔

میں نے آغاز ہی سے اس پر واضح کر دیا تھا کہ میں نے اس کو گود لیا ہے اور وہ مجھے ممی کہہ کر پکارے۔ تھوڑے ہی عرصے میں میری ننھی میسی اور بابی ایک جان دو قالب ہو گئے۔ جب میں ان کو سکول اکٹھا جاتے دیکھتی تو کسی موہوم سی وجہ سے میرا دل مٹھی میں آ جاتا اور وہ غبار جس کا میں ذکر کر چکی ہوں۔ میرے دماغ پر چھا جاتا۔ گو میں اس وقت یہ پوری طرح نہ سمجھ سکتی تھی لیکن جو خطرہ مستقبل میں ظہور پذیر ہونے والا تھا میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا۔ میں محسوس کرتی کہ کسی نہ کسی طریق پر رائے کی معصیت کا کفارہ اس کے یہ دونوں بچے ادا کریں گے۔

میسی اور بابی دونوں نے سکول کی تعلیم سے فراغت پائی۔ اس کے بعد بابی کا خیال تھا کہ وہ قانون پڑھے گا اور میسی نے میرے پاس رہ کر مجھے ہوٹل کے انتظام میں مدد دینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ وہ نامعلوم سا خطرہ جسے میں اس وقت تک محض اپنے دماغ کی اختراع سمجھتی تھی مجھے اکثر مجبور کرتا اور میں کئی ایک نوجوانوں کو میسی کی توجہ کا مرکز بنانے کی کوشش کرتی۔ میں اندرونی طور پر خوش بھی تھی کہ بابا ہم سے جدا ہو رہا ہے۔

کبھی تم نے اپنی زندگی میں ایک المیہ ڈرامہ کا افتتاح دیکھا ہے۔ کیسی عام سی بات ہمارے سامنے پیش ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی کیسی لاعلاج اور یہی ڈراما اب میرے روبرو شروع ہونے والا تھا۔

جب بابا پہلے سال تعطیلات میں واپس گھر آیا اور میسی نے اس کا استقبال کیا تو اسی وقت سے ان کے اطوار سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ان دو ہستیوں کو جدا کرنا ناممکن ہے۔

باب کے جسم میں مرحوم رائے بس رہا تھا اور بیسی گویا میری ہی ذات کا دوسرا نام تھا۔ ہماری زندگی کے ڈرامے میں ہماری اپنی ہی اولاد کا کا تھی۔ مجھے ان دونوں کی محبت مخوف کئے دیتی تھی۔ وہ وقت قریب آ رہا تھا جب مجھے ان دونوں کو یا ان میں سے ایک کو حقیقت سے آشنا کرنا ہی ہو گا۔ میں دست بدعا رہتی کہ ان دونوں کی محبت وقتی ثابت ہو۔

میں جان بوجھ کر دوسرے نوجوانوں کو بیسی سے محبت کرنے کے لئے کہتی۔ لیکن بیسی کسی طرح بھی انہیں قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس کے دل میں باب کے سوا دوسرے کی جگہ ہی نہ تھی۔

بتدریج ہم دونوں یعنی میرے اور بیسی کے دلوں میں کدورت پیدا ہونے لگی بیسی کو یہ علم تھا کہ میں اس کی اس محبت کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھتی ہوں گو نہ تو اس نے کبھی مجھ سے اس کا تذکرہ کیا تھا اور نہ میں ہی اپنے میں کبھی یہ جرات پا سکی کہ اس ذکر کو چھیڑوں۔ لیکن یہ المیہ ڈراما بتدریج مختلف مراحل طے کرتا گیا۔

باب کو پھر دوسری تعطیلات پر واپس آنا تھا۔ اس دفعہ پھر قدرت مخالف سامان مہیا کر رہی تھی۔ ہوٹل کے تمام کمرے رک چکے تھے، اور لامحالہ ہم تینوں کو یک جا گذر کرنا تھا۔ باب آیا اور حسب گرم جوشی سے بیسی اس سے بغلگیر ہوئی۔ وہ ان کے اندرونی جذبات کو ظاہر کر رہی تھی۔ لیکن میں دل میں کہہ رہی تھی، نہیں نہیں تم ایک دوسرے کے لئے پیدا نہیں کئے گئے۔ میں اندھی نہیں۔

بیسی نے میری طرف دیکھ کر کہا، ماں تمہیں مدت سے علم ہے کہ میں اور باب ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ تم نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ ہم دونوں کو علٰحدہ کر دو۔ تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے پاس اس غلیظ اور بے ہنگام ہوٹل میں رہ کر تمہاری مدد کرتی اور سڑتی رہوں۔ تم ظالم ہو۔ بدطینت ہو،

باب میرے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے باہر آؤ۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں، میں نے باب کو مخاطب کر کے کہا۔ باب میرے ساتھ باہر آیا ہم دونوں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔

'چچی' اس نے مجھ سے سوال کیا۔ آخر یہ کیا معاملہ ہے،

اور جب میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو میرے سامنے گویا مرحوم رائے بیٹھا تھا۔ ہاں وہی رائے جو جوانی میں اس قدر بے باک۔ خندہ رو اور خبر ذمہ دار تھا۔

'تم' میں نے اس کو کہا 'کسی صورت میں بیسی سے شادی نہیں کر سکتے۔ مجھے تم سے آخر کہنا ہی پڑا۔ تمہارے باپ نے مرتے وقت مجھ سے یہ عہد لیا تھا کہ میں کبھی تمہیں اس راز سے آگاہ نہ کروں۔ کاش میں ایسی حماقت سے کام نہ لیتی اور تمہیں بچپن ہی سے خبردار کر دیتی۔

"میرا باپ" باب نے کہا 'میرا خیال ہے کہ میرا باپ تو مجھے تمہارے گود لینے سے پیشتر ہی مر گیا تھا،

'تمہارا باپ' میں نے کہا 'وہی تھا جو بیسی کا باپ اور میرا خاوند تھا"

اس کے بعد ایک سکوت سا چھا گیا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر باب کی طرف دیکھا۔ پھر وہی رائے میرے سامنے تھا۔ لیکن ایک نئے وجود میں جس سے میں واقف نہ تھی اور جس کے دل میں قدرے رحم اور زندگی کی تلخی کا احساس پیدا ہو چکا تھا۔

'ہاں میں سمجھ گیا'، باب نے آہستگی سے جواب دیا لیکن کاش مجھے یہ علم پیشتر سے ہوتا،' اس کے چہرے پر حقارت آمیز تبسم کھیل رہا تھا۔

میں گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور میں نے چلا کر کہا 'باب تم کیا کرنا چاہتے ہو،

'کچھ نہیں' اس نے بے تعلقی سے جواب دیا 'صرف بیسی کو حقیقت حال سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں، آخر یہ حق تو مجھ سے نہیں چھینا جا سکتا۔ چچی! کچھ دیر کے لئے ہم دونوں کو علیحدہ رہنے دو۔ میں اس کو آخری سلام کہنا چاہتا ہوں۔

'باب' میں نے کہا 'یقیناً تم مجھ سے بغیر ملاقات کئے رخصت نہ ہو گے

'ہاں بغیر تمہاری ملاقات کئے نہیں،

اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دئے اور میری پیشانی کو بوسہ دیا۔ کہنے لگا 'تم نے اس معاملے میں نہایت خوش اسلوبی سے کام لیا ہے۔ لیکن میں تم سے بہتر طریق پر بیسی کو اس امر کے متعلق اطلاع دے سکتا ہوں۔ ہم دونوں کو کچھ وقفہ کے لئے اکٹھا رہنے کی اجازت دو'

اس نے اپنا منہ پھیر لیا اور جانے لگا اس کے کشادہ شانے چلتے وقت پیچھے کی طرف سر جھکانا رائے کی خصوصیتیں تھیں۔ میرے سامنے رائے چلا جا رہا تھا۔

یہ خیال میرے دماغ میں اس وقت نہ آیا کہ ان دونوں کو یک جا چھوڑنا غلطی ہے۔ میں وہیں درخت کے نیچے بیٹھی اپنے خیالات میں مستغرق تھی۔ اب اس المیہ ڈرامے کا آخری سین تھا۔ اب تو بیسی کو ضرور

اصلیت سے واقف ہونا تھا۔ میری رائے میں معاملہ اتنا نہیں بگڑا تھا کہ سلجھ نہ سکے۔ وہ جلد ہی ایک دوسرے کو بھول جائیں گے جس وقت میں گھر جاؤں گی۔ باب آہستہ آہستہ سنبھل جائے گا لیکن میسی اس کے متعلق مجھے یقین نہ تھا۔ لیکن میسی بھی بھول ہی جائے گی۔ وہ ابھی بالکل نوعمر ہے اور نوعمر جلد بھول جایا کرتے ہیں۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ میں ہوٹل جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ دور سے مجھے ایک کشتی جھیل میں جاتی دکھائی دی۔ بظاہر یہ معمولی بات تھی۔ بابی جو کشتی کو جھیل میں دار رہا تھا ایک ماہر ملاح تھا۔ لیکن میں پھر بھی خوفزدہ تھی میں دوڑ کر کشتی کے پاس پہنچی۔ میسی کشتی میں بیٹھی تھی اور بابی کا ایک پاؤں کشتی کے باہر اور ایک اس کے اندر تھا۔

دونوں نے میری طرف دیکھا۔ شام کے دھندلکے میں وہ دونوں غیر مرئی معلوم ہو رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں کچھ ایسی چمک تھی کہ میرا دل بیٹھ گیا۔

میں ان کی مرضی معلوم کئے بغیر کشتی میں ان دونوں کے درمیان بیٹھ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پر معنی نظروں سے دیکھا اور باب کشتی چلانے میں مصروف ہو گیا۔

دوسرے لمحے ہوا کشتی کو جھیل کے وسط میں لے چلی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

رہ رہ کر میرے دماغ میں یہ سوال اٹھتا کہ ایسے وقت ان کا کشتی میں نکلنا کیا معنی رکھتا ہے۔ کیا ان کا ارادہ خودکشی کرنے کا تھا۔ کچھ بھی ہو میرے آنے سے ان کے تمام ارادے درہم برہم ہو گئے تھے۔ میں خاموش بیٹھی تھی اور کشتی ہمیں جھیل کے عین وسط میں لے جا رہی تھی

آخر میں نہ رہ سکی۔ میں نے باب کو پکارا "باب تم کہاں جا رہے ہو آور آگے جانے کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ ہم پہلے ہی کنارے سے بہت دور آ چکے ہیں۔"

باب نے میری طرف مڑ کر دیکھا اور کہنے لگا "ہاں چچی تم ٹھیک کہتی ہو۔ آگے جانا بے سود ہے۔" میں نے محسوس کیا کہ باب کے ان الفاظ میں ایک خاص مطلب پنہاں تھا۔ اس نے جلدی سے کشتی کا رخ کنارے کی طرف پھیرا۔ اچانک شمال کی طرف سے ایک طوفان اٹھا اور باب کی کوشش کے باوجود کشتی بے قابو ہو کر الٹ گئی اور میں اور میسی برف جیسے سرد پانی میں کشتی کے نیچے دب گئے۔

باب غوطے کھاتا ہوا میرے پاس پہنچا اور مجھے بلند آواز سے پکار کر کہنے لگا "چچی سنبھلو ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دو میں تمہیں کنارے پر بحفاظت پہنچا دوں گا۔"

پھر میسی کو چلا کر کہا "میسی تم خود کو سنبھالے رکھنا میں چچی کو کنارے پر پہنچا کر ابھی آیا۔"

میسی اچھی خاصی تیراک تھی۔ لیکن میں تیرنے میں بالکل نااہل تھی۔

میں نے سنا کہ میسی باب کو یقین دلا رہی تھی "باب میں خیریت سے ہوں تم فکر نہ کرو۔"

جب میں کنارے پر پہنچی۔ سردی سے نیم جان ہو چکی تھی۔ بمشکل تمام باب کو میسی کے بچانے کی ہدایت کر سکی۔ باب مجھے چھوڑ کر پھر جھیل میں غوطہ زن ہوا اور میں نے اسے میسی میسی پکارتے سنا۔ اس کے تیرنے کی آواز میرے کان میں آئی۔ اس کے بعد میں بیہوش ہو گئی۔

ایک عرصے کے بعد باب کے ہلانے پر مجھے ہوش آیا۔ میں نے میسی کے متعلق دریافت کیا۔ لیکن باب نے بجائے جواب دینے کے ایک کالے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا جو کچھ فاصلے پر پڑا تھا۔

میں گھسٹتی ہوئی۔ اس ڈھیر کے پاس پہنچی۔ میں نے میسی کے چہرے کو چھوا اور جان لیا کہ وہ اب اس خواب سے بیدار نہ ہوگی۔

باب نے مجھے ایک طرف دھکیل دیا اور خود میسی کے ہاتھ پاؤں کو حرکت دیتا رہا۔ وہ اس عمل کو نہ معلوم کب تک جاری رکھتا۔ لیکن میں جا کر ایک ڈاکٹر کو بلا لائی۔ جس نے بصد مشکل باب کو میسی کی موت کا یقین دلا کر اسے اس بے سود کوشش سے باز رکھا۔

میسی مر چکی تھی اور اس نے اپنے باپ کے اس ظلم کا کفارہ ادا کر دیا تھا۔ جو اس کے باپ نے باب کی ماں کے ساتھ روا رکھا تھا۔

میسی کے تجہیز و تکفین کے بعد میں نے ہوٹل بیچ دیا اور باب اور میں ہارلٹن میں آ گئے۔ یہاں پہنچتے ہی کھیتی باڑی کا کام شروع کر دیا۔ یہاں ہر نفس اس کو جان بریلے کے نام سے جانتا تھا اور میرا لڑکا سمجھتا تھا۔ تم اور وہ سب ہمارے آپس میں نہ بولنے پر حیران تھے۔

اس رات سے جس رات میسی مری۔ میرے اور باب کے درمیان کبھی گفتگو نہ ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ کوئی موضوع ایسا رہ بھی نہ گیا

تھا جس کے متعلق ہم آپس میں بولتے۔

اکثر اوقات میں سوچتی ہوں کیا وہ دونوں جھیل میں خودکشی کرنے کے لئے جا رہے تھے۔ لیکن اب یہ سوچ بے فائدہ ہے۔

باب نے میری جان بچائی تھی اور میبی نے میری خاطر اپنی جان دی تھی۔ بس یہی میری رام کہانی ہے۔

لیکن جیسا تمہیں اب واضح ہوگیا ہوگا۔ باب آج نہیں آج سے تیس برس پیشتر مر چکا تھا۔ آج باب نہیں بلکہ جان بریلے مرا ہے وہ میرے جسم اور خون کا حصہ نہ تھا۔

خدا اس کی روح کو آسودگی بخشے۔

منظور ڈیرہ غازیخاں

رباعی

خمخانۂ آسماں میں اک جام ہے چاند
یا بامِ فلک پہ اک گلفام ہے چاند
ہے روح فزا اس کی ایک ایک کرن
یہ حسن کی عشق کا پیغام ہے چاند

اثر صہبائی

وہ رات!

وہ رات!
میرے پیارے محبوب
کتنی حسین تھی وہ رات
جب ہماری روحیں
محبت کے شفاف نور سے روشن ہو چکی تھیں ہمارے دھڑکتے دل ایک دوسرے کے قریب تھے

ہاں میرے محبوب
کتنی رومان انگیز تھی وہ تاریکی رات جب قدرت کی شہزادی
انسانی وادیوں کو سنہری چادر میں لپیٹ چکی تھی۔
جب یہ دنیا سونے کے دریا میں ڈوبا ہوا
سنہرا کھلونا معلوم ہوتی تھی

ہاں میری روح کے معبود
کتنی سحر آفریں تھی وہ رات جب جھلکتے ستاروں
اور آسمان پر جگمگاتے چاند کی حکومت میں ہماری روحیں محبت کے پر لگائے
پہاڑوں کی چوٹیوں۔ گھاٹیوں
زلف کی طرح بل کھاتی ندیوں
شفاف چشموں۔ گوہر بار آبشاروں
آبشاروں کے شیریں نغموں
مشکبار و عطر بیز ہواؤں
لالہ زاروں کی جلوہ ریز فضاؤں
سے گزر رہی تھیں

ہاں میرے مقدس دوست
کتنی دلکش تھی وہ سنہری رت
جس کے تصور میں اب
میرا دل ہے سوگوار
میری آنکھیں بھری بھری

الف۔ ایم ساقی

جامِ صہبائی

(۱)

مے عیش و نشاط کی پلاتی آئی
خُم کیف و سرور کے لنڈھاتی آئی
داماں جہاں سے بھر گیا پھولوں سے
یوں فصلِ بہار مسکراتی آئی

(۲)

پھولوں سے بھرا ہوا ہے دامانِ بہار
یا بحرِ جہاں میں ہے طوفانِ بہار
ہر پھول دھلا ہوا ہے کوثر میں اثرؔ
فردوس سے ہو رہا ہے بارانِ بہار

(۳)

باغوں میں نہیں ہے کہساروں میں نہیں
سورج میں نہیں ہے چاند تاروں میں نہیں
وہ حسن کہ ہے بتوں میں جلوہ پیرا
فطرت کے حسیں تریں نظاروں میں نہیں

(۴)

ہنگامۂ فصلِ گل ہے ہنگامۂ رنگ
ہے بربطِ رنگ سے رواں نغمۂ رنگ
میخانۂ رنگ ہے گلستانِ جہاں
ہر ساغرِ رنگ ہے صہبا بادۂ رنگ

اثرؔ صہبائی

طلسمِ گفتار

سرد آہیں بھروں گا، تو جوانی میں بھروں گا — مرنے کا ہے موسم یہی، جی بھر کے مروں گا

تو پیکرِ انساں میں، مرے سامنے آ جا — یارب میں تجھے صدق بھرا سجدہ کروں گا

جو بات چھپاتا ہوں، وہ ہے پہلے ہی رسوا — لیتے ہیں ترا نام کہ میں آہ بھروں گا

آجاتی نہیں خود لب پہ مرے، آپ کی باتیں — اندیشہ ہے، میں آپ کو بدنام کروں گا

مرنا ہے تو پھر مرگِ حسیں کیوں نہ خریدوں — جاں دے کے عدم عشق کی تکمیل کروں گا

اے عشق! وہ بت رونقِ بت خانہ بنا دے — جو ہستیٔ یزداں کو بھی افسانہ بنا دے

ہے عشرتِ دیوانگیٔ عشق عجب چیز — دیوانہ بنا دے، مجھے دیوانہ بنا دے

ہر فکرِ جگر سوز کی بنیاد خرد ہے — اے دوست مجھے عقل سے بیگانہ بنا دے

گمنام ہوں، ناپید ہوں، گویا کہ نہیں ہوں — کیا دیکھ رہا ہے! مجھے افسانہ بنا دے

ہو سکتا ہے افسانے کا گر تو متحمل — پھر مجھ کو بڑے شوق سے افسانہ بنا دے

اے زاہدِ کم فہم! تجھے علم بھی ہے کچھ؟ ق — دل کعبہ نہیں ہے اسے بتخانہ بنا دے

اللہ بھی اک بت ہے، بتِ اعظم و یکتا — اس رازِ دل آویز کو افسانہ بنا دے

دل مانگا تھا یارب یہ تجھے کس نے کہا تھا — پہلو میں مرے چھوٹا سا غم خانہ بنا دے

یہ آپ کی دزدیدہ نگاہی کہیں یوں ہی — دل میں مرے اک شہرِ تمنا نہ بنا دے

ہستی مری رہ جائے نہ جز نشہ و مستی — یوں دیکھ مجھے لغزشِ مستانہ بنا دے

اے جانِ عدم آ مری گفتار میں ڈھل جا
ہر شعرِ صنم رنگ کو بت خانہ بنا دے

عدم

کرشمۂ الفت

ذیل کی سطور روس کے مشہور ناول نگار ایوان الگزنڈر و وچ گونچاروف (۱۸۱۲ء - ۱۸۹۱ء) کے ناول ابلوماف رجو ہیرو کے نام سے منسوب ہے کے ایک باب کا ترجمہ ہے ابلوماف ، مصنف کا غیرفانی کردار ہے ۔ اُس نے اپنے کردار کی تصویر اس سچائی ، ہمدردانہ ظرافت اور صفائی سے اتاری ہے کہ دنیائے ادب میں شیکسپیر کے ہیملٹ اور ٹورگنیف کے تارتوف کی طرح ابلوماف بھی ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے ، روسی ادب میں "ابلومافیت" ایک بیماری کا نام ہے جو کاہلی ، آرام طلبی ، اور لیت و لعل کی عادت کا ہم معنی ہے ، اس میں شک نہیں کہ ماقبل انقلاب روس کی یہ مخصوص بیماری تھی ، لیکن اگر تجسس کیا جائے تو ہر قوم میں چند ایسے افراد نظر آئیں گے جن کی زندگی میں ابلومافیت کا ایک ہلکا سا عکس نظر آتا ہے ، ابلوماف ایسا کاہل انسان تھا جس کا عملی پہلو بالکل مردہ تھا ۔ جانتک بن پڑا اُس نے ہر کام کو کل پر اٹھا رکھا ، نہ کرنے کا عذر ڈھونڈا بہانہ تلاش کیا ۔ ارادے کئے لیکن کسی کو پورا نہ کیا ، بستر اس کا رفیق ، ڈریسنگ گاؤن اس کا مونس اور نیند اس کی دولت تھی ، بستر سے ہم آغوش ہو کر وہ دن کو خواب دیکھا کرتا اور اس لذت پر اس نے ہر چیز ، روح ، جسم ، جوانی ، زندگی ، مال اور دولت سب کو بھینٹ چڑھا دیا ، اس کے نیم روسی دوست اسٹولٹز نے اس کی زندگی کے عملی پہلو کو بیدار کرنے کی سعی کی اور اُس المناک انجام سے جو قسمت کے لکھے کی طرح ناگزیر تھا بچانا چاہا ، اولگا کو اس کی نجات کا وسیلہ سمجھ کر اس کا ابلوماف سے تعارف کرایا اولگا بہت زیادہ حسین نہ تھی ، لیکن اُس کے متناسب اعضا میں ایسی بے پناہ دلفریبی تھی جس کی کشش سے کوئی انسانی قلب محفوظ نہیں رہ سکتا تھا ، اس کی آواز میں ایک جادو تھا ، جو آہستہ آہستہ دماغ کو مسخر کر کے انسان کو از خود رفتہ بنا دیتا تھا ، جب وہ گانے لگتی تو ابلوماف کے مردہ دل بھی ایک ہیجان برپا ہو جاتا ، اس کی روح وجد کرنے لگتی اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو جاتا ، ایک ایسے ہی لمحے میں جبکہ اولگا نے اپنے سحر بار نغمہ سے ابلوماف کو مسحور کر دیا تھا ، وہ ایک عالم وارفتگی میں اولگا سے اپنی محبت کا اظہار کر دیتا ہے ، اور پھر ہوش آتے ہی احساس ندامت سے اولگا کے پاس سے اٹھ کر چل دیتا ہے ، ذیل کا واقعہ اسی کے بعد کا ہے ۔

اس واقعے کے بعد چند دنوں تک ابلوماف اور اولگا کی پھر تنہائی میں ملاقات نہ ہوئی ، جب کبھی ابلوماف کی نگاہ اولگا پر پڑ جاتی تھی تو وہ اسکول کے ایک طالب علم کی طرح چھپ جاتا ، اولگا کا رویہ بھی بدل گیا تھا ، حالانکہ وہ اُس سے نہ اجتناب کرنا چاہتی تھی اور نہ سرد مہری ہی سے پیش آتی تھی ، البتہ ذرا خاموش سی ہو گئی تھی ، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہ سوچ کر فکرمند تھی کہ ایسا واقعہ کیوں رونما ہوا جس کی وجہ سے وہ اس لطف سے محروم ہو گئی جو اُسے ابلوماف کو اپنی متنفسرانہ نگاہوں سے ستانے ، اس کی کاہلی پر نیک نیتی سے طعنہ زنی کرنے اور اُس کی آرام طلبی و پھوہڑ پنی پر لعنت ملامت کرنے میں حاصل ہوتا تھا ، ابلوماف کی ہنسی اڑانے میں اُسے ایک خاص مزہ ملتا تھا ، لیکن اس کے تمسخر میں عداوت کا کوئی پہلو نہ تھا ، بلکہ یہ ہنسی اس مسکراہٹ کے برابر تھی جو ایک ماں کے لبوں پر اپنے بیٹے کو مسخرے کے لباس میں ملبوس دیکھ کر پیدا ہو جاتی ہے ۔ اسٹولٹز بھی جا چکا تھا ، اور اب وہاں کوئی ایسا شخص موجود نہ تھا جس کو وہ اپنی نغمہ سرائی سے محظوظ کر سکے ، اس کا پیانو بند پڑا تھا ، دونوں کے دلوں پر احساس تنہائی سے ایک افسردگی سی چھائی ہوئی تھی ، اولگا کے دل میں رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ دونوں کے ابتدائی مراسم کس قدر خوشگوار تھے ، دونوں میں کتنا جلد تعارف ہو گیا تھا اور کس آسانی سے دونوں دوست بن گئے تھے ، اسٹولٹز کی نسبت ابلوماف زیادہ سادہ مزاج اور نرم دل واقع ہوا تھا ، یہ سچ تھا کہ اسٹولٹز کی طرح ابلوماف اولگا کی دل جوئی نہیں کر سکتا تھا ، لیکن اس کی فطری حرکتوں سے اولگا کا دل بہل جاتا تھا ، پھر وہ ہمیشہ اس کے تمسخر اور ہنسی کو معاف کر دینے کے لئے تیار رہتا تھا ، اس کے علاوہ اسٹولٹز نے چلتے وقت اولگا کو تاکید کر دی تھی کہ وہ ابلوماف کی خبرگیری کیا کرے اور اسے گھر میں پڑے رہنے سے باز رکھے اولگا نے اپنے ذہن میں ترکیبیں ایجاد کر لی تھیں کہ کس طرح وہ ابلوماف کو کھانے کے بعد سونے نہیں دے گی ، بلکہ دن کے وقت اُسے لیٹنے کا موقع ہی نہ دے گی ، جو وعدہ اُس نے اسٹولٹز سے کر لیا تھا اسے پورا کر کے رہے گی ، وہ خواب دیکھا کرتی کہ وہ ابلوماف کو اُن کتابوں کو پڑھنے کی رغبت دلائے گی جنہیں اسٹولٹز

چھوڑ گیا تھا، اُس سے اخبار پڑھا کرے گی، دیہات کے کارندوں کو خط لکھوائے گی۔ زمینداری کے انتظام کا خیال دلائے گی، باہر چلنے کے لئے آمادہ کیا کرے گی، کسی طرح بھی اُسے بے کار بیٹھ کر اونگھنے نہ دے گی، اور ہر وقت ایک نہ ایک کام اُس کے سامنے پیش کر دیا کرے گی۔ اُن چیزوں کا ہوش دلائے گی جن سے وہ رفتہ رفتہ غافل ہو گیا تھا۔ غرض وہ اس کی عادتوں میں اس قدر تغیر پیدا کر دے گی کہ واپس آنے پر اسٹولنٹز اس کو پہچان نہ سکے گا، وہی شرمیلی سی خاموش طبیعت والی لڑکی اولگا جس نے ہنوز دنیا کی زندگی میں قدم نہیں رکھا تھا، جس کی اطاعت کے لئے ہنوز کسی نے سر خم نہیں کیا تھا، دنیا کے سامنے ایک معجزہ پیش کر دے گی، وہ تبدیلِ فطرت کا باعث بن جائے گی، اُس نے اپنی تجاویز پر عمل کرنا بھی شروع کر دیا تھا، اور ابلوماف میں اُسی دن سے تبدیلی سی پیدا ہونے لگی تھی۔ جس دن اس نے اولگا کو گاتے سنا تھا۔ اب اس میں زندگی آ جائے گی اور دنیا کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے گا، وہ اس احسان کے لئے اولگا کو دعائیں دے گا، مردہ جسم میں روح پھونکنا! اگر اُس ڈاکٹر کی جو ایک مایوس مریض کو دوبارہ تندرست کر دیتا ہے بے انتہا تعریف و توصیف ہوتی ہے تو پھر اس عورت کی کیا کم تعریفیں ہوں گی جس نے ایک روح و دماغ کو جو اخلاقی حیثیت سے مردہ ہو رہے تھے۔ از سرِ نو زندگی بخشی، اس خیال سے شادمانی اور فخر کی ایک کپکپی اس کے سارے جسم میں محسوس ہوتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ قدرت نے اسے اس فرض پر مامور کیا تھا، اُس نے اپنے تصور میں ابلوماف کو اپنا سیکرٹری اور اپنی لائبریری کا محافظ بنا رکھا تھا۔ اب اس کی ساری امیدوں کا خاتمہ ہونے والا تھا، وہ حیران تھی کہ کیا کرے، لہٰذا جب اس کا سامنا ابلوماف سے ہو جاتا تھا تو اُسے چُپ سی لگ جاتی تھی۔

ابلوماف کے لئے یہ خیال سوہانِ روح ہو رہا تھا کہ اُس نے اولگا کو آزردہ خاطر کر دیا تھا، جب وہ اُسے دور سے دیکھتا تو اُس کی برق پاش نگاہوں اور عفت شعاری سختی کے خوف سے لرزہ براندام ہو کر الگ ہٹ جاتا، وہ ٹہلنے کے لئے جنگل کی طرف چلا جاتا یا دیہات کو نکل جاتا اور وہاں کسی جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھ کر بچوں کو کھیلتے اور بطوں کو تالاب میں تیرتے دیکھتا رہتا۔ اُس کے مکان کے نزدیک ایک بڑا پارک تھا، وہاں وہ اس خوف سے نہیں جاتا تھا کہ مبادا اولگا کا سامنا ہو جائے، وہ سوچتا تھا کہ میں نے کیوں ایسی بات منہ سے نکالی!" لیکن کبھی اس نے دل میں یہ غور نہیں کیا کہ آیا اس کے الفاظ میں صداقت تھی یا نہیں! وہ دل کی گہرائیوں سے نکلے تھے یا صرف نغمہ کے عارضی اثر کی پیداوار تھے۔ افسردگی، اور ندامت جسے وہ ذلت کا مرادف سمجھتا تھا اُسے اتنا موقع بھی نہ دیتی تھی کہ وہ اپنے الفاظ کا تجزیہ کرے یا سوچے کہ اولگا سے اس کا کیا تعلق تھا، وہ یہ بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ کون سی چیز اس کے دل کے اندر داخل ہو گئی تھی، ایک بار تھا جو اس سے قبل وہاں موجود نہ تھا، اس کے سارے جذبات ندامت کے احساس سے مغلوب ہو گئے تھے، لیکن جب ایک لمحے کے لئے بھی وہ اولگا کا خیال دل میں لاتا تو اُس کی نگاہ تصور کے سامنے اولگا کی تصویر آ کر کھڑی ہو جاتی جو سکون، زندگی اور مسرت کا مجسمہ معلوم ہوتی تھی، "آہ! یہ میں نے کیا کر لیا" وہ سوچتا "میں نے سب بنا ہوا کھیل بگاڑ دیا، شکر ہے کہ اسٹولٹنز یہاں موجود نہیں اولگا کو اُس سے کہنے کا موقع نہ ملا، نہیں تو میں زمین میں سما جانے کی دعائیں کرتا، محبت، آنسو . . . نہیں یہ میرا شیوہ نہیں۔ اولگا کی خالہ نے آج مجھے نہ اپنی خیریت کہلا بھیجی اور نہ چائے ہی پر بلایا، اولگا نے ضرور کہہ دیا ہو گا۔ اے میرے اللہ!" ان خیالات میں مستغرق وہ پارک کے درمیان ایک روش پر چل رہا تھا۔

اولگا کو صرف مشکل یہ تھی کہ وہ ابلوماف سے ملے گی کس طرح، کیا اس واقعے کے متعلق اُسے کچھ کہنا چاہئے یا اس طرح پیش آنا چاہئے کہ جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی تھی! لیکن آخر وہ بولے گی کیا! آیا اُسے ترش روئی برتنا چاہئے یا مغرورانہ انداز اختیار کرنا چاہئے، یا اُس کے چہرے کی طرف دیکھے بغیر روکھے پن اور سختی سے اتنا کہہ دینا چاہئے کہ "مجھ کو تم سے ایسی امید نہ تھی" اس نے اولگا کو کیا سمجھ کر اس قدر گستاخی سے گفتگو کی تھی۔ لیکن کیا یہ واقعی گستاخی تھی! اُس نے اپنے دل سے پوچھا "اگر اس کے جذبات میں اصلیت تھی تو پھر ان کو ظاہر کر کے اُس نے کون سا قصور کیا، . . . لیکن بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے ابھی تو میری اور اس کی اچھی طرح شناسائی بھی نہیں ہوئی، وہ میری طبیعت سے اچھی طرح واقف بھی نہیں ہے، کوئی مرد کسی عورت کو صرف تین چار بار کی ملاقات کے بعد ایسی بات نہیں کہہ سکتا، اور نہ کوئی اس قدر جلد محبت میں گرفتار ہو سکتا ہے، اس طرح کی باتیں صرف ابلوماف سے ہی ممکن ہیں"۔ لیکن اب اُسے یاد آیا کہ اُس نے پڑھا تھا کہ کبھی کبھی محبت اپنا اثر جلد دکھاتی ہے۔" وہ جذبہ سے مغلوب ہو گیا تھا۔ جذبات کی ایک رو اُسے اچانک بہا لے گئی، اب وہ میرے نزدیک آنے سے ڈرتا ہے اور نادم معلوم ہوتا ہے، لہٰذا یہ اس کی گستاخی نہ تھی، پھر یہ قصور کس کا ہے!"

وہ حیران تھی، اس نے سوچا کہ بے شک سارا قصور اسٹولنٹز کا تھا۔ کیونکہ اسی نے اولگا کو گانے پر آمادہ کیا تھا، لیکن ابلوماف تو پہلے سننا نہیں چاہتا تھا، وہ آزردہ ہوگئی تھی اور اس نے اس بات کی کوشش . . . رشدت غیرت سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا) ہاں اُس نے حتی الامکان کوشش کی کہ اس کے جذبات کو بیدار کر دے، اسٹولنٹز نے اُس سے کہا تھا کہ ابلوماف دنیا کی ساری چیزوں سے بیزار ہوگیا ہے، وہ کسی چیز میں بھی دلچسپی نہیں لیتا ہے اور اس کے اندر سارے حسیات مردہ ہو چکے ہیں، اس لئے اولگا نے آزمانا چاہا کہ واقعی ایسا ہے یا نہیں اور اس نے ایسا گایا کہ اس سے قبل کبھی نہیں گایا تھا "!

"آہ، یہ میرا قصور تھا، مجھے اس سے معافی مانگنی چاہئے . . . لیکن کس لئے؟" اُس نے دل سے سوال کیا" میں اس سے کیا کہوں گی، مسٹر ابلوماف، قصور وار میں ہوں، میں ہی نے تمہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی، کس قدر ذلت کی بات ہے نہیں نہیں یہ جھوٹ ہے" وہ چیخنے اور غصے سے زمین پر پیر پٹکنے لگی "کس کی اتنی ہمت ہے کہ یہ گمان کر سکے . . . بھلا مجھے کیا خبر تھی کہ وہ اس طرح متاثر ہو جائے گا اگر ایسا نہ ہوتا اگر اس کے منہ سے ایسی بات نہ نکلتی تو کیا ہوتا ، میں نہیں کہہ سکتی" اُس نے سوچا اُسی شام سے اس کے دل میں عجیب قسم کے جذبات پیدا ہو رہے تھے اُسے بے حد صدمہ پہنچا تھا، اُسے حرارت سی معلوم ہوتی تھی اور اس کا گال تمتایا ہوا تھا، . . . "اعصابی ہیجان . . . خفیف حرارت" ڈاکٹر کی یہی تشخیص تھی" یہ سب ابلوماف کا کیا ہوا ہے، آہ! میں اُسے ضرور سبق سکھاؤں گی تاکہ پھر ایسی حرکت کا اعادہ نہ ہو، میں خالہ جان سے کہہ دوں گی کہ وہ اُسے اپنے گھر نہ آنے دیں، اُسے اپنی حقیقت کو بھولنا نہیں چاہئے اُس نے جرأت کیسے کی" ان خیالات میں ڈوبی ہوئی وہ پارک میں مصروف خرام تھی، غیظ و غضب میں اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

یکایک اُس نے کسی کی آہٹ سنی۔

"کوئی آ رہا ہے" ابلوماف نے سوچا

دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔

"اولگا سرجیونا!" ابلوماف نے کہا، اس کا بدن پتے کی طرح کانپ رہا تھا،

"ابلوماف!" اولگا نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا،

دونوں ٹھٹک گئے

"خیر الصباح" ابلوماف نے کہا

"خیر الصباح" اولگا نے جواب دیا

"تم کہاں جا رہی ہو؟" اُس نے پوچھا

"کسی خاص جگہ نہیں" اُس نے اپنا سر اٹھائے بغیر جواب دیا

"میری وجہ سے تمہیں خلل تو نہیں ہوا؟"

"نہیں، مطلق نہیں" اولگا نے اپنی متجسسانہ نگاہوں سے بسرعت دیکھ کر جواب دیا

"تو کیا میں تمہارے ساتھ چل سکتا ہوں؟" اُس نے اچانک اولگا پر ایک مستفسرانہ نگاہ ڈال کر پوچھا

دونوں ایک روش پر خاموشی کے ساتھ ٹہلتے رہے، جس شدت کے ساتھ آج ابلوماف کا دل دھڑک رہا تھا اُستاد کے ڈنڈے کے ڈر سے بھی نہیں دھڑکا تھا، وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، اور اُس نے بولنے کی انتہائی کوشش کی، لیکن زبان حرکت نہ کرتی تھی، صرف اُس کا دل خوفناک طریقے پر دھڑک رہا تھا، گویا اُس پر کوئی مصیبت آنے والی ہے۔

"اسٹولنٹز کے یہاں سے کوئی خط آیا ہے؟" آخر اولگا نے دریافت کیا۔

"ہاں ایک خط آیا ہے"

"کیا لکھا ہے؟"

"اُس نے مجھے پیرس بلایا ہے"

"تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"میں جاؤں گا"

"کب؟"

"کچھ دنوں بعد . . . نہیں، کل . . . جس قدر جلد میں نیا رہ سکوں گا"

"اس قدر جلد کیوں؟" اس نے پوچھا

ابلوماف نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"کیا تمہیں اپنا مکان پسند نہیں ہے؟ . . . بتاؤ تم کیوں جانا چاہتے ہو؟"

"ڈھٹائی تو دیکھو کہ یہاں سے جانا چاہتا ہے" اس نے دل میں سوچا "کسی چیز نے مجھے کمزور اور بدحال بنا رکھا ہے جس کی وجہ سے میں نہایت اذیت میں مبتلا ہوں" اُس نے دبی آواز میں اولگا کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ وہ

چپ تھی، پھر اُس نے لیلاج کے پھولوں کا ایک گچھا اٹھا کر اُسے سونگھنے کے بہانے اپنا چہرہ ڈھک لیا،

"ان کی بو کتنی بھینی بھینی ہے نا!" اُس نے اپنی ناک بھی ڈھک کر پوچھا،

"یہاں وادی کے نیلوفر بھی ہیں، ٹھہرو، میں چند پھول تمہیں چن کر دیتا ہوں" گھاس کی طرف جھکتے ہوئے اُس نے کہا "ان کی بو زیادہ خوشگوار ہے، ان میں فطرت زیادہ نمایاں ہے، لیلاج کے پودے ہمیشہ مکانوں کے قریب اُگتے ہیں اور اُن کی شاخیں کھڑکیوں کے اندر گھس جاتی ہیں، ان کی بو بھی نہایت تیز ہے، ذرا ان نیلوفر کے پھولوں کو دیکھو، شبنم سے اب تک نم ہیں"

اُس نے چند پھول اولگا کے ہاتھوں میں دے دئیے

"کیا تمہیں پسند ہے؟" اُس نے پوچھا

"نہیں، اس کی بو بھی بہت کڑی ہے، مجھے نہ گلاب پسند ہے نہ چمپا بلکہ یوں کہنا چاہئیے کہ پھولوں سے مجھے زیادہ شوق نہیں، باغوں میں خیر ایسے بُرے نہیں، لیکن مکان کے اندر تو تکلیف کا باعث ہوتے ہیں . . . پھولوں کی کثرت تمام گندگی . . ."

"تمہیں اپنے کمروں کی صفائی زیادہ عزیز ہے!" اُس نے شرارت سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا "تم سے گندگی برداشت نہیں ہوتی؟"

"نہیں، میرا ملازم ایسا . . ." وہ بڑبڑایا اور دل ہی دل میں اُس نے جملہ کو پورا کیا "بدمعاش ہے"

"تم سیدھے پیرس جاؤ گے؟" اولگا نے دریافت کیا

"ہاں، اسٹولٹنر کئی دن سے میرا انتظار کر رہا ہے!"

"مجھ سے ایک خط لے لینا، میں اس کو ایک خط لکھنا چاہتی ہوں"

"تو آج ہی دے دو۔ کل میں شہر کو چلا جاؤں گا"

"کل ہی؟" اُس نے پوچھا "اس قدر جلد کیوں۔ یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی تمہیں نکال رہا ہے"

"ہاں"

"کون"

"ندامت . . ." اُس نے دبی آواز سے کہا

"ندامت" اولگا نے بے اختیاری طور پر دُہرایا، وہ سوچنے لگی "اب میں اُس سے کہوں گی کہ مسٹر ابلوماف مجھے یہ توقع نہ تھی . . ."

"ہاں اولگا سرجیونا" آخر اُس نے دل کڑا کر کے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں تعجب ہوا ہوگا . . . بلکہ غصہ . . ."

"اب وقت آگیا ہے . . . بس یہی موقع ہے . . ." اس کا دل دھڑکنے لگا "اُف میں نہیں کہہ سکتی"

ابلوماف نے جھک کر اس کے چہرے کا جائزہ لینا چاہا کہ ان باتوں کا اس پر کیا اثر ہوا ہے، لیکن وہ لیلاج اور نیلوفر کے پھولوں کو سونگھ رہی تھی اور خود بھی حیران تھی کہ وہ کس طرح متاثر ہوئی ہے، اور اُسے کیا کہنا اور کرنا چاہئیے، "آہ! میں کس قدر بے وقوف ہوں، میں کسی معاملے میں صحیح فیصلہ نہیں کر سکتی" اُس نے مایوس ہو کر سوچا

"میں بالکل ہی بھول گئی تھی . . ." اُس نے کہا

"یقین مانو، کہ میں بالکل بے بس تھا، مجھے اپنی زبان پر قابو نہ رہا اور بے اختیاری کے عالم میں وہ الفاظ میرے منہ سے نکل گئے . . ."

اُس کی ہمت بتدریج بڑھتی جا رہی تھی "اگر آسمان سے بجلی گر پڑتی اور میرے قدموں تلے کی زمین پھٹ پڑتی تو بھی میں کہے بغیر نہ رہتا۔ کوئی قوت بھی مجھے ایسا کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی تھی، خدا کے لئے یہ خیال نہ کرنا کہ میں نے قصداً . . . ایک منٹ کے بعد بڑی سے بڑی قیمت ادا کر کے میں اپنے الفاظ واپس لینے کو تیار تھا"

وہ اپنا سر جھکائے پھولوں کو سونگھتی چل رہی تھی۔

"اُسے بھول جاؤ" اُس نے اپنے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا "اسے بھول جاؤ، خصوصاً جبکہ اس میں صداقت نہ تھی . . ."

"صداقت نہ تھی؟" دفعتہً پھولوں کو ہاتھ سے گرا کر اور سر اٹھا کر اُس نے سوال کیا۔

اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور اُن میں حیرت و تعجب کی ایک چمک پیدا ہو گئی تھی،

"صداقت کیوں نہ تھی؟" اُس نے اپنا سوال پھر دُہرایا۔

"ہاں، خدا کے لئے اسے بھول جاؤ، اور خفا نہ ہو، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں ایک لمحے کے لئے از خود رفتہ ہو گیا تھا، تمہارے گانے کی وجہ سے . . ."

"صرف گانے کی وجہ سے؟"

اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا تھا، اس کے گالوں کی تمتماہٹ دور ہو گئی تھی اور آنکھوں کی چمک بھی جاتی رہی تھی،

"تو سب ختم ہو گیا، اُس نے اپنے الفاظ واپس لے لئے، اب خفگی کے اظہار کا کوئی موقع نہ رہا، معاملہ درست ہو گیا اور اب پریشانی کی کوئی وجہ نہیں

ہے پہلے کی طرح ہم پھر آپس میں گفتگو اور ہنسی مذاق کر سکتے ہیں" وہ سوچ رہی تھی چلتے چلتے اُس نے ایک شاخ کو پکڑ کر کھینچا اور اُسے توڑ کر ایک پتہ کو دانت سے کاٹنے لگی، دفعتہً اُس نے شاخ اور پتہ دونوں کو روش پر پھینک دیا

"تم خفا تو نہیں ہو گئیں؟ تم نے بھلا دیا ہے؟" ابلوماف نے اس کی پشت کی طرف سے جھک کر پوچھا۔

"لیکن یہ کیا، تم مجھ سے کیا چاہتے ہو" اُس نے لرزتے ہوئے جواب دیا، بلکہ وہ جز بز ہو کر اس کی طرف سے ہٹی جا رہی تھی۔ "میں نے سب کچھ بھلا دیا ہے . . . اب مجھے کچھ یاد نہیں رہا"

ابلوماف چپ ہو رہا، وہ نہیں جانتا تھا کہ کیا کرے، اُس نے اولگا کو دفعتہً آزردہ ہوتے دیکھا، لیکن اس کی وجہ معلوم کرنے سے قاصر تھا۔

"خدایا" اولگا نے سوچا "اب تلافی ہو گئی، وہ منظر ہی محو ہو گیا، خدایا تیرا شکر . . . پھر یہ کیا، اب اس کا کیا مطلب ہے"؟

"اب میں گھر جاتی ہوں" اُس نے دفعتہً کہا اور اپنی رفتار کو تیز کر کے ایک دوسری روش پر مڑ گئی۔

اس کے گلے پر ایک بار تھا، اور اُسے خوف تھا کہ وہ رو پڑے گی۔

"وہ راستہ اچھا نہیں ہے، یہ زیادہ قریب ہے" ابلوماف نے کہا، وہ مایوسی سے سوچنے لگا "احمق، اس عذر معذرت کا کیا فایدہ ہوا، اب وہ اور بھی بیزار ہو گئی، مجھے اس واقعے کی یاد نہیں دلانا چاہئے تھی خود آئی گئی بات ہو جاتی، اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں رہا کہ میں اُس سے معافی مانگوں"

"میں سمجھتی ہوں کہ میرے کبیدہ خاطر ہونے کی وجہ یہ ہے" وہ سوچ رہی تھی "کہ مجھے یہ کہنے کا موقع نہ ملا کہ مسٹر ابلوماف میرا ہرگز یہ خیال نہ تھا کہ تم اتنی جرأت . . . وہ میرے جذبہ کو پہلے ہی تاڑ گیا تھا، ہونہ صداقت نہ تھی، تو وہ جھوٹ بھی بول رہا تھا، کیسے جرأت ہوئی اُس کی؟

"کیا یہ سچ ہے کہ تم نے بھلا دیا ہے؟" ابلوماف نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہاں، سب کچھ" اُس نے گھر جانے کی جلدی میں جواب دیا۔

"اچھا تو یہ دکھانے کے لئے کہ تم مجھ سے رنجیدہ نہیں ہو اپنا ہاتھ مجھے دو"

ابلوماف کی طرف نگاہ کئے بغیر اولگا نے اپنی انگلیوں کو بڑھا دیا لیکن جیسے ہی اُس نے انہیں چھوا اولگا نے کھینچ لیا۔

"نہیں، تم ابھی تک رنجیدہ ہو" اُس نے سرد آہ کے ساتھ کہا "آہ! تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ یہ ایک لغزش تھی، میں ہرگز جرأت نہیں کر سکتا تھا . . . نہیں، بس، اب میں پھر کبھی تمہارا گانا نہیں سنوں گا . . ."

"مجھے یقین دلانے کی تمہیں ضرورت نہیں، اور نہ مجھ کو تمہاری معذرت کی خواہش ہے" اُس نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا "میں کسی صورت سے بھی نہیں گاؤں گی"

"بہت اچھا، میں کچھ نہ کہوں گا، خدا کے لئے مجھ سے اس طرح علحدہ نہ ہو ورنہ میرے دل پر ایک بار معلوم ہوگا"

وہ آہستہ آہستہ اس کی باتوں کو غور سے سنتی ہوئی چل رہی تھی۔

"اگر یہ سچ ہے کہ تمہارے گانے کے بعد اگر میں نہ روتا تو تم بھی نہ روتیں تو اس مرتبہ میں . . . اگر تم بغیر مسکرائے، بغیر اپنا ہاتھ میری طرف دوستانہ طور پر بڑھائے چلی جاؤ گی تو . . . مجھ پر رحم کرو، اولگا سرجیونا، میری طبیعت بگڑ جائے گی، میرے ٹخنے کانپ رہے ہیں۔ میں بہ مشکل کھڑا ہو سکتا ہوں . . ."

"کیوں؟" اولگا نے دفعتہً اُس کی طرف دیکھ کر پوچھا

"مجھے خود نہیں معلوم" اُس نے کہا "اب ندامت کا احساس مجھ سے جاتا رہا، میں اپنے الفاظ پر نادم نہیں ہوں . . . میں سمجھتا ہوں کہ وہ . . . "

اُس نے اپنے دل کے اندر پھر ایک کپکپی محسوس کی، پھر وہاں ایک بار معلوم ہوا، اور اولگا کی مہربان اور متجسسانہ نگاہیں پھر اُسے تڑپانے لگیں، وہ کس ادا کے ساتھ اس کی طرف مخاطب ہو کر اس کے جواب کا بے صبری سے انتظار کر رہی تھی۔

"وہ . . . کیا؟" اس نے بے چینی سے دریافت کیا

"نہیں، مجھے کہتے ڈر معلوم ہوتا ہے، تم پھر مجھ سے خفا ہو جاؤ گی"

"بولو" اُس نے آمرانہ لہجے میں کہا

وہ چپ تھا

"بولو"

"اس وقت تمہیں دیکھ کر پھر میرے دل میں آنسو بہانے کی بے اختیار

خواہش پیدا ہو رہی ہے، . . . تم دیکھتی ہو کہ مجھ میں غرور نہیں، میں اپنے جذبات سے نادم نہیں ہوں . . . "

"لیکن آنسو بہانے کا سبب؟" اُس نے نرمی سے پوچھا، گال پھر تمتا گئے تھے۔

"تمہاری آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے، . . . میں پھر محسوس کرتا ہوں کہ . . . "

"کیا؟" اُس نے پوچھا، اب اس کے گلے پر بار نہ تھا، اور وہ سراپا انتظار بنی ہوئی تھی،

دونوں اولگا کے مکان تک پہنچ گئے۔

"میں محسوس کرتا ہوں کہ . . . " ابلوماف اپنی بات جلد ختم کر دینا چاہتا تھا، لیکن وہ اتنا کہہ کر رک گیا۔

وہ آہستہ آہستہ زینے پر چڑھ رہی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسے چڑھنے میں تکلیف ہو رہی ہے۔

"وہی نغمہ . . . وہی . . . جذبہ . . . وہی احساس . . . مجھے معاف کر دو، مجھے معاف کر دو، مجھے معاف کر دو، میں سچ کہتا ہوں کہ میں بالکل مجبور ہوں . . . "

"مسٹر ابلوماف" اولگا نے سخت لہجے میں کہنا شروع کیا، لیکن یکایک اس کا چہرہ ایک تبسم سے منور ہو گیا، "میں رنجیدہ نہیں ہوں۔ میں تمہیں معاف کرتی ہوں۔" اُس نے نرمی سے کہا "ہاں صرف آئندہ . . . "

اپنا رُخ سامنے کئے بغیر اولگا نے ایک ہاتھ ابلوماف کی طرف بڑھا دیا، اُس نے تھام کر ہتھیلی کا بوسہ لے لیا، اولگا نے بھی آہستہ سے اپنی ہتھیلی کو اس کے لبوں پہ دبا دیا اور فوراً شیشے کے دروازے کے پیچھے غائب ہو گئی اور ابلوماف مورت کی طرح جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔

سید حسن ایم اے

قطعات

سب تیری جفائیں ہیں گوارا مجھ کو
کافی ہے وفاؤں کا سہارا مجھ کو
آخر تو گزر جائے کا دورِ نکبت
جینے دو کوئی روز خدا را مجھ کو

ناکام ہے ہر سعی الٰہی توبہ
یہ میری امیدوں کی تباہی توبہ
دنیا میں قیامت بھی کبھی آئے گی!!
ملتی ہے سزائے بے گناہی توبہ

ضیا
فتح آبادی ایم اے

بزمِ فطرت

(جنگل میں ایک شام)

مہرِ روشن چھپ گیا ضَو ماند پڑ جانے لگی
پھر شفق کی ساحرہ نیرنگ دکھلانے لگی

طائروں کے زمزموں سے گونج اٹھے دشت و جبل
اک سیہ بدلی سی ہر سُو گیت برسانے لگی

پھر گئی جلووں پہ اک مدہم سی تاریکی کی رو
اور فضا میں زلف سی ظلمت کی لہرانے لگی

اِک سہانا نشہ سا ہر چار سُو چھانے لگا
خامُشی کو جاگ اور شورش کو نیند آنے لگی

نغمۂ عشق آفریں چھیڑا کسی دہقان نے
دُور سے بنسی کی وجد آور صدا آنے لگی

تیرگی بڑھنے لگی گہرا دھندلکا چھا گیا
اک سیہ چادر تلے ہر شے سمٹ جانے لگی

جُو بُاروں سے ترنم کی صدا اُٹھنے لگی
دشت کی ہر چیز کا دل وجد میں آنے لگی

آہ یہ خلوت یہ جنگل کی فضائے عشق زا
قلبِ محزوں کو کسی کی یاد تڑپانے لگی

چشمِ دل کو منظرِ فطرت ہوا خارِ مغیل
آہ تنہائی میں اب تو رُوح گھبرانے لگی

تاجورؔ اٹھو خدا کے واسطے اب گھر چلو
بزمِ فطرت پر بھیانک خامُشی چھانے لگی

تاجور سامری

وکٹر ہیوگو کی محبّت

یہ داستان وکٹر ہیوگو کی سیاسی سرگرمیوں، اس کی کامرانیوں اور ناکامیوں اور اس کے ادبی کارناموں سے کچھ تعلق نہیں رکھتی، دنیائے ادب میں جو افسانوی شاہکار اس نے باقی چھوڑے ہیں نہ صرف فرانس بلکہ ساری دنیا ان پر فخر کر رہی ہے، اس نے وطن کی آزادی کے لئے ایک سرگرم جماعت تیار کی اور اس جماعت میں روح پھونک دی اور روح پھونک کر حیاتِ جاودان بخش دی، لیکن یہ داستان جو ہم آپ کو سنانے والے ہیں ان سرگرمیوں سے بالکل الگ ہے، یہ محبت کا رومان ہے جو اس کی زندگی کا اہم ترین اور رزیں واقعہ ہے، یہ وہ درد بھرا افسانہ ہے جس کے اختتام پر اس کی شگفتہ زندگی کا تابناک دور ختم ہوا اور اس کی ادبی اور سیاسی زندگی کا المناک سلسلہ شروع ہوا۔

جب وکٹر ہیوگو سیاسیات کے چکر میں پھنسا تو قدرتاً اس کے مزاج میں فرق آگیا، وہ حد درجہ خود پسند، ہرجائی اور بگڑا سا ہو گیا۔ لیکن جب وہ ایڈل فوشر سے محبت کی پینگیں بڑھا رہا تھا تو بالکل ایک بچے کی طرح تھا، ایک جواں سال شاعر جس کی رگ رگ میں بچپن کی پاکیزگی دوڑ رہی ہو، وہ مایوسی اور دنیا کی تنگ ظرفیوں سے بالکل بے بہرہ تھا، ابھی تک اس کے علوِ تخیل نے اس سے خراج نہیں لیا تھا، ابھی تک اس کی عیر فانی استعداد کی کرنیں پردۂ سحر کو چاک کرنے نہ پائی تھیں، وہ ابھی تک نادانستہ طور پر ایک تخیل پرست انسان تھا جو حسن و محبت کی وادی میں اپنے آرٹ کی پرورش کے لئے سرگرداں تھا اور اجتہاد کرتے ہوئے یہ ثابت کر دینا چاہتا تھا کہ اس کی زندگی محض محبت کے لئے ہی معرضِ وجود میں آئی تھی،

انسانی جذبہ جہاں دنیا بھر کے شاعروں کے لئے اہم ترین موضوع بنا رہا ہے۔ وہاں یہ الہام ربانی کا صحیح ترین سرچشمہ بھی ہے اور انسانی آبادی میں صرف شاعر اور مطرب اس جذبے کی تصویر دوسروں کے سامنے پیش کر سکتے ہیں کیونکہ وہ محبت کی زبان سمجھتے ہیں، شاعر کی محبت دراصل شاعر کا خواب ہوتا ہے جس کے ساتھ متعدد دلکشیاں وابستہ ہوتی ہیں، معصوم فضا کی تازگی ہیں جو محبت وکٹر ہیوگو نے کی —— وہ وکٹر ہیوگو جو دنیا کے بلند ترین شاعروں میں سے تھا اور سوائے شیکسپیئر کے ہم کسی کو اس سے بلند تصور نہیں کرتے —— اس کی داستانِ عشق کس قدر دردناک خیز ہو گی۔

ایڈل فوشر ہی ایک ایسی لڑکی تھی جو وکٹر ہیوگو کے تخیل پر چھا سکتی تھی، نہ صرف یہ کہ وہ حسین تھی بلکہ اس میں ایک پنہاں جاذبیت بھی تھی جو جذبات میں ہیجان اور تخیل کو تحریک دیتی رہتی تھی، ایک طویل اخلاص بھرے معاشقہ کے باوجود وکٹر کو ہمیشہ یہ کھٹکا رہا کہ کہیں ایڈل اس کو چھوڑ نہ دے، وہ اپنی رگ رگ میں قوت اور زندگی پیدا کرتا رہا تاکہ وہ ایڈل کی پرستش کے قابل ہو سکے، ایڈل ہمیشہ اس کی آغوش سے دور رہی اور قدرے بے اعتنائی سے کام لیتی رہی، اور اسی قسم کی جاذبیتوں کی وجہ سے عورت زمانے کی دست برد سے بچی رہتی ہے اور یہ ایک ایسا حسن تھا جس کے لئے وکٹر عمر بھر گیت گاتا رہا، مرد میں شکار کرنے کا فطری خاصہ ہے اور اگر شکار آسان ہو تو خواہ وہ عورت ہی کیوں نہ ہو، وہ اس سے نفرت کرتا ہے۔

ایڈل اور وکٹر گہوارے میں بھی ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔ کیونکہ ان کے والدین کی آپس میں بہت محبت تھی اور مدت سے ہمسائے چلے آتے تھے، بوڑھے اپنی گزشتہ زندگیوں کے متعلق گفتگو کر رہے ہوتے تو اس وقت دو ننھے منّے، بچے معصومانہ جذبات کو لئے ہوئے دوش بدوش مسرت بھری فضا میں کھیل کود رہے ہوتے، چونکہ ان کی عمر میں صرف ایک سال کا تفاوت تھا، اس لئے وہ ہر جگہ اور ہر وقت اکٹھے رہ سکتے تھے۔

وہ صرف ساتھی ہی نہ تھے، وکٹر بچپن سے ہی خواب و خیال کی دنیا میں مگن رہتا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایڈل اس کے خواب

کی تعبیر تھی اس نے سب کچھ ایڈل میں پا لیا تھا، وہ دونوں اپنے سینوں میں رومانیت سے لبریز زندگی کو لئے ہوئے قدیم ترین صحن چمن کی فضا میں پھولوں کی نکہت کی طرح آوارہ رہتے تھے۔

وکٹر اسی نوخیزی کے عالم میں لکھا کرتا تھا۔

"ایڈل کی آنکھیں بڑی بڑی اور چمکیلی تھیں۔ گیسوئے دراز لفیں، چہرے کی سنہری اور تاباں رنگت لعلیں ہونٹ اور رخسار گلابی تھے"۔

پھر لکھتا ہے "ہماری مائیں کو دنے پھاندنے کے لئے ہمیں باہر بھیجا کرتیں لیکن ہم سیر کو ترجیح دیتے۔ ہمیں کہا جاتا کہ ہم دوسرے بچوں کی طرح کھیلیں لیکن ہم باتوں میں وقت بسر کرتے، ہم ایک ہی عمر کے نیچے تھے گو ہم جنس نہ تھے۔ اس پر بھی . . . ہم اپنی طاقت کے تجربات کر لیا کرتے تھے، ایک دفعہ میں نے اس کے ہاتھ سے ایک بڑا سیب چھین لیا تھا، اور دوسری دفعہ میں نے اُسے تھپڑ رسید کیا کیونکہ وہ مجھے پرندے کا گھونسلہ نہیں دیتی تھی . . .

"ایک وقت وہ بھی آیا کہ وہ میرے بازو پر دُہری ہو کر چلتی اور میں مغرور تھا اور مجھ میں تازہ کیفیتیں پیدا ہونے لگیں، ہم آہستہ آہستہ چل رہے تھے اور اس کی نرم و نازک آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی، اس نے اپنا رومال گرا دیا تو میں نے اٹھایا، ہمارے ہاتھ ایک دوسرے سے چھو کر کانپ گئے، وہ ننھے ننھے پرندوں، ستاروں، درختوں کے عقب میں شفق کی سُرخی مائل جھولیوں، فراک اور رفیقوں کے متعلق گفتگو کرنے لگی، نہایت معصومانہ لہجے میں ہم بالکل معمولی چیزوں پر بحث کرنے لگے اور لطف یہ کہ ہم دونوں کے چہروں پر حیا کی سرخی دوڑنے لگی، کیونکہ ایڈل اب جوانی کے قریب تر پہنچ چکی تھی"۔

ایک عرصے تک یہ معصوم محبت نہایت اطمینان اور مسرت کی وادی میں کھیلتی رہی، لیکن ۱۸۱۹ء میں جبکہ وکٹر ہیوگو سولہ برس کا اور ایڈل پندرہ کی تھی، ہیوگو خاندان میں کشیدگی پیدا ہوئی، جنرل ہیوگو اور اس کی بیوی ایک سیاسی تنازعہ کی بنا پر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے، مادام ہیوگو ساتھ دے رہی تھی۔ بوربن جماعت کا۔ جنرل ہیوگو چونکہ گورنمنٹ سے پنشن پا رہا تھا۔ اس لئے یہ کبھی بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔

مادام ہیوگو (وکٹر کی ماں) نے اپنے خاوند سے قطع تعلق کر لیا اور اپنے دونوں بچوں کے ساتھ ایک معمولی سا مکان کرائے پر لے کر رہنے سہنے لگی، لیکن وہ مادام فوشر (والدہ ایڈل) کو نہ بھول سکی اور ہر شام اپنے دونوں لڑکوں کو ساتھ لے کر اس کے مکان پر جاتی۔

یوجینی (وکٹر کا بڑا بھائی) اس قسم کے میل ملاپ کو پسندیدہ نگاہ سے نہ دیکھتا تھا، لیکن وکٹر کے لئے وہ سنہری لمحے ہوتے تھے، اس کی نگاہیں ایڈل پر جمی ہوتی تھیں، وہ نگاہیں اتنی دیر تک اس کے چہرے پر پیوست رہتیں کہ بے چاری ایڈل شادماں بھی ہوتی لیکن ساتھ ہی گھبرا بھی جاتی، وہ جاننا چاہتی تھی کہ ان نگاہوں کے کیا معنی ہو سکتے ہیں لیکن وکٹر بہت شرمیلا تھا، اتنا شرمیلا کہ اسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ ان نگاہوں کا کیا مطلب ہو سکتا ہے، صرف ایک دھندلا سا احساس پیدا ہوا کہ اس کی زندگی میں ایک انقلاب سا برپا ہو رہا ہے اور بس۔

اب خاموش پوجا کی منزل طے ہو چکی تھی۔

ایڈل بھی جرات کے ساتھ اس کی گھورنے والی آنکھوں کا مقابلہ کرتی تھی جس سے اس کی نگاہوں میں ایک پنہاں سی روشنی نمودار ہوتی اور شاعر کا سینہ مسرت سے لبریز ہو جاتا، محبت کا سوز اب وہ زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکتے تھے، چنانچہ ایڈل نے ایک دن اسے تنہا ملنے کا اہتمام کیا۔

یہ ۲۶ اپریل ۱۸۱۹ء کا دن تھا۔

ایڈل نے نرم و نازک آواز میں کہا "وکٹر! مجھے یہ معلوم ہے کہ ایک بہت بڑا راز تمہارے سینے میں پوشیدہ ہے۔ اگر وہ تم مجھے بتا دو تو میں بھی تمہیں ایک راز بتاؤں گی"۔

وکٹر نے بلاتکلف کہہ دیا "میں تم سے محبت کرتا ہوں"۔ حسین ایڈل نے جواب دیا "میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں"۔

ان دو مختصر فقرات سے ان کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا محبت کا دیوتا ان پر سادگی اور معصومی کے پھول برسا رہا تھا، انہوں نے پیمانِ زندگی باندھا جسے وہ محبت کہنے لگے لیکن ان کا خیال تھا کہ ان کے والدین اسے معصومانہ حماقت سے زیادہ وقعت نہ دیں گے۔ چنانچہ اسی لئے انہوں نے اس راز کو اپنے سینوں تک ہی محدود رکھا، آنے والا کل ان کی شیریں زندگی پر اثر انداز نہ ہو سکتا تھا، نگاہیں، ہاتھ کا دبانا، بوس و کنار، خفیہ ملاقاتیں، ان کو رومانی زندگی میں لئے پھر رہی تھیں، آہستہ آہستہ ان کے سینوں میں محبت کا اہم ترین راز بیدار ہوا۔

موسم گرما ختم ہوا تو حسب معمول فوشر خاندان کے لوگ اسی سے چلے گئے، اس میں شک نہیں کہ یہ شہر پیرس سے بہت دور نہ تھا لیکن وکٹر

کی والدہ کے لئے ہر روز وہاں جانا بالکل ناممکن تھا، دکٹر اکیلا وہاں جانا نہ چاہتا تھا کیونکہ اس طرح راز افشا ہونے کا خطرہ تھا چنانچہ وہ پیرس میں بالکل اکیلا رہ گیا، فراق کی روح فرسا گھڑیاں اس کے دل و دماغ پر چھا گئیں اور اٹھتے بیٹھتے ہر وقت ایڈل اس کی آنکھوں کے سامنے رہنے لگی۔ کیا وہ بھی اسے یاد کرتی تھی؟ ـــــ دکٹر کو اب معلوم ہوا کہ محبت بچوں کا کھیل نہ تھا جبکہ وہ لطیف جذبہ ایک ایسا شعلہ بنا جو بجھائے نہ بجھ سکتا تھا، اسے محبت کی عظمت کا احساس ہوا، موسم سرما کے ابتدا میں جب ایڈل لوٹ کر آئی تو ہیوگو اور ایڈل نادان بچے نہ رہے ـــــ ایک عورت اور ایک مرد جو محبت کے عقدۂ لاینحل میں پھنس چکے تھے،

جب کبھی ایڈل کی والدہ باہر جاتی تو وہ دونوں باغ میں درختوں کے نیچے سرگرم گفتار ہوتے، یا جب کبھی ایڈل خرید و فروخت کے لئے بازار جاتی تو وہ دونوں گلیوں میں کھڑے ہو کر محبت کی لگائی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرتے لیکن ان کے لئے یہ کافی نہ تھا چنانچہ وہ ہر روز ایک دوسرے کو خط لکھنے لگے۔

دکٹر جس کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ اس کی محبت ہمیشہ جوان رہے گی اور اپنی استقامت پر اسے پورا اعتماد تھا اس واقعے کو ایک بلند ترین رومان تصور کر رہا تھا لیکن ایڈل محبت کو پوشیدہ رکھنے میں ایک توہین سی خیال کرنے لگی، اور ہر ایک بے لوث اور خوددار حسینہ اس احساس میں حق بجانب ہے۔ ایڈل کی خواہش تھی کہ وہ اپنی ماں کو اپنا ہمراز بنائے لیکن اسے جرأت نہ ہوتی تھی کیونکہ وہ انجام سے تو باخبر ہی تھی۔

ایک روز مادام فوشر نے ایڈل کے پاس شعروں کی ایک کتاب دیکھی جو ہیوگو نے اسے بھیجی تھی، ایڈل کی ماں اس سے بہت ناراض ہوئی اور اسے تنبیہ کی کہ وہ ایسے شخص سے جس سے وہ شادی نہیں کر سکتی کسی قسم کا تحفہ خواہ وہ توجہ ہی کیوں نہ ہو قبول نہ کرے، کیونکہ ایسا کرنے سے وہ اپنا وقار کھو بیٹھے گی اور جہاں وقار باقی نہ رہے وہاں محبت بھی نہیں رہتی،

ایڈل گویا چونک اٹھی، اسے محسوس ہونے لگا کہ واقعی وہ دکٹر کو جرأت دلا کر اپنے وقار کو صدمہ پہنچاتی رہی ہے، اس خیال سے اسے اس قدر تکلیف ہوئی کہ محبت کی فراوانی بھی اسے تسکین نہ دے سکی،

دکٹر ہیوگو نے ایک خط میں لکھا۔

"میں تمہیں کیا بتاؤں کہ میرے لئے تم کیا ہو! اگر میں یہ کہوں کہ میں تمہیں اپنی زندگی سے بھی بڑھ کر محبت کرتا ہوں تو یہ بالکل معمولی بات ہوگی تم جانتی ہو کہ میں زندگی کو بالکل عزیز نہیں سمجھتا، . . . . .

تم اس قسم کی باتیں مجھ سے کیوں کرتی ہو کہ میں تم سے نفرت کرتا ہوں یا تمہاری توقیر میرے دل میں نہیں، کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہارے وقار کے احساس کے بغیر ہی تم سے محبت کرتا رہا ہوں، تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ تمہارے اس الزام نے مجھے کس قدر دکھ دیا ہے . . . کیا تم نہیں جانتیں کہ مجھے تم سے کتنی پاکیزہ اور بے لوث محبت ہے، میں تمہارا خاوند ہوں، کم از کم میں تو ایسا ہی خیال کرتا ہوں۔

"تم جانتی ہو کہ ایک خیال سے میری مسرت کی انتہا نہیں رہتی! ان تمام رکاوٹوں کے باوجود میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ممکن ہے مجھے تمہارا خاوند بننے کی اجازت دے دی جائے خواہ ایک دن کے لئے کیوں نہ ہو۔ فرض کرو کہ میری اور تمہاری آج شادی ہو جائے اور دوسرے دن میں خودکشی کر لوں، اس طرح کم از کم ایک دن کے لئے تو میں اپنی مسرت کی انتہا دیکھ لوں گا، اس کے بعد تمہیں کوئی مطعون نہیں کر سکتا، لوگ یہی کہیں گے "یہ اس مرحوم کی بیوہ ہے" پیاری ایڈل! کیا ایسے ہو سکتا ہے۔ . . . صرف ایک دن کے لئے، ایک دن کی مسرت عمر بھر کے اندوہ و غم سے بہتر ہے"!

لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک دن کی مسرت بھی ان کے مقدر میں نہ تھی، محبت کا راستہ کبھی صاف نہیں ہوا کرتا چنانچہ ان معصوم روحوں پر مصیبتیں ٹوٹ پڑیں۔

جب سے ایڈل کی ماں کو اس کتاب کا قصہ معلوم ہوا تو وہ اپنی بیٹی کی حرکات کا نہایت غور سے مطالعہ کیا کرتی تھی، اس کے دل میں شکوک پیدا ہوتے گئے جو جلد ہی پایۂ یقین تک پہنچ گئے، اور اس نے ایڈل پر نہایت سختی سے سوالات کی بوچھاڑ کر دی، ایڈل خوفزدہ ہو گئی اور اس نے تمام باتوں کا اعتراف کر دیا، اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ اس کی ماں اس اعتراف پر غضبناک نہیں ہوئی بلکہ وہ نہایت ہمدردی اور پیار کے ساتھ تمام باتیں سنتی رہی اور آخر میں کہا۔

"بیٹی! میں اس معاملے پر غور کروں گی اور تمہارے باپ سے بھی مشورہ کروں گی"!

ایڈل خوشی سے تمتما اٹھی، اس کے باپ نے بھی اس معاملے میں رضامندی کا اظہار کیا، وہ دکٹر کی خداداد قابلیت کی ہمیشہ تعریف کیا کرتا تھا اور اس کی سعادتمندی کی وجہ سے اسے بہت پسند کرتا تھا،

۲۶ اپریل ۱۸۲۰ء کو موسیو فوشر اپنی بیوی کو ساتھ لے کر مادام ہیوگو کے پاس گیا تاکہ اس رشتہ کی سلسلہ جنبانی شروع ہو جائے۔

مادام ہیوگو کے لئے یہ خبر بالکل نئی تھی اس لئے وہ حیران رہ گئی۔

"وکٹر محبت کر رہا ہے!"

اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی،

"وہ تو ابھی بچہ ہی ہے، ایسے وقت میں آپ لوگوں کو نہ آنا چاہیئے تھا۔"

اس کے بعد وہ دیر تک ہنستی رہی، اس کی ہنسی بالکل مایوس کن تھی کہ اس کا بچہ جو بالکل معصوم تھا کس طرح ایک لڑکی کو محبت کرنے لگا، مجھے تو کہہ دیتا: دنیا میں میں صرف اسی سے محبت کرتی ہوں، میرے لئے سب کچھ وہی ہے لیکن وہ مجھے بھلا کر کس طرح ایک الھڑ لڑکی کے جال میں پھنس گیا، ماں کو بھی حق حاصل ہے کہ ایسے موقعوں پر رشک کو اپنے دل میں جگہ دے، وہ بے قرار ہو گئی اور فوشر خاندان کو برا بھلا کہنے لگی، "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جنرل ہیوگو کا بیٹا فوشر خاندان کی لڑکی گھر میں لائے"، اس کے علاوہ اس نے اور بہت سی باتیں کیں جس پر موسیو فوشر بھی تیز ہو گیا کہ فوشر خاندان فرانسیسی معاشرت میں ہیوگو سے کسی صورت میں بھی کم نہیں ہے لیجن آف آنر کے تمغے ہمارے پاس موجود ہیں، ہماری فوجی خدمات تم لوگوں سے کم نہیں ہیں، کافی عرصے تک یہ بک بک ہوتی رہی بالآخر یہ قرار پایا کہ آیندہ دونوں خاندانوں کے تعلقات ہمیشہ کے لئے منقطع ہو جائیں۔

وکٹر کو بھی اس وقت بلا لیا گیا، وہ ماں کے سامنے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا، سر جھکائے خاموش سنتا رہا لیکن جب ایڈل کے والدین چلے گئے تو وہ بے اختیار ہو کر اپنی ماں کی گود سے باہر بھاگ نکلا اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے اتنا رویا کہ اس کی آنکھوں میں کوئی آنسو باقی نہ رہا، اس کی ماں اسے بہت سمجھاتی رہی لیکن وکٹر کو محسوس ہو رہا تھا کہ ایڈل کو اب وہ کھو چکا ہے، اس کی ماں نے اس کی معصوم امیدوں کو خاک میں ملا دیا۔

اسے محبت کی فراوانی کا بھی آج ہی اندازہ ہوا، اس کے بغیر اب زندگی کیا رہے گی! تاریکی —— خوفناک تاریکی —— موت ——

ایک اٹھارہ سالہ معصوم نوجوان کے سینے میں دہشت انگیز مایوسی گھر کرنے لگی،

ایڈل بھی عجیب مصیبت میں مبتلا تھی کیونکہ اسے اصل گفتگو سے مطلع نہ کیا گیا، صرف اتنا کہا گیا کہ وہ وکٹر کا خیال دل سے نکال دے بلکہ نام بھی زبان پر کبھی نہ لائے کیونکہ وہ ایڈل کے بالکل قابل نہ تھا، ان کا خیال تھا کہ اتنا کہہ دینے سے ایڈل اپنی محبت کو بھول جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے ایڈل کے لئے کوئی رشتہ تلاش کرنے کی سلسلہ جنبانی شروع کر دی،

لیکن ایڈل وکٹر کو کیسے بھول سکتی تھی، اسے یقین نہ آتا تھا کہ وکٹر کبھی اس سے دغا کرے گا، وکٹر تو اس کا اپنا تھا وہ کیسے چھوڑ سکتا تھا، کئی ہفتے گزر گئے وکٹر کی طرف سے اسے کوئی خط نہ ملا، ایڈل کی ماں نے اس کے لئے بہت سی نئی دلچسپیوں کے سامان مہیا کئے، اسے خوش رکھنے کے لئے سو طرح کی تدبیریں کیں لیکن سب بے سود۔ ایڈل محسوس کر رہی تھی کہ اس سے ایک ایسی چیز چھن گئی ہے جو اس کی تمام مسرتوں کی بنیاد تھی، رقص، پارٹی، تھیئٹر اس کے لئے بالکل بے کیف سی چیزیں بن کر رہ گئیں، صرف تنہائی اسے تسکین دینے لگی کیونکہ وکٹر کی محبت کا تخیل وہ صرف تنہائی میں پا سکتی تھی، وکٹر کو اپنے دماغ سے وہ کیسے نکال سکتی تھی! اس کے جواب کے لئے وہ ہر روز خلوت میں اس کے گذشتہ خطوط پڑھا کرتی، اور اس کا آخری خط جس پر اس کے پورے دستخط تھے ایڈل کو رلا دینے کے لئے کافی تھا، فضا میں وہ الفاظ اس کی آنکھوں کے سامنے تھرا رہے تھے۔

"پیاری ایڈل! میرا یہ وعدہ اٹل ہے کہ میں سوائے تمہارے کسی اور کو اپنی بیوی نہ بناؤں گا۔ . . ہمیں دنیا اکٹھا نہ ہونے دے تو نہ سہی لیکن میں تمہارا رہوں اور رہا ابد تک تمہارا —— وی ایم۔ ہیوگو۔"

وفور محبت کی وجہ سے وہ دونوں امید کا دامن نہیں چھوڑ سکتے تھے، وکٹر جب پہلے صدمے سے ذرا سنبھلا تو اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے روپیہ کما کر ایڈل کو جیتے گا، چنانچہ اس نے ادبی کاوشوں کی طرف مکمل توجہ دی، اس زمانے میں اس نے بے نظیر ادبی شاہکار پیدا کئے کیونکہ ان کے پس پردہ اسے ایڈل نظر آ رہی تھی جو اسی راستے سے اس کی ہو سکتی تھی، چنانچہ قسمت نے اسے ایک موقع دیا۔

موسیو فوشر نے ایک کتاب شائع کی جس میں فوجی بھرتی کے متعلق چند فنی باتیں تھیں اور چند ذاتی فوجی تجربات بھی تھے، ہیوگو نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اس نے فوراً اپنے رسالہ La Conservateur Litteraire

میں ایک پورے صفحے کا تبصرہ لکھا گویا کہ وہ دنیائے ادب کا بہترین شاہکار تھا، اور اس رسالے کی ایک کاپی براہ راست موسیو فوشر کے پاس بھیجی

موسیو فوشر اس ریویو کو پڑھ کر جامے میں پھولا نہ سمایا لیکن کشیدگی کی بنا پر اس کا شکریہ ادا نہ کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود اس کے دل میں وکٹر کی قدر و منزلت پیدا ہو گئی، وکٹر اس کی خاموشی سے مایوس نہ ہوا، چنانچہ جب شاہِ فرانس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا جس کی آرزو تمام ملک میں ہو رہی تھی وکٹر نے ایک قصیدہ لکھا اور پمفلٹ کی صورت میں شائع کر کے موسیو فوشر کے نام پر معنون کیا، محبت میں انسان کیا کچھ نہیں کرتا جواں سال شاعر کو خیال تھا کہ ممکن ہے یہ الفاظ اس کی محبوبہ ایڈل کی نظر سے گزریں اور اس طرح کشیدہ تعلقات از سر نو خوشگوار ہو جائیں

موسیو فوشر اب خاموش نہ رہ سکتا تھا: وکٹر اس کی پبلک میں عزت افزائی کر رہا تھا اور اس وقت شکریہ ادا نہ کرنا بالکل غیر مناسب تھا۔ اس نے براہ راست تو وکٹر کو کچھ نہ لکھا البتہ مادام ہیوگو کو چند سطریں لکھیں۔

"میں وکٹر کا بہت ممنون ہوں کہ اس نے میری کتاب پر ایک نہایت حوصلہ افزا تبصرہ کیا اس کے بعد شہزادے کی پیدائش پر جو نظم لکھی اور میرے نام پر معنون کی اس کا بھی شکر گزار ہوں، میری بیوی بھی مرہون منت ہے۔ کیونکہ ہم دونوں اس نظم سے انتہائی لطف اندوز ہوئے۔"

اس کے بعد دونوں خاندانوں کے تعلقات خوشگوار ہونے لگے لیکن ایڈل اور وکٹر پر کڑی نگہداشت رہنے لگی اور انہیں والدین کی موجودگی میں بھی اکٹھے بیٹھنے کی اجازت نہ تھی، اس کے باوجود وکٹر اور ایڈل ایک دوسرے کو خط لکھتے رہے، لیکن وکٹر ملاقات کے لئے نہایت بے قرار تھا، ایک دن اسے معلوم ہوا کہ ایڈل مصوری سیکھنے لگی ہے۔ چنانچہ اس نے فوراً وہ اسکول معلوم کر لیا اور صبح دم اس کے راستے میں چھپ کر بیٹھ گیا، وہ دن وکٹر کو نہیں بھول سکا کیونکہ اس طویل فراق کے بعد جب وہ ایڈل سے ملا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ اسے اب تک نہ بھولی تھی، اس کی محبت ویسے ہی جوان تھی، وکٹر کو محسوس ہوا کہ اس کی زندگی کی روشن ترین شعاع اس کے نزدیک آ گئی ہے اور اب پھر دنیا اس قابل ہو گئی ہے کہ وہ اس میں زندہ رہ سکے۔

اس طرح وہ خفیہ خفیہ ایک دوسرے سے ملتے رہے حسین دہشتوں اور رنگین بے قراریوں کے ساتھ ایک سال اور گزر گیا۔

۲۶ اپریل ۱۸۲۱ء کے دن وکٹر نے ایڈل کو لکھا۔

"پیاری ایڈل! کیا تمہیں یاد ہے کہ یہ دن ہماری سالگرہ کا دن ہے! میری زندگی کی ابتدا اسی دن سے ہوئی تھی، . . . اوہ! مجھے بتاؤ کہ تم بھی وہ دن ابھی تک نہیں بھولیں، میری مسرتوں اور حسرتوں کا آغاز اسی دن سے ہوتا ہے، میں اسی روز سے اپنے آپ کو زندہ تصور کرتا ہوں اور آج تک اسی دن کو ذہن میں رکھ کر سانس لے رہا ہوں . . . صرف تمہاری صورت میرے سامنے ہے: میری زندگی کی ابتدا اور انتہا تم ہی ہو . . . "

۲۷ جون کو مادام ہیوگو راہی ملک عدم ہوئی تو اب وکٹر کے لئے ایڈل کے سوا دنیا میں کوئی نہ تھا، وکٹر اپنی ماں سے بے حد محبت کرتا تھا، باوجودیکہ ایڈل کے معاملے میں وکٹر کو مصیبت میں ڈالنے کا وہی باعث ہوئی تھی لیکن پھر بھی وہ اس کی پرستش کرتا رہا، وکٹر کے لئے اس کی ماں ایڈل سے بھی بڑھ کر قابل احترام ہستی تھی، جب اوائل مئی میں وہ بیمار ہوئی تو وکٹر نے دنیا کے تمام کاروبار چھوڑ دئیے اور ماں کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہو گیا، یہاں تک کہ ایڈل کی طرف بھی متوجہ نہ ہو سکا، متواتر دو مہینے تک وہ بستر مرگ پر پڑی رہی اور اس دو مہینے میں وکٹر اس کی تیمارداری میں مصروف رہا، اس عرصے میں اس نے ایک دفعہ بھی ایڈل کو خط نہ لکھا، اتنی تیمارداری کے باوجود اس کی ماں زندہ نہ رہ سکی اور اپنے بیٹے کو اس دنیا میں تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔

نوجوان وکٹر غم سے نڈھال ہو گیا، اس کو اپنی ماں کی صحیح قیمت کا اندازہ اس کی موت کے بعد ہوا، مدت ہوئی۔ اس کا باپ انہیں چھوڑ چکا تھا اپنے بھائی کے متعلق اسے کچھ علم نہ تھا اور اب وہ بالکل بے خانماں سا ہو کر رہ گیا، وہ حیران تھا کہ وہ کدھر جائے؟ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ایڈل نے بھی اسے چھوڑ دیا ہے۔

آہ! ماں کے چلے جانے سے وہ دنیا کو ویرانہ سمجھ رہا تھا۔

اس کی ماں کی تکفین کی تیاریاں ہو رہی تھیں وہ فرطِ غم سے گھبرایا ہوا باہر نکل گیا، وہ یہ منظر برداشت نہ کر سکتا تھا، شام کی تاریکی میں ایک غمزدہ روح گلیوں میں سے ٹھوکریں کھاتی ہوئی جا رہی تھی —— بلا ارادہ اور بلا مقصد وہ ایک ہوٹل میں جا پہنچا، برآمدے سے گزر رہا تھا کہ موسیقی کی آواز اس کے کانوں میں پڑی، وہ بھاگا ہوا ادھر گیا۔ ایک دروازے کے شیشے سے جھانک کر اندر دیکھا، ایڈل رقص کر رہی تھی، اس نے اپنا بخار

سے چمکتا ہوا چہرہ شیشے پر رکھ دیا، بعد ازاں وہ ایک خط میں ایڈل کو لکھتا ہے:

"پیاری ایڈل! اس دن تمہارا وکٹر ماتمی لباس پہنے ہوئے تمہیں حیران ہو کر دیکھ رہا تھا۔ میں حیران تھا کہ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے، اس دن میرا دل ٹوٹ گیا . . . میں اس مسرت گاہ میں ایک بھوت کی طرح تھا وہاں ہر ایک شاداں و فرحاں نظر آرہا تھا، ہر ایک ــــــ یہاں تک کہ میری ایڈل بھی مسرور تھی اور دوسروں کی مسرت میں حصہ لے رہی تھی ــــــ مجھ سے یہ برداشت نہ ہو سکا، میں اپنی حماقتوں کے خواب سے بیدار ہوا اور آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا، اور شکست خوردہ قمار باز کی طرح واپس گھر پہنچ گیا، اپنی ماں کی لاش کے قریب دو زانو ہو کر میں نے تمہارے لئے دعا کی ــــــ اس وقت غالباً تم رقص کر رہی ہو گی ــــــ"

واقعہ یوں ہے کہ ایڈل کو وکٹر کی ماں کے مرنے کی خبر اس وقت تک نہ پہنچی تھی، ایڈل کے والدین نے مصلحت اسی میں خیال کی کہ وہ ایڈل کو اس واقعے کی اطلاع نہ دیں چنانچہ جب یہ بات واضح ہوئی تو اس نے وکٹر کو خط لکھا تھا کہ مجھ کو علم ہوتا تو میں دنیا کے تمام خطرات کو پھاند کر تمہارے غم میں آکر شریک ہوتی۔

یہ الفاظ وکٹر کے سینے میں زندگی کی حرارت پیدا کرنے کے لئے کافی تھے، ایڈل نے اپنے والدین کو اس اخفا پر بہت بُرا بھلا کہا جب مادام فوشر ماتم پرسی کے لئے ہیوگو کے پاس گئی تو معصوم نوجوان کے چہرے پر امید کی جھلک نمایاں ہو گئی، تھوڑے دنوں بعد ایڈل اپنے والدین سمیت پہاڑی مقام پر چلی گئی اور اس دفعہ وکٹر نے ان کے پیچھے جانے کی جرأت کی، بے چارے کے پاس پیسہ تو تھا نہیں اس لئے وہاں تک وہ پیدل چلتا گیا، تین دن اور تین راتوں کے بعد وہ وہاں پہنچا، تھکان سے وہ بالکل چور ہو چکا تھا لیکن وہاں پہنچتے ہی اسے ایڈل اور اس کا باپ سیر کرتے ہوئے مل گئے، اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا وہ آج تک پیدل چلا ہی نہ تھا، انہیں دیکھ کر شاعر نے ایک مصنوعی تعجب کا اظہار کیا اور ایک سرائے میں پہنچ کر اس نے موسیو فوشر کو خط لکھا۔

"میں یہاں اپنے ایک دوست سے ملنے آیا تھا لیکن وہ مجھے نہیں مل سکا اس لئے میں نے یہاں دو چار روز ٹھہرنے کا ارادہ کیا، قسمت کا کھیل دیکھئے، میں آپ کو یہاں دیکھ کر ششدر رہ گیا میں سوچتا ہوں کہ کیا یہ خواب تھا، لیکن آپ میری گستاخی کو معاف کر دیں گے اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ آپ کے ساتھ ایڈل کو دیکھ کر میری مسرت کی انتہا نہ رہی، مجھ میں اتنی جرأت پیدا ہو گئی ہے کہ میں آپ سے براہِ راست کہہ دوں کہ میں ایڈل کو اپنی روح کی تمام طاقت کے ساتھ محبت کرتا ہوں اور میری تنہائی اور غم کی تاریکی میں صرف ایڈل کا خیال مجھے زندہ رہنے پر مجبور کر رہا ہے۔"

موسیو فوشر وکٹر کے اس شاندار جھوٹ پر مسکرایا تو ضرور ہو گا لیکن اس کو وکٹر کی حالت پر ترس آگیا اور اس نے اجازت دے دی کہ کسی تیسرے آدمی کی موجودگی میں وہ ایک دوسرے سے "لکسم برگ" باغ میں ہفتہ میں ایک دفعہ مل سکتے ہیں، نیز وکٹر کو یہ جتا دیا گیا کہ جب تک اس کی مالی حالت درست نہ ہو جائے وہ کسی صورت میں بھی اپنے منسوب ہونے کا اعلان نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس دوران میں وہ ایک دوسرے سے خط و کتابت کریں۔

وکٹر خط لکھنے کے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ چنانچہ وہ ایڈل کے باپ کو محبت بھرے خط لکھ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیا کرتا تھا، مثال کے طور پر وہ خط لیجئے جو اس نے ۲۸ جولائی کو لکھا،

"مجھے ایڈل اپنی زندگی سے بھی زیادہ محبوب ہے۔ میں اس کی مسرت کے لئے زندہ ہوں اگر وہ میرے بغیر خوش رہ سکتی ہو تو میں آج کسی دور دراز ملک کی طرف چلا جاؤں ــــــ یہ امید لئے ہوئے کہ ممکن ہے ہم ایک دوسرے کو پھر مل سکیں۔"

کچھ دنوں بعد اس نے پھر لکھا۔

"ایک خفیف سی رکاوٹ عظیم ترین ہمت کے راستے میں روڑا نہیں اٹکا سکتی، اس میں شک نہیں کہ مستقبل میں میں بہت سے خطرات محسوس کر رہا ہوں لیکن میری بہادر ماں نے مجھے یہ سکھایا تھا کہ مصیبتوں سے انسان کیسے سینہ سپر ہو سکتا ہے، بہت سے آدمی سنگلاخ زمین پر چلتے ہوئے لڑکھڑاتے ہیں لیکن وہ شخص جس کی ذہنیت شفاف ہو اور اس کا مقصد اعلیٰ ہو خطرناک زمین پر بھی قدم رکھتے ہوئے نہیں جھجکتا اور اس کے پاؤں کو لغزش نہیں ہو سکتی۔"

اب وکٹر کے سینے سے محبت کے جوش کھائے ہوئے چشمے پھوٹ کر بہ رہے تھے جن کا رکنا محال نظر آتا تھا، ایڈل کا باپ وکٹر کی محبت دیکھ کر رضامند ہو گیا، وکٹر کی زندگی درخشاں نظر آنے لگی، اس کامیابی کے جوش میں وہ اپنی مالی حالت کو سدھارنے کے لئے پوری جدوجہد کرنے لگا،

وہ محسوس کرنے لگا کہ جو دقتیں نہایت اٹل نظر آ رہی ہیں شبینہ روز محنت سے دور ہو جائیں گی۔

"ایڈل! تم میرے وفورِ جوش پر مسکرا رہی ہو، تم ہی تو ایک ایسی ہستی ہو جس نے میری روح میں طاقت پھونک دی ہے۔ تم اپنے آپ کو اس رنگ میں کیوں نہیں سمجھتیں جیسا کہ تم ہو، تم وکٹر کے لئے ایک فرشتہ، ایک روح، ایک شعر کی مانند ہو، تم اسی حد تک زمین پر رہنے والی فانی چیزوں سے تعلق رکھتی ہو جس حد تک کہ تم اس شخص کی قسمت میں حصہ لو جس کے ساتھ صانعِ ازل نہیں وابستہ کرنے والا ہے۔"

ایڈل اور اس کے والدین کی رضامندی کے باوجود ابھی بہت سی رکاوٹیں باقی تھیں، سب سے پہلے یہ کہ وہ اپنے لئے کسی مستقل آمدنی کا ذریعہ بن سکے۔ دوسری یہ کہ اس عقد کے لئے اس کے باپ کی رضامندی ضروری تھی، فرانسیسی قانون کے مطابق وہ والد کی اجازت کے بغیر شادی نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ پچیس برس کی عمر کے بعد یہ قید باقی نہ رہتی تھی۔ اس معاملے میں ایڈل کا باپ نہایت سختی سے اڑا ہوا تھا اور اس کے متعلقین اسے پہلی رکاوٹ پر بھی توجہ دلا رہے تھے، نیز وہ اس بات پر زور دے رہے تھے کہ جوان لڑکی کو پانچ سال تک بٹھائے رکھنا کہاں کی عقلمندی ہے، ان کے نزدیک ہیوگو اس معصوم لڑکی کے لئے بالکل مناسب بر نہیں تھا جس کی نہ تو مالی حالت ہی اچھی تھی اور نہ ہی وہ اپنے باپ کو رضامند کر سکتا ہے، سارے رشتے دار اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ ہیوگو کے ساتھ رشتہ نہ ہو۔

نوجوان فرانسیسی شاعر کو ان طعنوں سے ایک صدمہ پہنچا، لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا، بار بار اس کے ذہن میں یہ خیال آ رہا تھا، کہ وہ اپنے باپ کی رضامندی کیسے حاصل کرے؟ کب اس کی مستقل آمدنی ہو گی؟ ایک موہوم سا مستقبل اس کے سامنے تھا اور وہ ان سوالات کا جواب بطلق نہیں دے سکتا تھا، چنانچہ وہ ایڈل کو تسکین دیتا رہتا اور یہ کہتا۔

"پیاری ایڈل! ایک وقت آنے والا ہے کہ تمہارا [illegible] ہیوگو سے گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ ایک مستقل آمدنی کا ذریعہ میرے سامنے کھلنے والا ہے۔"

چنانچہ ایسا ہی ہوا، شاعر کا خواب جھوٹا ثابت نہ ہوا ۱۸۲۲ء میں گورنمنٹ نے اس کی خدمات کے معاوضہ میں اس کی پنشن مقرر کر دی، کچھ زیادہ پنشن نہ تھی، صرف [illegible]۱ فرانک سالانہ لیکن اسے اتنی تسلی تھی کہ یہ مستقل آمدنی ہے۔ اس نے ایڈل کو لکھا۔

"ایڈل! میری ایڈل!! میں خوشی سے دیوانہ ہوا جاتا ہوں، اس ہفتے میں ایک بلائے آسمانی کا انتظار کر رہا تھا لیکن خدا نے مجھ پر مسرتوں کا دروازہ کھول دیا ہے۔"

اب صرف جنرل ہیوگو کی اجازت کی ضرورت باقی تھی، لیکن یہ بہت مشکل کام تھا، وکٹر کو اس بات کا علم تھا کہ وہ کبھی بھی اجازت نہ دے گا، اس کے دماغ میں اپنے باپ کی ہیبت چھائی ہوئی تھی، وہ اس سے یہ سوال ہی نہ کرنا چاہتا تھا کیونکہ اگر ایک بار اس نے انکار کر دیا تو پھر سوائے پانچ سال اور ٹھیرنے کے اور کوئی راستہ نہ رہے گا، اور اسے یہ بھی احساس تھا کہ ایڈل کے والدین اتنی مدت انتظار نہ کر سکیں گے اور روز بروز وہ اس فیصلہ کن سوال کو ملتوی کرتا رہا، آخر کار ۶ مارچ کے روز اس نے خط لکھنے کی جرأت کر ہی دی۔ اُس نے ایڈل کو لکھا۔

"میں نے وہ خط لکھ دیا ہے جس پر میری قسمت کا فیصلہ ہو گا، ہم دونوں کو اس لمحے کا منتظر رہنا چاہئے کیونکہ اس وقت ہم اپنی زندگیوں کے نازک ترین دور میں سے گزر رہے ہیں، معاف کرنا میں اپنی زندگیوں لکھ رہا ہوں کیونکہ میں اپنی بدقسمتی کے چکر میں تمہیں بھی ساتھ ساتھ گھسیٹ رہا ہوں، لیکن جب میں یہ دیکھوں گا کہ میری زندگی سے تمہاری مسرتوں کا خون ہو رہا ہے تو میں فوراً اپنا خاتمہ کر دوں گا۔

ممکن ہے حالات ہمارے حق میں ہو جائیں، تمہاری محبت میں مجھے کئی بار مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، اس وقت بھی میں مایوس نہیں ہوں گو امید کا بہت ہی تھوڑا امکان ہے، میری امیدیں نہایت قیمتی اور نہایت شیریں ہیں . . . دیکھیں قسمت ہمارے لئے کیا کرتی ہے!"

ایک ایک دن گنتے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا، اس انتظار میں وکٹر کی عجیب حالت تھی، آخر کار آٹھویں دن جواب آ گیا جس نے دونوں میں خوف طاری کیا ہوا تھا کانپتے ہوئے ہاتھوں سے وکٹر نے خط کھولا تو اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آتا تھا۔

جنرل ہیوگو نے بخوشی اجازت دے دی تھی۔

اور ناراض ہو جانے کی بجائے اس نے اپنے بیٹے سے التجا کی کہ وہ اسے معاف کر دے،

"میں نے تمہاری ماں کو بہت دکھ پہنچایا ہے۔ میں نے ایک اور عورت سے شادی کر لی ہے اور غالباً اس عورت کی وجہ سے تمہاری

ماں کا دل ٹوٹ گیا تھا، میری یہ دلی خواہش ہے کہ میں تمہیں خوش دیکھوں غالباً میری اس خواہش سے تمہاری ماں کی روح بھی خوش ہو گی۔"

وکٹر مسرت سے اچھلنے لگا، لیکن اپنے باپ کی دوسری شادی کی خبر سن کر اُسے صدمہ ہوا، وہ ایڈل کو لکھتا ہے۔

"میں نے آج اپنے باپ کو خط لکھا ہے جس میں میں نے اپنے درد کا اظہار بھی کیا ہے"

۱۲ اکتوبر کے دن ان کی شادی قرار پا گئی، جس دن انہوں نے محبت کا عہد و پیمان کیا۔ اس دن سے پورے اڑھائی سال بعد ان کی شادی ہوئی۔

شادی سے چند روز پیشتر وکٹر نے ایڈل کو لکھا۔

پیاری ایڈل! تمہیں اس بات پر تو شک نہیں ہو گا کہ ہماری زندگیاں ایک عجیب گردش میں رہیں۔ ہماری روحوں کی گہرائی میں مسرتیں کھیل رہی ہیں جو زمین اور آسمان دونوں سے اخذ کی گئی ہیں، ہماری ہونے والی شادی عوام کو بتانے کے لئے ایک رسم ہو گی۔ ورنہ ہم خدا کے سامنے مدت ہوئی ایک مقدس معاہدہ کر چکے ہیں، وہی ہماری شادی تھی، اسی عہد کو آج لوگوں کے سامنے بیان کیا جا رہا ہے۔"

. . . . . .

افسوس یہ شادی ایک مقدس معاہدہ ثابت نہ ہو سکا۔ ایڈل ہمیشہ وفادار بیوی رہی لیکن وکٹر صحیح راستے سے بھٹک گیا، ایڈل نے کبھی شکایت نہ کی، وہ جانتی تھی کہ اس نے ایک طباع انسان سے شادی کی ہے اس لئے خاموشی کے ساتھ وہ سارے دکھ سہتی رہی۔

محبت کے آغاز کے دن ایڈل کی ساری زندگی کو تر و تازہ رکھنے کے لئے کافی تھے۔

(ترجمہ)

خلیل

رباعیات

ناکام ہے جان کامیابی ہو جا
آزاد صراحی و گلابی ہو جا
ہو ولولۂ عمل سے اتنا سرشار
بے منتِ جام و مے شرابی ہو جا

ہر نام و نمود سے گریزاں ہو جا
[illegible] میں چراغِ زیرِ داماں ہو جا
[illegible] تابِ فروغ
شمع [illegible] نفس [illegible] نمایاں ہو جا

سید [illegible] طباطبائی

گائے جا!

روح افسردہ سی ہے۔ بہلائے جا
جسم میں اک لہر سی دوڑائے جا
خود تڑپ اوروں کو بھی تڑپائے جا
گائے جا غم آشنا دل گائے جا

چٹکیاں لیتا ہے شوقِ جستجو
گدگداتی ہے کسی کی آرزو
ذکرِ الفت سے مجھے گرمائے جا
گائے جا غم آشنا دل گائے گا

رابطِ باہم کا نہ ٹوٹے سلسلہ
محو ہو جائے نہ یادِ دلربا
میٹھے میٹھے درد سے گھبرائے جا
گائے جا غم آشنا دل گائے جا

چھیڑتا ہوں روز میں سازِ شباب
دیکھتا ہوں روز میں رنگین خواب
رازہائے زندگی سمجھائے جا
گائے جا غم آشنا دل گائے جا

روشن نکودری

غزل

فصل گل دیتی ہے طعنے ترے دیوانے کو دھجیاں جیب کی ملتیں نہیں نذرانے کو
علم واعظ کو کہاں آئیں جو سمجھانے کو ہم تو ہیں دل میں چھپائے ہوئے بتخانے کو
واسطہ دیر سے کچھ ہے نہ حرم سے مطلب اک ترے در سے غرض ہے ترے دیوانے کو
دل ہوا ان کا طرفدار تو اپنا کیسا ہم تو پہلو میں جگہ دیں گے نہ بیگانے کو
مستیاں لیتی ہیں جھک جھک کے بلائیں سر راہ تم تو آنکھوں میں لئے پھرتے ہو میخانے کو
وہ کہاں فرق نشیں اور یہ پامال خرام دل صد چاک سے تشبیہ نہ دو شانے کو
نام رہتا ہے شہیدان وفا کا زندہ عمر خضری سے ہے میسر مرے افسانے کو
عالم جذب میں کیا جانئے کیا بک جائے کوئی للہ نہ چھیڑے ترے دیوانے کو
موت کا ایک سبب فرط مسرت بھی ہے کیوں گلے شمع لگا لیتی ہے پروانے کو
خاکساری کا عوض دہر میں ملتا ہے ضرور ہو کے مٹی لقب نخل ملا دانے کو
نثر میں بھی وہی اشعار کی موسیقی ہے گاتے پھرتے ہیں عنادل مرے افسانے کو
شب جو محفل میں انہیں مشق ستم کی سوجھی شمع جلوا کے جلاتے رہے پروانے کو
کیا ستم ہے کہ پپیہے سر تربت آکر چھیڑتے رہتے ہیں بھولے ہوئے افسانے کو
سخت جانی سے مری ہے متحیر قاتل دیکھتا ہے کبھی خنجر کبھی دندانے کو
میکدے میں ہیں کیا جانئے کیا یاد آیا رو پڑے دیکھ کے ٹوٹے ہوئے پیمانے کو

نجم ہر لفظ میں اک درس وفا پنہاں ہے
اہل دل غور سے دیکھیں مرے افسانے کو

نجم ندوی بی اے

پریما

بسنت کی سہانی رات تھی۔ چاند کی روپہلی کرنیں آم کی ہری ہری پتیوں سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔

بسنت رت کی چہل پہل ہوا پریما اور سوریش کو گدگدا کر چاند سے آنکھ مچولیاں کھیلتے ہوئے تاروں میں جا ملتی تھی۔ ان دونوں پریمیوں کے دلوں میں بیتے ہوئے دنوں اور آنے والے زمانے کی نہ جانے کتنی پہیلیاں گنگا کی لہروں کی طرح اٹھ کر غائب ہو جاتی تھیں۔

"سوریش! ذرا دیکھنا آکاس پر تارک بالاؤں کی سندر سبھا" پریما تاروں کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہوئی بولی۔

"ہاں یہ راس لیلا تو سدا اسنسار کے من کو موہتی رہے گی۔ لیکن آہ ہماری یہ پریم لیلا تو چار دن کی چاندنی ہے"۔ سوریش کسی قدر افسردہ لہجے میں بولا۔

"یہی چار دن کی چاندنی . . . ؟"

"تم نہیں جانتیں بھولی پریما! ہماری یہ پریم لیلا بدھاتا کو ایک آنکھ نہیں بھاتی"۔

"بدھاتا . . . ؟"

"سماج!"

"میں نہیں سمجھی"۔

"او ہو پریما تم کتنی بھولی ہو! اس نے تمہاری اُتم ہڈیوں کے مقابلے میں میری ہڈیوں کو مدھم اور نیچ بنایا ہے"۔

"پھر اس کا نتیجہ کیا ہوگا . . . ؟"

"آہ نتیجہ وہی ہوگا جو بھاگ میں لکھا ہوگا"۔

گنگا کی چنچل لہریں نرم رو ہوا سے اٹھکیلیاں کر رہی تھی اور چاند تاروں کے ساتھ آنکھ مچولیاں کھیل رہا تھا۔ سوریش اور پریما دھیرے دھیرے گاؤں کی طرف چلتے چلتے پریما کے منہ سے نکل گیا — "آہ نردئی سماج!"

. . . . . .

پریما کے باپ کیلاش بہاری مصر لڑکا تلاش کرتے کرتے تھک گئے۔ لیکن اونچی ہڈی کا لائق لڑکا نہ ملا۔ آخر مجبور ہو کر ایک نالائق اور بے جوڑ ہی بر کے ساتھ پریما کو بیاہ دیا اور اس بات پر خوش تھے کہ بر نالائق اور بے جوڑ سہی لیکن اونچی ہڈی کا تو ہے!

پریما کے پتی دیو کا نام ہری کرشن رائے تھا۔

. . . .

"چھی چھی۔ مرد ہو کر روتے ہو؟"

"پھر کیا کروں دل پر بھی کوئی بس ہے؟"

"دھیرج سے کام لو . . . ."

"آہ یہ بھی کوئی اپنے بس کی بات ہے؟"

"مرد ہو دھیرج سے کام لو۔ کوئی لائق لڑکی دیکھ کر اپنی گرہستی کھڑی کر لو اور ان خوشی کے دنوں میں مجھے بھی بلانا"۔ پریما بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"یہ مجھ سے نہ ہوگا"۔ سوریش آنسو پونچھ کر بولا۔

"پھر مجھ سے ملو گے؟" پریما اس کے ہاتھ کی انگلیاں پکڑ کر بولی۔

"ضرور ملوں گا"

"ہاں ضرور ملنا"

دونوں خاموش کھڑے تھے۔ لیکن ان کی آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔

"پریما؟"

". . . . ."

"پریما اتنی ادھیر نہ ہو"۔

"نہیں سوریش میں ادھیر نہیں ہو رہی ہوں۔ میں تمہارے آنے والے دنوں کی سوچ میں پڑی ہوں۔ بولو میرے نہ رہنے کی حالت میں اپنے دن سکھ سے بتاؤ گے نہ؟"

"اور تم . . . ؟"

"میری چنتا نہ کرو سوریش سنتی ہوں ان کا خاندان بڑا ہے۔"

میں کسی طرح اپنا دل بہلا لوں گی۔"

"کبھی کبھی خط لکھ سکو گی؟"

"ضرور ضرور۔ بھلا یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔"

"بس میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہتا۔ جہاں بھی رہو سکھ سے رہو۔ میری پریا میں اسی میں سکھی رہوں گا۔"

"اچھا سوریش اب رخصت چاہتی ہوں اور آخری رخصت۔"

سوریش نے دیکھا پریا کانپ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی اپار ندی اُمڈ رہی تھی۔

"پیاری پریا! اف کوئی آگیا؟" سوریش نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"بس میری ایک یہی پیار تمنا ہے کہ اپنے دل کے کسی کونے میں مجھے تھوڑی سی ایسی جگہ دو جہاں سے میں کبھی کبھی تمہاری یاد کے ساتھ یہی سہانا کھیل کھیل سکوں . . . "

. . . .

پریا اب ایک نئی دنیا میں آبسی تھی۔ یہاں کا ماحول وہاں سے بالکل جدا تھا۔ قدم قدم پر قانون اور پابندیوں کا کانٹا۔ کل کی بن کی آزاد کوئل آج سماج کے پنجرے کے اندر بند تھی۔ کبھی کبھی دوسرے کو ماں کہہ کر پکارنے والی پریا اب خود ماں بن گئی تھی —— ! اس حیرت انگیز انقلاب سے وہ جتنا بھی گھبراتی کم تھا۔

خطرناک صورت حالات کی موجودگی میں بھی پریا کسی نہ کسی طرح آدھا خط لکھ چکی تھی لیکن گھر والوں کی آنکھ کہاں تک بچاتی؟ ہری کرشن کے چھوٹے لڑکے انوپ نے اسے کئی دن لکھتے دیکھا تھا۔ بے چاری بہلنے گئی تھی۔ انوپ نے خط اٹھا لیا اور جاکر باپ کے سامنے پڑھنا شروع کیا۔ انوپ ابھی دوسرے ہی درجے میں پڑھتا تھا۔ بھلا ہاتھ کا لکھا ہوا خط اس سے کیسے پڑھا جاتا؟ الٹ پلٹ کر دو چار جملے اِدھر اُدھر کے پڑھ رہا تھا۔ باپ نے پوچھا "کیسا کاغذ ہے انوپ؟"

"نئی ماں کی چٹھی ہے" انوپ نے خط لفافے میں بند کرتے کرتے کہا۔

رائے صاحب کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ غصے سے ہونٹ کانپنے لگے۔ گرج کر بولے —— "پڑھ بے پڑھ . . . "

انوپ نے لفافے کے اوپر کے پتے کو پڑھنا شروع کیا —— "سو . . . ریش . . . چند . . . ر . . . میڈ . . . یکل . . . کالج . . . پٹنہ۔"

"بس کرو بس۔ میں سمجھ گیا۔ افوہ اتنی دلیری! ڈائن ہے ڈائن"

ہری کرشن رائے نے لڑکے کے ہاتھ سے خط لے کر ٹکڑے ٹکڑے کرکے پھینک دیا۔ اس کے بعد غریب پریا پر کیا گذری! یہ اس کے سوا کون جانے؛

. . . .

ڈاکٹر سوریش چندر کا سنگرام پور میں تبادلہ ہوا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ ایک کامیاب اور تجربہ کار ڈاکٹر ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ابھی تک اپنی شادی نہیں کی ہے۔ اس لئے ان کی عزت و شہرت دیکھ کر ہر روز کوئی نہ کوئی لڑکی والا ان کے پاس پہنچا ہی رہتا ہے۔ شاید ڈاکٹر ہونے کے بعد انہوں نے کسی عمل سے اپنی مدھم ہڈیوں کو اٹم بنا لیا ہے۔

لیکن ڈاکٹر صاحب کسی وجہ سے صاف انکار کرتے جاتے ہیں۔

اسی طرح کچھ دن گذر گئے۔

بسنت رُت کی دوپہر تھی۔ ڈاکٹر صاحب نسخہ لکھنے میں مصروف تھے۔ "بڑی بھیڑ تھی" "ماد ھو ہوں سرکار" ایک بوڑھے نے بیل گاڑی سے اترتے ہوئے کہا اور لاٹھی ٹیکتا ہوا کمرے میں آگیا۔

"کیا ہوا ہے؟ موتیا بند؟" ڈاکٹر نے فوراً اس کی آنکھوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں دکھ کا مارا ہوں سرکار، روگ پرانا ہوگیا ہے" بوڑھے نے رو کر کہا۔

"تمہاری آنکھوں کا اپریشن ہوگا۔ تمہارے ساتھ اور کوئی ہے؟"

"لڑکے نے مار پیٹ کر الگ کر دیا ہے سرکار۔ اب اور کون ہوگا؛ وہی بڑھاپے کی لکڑی . . . "

ڈاکٹر نے بات کاٹ کر کہا —— "بات ختم کرو۔ کون ہے بلاؤ!"

گاڑی سے اتر کر ایک عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ گھونگھٹ سے ڈھکا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے بار بار دیکھا لیکن ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آخر کمپاؤنڈر سے مریض کا بندوبست کرنے کے لئے کہہ کر چلے گئے۔ لیکن ان کے دل میں گوناگوں خیالات کا ایک ہنگامہ بپا تھا۔

وہی بسنت رُت کی شام اپنی سیاہ چادر سے دنیا کو ڈھک رہی

تھی۔ ڈاکٹر صاحب ہسپتال کے صحن میں کرسی پر بیٹھے ہوئے کچھ سوچ رہے تھے اور وہ عورت بھی برآمدے میں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد افق کی اوٹ سے چاند بھی جھانکنے لگا۔ عورت اٹھ کر دھیرے ایک طرف چلی۔

"ڈاکٹر بابو!" عورت گھونگھٹ کھول کر بولی۔

ڈاکٹر کا رہا سہا شک بھی جاتا رہا اور وہ کھڑے ہو کر پکار اٹھے

"پریما ——!"

عورت چپ چاپ ان کی طرف دیکھتی رہی۔

ہر چند کہ گردش زمانہ سے پریما کے رنگ روپ میں زبردست تغیر ہو گیا تھا۔ پھر بھی اتنے قریب آ کر وہ سوریش کی آنکھوں سے چھپ نہ سکی۔

"پریما!" ڈاکٹر نے پھر کہا۔

"سو . . . ر . . . یش . . . " عورت نے دھیرے سے کہا۔

عورت کا اتنا کہنا تھا کہ ڈاکٹر نے دوڑ کر اسے سینے سے لگا لیا اور دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی اپار ندی امڈ پڑی۔

"آہ میری دکھ بھری کہانی سن سکو گے سوریش؟" عورت سسک کر بولی۔ ڈاکٹر چپ رہا۔

"ضرور سن سکو گے۔ کیونکہ تم مرد ہو اور تمہارا دل مضبوط ہوگا اور میں دکھ کی ماری ابلا ہوں۔ لٹ چکی ہوں۔ تم سن تو سکو گے لیکن میں سنا بھی سکوں گی؟" عورت سسکیاں بھرتی ہوئی بولی۔

ڈاکٹر حیران رہ گیا ——

عورت نے کہنا شروع کیا —— اچھا تو سنو —— یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ جس وقت میری شادی ہوئی۔ اس بوڑھے کی عمر پچاس سے ڈھل چکی تھی۔ جب میں سسرال پہنچی تو گرہستی کا سارا بوجھ میرے سر پڑا۔ بوڑھے کی پہلی استری چل بسی تھی اس کے تین لڑکے تھے اور دو لڑکیاں۔ دو لڑکوں کی بہوئیں موجود تھیں۔ تیری ساس بن کر میں پہنچی گھر کا سارا بوجھ مجھے سنبھالنا پڑا اور اسی پر بس نہیں تھا سب کی کڑوی بولیاں بھی سہنی پڑیں۔

یہ تو تم جانتے ہو کہ بے سمجھ بوڑھے بچے بن جاتے ہیں۔ اس کا بڑا لڑکا رامو بوڑھے کی آنکھوں میں دھول جھونک کر میرے پیچھے پڑا۔ آہ سوریش سناؤں تمہیں اس پاپی کی کہانی —— ؟ اچھا سنو۔ اس نے میرے ساتھ نامناسب رشتہ جوڑنا شروع کیا اور میرے لئے بازار سے مٹھائیاں اور بناؤ سنگار کے سامان لا کر مجھے دینے لگا۔ موقع بے موقع میرے کمرے میں بھی آ پہنچتا اور کھلے لفظوں میں اپنے دل کی بات مجھ سے کہہ بیٹھتا۔ آہ اس وقت میرے دل میں کیسی ٹھیس لگتی تھی؟ یہ کچھ میں ہی جانتی ہوں۔ ہاں تو وہ نیچ پاپی کبھی کبھی رات کو بھی میرے پاس پہنچتا اور مجھے اپنے قابو میں لانے کے لئے اپنی طاقت سے کام لیتا۔ جب اس طرح بھی اس کا بس نہ چلتا تو میرے اوپر ظلم کا جو پہاڑ ڈھاتا اسے تمہیں دیکھنا ہوگا!" اتنا کہہ کر عورت نے اپنی پیٹھ کھول کر دکھائی۔ جس پر لاٹھیوں کی چوٹ کے سیکڑوں نشانات موجود تھے۔

عورت سسکیاں لیتی ہوئی کہنے لگی —— "سوریش! مجھے یہ تو نہیں یاد رہا کہ اس پر کتنی لاٹھیاں پڑی ہیں۔ لیکن یہ اچھی طرح یاد ہے کہ سات برس تک برابر اس پر لاٹھیاں برسی ہیں . . . آہ سوریش! میری رام کہانی کہاں تک سنوگے؟ اور میں کہاں تک سنا سکوں گی۔ بس اب مجھ سے نہیں کہا جاتا۔ ہائے رے بے رحم سماج . . . !"

اتنا کہتے کہتے پریما بے ہوش ہو گئی۔ ڈاکٹر نے چیخ کر نوکر کو پکارا —— "رامو! رامو! ارے او رامو!!"

آسی رام نگری

آمدِ صبح

دوپٹہ شب کا ڈھلکے گا!
نہ ٹھہرے گا یہ سر پر رات کی رانی کے اک پل کو؛

یہ روشن اور اجلا چاند یعنی رات کا پریمی
یہ اس کو جگمگاتے، پیلے تاروں سے
سجا کر لایا ہے گھر سے۔
مگر چنچل ہے رانی رات کی بے حد؛
دوپٹہ شب کا ڈھلکے گا!

ہے دل میں چاند کے جذبہ محبت کا،
چھپاتا ہے وہ غیروں کی نگاہوں سے اڑھا کر اک دوپٹہ اس کو تاروں کا؛
مگر چنچل ہے رانی رات کی بے حد،
فضا کے گلستاں میں پھرتی ہے اٹھکیلیاں کرتی،
ہوائیں گیسوؤں کو اس کے چھو کر دوڑ جاتی ہیں،
دوپٹہ شب کا ڈھلکے گا!

وہ لو، پیلا پڑا روشن سا چہرہ چاند کا بالکل!
اُسے افسوس! اندیشوں نے گھیرا ہے،
اُسے خطرہ ہے غیروں کا،
ہے جذبہ اُس کے دل میں تند چاہت کا۔

مگر چنچل ہے رانی رات کی بے حد،
وہ اِن کیفیتوں کو دل میں لاتی ہی نہیں بالکل!

دوپٹہ شب کا ڈھلکا، ہاں وہ ڈھلکا جس طرح نغمہ
کسی راگی کے دل سے اُٹھ کے اک دم بیٹھ جاتا ہے!

پرندے چہچہاتے ہیں،
وہ لو، سورج بھی اپنی سیج پر اب جاگ اٹھا ہے!
گئی رات اور دِن آیا!

"میراجی"

عشق اور خودداری

تمام انسانی جذبات میں عشق و محبت جیسے شریف جذبہ کو جو درجۂ فضیلت و امتیاز حاصل ہے۔ وہ محتاج بیان نہیں۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو عالمگیر تاثیر کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کی ہمہ گیری ایک امر مسلّم ہے۔ ہر دل میں اس کا جلوہ اور ہر شے پر اس کا تسلط۔ یہ ایک ایسا جادو ہے جس کے دائرۂ اثر سے اس کائنات کی کوئی چیز باہر نہیں۔ تمام نوع انسانی میں بلالحاظ قوم و نسل و ملک یہ جذبہ مساوی طور سے پایا جاتا ہے۔ ہر فرد بشر پر اس کی کارفرمائی ہے۔ نوع انسانی کا کوئی فرد خواہ وہ ایرانی ہو یا ہندی۔ عرب ہو یا ترک۔ جرمن ہو یا فرانسیسی یکساں طور پر شراب عشق میں سرشار نظر آتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کسی قوم کا لٹریچر اور کسی زبان کا ادب عشق و محبت کی روح پرور داستان سے خالی نہیں خصوصاً شاعری جو جذبات کے اظہار اور برانگیختگی کا نام ہے۔ عشقیات کے ایک بڑے جزو پر مشتمل ہوتی ہے۔ عالمگیر ہونے کے ساتھ ہی ساتھ یہ ایک نہائت وسیع عنوان بھی ہے۔ مختلف زبانوں کی شاعری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم کا لٹریچر عاشق و معشوق کی ایک علیحدہ تصویر پیش کرتا ہے۔ ان متعدد تصویروں میں بہت سے رنگ عام ہوتے اور بہت سے مخصوص بھی۔ بعض ایک تصویر میں زیادہ ابھرے ہوتے ہیں۔ اور بعض دوسری میں۔ عشق کے بہت سے ایسے پہلو اور عاشق و معشوق کی بہت سی ایسی خصوصیات ہوتی ہیں۔ جو ایک زبان میں پائی جاتی ہیں۔ اور دوسری میں نہیں یا جن پر ایک قوم کے ادبیات میں زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اور دوسری میں کم۔

اگر ہم اردو اور عربی کا مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ عشقیہ سوز و ساز۔ راز و نیاز۔ ہجر کے آزار۔ وصال کی پرکیف لذات۔ وداع کی متلاطم کیفیات۔ معشوق کی شوخی۔ ستم ظریفی۔ ادا۔ بانکپن۔ ناز اور عاشق کی عاجزی۔ نیاز۔ بےکسی۔ تسلیم۔ صبر و رضا۔ اور ناز برداری کے تذکرے دونوں زبانوں میں بطریق اکمل موجود ہیں۔ البتہ عاشق کی نفسیات کا ایک اہم پہلو ایسا ہے۔ جس پر عربی شاعری میں تو خوب روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور بڑے زور کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن ہماری زبان میں اس کی صرف ایک دھندلی سی جھلک کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ دونوں زبانوں میں عاشق کی جو تصویریں ہمارے سامنے پیش کی گئی ہیں۔ ان میں مابہ الامتیاز "عاشق کی خودداری" ہے۔ عربی میں عاشق کی صفات میں سے خودداری کو ایک اہم صفت قرار دیا جاتا ہے۔ بخلاف اردو کے کہ اس میں اس کی طرف بالکل توجہ نہیں کی گئی ہے۔

جس طرح ایک ہندی عاشق معشوق کی پرستش کرتا ہے۔ اس کی ایک ایک ادا پر دل قربان کرتا ہے۔ ہجر میں مر مر کر جیتا ہے۔ اس کے لئے تمام دنیا سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح ایک عرب کا دردمند محبت اور ایک ریگستان عرب کا صحرا نورد بھی اپنے محبوب پر دل و جان سے فدا ہوتا ہے۔ اس کے لئے طرح طرح کے مصائب و آلام برداشت کرتا ہے۔ جنگلوں جنگلوں مارا پھرتا ہے۔ راہ میں جتنی مشکلات پیش آئیں ان کا سامنا کرتا ہے۔ ہاں صرف فرق اتنا ہے۔ کہ ایک عربی عاشق کو ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ اپنی خودداری کا بھی پاس ہوتا ہے۔ معشوق کی ناز برداری میں وہ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا وہ بھی اس پر صد ہزار جان سے والا و شیدا ہے۔ اسے قدرت کی قوت تخلیق کا بہترین نمونہ تصور کرتا ہے۔ وہ بھی جفا کی لذتوں کا حریص ہے اور اقبال کے ساتھ ہم آواز ہو کر کہتا ہے۔ ع

ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزہ ہی نہیں

مگر معشوق کی تحقیرانہ نگاہ کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔ عشق کی راہ میں وہ کسی قسم کی تذلیل برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ معشوق کے مُنہ سے دشنام سننے کا آرزومند نہیں۔ وہ اس کی نظر میں وقیع اور باعزت ہو کر رہنا چاہتا ہے۔ وہ بوالہوس نہیں وہ معشوق کا غلام نہیں بلکہ اس کی شمع حسن کا پروانہ ہے۔ اسے عشق نے "نکما" نہیں کر دیا ہے۔ عشق نے اس کے احساس خودداری کو مردہ نہیں بنا دیا ہے۔ عشق اس کے لئے ذلت و خواری کا باعث نہیں ہو سکتا۔ اس کو اپنی عزت کا پاس ہے۔ اس کی خودداری کو کوئی ٹھیس نہیں لگ سکتی۔ اس کی یہ آرزو نہیں کہ وہ معشوق کے پاؤں میں پڑا رہے یا معشوق کی ٹھوکریں کھائے یا اس "سیمتن کے پاؤں" دھو دھو کر پیئے۔ عشق کی امانت کو اپنے سینہ میں رکھ کر وہ اس بات کی امید نہیں کرتا کہ دربان تو کجا خود محبوب کے مُنہ سے گالیاں

سنے۔ اس کو یہ تمنا مضطرب رکھتی ہے کہ وہ معشوق کے پاؤں میں نہیں بلکہ نظروں میں رہے۔ وہ اپنے پاسِ عزت کو اپنی وفا شعاری کا ضامن بناتا ہے چنانچہ جب کبھی معشوق کی بے اعتنائی اور سرد مہری دیکھتا ہے۔ شریفانہ طور پر علیحدگی اختیار کر لیتا ہے۔ اگر معشوق کی جانب سے ذرا تذلیل آمیز اعراض پایا جاتا ہے۔ تو اس کے پاس اس کی تیز رفتار دشمنی موجود ہے۔ تمام تعلقاتِ محبت کو یک لخت قطع کر کے فوراً روانہ ہو جاتا ہے۔

متذکرہ بالا بیان کے بعد یہ صاف کر دینے کی ضرورت ہے کہ عربی عاشق کی محبت، ناز برداری، یا وفاداری میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اپنی خودداری کا پاس سچے جذبہ محبت کے منافی نہیں۔ پاؤں دھو دھو کر پینا یا دشنام سننے کی آرزو کرنا ناز برداری کے مفہوم میں داخل نہیں۔ عشق سے نکما نہ ہو جانا۔ خودداری کے خیال سے تعلقاتِ محبت کو قطع کر دینا اور ان تمام آرزوؤں اور تمناؤں کو جنہیں اس نے اپنے خونِ جگر سے تربیت دیا تھا خیرباد کہ دینا بے وفائی نہیں بلکہ اوّل درجہ کی علوہمتی کی دلیل ہے۔ جو مردانہ اوصاف میں محمود ترین وصف ہے۔ اگر کوئی محبت قابلِ اعتماد ہو سکتی ہے تو اسی شخص کی جسے اپنی عزت کا پاس ہو۔ اگر کوئی شخص وفادار کہا جا سکتا ہے تو وہ وہی شخص ہے جو اپنی خودداری کو نہ کھو بیٹھا ہو۔ ناز برداری میں ایک عربی عاشق بھی کمی نہیں کرتا۔ وہ ہر قسم کے ناز اٹھانے کے لئے تیار ہے۔ لیکن ناز کو تذلیل کا مرادف نہیں سمجھتا۔ وہ ہر طرح کے امتحان محبت کے لئے اپنے آپ کو پیش کرتا ہے۔ ہاں! البتہ اپنی تذلیل کو وہ محبت کا معیار قرار نہیں دیتا۔ وہ اپنے عشق و وفا کو ذلت و تحقیر کے پیمانہ سے نہیں ناپ سکتا۔ اس کے اپنے خیال میں عشق سے اس کی قیمت میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی قدر و منزلت کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔

یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ عاشق کی خودداری۔ عاشق کی عاجزی اور نیاز کے کسی طرح منافی نہیں۔ اس خودداری کے یہ معنے نہیں کہ معشوق کا احترام بالکل خاک میں ملا دیا جائے۔ اس کا درجہ بالکل مبتذل ہو جائے اور اس سے ہر وقت تو تو میں میں ہوا کرے۔ اُردو کے بعض شعراء اور خصوصاً مرزا داغ کے یہاں اس قسم کی بے اعتدالیاں بہت پائی جاتی ہیں۔ اور یہ ان کی غزل کا بہت بڑا عیب ہے۔ ایک طرف تو مساویانہ گفتگو بالکل عام بات ہے۔ بلکہ کہیں کہیں معشوق کو بہت سخت دھمکیاں دی گئی ہیں۔ اور دوسری طرف بعض جگہ خاکساری سے گزر کر بازاری عشق میں نہایت ذلت اختیار کی ہے اور اپنے کو بہت مبتذل بنا دیا ہے۔ اس موقع پر مرزا غالب کا ایک شعر خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں انہوں نے معشوق کے مرتبہ اور اپنے فخر و غرور کا اس خوبصورتی سے اظہار کیا ہے کہ عاشقانہ عجز و نیاز کی شان قائم رکھی ہے۔ ؎

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیا دریغ ✤ رتبہ میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

ذیل میں ہم چند اشعار دونوں زبانوں کے پیش کریں گے جن سے مذکورہ بالا نظریہ کی صداقت کا ایک حد تک اندازہ ہو سکتا ہے:۔

ذوق کو دیکھیئے کس نشہ میں مخمور ہیں:۔

(۱) دشنام ہو کے وہ ترش ابرو ہزار دے ✤ یاں وہ نشے نہیں جنہیں ترشی اتار دے

غالب کہتے ہیں:۔

(۲) دے وہ جسقدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالینگے ✤ بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

(۳) بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی ✤ آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

(۴) داں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب ✤ یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

(۵) دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیمتن کے پاؤں ✤ رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

غالباً یہ ارذل ترین شعر ہے۔ اس میں شاعر نے اپنے درجہ کو بالکل مبتذل بنا دیا ہے۔ ایسی صورت میں کیا تعجب ہے اور کیا بے جا ہے اگر غالب کے معشوق نے ان کو اس لائق بھی نہ سمجھا کہ وہ پاؤں دھو کر پئیں!

اس کے مقابلہ میں عربی شعراء کے جذباتِ محبت و خودداری ذیل کے اشعار کے آئینہ میں ملاحظہ کیجئے:۔

لبید بن ربیعہ عرب کا بلند پایہ شاعر ہے۔ نوار اس کی معشوقہ کا نام ہے۔ پیر فلک نے اس کی منظورِ نظر کو اس سے کوسوں دور کر دیا ہے۔ لبید کو اس کی جانب سے بے اعتنائی کا شبہ ہوتا ہے۔ جس پر اپنے وارداتِ قلب کا ان اشعار میں اظہار کرتا ہے:۔

(۱) فَاقْطَعْ لُبَانَةَ مَنْ تَعَرَّضَ وَصْلُهُ ✤ وَلَخَيْرُ وَاصِلِ خُلَّةٍ صَرَّامُهَا

اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے لبید تو اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کو اس شخص سے قطع کر دے جس کی محبت معرضِ زوال میں ہو۔ اور جس کا مزاج بدل گیا ہو۔ بیشک سب سے بہتر محبت کرنے والا وہ شخص ہے جو اس کو منقطع بھی کر دے (جب محبت میں تغیر دیکھے)

(۲) وَاحْبُ الْمُجَامِلَ بِالْجَزِيلِ وَصَرْمُهُ ✤ بَاقٍ إِذَا ظَلَعَتْ وَزَاغَ قِوَامُهَا

جو تجھ سے اچھی طرح پیش آئے۔ اس کی طرف بہت زیادہ عنایت و محبت کر اور جب اس کی چال سیدھی نہ رہے (یعنی اس کی محبت میں فتور آئے) تو اس کو ترک و قطع کر دینے کا تجھ کو اختیار حاصل ہے۔ اُس وقت اُس سے

سر اسر غیر لغسیا ں) -

قطع محبت کرے۔

اسی قصیدہ میں آگے چل کر اپنی محبوبہ نوار سے خطاب کرکے کہتا ہے:۔

(۳) أَوَلَمْ تَكُنْ تَدْرِي نَوارُ بِأَنَّنِي + وَصَّالُ عَقْدِ حَبائِلٍ جَذّامُها

اے نوار! تو مجھ سے الفظ کرکے چلی گئی اور تو نے یہ نہ جانا کہ میں عہد محبت اور مواثیق عشق کا بڑا جوڑنے والا اور نیز توڑنے والا ہوں یعنی جو مجھ سے بے رحمی کا برتاؤ نہ کرے اس کے لئے مجسم وفا ہوں اور جو بے رخی برتے اسکو فوراً چھوڑ دیتا ہوں

(۴) تَرّاكُ أَمْكِنَةٍ إِذا لَمْ أَرْضَها + أَوْ يَرْتَبِطْ بَعْضَ النُّفُوسِ حِمامُها

کیا نوار نے یہ بھی نہ جانا کہ میں ان مقامات کو جنہیں میں پسند نہ کروں اور جو میرے لئے سازگار نہ ہوں (یعنی ذلت کی جگہوں کو) فوراً ترک کر دیتا ہوں مگر یہ کہ میری موت آ جائے کہ اس وقت میں وہاں کے قیام پر مجبور ہوتا ہوں مطلب یہ ہے کہ میں جیتے جی ذلت برداشت نہیں کر سکتا اور ذلت کے مقابلہ میں موت کو ترجیح دیتا ہوں۔

ایک اور مشہور شاعر امراءالقیس جس کو عربی شاعری کا علمبردار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اپنی محبوبہ کے ساتھ اپنی گذشتہ صحبتوں کو یاد کرکے کہتا ہے:۔

(۵) وَيَوْماً عَلى ظَهْرِ الكَثِيبِ تَعَذَّرَتْ + عَلَيَّ وَآلَتْ حَلْفَةً لَمْ تَحَلَّلِ

"اور اس معشوقہ نے ایک دن جبکہ ہم ایک ٹیلہ کی پشت پر بیٹھے ہوئے تھے مجھ پر بڑی سختی کی اور مجھ سے جدائی کی قطعی قسم کھائی اور انشاءاللہ بھی نہ کہا کہ اس قسم کے توڑنے کا موقع رہے"

اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد اپنی محبوبہ کو مخاطب کرکے کہتا ہے:۔

(۶) أَفاطِمُ مَهْلاً بَعْضَ هذا التَّدَلُّلِ + وَإِنْ كُنْتِ قَدْ أَزْمَعْتِ صَرْمِي فَأَجْمِلِي

اے فاطمہ! اگر تیرا یہ فعل از راہ ناز تھا تو اپنے اس ناز کو کسی قدر چھوڑ دے اور اگر تو نے مجھ سے علیحدگی کا پختہ ارادہ کر لیا ہے تو اسے اچھائی کے ساتھ کر یعنی شریفانہ طور سے مجھ سے علیحدہ ہو جا۔

(۷) أَغَرَّكِ مِنّي أَنَّ حُبَّكِ قاتِلي + وَأَنَّكِ مَهْما تَأْمُرِي القَلْبَ يَفْعَلِ

بے شک تجھ کو میرے اس امر نے دھوکہ میں ڈال دیا ہے کہ تیری محبت میری قاتل ہے اور تو میرے دل کو جو حکم کرتی ہے وہی کرنے لگتا ہے۔

اس کے بعد کیسا اچھا شعر کہا ہے:۔

(۸) وَإِنْ تَكُ قَدْ ساءَتْكِ مِنّي خَلِيقَةٌ + فَسُلِّي ثِيابِي مِنْ ثِيابِكِ تَنْسُلِ

اگر تجھ کو میری کوئی عادت بری معلوم ہوئی ہے تو میرے دل کو اپنے دل سے نکال دے اور جدا کر دے تاکہ میں تجھ سے علیحدہ ہو جاؤں اور تو مجھ سے بے غم ہو جائے یعنی اگرچہ میں یہ خوب جانتا ہوں کہ تجھ سے علیحدگی میری ہلاکت کا سبب ہوگی لیکن چونکہ تو مجھ سے محبت نہیں کرتی ہے اور مجھ سے علیحدگی اختیار کرنا چاہتی ہے۔ اس لئے میں اسی کو پسند کرتا ہوں۔ عاشقانہ خودداری اور تسلیم کی بہترین مثال ہے۔

سید محمد یوسف مولوی عالم از بھوپال

غزل

ہر ایک بات تھی گو حسبِ مدعا تیری
ہوئی نہ میرے موافق کبھی فضا تیری

بُھلا تو دیتی ہے باتوں کو وقت کی رفتار
یہ مجھ کو بھولنے دیتی نہیں وفا تیری

مری زبان کو مانع ہے پاسداری راز
تجھے بھی روکتی ہے بات سے حیا تیری

نگاہ روک کے ہاتھوں سے دل پکڑتا ہوں
کہیں سے کان میں آتی ہے جب صدا تیری

قرار دیتی تھی اس دل کو بےقراری میں
کہاں ہے صبر و تحمل بھری ادا تیری

یہ بات کیا ہوئی سیفی برا نہ تھا آغاز
ہوئی ہے قابلِ افسوس انتہا تیری

سیفی

کیا وہ سب تھا بھول جانے کے لئے

(۱)

ستمبر کا خوشگوار مہینہ تھا۔ آسمان پر بادل نام کو نہ تھے۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی نیلا ہی نیلا آسمان تھا۔ البتہ چیلیں کثرت سے منڈلایا کرتی تھیں سورج کی تمازت ذرا بھی ناگوار نہ گذرتی۔ ہاں! دوپہر کے وقت اکثر تیز ہوا چلتی تھی۔ گلابوں کا موسم تھا۔ سرخ۔ گلابی۔ زرد۔ زعفرانی۔ سب ہی رنگوں کے گلاب جا بجا نظر آتے۔ سورج مکھی کے پھول بھی کھلنا شروع ہو گئے تھے۔ امرود کے درختوں پر چمگادڑیں آنے لگی تھیں۔

ایسے پیارے موسم میں میں جواں بخت کے اسکول میں داخل ہوئی۔ جواں بخت ایک خوشرو نوجوان تھا۔ وہ اوپر کی منزل یعنی کالج میں پڑھتا تھا اور میں نچلی منزل یعنی اسکول کی ایک چھوٹی کلاس میں تھی۔

ایک روز اتفاق سے ماسٹر صاحب نہ آئے تھے اور ہم لوگ دل کھول کر شرارتیں کر رہے تھے۔ کمرے کے دروازے بند کر لئے تھے تاکہ دوسری کلاس میں شور کی آواز نہ جائے۔ اس لئے نہیں کہ ہمیں دوسری کلاسوں کے طالب علموں کے حرج کا خیال تھا بلکہ یہ ڈر تھا کہ کہیں دوسرے ماسٹر صاحب آکر خفا ہوں اور ہمیں کوئی کام دے جائیں تو یہ ساری چہل پہل خاک میں مل جائے گی۔ ایک لڑکے نے میری کاپی میں سے دو تین سوالات زبردستی نقل کر لئے۔ مجھے انتہائی غصہ آیا، کیونکہ وہ مجھے اپنی کاپی نقل کرنے کے لئے کبھی نہ دیتا تھا۔ میں جھنجھلا کر کلاس سے باہر چلی آئی اور اوپر کالج کی لائبریری میں پہنچ گئی۔ وہاں جواں بخت کسی کتاب کی تلاش میں الماری کے خانے میں منہ دیئے کھڑے تھے۔ میں نے کرسی میز کی طرف اس زور سے گھسیٹی کہ جواں بخت نے چونک کر پیچھے دیکھا اور مسکرانے لگے۔ اس کے جواب میں میں نے ایک قہقہہ لگایا، پھر باہر دیکھنے لگی۔ کھڑکی سے باغ نظر آ رہا تھا۔ گل اشرفی کا درخت ہوا سے جھوم رہا تھا۔ سرخ سرخ پھول زمین پر بکھرے پڑے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو سنجیدہ بنانے کی کوشش کی۔ سوچا کہ باغ کے خوشنما منظر میں اپنی ہنسی بھول جاؤں۔ بڑی مشکل سے تھوڑی دیر خاموش رہی۔ ایک بار جواں بخت کی طرف دیکھا اور پھر ہنسی آ گئی۔ دوسری طرف منہ پھیرا تو کتابوں کی شیشے کی الماری میں اپنی ہنستی ہوئی صورت نظر آئی۔ اب تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ مجبوراً نیچے بھاگ آئی۔ بس یہ تھی میری اور جواں بخت کی پہلی ملاقات!!!

اس ملاقات کے بعد میں جواں بخت کو قریباً ہر روز دیکھتی تھی لیکن کبھی باتیں کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس روز کے واقعہ کا خیال آتا تو بے اختیار ہنس دیتی۔ وہ بھی مسکرانے لگتے۔

(۲)

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ جواں بخت میرے والد کے ایک دوست کے لڑکے تھے۔ ایک روز والدہ جواں بخت کی بھاوج سے ملنے گئیں میں بھی ساتھ گئی۔ یہ میرے لئے جواں بخت کے گھر جانے کا پہلا اتفاق تھا۔ اس وقت وہ گھر پر موجود نہ تھے۔ میں ان کے کمرے میں پہنچی۔ کتابوں کی الماری میں چند انگریزی رسائل رکھے تھے۔ میں نے نکال کر الٹنا پلٹنا شروع کئے۔ اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ جو تصاویر پسند آئیں قینچی سے کاٹ لیں۔ پھر کاپیوں پر ہاتھ صاف کیا۔ جگہ جگہ پنسل سے جواں بخت کی تصویریں بنائیں اور لکھ دیا۔ "جواں بخت کو سزا مل رہی ہے۔" "جواں بخت کان پکڑ کر اٹھ بیٹھ رہے ہیں۔" "جواں بخت کرکٹ میچ ہارنے کے بعد۔"

میں نہایت اطمینان سے تصویریں بنا رہی تھی کہ اتنے میں وہ کمرے میں داخل ہوئے۔ خدایا!!! خوف کے مارے میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ جواں بخت گھبرا کر میرے قریب آئے۔ میں آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ "جواں بخت! معاف کیجئے۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ "کیا معاف کر دوں؟ لیکن تم چیخ

کیوں پڑی تھیں؟"

اس کے بعد دیگرے میں نے تمام کاپیاں ان کے سامنے رکھ دیں۔ تصویریں تو ایسی ابھی نہ تھیں کہ دیکھنے سے سمجھ میں آ جائیں۔ لیکن نیچے لکھے ہوئے الفاظ تشریح کر رہے تھے۔ جواں بخت اپنے آپ کو ہر رنگ میں دیکھ کر بہت ہنسے۔ میں ڈر رہی تھی کہ دیکھئے کیا کہتے ہیں۔ لیکن انہوں نے پیار سے میرے سر پر ایک چپت رسید کی اور کہا "تم بے حد شریر ہو! اسکول میں بھی شرارتیں کرتی ہو اور گھر پر بھی باز نہیں آتیں"

ان کی خوش مزاجی دیکھ کر میرا ڈر جاتا رہا۔ میں نے جمع کی ہوئی تصویریں بھی ان کے آگے رکھ دیں۔

وہ میرے بالوں سے کھیلتے ہوئے بولے "اچھا! تم بہت کچھ کر چکی ہو! تم نے سارے رسالے خراب کر ڈالے۔ لیکن خیر نہیں پسند ہیں تو لے لو"

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ان کا شکریہ ادا کیا اور بے تکلفی سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ جواں بخت خاموش بیٹھے تھے۔ میں ان کے گلابی گلابی ہونٹوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔ دفعتہً انہوں نے گل دان سے بنفشہ کے دو نیلے نیلے پھول نکال کر میرے بالوں میں لگا دیئے۔

میں نے کہا "یہ کیا۔ گل دان میں اچھے خاصے رکھے تھے۔ اس میں سے کیوں نکال لئے؟"

کہنے لگے "تمہارے بالوں میں زیادہ اچھے معلوم ہوتے ہیں"

سورج نصف النہار سے گذر چکا تھا۔ روشن دان سے عجب کیف پرور کرنیں آ رہی تھیں۔ خوشگوار ہوا سے جواں بخت کے بال اڑ رہے تھے۔ وہ اس وقت نہایت غور سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ لیکن میں مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ ان کے بالوں کا تماشا دیکھ رہی تھی وہ بے حد خوب صورت معلوم ہو رہے تھے۔ اتنے میں والدہ نے مجھے پکارا اور میں کمرے سے بھاگ گئی۔

اس ملاقات کے بعد مجھے اتنا احساس اچھی طرح ہونے لگا تھا کہ مجھے جواں بخت کے ساتھ غیر معمولی دلچسپی ہے۔

(۳)

سردیوں کا موسم آہستہ آہستہ گذر گیا۔ خزاں اور بہار میں باہم جنگ ہو رہی تھی بعض درختوں میں کونپلیں پھوٹ آئی تھیں۔ بعض کے پتے زرد ہو کر گر رہے تھے۔ چڑیاں دھوپ کی تیزی کی وجہ سے اکثر سائے ہی میں بیٹھی پھرتیں۔ گلہریاں سوکھی پتیوں پر دوڑ دوڑ کر ایک لطیف کھڑکھڑاہٹ پیدا کر رہی تھیں۔

سات مارچ کو اسکول اور کالج کا سالانہ اجتماع (Social gathering) تھا۔ ہم لوگوں نے کئی دن پہلے سے تیاری شروع کر دی تھی۔ کلاس کو اچھی طرح سجایا۔ دو ایک لڑکوں نے نظمیں یاد کی تھیں پوری کلاس مل کر ایک ڈراما کرنے والی تھی۔ دوسری کلاسیں بھی تیاری کر رہی تھیں لیکن ایسے موقعوں پر چھوٹی کلاسیں زیادہ دلچسپی سے کام لیتی ہیں۔ ہم لوگ بہت محنت سے تیاری کر رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ بے چینی سے اس روز کا انتظار بھی تھا۔ اس مرتبہ تجویز ہوئی تھی کہ مختلف طلبا تمام استادوں کی نقل کریں۔ جواں بخت نے مجھ سے کہا "تم عربی کے مولوی صاحب کے وعظ کی نقل کرنا بڑا لطف رہے گا"

میں راضی ہو گئی۔ اب تو مجھے واقعی شوق پیدا ہو چلا تھا۔ مولوی صاحب کی نقل چیز تو اچھی ہو گی۔

کالج کے باغ کے ایک کونے میں جواں بخت مجھے وعظ کی مشق کراتے۔ تھوڑا سا استادی اور شاگردی کا حال بھی ملاحظہ ہو۔

جواں بخت۔ "کہو" بچو! میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ مذہب کی طرف سے بہت بے پروا ہوتے جا رہے ہو۔ بس دنیا ہی میں نیک نامی اور عزت حاصل کرنا چاہتے ہو"

اس کے جواب میں میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

جواں بخت۔ "دیکھو بی ہنسو نہیں"

میں نے شرماتے ہوئے آہستہ سے کہا "بچو! میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ مذہب کی طرف سے . . . "

جواں بخت۔ "ذرا آواز اونچی کرو"

"اونہہ آپ تو بیچ میں ٹوک دیتے ہیں۔ پورا جملہ بھی نہ کہنے دیا۔ ہم نہیں کہتے" یہ کہہ کر میں نے جواں بخت کی طرف سے پیٹھ موڑ لی اور قریب کی جھاڑی سے گلاب توڑ کر اس کی پنکھڑیاں گھاس پر بکھیر دیں۔

جواں بخت "پھولوں پر کیوں غصہ اتار رہی ہو۔ اچھا بی! پورا جملہ ختم ہونے کے بعد بتایا کروں گا"

میں ہنس کر جواں بخت کی طرف مڑ گئی اور پھر کہنا شروع کیا۔

اسی طرح روٹھ روٹھ کر مشق کرتی رہی۔ جس دن اچھی طرح کہہ لیتی تو مجھ سے زیادہ جواں بخت خوش ہوتے۔ کئی دن بعد مولوی صاحب کا

لہجہ اختیار کر لیا۔ مولوی صاحب کی ایسی آواز تو بنا نہ سکتی تھی۔

بہار کی خوشگوار رات تھی۔ جوہی اور بیلے کی بھینی بھینی خوشبو سے چاندنی کی ساری فضا معطر ہو رہی تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں ہلکے ہلکے بادل بھی تھے۔ مجھے نیند نہ آتی تھی۔ کیونکہ صبح سالانہ اجتماع کا روز تھا۔ خوشی، شوق اور بے تابی نیند اڑائے گئی تھی۔ میں کبھی وعظ کے جملے دہرانے لگتی اور کبھی مولوی صاحب کی شکل یاد کر کے خود ہی مسکرا دیتی۔ کم عمری میں ایسے موقعوں پر بڑی مشکل سے نیند آتی ہے۔ بس وہی حال میرا تھا۔ گیدڑ بڑی ڈراونی آواز سے چیخ رہے تھے۔ اس وجہ سے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ جاتا۔ صبح کے قریب آنکھ لگی۔

اسکول میں صبح سے بڑی چہل پہل تھی۔ دن بھر نہایت پرلطف پروگرام ہوتے رہے۔ شام کو میری باری آئی۔ میں کچھ مسکراتی، شرماتی اور جھجکتی ہوئی سٹیج پر جا پہنچی۔ پھر نہایت سنجیدہ منہ بنا کر کہنا شروع کیا۔

"بچو! میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ مذہب کی طرف سے بہت بے پرواہ ہوتے جا رہے ہو۔ بس دنیا ہی میں نیک نامی اور عزت حاصل کرنا چاہتے ہو۔ یہ دنیاوی عیش کسی کام نہ آئے گا۔ (زانو پر ہاتھ مار کے) یاد رکھو! ایک دن ہمیں تمہیں سب کو اس کے حضور میں جانا ہے اور اپنے اعمالوں کا جواب دینا ہے۔ ڈرو اس خدا سے کیونکہ وہ رحمٰن و رحیم ہے لیکن قہار بھی ہے (ذرا چیخ کر) وہ تم کو پل میں کیا سے کیا بنا سکتا ہے۔ کیا تم کو نوح کا طوفان یاد نہیں؟ اس کا حکم ہے کہ نماز پڑھا کرو۔ نماز پڑھنا کتنا آسان کام ہے لیکن اس کی فضیلت بڑی ہے۔ افسوس ہم میں سے بہت سے ایسے بھی ہیں جو ایک وقت کی نماز بھی پابندی سے نہیں پڑھتے۔ نماز پڑھنے سے چہرے پر نور اترتا ہے۔ اس کی زندہ مثال ہمارے مولوی صاحب ہیں۔"

(مولوی صاحب کی شکل نہایت بھونڈی تھی) لہٰذا اس جملے کے ساتھ ہال میں ایک مسلسل قہقہہ گونجا۔ بس اسی طرح کا ٹوٹا پھوٹا وعظ کہا۔ لیکن وعظ کے دوران میں ہنسنا تو کیا معنی مسکرائی تک نہیں۔ مجھے خود اپنی سنجیدگی پر تعجب ہو رہا تھا۔ وعظ ختم ہونے پر سارا ہال قہقہوں اور تالیوں سے گونج اٹھا۔ پرنسپل صاحب نے فرطِ مسرت سے گود میں اٹھا کر مجھے پیار کیا اور ایک کہانیوں کی کتاب دینے کا وعدہ کیا۔ میری اتنی ہمت تو نہ پڑی کہ دیکھتی کہ مولوی صاحب پر کیا گذری۔ لیکن جواں بخت نے بتایا۔ کہہ رہے تھے۔

"لڑکی کو گستاخ بنا دیا ہے۔ استغفر اللہ! قرآن شریف اور حدیث کی باتوں کا مضحکہ اڑایا جائے۔"

ہمارا اسکول دریا کے کنارے تھا۔ رات کو دریا میں متعدد ننھے ننھے چراغ بہائے گئے۔ عجیب پر رونق چراغاں تھا۔ ہم لوگ ٹولیاں بنا کر مختلف کشتیوں میں دریا کی سیر کرنے روانہ ہوئے۔ بڑا اچھا وقت تھا۔ کسی کی کشتی میں بانسری بجائی جا رہی تھی۔ کہیں صرف گانا ہو رہا تھا۔ ہماری کشتی میں ایک لڑکا ڈھولک پر گا رہا تھا۔ اسی کشتی میں جواں بخت بھی تھے۔ کشتی کے اور لوگ گانے کی طرف متوجہ تھے کہ جواں بخت نے مجھے اٹھا کر گود میں بٹھا لیا۔ اس رات کو میں بے حد مسرور تھی۔ وہ رات! اس رات کا کیف! دریا میں چراغوں کی روشنی! پھر نغموں سے مدہوش فضا آج تک یاد ہے۔ میرا سر خود بخود جواں بخت کے شانے پر جھک گیا۔ میرے اللہ!!! جواں بخت نے مجھ سے آہستہ سے کہا۔

"لڑکی جلدی سے بڑی ہو جاؤ اور محبت کرنا سیکھو۔"

میں نے بے معنی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا لیا۔

گھر واپس آ کر لباس تبدیل کیا اور سونے چلی گئی۔ دن بھر کی مصروفیات کی وجہ سے تکان تو بے حد تھی۔ لیکن پھر بھی نیند نہ آتی تھی۔ یا اللہ! یہ محبت کیا ہوتی ہے؟ محبت کرنا کیسے سیکھتے ہیں؟ اماں مجھے کتنا چاہتی ہیں۔ مجھ سے بے حد محبت کرتی ہیں۔ میں بھی اماں سے محبت کرتی ہوں تو کیا یہی محبت ہے؟ لیکن جواں بخت اماں تو نہیں جو ان کو چاہنے لگوں۔ پھر میں نے اماں کے لئے محبت سیکھی تو نہیں۔ وہ تو ہمیشہ ہمیشہ سے میرے دل میں ہے۔ نہیں نہیں توبہ ہے میں بھی کس قدر پاگل ہوں۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے "شیریں فرہاد" فلم دیکھا، وہ محبت تھی۔ فرہاد نے کتنے مشکل کام کئے تھے اور پھر خود ہی مر گیا تو کیا محبت میں مر جانا پڑتا ہے؟ توبہ! اتنی محنت کی اور پھر مر گئے۔ میں بھی محبت میں مر گئی تو اماں، ابا، اپنا گھر، یہ سب کہاں ملیں گے؟ شیریں قبر میں زندہ دفن ہو گئی تھی۔ کیا مجھے بھی ایسا ہی کرنا پڑے گا؟ مجھ سے تو کبھی نہ ہو گا۔ فرہاد نے پہاڑ کھودا تھا اور یہاں تو ایک کیاری کھودنے سے ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے ہیں۔ مجھ سے اچھا تو مالی ہی ہے۔ وہ دن میں کئی کیاریاں تیار کر لیتا ہے۔ اللہ! جب محبت اتنی مشکل چیز ہے تو میں کیسے سیکھ سکتی ہوں۔ بھلا اس میں بڑے ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ خدا جانے میں کب بڑی ہو جاؤں گی۔ کیا اس وقت مجھ سے اتنے مشکل کام ہو سکیں گے؟

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آنے لگے۔ گذری رات کی تکان تھی ہی۔ پلکیں بھاری ہوئیں۔ پھر آنکھ لگ گئی اور محبت کا معصوم فلسفہ ختم ہوا۔

(۴)

ایک دن میں دریا کے کنارے خربوزوں کی باڑی میں کھڑی کچے پکے خربوزے توڑ رہی تھی۔ باڑی کا مالک مجھے منع کر رہا تھا لیکن میں کب ماننے والی تھی۔ اتنے میں جواں بخت آ گئے۔

"اوہ!! اس چلچلاتی دھوپ میں تم یہاں ہو۔ تمہیں اس وقت یہاں آنے کی کس نے اجازت دی! لو بھی چل رہی ہے۔ فوراً گھر چلو۔"

ہم دونوں گھر کی طرف چل پڑے۔

"اور، جواں بخت! آپ خود اس دھوپ میں اتنی دور کیسے آ گئے؟"

"مجھے ایک ضروری کام تھا۔ اس طرف اپنے ایک دوست کے گھر گیا تھا۔ واپسی میں سوچا کہ کچے راستے سے چلا جاؤں۔ اتنے میں تم نظر آئیں"۔

"میں کیا کروں۔ دوپہر کو گھر میں سب سو جاتے ہیں۔ میرا دل گھبرانے لگتا ہے۔ اس لئے چلی آئی تھی"۔

"ایک بات پوچھوں؟ بتاؤ گی"۔

"کہئے!"

"تم میرے ساتھ شادی کرو گی؟"

مجھے ہنسی آ گئی لیکن میں نے اپنے سے بڑی لڑکیوں کو شادی کے نام سے شرماتے دیکھا تھا۔ مجھے تو ذرا بھی شرم نہ آئی۔ ہنسی ضرور آئی۔ میں نے منہ پر رومال رکھ لیا اور گردن نیچی کئے راستہ طے کرنے لگی۔ میں سوچ رہی تھی "شادی! سرخ سرخ کپڑے۔ عطر اور ابٹن میں بسی ہوئی دلہن۔ بارات کے باجے۔ دولہا کا جگمگ جگمگ سہرا۔ زرق برق کپڑے۔ باغ بہاری کا لٹنا۔ آتش بازی کی بہار۔ سسرال میں دلہن کی منہ دکھائی۔ دلہن ایسی دلچسپ چیز"۔ بس اس وقت میرے لئے شادی کا مفہوم صرف یہی باتیں تھیں۔

جواں بخت نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوے کہا "بولو!"

میں نے زمین کو گھورتے ہوئے "ہاں" کہہ دیا۔

تھوڑی دیر میں ہم لوگ گھر پہنچ گئے۔ لیموں کا شربت پیا اور ایک ٹھنڈے کمرے میں بیٹھ گئے۔ باہر خوب لو چلتی رہی۔ بگولے بھی اٹھ رہے تھے۔ ہم لوگ برقی پنکھا لگائے بڑے مزے سے باتیں کرتے رہے۔ شام کو جواں بخت اپنے گھر چلے گئے۔

(۵)

موسم گرما کی تعطیلات آ گئیں۔ زیادہ تر وقت بیکاری میں گذرنے لگا۔ پڑھائی کی معروفیتیں۔ اس کے بعد اتنی طول طویل فرصت۔ بڑی مشکل سے دن کٹتا تھا۔

ایک دن میں دریا پر نہا رہی تھی۔ جھٹپٹے سے تھوڑی دیر پہلے کا وقت تھا۔ آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ کچھ کرنیں دریا کے پانی کو سنہرا بنا رہی تھیں۔ کچھ دریا پار پہاڑوں پر پڑ رہی تھیں۔ آفتابی نور دریا کی ہنگامہ خیز موجوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ دن بھر کے تھکے ماندے پرندے سست رفتار سے اپنے آشیانوں کی طرف جا رہے تھے۔ دریائی چڑیاں مایوس آواز سے بول رہی تھیں۔ گائے بھینسیں جنگل سے شہر کی طرف واپس آ رہی تھیں اور میں اُتھلے پانی میں کھڑی ہوئی نہایت انہماک کے ساتھ ناچ رہی تھی۔ میرے سامنے دیہاتی عورتیں اور دھوبنیں بیٹھی تھیں میں کہہ رہی تھی۔

"دیکھو! ہم نے سینما میں ایک عورت دیکھی تھی وہ اس طرح تالاب میں ناچتی تھی"۔

دیہاتی عورتیں ہنس ہنس کر دیکھ رہی تھیں۔ جب میں ذرا تھک گئی تو سر اٹھا کر دیکھا۔ میرے اللہ!! میری روح نکل گئی۔ سر چکرا گیا۔ پگ ڈنڈی پر جواں بخت مع اپنے چند دوستوں کے مسکرا مسکرا کر میرا تماشا دیکھ رہے تھے۔ ڈوب مروں! جسم پر صرف تیرنے کا لباس تھا وہ بھی بھیگا ہوا۔ وہیں بیٹھ گئی۔ گردن جھکا لی۔ کپڑے اتنی دور تھے کہ زمین پر کافی چلنا ہوتا اور پانی سے نکلنے کے بعد میں ان لوگوں کے لئے ایک اور مضحکہ خیز سین پیش کرتی۔

اپنی کم سنی کے زمانے میں شاید اسی روز مجھے سب سے زیادہ اور حقیقی معنوں میں شرم کا احساس ہوا۔ یا یوں کہئے جی چاہتا تھا کہیں ڈوب مروں۔ جواں بخت مجھے یوں دیکھیں اور پھر وہ بھی ناچتے ہوئے۔

تھوڑی دیر میں ڈرتے ڈرتے نگاہ اٹھائی تو وہ لوگ جا چکے تھے میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ کپڑے پہن کر لڑکھڑاتی ہوئی چال سے گردن نیچی کئے گھر آئی۔ لیکن حیا سے عرق عرق ہوئی جاتی تھی۔ کچھ عجیب خفت تھی اللہ بچائے۔

اس دن سے میری ہمت نہ پڑی کہ جواں بخت کے گھر جاؤں۔

حالانکہ چھٹیوں کے دن تھے۔ جی بھی بہت چاہتا تھا۔ لیکن اس شام کا خیال آتے ہی قدم رک جاتے۔

(۶)

اکثر شام کے وقت میں ایک چمپا کے درخت کے پاس بیٹھ جاتی تھی۔ وہاں سے ساحل اور دریا اچھی طرح نظر آتے تھے۔ جواں بخت کا انتظار کرتی کہ شاید اس طرف سے کبھی گذریں۔ چند روز بعد میں نے سنا کہ وہ چھٹیاں گذارنے اپنے وطن جا رہے ہیں۔

اسی روز شام کو میں نے ساحل پر انہیں دیکھا۔ وہ میرے ہی گھر آ رہے تھے۔ بڑی ہمت کر کے میں خود ان کے پاس چلی گئی ملنے آئے تھے کہنے لگے۔

"چھٹیوں کے بعد فوراً ہی آؤں گا۔ تم مجھے یاد تو نہیں کرو گی؟"

"کیوں نہیں —— ضرور یاد کروں گی۔ آج کل چھٹیوں میں تو وقت بھی نہیں کٹتا"

کچھ مسکرا کر بولے "اچھا تو پھر میں جلد آنے کی کوشش کروں گا۔ تم انتظار کرنا خدا حافظ۔ مجھے اور جگہ بھی ملنے جانا ہے دوست انتظار کر رہے ہوں گے"

"خدا حافظ! ذرا جلد آئیے گا"

(۷)

ان واقعات کو سالہا سال گذر گئے۔ چمپا کا درخت اپنی جگہ بدستور کھڑا ہے میں روز شام کو جواں بخت کا انتظار کرتی ہوں۔ سورج دریا پر نور کی بارش کرتا ہوا غروب ہو جاتا ہے شفق کی دلفریب سرخی میں کبھی امید اور کبھی نا امیدی کی جھلک نظر آتی ہے۔ کسی کسی دن وہی سرخی ہوتی ہے جیسی جواں بخت کے جانے کے روز تھی۔ ایسے دن مجھے امید ہوتی ہے کہ شاید جواں بخت اب آتے ہوں۔ یہی رنگت ایک دن انہیں یہاں کھینچ لائی تھی۔

اونچے اونچے پہاڑ شاید میرے ناکام انتظار پر ہنسا کرتے ہیں۔ شام کی اداس سیاہی میں پرندے اپنے آشیانوں کا رُخ کرتے ہیں۔ سرد ملکوں کے پرندے ہر چھ ماہ بعد آتے ہیں۔ لیکن جواں بخت نہیں آتے۔ دریائی پرندے سیٹی بجا بجا کر مجھے اپنی مایوسی کا احساس دلاتے ہیں۔ دریا میں طغیانی آتی ہے ادھر میرے آنسو مسلسل بہنے لگتے ہیں۔ تاروں بھری راتیں اب بھی آتی ہیں۔ دنیا والے دریا کی سیر کا لطف اٹھاتے ہیں لیکن آہ! شاید میری دریا کی سیر اسی روز ختم ہو گئی تھی۔ جواں بخت! آ جاؤ! دیکھو اب میں کتنی بڑی ہو گئی ہوں۔ شاید اب مجھے محبت کرنا بھی آ گیا ہو۔

سلیمہ سلطانی بیگم لکھنوی

دعوتِ عمل

زندگی کیا ہے؟ نمودِ پیچ و تاب!

موت کیا شے ہے؟ جمودِ انقلاب!

سرِّ عیشِ جاودانِ پاستاں!

سوز و سازِ عشق و جرأت کا شباب!

روحِ محفل! بادہ و رقص و سرود!

ورنہ ہیں بے سود طاؤس و رباب!

"ہرچہ در خود داشتی! در باختی"

تجھ کو خوش آئی نہ افرنگی شراب!

دل کی غفلت، موت! بیداری، حیات!

اس کی جنبش، شورِ یم! سکنت، سراب!

"گوہرِ شہوار بر ساحل مجو!"

"تیشہ زن بر صدف و یم منزل بیاب!"

ابرار احمد فاروقی عرمی

رباعیات

(۱)

فطرت نہیں کوئی بات سننے کے لئے
ہے دل کی بات کہنے کے لئے
بے چین ہے دل نہ ہے حیراں
وہ حکم سخن لبوں کو آنے کے لئے
اب وقت نہیں خموش رہنے کے لئے

(۲)

ہر چیز کو بے نقاب دیکھا نہ گیا
یہ آفتاب دیکھا نہ گیا
ذرہ کوئی میں
کچھ سوچ کے منہ چھپا لیا پردے میں
آپ اپنا مگر جواب دیکھا نہ گیا

(۳)

محفل میں ملے گا وہ، نہ تنہائی میں
ہے نہ گل کی رعنائی میں
کہسار میں ہے نہ گہر میں
تو جس کی تلاش میں ہے شب وروز
آ، دیکھ! وہ میرے دل کی گہرائی میں

(۴)

بدبیں کے دل کو بد سے بدتر کر دے
بدخواہ کی زندگی کو دوبھر کر دے
ہے شقاوت پہ فخر
کرتے ہیں جو جبر
ان سنگدلوں کو اور پتھر کر دے

حرماں خیرآبادی

ایک راہبہ کے محبت نامے

(تعارف)

اس سے پیشتر کہ ہم ان خطوط کا مطالعہ شروع کریں، یہ جاننا ازبس ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاتون کون تھی جس کی طرف سے یہ خطوط لکھے گئے، اور ان کا مخاطب کون تھا؟

ان خطوط کی لکھنے والی پرتگال کی ایک راہبہ تھی جس کا نام **میری آنا الکافاریدو** تھا، اور ان کا مخاطب ایک فرانسیسی نوجوان **نوئل باوٹن ڈی شامیلی** تھا جو بعد میں مارکوئس آف شامیلی کے نام سے مشہور ہوا

خطوط کی اصل زبان جس میں یہ لکھے گئے، پرتگالی ہے۔ انگریزی زبان میں ترجمہ ہوکر یہ خطوط اس قدر ہردلعزیز ہوئے اور پسند کئے گئے، کہ تقریباً بیس مرتبہ کتابی صورت میں اشاعت پذیر ہوئے

ایک فاضل نقاد لکھتا ہے "اسپین اور پرتگال کی باہمی [illegible] درجنگ و جدل سے جو بہترین اور بیش بہا خزانہ دنیا کے ہاتھ لگے ہیں، وہ ایک پرتگالی راہبہ کے محبت نامے" ہیں!!

اس سے پہلے کہ ان خطوط پر تنقیدی نگاہ ڈالی جائے، ہمارا شوق ہمیں یہ جاننے کے لئے مجبور کرتا ہے، کہ محبت کا وہ رومانی ڈراما کیسے شروع ہوا، جس کی وجہ سے یہ غیر فانی محبت نامے وجود میں آئے!! ۱۶۶۱ء میں نوئل باوٹن ڈی شامیلی جو سینٹ لیگر کا کاونٹ بھی تھا۔ شاہِ فرانس کے اشارے سے فرانسیسی فوجوں کا سپہ سالار بن کر پرتگال کی سرحد پہ آکر ٹھیرا۔ یہ نوجوان سپہ سالار اس وقت عین عنفوانِ شباب میں تھا، اور میری آنا اس وقت بیجا در پرتگال کا ایک چھوٹا سا قصبہ کے ایک معبد میں راہبہ کی حیثیت سے اپنی خاموش اور پرسکون زندگی گزار رہی تھی، کہ ناگاہ اس نوجوان کپتان نے اپنی مداخلت سے بہ یک جنبشِ نظر معصوم راہبہ کی زندگی کے مطمئن خوابوں کو درہم برہم کر دیا!! وہ تقریباً ہر روز معبد کے گرد آکر طواف کرتا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ اس نے اس راہبہ کو اپنے دامِ محبت میں پھنسا کر ہی دم لیا، جسے بعد میں وہ تنہا آتشِ عشق کے ساتھ کھیلنے کے لئے اور اپنے ہجر میں تا عمر سسکیاں بھرنے کے لئے چھوڑ کر اپنے وطن یعنی فرانس چلا گیا!!

فرانس جا کر اس رنگیلے نوجوان نے پھر بدنصیب **میری آنا** کی طرف رُخ تک بھی نہ کیا، یہاں تک کہ اُسے بالکل فراموش کر دیا!! لیکن مظلوم میری آنا نے اپنے اس بے وفا عاشق کو جسے عاشق کہنا سراسر محبت کا خون کرنا ہے۔ مرتے دم تک اپنے دل سے نہ بھلایا، اور اس اولین محبت کو فطرت کا ایک غیر فانی عطیہ تصور کرتی رہی!!

اُس نے ایک معمولی دنیا دار انسان کی طرح نہیں بلکہ اپنا مذہب اپنا ایمان جان کر اپنے بند ہ محبت کی پرستش کی!!

وہ محبت کو اپنی زندگی کی حقیقی مسرت خیال کر کے اپنے مایوس اور تلخ مستقبل کو بھلاتی رہی!!

اُس نے کبھی اس گمان کو اپنے دل میں جگہ نہ دی کہ محبت ناشکر گذار، بےرحم اور بے مروت بھی ہوتی ہے!! اُس نے اپنے عاشق کی سخت سے سخت لغزشوں کو بھی بھول جانے کی کوشش کی اور ساری عمر اسی خام امید میں جیتی رہی ؎

باشد کہ باز بینم آں یار آشنا را!!

اس کا ذکر کرنا بھی ہمارے لئے نہایت ضروری ہے کہ اُس مظلوم و بدنصیب راہبہ کی سچی اور پاکیزہ محبت کا ذرا سا احساس بھی کئے بغیر اس کے بے وفا عاشق نے فرانس کے ایک معزز اور متمول گھرانے کی لڑکی سے شادی بھی کر لی!! یہ کوئی نئی بات نہیں، ایسا اکثر ہوتا رہتا ہے دنیا میں اس نوع کے قصوں کا فقدان نہیں! ــــ آہ، سچی محبت کے لئے دنیا روتی بھی ہے، ــــ اور ساتھ ہی ساتھ اُس کا مذاق بھی کس خوبصورتی سے اڑاتی ہے!!!

کیا دنیا کی کوئی عورت جسے غریب **میری آنا** کی محبت کا تلخ انجام

معلوم ہو۔ اپنی جنس کے جذبۂ حمایت سے متاثر ہو کر مارکوئس ڈی شاملی کے اس قصور کو کبھی معاف کر سکتی ہے؟

. . . .

ان محبت ناموں کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک محبت کی راندی ہوئی خاتون کی لطیف نگارش کے مرہونِ منت ہیں، اور ایک یاس خوردہ اور دل شکستہ روح کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں!!

ان محبت ناموں کا کوئی جملہ ایسا نہیں جس میں درد و الم کی چنگاریاں ملفوف نہ ہوں اور جملے کا کوئی لفظ ایسا نہیں جو ایک رقت انگیز خلش اپنے اندر نہ لئے ہوئے ہو!! ہر اک محبت نامے سے گداز محبت کے انگارے اُبل رہے ہیں!! (ان محبت ناموں کی تعداد پانچ ہے)

سب سے آخری محبت نامہ اس مظلوم راہبہ کی بدنصیب محبت کا فیصلہ ہے مگر ناکام!! اور اس بے رحمانہ صلے کا نتیجہ ہے جو اُسے اپنے بے وفا اور سفاک عاشق سے اپنی پرخلوص محبت کے عوض میں ملا۔

مترجم

پہلا خط!!

آہ، اے مظلوم میری آنا تو کتنی نادان رہی کہ اپنی محبت کی اصلیت کو بھی نہ جان سکی اور آہ، اے بدقسمت انسان! تو نے خود بھی فریب کھایا اور مجھے بھی جھوٹی امیدوں کی دنیا سونپ دی۔

محبت کا وہ اولین معصوم جذبہ جو ہم دونوں کی مسرتوں کا ایک رنگین خواب تھا، اب اس میں ایک ابدی محرومی کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ جدائی کے بے رحم لمحوں نے محبت کی دوامی بہار لوٹ لی۔

آہ! کیا یہ جدائی جس نے میری محبت کی دنیا کو پُریاس بنا دیا۔ اب مجھے تم سے کبھی نہ ملنے دے گی۔ کیا میں ان آنکھوں کا نظارہ اب نہ کر سکوں گی۔ جن کی حسین شعاعیں میری محبت کی آفرینش کا خلاق بنیں اور جن کی کیف آور مستیوں نے میری روح کو قرار و سکون کے ساتھ ہمکنار کیا۔

افسوس اُس دل میں جس سے کبھی میں تمہاری پرستش کیا کرتی تھی۔ اب سوائے ناامیدیوں اور حسرتوں کے کچھ نہ رہا۔ یہ معلوم کر کے کہ تم نے اب مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا رہنے کی قسم کھالی ہے، مجھ پر غم و اندوہ کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے اور میرے حواس کھوئے گئے ہیں۔ آہ تمہاری جدائی کا صدمہ میں زندہ رہ کر کیونکر برداشت کر سکوں گی!!

تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میری آرزوؤں کو خاک میں ملانے والے صرف تم ہی ہو۔ میں نے پہلی بار دیکھتے ہی تمہیں اپنا سب کچھ دے دیا۔ اب بھی میں اپنی زندگی کی تمام تر رنگینیاں تم پر نثار کرنے کے لئے تیار ہوں۔ میں دن بھر تمہاری محبت کے خواب دیکھتی رہتی ہوں، اور روتی رہتی ہوں۔ میرے غمزدہ دل کی خاموش آہیں تمہیں تلاش کرنے جاتی ہیں۔ مگر تمہاری جانب سے ناکام ہو کر لوٹ آتی ہیں۔ میری سیہ بختی کی دلیل اس سے زیادہ اور مایوس کن کیا ہو سکتی ہے کہ اپنے مظلوم و ستم رسیدہ دل کو خود ہی سمجھاتی ہوں۔

بدنصیب میری آنا! آنسو نہ بہا، آہیں نہ بھر، ناحق اپنے دل کو غم سے پاش پاش نہ کر۔ تو جس محبوب کی جستجو میں پریشان ہو رہی ہے۔ وہ تجھے اب کبھی حاصل نہ ہو سکے گا۔ وہ تجھ سے جدا ہو کر سمندر کی انتہا سے بھی پرے چلا گیا ہے۔ وہ فرانس کی بزم طرب میں مصروف عیش و نشاط ہے وہ تیرے خلوص تیری محبت اور تیرے غموں سے بالکل بے پروا ہے۔ وہ تیری آہ و زاری کو بھولا ہوا ہے اُس کا دل تیرے معصومانہ اعتراف محبت سے ہرگز ہرگز گداز نہ ہو سکے گا!!

مگر نہیں، میں تمہاری محبت کو اس قدر سنگدلی سے مجرم قرار نہیں دے سکتی۔ میں نے تم سے بے انصافی کی۔ تم بے قصور ہو، بے گناہ ہو، میں یہ کیسے مان لوں کہ تم نے مجھے بھلا دیا ہے۔ یہ صرف میرے دل کے شکوک ہیں اور اُن کی فریب کاریاں جن کی وجہ سے میں ناامید ہو رہی ہوں۔ آہ، میں اُن تکلیفوں اور کاوشوں کو جو تم نے میری محبت کو آسان بنانے میں برداشت کیں کیسے بھلا سکتی ہوں۔

تمہاری محبت کی سرگرمیوں اور خلوص نے ہی مجھے تمہارا شیدا بنایا تھا، یقیناً یہ ناشکرگزاری ہو گی۔ اگر میں بھی تمہیں ان ہی صمیم جذبوں کے ساتھ نہ چاہوں جن سے تم نے میرے ساتھ محبت کی۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایسے مسحور کن لمحوں کی یادگار اس قدر تلخ ہو؟ مگر گزشتہ لطف و نشاط کی ساعتیں مجھے جس دم یاد آتی ہیں میں بے قرار ہو جاتی ہوں۔

یقین جانو۔ کہ تمہارے پچھلے محبت نامے کو پڑھ کر جو صدمہ میرے

دل کو ہوا اور میرے ذہن کے ساتھ جو گزری وہ حالت نہایت روح فرسا اور ناقابل بیان ہے! جی چاہتا تھا کہ میں اپنے دل کی اسی خستگی اور پائمالی کے ہمراہ تمہاری تلاش میں نکل پڑوں۔ مجھ پر یاس و ناامیدی کے مجروح کن جذبات نے اتنا غلبہ ڈالا کہ میں قریباً تین گھنٹے تک بالکل بے ہوش پڑی رہی۔ کاش! میں اُس بے ہوشی اور بے حالی کی حالت میں ہی مر جاتی! اور اپنی اُس زندگی کی جسے ہر وقت تمہارے قدموں میں نچھاور کرنا چاہتی ہوں تمام خوشیوں کو تمہاری محبت کے غم میں کھو ڈالتی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب مجھے ہوش آیا میں نے اپنے دل کو اس خیال سے تسلّی دی کہ میں تمہاری محبت میں جان توڑ رہی تھی اور ساتھ ہی یہ جان کر مسرور بھی ہوئی کہ اب میرا دل تمہاری مفارقت کے غم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہا ہو جائے گا!!

بیداری الفت کے ابتدائی لمحات سے لے کر اب تک میں تمہاری جدائی کی تلخیوں میں تڑپ رہی ہوں اور جب تک تم مجھے نظر نہ آؤ گے یوں ہی تڑپتی رہوں۔

تمہاری فرقت کے غم میرے لئے مسرت کے پیغام ہیں کیونکہ وہ میری پُریاس و حرماں خلوت میں تمہاری طرف سے دل خوش کن نغمے لاتے ہیں جن کی رنگینیوں میں میرا دل محبت کے سنہری خواب دیکھتا ہے!

آہ کیا میری پر خلوص محبت کا انعام یہی ہے کہ میں تمہارے ہجر کے غموں سے ہی اپنے آپ کو خوش کرتی رہوں! مجھے تم سے کسی قسم کا صِلہ نہیں چاہیئے کیونکہ میں نے اب عہد کر لیا ہے کہ میں دنیا میں تمہارے سوا اور کسی سے محبت نہ کروں گی! میں صرف تم کو ہی اپنی آرزوؤں کا مرکز بنانا چاہتی ہوں اور اپنی یہ ناکام زندگی تمہارے ہی لئے وقف کر چکی ہوں!!

کاش میں بھی یہ امید کر سکتی کہ تم بھی میرے سوا اور کسی کو پیار نہ کرو گے۔ کسی اور کو نہ چاہو گے اگر میں پوچھتی ہوں۔ کیا تم میری محبت میں اتنے سرگرم اور ثابت قدم ہو جتنی کہ میں ہوں۔ تمہیں یقیناً دنیا میں مجھ سے جسے تم کئی بار اپنی زبان سے خوب صورت کہہ چکے ہو زیادہ حسین و جمیل صورتیں مل جائیں گی۔ مگر محبت سے خالی۔ . . اور ظاہر ہے کہ محبت کے بغیر حسن کی لطافتیں یکسر بے رنگ و بے کیف ہیں!

خطوں میں اس قسم کی باتیں لکھ کر کہ میں تمہیں یاد کیا کروں۔ میرا دل نہ دکھاؤ۔ کیونکہ میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکتی۔ تم نے مجھے یہ امید دلائی ہے کہ تم مجھ سے ملنے کے لئے آؤ گے اور کچھ عرصہ میرے پاس رہو گے بھی کیا میں اس کا یقین کروں!!! میرے دل کی آرزو ہے کہ تم اپنی ساری کی ساری زندگی میرے پاس گزار دو۔ آہ اگر یہ ممکن ہو سکے کہ میں اس کمبخت معبد کو چھوڑ سکوں تو میں سرزمین پرتگال میں بیٹھ کر تمہارے عہد و پیمان کی تکمیل کی کبھی بھی منتظر نہ رہوں۔ اپنے انجام سے بے خبر ہو کر میں تمہاری جستجو میں چل پڑوں تم چاہے کہیں بھی ہو میں تمہارا تعاقب کرتی رہوں اور تمہیں محبت کرتی جاؤں! مگر آہ، یہ تو سب دل کے بہلانے کی باتیں ہیں۔ ایسا کیوں ہونے لگا میری امیدیں کبھی بار آور نہ ہوں گی مجھے فطرت نے صرف غم جھیلنے کے لئے ہی پیدا کیا ہے خوشیوں کے لئے نہیں اتنا غنیمت ہے کہ میرے بھائی کی وساطت سے مجھے یہ موقع ملا کہ میں تمہاری طرف کچھ لکھ کر بھیج سکوں۔ اس خیال نے میرے غم کے بار کو کچھ نہ کچھ ہلکا کر دیا اور عارضی طور پر کچھ لمحوں کے لئے میں اپنے غم کو بھولی بھی رہی!

میں تمہیں قسم دلا کر پوچھتی ہوں کہ جب تم جانتے تھے کہ میرا ساتھ نہ نبھا سکو گے تو تم نے مجھے اس قدر رجھانے اور اتنا لبھانے کی کوششیں کیوں کیں۔ اور مجھے اتنی بے رحمی سے تباہ و برباد کیوں کیا۔ تم نے میرا رہا سہا سکون مجھ سے کیوں چھینا۔ میری روح کا اطمینان کیوں لوٹا؟ کیا میں نے کبھی تمہیں کوئی تکلیف دی تھی!!؟

مگر آہ، مجھے معاف کرو۔ میں تمہیں کوئی الزام دینا نہیں چاہتی میں نے تم سے انتقام نہیں لینا۔ میں اس معاملے میں صرف اپنی روسیاہ قسمت کو ہی سزاوار ٹھیراتی ہوں اس ظلم پیشہ ساحرہ نے ہی ہمیں ایک دوسرے سے جدا کیا۔ اس نے ہماری مسرتوں کو تاراج کیا۔ اس نے ہماری محبت کو مجروح اور پائمال کیا!!

خیر قسمت خواہ کیسی ہی سخت گیری سے ہم پر مظالم ڈھائے۔ ہمارے دل کبھی جدا نہیں ہو سکتے۔ محبت نے جو ہر طرح قسمت سے زیادہ پائیدار ہے۔ ہمارے دلوں کو زندگی بھر کے لئے ایک کر دیا ہے۔

اگر تمہیں بھی مجھ سے کچھ محبت ہے تو مجھے خط کے ذریعے ہی کبھی کبھی یاد کر لیا کرو۔ کیا مجھے یہ حق حاصل نہیں کہ میں بھی تم سے تمہارے دل کا حال پوچھا اور کم از کم تمہارے ماحول کی سرگرمیوں سے ہی آگاہ ہوتی رہوں!

اچھا اب ان باتوں کو چھوڑ دو اور سب سے پہلے مجھے بتاؤ کہ تم مجھے ملنے کے لئے کب آ رہے ہو؟ جی نہیں چاہتا کہ اس کاغذ کے پرزے کو ہاتھوں سے چھوڑوں۔ اس لئے کہ اس نے تمہارے ہاتھوں کو چھونا ہے۔ کاش مجھے بھی ایسی خوش قسمتی حاصل ہوتی!

دیکھا! اتنی احمق ہوں میں! جب کہ مجھے اس کا خوب علم ہے کہ میرے ایسے نصیب کہاں! الوداع . . . اب مجھ سے کچھ نہیں لکھا جاتا۔ سوائے اس کے کہ تم مجھے اپنی نہ بھولنے والی محبت سے ہمیشہ چاہتے رہو! اور میرے مظلوم دل کی خلش کو بڑھاتے رہو!!!

عظیم قریشی

اعتماد

مضحکہ خیز نظر آتی ہے یہ بات مجھے
کر رہے ہیں ہدفِ یورشِ آفات مجھے

کیا جوانی کی روایات سے آگاہ نہیں
یہ ستمگر مگر اس بات سے آگاہ نہیں

کہ بلند عرش سے جرأت کا عَلَم رکھتے ہیں
سینۂ مہر پہ ہم لوگ قدم رکھتے ہیں!

اس پہ حیراں ہوں کہ ہے برق کوئی ایسی بھی
جس کی فطرت میں ہو شوریدہ سری ایسی بھی

کہ مری راہ میں ڈٹ جائے جگرداری سے
موت سے آکے لپٹ جائے جگرداری سے

کوئی بپھرا ہوا طوفان ہے ایسا بھی مگر
جس کا دم توڑ کے رکھ دے نہ مرے غیض کا ڈر

کارواں مست جوانی کا جدھر جاتا ہے
زلزلے ڈال کے ہر سمت گزر جاتا ہے

یہ چٹانوں کو الٹتے ہوئے دریا کیا ہیں
آندھیاں کیا ہیں، دہکتے ہوئے صحرا کیا ہیں

جس کو چھو جائے تنفّس بھی، وہ مر جاتا ہے
موت کے دیو کا چہرہ بھی اتر جاتا ہے

گردشِ شام و سحر حکم پہ سر دھنتی ہے
بات جو کہتے ہیں فطرت اُسے خود سنتی ہے

اہرمن سجدۂ تعظیم بجا لاتا ہے!
ہم جہاں جاتے ہیں ہمراہ خدا جاتا ہے

عدمؔ

دنیائے ادب

شہر قدیم پومپیائی

دنیا میں بعض ایسے نفائس موجود ہیں کہ ان کا تعلق کسی خاص قطعہ یا ملک سے نہیں ہے۔ بلکہ حقیقتاً وہ تمام اہل دنیا سے تعلق رکھتے ہیں اور جس شخص کو کچھ بھی علم یا آرٹ سے مس ہو، وہ ان کے خراب یا معدوم ہونے سے افسوس ظاہر کرتا ہے اور ان کے دیکھنے یا کم از کم ان کا حال نہایت شرح و بسط کے ساتھ سننے سے خوشی محسوس کرتا ہے۔ آج ہم ناظرین کو اٹلی کے ایک قدیم تاریخی شہر کی سیر کرائیں گے۔ اس شہر کا نام پومپیائی ہے، جو تقریباً سترہ سو برس خاک کے نیچے دبا رہا ہے۔ اس کے تمام ظاہری آثار مٹ گئے تھے کہ اتفاق سے زمین کے نیچے سے اس کے چند نشانات ظاہر ہوئے اور اس طرح دنیا کو اس شہر کا حال معلوم ہوا۔

پومپیائی ولادت مسیح کے اوائل میں ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر تھا اور اٹلی کے مغربی ساحل پر کوہ ویسیو ویس کے جنوبی دامن میں مشہور شہر ناپل سے چار پانچ میل مشرق کی جانب واقع تھا۔ سلطنت روما کے اشراف و امیان گرمی کا موسم اسی مقام پر گزارتے تھے۔ اس شہر کی آبادی بیس ہزار نفوس تھی۔ لوگ آسائش کی زندگی بسر کرتے تھے اور اس حقیقت سے بالکل بے خبر تھے کہ اس پرنشاط وادی کے نیچے شرربار آگ شعلہ زن ہے اور کسی دن سخت پتھروں کو پھاڑ کر آتش باری شروع کر دے گی۔ جدید کشفیات علمی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوہ ویسیو ویس نہایت قدیم زمانے میں آتش فشاں رہا ہے۔ لیکن اُس زمانے میں جس کا ذکر ہم کر رہے ہیں نہایت سرسبز اور دلکش پہاڑ تھا۔ اس کے جاں بخش اور روح افزا مناظر دور دور سے لوگوں کو کھینچ لاتے تھے۔ لیکن آتش فشانی کے کوئی آثار بھی نظر نہیں آتے تھے۔ چنانچہ جغرافیائے عمومی میں لکھا ہے کہ اس پہاڑ کے سرسبز دامن میں مغربی جانب ایک دریا بہتا تھا پہاڑ کی چوٹی تک تمام زمین مزروعہ تھی اور کسی شخص کو بھی یہ گمان نہ ہوسکتا تھا کہ اس سرسبز اور پھولوں سے پُر سرزمین کے شکم میں آگ خوابیدہ ہے۔

۲۴ اگست ۷۹ء کی رات کو اچانک پہاڑ آتش فشاں ہوا۔ کوہ آتش فشاں جس کو یورپین زبانوں میں والکان[1] کہتے ہیں کی شکل ایک مخروطی مینار کی مانند ہوتی ہے۔ اس کی چوٹی سے ہمیشہ دھواں اور بخارات خارج ہوتے رہتے ہیں اور کبھی اس طرح ہیجان میں آتا ہے کہ ابلتا ہوا پانی، پتھر اور دوسرے پگھلے ہوئے مادے نہایت شدت سے اس میں سے نکلتے ہیں اور بعض اس قسم کے پہاڑ ہیں کہ ہمیشہ حالت ہیجان میں رہتے ہیں۔ قدیم زمانے میں بہت سے پہاڑ آتش فشاں تھے۔ جو اب خاموش اور جامد ہوگئے ہیں۔ ان میں سے دکن کی سطح مرتفع بھی ہے۔ جو گزشتہ زمانے میں آتش فشاں تھی اور اب بالکل خاموش ہے۔ اس وقت بھی روئے زمین پر تقریباً ۱۲۲۰ آتش فشاں پہاڑ موجود ہیں۔ ان میں سے ۲۷۰ زیادہ اہم ہیں۔ ۴۰۰ سے بھی زیادہ ہیں کہ اس وقت خاموش ہوگئے ہیں۔ آتش فشاں پہاڑوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ ہیجان میں آنے سے پہلے ان سے بعض علامات ظاہر ہوتی ہیں اور دوسری یہ کہ بغیر کسی قسم کی علامات بیشیں کے ناگہانی طور پر آتش فشانی شروع کر دیتے ہیں جو علامات قسم اول میں ظاہر ہوتی ہیں۔ زیادہ تر بادل کی گرج کی مانند آوازیں ہوتی ہیں، جو اندرون زمین سے سنی جاتی ہیں یا قرب و جوار کی زمین میں زلزلہ آتا ہے اور ہوا اتنی ساکن ہو جاتی ہے کہ سانس لینا بھی دشوار ہوتا ہے۔ چشمے خشک ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد اس قدر شدید آواز اور تیزی سے آتش فشانی شروع ہوتی ہے جیسے یک دم کئی توپیں داغی جائیں۔ اس وقت اس کے دہانے سے

[1] والکان لفظ ولکانوس سے جو آتش و فلزات کے دیوتا کا نام ہے ماخوذ ہے اور قدیم یونانی یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اس دیوتا نے اپنی دھونکنی اور بھٹی کو اس پہاڑ کے نیچے رکھا ہوا ہے اور اسے دھونکتا ہے جس کی وجہ سے یہ آتش فشانی ہوتی ہے۔

بخارات اور غلیظ و کثیف دھواں باہر نکلتا ہے۔ بجلی کڑکتی ہے اور زمین کا
مواد لاوے کی صورت میں بڑے بڑے پتھروں کے ساتھ باہر گرتا ہے۔
آخر کار مواد ذائبہ پگھلے ہوئے لوہے کی مانند ہوا میں ایک فوارے کی شکل
میں اچھلتا ہے اور زمین پر بہہ نکلتا ہے۔ اس ہیجان کے کچھ عرصہ بعد پہاڑ
میں سکون ہو جاتا ہے لیکن پھر جلد ہی اسی طرح پہاڑ کے دہانے سے
دھواں اور بخارات بلند ہوتے ہیں اور دوسرے ہیجان تک بلند ہوتے
رہتے ہیں۔ آتش فشاں پہاڑوں کی قوت اور مادے کی مقدار جو ان کے
دہانے سے خارج ہوتا ہے اس قدر ہے کہ ایک جاہل شخص کو ان کے تسلیم
کرنے میں تامل ہوگا۔ چنانچہ جزیرہ آتی میں جو پہاڑ اٹھتا ہے وہ جب ہیجان
میں آیا تو ایک ہی آتش فشانی میں اس نے قریباً تین ہزار مکعب میٹر مواد
آتشین باہر نکال پھینکا اور اسی کوہ ویسیو ویس سے جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں
ایک موقع پر اتنا لاوا نکلا کہ جب وہ منجمد ہو گیا تو اس کا حجم تقریباً دس ہزار
مکعب میٹر تھا اور یہاں تک کہ ایک دوسرے ہیجان میں مادہ ۱۴ ہزار مکعب
میٹر تک پہنچ گیا اور اسی طرح جزیرۂ آئیسلانڈ میں ایک پہاڑ سے ۱۷۸۳ء میں
لاوے کے دو بڑے بڑے آتشیں دریا جاری ہوئے۔ ان میں سے ایک کا طول
سات کوس اور عرض دو کوس اور دوسرے کا طول بارہ کوس اور عرض
چار کوس تھا۔ ان کی گہرائی بیابانوں میں تین گز اور دروں میں قریباً بیس گز
تھی اور کبھی کبھی بڑی بڑی چٹانیں اور پتھر کہ ان میں سے ایک ایک کا وزن
بیس بیس من تھا، دو تین میل کے فاصلے پر پڑے ملے۔ یہاں تک دیکھا
گیا ہے کہ کوہ ویسیو ویس نے بڑے بڑے پتھروں کو ہوا میں ۱۲۰۰ گز کی بلندی
تک پھینکا ہے۔

شہر پومپیائی جس کا ہم ذکر کر رہے تھے جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے۔ میلاد
مسیح کے اوائل میں بہت عمدہ اور صاف شہر تھا۔ ہر طرف سے روم کے اعیان و
اشراف تفریح اور عیش و مسرت کے لئے یہاں آتے تھے۔ چنانچہ تاریخوں
میں لکھا ہے کہ ۵۹ء میں یعنی اس شہر کے برباد ہونے سے بیس سال پہلے اس
کے ایک تماشہ خانہ میں شہریوں اور ان تماشائیوں میں جو کہ اطراف شہر سے
تماشہ دیکھنے کے لئے آتے تھے ایک جھگڑا پیدا ہو گیا۔ طرفین کے بہت سے
آدمی مجروح ہوئے اور مارے گئے۔ حکومت روم نے اہل شہر کی تنبیہہ
کے لئے حکم دے دیا کہ شہر مذکور میں دس سال تک کوئی کھیل یا تماشہ نہ دکھایا
جائے۔ آج جبکہ شہر کے کھنڈرات خاک اور خاکستر کے نیچے سے کھود دے
گئے ہیں تو ایک مکان کی دیوار پر اس جھگڑے اور پکڑ دھکڑ کی تصویر منقوش ملی

جو نہایت صاف دکھائی دیتی ہے۔

۶۳ء میں اس شہر میں ایک سخت زلزلہ آیا جس سے بہت سی عمارات
اور مکانات منہدم ہو گئے اور لوگ اس ناگہانی قہر خدا سے اس قدر خوفزدہ
اور سراسیمہ ہوئے کہ روم کی مجلس اعیان (سنا) نے مکانات کی دوبارہ تعمیر
و ترمیم روک دی۔ لیکن شہر والوں نے آہستہ آہستہ اجازت حاصل کر لی اور
جیسا کہ موجودہ کھنڈرات سے نتیجہ نکالا جاتا ہے۔ انہوں نے ویران
شدہ عمارات کو تعمیر کرنے کا کام ابھی شروع کیا ہی تھا کہ ناگہاں ۲۴ اگست
۷۹ء کی رات کو کوہ ویسیو ویس نے آتش فشانی کا آغاز کیا اور پومپیائی
کو دو اور قریب کے شہروں کے ساتھ جن کا نام ہرکولانوم اور استابی
تھا نہایت قلیل مدت میں مکمل طور پر منہدم اور ویران کر دیا اور مٹی، راکھ
اور مادے کے بلند طبقات کے نیچے پنہاں کر دیا۔

اس وحشت ناک واقعے کی تفصیل یوں ہے کہ مذکورہ رات کو پہاڑ
کی چوٹی سے دھواں نکلنا شروع ہوا کبھی روشنی ہو جاتی تھی اور کبھی تاریکی
خاک اور پگھلا ہوا مادہ اس سے بلند ہوتا تھا اور ریت اور بڑے بڑے
پتھروں کی بارش برستی تھی جس نے شہر کو ایک گز کی گہرائی تک ڈھانپ
لیا۔ بہت سے اہالیان شہر اسی ہنگامے میں ہلاک ہو گئے اور بعض جو بھاگ
نکلے انہیں موت نے راستے میں ہی جا لیا بعض ایسے جسم خاک کے نیچے
سے برآمد ہوئے ہیں جو اسی بھاگنے کی حالت میں ہاتھ میں نقدی کی تھیلیاں
لئے صدیوں مٹی کے نیچے دبے رہے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اسی
حالت فرار میں پنجۂ اجل میں گرفتار ہو گئے۔ غرضیکہ اس قدر پگھلا
ہوا مادہ، مٹی، راکھ اور ابلتا ہوا پانی شہر پر گرا کہ ان کے طبقات کی گہرائی
سات گز تک پہنچ گئی اور شہر مکمل طور پر اس میں چھپ گیا اور روئے
زمین سے ایک عرصے کے لئے مفقود ہو گیا۔ ہرکولانوم میں بھی اس
مادے کی گہرائی تین گز سے زیادہ تھی۔

کوہ ویسیو ویس کی آتش فشانی کی تفصیل پلینیوس خورد مشہور رومی
ناثر نے اپنے دو خطوط میں جو اس نے اسی زمانے میں اپنے دوست
اور مشہور رومی مورخ تاسیت کو لکھے تھے خوب وضاحت سے قلمبند
کی ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ باوجودیکہ اس کا چچا پلینیوس قدیم
اس موقع پر شہر ناپل کے نزدیک ایک بندرگاہ میں ایک جہاز کے امیر البحر کی
حیثیت سے ٹھہرا ہوا تھا اور ان تینوں شہروں میں سے وہ استابی شہر
کے باشندوں کو بچانے کے لئے نہایت سرعت سے وہاں گیا تھا اور

اسی کوشش میں گندے بخارات کے اثر سے خود بھی مسموم ہوگیا تھا۔
جب وہ کوہ ویسیوویس کی آتش فشانی کا ذکر کرتا ہے تو پومپیائی، ہرکولانوم اور استابی کے متعلق ایک کلمہ بھی نہیں لکھتا لیکن ایک دوسرے یونانی مورخ نے جس کا نام دیون کاسیوس تھا۔ اپنی مشہور تاریخ روم میں ان شہروں کی بربادی کا حال بھی لکھا ہے۔ یہ مورخ تیسری صدی عیسوی کے آغاز میں ہوا ہے۔ اس کی تفصیلات بہت دلچسپ ہیں۔

اس واقعے کے پندرہ سو برس گزر جانے کے بعد جب یہ ہولناک سانحہ لوگوں کے دلوں سے مکمل طور پر فراموش ہو چکا تھا۔ دسویں صدی ہجری کے اوائل میں اتفاقاً ایک مکان کی بنیاد کھودتے ہوئے دو کتبے برآمد ہوئے۔ لیکن یہ کتبے لوگوں کی توجہ اچھی طرح اپنی طرف منعطف نہ کرا سکے اور کسی نے انہیں کوئی وقعت نہ دی۔ ۱۱۶۰ھ میں ایک کنواں کھودنے کے موقع پر پومپیائی کا اصلی مرکز معلوم ہوگیا۔ لیکن اس کے کھودنے کے لئے جو قدم اٹھایا گیا وہ ۱۱۶۱ھ میں تھا۔ لیکن پھر بھی کام کسی اصول یا نقشہ کے مطابق نہ تھا اور کہا جا سکتا ہے کہ حقیقت میں کھدائی ۱۲۳۳ھ میں شروع ہوئی۔ ۱۲۷۶ھ سے ایک منظم اسی آدمیوں پر مشتمل عملہ، سمجھ دار اور قابل آثار قدیمہ کے ماہروں کے تحت نظر کھدائی میں مشغول ہے۔ اس وقت تک انہوں نے شہر کا ۳/۵ حصہ خاک کے نیچے سے کھود لیا ہے۔ سب سے پہلے جو چیزیں برآمد ہوئیں۔ ان میں سے قابل ذکر چار ڈھانچے ہیں جو اسی حالت میں بغیر کسی قسم کی تبدیلی کے اس وقت تک پڑے ہوئے تھے اور اب انہیں ناپل کے عجائب گھر میں رکھا گیا ہے۔ ان چار ڈھانچوں میں سے ایک عورت کا ڈھانچہ ہے، جس کے پہلو میں اس وقت کے ۹۱ مختلف سکے، دو چاندی کے پیالے، ایک چابیوں کا گچھا اور جواہرات پائے گئے تھے اور ظاہری طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے انہیں اٹھایا ہوا تھا تاکہ انہیں لے کر بھاگ جائے اور اسی حالت میں ہلاک ہوگئی۔
یہ عورت ڈھانچوں کے بائیں طرف پڑی ہوئی تھی۔ اس کے سر پر نقاب اور انگلیوں میں دو انگوٹھیاں تھیں۔ اس کے پہلو میں ایک اور عورت، ایک لڑکی اور ایک مرد پڑے ہوئے تھے۔ اس کے بعد تدریجاً اور بہت سے انسانی جسم برآمد ہوئے اور اب بھی ہو رہے ہیں۔ اسی طرح اور بہت سے آثار قدیمہ مجسموں، ستونوں، عمارات، محلات، عام مکانات، عبادت گاہوں، میدانوں، حماموں اور دکانوں کی صورت میں کھودے گئے ہیں۔ ان میں سے بہت سی ایسی چیزیں جنہیں محل و نقل کیا جا سکتا ہے اب ناپل کے عجائب گھر میں پڑی ہیں۔

پومپیائی شہر کی سڑکیں اور گلیاں عموماً سیدھی اور مستقیم ہیں اور ان میں اور بہت سے پرانے شہروں کی گلیوں کی طرح کوئی پیچ و خم نہیں۔ . . . ان کی چوڑائی ۴ سے ۹ فٹ تک ہے اور ان پر پتھر کا فرش لگا ہوا ہے پیدل چلنے والوں کے لئے الگ پٹریاں بنی ہوئی ہیں جو سڑک کی سطح سے قدرے اونچی ہیں اور چوڑائی میں دو فٹ سے زیادہ نہیں۔

ارکان سلطنت میں سے قابل ذکر وہ محل ہے جس کا نام ہے،
کازوال فونو کا محل، اس کی دیواروں کی منڈیر پر نہایت عمدہ خاتم کاری سے بہت دلکش تصویریں منقش کی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک مشہور تصویر ہے جو سکندر اعظم اور دارائے سوم بادشاہ ایران کی جنگ کا نقشہ ظاہر کرتی ہے اس تصویر کا انکشاف ۱۲۴۷ھ میں ہوا اور تاریخی و علمی لحاظ سے بہت گراں بہا ہے۔ کیونکہ اغلب ہے کہ یہ تصویر یا تو خود سکندر کے عہد میں یا اس سے کچھ عرصہ بعد کندہ کی گئی ہے۔ اس تصویر کی تمام جزئیات لباس، گھوڑوں کے ساز و سامان، اسباب جنگ اور ہتھیاروں کی حیثیت سے بالکل واقعہ کے مطابق ہیں، اس تصویر کے بائیں طرف سکندر کے روبرو دارا سوم بادشاہ ایران ایک جنگی رتھ پر بیٹھا ہے۔ اس کے اردگرد ایرانی لشکر ہے جو سکندر کے لشکر کے ہجوم کرنے کی وجہ سے بھاگ رہا ہے۔ دارا کے پیچھے ایک سوار درفش کاویانی ہاتھ میں اٹھائے کھڑا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ خاتم کاری کا یہی حصہ خاص طور پر شکستہ ہے جس کی وجہ سے جھنڈا اچھی طرح ظاہر نہیں۔ لیکن اس کے باوجود جھنڈے کا بالائی حصہ اور نیزے کی نوک جس سے جھنڈا بندھا ہوا ہے اور اسی طرح وہ حصہ جہاں سجاوٹ کے لئے رنگا رنگ کی جھنڈیاں لٹکی ہوئی ہیں۔ خوب نمایاں ہیں۔
لارڈ لٹن مشہور انگریزی نثر نگار نے ایک ناول "لاسٹ ڈیز آف پومپی آئی" کے نام سے لکھا ہے۔ یہ ناول پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کیونکہ مصنف مذکور نے نہایت محنت اور کوشش سے معلومات تاریخی اور کشفیات تازہ کو جمع کر کے اس زمانے کی حیات اجتماعی کو مجسم کرنے کی سعی کی ہے اور حقیقت میں اس نے اپنے کام کی ذمہ داری کو پورا پورا ادا کیا ہے۔

(ترجمہ)

"شاہکار"

عبدالرشید صدیقی

غزل

غم دینے والا شاد رہے پہلو میں ہجوم غم ہی سہی
لب اُن کے تبسم ریز رہیں آنکھیں میری پُرنم ہی سہی

گر جذبِ عشق سلامت ہے یہ فرق بھی مٹنے والا ہے
وہ حُسن کی اک دنیا ہی سہی میں حیرت کا عالم ہی سہی

ان مست نگاہوں کے آگے، پینے کا ذکر نہ کر ساقی
میخانہ ترا جنّت ہی سہی، پیمانہ جامِ جم ہی سہی

ملتا نہیں جب مونس کوئی اس وقت یہی یاد آتا ہے
اپنا دل پھر بھی اپنا ہے خوکردہ ذوقِ رم ہی سہی

جب دونوں کا انجام ہے اک پھر چون و چرا سے کیا حاصل؟
تدبیر کا میں قائل ہی سہی، تقدیر کا تو محرم ہی سہی

بندوں کے ڈر سے تجھے پوجوں؟ میں ایسی ریا سے باز آیا
دل میں ہے خوف ترا یارب! سرپائے صنم پر خم ہی سہی

آغازِ محبت دیکھ لیا، انجامِ محبت کیسا ہوگا!
قسمت میں حفیظِ بیکس کی آوارگیٔ پیہم ہی سہی

ہمایوں"

حفیظ ہوشیارپوری

پیامِ بہار

زمیں اُگل دے گی گنجِ پنہاں جہاں میں دورِ بہار ہوگا
کلی کلی عطر بیز ہوگی چمن سراپا نگار ہوگا

فلک پہ چھا جائیں گی گھٹائیں چلیں گی فردوس کی ہوائیں
شجر شجر جھومنے لگے گا چمن چمن بادہ خوار ہوگا

فلک نے بنیاد ڈال دی ہے جہاں میں اک باغِ دلکشا کی
کسے یہ معلوم ہے کہ کس کس کا خون صرفِ بہار ہوگا

تلاشِ منزل کو آپ ہوگی ہمارے گم گشتہ کارواں کی
نہ دورِ گردوں خلاف ہوگا نہ بخت ناسازگار ہوگا

کسی کا قصرِ بلند مٹ کر ملے گا کیونکر غبارِ رہ میں
اسے وہ دانا سمجھ سکے گا جو چرخ کا رازدار ہوگا

عجب ادا سے مرے سرہانے کھڑی ہیں مینا بدوش حوریں
زباں سے کہتی ہیں یاالٰہی یہ مست کب ہوشیار ہوگا

فرات پر گل تری رضا میں جو تشنہ لب سر کٹا دیا ہے
تو آج بھی تیرے آستاں پر نثار یہ جاں نثار ہوگا

غمِ محبت میں میرے دل کو ہر اک تڑپ میں نیا مزا ہے
خود اس کی چارہ گری کروگے تو اور بھی بے قرار ہوگا

نواحِ یثرب میں دے ہی دیں گے نظیرؔ دو گز زمیں مجھے بھی
اُسی چمن کا ہزار ہوں میں اُسی چمن میں مزار ہوگا

"انقلاب"

نظیر لودھیانوی

مظلوم بچّہ

بحسرت مالکہ کے حکم سے اک ناتواں بچہ
جھکا میداں میں جھاڑو دے رہا ہے یکہ و تنہا
سحر کا وقت ہے، شادابیاں ہیں نرم جھونکوں میں
گلی سے آرہی ہیں کھیل کی مخلوط آوازیں
پیاپے کھیل کا میدان جب آواز دیتا ہے
ذرا سا سر اٹھا کر مالکہ کو دیکھ لیتا ہے
صدائیں کھیل کی آ آ کے جب اوسان کھوتی ہیں
اسے اپنے جگر پر ٹھوکریں محسوس ہوتی ہیں
تقاضا کم سنی کا دل میں جب دھومیں مچاتا ہے
لرز اٹھتا ہے گردن موڑتا ہے، سر کھجاتا ہے
دمادم جب گلی سے گیند کی آواز آتی ہے
رُخِ طفلی پہ اک بیچارگی سی دوڑ جاتی ہے
غریبِ افلاس! تجھ کو دھیان میں لاتی نہیں دنیا
ترے معصوم بچوں تک کو بہلاتی نہیں دنیا

"کلیم"

جوشؔ

عام پسند مغالطے

(۱) ہم میں سے کتنے ہیں جو اُن امور میں اپنی واقفیت کا دعویٰ کرتے ہیں جن سے وہ ناواقف ہیں اور کتنے ہیں جو ان امور میں اپنی عدم واقفیت کا اظہار کرتے ہیں، جن سے وہ واقف ہیں۔

(۲) ہم اچھوں کا روپ بھر کر سامنے آتے ہیں اور ہماری ذات میں لے دے کے صرف اتنی ہی خوبی پائی جاتی ہے کہ ہمارا ظاہر بہت خوشنما ہوتا ہے۔

ہم اب اس نقطۂ زوال تک آ چکے ہیں کہ صرف شکل و شمائل کی تو عزت کر سکتے ہیں لیکن معنوی و حقیقی محاسن تک ہماری نظر نہیں پہنچتی۔ کیا ظاہر کو ابھارنے اور باطن کو چھپانے کا فن ہم اچھی طرح حاصل نہیں کر چکے ہیں؟ کیا ہم پُر عیب نہیں ہیں، اور ہم نے اسی کے ساتھ ساتھ ہنر نہیں سیکھا ہے؟ کیونکہ ہمیں معلوم ہو چکا ہے۔ کہ عیب کے چھپانے کے لئے بھی ہنر کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۳) ریاکاری غالباً اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ نسلِ انسانی اور سب سے پہلے ریاکار کو اس فن کی باریکیوں میں کمال حاصل ہونا چاہیئے۔ یہ پہلا ریاکار کون تھا؟ اور وہ کیوں ریاکار تھا؟

(۴) انسان اپنی زندگی کے چند ابتدائی سال گویائی حاصل کرنے میں صرف کر دیتا ہے اور اس کے بعد کیا وہ اپنی تمام بقیہ زندگی کے ماہ و سال اس سعی میں صرف نہیں کر دیتا کہ وہ کیونکر خاموش رہے۔

(۵) انسان عملی زندگی میں اپنے قائل کئے جانے پر صرف ناک بھوں ہی نہیں چڑھاتا بلکہ جو شخص اُسے قائل کر دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے، وہ اُس سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح نظری طور پر کیا یہ ایک اچھا مشغلہ نہیں ہے کہ کسی جاہل انسان کے قائل کرنے کی سعی کی جائے؟

(۶) چند افراد ایسے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ در اصل انہیں کس چیز کی ضرورت ہے، اور وہ چیز انہیں مل جاتی ہے بعض یہ جانتے ہوئے بھی کہ انہیں کس چیز کی ضرورت ہے، اس چیز کو حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن کیا ایسے بھی لاتعداد انسان موجود نہیں ہیں جو در حقیقت یہ جانتے ہی نہیں کہ انہیں اصل میں کس چیز کی ضرورت ہے۔ اور وہ ہمیشہ اس چیز سے محروم رہتے ہیں!

(۷) کیا یہ ہر شخص کے لئے طے کرنے کی بات نہیں ہے کہ آیا اس پتھر کو جو اُس کی راہ میں حائل ہے، سنگِ راہ کی صورت میں وہیں پڑا رہنے دیا جائے یا اُسے تراش کر زینے میں تبدیل کر لینا چاہیئے!

(۸) جب کوئی غیر متوقع اور خلافِ امید امر پیش آ جائے تو اُس سے ایسا ہی سلوک کیوں نہ کرو گویا وہ سر بسر حسب توقع اور حسب امید واقع ہوا ہے!

"کلیم"

نقد و نظر

انقلاب روس

مصنفہ جناب کشن پرشاد صاحب کول، ممبر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی لکھنؤ۔

صفحۂ ہستی پر سیکڑوں نہیں ہزاروں ہی انقلاب آئے ہوں گے اور فرزند آدم پر لاکھوں مرتبہ مصیبت کے پہاڑ ٹوٹے ہوں گے۔ ہماری موجودہ تاریخ نے بیسیوں سلطنتوں کو تاخت و تاراج ہوتے دیکھا ہے لیکن جو نقشہ انقلاب روس نے پیش کیا ہے اس کی مثال تاریخ عالم میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔

یہ انقلاب سابقہ حکومت اور تخت و تاج پر ہی نہیں آیا بلکہ اس نے نہ صرف حکومت اور طرزِ حکومت کو، اور افراد اور ان کی قسمت کو منقلب کر دیا ہے بلکہ رعایا کی ذہنیت، مذہب اور معاشرت کو بدل کر رکھ دیا ہے۔

فاضل مصنف نے کتاب کو پانچ مبسوط حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

حصہ اول میں روس کے ابتدائی حالات، جنگ عظیم اور زمانۂ مابعد جنگ تک کے تاریخی حالات درج ہیں۔

حصہ دوم میں سوشلزم کے نشو و نما ہنگامۂ انقلاب اور اس کے اسباب و علل پر بحث کی گئی ہے۔

حصہ سوم، دستور حکومت اور آئین و قوانین کے متعلق ہے۔

حصہ چہارم ملکیت او صنعت و حرفت، زراعت اور کواپریشن کی تفاصیل پر منطبق ہے

حصہ پنجم میں تعلیم، مذہب اور طرزِ معاشرت پر بحث کی گئی ہے۔

کتاب کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تدوین و تالیف میں کافی تحقیق سے کام لیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود پیرائیہ بیان اس قدر دلآویز ہے کہ کسی دلچسپ افسانے کا شبہ ہوتا ہے۔

کتاب عربی ٹائپ کے حروف میں شائع ہوئی ہے اور بڑے سائز کے زائد از ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے مجلد تین روپے۔ ہندوستانی اکیڈیمی، الہ آباد سے طلب فرمائیے۔

تمدنِ عتیق

مصنفہ جناب ابوظفر عبدالواحد صاحب ایم اے و جناب مولوی عطاالرحمن صاحب بی۔ اے نظامی کالج، حیدرآباد دکن۔

فاضل مؤلفین نے سائنس کی جدید تحقیقات کی روشنی میں کرۂ ارض کے معرض وجود میں آنے اور اس پر زندگی کے اولین نمونے سے لے کر حضرتِ انسان کے ورود اور اس کے معاشری اور تمدنی ارتقا پر بحث کی ہے اگرچہ جو نتائج مستنبط کئے گئے ہیں انہیں قطعی اور آخری نہیں کہا جاسکتا لیکن فرسودہ توہمات اور قیاسات کے مقابلے میں ان کی دلائل واقعات اور شواہد کی استوار بنیادوں پر قائم ہیں۔ انداز بیان شستہ اور عام فہم ہے۔

کتاب $\frac{20 \times 30}{16}$ کے ۳۲۴ صفحات پر مشتمل ہے قیمت بے تصویر ایڈیشن دو روپے باتصویر ایڈیشن تین روپے۔ مصنفین سے براہ راست طلب فرمائیے۔

عجائبات سائنس

مصنفہ ڈاکٹر محمود عبدالحق صاحب ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ٹیکنیکل سکول۔ لاہور

مادہ، توانائی اور سائنس کے دیگر نظریوں پر عام فہم زبان میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب علمی نقطۂ نظر سے اچھی ہے اور ان لوگوں کے معلومات میں جو انگریزی سے بے بہرہ ہیں اس ضمن میں کافی اضافہ کرسکتی ہے۔ بعض جگہ نقشے اور تصاویر سے بھی مدد لی گئی ہے۔

$\frac{20 \times 30}{16}$ سائز کے ۱۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت بلا جلد بارہ آنے ۱۲ر مجلد ایک روپیہ

ڈاکٹر صاحب موصوف سے براہ راست طلب فرمائیے۔

(ادارہ)

ڈاک کے ڈاکو ہر ماہ ہمیں خریداروں کی طرف سے شکایتیں موصول ہوتی ہیں کہ انہیں پرچہ نہیں ملا اور ہمیں خریدار ایسے بھی ہیں جو شکایت نہیں کرتے لیکن یہ فرض کر لیتے ہیں کہ پرچہ دفتر نے نہیں بھیجا تاکہ ان کا پیسہ بچا رہے۔ یا چھاپنا اور پھر خریدار کو نہ بھیجنا پاگل پن اور تجارتی خودکشی سے کم نہیں۔ دفتر ایسا نہیں کرتا۔ ادبی دنیا ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے۔ اگر اس تاریخ تک آپ کو پرچہ نہ ملے تو سمجھ لیجئے کہ کسی ڈاک کے ڈاکو کی نذر ہو گیا۔ پس ایک شکایتی کارڈ اپنے حلقے کے سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس کو لکھئے اور ایک ہمیں لکھئے تاکہ آپ کو پرچہ دوبارہ بھیجا جائے اور محکمہ ڈاک کے دروازہ پر ایک دستک دی جائے۔

فہرستِ مضامینِ ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ مئی ۱۹۳۷ء

جلد ۱۵ — تصویر: منصور احمد — **نمبر ۷**

سالانہ چندہ معہ محصول ڈاک و وی پی پانچ روپے (ص) ممالک غیر سے دس (۱۰) شلنگ

(رگیلانی)

جمال پریس لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا کمرشل بلڈنگس مال روڈ لاہور سے شائع ہوا

آہ! منصور احمد

ایں ماتمِ سخت است کہ گویند جواں مُرد

ادبی دنیا کے ناظرین کو یہ سُن کر بے حد صدمہ ہوگا کہ مولوی منصور احمد ایڈیٹر ادبی دنیا جنھوں نے اپنی عمر کی ابھی بمشکل چھتیس منزلیں طے کی تھیں تین ماہ کی علالت کے بعد ۷ مئی کو جمعہ کے دن دو بجے اس عالم فانی سے جہان باقی کو انتقال فرما گئے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ مرحوم یکم مئی کو بحالی صحت کے لئے کوہ مری تشریف لے گئے تھے۔ آپ کے چھوٹے بھائی مولوی مظفر احمد آپ کے ساتھ تھے۔ پہاڑ پر پہنچکر آپ کی طبیعت تھوڑی دیر کے لئے سنبھل تو گئی لیکن پھر یکایک ایسی بگڑی کہ آپ نے واپس وطن آنے پر اصرار کیا۔ چنانچہ ۶ مئی کی شام کو لاہور واپس آ گئے۔ آئے تو سفر کی کوفت سے حالت اور بھی خراب تھی۔ ۶ اور ۷ مئی کی درمیانی شب بڑی تکلیف سے بسر ہوئی۔ صبح ٹیکہ لگایا گیا لیکن بےسود۔ آخر دو بجے کے قریب جانِ شیریں جانِ آفریں کے سپرد کردی اور ہم سب کو عمر بھر کے لئے روتا چھوڑ گئے۔

دنیا کا قاعدہ ہے کہ موت کے بعد مرنے والے کی خوبیاں بیان کرتے اور برائیوں کو بھول جاتے ہیں لیکن حق بات یہ ہے کہ ہم نے منصور احمد کی تمام زندگی میں کسی کے منہ سے اس کی برائی نہ سنی اور نہ کبھی اس کے منہ سے کسی کے حق میں بُرا کلمہ نکلا۔ جس کسی کو کبھی ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ یا ان سے کسی قسم کا واسطہ پڑا۔ وہ اپنے دل پر اُن کی شرافتِ نفس۔ پاکیزگی فطرت اور علوِّ سیرت کا نقش راسخ اپنے دل پر لے کر اٹھا۔ راقم الحروف کے تعلقات اُن سے گزشتہ پچیس برس سے قائم تھے اور تعلقات بھی ایسے جو دوستی کے میدان سے گزر کر یک دلی و یکجائی کی حدود میں آچکے تھے لیکن اُن کی پختگی سیرت۔ اور وضع داری کا یہ عالم تھا کہ کبھی اپنے منہ سے اپنی کسی پریشانی کا مجھ سے اظہار نہ کرتے اور انتہا درجہ کی بے تکلفی کے باوجود اپنی مخصوص متانت اور تہذیب کو کبھی ہاتھ سے نہ دیتے۔ جھوٹ کیسا ہوتا ہے۔ یہ انھیں معلوم نہ تھا۔ اہلِ دنیا سے معاملات کس طرح کئے جاتے ہیں۔ وہ اس سے بالکل بے خبر تھے زبان و ادب سے انھیں عشق تھا۔ اور ان کی ادبی خدمات اس زمانے سے بھی دس برس بیشتر شروع ہوتی ہیں۔ جب انھوں نے ہمایوں کی ادارت سنبھالی۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں خیابان (خیاآستان) جاری کیا۔ اور اگرچہ وہ ابھی بالکل نوعمر تھے لیکن ان کی پختگی تحریر اور سلیقۂ ادارت کو دیکھ کر علامہ اقبال اور پروفیسر مرزا محمد سعید جیسے بلند پایہ اصحابِ علم نے اس زمانہ میں لکھا تھا کہ یہ ہونہار ادیب زبان و ادب کی بیش بہا خدمات بجالائے گا۔

نوجوانوں میں صحیح ذوقِ ادب پیدا کرنے کا شوق اس قدر تھا کہ ہر روز اپنے قیمتی اوقات کا ایک معقول حصہ ان ہونہار ادیبوں کے مضامین کی درستگی میں صرف کر دیتے جو اپنی پہلی "ادبی کاوشیں" لے کر دفتر "ادبی دنیا" میں آتے اور انھیں مشق جاری رکھنے کا حوصلہ دلاتے۔ راقم پر بعض دفعہ یہ ادبی پورشیں کچھ ناگوار گزرتیں تو فرمایا کرتے۔ بھئی ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہی گھٹنیوں چلنے والے کسی دن عرصۂ ادب کے شہسوار ہو جائیں گے۔ مرض الموت میں گرفتار تھے لیکن "اصطلاحاتِ ادب" برابر مرتب کر رہے تھے۔ میں نے منع کیا تو کہنے لگے کہ بہت سے نوآموز شاعر اور ادیب بڑی موزوں طبیعتیں رکھتے ہیں لیکن علمی تربیت کی کمی کے باعث نادانستہ غلطیاں کرجاتے ہیں۔ لگے ہاتھوں اُن کی یہ چھوٹی سی خدمت ہو جائے تو کیا بُرائی ہے۔ آہ کسے خبر تھی کہ موت کی آندھی اس شمعِ فروزاں کو عین اس وقت گُل کر دے گی جب اس کی روشنی صحن و در سے نکل کر اقصائے دنیائے ادب تک پہنچنے لگی تھی۔ ہیہات ؎

لوٹا سرِ راہ قافلۂ عمر قضا نے   منصور ابھی واردِ منزل نہ ہوا تھا

غم نصیب:- صلاح الدین احمد

نوحۂ منصور

داغ سینہ میں کہ دل میں کوئی ناسور نہیں — پھر یہ کیا سنتا ہوں افسوس کہ منصور نہیں
کون منصور خلوص اور محبت کی شبیہہ — ایسے اوصاف تو اِس دَور کا دستور نہیں
کون منصور وہ دنیائے ادب کا خورشید — اب صحافت کی فضا دھندلی ہی پُر نور نہیں
پیکرِ نیکی و اخلاق تھا منصور احمد — کونسا دل ہے کہ اس صدمہ سے جو چور نہیں
پدرِ پیر[1] کی حالت نہیں دیکھی جاتی — دن قیامت کا مگر آج سے کچھ دُور نہیں
وہ مرض لگ گیا جو جان کو لے کر ہی گیا — ورنہ کس دُکھ کی دوا علم میں مذکور نہیں
تھا جو ممکن وہ کیا اس کے بچانے کے لئے — مَوت کو روکے۔ کسی کا بھی یہ مقدور نہیں
بدلی گو آب و ہوا۔ ہائے نہ بدلی قسمت — کہہ سکے کون اب انسان کو مجبور نہیں

کیفیؔ غم زدہ کا ساتھ دیا اور ایسا
بھائی! اُلفت کا تو کچھ خوب یہ دستور نہیں

کیفیؔ

[1] مرحوم کے والد کی طرف خطاب ہے۔

آئینۂ عالم

زارِ روس کے حقیقی قاتل

شہنشاہ جارج پنجم نے اپنی وصیت میں یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ ان تمام تاریخی واقعات کی توضیحات شائع کی جائیں جن کے وقوع نے زارِ روس ''اس کے خاندان کو اس دردناک انجام پر پہنچایا تھا۔

شہنشاہ کی زندگی ہی میں اس کتاب کی تالیف شروع ہو گئی تھی جس میں اس حسرت ناک واقع کی تفصیلات جمع کی جا رہی تھیں مس بلانکے ڈگڈیل، لارڈ بالفور کی بھانجی شہنشاہ کی امداد اور ہدایات کے مطابق اسے مرتب کر رہی تھی۔ مس ڈگڈیل کو شہنشاہ نے کئی مرتبہ اسی ضمن میں اپنے حضور میں طلب فرمایا اور حکم صادر فرمایا کہ تمام متعلقہ سرکاری مسودات یہاں تک کہ دفترِ خارجہ کی یادداشتیں بھی مس ڈگڈیل کو بہم پہنچائی جائیں۔

شہنشاہ کی ذاتی توجہ کی وجہ سے تمام ضروری مواد تکمیل کی حد تک پہنچ چکا ہے۔ اور ملکہ اپنے مرحوم شوہر کی آخری خواہش کو پورا کرنے کے لئے عنقریب اسے شائع فرمانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔

سلطنت روس کے آخری وزیر اعظم ایم الگزنڈر کیرنسکی نے مجھے ایک ملاقات خصوصی میں جو پیرس میں ہوئی مندرجہ ذیل واقعات بتائے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ کس طرح لائڈ جارج نے زارِ روس اور اس کے گھرانے کو بچانے کے لئے جارج پنجم کی تمام کوششوں کو ناکام بنایا اور انہیں انگلستان لانے سے باز رکھا۔

ایم کیرنسکی نے کہا: "میرے لئے اور ان تمام لوگوں کے لئے جو شہنشاہ جارج کو جانتے تھے۔ یہ ضروری تھا کہ وہ شہنشاہ کو ان تمام تاریخی واقعات کے شائع کرنے کی رائے دیں جو شہنشاہ کے عم زاد بھائی اور اس کے خاندان کی بربادی کا موجب ہوئے تھے۔ شہنشاہ چاہتے تھے کہ وہ دنیا کو ان تمام کوششوں کی تفصیلات بتا دیں جو انھوں نے زار کو بچانے کے لئے کی تھیں۔ اور ان الزامات سے بری الذمہ ہو جائیں جو ان کو ایسا نہ کرنے کی صورت میں ان پر عائد ہوتے تھے۔

"یہ ایک حقیقت ہے کہ انھوں نے زار اور اس کے خاندان کو روس سے انگلستان تک بھگا لے جانے کے لئے ہر امکانی کوشش کر ڈالی اور ان کوششوں کے ناکامیاب رہنے کے لئے وہ کسی طرح بھی موردِ الزام نہیں ہو سکتے۔

"یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ کو زار اور اس کے خاندان کو سرخ ڈاکوؤں کے پنجے سے چھڑا نے نہ دیا گیا اور اس واقعہ نے آپ کی باقیماندہ زندگی کو پژمردہ سا کر دیا۔ آپ اکثر اپنے دوستوں سے اپنی کوششوں کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ آپ کو اس ناکامی کا نہایت ہی قلق تھا اور باوجود اپنی بے بسی کے علم کے آپ اپنے ضمیر کے سامنے سرخرو نہ ہو سکتے تھے۔ اس وقت سے لے کر زندگی کے آخری ایام تک آپ روس کے متعلق ہر بات میں دلچسپی لیتے رہے۔ اور جو لوگ آپ کو جانتے تھے ان کا خیال ہے کہ موجودہ روس کے متعلق ان کی معلومات دنیا کے ہر آدمی سے زیادہ تھیں۔

ایم کیرنسکی نے اس کے بعد ان ناشاد ایام کی ساری سربستہ کہانی مجھے کہہ سنائی۔

"۱۹۳۴ء میں شہنشاہ نے زار کی شاہی گارڈ کے افسر پال بولجن کی ایک کتاب کی اشاعت کے حق میں رائے دی تھی جو ان حالات پر منطبق تھی۔

۱۹۱۸ء میں آپ نے بولجن کو فوراً روس جانے کا حکم دیا۔ کیونکہ آپ کا خیال تھا کہ شاید غیر مفتوح اضلاع میں ابھی تک شاہی خاندان کے افراد زندہ ہوں۔ چونکہ ہنگامۂ بغاوت میں صحیح اطلاعات نہ مل سکتی تھیں۔ اس لئے شہنشاہ یہ امید رکھتے تھے کہ شاید خاندان شاہی کے چند افراد بھاگ کر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔

بولجن نے واپس یہ بتایا کہ شاہی خاندان کے تمام ممبروں کا وہی حشر ہوا ہے جو خود زار کا ہوا اور وہ ایسے وقت میں پہنچا کہ موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

"ہنگامہ انقلاب کے شروع ہونے کے ساتھ ہی زار اور شاہی خاندان کے تمام افراد کو قید کر لیا گیا تھا۔ جوں ہی ان کی گرفتاری کی خبر لندن پہنچی شہنشاہ نے فوراً اپنے سفیر متعینہ سینٹ پیٹرزبرگ سر جارج بوکانن کو ہدایت بھیجی کہ وہ حکومت روس کو مطلع کرے کہ شہنشاہ جارج زار اور شاہی خاندان کو لندن میں پناہ دینے پر تیار ہیں۔ سر جارج نے ہماری حکومت سے یہ بھی کہا کہ ہم شاہی خاندان کو بحفاظت انگلستان پہنچا دینے کا ذمہ لیتے ہیں۔

"اس کے بعد شہنشاہ نے احکام صادر فرمائے کہ ایک انگریزی تباہ کن جہاز ساحل روس پر بھیج دیا جائے۔ تاکہ وہ زار اور شاہی خاندان کو لندن لے آئے۔ اس کے ساتھ ہی حکومت ڈنمارک کے ذریعے سے قیصر ولہلم ثانی تک رسائی حاصل کی گئی۔ اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے جنگی بیڑے کو ہدایات دے دے گا کہ اس انگریزی تباہ کن کشتی سے کسی قسم کی باز پرس نہ کی جائے۔

"میں اور سابق حکومت روس اس بات سے نہایت ہی مسرور ہوئے کہ شہنشاہ نے اتنی فراخ دلی کا برتاؤ کیا ہے کیونکہ ہم خود زار کے مستقبل کے متعلق نہایت فکرمند تھے۔ چنانچہ میں نے زار کی گاڑی کے ساتھ مرمانسک کی بندرگاہ تک جانے کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ بدقسمتی سے ریل اس وقت سرخ فوج کے قبضے میں تھی جس کی وجہ سے سفر نہایت خطرناک ہو رہا تھا ہم نے روانگی کا ارادہ اس وقت تک کے لئے ملتوی کر دیا۔ جب تک حالات کسی حد تک درست نہ ہو جائیں۔

شہنشاہ کی یہ پیش کش چونکہ ذاتی حیثیت سے اور رشتہ داری کے تعلقات پر مبنی تھی اس لئے زمانہ جنگ کے وزیر اعظم مسٹر لائڈ جارج۔ لبرل پارٹی اور مزدور طبقہ اس سے مشتعل ہو گیا۔ لندن کے ایک اخبار نے جس سے لائڈ جارج کے گہرے تعلقات تھے۔ اس تجویز کے خلاف مضامین کا ایک سلسلہ شروع کر دیا جس کے نتیجے میں وزیر خارجہ کو ایک سرکاری بیان شائع کرنا پڑا جس کا ملخص یہ تھا کہ "شاہ انگلستان کی حکومت اس دعوت کو جو زار روس کو پناہ دینے کے سلسلے میں دی گئی تھی جاری نہیں رکھنا چاہتی اور اپنی پیش کش کو واپس لیتی ہے۔"

اخبارات کے ذریعے سے زار اور اس کے خاندان کے خلاف عوام کے دلوں میں نفرت پیدا کی گئی۔ سب سے زیادہ زارینہ کو ہدف ملامت بنایا گیا اور ظاہر کیا گیا کہ جرمنی کے ساتھ اس کے تعلقات نہایت گہرے ہیں۔ اور انگلستان میں اس کی موجودگی نہایت تباہ کن نتائج پیدا کرے گی۔ اس کے علاوہ مختلف ذرائع سے شہنشاہ پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ اپنے خیال سے باز آ جائیں

"اپریل ۱۹۱۷ء کے اوائل میں سر جارج بوکانن کو لندن سے ایک تار موصول ہوا۔ تار کو پڑھ کر اس کا رنگ زرد پڑ گیا اور وہ اپنی بیٹی کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ جو اتفاق سے اس وقت اس کے کمرے میں موجود تھی۔ "انھیں زار کی ضرورت نہیں۔ وہ اسے انگلستان میں بلانا نہیں چاہتے۔ انھیں ڈر ہے کہ اس کی موجودگی انگلستان میں سیاسی پیچیدگیاں پیدا کر دے گی۔"

اس تمام عرصے کے دوران میں زار اور اس کا خاندان۔ لندن کی خبروں کا نہایت بے تابی سے انتظار کر رہے تھے۔ روس میں حالات بھی اب کسی حد تک بہتر ہو گئے تھے اور مرمانسک تک سفر کرنا ممکن ہو گیا تھا۔ میں روسی وزیر خارجہ کے پاس گیا اور اسے کہا کہ وہ حکومت انگلستان سے اس تباہ کن جہاز کا مطالبہ پیش کرے جس کا انھوں نے وعدہ کیا تھا۔ ہم اور سفیر انگلستان اس عرضداشت کے جواب کا نہایت بے تابی سے انتظار کرتے رہے لیکن افسوس کہ اس کے جواب میں ہفتوں ہی گزر گئے۔ آخر ایک دن سر جارج ہمارے وزیر خارجہ کے پاس آیا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس نے بتایا کہ حکومت انگلستان زار روس کو اپنے ہاں پناہ دینے پر آمادہ نہیں۔

"یہ خطا لائڈ جارج کی کرتوت تھا۔ اس نے زار کے سفر کو اپنی تمام امکانی کوششوں سے روکا۔ اس نے شہنشاہ سے کہا (جو ابھی تک اپنے پہلے ارادے پر قائم تھے) کہ اگر زار کو انگلستان بلا لیا گیا تو نہایت ہی شدید سیاسی مشکلات پیش آ جائیں گی۔ اس نے کہا کہ صنعتی طبقے نے اس بات کا فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر زار کو بلایا گیا تو تمام بندرگاہوں۔ کانوں اور اسلحہ خانوں میں ہڑتال کر دی جائے گی۔

"اس موضوع پر لائیڈ جارج سے میں نے ایک طویل بحث کی ہے اب وہ زار کی بربادی کا تمام تر الزام ہماری حکومت کے سر تھوپتا ہے۔ میں اسکی

جنگی یادداشتوں کی اشاعت کا منتظر ہوں اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر اس نے واقعات اور حقائق میں ذرا سا ردوبدل بھی کیا تو میں انگلستان کی کسی کھلی عدالت میں یک دم اسے رجوع کروں گا۔ میں نے ان یادداشتوں میں سے ایک کا مطالعہ کیا ہے۔ اس نے ان "واقعات" کا ذکر تو کیا ہے جو مارچ اور اپریل ۱۹۱۷ء میں وقوع پذیر ہوئے یعنی جب زار کو دعوت دی گئی تھی لیکن وہ ان واقعات کو بالکل نظر انداز کر گیا ہے جو جون ۱۹۱۷ء میں واقع ہوئے یعنی اس دعوت کی واپسی کو۔ اگرچہ ہماری حکومت پر جو حملے اس نے کئے ہیں اس کا مداوا نہیں کیا لیکن اس نے مجھے عدالت میں جانے کا موقع بھی نہیں دیا۔"

ایم کیرنسکی نہایت بے تابی سے شہنشاہ جارج کی فرمودہ کتاب کی اشاعت کا انتظار کر رہے ہیں جس سے ۱۹۱۷ء کے روسی واقعات حقیقی روشنی میں آجائیں گے اور زار کی موت کی ذمہ داری سے شہنشاہ کی ذات ہمیشہ کیلئے پاک ہو جائے گی۔

آخر میں اس نے کہا "مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب آخرکار میرے کندھوں سے ذمہ داری کا وہ بوجھ اٹھالے گی جو مسٹر لائڈ جارج نے میری ذات پر ڈال رکھا ہے۔ اور دنیا پر روز روشن کی طرح واضح کر دے گی کہ زار اور اس کے خاندان کے دردناک حشر کے تمام تر ذمہ دار صرف مسٹر لائیڈ جارج اور ان کی حکومت ہیں۔"

ڈاک کے پرانے ٹکٹ

آسٹریلیا کی پہلی ہوائی ڈاک کا لفافہ ۳۲ پونڈ میں نیلام ہوا ہے اگر آپ چند روپے ہفتہ وار اس کام میں لگائیں اور کچھ سوچ بچار سے کام لیں تو کافی دولت کما سکتے ہیں۔ شہنشاہ جارج پنجم کے جشن سیمیں کے ۴۹ ٹکٹوں کا مجموعہ جو صرف اسی تقریب پر برطانوی مقبوضات میں جاری کئے گئے تھے پہلے پہل چار پونڈ چار شلنگ میں فروخت ہوئے لیکن اس وقت ان کی قیمت ۱۹ پونڈ ۱۰ شلنگ ہے۔

شوقین امراء پرانے اور نایاب ٹکٹوں کی قیمت ہزاروں پونڈ تک ادا کرتے ہیں۔ ابتدا میں ٹکٹ جمع کرنے کے لئے آپ خوش قسمتی کا انتظار کرتے ہیں لیکن جب آپ اس کام میں پڑ جائیں تو اس کام کی دلچسپی خود آپ کو شوقین بنا دیتی ہے۔

ابتدائی ایام میں کافی لوگ اس میں دلچسپی نہ لیتے تھے لیکن اس وقت صرف انگلستان میں تقریباً دس لاکھ آدمی نہایت شوق سے اس میں حصہ لے رہے ہیں۔ ان لوگوں میں سب سے زیادہ تعداد ڈاکٹروں کی ہے اور ان سے دوسرے درجے پر پادریوں کی۔

ٹکٹوں کا سب سے قیمتی ذخیرہ شہنشاہ جارج پنجم کا تھا۔ آپ نے اپنی شہزادگی کے ایام میں اس کی ابتدا کی تھی۔ آپ ٹکٹوں کے شوقینوں کی انجمن کے صدر تھے۔ دوسرے قیمتی ذخائر کے مالکوں میں جارج روبی، بابی ہوز جنجر روجرز اور ایڈولف منجو جیسی مقتدر ہستیاں ہیں اور اس کے بعد معاشرہ کے تمام طبقوں سے گزر کر سکول کے بچے تک اس میں دلچسپی لیتے ہیں۔

ایک دفعہ جب یہ خبط کسی کے سر میں سما جائے تو وہ ہزار ہا پونڈ کی قیمت کا ٹکٹ یا اپنے مجموعے کی تکمیل کے لئے کسی اور نئے ٹکٹ کے حصول کے لئے یکساں بے تاب اور مضطرب رہتا ہے۔ سیکڑوں لوگ جنہیں اس سے قبل ٹکٹ جمع کرنے کا خواب و خیال بھی نہ تھا جشن سیمیں سے اس میں شامل ہو گئے اور ابھی سیکڑوں جشن تاج پوشی کی تقریب پر ٹکٹ جمع کرنے شروع کر دیں گے۔

سب سے بڑی دلچسپی ان کی لاتعداد اقسام اور پھر ان کے متواتر و مسلسل اجرا میں مضمر ہے کیونکہ ہر وقت کوئی نہ کوئی نیا ٹکٹ جاری ہوتا رہتا ہے۔ ذخیرہ کرنے والوں کے لئے چھ موٹی موٹی اقسام ہیں ان میں سے پہلی تین کمیاب اور قیمتی ہیں اور آخری تین زیادہ آسانی سے مل جاتی ہیں۔

پہلی تین میں اول نمبر برطانی نوآبادیات کا ہے جیسے ولیسٹ انڈیز یا ریاست ہائے آسٹریلیا۔ یا کسی ایک ملک مثلاً فرانس کی تمام ٹکٹوں کا مجموعہ۔

دوسرا نمبر ان ٹکٹوں کا ہے جن کے کنارے دندانے دار نہیں ہیں ۱۸۴۰ء سے ۱۸۶۰ء تک کے عرصے سے پہلے تمام ٹکٹ اسی قسم کے ہوا کرتے تھے۔ ان ٹکٹوں میں ایک ٹکٹ ماریشس کے ڈاک خانے کا نہایت کمیاب ہے اس پر غلطی سے بجائے POST PAID کے OFFICE کے الفاظ طبع ہو گئے تھے۔ یہ ٹکٹ ایک سرکاری جلسۂ سرود کے مہمانوں کے دعوتی رقعوں پر ۱۸۴۷ء میں لگایا گیا تھا۔ یہ غلطی معلوم تو ہو گئی لیکن اس وقت جب کہ چند لفافے ڈاک میں ڈالے جا چکے تھے۔ باقیوں پر غلطی کی تصحیح کر لی گئی۔ اس ٹکٹ کی اصلی قیمت ایک پنس تھی لیکن اس وقت اس ٹکٹ کے عوض میں ۳۰۰۰ پونڈ مل سکتے ہیں۔

تیسری قسم ان ٹکٹوں کی ہے جن پر کسی اور ٹکٹ کے ختم ہونے کی وجہ سے دوسری قیمت دوبارہ طبع کی جاتی ہے۔ مثلاً باربیڈوس کا ایک ۵ شلنگ

کا ٹکٹ ایک لیبل کے ساتھ شائع کیا گیا۔ جسے درمیان میں سے کاٹا گیا تھا
اور ہر حصہ ایک پنس کا تھا۔

حال ہی میں فرانس کے چار ایسے ٹکٹ ۶۰۰ پونڈ میں فروخت ہوئے
ہیں۔ اصل میں یہ ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئے تھے۔ اور ان کی اصلی قیمت ۹ سنٹائم
تھی۔ جب یہ ڈاک میں نیویارک بھیجے گئے تو ان پر زائد محصول وصول کیا گیا۔

ٹکٹوں کی باقی تین اقسام کمیاب نہیں ہیں۔

چوتھی قسم کے وہ ٹکٹ ہیں جو خاص خاص تقریبوں کے موقع پر شائع
ہوتے ہیں۔ مثلاً جشن سیمیں کے یا سٹرالیون کے سٹ جو ۱۹۳۳ء میں غلامی
سے نجات حاصل کرنے اور ولیم ولبرفورس کی موت کے موقع پر شائع
کئے گئے تھے۔ شروع میں ان کی قیمت دو پونڈ تھی۔ مگر اب ۵ اپونڈ میں ملتے ہیں

ایسے تقریبی ٹکٹ صرف چند ماہ تک جاری رہتے ہیں۔ اور اس کے
بعد باقی بچے ہوئے تلف کر دئے جاتے ہیں۔ اور پھر دوبارہ پرانے ٹکٹ جاری
ہو جاتے ہیں جو حکومت یا بادشاہ کے عہد حکومت تک جاری رہتے ہیں

پانچویں قسم ذاتی دلچسپیوں پر مشتمل ہوتی ہے جو انواع و اقسام
کے رنگ اور مختلف ڈیزائنوں کے لئے جمع کئے جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ
آپ ان میں سے صرف تصویری ٹکٹوں کے جمع کرنے کے شائق ہوں۔
جن میں گوا کا وہ ٹکٹ بھی شامل ہے جس پر ایک برہنہ عورت کی تصویر ہے

چھٹی قسم ہوائی ڈاک کے ٹکٹوں کی ہے جو اپنی دلچسپیوں کی وجہ
سے سب میں ممتاز ہے۔ عموماً عورتیں ان کے جمع کرنے کی سب سے بڑی
شائق ہیں۔ انگلستان کی اولین ہوائی ڈاک جو ۱۹۱۱ء میں لنڈن سے
ونڈسر پہنچائی گئی۔ یا شمالی بحر اٹلانٹک کی اڑان جو ۱۹۱۹ء میں عمل میں آئی
اس سفر میں ہوا باز اور ڈاک کے خطوط کو بمشکل بچایا گیا تھا۔ ان تاریخی
واقعات کے حامل لفافے کافی قیمت پاتے ہیں۔

سب سے زیادہ قیمتی ٹکٹ اس ڈاک کا ہے جو مارکوس ڈی پینیڈو
۱۹۲۷ء میں اپنے ریکارڈ توڑنے والے ہوائی سفر میں لایا۔ اس کی اصلی
قیمت ۲۰ سنٹ ہے لیکن اس کے فوراً ہی بعد ۵ پونڈ ہو گئی اور اب ۴۰۰
پونڈ ہے۔

اگر آپ بھی ٹکٹوں کا ذخیرہ جمع کرنے کے متعلق غور کر رہے ہوں تو
آپ دنیا کا سب سے زیادہ قیمتی ٹکٹ خرید سکتے ہیں۔ جو اس وقت قابل
فروخت ہے۔ یہ ٹکٹ برطانی گیانا سے ۱۸۵۶ء میں ایک سنٹ کے لئے
جاری ہوا تھا۔ ایک شوقین نے ۱۹۲۲ء میں اسے ۷،۳۵۰ پونڈ میں خریدا۔ یہ
اپنی قسم کا ایک ہی ٹکٹ ہے اور کسی ذخیرے میں اس کا ثانی موجود نہیں۔

اصحاب کہف کا بھائی

ایک شخص لندن کے ایک سنیما کی تاریکی میں بیٹھا ہوا پردے کی طرف
دیکھ دیکھ کر آنکھیں جھپک رہا تھا۔ یکایک حیرت کے مارے اس کے منہ سے
ایک چیخ نکل گئی۔ وجہ یہ تھی کہ سنیما کے پردۂ سیمیں پر ایک اداکار بول رہا
تھا اور مسٹر ولیم انگلس نے آج تک متکلم فلم نہ دیکھی تھی۔

مسٹر انگلس جنگ عظیم کے دوران میں اعلان صلح سے ایک ماہ قبل
ایک بم سے زخمی ہوا تھا اور اس وقت سے لے کر اب تک لندن کے ایک
ہسپتال میں زیر علاج تھا۔ مسٹر انگلس کی عمر اس وقت بیالیس سال ہے اور
بیس سال تک موت و حیات کے درمیان لٹکتے رہنے کے بعد چند ہی دن
ہوئے ہیں کہ وہ پھر زندوں کی دنیا میں لوٹ آیا ہے۔

"دنیا اس قدر بدل چکی ہے کہ اب پہچانی ہی نہیں جاتی" مسٹر
انگلس نے عجوبے پر عجوبہ دیکھنے کے بعد کہا۔ سنیما کی ایک عالیشان عمارت
دیکھ کر بولا "یہ خوب صورت عمارت سنیما ہال کیسے ہو سکتی ہے؟ ہمارے
زمانے میں یہ عمارتیں چوہے کے بلوں کی طرح ہوتی تھیں۔ جہاں ہم دو آنے
میں چھ آنے کی برابر تاریکی خرید سکتے تھے۔

مسٹر انگلس حیرت زدہ ہو کر پانچ گھنٹے تک ٹریفک کی قندیلوں کے
بدلتے ہوئے رنگ دیکھتا رہا اور انتہائی غور و خوض کے بعد بھی ان کے
خود بخود بدلنے کا راز نہ پا سکا۔

بجلی کے لفٹ کو اس نے موجودہ زمانے کا سب سے بڑا معجزہ
خیال کیا اور اس کے ذریعے اوپر اور نیچے بار بار سفر کرنے پر مُصر رہا۔

آخر اس دنیا کے عجائبات سے محظوظ اور مسرور ہو کر اس نے
اپنی نئی زندگی کا پہلا دن ختم کیا۔

ادارہ

صبحِ تصوّر

اللہ رے عالم سے شبِ تار کی رخصت
افسانۂ تنویر نہیں گرچہ مکمل

ہے چرخ ستاروں کی کشاکش سے سبکدوش
انفاس زمیں شورشِ مخلوق سے بوجھل

مشرق کی تجلّی میں مچلتی ہوئی بدلی
خورشید کے رخسار سے اڑتا ہوا آنچل

مرغانِ سحر خیز کے نغموں کے اثر سے
سینے میں ہے طوفان بپا روح میں ہلچل

اب عقل و جنوں ایک ہی مرکز پہ نگوں ہیں
ایمان کے مطلع پہ نہیں ہے کہیں بادل

خاموش بلندی سے یہ رستا ہوا کہر
پلکوں سے فضاؤں کی یہ بہتا ہوا کاجل

کانپی ہوئی شبنم پہ یہ خورشید کی نظریں
چلنے سے ہواؤں کے یہ جاگا ہوا جنگل

بہکانے سے جھونکوں کے یہ لہکا ہوا سبزہ
رستوں کے کناروں پہ یہ پھیلی ہوئی مخمل

پھولوں کے کٹوروں میں یہ صہبائے بہاراں
رقاصۂ موسم کی چھلکتی ہوئی چھاگل

بہکی ہوئی چھپا کے شگوفوں سے خموشی
فطرت نے ہر اک کنج میں کھولی ہوئی بوتل

خورشید پہ باریک سی گلرنگ سی بدلی
جبریل نے ماتھے پہ لگایا ہوا صندل

اب دستِ تصور میں بیک وقت ہیں دو جام
اک غیرتِ تریاق ہے اک زہرِ ہلاہل

احسان دانش



منصور احمد صاحب



ہماری زبان کا نام

یہ تقریر آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے شعبۂ اردو میں ۲۹ مارچ ۱۹۳۷ء کو حضرت علامہ سید سلیمان ندوی نے فرمائی۔

حضرات! قوموں اور زبانوں کی تاریخ ایک دن میں نہیں بنتی، ان کا خمیر اٹھتے، مزاج بنتے اور ایک صورت پکڑتے صدیاں لگتی ہیں،

آج ہم جس ملک کو اس آسانی سے "ہندوستان" کہہ دیتے ہیں، اور اس سے ہمالیہ کے دامن سے بحرِ شور کے ساحل تک کا علاقہ ہمارے ذہن میں آ جاتا ہے، مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس کا نہ یہ نام تھا اور نہ یہ اس کی وسعت تھی، اور نہ مسلمانوں سے پہلے اس ملک کا کوئی ایسا نام تھا جو اس پورے ملک کو بتا سکے جو پنجاب کی سرحد سے شروع ہو کر بنگال، مدراس، اور بمبئی کے کناروں پر جا کر ختم ہوتا ہے، بلکہ انتہا یہ ہے کہ اس پوری قوم کے لئے بھی جس نے اپنے کو "ہندو" کے نام سے ایک قوم بنا لیا ہے کوئی ایک نام نہ تھا، کہتے ہیں کہ اس ملک کے ایرانی ہمسایوں کی زبان میں اس ملک کا نام سندھو تھا اور قدیم ایرانی اور سنسکرت زبانوں میں ھ اور س کا باہم مبادلہ ہو جاتا ہے، اس طرح سندھو ہندو ہوا، اس ملک کے دوسرے بحری ہمسایہ کی زبان میں دو لفظ تھے، السند والہند، کشمیر کی ترائی سے لے کر موجودہ سندھ کے کناروں تک کو وہ سندھ اور گجرات اور لار سے باقی اندرونی ملک کو وہ ہند، کہتے تھے، اس ہند نے یورپ جا کر ہند کی اور آ ند نے انڈیا کی صورت اختیار کر لی، ہند والوں کو عرب "ہندی"، اور خراسانی "ہندو" کہتے تھے، اور عرب ہندی کی جمع ہنود اور خراسانی "ہندوان" بناتے تھے،

مسلمان جب اس ملک میں آئے تو ان میں سے اہلِ عرب نے اس ملک کو ہند کا، اور اہلِ خراسان نے ہندوستان کا نام دیا۔ لفظ ستان، جگہ یا زمین کے لئے فارسی اور سنسکرت دونوں میں بولتے ہیں، اس لئے ہندوستان ہندو استھان بھی ہو سکتا تھا،

اس ملک میں جو بولی بولی جاتی تھی وہ بھی ایک نہ تھی، ہر صوبے کی بولی الگ الگ تھی، لیکن مسلمانوں نے یہاں کی ہر بولی کا ایک ہی نام رکھا، یعنی ہندی یا ہندیہ۔

اس تفصیل سے معلوم ہو گا کہ اس سرزمین کے ایک ملک کا ایک نام ہند یا ہندوستان، اور یہاں کی رہنے والی قوموں کا ایک نام ہندو، اور یہاں کی مختلف زبانوں کا ایک نام ہندی مسلمانوں نے رکھا، اور حقیقت میں یہ مسلمانوں ہی کی ذہنیت اور ذہانت تھی، جس نے اس پوری سرزمین کو ایک ملک اور یہاں کے رہنے والوں کو ایک قوم، اور یہاں کی بولیوں کو ایک زبان سمجھنے کا تصور پیش کیا،

اس ملک میں عرب، عربی، ایرانی، فارسی اور ترک ترکی بولتے ہوئے آئے، مگر کچھ ہی دنوں کے بعد یہاں کے اصلی باشندوں سے گھل مل کر تتلا تتلا کر یہیں کی سی کوئی زبان بولنے لگے، جس کا نام انہوں نے ہندی یا ہندوی رکھا، ورنہ ہندی نام کی کوئی زبان اس ملک میں ان کے آنے سے پہلے نہیں بولی جاتی تھی، اس زبان نے ترقی شروع کی تو گجرات میں اس کو گوجری، دکن میں دکھنی، اور اودھ میں اودھی کہنے لگے، لیکن صوبہ دار ناموں کو چھوڑ کر پورے ملک کی اس ملی جلی بولی کا نام ہندوستان کی نسبت سے ہندوستانی بھی پکارا جانے لگا، میں نے آج سے چند سال پہلے یہاں "ہندوستان میں ہندوستانی" کے نام سے جو مقالہ پڑھا تھا، اس میں ہندوستانی نام کے پرانے تاریخی حوالے پیش کئے ہیں،

شاہجہاں کے زمانے میں جب دلی شاہجہاں آباد بنی تو شاہی قلعہ یا بازار کے لئے ترکی لفظ "اردو" اردوئے معلی کی توصیفی ترکیب سے رواج پایا، اور صوبہ وار نئی دیسی بولیوں کے لئے اس اردوئے معلی کی شاہی بولی کا ڈھنگ اس زبان کی صحت اور صفائی کا معیار بنا، اور اس طرح اس نئی معیاری بولی کو اضافت کے ساتھ "زبانِ اردوئے معلی" کہنے لگے، اور آج سے کوئی سو ڈیڑھ سو برس پہلے زبانِ اردوئے معلی کی لمبی ترکیب کے بجائے "زبانِ اردو" یعنی اردو کی زبان بنی، اور پھر اس سے بھی مختصر ہو کر "اردو" ہوئی،

جب انگریزوں کے اقبال کا ستارہ چمکا، تو فورٹ ولیم میں سیاست کے

کھلاڑیوں نے علم و دانش کے پلنے پھیکے، دو رینی سے ملک کی دو قوموں کو جو ایک ہزار سال کی محنت اور جد و جہد کے بعد ایک قوم بنی تھی جس کا تمدن جس کی زبان اور جس کی سیاست ایک ہو رہی تھی، اس کو پھر دو قوموں میں بانٹ کر علیحدہ علیحدہ کئے جانے کے لئے کوششیں شروع کیں، اور ہندی اور ہندوستانی یا اردو دو زبانیں بنا کر ایک کے لئے پنڈت اور دوسری کے لئے منشی اور مولوی نوکر رکھ کر دو زبانوں کے لئے سامان درست کر لیا، ابھی اٹھارھویں صدی ختم بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ فرنگی جادوگروں کے منتر سے اردو اور ہندی کے دو خاکی پتلے فولادی سپاہی بن کر ملک کے طول و عرض میں مرنے کٹنے لگے۔

ہندو بھائیوں کے دلوں میں یہ خیال زور پکڑنے لگا کہ اب جب مسلمانوں کی سلطنت کے دباؤ سے وہ آزاد ہو چکے ہیں تو ہم کو اسلامی اثر کی ہر چیز سے آزاد ہونا چاہیے، اس بنا پر انگریزوں کی تفریق کی سیاسی تحریک بہت کار آمد ثابت ہوئی اور سب سے پہلے اس کا اثر زبان کے معاملہ میں ظاہر ہوا، اور ہندی کے نام سے ایک زبان کی تبلیغ شروع ہوئی۔ اور بعض صوبوں میں یہاں تک کیا گیا کہ اردو خط تک عدالتوں سے خارج کر دیا گیا، اور اب یہ تحریک یہاں تک زور پکڑ رہی ہے کہ یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ اس صوبے کے چند شاعروں نے جس بھاشا میں کچھ مذہبی نظمیں کبھی لکھی تھیں وہی پورے ملک کی زبان بنا دی جائے

لیکن اس کے برخلاف ملک کے بہت سے سمجھدار ہندو اور مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں نے ایک ہزار سال کی محنت میں جس زبان کو پیدا کیا اور بڑھایا اور یہاں تک پہنچایا وہی ہمارے دیس کی زبان ہو، اور جو ہندو مسلمان دونوں قوموں کے میل ملاپ کی پہچان ہو،

بہرحال اب صورت یہ ہے کہ ملک کی اس زبان کی جگہ جس کو ہم بولتے ہیں، اور جس کو ہمارے بزرگ ہندی یا ہندوی کہتے تھے، ہندو بھائی زبردستی اپنی ایک خاص زبان اور خاص رسم الخط کو ہندی کہنے لگے، اور اس نام کو اس زبان کے معنی میں اتنا انہوں نے برتا کہ وہ انہی کی چیز ہو گئی، اور مسلمانوں نے بھی غیرت کے مارے غیریت برتی اور خوشی سے یہ نام ان کے حوالے کر دیا، اور اپنی زبان کو پہچان کے لئے ہندی یا ہندوی کے بجائے اردو کہنے لگے اور اس طرح سارے ہندوستان کے میدان کو چھوڑ کر صرف اردوئے معلی کی چہار دیواری میں سمٹ کر رہ گئے۔

یہ حالت دیکھ کر آج سے چند سال پہلے اسی یونیورسٹی کے یونین ہال میں سب سے پہلے یہ تحریک پیش کی گئی کہ اس زبان کا نام اردو کے بجائے جو اٹھارھویں صدی کے خاتمہ کی ایجاد ہے۔ جب واقعی ہندوستان کی شاہی کاروبار اردوئے معلی کے صحن و دیوان میں محدود ہو گئی تھی، اس کو واقعی طور سے اس کے پرانے نام ہندوستانی سے یاد کیا جائے، جو اس وقت کا نام ہے، جب ہندوستان کی شہنشاہی سارے ملک ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی تاکہ یہ زبان پورے ملک کی ملکیت کا دعوے کر سکے۔

مسلمانوں کا یہ سمجھنا کہ یہ تجویز ہندوؤں کی خوشنودی کے لئے یا ہندوؤں کا یہ سمجھنا کہ یہ ان کو دھوکا دینے کے لئے سازش کی جا رہی ہے بدگمانی کی انتہا ہے

یہ تحریک خالص لسانی اصول و مبادی کی بنا پر اٹھائی گئی ہے، جس کے بہت سے سبب ہیں، میں ان میں سے ایک ایک کو بہت ہی اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہوں،

۱۔ اس زبان کے دو پرانے نام تاریخوں میں ملتے ہیں، زیادہ تر ہندی یا ہندوی، اور اس کے بعد ہندوستانی، اب چونکہ ہندی کا نام ایک خاص زبان اور رسم الخط کے لئے بولا جانے لگا ہے، اس لئے دوسرے پرانے نام ہندوستانی کو اس زبان کے لئے خاص کرنا چاہئے جس کو اب غلطی سے عام طور سے "اردو" کہنے لگے ہیں،

۲۔ دنیا کی ساری یا اکثر زبانوں کے نام کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ اس قوم کی نسبت سے مشہور ہوتی ہے، جو اس کو بولتی ہے، یا اس ملک کی نسبت سے موسوم ہوتی ہے جس میں وہ بولی جاتی ہے، اسی اصول کی بنا پر عرب کی زبان عربی، فارس کی زبان فارسی، ترکستان کی زبان ترکی، انگلستان کی انگلش، فرانس کی فرنچ، جرمن قوم کی جرمن، ترکی قوم کی ترکی وغیرہ کہی جاتی ہے، اسی اصول کے مطابق اس زبان کو جو ہندوستان کے طول و عرض میں بولی جاتی ہے، ہندوستانی کا نام دینا چاہئے،

۳۔ ایک شائستہ اور مہذب زبان کا خاصہ یہ ہے کہ اس کے نام لینے کے ساتھ وہ قوم یا ملک سننے والے کی سمجھ میں آ جائے، جس کو اس زبان سے نسبت ہے، نہ یہ کہ زبان کا نام لینے کے بعد اس کے ساتھ ایک تاریخی یا تعریفی فقرہ اضافہ کیا جائے، جس سے اس کے جنم بھوم کی کہانی معلوم ہو، لفظ "اردو" سے اس قسم کی کوئی مدد ذہن انسانی کو نہیں ملتی، اس لئے اس کی جگہ اس کے اصلی نام ہندوستانی کو رواج دینا چاہئے۔

۴۔ ہم کو اپنی بولی کا ایک ایسا نام رکھنا چاہئے جس کے سننے کے ساتھ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اس پورے ملک کی بولی ہے، لفظ اردو کے ساتھ اس قسم کا کوئی تصور ذہن میں نہیں آتا، برخلاف اس کے ہندوستانی نام بولنے کے ساتھ پورے ملک کا نقشہ ہمارے ذہن میں آ جاتا ہے اور اس کے پورے

ملک کی بولی ہونے کا یقین منطق کی آمیزش کے بغیر صرف نفسیاتی اثر سے ہمارے اندر، اور ہر سننے والے کے دل کے اندر پیدا ہو جاتا ہے۔

۵۔ اس زبان کو ایک غیر متعلق بدیسی لفظ سے موسوم کرنے سے ہر اجنبی کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ جیسا بدیسی نام ہے ویسی ہی بدیسی زبان بھی ہوگی اور ہم کو اس کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ایک لمبی تقریر کی ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے، یہ نقص ہندوستانی نام قبول کرنے سے فوراً دور ہو جاتا ہے۔

۶۔ ہم کو اپنی زبان کے لئے ایک ایسا نام چاہیے جس سے ملک کے ہر صوبے کو برابر کی نسبت ہو، تاکہ ہر صوبہ اس کو اپنے وطن کی بولی سمجھے اور قرار دینے کا برابر کا دعوے کر سکے، لفظ اردو میں یہ بات نہیں، یہ بات ہندوستانی کو حاصل ہے، جس کی بنا پر صرف لکھنؤ اور دہلی ہی نہیں بلکہ بمبئی، مدراس، لاہور، کلکتہ، پٹنہ، پشاور سب کو اس کی ملکیت کا حق پہنچتا ہے، اور سب کو اس سے یکساں ملکی اور وطنی محبت معلوم ہوتی ہے، اور کسی صوبے میں وہ اجنبی اور بیگانہ نہیں قرار دی جا سکتی ہے۔

۷۔ لفظ اردو میں ایک فوجی تسلط اور شخصی شہنشاہی کی تاریخ چھپی ہوئی ہے جس سے مرعوبیت کے سوا کوئی محبت کا جذبہ نمایاں نہیں ہوتا، اگر ہم اپنے پیارے ملک کی نسبت سے اس زبان کو پکاریں، تو اس نام سے ہر ہندوستانی کے دل میں وطنی محبت کا جذبہ ابھرے گا۔

۸۔ اس ملک کا نام ہندوستان مسلمانوں کے آنے کے بعد پڑا، اسی طرح یہ بولی بھی مسلمانوں کے اس ملک میں آنے اور اس ملک کے لوگوں سے میل جول پیدا ہونے کے بعد نکلی، اس لئے اس بولی کا نام ہندوستانی رکھنا مناسب ہے، تاکہ تاریخی مناسبت کے ساتھ ہندو مسلمانوں کے برابر کے میل جول کی کہانی بھی ہم کو ہمیشہ یاد رہے،

۹۔ لفظ اردو سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ مسلمان ترکستان و خراسان سے کوئی بولی لے کر یہاں آئے تھے، جس کو وہ ترکی میں اردو کہتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ باہر سے آنے والے مسلمانوں کی زبانیں اور تھیں، اور یہ وہ بولی ہے، جس کو انھوں نے ہندوستان آ کر اختیار کر لیا، یہ واقعہ اس بولی کو ہندوستانی کے اصلی اور صحیح نام سے پکارنے سے ساری دنیا کے سامنے روشن ہو جاتا ہے، اور اس کے بدیسی پن کا بے وجہ شبہ دور ہو جاتا ہے۔

۱۰۔ اس زبان کو اردو کہنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ناواقف گرامرین اس کی صرف و نحو کو عربی و فارسی کی صرف و نحو سے جانچ کر اس کے اصول بنانے لگے، اور انہوں نے اس غلط طریق و روش کی بنا پر بہت سی غلطیاں کیں، اور اس کے جوڑوں کو عربی و فارسی قاعدوں سے جوڑنے لگے، گو اب ہماری زبان کے نئے نحویوں نے اس غلطی کو ہر طرح سے دور کرنے کی کوشش کی، مگر ابھی تک بات حلق سے نیچے نہیں اتری ہے۔ اب اس کو عام طور سے ہندوستانی کہہ کر پکارنے سے اس زبان کی صرفی و نحوی، اور لغوی تحقیقات کا رخ ایران و خراساں و ترکستان کی طرف سے مڑ کر ہندوستان کے صحیح قبلہ کی طرف ہو جائے گا، اور اس سے زبان کی اصولی و لغوی تحقیقات کی بہت سی راہیں کھلیں گی۔

۱۱۔ اگر ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ یہ پورے ملک کی مشترک زبان ہے تو اس دعوے کی اس سے زیادہ مضبوط دلیل کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ اس کا نام ہندوستانی ہے، اس کے اس پرانے نام کو رفتہ رفتہ بھلا دینے سے غلط طور کی ہمدردی کر کے ہم نادانستہ اس کے دعوے کی بنیاد کھوکھلی کر رہے ہیں۔

۱۲۔ چونکہ شروع شروع میں جو پرتگالی، یا اسپینی یا اور اگلے یورپین یہاں آئے، بلکہ خود انگریزوں نے بھی اس زبان کو صحیح طور سے ہندوستانی کہا تو ہم میں سے اکثروں کو یہ دھوکا ہوا کہ یہ نام انگریزوں کا بخشا ہوا ہے حالانکہ اس زبان کا یہ نام ہم اپنے ہندوستانی کے مقالہ میں بتا چکے ہیں کہ بادشاہ نامہ اور تاریخ فرشتہ تک میں موجود ہے، فرشتہ میں عادل شاہ ثانی والی بیجاپور کے متعلق ہے کہ "تا بہ ہندوستانی متکلم نمی شد"۔ شاہجہاں کی درباری تاریخ بادشاہ نامہ میں ہے "نغمہ سرایان ہندوستانی زبان" تلاش سے اور بھی مثالیں مل سکتی ہیں، اس لئے یہ شبہہ دور ہو جانا چاہئے کہ اس زبان کا یہ نام فرنگیوں نے رکھا ہے، بلکہ یقین کرنا چاہئے کہ ہندی کے بعد ہماری زبان کا یہ وہ نام ہے جو ہمارے بزرگوں نے رکھا تھا، اور ہم کو بھی اس نام کو باقی رکھنا چاہیئے۔

۱۳۔ اہل نظر سے چھپا نہیں کہ اس زبان کی صحیح تاریخ کے سمجھنے میں میر امن دہلوی سے سرسید، بلکہ آزاد مرحوم تک جو غلط فہمی ہوئی کہ یہ لشکری بولی ہے یا بازاری، جیسا کہ میر امن کا بیان ہے!

> جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے، تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر حضور میں جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی، اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب کرتے، ایک زبان مقرر ہوئی۔
>
> جب حضرت شاہجہاں صاحب قران نے . . . شہر دہلی کو اپنا دار الخلافت بنایا . . . اور وہاں کے بازار کو اردوئے معلیٰ خطاب دیا۔

سرسید نے یہی حکایت شاہجہاں کے عہد کی نسبت لکھی ہے، اور

لکھا ہے کہ چونکہ یہ زبان خاص بادشاہی بازاروں میں مروج تھی اس واسطے اس کو زبان اردو کہا کرتے تھے، اس غلطی کا سبب صرف لفظ اردو ہے، اس لئے اس نام کو باقی رکھنا اس غلط تاریخ کا باقی رکھنا ہے، اور اس کی اصلی تاریخ کو جو اب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے، برباد کرنا ہے،

۴۔ بعض دوست کہتے ہیں کہ چونکہ نہرو رپورٹ اور پنڈت جواہر لال نے اپنی آپ بیتی میں "ہندوستانی زبان" کی اکثریت کو تسلیم کیا ہے اور اپریل ۱۹۳۶ء میں بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے اجلاس ناگ پور میں "ہندی یعنی ہندوستانی" کی تجویز منظور ہوئی ہے اور ان سب سے "مراد ہندی" ہے، اس لئے ہندی اور ہندوستانی ہم معنی لفظ ہو گئے ہیں، اس لفظ سے پرہیز کرنا چاہیے۔

میری عرض یہ ہے کہ یہ تو مسلمانوں کی بے احساسی سے ایسا ہوا، شاہ عبدالقادر صاحب کے زمانے تک اردو کا نام "ہندی متعارف" تھا، اور سرسید نے آثار الصنادید کے طبع اول میں اردو کے لئے "ہندی" کا لفظ استعمال کیا ہے، اور اسی کو ہندی کہتے تھے، ہندی والوں نے اس لفظ پر ایسا قبضہ کیا کہ آپ کو اس نام پر سے ملکیت کا دعوے اٹھا لینا پڑا، اب ایک لفظ "ہندوستانی" رہ گیا تھا جو خالص طور پر اردو کے معنوں میں ہمیشہ استعمال ہوا ہے، اگر آپ اس کو بھی چھوڑ دیں گے تو دوسروں کے قبضۂ مخالفانہ سے وہ ہرگز نہیں بچ سکتا، یہی وقت ہے کہ آپ معاملے کی سنجیدگی کو سمجھیں، اور اپنے قبضہ سے خود ہاتھ اٹھا لینے کا گناہ نہ کریں، لیکن ہم اپنے بدگمان دوستوں کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ یہ لفظ ہندوستانی مسلمانوں کے اصرار سے اور مسلمانوں ہی کی طفل تسلی کے لئے رکھا گیا ہے، اور اس سے مراد ہماری وہی زبان ہے جو ہماری عام بول چال میں ہے، ہم کو جو کچھ شکایت ہے وہ یہ ہے کہ ہندی اور ہندوستانی کو ہم معنی اور مرادف کیوں ٹھہرایا گیا ہے، افسوس ہے کہ ایسے مسئلہ کو جو سراسر ادبی اور لسانی ہے غلط طور سے سیاسی بنایا جا رہا ہے، جذبات سے خالی ہو کر واقعات اور دلائل پر غور کرنا چاہیئے اور وہ قدم اٹھانا چاہیئے جو ہماری زبان کی حفاظت اور ترقی کا باعث ہو۔

یہ تجویز کسی تحریک و تائید اور رائے شماری کی غرض سے نہیں پیش کی جا رہی ہے، اور نہ اس طرح سے ادبی و لسانی مسئلوں کا فیصلہ ہوتا ہے بلکہ جو کچھ ہمارے سامنے ہے وہ اپنی زبان کی بھلائی اور ترقی کا خیال ہے، اس قسم کی تحریکیں پیدا ہوتی ہیں، پھر آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ وہ رائے عامہ کو متاثر کر لیتی ہیں، اردو کا نام اردو کس ایک شخص یا کانفرنس نے رکھا! یہ تو پہلے کسی کسی کی زبان پر آیا، پھر بڑھتا اور پھیلتا گیا، یہاں تک کہ سب پر چھا گیا، غور کیجئے کہ ابھی چند سال ہوئے کہ اس خیال کو کہ اردو کا موزوں نام ہندوستانی ہے، آپ کے درمیان پیش کیا گیا، اور کبھی کبھی مضمونوں میں ادھر اشارے کئے گئے، اتنے پر یہ نام مدراس وغیرہ کے رسالوں میں چھپنے لگا، اور کہیں کہیں اس کا چرچا ہونے لگا، یہاں تک کہ آج اس کھلے اجلاس میں اس پر بحث تک نوبت پہنچ گئی، غرض ضرورت مباحثہ اور مناظرہ کی نہیں ہے، بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ جو اصحاب اس تجویز سے اتفاق رکھتے ہیں وہ اپنی زبان اور قلم سے اس کا استعمال شروع کر دیں، اس سلسلہ میں ہمارے مدرسے سے زیادہ اخباروں اور رسالوں کے اڈیٹر کر سکتے ہیں، امید ہے کہ وہ ادھر توجہ فرما کر اپنی زبان کے قدیم نام کو زندہ کر کے پچھلے سو برس کی غلطی کو دور کریں گے اور ثابت کریں گے کہ ہندوستان کی عام زبان کا نام "ہندوستانی" ہی ہونا زیادہ موزوں ہے، اور یہ وہی زبان ہے جو عام طور سے ہم ہندوستانیوں کے بول چال میں ہے،

یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ اردو کا علمی نام ہندوستانی رکھنے کی تحریک آج کل کی زبانی کشمکش کا نتیجہ ہے، بلکہ عجیب اتفاق یہ ہے کہ اسی ناگ پور میں جس میں ساہتیہ پرشد نے اپنا مشہور فیصلہ سنایا۔ آج سے چھبیس برس پہلے ۱۹۱۱ء کی مسلم لیگ کے اجلاس میں عزیز مرزا مرحوم نے بعینہ یہی تحریک پیش کی تھی اور اس کے بعد ساہتیہ پرشد کے اجلاس سابق سے چند سال پہلے اسی یونیورسٹی کے یونین میں یہ تجویز دوبارہ پیش کی گئی تھی۔

یہ سمجھنا بھی درست نہیں کہ اس تجویز کے پیش کرنے والوں کا یہ مقصد ہے کہ ہم اپنی زبان میں کوئی ایسی تبدیلی کر لیں جس سے وہ ہندی یا ہندی کے قریب بن جائے، حاشا و کلا اس قسم کی کوئی بات نہیں ہے، بلکہ بعینہ اسی اردو اسی زبان اسی بول چال کو جو ہم بولتے ہیں، ہم ہندوستانی کہتے ہیں۔

ہم کو اس سے بھی اختلاف نہیں کہ اس زبان کا گھریلو نام اردو باقی رہے، لیکن عمومی طور پر اس کے پرانے نام ہندوستانی ہی کو رواج دیا جائے۔ ہمارے بزرگوں نے اس زبان کو دو قسموں میں تقسیم کیا تھا، ایک کا نام ریختہ جو غزل کی زبان تھی، اور دوسرے کا نام ہندی بتایا تھا، جو عام بول چال کی زبان تھی، ہندی کا لفظ چھن گیا، اب جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ اس کے پرانے نام ہندی کی جگہ اس کے دوسرے پرانے نام ہندوستانی کو رواج دیجئے، خواہ اپنی غزلوں کا نام ریختہ کی جگہ اردو ہی رکھئے

اس میں کچھ ہرج نہیں، مگر اپنی ملی تعلیمی، وطنی اور سیاسی تحریکات میں عام طور سے اس کو ہندوستانی کے صحیح نام سے یاد کر کے ثابت کیجئے کہ یہ پورے ملک ہندوستان کی زبان ہے، اور اس کا یہی نام اس کے پورے ملک کی زبان ہونے کی دلیل ہے،

ہم اس فریب میں مبتلا نہیں ہیں کہ اس صحیح نام ہندوستانی کے رواج دے دینے سے ہماری زبان کی ساری مشکلیں ختم ہو جائیں گی، گویا یہ نام کوئی جادو کی چھڑی ہے جس کے گھماتے ہی ساری بلائیں دور ہو جائیں گی بلکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آج جب ہم اپنی زبان کی اصلی پوزیشن کو دنیا پر واضح کرنے اور اس کے ہمہ گیر تخیل کو ثابت کرنے، اور اس کو سارے ملک کی زبان بنانے کا تہیہ کر رہے ہیں، تو ضرورت ہے کہ ہم سب سے پہلے اس کو اس کے اس نام سے روشناس کرائیں جس سے اس کی اصلی حیثیت واضح ہوتی ہے، اور پورے ملک کی اس کے اندر سمائی ہوتی ہے، اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعی اس پورے ملک کی زبان ہے، اور جو اس پورے ملک کی زبان بننے کی مدعی ہو اس کا یہی نام ہونا چاہئے۔

ہم کو امید ہے کہ اس زبان کے بہی خواہ اس تحریک کی تائید کریں گے، اور بحث و مناظرہ کے بجائے جو افسوس ہے کہ ہر مفید تحریک میں ہماری عادت ہو گئی ہے، عملاً اس کے رواج دینے کی کوشش کریں گے تاکہ اس کا جو نام صرف خواص کو معلوم ہے وہی عوام میں پھیل جائے۔

ابھی مولوی عبدالحق صاحب نے آپ کے سامنے جو صدارتی خطبہ پڑھا ہے اس میں انگریزی کے جتنے پرانے اقتباسات انہوں نے پیش کئے ہیں، آپ نے خیال کیا ہوگا کہ ان میں ہر جگہ اس زبان کا نام یورپ کے سیاحوں تاجروں کمپنی کے حاکموں اور لکھے پڑھے ہندوستانیوں کی زبان پر ہندوستانی ہی آیا ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ اس کا اصلی نام پہلے یہی مشہور و معروف تھا، جو اب عام طور سے متروک ہو رہا ہے ہمارا مقصد اسی غلطی کی اصلاح اور اسی مرے ہوئے نام کو دوبارہ چلانا ہے۔

سید سلیمان ندوی

غزل

دل مرا محوِ تماشائے جہاں ہونے کو ہے
اس پہ عریاں جلوۂ کون و مکاں ہونے کو ہے

ہو رہا ہے پھر نثارِ دوستِ تاجِ خسروی
حسن پھر اب جلوۂ برقِ تپاں ہونے کو ہے

بادۂ تندِ جوانی میں ہے پیدا انتشار
آرزو کے خوں سے رنگیں داستاں ہونے کو ہے

عاشقی میں مہرباں نامہرباں کا کیا سوال
مدعیٔ عشق تیرا امتحاں ہونے کو ہے

آج تک تو ضبطِ دل تھا پردہ دارِ رازِ عشق
آہ فرطِ درد سے وہ بھی عیاں ہونے کو ہے

کود نے کو دل ہے نارِ عشق میں دیوانہ وار
برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہونے کو ہے

وہ بھی کہتے ہیں کہ ہے رنگِ تغزل دلفریب
شاید اب مرغوب مرغوبِ جہاں ہونے کو ہے

نذیر احمد خاں مرغوب ایم اے

شاہدرہ میں ایک صبح

سوئی ہوئی لہروں پہ ہیں کرنوں کے سفینے
یا عرش کے سینے پہ ہیں چاندی کے خزینے

کیا رات کو غلمان نے جبریل کو چھیڑا
کلیوں سے ٹپکتے ہیں فرشتوں کے پسینے

جھونکے ہیں کہ حوروں کے پروں کی ہیں صدائیں
کرنیں ہیں کہ روحوں کے چمکتے ہوئے زینے

سبزہ ہے کہ فردوس کی مخمل کا بچھونا
گل ہیں کہ ثریا کی انگوٹھی کے نگینے

کھب جاتا ہے آنکھوں میں چنبیلی کا تبسم
اور دل میں سما جاتے ہیں ساون کے قرینے

ندی کے کنارے پہ چمکتے ہوئے پتھر
جنت کے حسینوں کے دمکتے ہوئے سینے

لہروں پہ ملائم سا تلاطم ہے نمایاں
بن بن کے بکھر جاتے ہیں بہتے ہوئے زینے

اک کیف سا بھر دیتے ہیں سوئے ہوئے دل میں
شرمائے ہوئے پھولوں کے دھوئے ہوئے سینے

یہ ریت کے ذرے ہیں کہ الماس کے ٹکڑے
گیتی نے اگل ڈالے ہیں قاروں کے دفینے

یہ تیتریاں تیرتی پھرتی ہیں ہوا میں
یا عرش سے اترے ہیں زمرد کے سفینے

بادل ہیں کہ پھر جھومتی آتی ہے جوانی
مے خانے کو جنت سے انڈیلا ہے کسی نے

اے دوست، یہ بہکے ہوئے، بدمست نظارے
اک بے سروساماں کو دیتے نہیں جینے

احمد ندیم قاسمی بی اے

کائنات میں تنظیم اور مادے کی حقیقت

کائنات کے طول و عرض میں انتہائی تنظیم اور ہم آہنگی ہے۔ یہ دونوں بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی اشیا میں یکساں طور پر جاری و ساری ہے۔

~~~~~~~~

علم ہیئت کے حقائق ثابتہ کا تھوڑا سا علم بھی ایک ایسی کائنات کا منظر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جس میں بے شمار ستارے اپنی حیرت انگیز تعداد اور اقسام میں جھلملا رہے ہیں۔ بعض ستارے ہمارے آفتاب کی طرح "اوسطی" قد و قامت کے ہیں، بعض چھوٹے لیکن کئی اتنے عظیم الہیئت ہیں کہ ان کی پیمائش کے اعداد انسانی دماغ کو چکرا دینے کے لئے کافی ہیں۔ مثلاً البط الجوزا ہمارے آفتاب سے ۲۵۰۰۰۰۰۰ (دو کروڑ پچاس لاکھ) گنا بڑا ہے۔ اگر یہ ستارہ ہمارے آفتاب کی جگہ پر ہو تو اس کے کنارے مریخ تک جا پہنچیں اور ہماری زمین اور اس کا محور اس عظیم الجسامت آفتاب کے اندر یکسر غائب ہو جائیں۔

فضا کی دوسری قندیلیں جنہیں ہم قائم ستاروں کا نام دیتے ہیں اور جو ہمیں ایک دوسرے سے ملے ہوئے نظر آتے ہیں، درحقیقت فضائے آسمانی میں ۷۰۰ میل فی منٹ کی رفتار سے دوڑ رہے ہیں۔ لیکن اپنی دوری کی وجہ سے ہمیں ایک ہی جگہ پر قائم دکھائی دیتے ہیں۔ بعض ستارے فضا کی گہرائیوں میں گچھوں کی صورت میں نظر آتے ہیں اور ہم انہیں "جزائری کائناتوں" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ ایک ایک کائنات نہیں بلکہ کئی کئی کائناتوں کا مجموعہ ہیں۔ اس کے علاوہ بعض ستارے فضا میں اتنی عمیق گہرائیوں میں ہیں کہ ان کی روشنی جو ۱۸۶۰۰۰ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کر رہی ہے ہم تک پہنچنے میں کروڑوں سال لیتی ہے۔ اسی فضا کے بُعد میں چمکدار گیس کے "آتشیں بادل" ہیں جو حقیقت میں ستاروں کے جھنڈ کے جھنڈ ہیں اور بعض کے نزدیک دوسرے تمام ستاروں کے آباؤ اجداد یہی ہیں۔ طاقت کی اس مقدار کا اندازہ لگائیے جو یہ اجسام اشعاع (RADIATION) کے ذریعے سے خرچ کر رہے ہیں۔ صرف ہمارا آفتاب اپنے جسم کو ۴۰۰۰۰۰۰ (چالیس لاکھ) ٹن فی سیکنڈ کے حساب سے اشعاع کے ذریعے سے خرچ کر رہا ہے لیکن اس کی جسامت اتنی زیادہ ہے کہ اس اسراف کے باوجود ہم اس کے قد و قامت میں کسی قسم کی کمی محسوس نہیں کرتے۔

مہندسین نے نہ صرف خلا کی گہرائیوں کو ناپا ہے اور ان طاقتوں کو جانچا ہے جن سے یہ آفتاب قائم ہیں بلکہ اپنی گز کی لکڑی لے کر فضائے آسمانی کی پیمائش پر تل گئے ہیں۔ اُن کے نتائج بدرجہ غایت دلچسپ اور حیران کر دینے والے ہیں۔ چنانچہ اضافیت کے نئے نظریے کے مطابق یہ کائنات جسے ہم ہر پہلو سے غیر محدود تصور کرتے چلے آتے ہیں حقیقت میں ہر سمت سے محدود ثابت ہوتی ہے۔ نہ صرف فاصلے میں بلکہ وقت میں بھی وہ ثبوت جن سے ہم ان نتائج پر پہنچے ہیں نہایت مشکل اور دقیق ہیں، اور اس کی دلائل ہمارے روزمرہ کے تجربات سے بلند تر ہیں۔

اس نظریے کے مطابق ہمیں فاصلے کے چار بعد بتلائے جاتے ہیں جو طول، عرض، بلندی اور وقت پر مشتمل ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہمارا تصور اس چار بُعد والی کائنات کی تصویر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ ہمارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ صرف انہی دلائل کی مدد سے ہم کائنات کی بظاہر بے ربط اشیا کے اس ہیولے کو اپنی اپنی جگہ پر مربوط کر سکتے ہیں۔

ان تاروں بھرے آسمان، ان عظیم الہیئت آفتابوں اور ان حسین کہکشاں کے منظر کی بنیادی خصوصیت تنظیم اور باقاعدگی ہے۔

نظام شمسی کا ہر ستارہ، جن میں ہماری زمین بھی شامل ہے ایک
~~~~~~~~

مقررہ رفتار کے ساتھ ایک مقررہ خط کے اندر اپنے بوجھ کو یکساں رکھے ہوئے آفتاب کے گرد گھوم رہا ہے۔ اگر کسی ستارے کے توازن میں ایک ذرے کے برابر بھی فرق آ جائے تو ایک لمحے میں ہر چیز خلا میں اِدھر اُدھر بکھر کے رہ جائے۔ اس تمام نظام کو ان کا درمیانی ستارہ یعنی آفتاب منضبط کئے ہوئے ہے۔

ایک خاص طاقت کے ذریعے سے جسے کشش ثقل کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو موجودہ نظریۂ اضافت کے رُو سے اب کسی اور نام سے پکاری جاتی ہے۔ ستاروں کا مقررہ راستہ اور ان کا درمیانی کرے کے گرد گردش کرنا قائم رہتا ہے۔

بعض ستاروں — خصوصاً مشتری، زحل اور زمین کے گرد چھوٹے ستارے یعنی ان کے نائبین گردش کرتے ہیں۔ چاند جو ہماری زمین پر مد و جزر کی صورت میں اثر انداز ہوتا ہے انہیں نائبین میں سے ہے۔ کائنات کی جس چیز کی طرف بھی ہم نظر اٹھا کر دیکھیں گے ہمیں تنظیم اور باقاعدگی بدرجۂ غایت دکھائی دے گی۔ ہر بڑے سے بڑا نظام اپنے سفر کے دوران میں کسی نہ کسی ہمسایہ نظام کو منسلک کئے ہوئے ہے اور یہ عمل ایک بے مثال باقاعدگی سے جاری ہے۔

اب انتہائی بڑی چیزوں کو چھوڑ کر انتہائی چھوٹی چیزوں پر غور کیجئے تو یہاں بھی آپ کو تنظیم و توازن کا وہی دستور العمل جاری دکھائی دے گا۔

کیمیادان ہر مادی شے کو کسی نہ کسی عنصر سے موسوم کرتا ہے یا چند عناصر کا مرکب بتاتا ہے۔ عناصر کی تعداد ۹۰ کے قریب پائی جاتی ہے۔ ہر عنصر یا مرکب چند سالموں یا جوہروں کے مجموعوں پر مشتمل ہوتا ہے کیونکہ جوہر تنہا یا آزاد نہیں رہ سکتا بلکہ چند اور جوہروں سے منسلک یا پیوست ہو کر "قیام" کی اہلیت پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ پانی کا ایک سالمہ جو بطور خود قائم رہ سکتا ہے دو عناصر سے مرکب ہوتا ہے جس میں دو جوہر آکسیجن کے اور ایک ہائیڈروجن کا ہوتا ہے۔

چند سال ہی گذرے ہیں کہ جوہر کو مادے کا جزو لایتجزا سمجھا جاتا تھا اس کا تجزیہ کرنے کی کوئی کوشش بھی کامیاب نہ ہوتی تھی اور اس ابتدائی اینٹ سے تعبیر کیا جاتا تھا جس سے تمام اجسام کی تعمیر ہوئی ہے۔ گذشتہ صدی کے آخر تک انسان کا علم اس سے آگے نہ بڑھا تھا لیکن یکایک ایک نئے انکشاف نے جوہر کے متعلق پچھلے تمام نظریوں کو باطل کر دیا۔ اب معلوم ہوا کہ جوہر جزو لایتجزا نہیں بلکہ یہ خود چند اجزا سے مرکب ہے جنہیں برقیوں کا نام تفویض کیا گیا ہے۔ ہر جوہر ایک یا اس سے زیادہ برقیوں پر مشتمل ہوتا ہے جو منفی برق کے حامل ہوتے ہیں اور ایک صدر (NUCLEUS) کے گرد گھومتے ہیں جس میں مثبت برق کی مساوی مقدار ہوتی ہے۔ یا یوں کہئے کہ جوہر دراصل نظام شمسی کا ایک ننھا سا نمونہ ہے۔ صدر کی بناوٹ نہایت پیچیدہ ہوتی ہے سوائے ہائیڈروجن کے صدر کے جو مثبت برق کے حامل صرف ایک کرے پر مشتمل ہوتا ہے، اسے پروٹون کہتے ہیں۔ ہائیڈروجن کے جوہر میں صدر کی جگہ صرف ایک پروٹون ہوتا ہے اور ایک برقیہ گردش کرتا ہے لیکن باقی عناصر میں چار یا اس سے زیادہ پروٹون صدر ہوتے ہیں اور بعض مختلف تعداد میں ان سے منسلک ہوتے ہیں اور گردش کرنے والے برقیوں کے محتاج نہیں ہوتے۔

دوسرے عناصر کے جوہروں میں نہ صرف صدر کی بناوٹ ہی پیچیدہ ہوتی ہے بلکہ گردش کرنے والے برقیوں کی تعداد بھی کسی قطعی قاعدے کے ماتحت کم یا زیادہ ہوتی ہے۔ اسی فرق کو مدنظر رکھتے ہوئے تمام عناصر کی ایک فہرست بنائی گئی ہے جس سے ثابت ہوا ہے کہ عناصر کا آپس میں فرق صرف برقیوں اور پروٹونوں کی کمی بیشی اور ان کی گوناگوں تقسیم اور ان کے مدار پر منحصر ہے۔

یہ بات تجربے میں آ چکی ہے کہ ایک عنصر دوسرے عنصر میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ یورینیم (URANIUM) اشعاع دے دے کر آخر کار جست کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ جست کو سونے کی صورت میں تبدیل کرنے کا خواب جو قدیم زمانے سے ہوس دیکھتے چلے آئے ہیں آخر کار اتنا مضحکہ خیز نہیں ہے جتنا کہ خیال کیا جاتا تھا۔

ان نوے عناصر کی فہرست میں جوں جوں ہم اوپر کی طرف نظر ڈالتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ جوہر اپنے مختلف مدارج میں بدلتا چلا جاتا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ سالمے کے بنانے میں ایک جوہر کا دوسرے کے ساتھ تعلق مختلف مدارج میں مختلف ہوتا چلا جاتا ہے — یہ اختلاف بے قاعدہ اور علی الحساب نہیں ہوتا بلکہ ایک خاص قاعدے اور ترتیب کے ماتحت عمل میں آتا ہے۔

یہ سالمے اور جوہر، پروٹون اور برقئے ایک ڈھیر کی صورت میں پھینکے ہوئے نہیں ہیں بلکہ سادہ ترین اجزا سے لے کر محیر العقول پیچیدگی کے مظاہر تک ہر چیز ایک ہی ضابطے اور قانون کی پابند ہے اور جس طرح عظیم ترین موجودات میں ایک نظام عمل جاری ہے۔ اسی طرح حقیر ترین اشیا

میں بھی وہی باقاعدگی اور ترتیب نظر آتی ہے۔

آئیے اب ہم مضمون زیر بحث سے ذرا تجاوز کرکے جوہر کا تجزیہ اس کے آخری معلومہ اجزا تک کریں اس کے نتائج ذیل میں ظاہر ہوں گے۔

اب تک جو کچھ ہمیں جوہر کے اجزا کے متعلق معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اس کا ایک جزو تو سالمہ ہے اور دوسرے وہ برقیے جو اس کے گرد گردش کرتے ہیں اور یہ سارا نظام ایک خاص سطح (SPACE) میں محدود ہے۔ ان برقی ذروں کی اگر مزید تحقیقات کی جائے تو ایک نئی اور حیران کن حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ یہ برقیے اور پروٹون حقیقت میں "ذرے" نہیں ہیں جیسا کہ بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ منفی اور مثبت برق کی "امواج" ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ بعض دفعہ تو وہ ذرے معلوم ہوتے ہیں اور بعض اوقات امواج کا شبہ ہوتا ہے۔ اسی لئے پروفیسر ایڈنگٹن نے ان کا نام "موج ذرے" (WAVICLES) تجویز کیا ہے جس سے ان کے دوگونہ صفات کا پتہ چلتا ہے۔ یہ ذرے یا امواج، جو کچھ بھی یہ ہیں، نہایت پر اسرار اور عجیب و غریب شے ہیں۔ ہمیں یہ تو معلوم نہیں کہ وہ کیا ہیں اور شاید ہمیں کبھی اس کا علم نہ ہو سکے لیکن ہم ان کی عادات کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ عام طریقوں سے ان کی کوئی توضیح نہیں کی جا سکتی اور نہ ان کے لئے کوئی مثال دی جا سکتی ہے اور بالآخر ان کے اظہار کے لئے نہایت پیچیدہ اور معموں کی طرح کی چند ہندسی علامات وضع کرنی پڑی ہیں۔

اس تمام بیان کا ملخص یہ ہے کہ انہیں اجزائے برق کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اب بتائیے کہ مادے کا وجود کہاں رہا۔ کیا وہ بالکل غائب نہیں ہو گیا؟

ان تمام تجربات اور تحقیقات سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مادہ بذات خود بالکل ناقابل توجہ شے رہ جاتا ہے۔ مادے کی حیثیت سے اب اس کا کوئی وجود نہیں اور آئندہ اسے برقی امواج سمجھنا چاہئے۔

منطقی نقطۂ نظر سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر عنصر، ہر مرکب، ہر پودہ، ہر حیوان اور انسان چونکہ مختلف عناصر اور ان کے مرکبات کے علاوہ اور کسی چیز کی مدد سے نہیں بنا اس لئے ان کا وجود سوائے برقی امواج یا برقی ذروں کے اور کچھ نہیں ہے۔ یعنی

"اس شے سے ہم بنے ہیں جس سے بنی ہیں خوابیں"

عبدالعزیز خاں

غزل

کسی مستِ شباب کی دنیا
ایسی ہے، جیسے خواب کی دنیا

ہائے ظالم کی مست آنکھوں میں
بس رہی ہے شراب کی دنیا

حُسن اس شوخ کا، خدا کی پناہ
ہے مہ و آفتاب کی دنیا

چین دم بھر، اسے نصیب نہیں
دل ہے، یا انقلاب کی دنیا!

محوِ غفلت ہے کائنات تمام
ساری دنیا ہے خواب کی دنیا

موت میں دو جہاں کی راحت ہے
زندگی ہے عذاب کی دنیا

حرصِ دنیا میں پھنس کے اے امجد
تو نے اپنی خراب کی دنیا!

امجد حیدرآبادی

دریا

دریا ہے کہ دیوانۂ آتش تہ پا ہے
خود قافلۂ شوق خود آوازِ درا ہے!

شوریدہ و سرمست ہے سرگرمِ سفر ہے
کچھ شام کی پروا ہے، نہ پروائے سحر ہے

اس شور میں بھی نغمے کا انداز ہے پیدا
بے زخمہ و بے تار عجب ساز ہے پیدا

جاری سحر و شام ہے اک نغمۂ مستی
یہ نغمۂ مستی ہے کہ ہنگامۂ ہستی!

کس عالمِ پر کیف میں منزل کو رواں ہے
گرمِ تگ و دو، رقص کناں زمزمہ خواں ہے

اک نعرۂ مردانہ ہے یہ نغمہ نہیں ہے
اک شورشِ مستانہ ہے یہ نغمہ نہیں ہے

افسردہ دلوں کے لئے پیغامِ بقا ہے
درماندہ مسافر کے لئے بانگِ درا ہے

ہو شوق تو مشکل کوئی مشکل نہیں رہتی
رہرو کے لئے سختی منزل نہیں رہتی،

آثر صہبائی



اجنبی

"تاریکی میں سے نکل کر یکایک ایک آدمی ہمارے آگ کے الاؤ کے پاس روشنی کے چھوٹے سے حلقے کے اندر ایک ٹیلے پر آن بیٹھا اور نہایت کرخت لہجے میں بولا "اس علاقے میں آنے والے تم پہلے آدمی نہیں ہو"

ہم میں سے کسی شخص نے اس کے بیان کو جھٹلانے کی جرأت نہ کی کیونکہ اس کا اپنا وجود اس کے دعوے کی دلیل تھا۔ وہ ہمارے ساتھیوں میں سے نہ تھا اور بہت ممکن ہے کہ جب ہم اپنا ڈیرہ لگا رہے تھے تو وہ یہیں کہیں نزدیک ہی موجود ہو۔ اس کے علاوہ اس کے ساتھی بھی کہیں دور نہ ہوں گے کیونکہ اس علاقے میں کسی اکیلے دکیلے شخص کا تن تنہا رہنا یا سفر کرنا بالکل ناممکن تھا۔ قریباً ایک ہفتے سے ہم ایسی سرزمین میں سے گزر رہے تھے جہاں اپنے اور اپنے جانوروں کے علاوہ ہمیں صرف سانپ اور زہریلے مینڈک ہی نظر آتے رہے۔ روسی ترکستان کے اس دشوار گذار علاقے میں انسان صرف ایسے ساتھیوں کی معیت میں زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا بلکہ اس کے ساتھ باربرداری کے جانور، اسباب خورونوش ہتھیار اور اسی قسم کا مکمل سامان ہونا ضروری ہے اور جب یہ تمام چیزیں ہوں تو اس کے ساتھ مددگاروں کا ہونا بھی لازمی ہے۔ اس اندیشے نے کہ معلوم نہیں اس اجنبی کے ہمراہی کس قماش کے لوگ ہوں گے اور پھر اس کے ساتھ ہی اس کے مبارزت طلبانہ لہجے نے ہم چھیوں کو اٹھا کر بٹھا دیا اور ہر ایک نے اپنے اپنے ہتھیار کو گرفت میں لے لیا۔ ہمارا یہ طرزِ عمل اُس وقت اور موقع کے پیشِ نظر حادثات کی پیش بندی کے طور پر غیر موزوں بھی نہ تھا لیکن اجنبی نے اس کی پرواہ تک نہ کی اور اسی کرخت لہجے میں جس میں اس نے پہلا فقرہ ادا کیا تھا اپنے سلسلۂ کلام کو یوں جاری رکھا:۔

"تیس سال ہوئے اسلم، کریم، فضل اور اکبر سرحد افغانستان کے چار پہاڑی بہادر کافی سازوسامان کے ساتھ تمام انسانی آبادیوں سے گذر کر آگے بڑھ گئے۔ ہم سونے کی تلاش میں آئے تھے اور ہمارا خیال تھا کہ اگر ہماری کوششیں کامیاب نہ ہوئیں تو ہم اس غیر آباد علاقے کو عبور کر کے پار نکل جائیں گے جہاں ہمارے خیال میں روسی حکومت کی آبادیاں شروع ہوتی تھیں۔ ہمارا ساز و سامان تو کافی تھا لیکن ہمارے ساتھ کوئی راہبر نہ تھا۔ صرف اسلم، کریم، فضل اور اکبر چار ہی تھے"!

وہ شخص ان ناموں کو آہستہ آہستہ اور صاف آواز کے ساتھ یوں دہراتا تھا جیسے اپنے سامعین کو ذہن نشین کرانا چاہتا ہو۔ ہم میں سے ہر شخص نہایت توجہ سے اس کی باتیں سُن رہا تھا۔ اس کے سطحی طرزِ عمل نے اب وہ خطرہ تو دور کر دیا تھا جس کا اندیشہ ہمیں اس کی ذات سے تھا۔ لیکن تاریکی کی اس دیوار کے پیچھے جو ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی اس کے چھپے ہوئے نامعلوم ساتھیوں کی طرف سے ہم ابھی تک چوکنے تھے۔ اُس کا اپنا طرزِ عمل دشمنی کے بجائے دیوانگی کے زیادہ قریب تھا۔ ہم لوگ تجربے سے جانتے تھے کہ آبادیوں میں رہنے والے ان ویران علاقوں میں رہ کر ایسی عادات واطوار اختیار کر لیتے ہیں جن کا دیوانگی سے امتیاز کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ انسان کی مثال ایک درخت کی سی ہے جو اپنے ساتھیوں کے درمیان سیدھا اور تنا ورکھڑا رہتا ہے لیکن اگر اسے ہمجنسوں سے دور کسی کھلے میدان میں لگا دیا جائے تو اس میں سیکڑوں قسم کے خم پیدا ہو جاتے ہیں آگ کی تیز روشنی سے آنکھوں کو بچانے کے لئے اپنی چھجے دار ٹوپی کو آگے کی طرف جھکاتے ہوئے کچھ اس قسم کے خیالات میرے دماغ میں چکر لگا رہے تھے۔ بے شک بے چارہ سیدھا سادا سا آدمی ہے لیکن اس ویران اور صحرائی مقام میں یہ کیا کر رہا ہے؟

چونکہ اس سکوت کو کسی نے نہ توڑا اس لئے اجنبی پھر گویا ہوا:۔

"اس زمانے میں یہ علاقہ آج کی طرح نہیں تھا۔ جھاڑیوں کا نام و نشان نہ تھا۔ پہاڑیوں میں کہیں کہیں شکار بھی مل جاتا تھا اور بعض آبی گڑھوں کے گرد گھاس بھی اُگا ہوا تھا جن پر ہمارے جانور کس حد تک گذارا کر کے فاقہ کشی کی موت سے بچے ہوئے تھے۔ اگر ہماری خوش قسمتی ہمیں وحشی لٹیروں سے بچائے رکھتی تو شاید ہم اس ویران حصہ سے گزر کر آبادی میں پہنچ جاتے

لیکن ہوا یہ کہ ایک ہی ہفتے کے دوران میں بجائے دولت کے انبار لگنے کے ہمیں اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ ہم اتنا آگے نکل گئے تھے کہ واپسی کے خیال میں کوئی کشش باقی نہ رہی تھی کیونکہ جن مصائب میں سے گزر کر ہم یہاں تک پہنچے تھے ان سے بدتر مصائب کا تصور ہی نہ ہو سکتا تھا۔

چنانچہ راتوں کی تاریکی میں وحشیوں کی نظروں سے حتی الامکان چھپتے ہوئے ہم آگے ہی بڑھتے گئے۔ بعض اوقات ہمارا کھانا اور پانی بالکل ختم ہو جاتا اور ہم کئی کئی دنوں تک بھوکے اور پیاسے سفر کرتے رہتے لیکن یکایک کوئی چشمہ یا پانی کا گڑھا مل جاتا جس سے ہمارے ہوش و حواس پھر درست ہو جاتے اور ہم ان جنگلی جانوروں کا شکار کرنے کے قابل ہو جاتے جو شاید موت کے متلاشی ہوتے تھے۔ ہمارا شکار کبھی ریچھ ہوتا کبھی بارہ سنگا اور کبھی بھیڑیا یا لومڑی یا چیتا۔ غرضکہ جو کچھ بھی خدا ہمیں کھانے کے لئے بھیج دیتا ہم صبر و شکر کے ساتھ قبول کر لیتے تھے۔

"ایک روز علی الصبح ہم ایک طویل پہاڑی سلسلے کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے کہ شاید اسے عبور کرنے کے لئے کوئی درہ مل جائے یہ مقام اس جگہ سے نزدیک ہی ہے کہ ناگہاں وحشیوں کی ایک ٹولی نے ہم پر حملہ کر دیا یہ لوگ پچھلی وادی سے ہمارا تعاقب کرتے چلے آ رہے تھے۔ وحشی چونکہ ہماری تعداد سے دس گنا زیادہ تھے اس لئے انہوں نے چھپ کر حملہ کرنے کے بجائے اپنی عادت کے خلاف کھلم کھلا چیختے چلاتے ہوئے اور گولیاں سر کرتے ہوئے ہم پر گھوڑے دوڑا دیئے۔ ہمارے لئے ان کے ساتھ نبرد آزما ہونا جنون سے کم نہ تھا۔ ہم اپنے مریل جانوروں کو جہاں تک قدم رکھنے کی جگہ تھی گھاٹی پر چڑھائے گئے اور پھر گھوڑوں سے اتر کر ایک ٹیلے کی اوٹ میں ہو گئے اور اپنے تمام سامان کو دشمنوں کے رحم پر چھوڑ دیا۔ لیکن ہم نے اپنی بندوقیں نہ چھوڑیں۔ اسلم، کریم، فضل اور اکبر چاروں کے پاس بندوقیں موجود تھیں"۔

یکایک ہمارا ایک مسخرہ ساتھی بول اٹھا "وہی پرانی فوج" لیکن ہمارے سردار کے ناپسندیدگی کے اظہار نے اسے فوراً خاموش کر دیا اور اجنبی نے اپنے قصے کو پھر جاری کر دیا۔

"وحشی بھی گھوڑوں سے اتر پڑے اور گھاٹی پر اس جگہ سے بھی اوپر آ گئے جہاں ہم اترتے تھے اور ہمارے بھاگ نکلنے کا جو راستہ باقی رہ گیا تھا وہ بھی مسدود کر دیا۔ چنانچہ ہم اور اوپر چڑھ گئے۔ بدقسمتی سے جو ٹیلہ ہمیں پناہ دیئے ہوئے تھا یہاں آ کر ختم ہو گیا اور اس کی اوٹ سے ظاہر ہوتے ہی ہم پر بارہ گولیوں کی باڑھ پڑی۔ وحشی قبائل جلدی میں صحیح نشانہ نہیں لگا سکتے چنانچہ خدا نے ہم سب کو بچا لیا۔ ہمارے مقام سے بیس گز کی بلندی پر ٹیلے کی چوٹی سے پرے دو عمودی چٹانیں تھیں جن کے درمیان ایک تنگ سا غار نظر آ رہا تھا۔ ہم لپٹتے ہوئے اس کی طرف دوڑے اور دیکھا کہ وہ ایک چھوٹے سے کمرے کے برابر ہے۔ کچھ عرصے تک ہم یہاں محفوظ تھے۔ اور ہمارا صرف ایک آدمی اپنی بندوق سے اس علاقے کے تمام وحشیوں کو روک سکتا تھا لیکن بھوک اور پیاس کے مقابلے کا ہمارے پاس کوئی علاج نہ تھا۔ جرات و ہمت ابھی تک موجود تھی لیکن امید ایک خیال ہو گئی تھی۔

اس کے بعد ان وحشیوں میں سے ایک کی شکل بھی ہمیں نظر نہ آئی لیکن ان کی آگ کی چمک اور دھوئیں کی موجودگی ہمیں بتلا رہی تھی کہ وہ دن رات اپنی بندوقیں بھرے تیار رہتے ہیں اور ہمیں یقین تھا کہ اگر ہم میں سے ایک بھی باہر نکلا تو قبل اس کے کہ تین قدم بھی چلے وہ گولیوں سے چھلنی ہو جائے گا۔ تین دن تک ہم باری باری سے پہرہ دیتے ہوئے اپنے محاصرین سے محفوظ رہے لیکن اب ہماری تکالیف ناقابل برداشت ہو چکی تھیں۔ پھر چوتھے دن کی صبح کو اسلم بولا "بھائیو میں خدا پر ایمان نہیں رکھتا اور نہ مجھے معلوم ہے کہ اسے خوش کرنے کے لئے کیا کرنا چاہئے میں نے اپنی زندگی مذہب سے بیگانہ رہ کر گزاری ہے۔ بھائیو مجھے معاف کرنا کیونکہ میرے لئے وقت آ گیا ہے کہ میں وحشیوں کی آرزوؤں کو پامال کر دوں"

"وہ غار کے سنگیں فرش پر دو زانو ہو کر بیٹھ گیا اور "اماں اسلم کی روح آ رہی ہے" کہتے ہوئے پستول کی گولی اپنی کنپٹی میں مار کر ہلاک ہو گیا اور کریم فضل اور اکبر باقی رہ گئے۔

میں ان کا سردار تھا اس لئے مجھے اس موقع پر کچھ کہنا چاہئے تھا۔ چنانچہ میں نے کہا:۔ اسلم ایک دلیر انسان تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کب اور کس طرح مرنا چاہئے۔ واقعی بھوک اور پیاس سے مرنا یا وحشیوں کی گولیوں کا شکار ہونا یا گرفتار ہو کر زندہ کھال اتروانا بے وقوفی اور بدذوقی کی دلیل ہے آؤ ہم بھی اسلم سے جا ملیں۔

"میں تائید کرتا ہوں" کریم بولا

"میں بھی متفق ہوں" فضل نے کہا

"میں نے اسلم کی لاش کو لٹا دیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کر دیئے اور اس کے منہ کو رومال سے ڈھک دیا۔ پھر کریم بولا کہ میں بھی چاہتا ہوں کہ مر کر اسی طرح نظر آؤں اور فضل بولا کم از کم کچھ دیر کے لئے میں بھی اسی طرح رہنا

چاہتا ہوں۔

میں نے کہا ایسا ہی ہوگا اور ان وحشی کتوں کو ہماری لاشیں قبضے میں کرنے کے لئے کم از کم ایک ہفتہ اور انتظار کرنا پڑے گا۔ کریم! اور فضل! اپنے ہتھیار نکالو اور دوزانو ہو جاؤ۔

انہوں نے تعمیل کی اور میں ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"اے غفور و رحیم خدا" میں نے کہا

"اے غفور و رحیم خدا" کریم نے کہا

"اے غفور رحیم خدا" فضل نے دہرایا

"ہمارے گناہوں کو معاف کر دے" میں نے کہا

"ہمارے گناہوں کو معاف کر دے" انہوں نے دہرایا

"اور ہماری روحوں کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لے"

"اور ہماری روحوں کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لے"

"آمین"

"آمین"

چنانچہ میں نے ان کی لاشوں کو بھی اسلم کے پہلو میں لٹا دیا اور ان کے چہروں پر رومال ڈال دئے۔"

یکایک ہمارے آگ کے الاؤ کے پرلی طرف ایک شور سا اٹھا اور ہمارا ایک ساتھی ہاتھ میں پستول لئے ہوئے لپکا "اور تم... تم جان بچا کر نکل بھاگے! ان کو مار کر تم زندہ بچ نکلے! بزدل کمینے، کتے!!! میں تمہیں بھی ان کے پیچھے بھیج کے رہوں گا خواہ مجھے اس کے بدلے میں تختہ دار پر کھڑا ہونا پڑے۔"

لیکن ہمارا کپتان چیتے کی طرح جھپٹ کر حملہ آور پر جا گرا اور اس کے پستول والے ہاتھ کو اپنی آہنی گرفت میں لے کر بولا "صبر کرو اختر! صبر کرو!"

ہم سب کھڑے ہو گئے تھے لیکن اجنبی بے حس و حرکت اور نہایت بے اعتنائی کے ساتھ اس طرح اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ کسی نے اختر کا بازو پکڑ کر پرے گھسیٹ لیا۔

میں نے کہا "کپتان، اس تمام معاملے میں کچھ غلطی ضرور ہے یہ شخص یا تو دیوانہ ہے یا جھوٹا ہے ـــ ایسا جھوٹا جیسے ہمیں روزمرہ کی زندگی میں ملتے رہتے ہیں اور اختر اس کے قتل کرنے میں کسی طرح بھی حق بجانب نہیں ہے۔ اگر یہ شخص انہیں لوگوں کا ساتھی ہوتا تو وہ پانچ ہوتے اور بہت ممکن ہے کہ اس نے دیدہ دانستہ پانچویں کا نام نہیں لیا یعنی اپنا"

"ہاں" کپتان نے کہا اور اختر کا بازو چھوڑ دیا "اس میں کچھ راز ضرور ہے کوئی غیر معمولی بات ہے کئی سال کا ذکر ہے اس غار کے منہ پر چار آدمیوں کی لاشیں ملی تھیں۔ ان کی کھوپریاں چور چور ہو رہی تھیں اور نہایت خطرناک طریقے پر ان کے اعضا کی قطع و برید ہو رہی تھی۔ انہیں وہیں دفن کر دیا گیا تھا میں نے ان کی قبریں بھی دیکھی تھیں اور کل تم سب کو دکھاؤں گا۔"

اجنبی کھڑا ہو گیا۔ الاؤ کی بجھتی ہوئی آگ کی ہلکی ہلکی روشنی میں وہ اور بھی لمبا نظر آ رہا تھا۔ اس کی کہانی سننے میں ہم اس طرح محو تھے کہ الاؤ پر لکڑیاں ڈالنا بھی بھول گئے تھے۔

اجنبی پھر بولا "وہ چار تھے ـــ اسلم، کریم، فضل اور اکبر"

ناموں کو آخری مرتبہ پکار کر وہ تاریکی کی طرف چل پڑا اور پھر ہم نے اسے کبھی نہ دیکھا۔

اُسی وقت ہمارا ایک ساتھی جو پہرہ پر کھڑا تھا ہاتھ میں بندوق تھامے ہوئے کچھ مضطربانہ انداز میں بھاگتا ہوا آیا۔ اور بولا:۔

"کپتان صاحب! میں آدھے گھنٹے سے اُن جھاڑیوں کے پاس تین آدمیوں کو کھڑے ہوئے دیکھتا رہا ہوں" اس نے اس سمت کی طرف اشارہ کیا جس طرف اجنبی گیا تھا۔ "وہ مجھے بالکل صاف نظر آ رہے تھے۔ کیونکہ چاند پوری تابانی سے چمک رہا ہے۔ ان کے پاس کوئی بندوق نہ تھی اور میں نے انہیں اپنی بندوق کے نشانے پر لے رکھا تھا اور منتظر تھا کہ وہ کوئی حرکت کریں تو میں اپنا کام کروں ـــ لیکن انہوں نے حرکت ہی نہیں کی۔ لیکن کپتان صاحب عجیب بات یہ ہے کہ ان کی طرف دیکھ دیکھ کر میرے اعصاب کا کچومر نکل گیا ہے اور اب وہ نظر نہیں آتے۔" "اپنے پہرے پر واپس جاؤ اور اس وقت تک کھڑے رہو جب تک وہ تمہیں دوبارہ نظر نہ آئیں" کپتان نے تحکمانہ لہجے میں کہا "اور تم سب دوبارہ لیٹ جاؤ ورنہ میں سب کو آگ میں دھکیل دوں گا۔"

پہرہ دار بڑبڑاتا ہوا اپنی چوکی پر جا پہنچا اور پھر واپس نہ آیا۔ ہم اپنے کمبل درست کر رہے تھے کہ آتش مزاج اختر بولا "خطا معاف ہو، کپتان! لیکن وہ شیطان تھے کون؟"

"اسلم، کریم اور فضل"

"لیکن اکبر کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ اسے قتل کر دینا ہی مناسب تھا۔"

"بے فائدہ، کیونکہ جتنا وہ مر چکا ہے اس سے زیادہ تم اسے نہیں مار سکتے۔ اب سو جاؤ!"

(ترجمہ)

مظفر احمد

طیّارہ

ذرا دیکھ اے صاحبِ سوز و ساز ہوا میں ہے پرّاں ہوائی جہاز

یہ افلاک پیما ہے سیّارہ ہے یہ پہنائے گردوں کا طیّارہ ہے

یہ شہزادۂ ملکِ افلاک ہے ہوا کے سمندر کا تیراک ہے

فرشتہ ہے شہرِ ثریّا کا یہ پیمبر ہے تاروں کی دنیا کا یہ

فضاؤں میں اس کی تگ و تاز ہے کہ انسان کا ذوقِ پرواز ہے

یہ صرصر کی مانند ہے تیز گام سحر ہے کراچی میں برلن میں شام

تھپیڑے ہواؤں کے کھاتا ہوا اڑا جاتا ہے مُسکراتا ہوا

گذرتا ہے مانندِ ابرِ بہار کھڑے دیکھتے ہیں اسے کوہسار

کئی بحر و امصار طے کر گیا کئی دشت و گلزار طے کر گیا

نہ جاندار ہے یہ نہ پردار ہے مگر سب پرندوں کا سردار ہے

نہ کرگس نہ طاؤس پرّاں ہے یہ

کمالِ تمنائے انساں ہے یہ

اصغر حسین خاں نظیر لودھیانوی

اڈیٹر

کردار

۱۔ اڈیٹر فلمی رسالہ "پردہ سیمیں" بی اے
۲۔ اڈیٹر کی بیس سالہ حسین بیوی
۳۔ اس کا سات سالہ بھتیجا
۴۔ دو کاتب
۵۔ دو ملازم
۶۔ اور دھوبی

مقام:۔ باب الہند بمبئی

زمانہ:۔ عہد حاضر

پہلا منظر

دفتر "پردہ سیمیں"

(ایک تنگ کمرہ جس میں صرف ایک کھڑکی اور ایک دروازہ ہے کھڑکی کے قریب اڈیٹر کی تین ٹانگ کی میز دیوار سے لگا کر رکھی ہوئی ہے۔ اس کے پاس ہی ایک نہایت اونچی کرسی ہے جو بظاہر کسی اصلاح خانے کی معلوم ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں بید کی دو دو کرسیاں موجود ہیں۔ کمرے کے ایک تہائی حصہ پر بادامی پردہ پڑا ہوا ہے۔ دیواروں پر کئی کیلنڈر اور ایکٹرسوں کی تصویریں ٹنگی ہیں۔ میز پر دو موٹی موٹی کتابیں، چند اخبارات، اور رسائل بکھرے ہوئے ہیں۔ قلمدان اور دوات کے اردگرد روشنائی کے بے شمار دھبے پڑے ہیں جو دور سے دکھائی دیتے ہیں۔ میز کے ایک سرے پر ٹیلیفون رکھا ہے۔ کاتب حضرات ایک بوسیدہ چٹائی پر بیٹھے کتابت میں منہمک ہیں۔ دروازے کے پاس ایک اسٹول پر ملازم بیٹھا گنگنا رہا ہے ؎

عزیبوں کا بھی کوئی آسرا ہوتا تو کیا ہوتا

ایک لمحہ بعد ملازم خاموش ہو جاتا ہے۔ بھاری قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے اور اڈیٹر کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ ٹوپی اتار کر ایک طرف پھینکتا ہے اور میز کے اوپر بیٹھ کر کرسی پر پیر پھیلا دیتا ہے)

اڈیٹر:۔ آج کی ڈاک سے کوئی منی آرڈر آیا تھا؟

ایک کاتب:۔ ابھی ڈاک نہیں آئی جناب!

(عین اسی وقت ڈاکیہ داخل ہوتا ہے)

ڈاکیہ:۔ (ایک لفافہ پڑھتے ہوئے) اڈیٹر پردہ سیمیں۔

اڈیٹر:۔ ہاں (لفافہ لے کر چاک کرتا ہے)

ڈاکیہ:۔ ڈھائی آنے دلوائیے حضور!

اڈیٹر:۔ (منہ بگاڑ کر) بیرنگ ہے یہ؟

ڈاکیہ:۔ جی ہاں۔

اڈیٹر:۔ (کاتب سے) ڈھائی آنے دے دیجئے۔ میرے پاس اس وقت چک ہے روپے لانے پر لوٹا دوں گا۔ یاد دلائیے گا!

کاتب:۔ (جیب ٹٹول کر دوسرے کاتب سے) میرے پاس چھ پیسے ہیں، چار آپ دے دیجئے۔

دوسرا کاتب:۔ چار پیسے، اچھا (آہستہ سے) سگرٹ آپ کے ذمے رہا پھر!

(ڈاکیہ پیسے پاکر چلا جاتا ہے۔ کاتب لکھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اڈیٹر لفافہ کھولتا ہے جس میں سے ایک مقامی اخبار کی ناراضمت کا ایک ورق نکلتا ہے جسے وہ ایک جگہ سے سرگوشیوں کے لہجے میں یوں پڑھتا ہے)

اڈیٹر:۔ گھاس چھیلنے چھیلتے اڈیٹر صاحب پردہ سیمیں کو یہ کیا سوجھی جو فلمن

لطیفہ پر مضمون لکھنے بیٹھ گئے . . . !"

(چراغ پا ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ اس اثنا میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

اڈیٹر۔ (ٹیلیفون کا ریسیور کان سے لگا کر) ہلو، کون؟ حامد بھائی! —— جی ہاں میں نے بھی اسے دیکھا۔ بلکہ کسی کم بخت نے مجھے وہ ورق مکمل کر بنگ بھیج دیا ہے —— دنیا میں کیسے کیسے کمینے بستے ہیں! ؟ —— ہاں —— حامد بھائی میں ذرا اس وقت بہت عدیم الفرصت ہوں پھر مفصل گفتگو ہوگی —— اچھا . . . (سلسلہ منقطع کرتا ہے)

کاتب۔ کیا بات ہے صاحب؟

اڈیٹر۔ کچھ نہیں!

(پھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

اڈیٹر۔ (فون لے کر) ہلو، ہلو، کون؟ وکیل صاحب! —— شکریہ —— ہاں ہاں میں نے دیکھا، کس قدر لغویات ہے —— مقدمہ دائر کر دوں؟ فائدہ؟! بہت خوب، میں غور کروں گا۔ اس وقت اڈیٹوریل لکھ رہا ہوں، معاف فرمائیے . . .

کاتب۔ (سر اٹھا کر) اس صفحہ پر سات سطریں بچ رہی ہیں۔

اڈیٹر۔ لکھو دو جلی قلم سے (رک رک کر لکھواتا ہے) مستقبل قریب کی کسی اشاعت میں . . . مس البیلی کی . . . خاص زاویہ سے . . . کھینچی ہوئی سہ رنگی تصویر کا بے چینی سے انتظار کیجئے۔ مینجر۔

(پھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

اڈیٹر۔ ہلو، یوسفی، کیسے مزاج ہیں! —— میں بھی اسی فکر میں ہوں۔ کوئی تنفیدہے کمبخت وہ؟ کھسیانی بلی کھمبا نوچے والی بات ہے! میں اسی کے متعلق اپنے وکیل سے مشورہ لے رہا ہوں۔ بے چارے بڑی دیر سے بیٹھے ہیں۔ اچھا . . .

(سلسلہ منقطع کرتا ہے کہ پھر گھنٹی بجتی ہے)

اڈیٹر۔ (جھنجھلا کر کاتب سے) دیکھو فون پر کون ہے، کون ہے، کوئی ہمیں پوچھے تو کہہ دو نہیں ہیں۔

کاتب (فون لے کر) ہلو، ہلو، کیا؟ کیا؟ اور سب کہاں سے بولتے ہیں جی؟ ؟

اڈیٹر۔ کیا بکتے ہو؟

کاتب۔ (آلے کو منہ سے لگاتے ہوئے) دیکھئے صاحب پوچھتے ہیں۔ کہاں سے بولتے ہو۔ کہہ دو اں منہ سے بولتے ہیں!

اڈیٹر۔ ہیں، ہیں! تم نے کیا کہہ ڈالا (لپک کر فون چھین لیتا ہے) ہلو، کون! پولیس سٹیشن! جی ہاں، دفتر پر دہ سیس اور میں! —— میں جنرل مینجر جی کیا! ہمارا ملازم گرفتار ہو گیا۔ سائیکل کا حادثہ؟ لیکن اڈیٹر صاحب تو نہیں ہیں دفتر میں . . . .

دوسرا کاتب۔ (جواب تک خاموش تھا) یہ تو ہونے والی بات تھی۔ دفتر کی سائیکل میں نہ تو گھنٹی تھی نہ بریک، حادثہ نہ ہوتو کیا ہو۔

(اڈیٹر پریشانی کے عالم میں کچھ دیر ادھر اُدھر ٹہلتا ہے۔ سگرٹ جلاتا ہے۔ آدھا پینے کے بعد بجھا کر جیب میں رکھ لیتا ہے اور پھر ٹیلیفون پر آتا ہے)

اڈیٹر۔ (کسی سے سلسلہ ملائے بغیر، کاتبوں کو سنانے کے لئے ذرا بلند آواز سے) دیکھو آمو، انجنیر صاحب ہیں مکان پر؟ خیر، بھائی ذرا لپک کر دوسری منزل پر میرے ہاں دریافت کر لو کہ ننھے کی طبیعت اب کیسی ہے۔ (دو منٹ توقف کے بعد) کیا! بخار تیز ہو گیا، وہ بے ہوش ہے؟! اف یہ کیا ہو گیا، اچھا تو میں آ رہا ہوں (کاتبوں کی طرف دیکھ کر) ننھا بہت علیل ہے۔ میں مکان جا رہا ہوں۔

کاتب۔ اور فادر بے چارے کی رہائی۔

دوسرا کاتب۔ میں نے اس سے پہلے ہی کہا تھا کہ سائیکل پر نہ جاؤ خدا نخواستہ . . .

اڈیٹر۔ . . . اچھا اچھا، میں غور کروں گا۔

(اڈیٹر ٹوپی سنبھال کر کمرے سے باہر نکل جاتا ہے)

(پردہ)

دوسرا منظر

اڈیٹر کا مکان۔

(ایک آراستہ ڈرائنگ روم۔ دائیں جانب ایک دروازہ جو خوابگاہ میں کھلتا ہے۔ اس میں ایک مسہری نظر آتی ہے جس پر مچھر دانی پڑی ہے۔ اڈیٹر گردن تک ایک بید کی کرسی میں ڈوبا ہوا سگریٹ کی ڈبیہ سے کھیل رہا ہے۔ خواب گاہ کے دروازے سے اس کی بیوی مسکراتی ہوئی داخل ہوتی ہے)

بیوی۔ آج بے وقت کیسے آ گئے، خیریت تو ہے!

اڈیٹر۔ آ گئے ہماری مرضی، بے وقت آ گئے تو کیا گھر میں نہ گھسنے دوگی؟

(اڈیٹر کا بھتیجا اچھلتا کودتا داخل ہوتا ہے)

بھتیجا۔ (اڈیٹر کے قریب آ کر) چچا جان دیکھئے میں کب سے کہہ رہا ہوں تیّی جان مجھے . . . .

اڈیٹر۔ (طمانچہ رسید کر کے) تم بہت شریر ہو گئے ہو تنھے! جاؤ، کھیلو۔

(رومال نکالنے کے لئے شیروانی کی تمام جیبیں ٹٹولتا ہے ملازم داخل ہوتا ہے)

ملازم۔ دھوبی آیا ہے۔

(پیچھے پیچھے بغل میں پشتارہ دبائے دھوبی آتا ہے اڈیٹر کی بیوی اندر چلی جاتی ہے)

دھوبی۔ سلام صاحب!

اڈیٹر۔ رومال لائے؟

دھوبی۔ جی حضور، (تمام کپڑے گنتا ہے) دو پتلون، ایک بنیان، ایک جوڑا موزے، دو قمیص، ایک کالر، شیروانی ــــ صاحب رومال تو پھر بھول آیا . . . اس کھیپ میں ضرور . . .

اڈیٹر۔ (شیروانی اٹھا کر) اس کا گلا بھی پھاڑ لائے۔

دھوبی۔ وہ پہلے ہی پھٹا تھا صاحب۔

اڈیٹر۔ بکو مت، اب بہت کپڑے چرانے لگے ہو۔

ننھا۔ (باہر سے آ کر) ڈاکیہ آیا ہے، چچا جان!

اڈیٹر۔ آیا ہے تو ہم کیا کریں، ملنے آیا ہے وہ ہم سے؟ کوئی خط ہو تو لے لو۔

ملازم۔ (جو اس اثنا میں باہر جا کر پھر اندر آتا ہے) اور حضور پیسے۔

اڈیٹر۔ کیسے پیسے؟

ملازم۔ بیرنگ ہے حضور!

اڈیٹر۔ بیرنگ! کہہ دو نہیں چاہئے۔

ملازم۔ مگر وہ آپ کے نام کا ہے، کہہ دوں نہیں چاہئے؟

اڈیٹر۔ شریفوں کا قاعدہ ہے بیرنگ خطوط نہیں لیتے۔ یہ تہذیب کے خلاف ہے۔

ملازم۔ پہلے تو آپ وصول کر لیا کرتے تھے حضور۔

اڈیٹر۔ (کرخت لہجے میں) بکواس نہ کر، جاتا ہے کہ نہیں یہاں سے! بدذات

(ملازم زیر لب بڑبڑاتا ہوا واپس چلا جاتا ہے۔ پیچھے پیچھے دھوبی بھی ہاتھ ہلاتا ہوا کمرے سے باہر نکل جاتا ہے)

(پردہ)

تیسرا منظر

دفتر "پردہ سیمیں"

(اڈیٹر اپنی میز پر بیٹھا کچھ لکھنے میں مصروف ہے۔ بال پریشان ہیں۔ شیروانی اور اس کے اندر قمیص کے بٹن کھلے ہیں)

اڈیٹر۔ (سر اٹھا کر) کاتب صاحب آپ کو سیراوہ شعر یاد ہے؟

کاتب۔ (قلم روک کر) کونسا؟

اڈیٹر۔ وہ کچھ ایسا ہی تھا ۔

شومئی قسمت جب امیدوں کا لنگر توڑ دے

کاتب۔ شومئی قسمت . . .

اڈیٹر۔ . . . جب امیدوں کا لنگر توڑ دے ــــ مصرع ثانی کیا ہے اس کا؟

کاتب۔ صاحب اس کا ثانی نہیں . . .

اڈیٹر۔ کیا؟

کاتب۔ حضور مجھے اس کا مصرع ثانی یاد نہیں ہے

دوسرا کاتب۔ (قلم کو تہبند سے پونچھتے ہوئے) اگر اجازت دیجئے تو مصرع ثانی میں بنا دوں۔

اڈیٹر۔ (طنزاً) مگر اس کے توجملہ حقوق محفوظ ہوں گے؟

دوسرا کاتب۔ نہیں نہیں، بخشا ہوا سمجھئے۔

اڈیٹر۔ اچھا جلدی کہو، کچھ سوجھا!

دوسرا کاتب۔ (ترنم سے) شومئی قسمت جب امیدوں کا لنگر توڑ دے

ملازم۔ (قریب آ کر) بھئی واہ!

پہلا کاتب۔ شومئی قسمت جب امیدوں کا لنگر . . .

دوسرا کاتب۔ توڑ دے . . . ابھی عرض کیا ہے ع

ناخدا کو چاہئے کشتی خدا پر چھوڑ دے۔

ملازم اور کاتب۔ واہ واہ! خوب! بھئی واہ! کیا گرہ لگائی ہے! واہ . . .

(کاتب کھڑا ہو کر آداب بجا لاتا ہے اور بار بار شعر پڑھتا ہے۔ داد دینے والے خاموش ہو جاتے ہیں لیکن وہ سلام کئے جاتا ہے اور جب اس کو احساس ہوتا ہے تو یک بارگی چہرہ کو سنجیدہ بنا کر کتابت میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اڈیٹر دوبارہ لکھنے میں مصروف ہو جاتا ہے اور مسکراتے ہوئے اپنے لکھے کو دھراتا ہے)

اڈیٹر۔ اداریہ کی آخیر سطور لکھ رہا تھا کہ ایک شعر حسب حال ہو گیا جو درج ذیل ہے

شومئی قسمت . . . .

(پردہ)

غلام عباس ہولوی

نوائے فراق

وفورِ شوق کو کچھ ہوش حسن راہ تو دے
یہ برقِ جلوہ تری فرصتِ نگاہ تو دے

رہے گا کھل کے کبھی رازِ ہوش و غفلت بھی
پتہ کچھ اپنا سیہ مستیٔ نگاہ تو دے

دل اپنا ڈوب چلا جب تو ذکرِ ساحل کیا
یہ ناؤ بیٹھ کے دریائے غم کی تھاہ تو دے

غم و خوشی ہیں ۔ ترے حسنِ بے پناہ کی خیر
تباہ حال دلوں کو کہیں پناہ تو دے

علاجِ خوبیٔ تقدیرِ عشق کیا ہمدم
وہ دل سے عہدِ وفا باندھ کر نباہ تو دے

بتائے کون خموشی کو داستاں کرنا
کہ یہ پیامِ نہاں دے تری نگاہ تو دے

اک آہ سرد سہی اک نوائے درد سہی
یہ ضبطِ غم کبھی بے چارگی کو راہ تو دے

ہر اک کی ہوش کا کھل جائے گا بھرم ساقی
کچھ اذنِ بادہ کشی مستیٔ نگاہ تو دے

بجا یہ عالمِ مستی ۔ یہ کیفیت برحق
خبر کچھ اپنی مگر نرگسِ سیاہ تو دے

نہیں ہے چین جو قسمت میں اے غمِ جاناں
کشاکشِ غمِ دنیا سے کچھ پناہ تو دے

رہی ہے راز سراسر اگرچہ فطرتِ حسن
ہوا کسی کو مگر دامنِ نگاہ تو دے

تمام عمر اسی انتظار میں گذری
کہ نازِ حسن کو بے تابِ عشق راہ تو دے

ظہورِ حسن سہی، عالمِ شہود سہی
پتہ مرا بھی کہیں تیری جلوہ گاہ تو دے

کسی کی رنجشِ بے جا سے دل بھی نادم ہے
کچھ آج اپنی صفائی یہ بے گناہ تو دے

حجابِ حسن کو بے باک بھی بنا لیں گے
پتہ کچھ اپنا تری شرمگیں نگاہ تو دے

فنا کی موج کا سر سے گذر مبارک ہو
اترنے والوں کو دریائے عشق تھاہ تو دے

خبر نہیں ترے گم گشتگانِ عشق کو کچھ
فضائے غم میں ہوا دل کی سرد آہ تو دے

نہ بے قرار رہے گا نہ باقرار کوئی
پیامِ ہوش ربا گردشِ نگاہ تو دے

ذرا دوراہۂ ہجر و وصال سے بچ کر
فراقؔ دل میں کبھی اپنے دل کو راہ تو دے

رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری

یاد آیا ہے کہ...

اکتوبر کا آخیر تھا۔

فضا میں رفتہ رفتہ سردی سما رہی تھی۔

سردی کی آمد، ہلکی خوشگوار ہوا اور ٹھنڈے پانی کے خیال سے میرے ناتواں جسم میں جان سی آگئی۔ گرمی مجھ ایسے خفقانی انسان کو دیوانہ بنا دیتی ہے۔ جون جولائی کی بھوکی ہوائیں میری روح کی تازگی کو چوس چکی تھیں۔ اب صرف ایک جھلسا ہوا بدن تھا جو مہینوں سے پلنگ پر پڑا تھا۔

میرے آس پاس کوئی جاندار چیز نہ تھی سوائے ایک شکستہ دل کے جو صدمات سے بوڑھا ہو گیا تھا اور اب تو اس کی رفتار بھی مدھم پڑ گئی تھی۔ دوسری چیز ایک برقی پنکھا تھا جو شب و روز گھومتا تھا مگر اُس کی آہنی خاموشی میری برداشت کی حد سے بڑھ گئی تھی۔ اُس نے میری بے قراری، میری پریشانی دیکھی تھی، میرے آنسو اپنے آنچل کی ہوا سے خشک کئے تھے، میری پیشانی کے سفید سفید قطرے، میری زندگی کی نشانی، بڑی پھرتی سے چاٹ لیے تھے مگر اُس نے کبھی اظہار ہمدردی نہ کیا تھا! اس کی بے پروائی ظلم کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ اُس کی خشک ہوا نے میرے حواس سُن کر دیئے تھے۔ مجھے اس سے نفرت تھی گو وہ مہینوں سے میری خدمت کر رہا تھا!

اگر میں جیتا تھا تو اُسی بوڑھے دل کے سہارے، جو ہر حالت میں میرا غمگسار تھا۔ میری بے قراری سے وہ بے قرار ہو جاتا۔ میرے ضعف سے اس کو ضعف آجاتا۔ اُس کو مجھ سے محبت تھی، وہ مجھے چاہتا تھا اور میں اس کو۔

جب کبھی میں کمرے کی خاموشی سے گھبرا جاتا تو بوڑھے سے باتیں کرنے لگتا۔ وہ ایسی میٹھی میٹھی باتیں سناتا کہ کلفت دور ہو جاتی اور میری تھکی ہوئی آنکھیں جھپک جاتیں۔ میرے تعجب کی کوئی حد نہ رہی جب مجھے معلوم ہوا کہ بوڑھا میرے اِک اِک راز سے واقف ہے اور اس کو وہ تمام واقعات یاد ہیں جن سے مجھ کو اُنس تھا۔ رات کی تاریکی میں جب نیند مجھ سے دور بھاگتی تھی یہ بوڑھا مزے لے لے کر پرانے واقعات سناتا۔ اُسے معلوم تھا کہ مرحومہ سے مجھے کتنی محبت تھی، اس کو وہ تمام عہد و پیمان یاد تھے جو ہم دونوں نے موت سے بے خبر ہو کر باندھے تھے۔ اس کو ہماری باتیں حرف بہ حرف یاد تھیں۔ گزشتہ واقعات اس خوبی سے دُھراتا کہ میں اپنی بیماری اور اُس کی موت کو بھول جاتا۔ گزرا ہوا زمانہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا اور اُس کی پیاری پیاری آواز میرے کانوں میں گونجنے لگتی!!!

"اُف، کیا زمانہ تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے خواب و خیال ہو کر رہ گیا۔ کسے معلوم تھا کہ حالات یوں بدل جائیں گے۔ ایک مختصر سا زمانہ ہے جس میں ابتدا سے انتہا ہوئی اور عروج سے زوال مگر اس کے نقوش کچھ اتنے گہرے ہیں کہ شائد نہ مٹیں گے، شاید اس لئے کہ یہ اُس عہدِ ماضی کی یادگار ہے۔

ع۔ جب دنیا اپنی جنت تھی اور زندگی اک کھیل

بیماری اور تنہائی کا یہ کٹھن زمانہ بوڑھے کی خوش کلامی کے طفیل گزرا، وہ میرے مزاج سے خوب واقف ہو گیا تھا۔ روزانہ سرِ شام ہی کوئی بھولا ہوا قصہ چھیڑ دیتا اور ساری ساری رات باتوں میں کٹ جاتی اُسے سب کچھ یاد تھا، اُسے وہ دن بھی یاد تھے۔ جب عائشہ اور میں دن بھر اکٹھے کھیلا کرتے تھے اور ہمارے دن بچپن کی معصوم مسرتوں سے رچے ہوئے تھے اور راتیں میٹھی نیند میں بسی ہوئی تھیں اور وہ دن بھی جب چاندنی راتیں تھیں اور میں تھا۔ خیالوں کی دنیا میں مو میلوں نکل جاتا تھا۔ مگر کھیتوں کی تازگی اور میدانوں کی وسعت میرے لئے سامانِ سکون مہیا نہ کر سکتے تھے!

سب سے زیادہ اُسے وہ زمانہ پسند تھا جب کہ وہ خود بھی جوان تھا۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ بعض واقعات اُسے تمام تفصیل سے یاد تھے۔ وہ گرمی کی دوپہر جس کو گزرے ہوئے آٹھ سال کا زمانہ ہونا ہے، اس کو اس طرح یاد تھی جیسے کل کی بات ہو۔ میں اپنے کمرے کے ایک گوشے میں

بیٹھا ہوا سکول کا کام کر رہا تھا کہ اچانک کسی نے چپکے سے آکر میری آنکھیں میچ لیں۔ میں چونک اُٹھا اور جب مڑ کر دیکھا تو وہ ہنس رہی تھی۔ مجھے اس حرکت پر خفیف سا غصہ آگیا تھا اور غیر ارادی طور پہ ماتھے پر شاید شکن پڑ گئے تھے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ مجھ سے ایسی بدسلوکی ہوئی۔ مگر یہی پہلا موقعہ تھا کہ مجھے اس سے کبھی نہ بھولنے والی محبت بھی ہوئی تھی۔ وہ بہت ہی کمزور دل لڑکی تھی۔ ذرا سی بات سے خوفزدہ ہو جاتی تھی اور اپنی غلطی کی معافی بڑی عاجزی سے مانگتی تھی۔ مجھے منانے کے لئے اس نے فوراً اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ پلکوں والی آنکھیں میری منت کر رہی تھیں کہ میں اسے معاف کر دوں۔ وہ برابر اس طرح دیکھ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر میں کچھ اور دیر خاموش رہا تو اس کی نگاہ مجھے تحلیل کر دے گی۔ مگر میں اپنے اندرونی ہیجان کی وجہ سے خاموشی پر مجبور تھا، مجھے فقط اتنا احساس تھا کہ وہ مجھے بہت ہی اچھی لگ رہی تھی، میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اسے دیکھتا ہی رہوں، مجھے معلوم ہوتا تھا کہ میری روح انہیں دلکش آنکھوں میں مقید ہے۔

آخر بمشکل تمام میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا "ارے تم یہ کیا کر رہی ہو، اور تم یہاں کیوں آئی تھیں؟" اس کی شوخی تو رخصت ہو گئی تھی۔ مگر اسے یقین ہو گیا کہ میں خفا نہیں ہوں۔ چنانچہ اس نے ہنستے ہنستے کہا "آپ کی چھٹی ہے نا، صغریٰ آپا آئی ہوئی ہیں اور نسیم بھی ہیں۔ ہمیں باغ میں لے چلئے، وہاں ہم کھیلنا چاہتے ہیں" رُک رُک کر اور میری طرف نیچی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس نے یہ الفاظ کہے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں نے جلدی جلدی بستہ سنبھالا، اور کہا، "اچھا، چلو۔ تیار ہو جاؤ"۔

ہم چار پانچ آدمی سامنے والے باغ میں پہنچ گئے وہ سب بھاگتے ہوئے چلے گئے اور آن کی آن میں درختوں کے پیچھے چھپ گئے میں بھی ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ وہ ایک دوسرے کو پکڑنے کے لئے دور دور بھاگ جاتے تھے اور جب کبھی کوئی پکڑا جاتا تو وہ جگہ شور سے گونج اٹھتی تھی۔ اکثر بے چاری عائشہ ہی پکڑی جاتی۔ اس سے تیز نہیں بھاگا جاتا تھا اور وہ جلدی ہی ہانپ اٹھتی تھی۔ اس کے بال اس کو بہت تنگ کر رہے تھے۔ وہ بار بار اُن کو ہٹاتی تھی۔ مگر ہوا کے ایک ہی جھونکے سے وہ پھر اس کے منہ پر بکھر جاتے تھے۔ بعض دفعہ تھک کر وہ بیٹھ جاتی تھی اور بالوں کو خوب اچھی طرح باندھ لیتی تھی، مگر دوڑنے سے پہلے وہ سب پھر اس کے چہرے پر آگرتے تھے۔ جب وہ چور بنتی تھی تو میں اس کی مدد کے خیال سے نسیم یا صغریٰ کے چھپنے کی جگہ اشارہ سے بتا دیتا تھا۔ وہ ان کو پکڑ کر بہت خوش ہوتی تھی، مگر جب کبھی صغریٰ یا نسیم کو معلوم ہو جاتا تو وہ مجھ سے شکایت کرتی تھیں کہ "بھائی وقار! آپ عائشہ کی بہت رعایت کرتے ہیں، ہم اس طرح نہیں کھیلیں گے"۔

مجھے وہ ایک شام اور بھی یاد تھی۔ واقعی وہ ایک دلفریب اور دل گداز شام تھی اور مجھے بھی مدت العمر یاد رہے گی۔ عائشہ اور میں اب تک بہت مانوس ہو گئے تھے بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ منسوب ہو گئے تھے، سب کو معلوم تھا کہ عائشہ وقار کی ہو چکی۔ ہم دونوں اکثر شام کو سیر کی غرض سے نورانی پر چلے جاتے تھے۔ نورانی شہر سے کچھ فاصلے پر چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے درمیان ایک شاداب جگہ تھی۔ جہاں سنگترے کے گھنے درختوں کے سائے میں ایک مصنوعی جھیل تھی جسے پتوں کی دلفریب دھوپ چھاؤں اور رنگتروں کی مست خوشبو نے حسن بن صباح کی بہشت کا نمونہ بنا دیا تھا۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ بادلوں کے ہلکے ہلکے ٹکڑے نیلے آسمان پر دوڑتے پھرتے تھے اور شفق اُن کو چوم چوم کر پیار سے رنگا رنگ کے چھینٹے دے کر رخصت کر رہی تھی۔ شام کی خاموش فضاء سبزے کی کچی کچی خوشبو اور شفق کے ہلکے رنگ مجھے مخمور کئے دیتے تھے۔ ہم جھومتے جھامتے جھیل کے کنارے پر آبیٹھے۔

شام کا آسمانی میلہ ختم ہو چکا تھا۔ شفق اپنا رنگ لٹا چکی تھی کبھی کبھی کسی بھٹکے ہوئے پرندے کے پروں کی آواز آجاتی تھی ورنہ ایک مکمل خاموشی طاری تھی۔ چاندنی آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی۔ ہوا سے جھیل کی سطح پر باریک باریک لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ عائشہ پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی، اور پانی اوچھال رہی تھی۔ میں اُسے دیکھ رہا تھا اور اپنی کہی ہوئی پرانی نظمیں دھرا رہا تھا۔ میرے مدھم سُر، پانی کی لہروں کی ہلکی ہلکی موسیقی، اور عائشہ کے قہقہے، خود رو پھولوں کی تیز خوشبو، ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس، چاندنی کا پھیلتا ہوا سیلاب اور نیلے آسمان میں چمکتے ہوئے تارے، آہ، ہم اس شب و روز کی افسردہ دنیا سے کتنی دور تھے۔ نہ معلوم ہم نے ایک دوسرے سے کیا کیا کہہ ڈالا۔

عائشہ کو ایک اور شرارت سوجھی وہ دوڑتی ہوئی گئی اور ہوا

سے گرے ہوئے صاف صاف پتوں کو چُن لائی اور پھر ان کو ایک ایک کر کے جھیل کی لہروں پر چھوڑتی رہی۔ وہ ہوا کے جھونکوں سے سیدھے ترچھے تیرتے چلے جا رہے تھے۔ جب کبھی ٹکرا جاتے تو وہ پتوں کا بیڑا بکھر جاتا۔ پتوں کی قطار دور تک نظر آ رہی تھی اور بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے بھی کچھ پتے چھوڑے جو تیرتے تیرتے اس کی "کشتیوں" کے پاس پہنچ گئے، وہ چلائی "دیکھئے اپنی کشتیوں کو الگ رکھئے ورنہ جنگ ہوتی ہے!" ساتھ ہی اس نے چھوٹے چھوٹے کنکر برسانے شروع کر دئیے تھے۔ اتفاق سے ایک پتہ الٹ گیا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا "بس، اب کیا ہوگا، ہماری "کشتی" تو الٹ گئی!" نہ معلوم کیوں اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے "نہیں وقار! الیسا مت کہو۔ میں دعا کرتی ہوں کہ میری ساری کشتیاں الٹ جائیں! میں نے کنکر کیوں برسائے تھے!" ذرا سی بات سے وہ خوفزدہ ہو جاتی تھی، وہ بار بار افسوس کر رہی تھی، اس کی آنکھوں میں وہی قیامت کی عاجزی آگئی تھی کتنی مشکل سے میں نے اس کا وہم دور کیا تھا!!

اب سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ ہم واپس چلے آئے، راستے میں وہ کچھ خاموش ہی رہی، افسوس کہ پھر اس عرصے میں ہمیں "نورانی" جانے کا اتفاق نہ ہوا، مگر اس کی یاد ہمیشہ عزیز رہے گی۔

عائشہ جیسی بھولی محبت کرنے والی لڑکی شاید ہی ملے، افسوس کہ وہ زیادہ دیر تک زندہ نہ رہی، میری زندگی اسی کی چند روزہ زندگی کی یاد سے وابستہ ہے، اور دل اسی زمانے کے واقعات سے غمی، خوشی کے موقعوں پر بھی میرے بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں . . .

آہ۔ تنہائی تیری سوگوار خوشیاں!!!

خلیق احمد

سرودِ فطرت

لبِ دریا ہے اور سنسان جنگل
سہانی رات ظلمت چھا رہی ہے
فضا ہلکے ترنم سے ہے معمور
گماں ہوتا ہے ہر شے گا رہی ہے
عجب روحانیت طاری ہے ہر سُو
کہ یادِ قدرتِ حق آ رہی ہے
یہ تارے ہیں کہ ہیں نغمے مجسّم
مگر زہرہ فلک پر گا رہی ہے
فضا لہرائی جنگل جھوم اٹھا
نوائے نے کہیں سے آ رہی ہے
ہوائے مست دھیمے دھیمے سُر میں
کوئی دلکش ترانہ گا رہی ہے
یہ فطرت کی ترنم آفرینی
دلِ محزوں کو تسکیں آ رہی ہے
چلو بھی تاجور اب گھر کی جانب
چلو بھی، رات بھیگی جا رہی ہے

تاجور سامری

غزل

مرگِ دلِ نشاط کوش قصۂ دوش ہی سہی   حسرتِ گرمجوش کا سازِ خموش ہی سہی

حاصلِ دردِ عشق ہے زندگیٔ مآل سوز   نغمۂ بےخودی مرا ماتمِ ہوش ہی سہی

دیکھ لے کاش ایک بار پرتوِ حسنِ روئے یار   تشنگیٔ جہانِ شوق میکدہ نوش ہی سہی

دل میں رواں ہے موجِ خوں ہاتھ میں دامنِ جنوں   گر نہیں عالمِ سکوں محشرِ جوش ہی سہی

حسنِ نظر فریب کی چھپ نہ سکے گی سادگی   ان کی ادائے دلبری جلوہ فروش ہی سہی

برقِ تجلیٔ جمال کر گئی آشنائے حال   شاہدِ ماجرائے طور دیدہ و گوش ہی سہی

کون کرے گا حشر میں اپنے قصور کو قبول   غیرتِ حسن و ننگِ عشق دوش بدوش ہی سہی

گرمیٔ عشق سے نظرؔ پختگیٔ کلام ہے
تیری نوائے دل گداز بانگِ سروش ہی سہی

قیوم نظر

بے چارہ

ہفتے کی سہ پہر تھی۔ بہار کی حسین دھوپ میں لندن کیسا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ منظر اتنا دل ربا تھا کہ اس کی حقیقی تصویر صرف تخیل ہی پیش کرسکتا ہے۔ سورج کی کرنیں بیک وقت روپہلی، گلابی اور نارنجی تھیں چمن کا گوشہ گوشہ نشۂ بہار میں مدہوش تھا۔ ہر شجر سے نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ بہار کے ساتھ ہی لندن کے میلے گلی کوچوں، تنگ بازاروں، تاریک مکانوں اور افسردہ و مردہ باغات میں نئی زندگی کا دور دورا تھا جو کل بے جان تھا آج زندہ تھا اور پھر جنہوں نے اس موت کو زندگی میں بدلتے دیکھا وہ خود اپنے میں تبدیلی محسوس کر رہے تھے۔

موسم کے خوشگوار ہوتے ہی جذبات میں ہلچل مچ گئی تھی۔ الفت و محبت کی داستانیں غیر معمولی جوش کے ساتھ دہرائی گئیں۔ باغات میں بکھرے ہوئے جوڑوں کی بات بات سے شادمانی ٹپکی پڑتی تھی۔ زندہ دل نوجوانوں نے ہیٹ اتارے اور بنچوں پر بیٹھ کر دل میں نیک ارادے باندھے جو زیادہ تر وسکی، دفتر میں ٹائپ کرنے والی خوب صورت لڑکیوں اور سویرے جاگنے کے متعلق تھے۔ ادھیڑ عمر اصحاب نے باغ میں سے ہو کر گھر جاتے ہوئے اکتائے ہوئے کاروباری دلوں میں ایک دفعہ پھر وہی پرانی تڑپ محسوس کی۔ انہیں اپنی بیویوں کا خیال آیا اور یہ خیال آتے ہی اگرچہ شادی کو تیس برس ہو گئے تھے گزشتہ محبت عود کر آئی۔ "واپس جاتے ہوئے ضرور بازار سے ہوتے چلیں گے" انہوں نے سوچا۔ "اور ــــ کے لئے ایک ننھا سا تحفہ خریدیں گے۔" یہ کیا ہوگا؟ محفوظ شدہ پھلوں کا ایک ڈبہ؟ یا بالوں میں لگانے کے لئے ــــ اور پھر انہیں یکایک یاد آیا کہ یہ تو ہفتے کی سہ پہر تھی تمام دکانیں بند ہوں گی۔ ذرا سنجیدہ انداز میں انہوں نے ادھر ادھر دیکھا اور نگاہیں کھیلتے ہوئے بچوں پر، ہری گھاس پر بیٹھے ہوئے شرشار الفت نوجوان لڑکے لڑکیوں پر جم کر رہ گئیں۔ "یہ ہے ہماری زندگی۔ جب دل کھلا ہو تو دکانیں اکثر بند ہوتی ہیں۔"

پیٹر برٹ پر بھی سہانے موسم اور نوشگفتہ پھولوں کا اثر دوسروں سے کم نہ تھا۔ اس بہار سے اس کے تنہائی کے احساس میں اور اضافہ ہوا اس کے دل نے نصف بہتر کی ضرورت غیر معمولی شدت سے محسوس کی اس کے اردگرد قہقہوں کا ہجوم تھا لیکن اس کا دل کہیں دور تاریکی میں بھٹک رہا تھا۔ یہ سچ ہے بہار اپنے ساتھ بہتوں کے لئے پیام مسرت لائی تھی لیکن اسے کسی سے کیا غرض جبکہ وہ جیسا پہلے تھا ویسا اب تھا۔ دوسرے اپنی اپنی محبوبہ کے ہاتھ میں ہاتھ دئے محو خرام تھے لیکن وہ اکیلا چل رہا تھا۔ بہار کے باوجود، دھوپ کے ہوتے ہوئے بھی، اگرچہ آج ہفتہ تھا اور کل اتوار ہوگا گو وہ جانتا تھا کہ جو چیزیں دوسروں کو مسرور کر رہی ہیں۔ وہ ساری کی ساری نہ سہی ان کے کچھ حصے پر اسے بھی دسترس حاصل ہے تاہم وہ افسردہ تھا اور غمگین منہ بنائے ہائیڈ پارک میں پھر تا رہا۔

معمول کے مطابق اسے تصورات ہی کی دنیا میں پناہ ملی۔ مثلاً ایک کمسن کا فرجمال لڑکی کسی اکھڑے ہوئے پتھر سے ٹھوکر کھا کر ٹھیک اس کے آگے گر پڑے اور اس کے ٹخنے میں موچ آجائے تو عنبریں بالوں کو چہرے سے ہٹاتا ہوا حسین پیٹر فوراً اس کی مدد کو دوڑ پڑے گا۔ وہ اسے ٹیکسی میں سوار کرا کے اس کے گھر لے چلے گا۔ وہ ایک نواب کی لڑکی ثابت ہوگی۔ وہ ایک دوسرے کو چاہنے لگیں گے . . .

یا اس نے ایک بچے کو گول تالاب میں ڈوبنے سے بچا لیا اور اس طرح ہر ایک سے داد حاصل کی اور اس سے بڑھ کر یہ کہ بچے کی امیر بیوہ ماں کو ہمیشہ کے لئے ممنون کر لیا۔ بیوہ ماں پیٹر نے بچے کی ماں ہمیشہ ایک امیر بیوہ قرار دیتا اور ہمیں اس کے خیالات کی نوعیت پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی وہ ابھی نوجوان تھا اور اس نے ایک اچھے گھرانے میں پرورش پائی تھی یا یہ کہ تمہید میں کوئی اتفاقی حادثہ پیش نہ آئے۔ وہ ایک لڑکی کو بنچ پر تنہا بیٹھے دیکھے۔ وہ بہت خوبصورت ہو اور اس کے چہرے پر مایوسی کے آثار ہوں۔ وہ آداب مجالس کو پیش نظر رکھتے ہوئے آگے بڑھے گا ہیٹ اتارے گا اور مسکرائے گا۔ "مجھے خوب معلوم ہے آپ کا دنیا میں کوئی نہیں!" اس کا لہجہ نہایت لطیف ہوگا۔ اور اس کے چہرے پر قدرتی تبسم رقص کرتا ہوگا۔ اس کے الفاظ میں ذرہ بھر بھی لکنت نہیں ہوگی جس سے اس کے توتلے پن کا ثبوت ملے اور جو ہمیشہ گفتگو اس کے

لئے مشکل کر دیتا تھا۔ "میں جانتا ہوں آپ زندگی اکیلی بسر کرتی ہیں۔ خیر میرا بھی یہی حال ہے۔ کیا میں آپ کے پاس بیٹھ جاؤں؟" وہ مسکرائے گی اور وہ بیٹھ جائے گا۔ تب وہ اسے بتائے گا کہ وہ ایک یتیم ہے اور دنیا میں سوائے ایک شادی شدہ بہن کے اس کا کوئی نہیں اور وہ کہے گی کہ میں بھی یتیم ہوں۔ تو بس بات پکی ہو گئی۔ وہ ایک دوسرے کو بتائیں گے کہ ان کی زندگی کتنی تکلیف دہ تھی۔ وہ رو پڑے گی۔ وہ کہے گا "مت رو۔ میں تمہارا ہوں۔" یہ سن کر اس کی طبیعت قدرے سنبھلے گی۔ پھر وہ اکٹھے سینما جائیں گے اور آخر کار ان کی شادی ہو جائے گی۔ لیکن اس کہانی کا یہ حصہ کچھ مبہم سا تھا۔

لیکن کوئی ایسا اتفاق یا حادثہ وقوع پذیر نہ ہوا اور وہ ابھی تک کسی کو نہیں بتا سکا تھا کہ تنہائی کی زندگی سے وہ کتنا بیزار ہے۔ سب سے بڑا نقص اس کا توتلا پن تھا۔ وہ ایک ٹھنگنے سے قد کا اور عجیب الطرفین آدمی تھا۔ عینک استعمال کرتا تھا اور قریباً ہمیشہ اس کا چہرہ پھنسیوں سے پُر رہتا۔ اس کا سیاہ سوٹ کثرت استعمال سے نئے نئے رنگ بدلتا رہتا۔ اس کے بوٹ اگرچہ بڑی احتیاط سے پالش کئے گئے تھے لیکن پالش ان کے بساپن کو عوام کی نگاہوں سے چھپا نہیں سکی تھی اور اس سہ پہر کو اس کے دماغی انتشار کا باعث یہی بوٹ تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نواب کی لڑکی سے ٹیکسی میں کس قسم کی گفتگو کی جائے کہ دفعتہً اس کا خیال اپنے بوٹوں کی طرف منتقل ہوا۔ کتنے بھدے ہیں! اور ان امیر لڑکوں کے چمکیلے بوٹوں سے کتنے مختلف۔ یہ جب نئے تھے تب بھی کچھ کم بدنما نہ تھے۔ اب تین سال متواتر استعمال کرنے سے سونے پر سہاگے کا معاملہ ہو گیا تھا۔ ایڑیاں گھسی ہوئیں اور ٹو تو کسی کو دکھائی ہی نہیں دیتی تھی۔ پالش کے اندر سینکڑوں جھریاں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ بائیں بوٹ کی ایڑی اکھڑ گئی تھی اور دوبارہ لگوائی گئی تھی۔ جابجا سلائی کے نشان تھے۔ تین سال تسمے باندھتے اور کھولتے رہنے سے سوراخوں کا ملمع اکھڑ گیا تھا اور وہ اپنے قدرتی سفید رنگ میں ظاہر ہو گئے تھے۔

آہ۔ یہ بوٹ حقیقی معنوں میں منحوس صورت اور بیزار کن تھے لیکن ان سے تو وہ ابھی ایک سال اور گزارنا چاہتا تھا۔ پیٹر ایک دفعہ پھر رقمیں جمع کرنے لگا۔ اگر وہ روزانہ ایک آنے کی کم روٹی کھائے۔ اگر دفتر بس میں جانے کی بجائے پیدل چلا جائے۔ ۔ ۔ !

لیکن خواہ وہ کتنی احتیاط سے پیسے جمع کرتا اخیر میں سوائے بارہ چودہ آنوں کے اور کچھ جمع نہ ہوتا۔ بوٹ مہنگے تھے اور ایک دفعہ اس نے ایک جوڑا خریدنے کے لئے رقم پس انداز کر بھی لی لیکن سوٹ کا مسئلہ ہنوز لاینحل تھا۔ وہ اپنی حالت قابلِ رحم تصور کر رہا تھا کیونکہ اس نے دیکھا کہ دوسروں کے پاس تعیش کے لئے عورتیں بھی تھیں سوٹ بھی اور بوٹ بھی۔ لیکن خدا نے اسے ان میں سے ایک نعمت بھی عطا نہ کی تھی۔ حقیقت اسے آج حد سے زیادہ تلخ محسوس ہو رہی تھی۔ جونہی وہ کوئی خیالی قلعہ تعمیر کرنے لگتا بوٹ اس خوابوں کی دنیا سے واپس کھینچ لاتے۔ پھر وہ تھا یا ذہنی کرب۔

دو نوجوان لڑکیاں ہجوم سے نکلیں اور جلد ہی واٹ سٹریٹ کے راستے پر ہولیں۔ پیٹر ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اس نے محسوس کیا کہ ہوا میں ان کے گزرنے سے ایک لطیف خوشبو پیدا ہو گئی ہے۔ وہ لمبے لمبے سانس لے کر اردگرد کی تمام ہوا ایک ہی دفعہ سونگھ جانا چاہتا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اسے یقین تھا کہ وہ لڑکیاں عام انسانوں سے برتر تھیں۔ رعنائی حسن اور شباب کی ہر وہ خصوصیت ان میں موجود تھی جو شاذ ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ اس لاثانی خوبصورتی کو دیکھ کر وہ دل کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ اس لئے کہ وہ ان کے قریب ہو سکے اور شاید کوئی کرامات یا معجزہ ظہور پذیر ہو جو اس کو ان کی ہستیوں سے وابستہ کر دے اس نے قدم تیز کر لئے۔

ان کے نفیس عطر کی مہک اس کے ناک سے گزرتی ہوئی دل کو معطر کر رہی تھی۔ وہ اسے سونگھتا نہیں تھا بلکہ نگل رہا تھا گویا کہ اس کی زندگی کا انحصار ہی اس پر تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دونوں نازک اندام سرو قد تھیں۔ ایک کا کوٹ سفید رنگ کا تھا جس پر سیاہ سمور لگی ہوئی تھی۔ دوسری کا کوٹ تمام تر سمور پر مشتمل تھا۔ پہلی کی جرابیں سفید اور دوسری کی فاختئی رنگ کی تھیں۔ ایک پستہ قد سیاہ بلڈاگ ان کے ساتھ تھا جو کبھی ان کے پیچھے اور کبھی آگے ہو کر دوڑنے لگتا۔

پیٹر ان کے اتنا قریب ہو کر چل رہا تھا کہ جب ہجوم کم ہوا تو وہ ان کی گفتگو تک بخوبی سننے لگا۔ ایک کی آواز کوئل کی طرح باریک تھی اور دوسری کی قمری کی مانند لوچدار۔

"کیسا زندہ دل انسان!" قمری چہکی "حقیقی معنوں میں زندہ دل!"

"از بس بھی یہی کہتی تھی" کوئل نے رومال سے منہ صاف کرتے

ہوئے کہا۔

اور دعوت بھی نہایت پُرتکلف تھی۔ جب ہم آنے لگے تو میں نے کہا کہ بہت مشکل سے کوئی ٹیکسی دستیاب ہو گی۔ اس پر اس نے یہ فقرا چست کیا کہ اگر میں اس کے دل کے اڈے تک پہنچ گئی تو بہت سی ٹیکسیاں مل جائیں گی اور مزید براں کرایہ متقابلتہً کم ہو گا"۔۔۔۔

دونوں قہقہہ مار کر ہنسنے لگیں۔ پاس سے گزرتے ہوئے لڑکوں کے شور نے پیٹر کے کانوں تک تھوڑے عرصے کے لئے کوئی لفظ نہ پہنچنے دیا۔ وہ دل ہی دل میں ان کو کوسنے لگا "الو کے چرخے۔ یہ سرِعام کوؤں کی طرح شور مچانا کون سی عقلمندی ہے۔ یقیناً ان کے والدین سوسائٹی کے ادنٰی طبقے کے افراد ہوں گے۔

پیٹر واقعی خاموشی پسند کرتا تھا۔ دیہاتی زندگی کا وہ دلدادہ تھا یہاں تک کہ وہ اس نواب کی لڑکی کے ساتھ بھی کسی گاؤں میں زندگی بسر کرنی چاہتا تھا۔ وہ اس دنیا سے جس میں پُرتکلف دعوتیں ہوتی ہیں۔ جہاں زندہ دل انسان نوجوان دیویوں کو دل کی "ٹیکسیاں" تلاش کرنے کے لئے کہتے ہیں قطعی ناواقف تھا۔ اب وہ اس سے قدرے آشنا ہو چلا تھا۔ اسے افسوس تھا کہ آج تک وہ اس من موہنی پُرکیف اور رنگین دنیا سے کیوں اجنبی رہا۔ اب اس کے دل کی سب سے بڑی خواہش اس زریں دنیا میں داخل ہونے کی تھی۔ وہ اس کی رنگینیت حاصل کرنے کے لئے گراں سے گراں قیمت ادا کرنے کو تیار تھا۔ فرض کرو وہ دونوں اس سامنے پڑے ہوئے پتھر سے ٹھوکر کھا کر گر پڑیں۔ فرض کرو . . . .

لیکن وہ دونوں اس پتھر پر سے چھلانگ لگاتے ہوئے گزر گئیں۔ دفعتہً یاس کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں شعاعِ امید نمودار ہوئی۔

بلڈاگ دوسری طرف جا کر پودے سونگھ رہا تھا۔ جلد ہی وہ پنجوں سے زمین کریدنے اور بھونکنے لگا اُدھر سے ایک ٹیریر نے ظاہر ہو کر جواباً بھونکنا شروع کیا۔ بلڈاگ مٹی کریدنا چھوڑ کر آگے بڑھا۔ دونوں پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے گرد پھرنے لگے ناک سے سوں سوں اور منہ سے بھوں بھوں کرتے ہوئے وہ اور قریب ہوئے۔ پیٹر ٹکٹکی باندھے ایک موہوم سی امید دل میں لئے ان کو دیکھتا رہا۔ اگر کتے لڑ پڑیں تو واقعی اس کے پو بارہ تھے۔ اس کا طائرِ خیال کہیں دور پرواز کر رہا تھا۔ اگر وہ لڑ پڑیں تو جان ہتھیلی پر رکھ کر وہ دوڑ پڑے گا۔ ان کو فوراً ایک دوسرے سے علیحدہ کر دے گا۔ شاید وہ اُسے کاٹیں بھی لیکن کتوں کے ایسا کرنے سے وہ دیویوں کے شکریے کا اور زیادہ مستحق ہو گا۔ وہ چاہتا تھا کہ کتے ایک دم لڑ پڑیں۔ سب سے بری بات یہ ہو گی اگر دیویاں یا ٹیریر کا مالک کتوں کے لڑنے سے پہلے مداخلت کرے۔ "او خدا!" اس نے نہایت خشوع سے دعا مانگی "ان کو کتے بلانے نہ دینا۔ کتوں کو لڑا دو۔ یسوع مسیح کے لئے آمین"۔

لڑکے گزر چکے تھے۔ دیویوں کی آوازیں پھر سنائی دے رہی تھیں۔ قمری کہہ رہی تھی۔

"وہ کتنا گندہ آدمی ہے۔ میں نے اسے بارہا کہا ہے کہ مجھے بہودیوں سے نفرت ہے اور یہ بھی کہ میں اُسے بدصورت، بدقماش، بدوضع خیال کرتی ہوں لیکن وہ اپنی ہی ہانکے جاتا ہے"۔ "تمہیں اسے کارآمد بنانا چاہیئے" کوئل نے رازدارانہ لہجے میں کہا:

"ہاں ایسا تو میں کرتی ہی ہوں۔ ابھی کل اُس نے ایک قیمتی گھڑی مجھے بذریعہ ڈاک بھیجی تھی"۔

ایک وقفہ ۔۔۔۔ پیٹر نے دعا دہرائی۔

"اگر عاشق صاحبان اتنا سمجھ لیں کہ" ۔۔۔۔ قمری کی آواز ڈراؤنی غراہٹ اور بھونکنے کے شور میں گم ہو گئی۔ دونوں مڑیں اور ہاتھ ہلاتے ہوئے چلائیں "پونگو۔ پونگو"

لیکن ان کے بلانے پر بھی لڑائی میں کوئی تغیر رونما نہ ہوا۔ پونگو اور ٹیریر اچھل اچھل کر ایک دوسرے پر حملہ کر رہے تھے۔!!

"مامی! مامی!!" ایک چھوٹی لڑکی جو آیا کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی۔ دوڑتی ہوئی چلائی "مامی ادھر آؤ"۔۔۔

آخر وقت آن پہنچا۔ بے قراری سے انتظار کیا ہوا لمحہ آن پہنچا دل میں نعرۂ شادمانی بلند کرتے ہوئے پیٹر نے خود کو کتوں پر گرا دیا۔

"فضول، واہیات کتا!" وہ ٹیریر کو ٹھوکر مارتے ہوئے چلایا کیونکہ اس کی نگاہوں میں سارے فساد کا باعث یہی تھا اور بلڈاگ ۔۔۔۔ ان کا بلڈاگ اس کی رائے میں بے قصور تھا "پرے ہٹو!" وہ تقریباً بھول گیا تھا کہ وہ تو تلا ہے اور کوئی لفظ بھی دو تین مرتبہ کوشش کرنے کے بغیر ادا نہیں کر سکتا۔ لیکن آج وہ "پرے ہٹو" نہایت بے تکلفی سے بول رہا تھا۔ اس نے کتوں کو دُموں سے پکڑ کر کھینچا اور ان کو علیحدہ کرنے میں پوری قوت صرف کر دی مگر کامیاب نہ ہوا۔ گا ہے گا ہے وہ ٹیریر کو ٹھوکر بھی لگاتا جاتا لیکن جو کتا اُسے کاٹ رہا تھا وہ بلڈاگ تھا۔ بلڈاگ ۔۔۔۔

کم فہم بلڈاگ بے چارے پیٹر کا دلی تعلق جو اس کی مالکہ کے لئے اس کے ذہن میں قایم ہو چکا تھا سمجھنے سے قاصر تھا لیکن پیٹر کو اس پر مطلق غصہ نہ آیا اور نہ ہی اس کے کاٹنے سے کوئی درد محسوس ہوا۔ اس کے بائیں ہاتھ سے خون آہستہ آہستہ تمام انگلیاں تر کرتے ہوئے نیچے ٹپکنے لگا۔

"اف۔ اف" کومل نے درد بھرے لہجے میں کہا گویا یہ اس کا اپنا ہاتھ تھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔ "ذرا احتیاط سے کام لو" قمری نے مضطرب ہو کر کہا "ذرا احتیاط سے"

ان کی دل خوش کن آوازوں سے اس کے تھکے ہوئے اعضا میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ وہ اور تیزی سے ٹیریر کو لوٹ مار کر اور بلڈاگ کو ہاتھ سے جدا کرنے لگا۔ اور آخر غضب ناک حیوانوں کو اس نے علیحدہ کر ہی دیا۔ بلڈاگ کو کان سے پکڑتے ہوئے اس نے اوپر اٹھا لیا۔ ٹیریر اچھل اچھل کر دشمن تک پہنچنا چاہتا تھا۔ لیکن پیٹر نے ساری قوت مجتمع کر کے بلڈاگ کو جہاں تک اس کا بازو اٹھ سکتا تھا اٹھا لیا ساتھ ہی وہ ٹیریر کو ٹھوکریں لگاتا جاتا۔ چھوٹی لڑکی اور اس کی آیا اب قریب پہنچ چکی تھیں اور کچھ دیر بعد ٹیریر کو دوسری طرف گھسیٹ کر لے گئیں۔

پیٹر مڑا اور دیویوں کی طرف بڑھا۔ قمری کی آنکھیں دلکش اور چہرہ گلابی تھا۔ کومل گداز بدن اور سفید و سرخ رنگ کی تھی۔ پیٹر نے ایک سے دوسری کی طرف دیکھا اور فیصلہ نہ کر سکا کہ کونسی زیادہ خوبصورت تھی۔ اس نے پونگو کو آہستہ سے زمین پر رکھا۔ "یہ رہا آپ کا کتا ——" وہ کہنا چاہتا تھا لیکن رعبِ حسن سے یا شاید توتلے ہونے کی وجہ سے اس نے کہنا شروع کیا۔

"یہ رر۔ رر ——" لیکن وہ فقرہ مکمل نہ کر سکا۔ وہ تلملایا۔ پیر کو زور سے زمین پر مارا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کی حالت قابلِ رحم تھی ——

"یہ رر۔ رہا۔ آپپ پپ پا پکا کتا" —— آخر کار وہ کہہ ہی گیا۔

"بہت بہت شکریہ۔ مہربانی۔ نوازش"۔ کومل نے کہا۔

"شاباش تم نے بہت جوانمردی دکھائی۔ قمری بولی "تمہارا زخم زیادہ خطرناک تو نہیں؟"

"اوہ۔ یہ کک کچھ بھی نہیں"۔ پیٹر نے ہاتھ پہ رومال شانِ استغنا سے لپیٹتے ہوئے کہا۔

"لیکن کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ خطرناک نہیں؟" قمری نے اصرار کیا۔ "ذرا مجھے دکھانا تو"

پیٹر نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے رومال کھولا اور ہاتھ سامنے کر دیا۔ اس نے سوچا کہ ابھی تک سب کچھ اس کی امید کے مطابق ہو رہا ہے۔ اس نے دیکھا کہ اس کے ناخنوں میں میل بھری ہوئی تھی۔ کاش —— کاش کہ صبح نہاتے وقت اسے ناخن صاف کرنے کا خیال آیا ہوتا! وہ کیا خیال کریں گی! شرماتے ہوئے اس نے رومال باندھنے کی کوشش کی۔ لیکن قمری نے اسے ایسا کرنے سے روکا۔

"ذرا ٹھہرنا" اس نے کہا اور پھر تشویشناک لہجے میں بولی۔ "زخم بہت گہرا ہے۔" "خطرناک" کومل نے اس کے ہاتھ پر سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "مجھے سخت افسوس ہے کہ میرے کتے نے ——"

"تمہیں فوراً کسی ڈاکٹر کے پاس جا کر پٹی بندھوانی چاہئے" قمری نے اس کے ہاتھ سے نگاہیں اٹھا کر اس کے چہرے کی جانب اٹھائیں "ہاں ڈاکٹر کے پاس"۔ کومل نے تائید کی۔

پیٹر بہکے ہوئے شخص کی طرح ایک سے دوسری کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مدہوشی اس کی رگ و پے میں سرائت کرتی جاتی تھی۔ وہ آنکھیں —— ہمدردی سے لبریز آنکھیں۔ وہ مسکرایا۔ سر کو اس طرح حرکت دی گویا خواب دیکھ رہا ہو۔ ہاتھ کو جلدی سے رومال میں لپیٹا اور بولا۔

"یہ کچھ بھی نہیں۔"

"نہیں ڈاکٹر کو ضرور دکھاؤ"۔

"ہاں ضرور"

"کک کچھ بھی نہیں"۔ وہ ڈاکٹر کے پاس نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش دیویوں کے پاس ٹھہرنے کی تھی۔ کومل قمری کی طرف مڑی اور دونوں سرگوشیاں کرنے لگیں۔ قمری نے پلٹ کر پیٹر کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ اس کے سستے ہیٹ سے اس کے سستے بوٹوں پر اس کے زرد چھائیوں بھرے چہرے سے اس کے گندے ہاتھوں پر اس کی لوہے کی کمانیوں والی عینک سے اس کے بغیر گھڑی کے تسمے پر سے ہوتی ہوئی اس کا جائزہ لینے لگی۔ پیٹر نے دیکھا کہ وہ اس کی طرف غور سے دیکھ رہی ہے۔ وہ ایک شرمیلے انداز میں مسکرایا۔ وہ کتنی خوب صورت تھی! وہ سوچنے لگا کہ دونوں آپس میں کیا کانا پھوسی کر رہی تھیں۔ شاید معاملہ زیر بحث یہ تھا کہ اسے (پیٹر کو) چائے پر مدعو کیا جائے۔ اور جوں ہی یہ خیال اس کے ذہن میں گزرا اس کا

یقین ہوگیا۔ کیسا اتفاق تھا۔ سب کچھ اس کے خوابوں کے مطابق واقع ہو رہا تھا۔

قمری نے جھک کر کوئل کے کان میں کچھ کہا۔ کوئل نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور جیب میں ہاتھ ڈال کر بٹوا نکالا۔

"تم نے بہت جوانمردی دکھائی" قمری نے پیٹر سے مخاطب ہوکر اپنا فقرہ دہرایا۔ پیٹر جواب میں صرف سر ہلا سکا۔ اس نے ان شفاف، جادو بھری نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے نظریں نیچے جھکا لیں۔ اس کی خواہش تھی کہ اسے بغور دیکھے۔ مگر ایسا کرنے کی جرأت اپنے میں نہ پائی۔

"شاید تم کتوں کی عادات سے بخوبی واقف ہو؟" اس نے پوچھا "تمہارا اپنا کتا ہے؟"

"نہ۔ نہیں،"

"خیر اس سے تمہاری بہادری کی قیمت اور زیادہ بڑھ گئی" قمری نے یہ کہتے کہتے اس کا ہاتھ پکڑ کر گرمجوشی سے دبایا "اچھا خدا حافظ"۔ اس نے ہنس کر کہا "ہم تمہارے بہت شکرگذار ہیں"۔

ہیں۔ ہیں کیا وہ جا رہی ہیں؟ پیٹر نے دفعتہً سہانے خواب سے چونکتے ہوئے سوچا۔ سچ مچ جا رہی ہیں؟ اس کو چائے پر مدعو کرنے یا اپنا نام و نشان بتلائے بغیر؟ وہ چاہتا تھا کہ دیویاں کوئی دم اور اس کے پاس ٹھہریں۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اپنا عندیہ کبھی الفاظ میں ظاہر نہیں کرسکے گا۔ وہ اس شخص کی مانند تھا جو آنکھوں کے سامنے اپنی بربادی دیکھ رہا ہو۔ لیکن کوئی مزاحمت نہ کرسکے۔ "آ۔ پ" اس نے جرأت سے کام لیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ لیکن اس سے پیشتر کہ وہ جملہ پورا کرے دوسری اس کا ہاتھ پکڑ کر زور سے ہلانے لگی۔

"تمہارے جیسے دلیر انسان دنیا میں بہت کم پائے جاتے ہیں"، کوئل نے کہا "لیکن ڈاکٹر کو ضرور زخم دکھانا۔ اچھا خدا حافظ ——" یہ الفاظ ادا کرتے کرتے اس نے سلیقے سے تہ کیا ہوا ایک پاؤنڈ کا نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی انگلیوں میں دبا دیا۔

پیٹر کا سارا خون سمٹ کر اس کے چہرے میں اکٹھا ہوگیا۔ اس نے سر ہلایا "نہ۔ نہ" وہ بولنے لگا نوٹ کو واپس کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے مسکرا کر کہا "میری خاطر یہ قبول کرلو" اور یہ کہتے ہی اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ دوڑ کر قمری کے پاس جا پہنچی جو اس عرصے میں پونگو کی زنجیر پکڑے چل رہی تھی۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ کوئل نے اس کے پاس جاتے ہی کہا۔

"اس نے لے لیا؟"

"ہاں" بات کا رخ بدلتے ہوئے "ہاں تو مسئلہ زیر بحث کیا تھا؟"

. . . .

"نہ۔ نہ۔ نہیں۔" آخر پیٹر نے کہا۔ لیکن وہ تو کب کی جا چکی تھیں اس نے ایک دو قدم ان کی سمت میں اٹھائے لیکن پھر رک گیا۔ یہ مناسب نہ ہوگا۔ وہ اس کے جذبات کو نہیں سمجھ سکیں گی۔ شاید وہ گلوخلاصی کرانے کے لئے ایک اور نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیں اور چلتی بنیں۔ وہ انہیں دیکھتا رہا حتیٰ کہ وہ بازار کی دوسری جانب جاکر آنکھوں سے اوجھل ہوگئیں۔

اس کی نگاہِ تخیل میں سارا منظر از سر نو پھر گیا۔ ایسے نہیں جیسے کہ وہ حقیقی طور پر تھا بلکہ ایسے جیسا کہ اسے ہونا چاہئے تھا۔

جب کوئل نے نوٹ اس کے ہاتھ میں دیا تو اس نے مسکرا کر واپس کرتے ہوئے کہا "معاف کیجئے آپ کو غلطی ہوئی۔ ایک قابل درگزر غلطی۔ میں مانتا ہوں میری ظاہری ہیئت میری غریبی کا راز فاش کر رہی ہے۔ لیکن یقین جانئے میں ایک شریف آدمی ہوں۔ میرا باپ ایک ڈاکٹر تھا اور میری ماں ایک ڈاکٹر کی لڑکی ہیں ان کی موت تک ایک اچھی درسگاہ میں تعلیم پاتا رہا۔ میں سولہ برس کا تھا کہ وہ اس دار فانی سے یکے بعد دیگرے رخصت ہوگئے۔ اب مجھے اپنی روزی آپ کمانی پڑی لیکن میں کمینہ نہیں ہوں۔ آپ کے پیسے کو ہاتھ لگانا حرام جانتا ہوں۔ میں نے ان کتوں کو اس لئے لڑنے سے روکا کہ میں آپ اور آپ کی سہیلی کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ آپ کتنی معصوم کتنی خوب صورت کتنی بھولی ہیں" کوئل اس کی تقریر سے بہت متاثر ہوئی۔ اس نے پیٹر کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس سے معافی مانگی۔ معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ پھر کوئل نے اس سے پوچھا کہ وہ ان کے ساتھ چائے پینا گوارا کرے گا؟ اس سے آگے پیٹر کے خیالات زیادہ دھندلے ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ دفعتہً نواب کی لڑکی، منتک بیوہ اور یتیم دوشیزہ کی تصویریں اس کی آنکھوں کے آگے ناچنے لگیں —— لیکن ان سب فرضی باتوں کی بجائے اس وقت تو دو دیویاں تھیں اور ان کے وجود خیالی نہیں بلکہ حقیقی تھے۔

یہ ہوائی قلعے تعمیر کرتے ہوئے بھی وہ جانتا تھا کہ واقعات اس

طرح معرضِ وجود میں نہیں آئے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے کچھ کہنے سے پیشتر ہی چل گئیں۔ اگر وہ ان کے پیچھے دوڑتا تب بھی اپنا مطلب واضح نہیں کر سکتا تھا۔ شاید وہ اس کے توتلے پن کا مذاق اڑاتیں۔ اس نے نوٹ لے لیا تھا۔ انہوں نے شاید اسے ایک بازاری لونڈا سمجھا جس نے یہ خطرہ اس لئے مول لیا تھا کہ کوئی بخشیش ملے۔ انہوں نے اسے اپنے برابر بھی نہ سمجھا اور تم کو ہی استعمال کرتی رہیں۔ چائے اور اپنا نام یا گھر کا پتہ بتانے کا تو ذکر ہی کیا . . .

لیکن اس کا تخیل ہنوز بڑے انہماک سے مصروفِ کار تھا۔ اس نے سوچا کہ نوٹ بغیر کچھ کہے سنے اُن کی طرف پھینکا جا سکتا تھا۔ اس نے ایسا کیوں نہ کیا؟ لیکن ایسی حالت میں اس پہ سست ہونے کا الزام عاید نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بہت جلد کھسک گئی تھیں اور یہی اصلی سبب تھا۔ اور پھر اگر وہ ان کا تعاقب کرتا تو نوٹ کسی چھوکرے کے ہاتھ واپس بھیجا جا سکتا تھا۔ ایک عمدہ ترکیب —— لیکن اس پر عمل کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔

ساری سہ پہر پیٹر پھرتا رہا۔ پیٹھ پر دونوں ہاتھ رکھے آنکھیں جھکائے پھرتا رہا۔ کبھی کبھی اپنی غریبی کا خیال اس کے بدن میں سنسنی سی پیدا کر دیتا۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے رکتا اور پھر چلنے لگ پڑتا۔

دن ڈھلنے لگا۔ دھندلی ملگجی تاریکی میں عاشق نے محبوبہ کو اور زور کے ساتھ بھینچا۔ زرد قندیلوں کی قطار دفعتہً جاگ اٹھی اور اونچے آسمان میں چاند کا ایک چوتھائی حصہ نظر آ رہا تھا۔ تنہائی اور رنج تنہائی اس کے لئے اب ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ وہ پارک سے نکلا اور آہستہ آہستہ ایک چائے کی دکان کی طرف چل دیا۔

"ہاتھ کیسے زخمی کیا؟" خادمہ نے پوچھا

"اسے۔ اسے۔ اسے ایک کتے نے کاٹ کھایا!"

اور یہ کہتے ہی دبے ہوئے جذبات میں ازسرِ نو اشتعال پیدا ہوا۔ ہاں انہوں نے اسے ایک بازاری لونڈا سمجھا۔ جیسے کہ وہ انسان نہیں تھا۔ گویا کہ کرائے کا مزدور تھا جسے معاوضہ دینے کے بعد مزید توجہ دینے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس ذلت کے خیال ہی میں اتنا لپس بھرا تھا کہ یاد آتے ہی نہ صرف اسے ذہنی کرب بلکہ جسمانی کوفت کا بھی شکار ہونا پڑا۔ اس کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔

آخر رنج و غم، شرمساری و ناکامی کے خیالات لئے وہ دکان سے باہر نکلا۔ اگرچہ بہت تھکا ہوا تھا لیکن اس نے اپنی بے مقصد گشت کو برابر جاری رکھا۔ بازاروں سے گزرتا ہوا۔ عالی شان عمارتوں پہ نگاہ غلط انداز ڈالتا ہوا وہ گلیوں سے ہو کر واپس جانے لگا۔

ایک عورت تیزی سے اس کے سامنے آ کر رُک گئی۔ "جانی" اس نے چھوٹتے ہی کہا، "بڑے اُداس معلوم ہوتے ہو۔"

پیٹر نے اس کی طرف حیرت زدہ آنکھوں سے دیکھا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ وہ اس سے باتیں کر رہی تھی۔؟ ایک عورت —— کیا یہ ممکن تھا!۔ وہ خوب جانتا تھا کہ لوگ ایسی عورتوں کو برا سمجھتے ہیں لیکن اس کا پیٹر سے مخاطب ہونا کچھ کم تعجب کی بات نہ تھی۔ اس کی برائی پر اس کے تعجب کا پردہ پڑ گیا۔

"آؤ نہ میرے ساتھ،" وہ بولی۔

پیٹر چل پڑا۔ اسے یقین نہ تھا کہ یہ سب کچھ سچ ہے۔ عورت اس کے بازو میں بازو ڈال کر ساتھ ہو لی۔

"مال تو تمہارے پاس ہو گا ہی؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

پیٹر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیا کسی جنازے سے واپس آ رہے ہو؟ شکل سے وحشت ٹپکتی ہے۔"

"مم۔ مم۔ میں اکیلا ہوں۔ تنہا۔ واحد۔" پیٹر نے گھگھیا کر کہا وہ رونے کو تیار تھا۔ وہ رونا چاہتا تھا۔ رو کر دل کی بھڑاس نکالنا چاہتا تھا۔ اس کی آواز ٹوٹے ہوئے تار کی طرح کانپ رہی تھی۔

"اکیلے ہو! کیسی عجیب بات ہے! تم جیسا بانکا جوان اور اکیلا!" وہ ہنسی۔ اس کی ہنسی خشک اور جذبات سے خالی تھی۔

اس کے کمرے میں مدھم سی روشنی تھی۔ سستے عطر کی خوشبو یا بدبو ہوا میں موجود تھی۔

"ایک منٹ ٹھہرنا" اس نے کہا اور ایک دروازہ کھول کر غائب ہو گئی۔ وہ بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ وہ جلد ہی واپس آ گئی اور اس کے زانوؤں پر بیٹھ گئی۔ برہنہ باہیں اس کے گلے کے گرد حائل کر دیں۔ اور بوسوں کا ایک تانتا سا باندھ دیا۔ اس کی آنکھیں پژمردہ اور ڈراؤنی تھیں۔ نزدیک سے دیکھنے پر اس سے گھن آتی تھی۔

پیٹر نے سب کچھ دیکھا —— اس کے روکھے بوسوں کی حقیقت سمجھا۔ اس نے منہ پھیر لیا۔ نواب کی لڑکی یتیم دوشیزہ اور بیوہ

جس کا لڑکا تالاب میں گر پڑا۔ کوئل اور قمری اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ اوہ۔ اوہ۔ آہ۔ اس نے اسے زور سے پرے دھکیلا اور اچھل کر کھڑا ہوگیا۔

"معاف کرنا۔ مجھے اسے۔ اسے ایک ضروری کام ہے۔"
اس نے ہیٹ اٹھا لیا اور دروازے کی جانب مڑا۔

وہ عورت اس کے پیچھے دوڑی اور اسے بازو سے پکڑ لیا۔ "پاجی خبیث ایک لڑکی کو بلانا اور پھر بغیر ادا کئے کھسک جانا"
——— اور پھر گالیوں کا ناخوشگوار سلسلہ شروع ہوا۔

پیٹر نے ہاتھ جیب میں ڈالا۔ کوئل کا سلیقے سے تہ کیا ہوا نوٹ نکالا۔ "ہم۔ ہم مجھے جانے دو۔" اس نے نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

جب وہ مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے نوٹ کو کھول رہی تھی۔ وہ نکل بھاگا۔ اپنے پیچھے دروازہ زور سے بند کرتے ہوئے اور تاریک سیڑھیوں کو پھلانگتے ہوئے وہ گلی میں جا پہنچا۔

(ترجمہ)

اقبال

رباعی

آ جام اٹھا حدیثِ فردا مت پوچھ
کس اوج پہ ہیں مے مینا مت پوچھ
ساقی نے الٹ دیا جہاں ساغر کو
اس خاکِ فلک نشاں کا رتبہ مت پوچھ

سعید احمد اعجاز

اعجازِ بیان

کیا کہئے شباب ان کا اب کیا نظر آتا ہے
اک جام چھلکتا ہے، ایسا نظر آتا ہے

پہلو میں وہ بیٹھے ہیں، سینے سے وہ لپٹے ہیں
کیا حسنِ تصور ہے، کیا کیا نظر آتا ہے

فطرت کے پسِ پردہ اس دیدۂ بینا کو
اک شاہدِ رنگیں کا جلوا نظر آتا ہے

بکھری ہے ثریا تک سرمستی و سرشاری
یہ گنبدِ مینائی مینا نظر آتا ہے

اعجازؔ یہ میخانہ مدت سے تھا ویرانہ
پھر آج ترے دم سے شیشہ نظر آتا ہے

سعید احمد
اعجازؔ

بہار

فصلِ بہار جہاں میں آئی،

فصلِ بہار جہاں میں آئی دنیا جاگی لی انگڑائی
شاخ شاخ میں روح سمائی بلبل چہکی شاما گائی
فصلِ بہار جہاں میں آئی

پتّے نکلے جوشِ نمو سے دشت و جبل مہکے خوشبو سے
گونجے کوئل کی کوکو سے آزادوں نے دھوم مچائی
فصلِ بہار جہاں میں آئی

فرشِ زمرّد کا کیا کہنا ارزاں کپڑے سستا گہنا
شاخوں نے پھر خلعت پہنا دُلھن کی ایسی شکل بنائی
فصلِ بہار جہاں میں آئی

جُھرمٹ باندھ پرندے آئے ٹہنی پکڑی پاؤں جمائے
پھولے اُچھلے پر پھیلائے بے خود ہو کر تان اڑائی
فصلِ بہار جہاں میں آئی

بیلیں لپکیں آتاروں پر دروازوں پر دیواروں پر
بادل گرجا گلزاروں پر چاروں کونے رونق چھائی
فصلِ بہار جہاں میں آئی

سردی گرمی دونوں کم کم تازی ہوا گوارا موسم
ہلکی بارش بھاری بھر کم پتّے دھوئے گرد دبائی
فصلِ بہار جہاں میں آئی

سیفی نوگانوی

سررشتۂ تالیف و ترجمۂ جامعہ عثمانیہ

اور اس کی خدمات

سلطنت آصفیہ نے علوم و فنون اور اردو کو جو ترقی دی ہے وہ کبھی بھلائی نہیں جا سکتی۔ نواب میر نظام علی خاں کے عہد حکومت سے لے کر نواب میر محبوب علیخاں بہادر کے عہد حکومت تک علوم و فنون کی سرپرستی کی جاتی رہی اور علماء فضلا و شعرا کی غیر معمولی امداد کی گئی یہی وجہ ہے کہ آزاد بلگرامی سے لے کر شاہ نصیر اور داغ دہلوی تک ہزاروں علما و شعرا سرزمین دکن میں آسودہ نظر آتے ہیں۔ مگر یہ ابتدائی دور تھا گویا دکن کی علم نوازیوں اور ادب پروریوں کا عہد طفولیت تھا۔ شباب اس وقت آیا جب ہز اگزالٹڈ ہائنس نواب سر میر عثمان علی خاں بہادر نے تخت ریاست پر جلوہ فرمایا۔ حضور کے تخت نشین ہوتے ہی ملک میں ایک جان سی پڑ گئی اور چند ہی سال میں دکن کیا سے کیا ہو گیا۔ ایک عثمانیہ یونیورسٹی ہی کو لیجئے حضور نے نہ صرف اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنا کر اردو کو بقائے دوام کا خلعت سرفراز فرما دیا بلکہ مادری زبان کے ذریعۂ تعلیم قرار پانے کی وجہ سے ہر شخص کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور ڈگری پانے میں سہولت ہو گئی۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ حیدرآباد میں ایک پی ایچ ڈی سیاحت کناں وارد ہو گیا تھا جسے لوگوں نے تماشا بنا لیا دیکھنے جاتے تھے کہ آخر پی ایچ ڈی ہوتا کیسا ہے۔ مگر اب خدا کے فضل و کرم سے ملک میں ہزاروں پی ایچ ڈی ایل ایل ڈی، ڈی سی ایل، ڈی فل، ڈی لٹ، وغیرہ موجود ہیں جو دکن ہی کے نونہال اور جامعہ عثمانیہ کے فرزند ہیں۔

من جملہ اور کار آمد سررشتوں کے ایک سررشتۂ تالیف و ترجمہ بھی ہے جس نے ملک کی تعمیری خدمت اور اردو کی غیر معمولی دستگیری کی ہے۔ کسی قوم میں زندگی کے آثار اس وقت تک محسوس نہیں ہوتے جب تک کہ وہ جد و جہد نہ کرنے لگے اور علمی ادبی ترقی کے لئے غیر زبانوں کے ذخیرے کو اپنی زبان میں منتقل نہ کرے۔ چنانچہ اسی خیال کے تحت سررشتۂ تالیف و ترجمہ قائم ہوا جس کے ساتھ ہی ساتھ مجلس وضع اصطلاحات بھی قائم ہو گئی اور عمدہ طریقے پر کام شروع کر دیا گیا۔

۱۷ء ۱۹ء موافق ۱۹۳۵ء ریکم آبان ۱۳۲۶ف) میں دار الترجمہ قائم ہوا، جس کے ارکان حسب ذیل مقرر کئے گئے۔

(۱) عبدالحق بی اے، ناظم (۲) قاضی محمد حسین ایم اے، رینگلر مترجم ریاضیات۔ (۳) چودھری برکت علی بی ایس سی مترجم سائنس (۴) سید ہاشمی فرید آبادی، مترجم تاریخ: (۵) محمد الیاس برنی ایم اے، مترجم معاشیات (۶) قاضی تلمذ حسین ایم اے، مترجم سیاسیات، (۷) ظفر علی خاں بی اے، مترجم تاریخ، (۸) عبدالماجد بی اے مترجم فلسفہ و منطق (۹) مولوی عبدالحلیم شرر مولف تاریخ اسلام (۱۰) سید علی رضا بی اے۔ مترجم قانون۔ (۱۱) مولوی عبداللہ عمادی مترجم عربی (۱۲) حاجی صفی الدین ناظر مذہبی (۱۳) علی حیدر طباطبائی، ناظر ادبی؛

ان مترجموں کے علاوہ مصحح منتظم، اہلکار وغیرہ ایک خاصا عملہ مقرر کیا گیا۔

کتابوں کے تراجم کا انتظام اس طرح کیا جانے لگا کہ جامعہ عثمانیہ کی مجلس نصاب جس کتاب کے ترجمہ کی ضرورت محسوس کرتی اسے مجلس اعلیٰ سے منظوری لے کر دار الترجمہ میں روانہ کر دیتی اور دار الترجمہ اس کے ترجمہ کا انتظام شروع کر دیتا، قبل ازیں جن ارکان کے نام لکھے گئے وہ تنخواہ یاب یعنی ملازم ارکان یا مترجم ہیں ان کے علاوہ ملک کے اور بیرون ملک کے قابل افراد کو بھی دار الترجمہ کا رکن بنایا گیا ہے جن کو معاوضہ دے کر ترجمہ کرایا جاتا ہے۔

اس وقت اراکین اور عملۂ دار الترجمہ کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

افسران

ناظم ۱ (۵۰۰ اضافہ سالانہ ۵۰ تا ۱۰۰۰) مترجم ۱۱ (۳۵۰ اضافہ ۲۵ تا ۶۰۰) ۹ (۲۰۰-۱۵-۴۰۰) ۱ (۳۰۰) ۳ (۵۰۰) جملہ ۲۵ نفر۔ میزان خرچ (۱،۳۴،۵۳۰) روپیہ سالانہ

عملہ اہلکاران اور ادنیٰ ملازمین کے مشاہرے ملاکر۔

جملہ میزان خرچ دارالترجمہ ۴۲ف (۱۵۷،۹۳) و ۴۴ف (۱،۶۰،۷۹۲) روپیہ سکہ عثمانیہ

اس کے علاوہ مطبع کا خرچ حقیقی ۴۴ف (۱،۴۵،۲۳۱) روپیہ سکہ عثمانیہ۔ دیکھو موازنہ تفصیلی ۱۳۴۴ف ص ۸۵۔

اس طرح دارالترجمہ اور اس کے پریس پر مندرجہ ذیل رقوم ہر سال خرچ ہوتے ہیں۔

خرچ حقیقی سررشتہ تالیف و ترجمہ ۱۳۴۲ف (۱،۹۲،۶۱۷) ۴۳ف (۲،۵۶،۷۳۶) ۴۴ف (۲،۵۹،۲۸۰) سکہ عثمانیہ۔

خرچ حقیقی مطبع ۱۳۴۲ف (۸۰،۳۴۰) ۴۳ف (۱،۴۹،۸۲۹) ۴۴ف (۱،۶۲،۸۹) سکہ عثمانیہ۔

(دیکھو موازنہ جمع و خرچ ۱۳۴۴ف ص ۱۶۱ خرچ صدر مد ۳۴ تعلیمات)

اس وقت حسب ذیل ارکان دارالترجمہ کے کارگزار ہیں۔

(۱) محمد الیاس برنی ناظم (۲) عبداللہ عمادی مترجم عربی، (۳) قاضی تلمذ حسین مترجم پولیٹکل سائنس، (۴) مسعود علی محوی بی۔اے۔ (۵) سید ابراہیم مترجم عربی (۶) فضل کریم خاں۔ ایم۔ بی بی ایس مترجم طبعیات (۷) عثمان خاں مترجم طبعیات (۸) سردار بلدیو سنگھ مترجم سائنس، (۹) ڈاکٹر سید مختار حسین مترجم طب (۱۰) ڈاکٹر غلام دستگیر مترجم طب (۱۱) ڈاکٹر محمد حسین مترجم طب (۱۲) فدا علی طالب، مترجم فارسی، (۱۳) محمد احسان احمد بی اے مترجم فلسفہ (۱۴) رشید احمد بی اے مترجم معاشیات، (۱۵) ابوالخیر مودودی مترجم عربی (۱۶) نذیر الدین ایم اے مترجم ریاضی، (۱۷) عبدالستار ایم اے مترجم تاریخ۔ (۱۸) خواجہ عبدالقدوس ایم اے مترجم فلسفہ

(دیکھو سول لسٹ مصححہ تا یکم آذر ۱۳۴۳ف)

قیام دارالترجمہ کے بعد حسب ذیل ارکان مجلس وضع اصطلاحات کے لئے مقرر کئے گئے۔

(۱) مولوی مرزا مہدی خاں کوکب (۲) مولوی حمید الدین بی اے۔ (۳) مولوی سید علی حیدر طباطبائی (۴) مولوی وحید الدین سلیم (۵) مولوی عبدالحق بی اے (۶) خان فضل محمد خاں ایم اے رینگلر، (۷) مولوی عبدالواسع، (۸) مولوی عبدالرحمن خاں (۹) مولوی مرزا ہادی رسوا بی اے (۱۰) مولوی سید سلیمان ندوی (۱۱) مولوی سید راس مسعود، ان میں سے نمبر ۲ و ۳ و ۴ و ۷ و ۹ نے انتقال کیا اور نمبر ۱ حیدرآباد سے چلے گئے جس کی وجہ سے ایک دوسری مجلس کی تشکیل کی گئی جس میں پروفیسران کلیہ جامعہ عثمانیہ، میڈیکل کالج، ٹیکنیکل کالج، ٹریننگ کالج کے علاوہ مترجمان دارالترجمہ اور باہر کے علم دوست اور ماہر فن حضرات بھی شریک کئے گئے ہیں۔

ارکان دارالترجمہ جو ملازم اور تنخواہ یاب ہیں ان کے علاوہ ان ارکان کو جو دارالترجمہ کے ملازم نہیں مگر دارالترجمہ کی کتب کا ترجمہ کرتے ہیں حسب ذیل معاوضہ دیا جاتا ہے۔

میٹرکیلیشن کی نصابی کتب کے ترجمہ کے لئے کیمیا کی کتابوں پر فی صفحہ انگریزی تین روپیہ سکہ عثمانیہ ریاضیات کی کتابوں پر فی صفحہ تین روپے سکہ عثمانیہ۔

انٹرمیڈیٹ کی نصابی کتب کے لئے کیمیا، ریاضیات، اور طبعیات پر فی صفحہ انگریزی پانچ روپیہ سکہ عثمانیہ اور فلسفہ و تاریخ کے لئے فی صفحہ انگریزی تین روپیہ سکہ عثمانیہ،

بی۔اے کی نصابی کتب کے لئے، کیمیا، ریاضی اور طبعیات پر فی صفحہ انگریزی چھ روپیہ سکہ عثمانیہ۔ فلسفہ کی کتب پر پانچ روپیہ سے سات روپیہ سکہ عثمانیہ تک اور معاشیات پر فی صفحہ پانچ روپیہ سکہ عثمانیہ۔ تاریخ کے لئے ایک روپیہ بارہ آنے سے تین روپیہ فی صفحہ تک۔ قانون کے لئے چھ روپیہ فی صفحہ سکہ عثمانیہ۔ ایم اے کی نصابی کتب کے لئے سائنس اور ریاضی فی صفحہ آٹھ روپیہ۔ تاریخ فی صفحہ تین روپیہ۔ فلسفہ چھ روپیہ، اور سات روپیہ فی صفحہ انگریزی اور جرمنی کے لئے۔

طبی کتب کے ترجمہ کے لئے فی صفحہ چھ روپیہ اور آٹھ روپیہ۔ انجنیرنگ کے لئے چھ روپیہ سکہ عثمانیہ بعد ترجمہ نظر ثانی کے لئے سو صفحہ کے لئے تیس روپے سے ساٹھ روپیہ سکہ عثمانیہ تک۔

ترجمہ اور تالیف شدہ کتب کو مذہبی نقطہ نظر سے جانچنے کے لئے تاکہ اس میں کوئی بات ایسی نہ رہ جائے جو کسی مسلم عقیدے کے خلاف ہو ایک ناظر مذہبی مقرر ہے جس کی تنخواہ پانچ سو روپیہ ماہوار ہے۔ اسی طرح ادبی نقطہ نظر سے جانچنے کے لئے کہ عبارت بے ربط نہ ہو اور زبان و محاورے کی غلطیاں نہ رہ گئی ہوں ایک ناظر ادبی مقرر ہے جس کی ماہوار تنخواہ پانچ سو

روپیہ سکۂ عثمانیہ ہے۔

مجلس وضع اصطلاحات کی شرکت کے لئے فی میٹنگ ہر ایک رکن کو بطور فیس یا خرچہ سواری پانچ روپیہ دیئے جاتے ہیں۔

دارالترجمہ نے کم تعداد میں سہی مگر چند مفید تالیفات بھی شائع کی ہیں چنانچہ ان کی تفصیل یہ ہے۔

اب تک دارالترجمہ نے تاریخ ہند پر (۳۳) تاریخ انگلستان پر (۶) تاریخ یورپ پر (۸) تاریخ یونان پر (۷) تاریخ روما پر (۸) تاریخ اسلام پر (۱۵) جغرافیہ پر (۵) سیاسیات پر (۶) دستور انگلستان پر (۳) معاشیات پر (۶) عمرانیات پر (۲) فلسفہ پر (۱۰) منطق پر (۴) مابعد الطبیعیات پر (۲) نفسیات پر (۹) اخلاقیات پر (۵) قانون پر (۹) ریاضیات پر (۱۹) طبعیات پر (۱۸) کیمیا پر (۹) طب پر (۳) انجنیری پر (۲۱) اصطلاحات پر (۱) جملہ (۲۰۴) دوسو چار کتابیں شائع کیں جن میں سے بعض تالیفات اور باقیہ جرمن، انگریزی، عربی، فارسی، بہترین کتب کے تراجم ہیں (۷۷) کتب ترجمہ و تالیف شدہ زیر طبع ہیں اور (۳۷) کتب زیر ترجمہ و تالیف ہیں جن کی مجموعی تعداد ۲۶۹ ہوتی ہے۔

ابتداءً دارالترجمہ قایم ہوا تو مولوی محمد عبدالحق بی اے (علیگ) معتمد انجمن ترقی اردو ناظم مقرر کئے گئے اور ۱۱ ستمبر ۱۹۱۷ء سے ۵ ستمبر ۱۹۱۹ء تک ناظم رہے، مولوی صاحب ہی نے تنظیم کی اور اراکین کا انتخاب وغیرہ کرکے اپنے خاص خاص اعتماد کے آدمیوں کو دارالترجمہ میں رکھا۔

۲۲ جنوری ۱۹۲۱ء سے ۲۹ جنوری ۱۹۳۵ء تک مولوی عنایت اللہ صاحب بی اے، دہلوی، ناظم دارالترجمہ رہے۔ مولوی عنایت اللہ نہ صرف اچھے انشا پرداز اور عمدہ مترجم ثابت ہوئے بلکہ مترجمین کو مدد بھی بہت دیتے رہے مگر افسوس ہے کہ مولوی صاحب کو دفتری کاروبار سے دلچسپی اور انتظامی تجربہ نہ تھا جس کی وجہ سے دارالترجمہ اور پریس کی حالت کچھ زیادہ اچھی نہ رہ سکی اور نہ مطبوعات کی تشہیر و فروخت کا معقول انتظام ہی ہو سکا۔ چونکہ مولوی صاحب کی مدت ملازمت ختم ہو رہی تھی اس لئے وظیفہ (پنشن) پر سبکدوش کئے گئے اور ایک لائق، سمجھدار تجربہ کار مترجم کا نظامت کے لئے انتخاب عمل میں آیا چنانچہ مولوی محمد الیاس برنی نے ۳۰ جنوری ۱۹۳۵ء کو نظامت دارالترجمہ کا جائزہ لیا۔

مولوی الیاس برنی ایم اے، ملک کے ممتاز عالم اقتصادیات ہونے کی حیثیت سے ۱۲ ستمبر ۱۹۱۷ء کو دارالترجمہ کے مترجم اقتصادیات مقرر کئے گئے۔ ۲۸ اگست ۱۹۱۹ء سے جامعہ عثمانیہ نے آپ کی خدمات پروفیسر معاشیات کی حیثیت سے حاصل کیں، مگر آخر میں آپ کو پھر دارالترجمہ نے کھینچ لیا،

چونکہ مولوی برنی دارالترجمہ کے کام سے تفصیلی طور پر واقف ہونے کے علاوہ انتظامی سلیقہ بھی رکھتے ہیں۔ ایک عالم اقتصادیات کی حیثیت سے آمد و خرچ کی بھی فکر رکھیں گے اس لئے دارالترجمہ کی نظامت پر آپ کا انتخاب نہایت موزوں ہوا ہے۔ امید ہے کہ اب دارالترجمہ باضابطہ کام شروع کر دے گا اور معمولی بے ترتیبیاں جو درمیان میں پیدا ہو گئی تھیں اب باقی نہیں رہیں گی۔

دارالترجمہ نے اب تک جس قدر انگریزی جرمن وغیرہ زبانوں کی کتابیں ترجمہ کی ہیں، ان کے ناشروں سے ترجمہ کی اجازت لینے کے بعد ترجمہ کرایا گیا ہے اور اکثر ناشروں کو حسب شرائط معاوضے بھی دیئے گئے ہیں،

ترجموں میں یہ لحاظ رکھا گیا ہے کہ ترجمہ صحیح ہو، واضح ہو، سلیس ہو اور رواں ہو،

ترجمہ کرنے کے بعد اولاً مترجم خود نظر ثانی کرتا ہے اور اس کے بعد اگر ضرورت ہو تو متعلقہ پروفیسر سے یا اس موضوع کے کسی ماہر سے نظر ثانی کرائی جاتی ہے، اس دوبارہ نظر ثانی کے لئے پہلے معاوضہ دیا جاتا تھا۔ مگر اب نہیں دیا جا رہا ہے۔

اب تک مترجمین دارالترجمہ نے جو رکن اور تنخواہ یاب ہیں (۸۹) کتابوں کا ترجمہ کیا ہے، اور غیر ملازم اصحاب نے معاوضہ پر (۱۵۷) کتابوں کا ترجمہ کیا ہے، اور (۳۹) کتابیں اس وقت زیر ترجمہ ہیں بعض خاص خاص فنی کتابوں پر دارالترجمہ نے بہت زیادہ رقم خرچ کی ہے اور نہایت فراخ دلی سے معاوضہ دیا ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے استفسار کے باوجود دارالترجمہ سے ایسے اعداد فراہم نہیں کئے گئے جن سے بعض خاص خاص کتابوں کا معاوضہ مشخص ہو سکتا مگر جہاں تک معلوم ہوا ہے دارالترجمہ نے آج تک کوئی ایسی کتاب شائع نہیں کی جس کا معاوضہ سو روپیہ سے کم دیا گیا ہو بلکہ سینکڑوں کتابیں ایسی شائع ہوئی ہیں جن کا معاوضہ کئی کئی ہزار روپیہ دیا گیا ہے، اس معاملے میں سرکار عالی نے نہایت دریا دلی سے روپیہ صرف کیا ہے۔

اس وقت تک مجلس وضع اصطلاحات نے تقریباً چالیس ہزار اصطلاحات کا اردو ترجمہ کیا۔ ان اصطلاحات کا ایک مجموعہ (مرتبہ جانکی پرشاد) ۱۹۲۲ء میں فلسکیپ سائز کے (۱۹) سطری مسطر کے (۵۱۲) صفحات پر طبع ہو چکا ہے جس میں صرف وہ اصطلاحات ہیں جو ۱۳۳۲ف سے ۱۳۳۲ف تک مجلس نے وضع کی ہیں یہ مجموعہ اس قدر مقبول ہوا کہ اس کا طبع اول ختم ہو گیا۔ اب طبع ثانی کا انتظام ہو رہا ہے۔ اس مجموعے میں تقریباً (۴۰۰۰۵) اصطلات ہیں۔

دوسرا مجموعہ جس میں ۱۳۳۳ف سے ۱۳۴۴ف تک کی وضع شدہ اصطلاحات ہیں، زیر طبع ہے،

دارالترجمہ کی مطبوعات عام طور پر فلسکیپ سائز (۱۳½ + ۹½) اور رائل سائز (۱۰ + ۷) پر طبع ہوئی ہیں،

فلسکیپ سائز پر بہت کم کتابیں طبع ہوئی ہیں ورنہ عام طور پر دارالترجمہ کی کتابوں کا سائز رائل رکھا گیا ہے۔ کتابوں کے لئے کاغذ نہایت عمدہ ولایتی چکنا استعمال کیا جاتا ہے، عام طور پر کتابیں دو قسم کی طبع کی گئی ہیں۔ ایک نہایت اچھے اور عمدہ کاغذ پر جو مجلد فروخت ہوتی ہیں دوسری معمولی کاغذ پر جو غیر مجلد ہوتی ہیں مجلد اور غیر مجلد کی قیمتوں میں بہت کم فرق رکھا گیا ہے۔

مطبوعات دارالترجمہ کی قیمتیں نہایت بے ڈھنگے پن سے اور زیادہ مقرر کی گئی ہیں مثلاً مقدمہ مابعد الطبعیات (ہنری برگسان) مترجمہ پروفیسر عبدالباری ندوی (۲۷۸) صفحات پر چھپا ہے، عام طور پر رائل سائز کے تین جزو کی کتاب چار چھ آنے میں فروخت ہوتی ہے مجلد ہونے کی وجہ سے آٹھ دس آنے تک قیمت رکھنی چاہئے تھی مگر اس کی قیمت ایک روپیہ چودہ آنے سکہ عثمانیہ اور ایک روپیہ دس آنے سکہ برٹش انڈیا مقرر کی گئی ہے، جو بہت زیادہ ہے۔ قیمتوں کی زیادتی ہی کی وجہ سے دارالترجمہ کی مطبوعات کم مقبول ہو رہی ہیں۔ کتابوں کی قیمتوں کے قرار داد میں کوئی اصول پیش نظر نہیں رکھا گیا ہے ۱۲، ۱۵ تک روپوں پر بڑھائے گئے ہیں۔

عام طور پر ان کتابوں کو مشتہر بھی نہیں کیا گیا، ہماری تحریک پر مولوی الیاس برنی ناظم دارالترجمہ نے وعدہ کیا ہے کہ قیمتوں میں مناسب حد تک تخفیف کر دیں گے۔ بہتر ہوگا کہ دارالترجمہ کی ہر جدید مطبوعہ کتاب علمی رسائل اور اخبارات کو ریویو کی غرض سے روانہ کی جایا کرے۔ تاکہ ان کتابوں پر ریویو ہوں اور عام لوگوں کو معلوم ہو سکے،

لکھائی چھپائی پر نہایت فراخ دلی سے روپیہ صرف کیا جا رہا ہے ایک مستقل پریس "دارالطبع جامعہ عثمانیہ" اور اس کا عظیم الشان عملہ موجود ہے مصحح، مصلح سنگ اور کاپی نویس، فورمن، کثیر تعداد میں موجود ہیں جنہیں بہت زیادہ تنخواہیں دی جا رہی ہیں مگر جیسی عمدگی طباعت میں پیدا ہونی چاہئے اور جو نفاست اتنا روپیہ خرچ کرنے کے بعد لازمی تھی مصارف کی زیادتی جس صحت و صفائی کی متقضی تھی۔ وہ اب تک حاصل نہیں ہوئی ہے، اس کی وجہ معاشی اور اقتصادی اصول سے بے تعلقی اور عدم نگرانی ہے۔ اب ہمیں توقع ہے کہ مولوی برنی ان سب اسقام کو دور فرما دیں گے۔

نواب ڈاکٹر سر حیدر نواز جنگ بہادر (حیدری) صدر المہام فینانس و نائب صدر اعظم نے شروع سے جامعہ کے قیام اور اس کے کاروبار میں بے انتہا دلچسپی لی ہے اور اب تک لے رہے ہیں یہ سر حیدری ہی کی کوششیں ہیں جو جامعہ عثمانیہ اس قدر کامیاب اور دارالترجمہ یوں مستقل طور پر کام کر رہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ سر حیدری کو تاریخ دکن کی طرف متوجہ کرائیں یعنی دارالترجمہ میں دکن کی تاریخوں کے تراجم کے لئے خاص طور پر توجہ کرنے کی رائے دیں۔ امید ہے کہ سر حیدری دکن کی تاریخوں کو خصوصیت سے ترجمہ کرانے کی کوشش فرمائیں گے۔

دارالترجمہ ۱۹۱۷ء میں قایم ہوا، اٹھارہ سال میں اس ادارے نے (۳۶۹) کتابیں پیش کیں، بظاہر اٹھارہ سال کے عرصے میں ساڑھے تین سو سے زاید کتابوں کا ترجمہ کچھ زیادہ امید افزا نظر نہیں آتا مگر جب معاشیات، عمرانیات فلسفہ، منطق، مابعد الطبعیات، نفسیات، اخلاقیات، ریاضیات، طبعیات، کیمیا، حیاتیات، طب، اور انجنیری کی موٹی موٹی معرکۃ الآرا کتابوں پر نظر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارہ سال ان کتابوں کے ترجموں کے لئے بہت کم ہیں۔ فنون اور اصطلاحات کا ترجمہ کرنا ایک نئی نویلی البیلی زبان میں موٹے موٹے علمی اور فنی مسائل کا بیان۔ حیرت انگیز کامیابی ہے اس کی اہمیت وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو علمی اور فنی تراجم کی دقتوں سے واقف اور اس کام کا تجربہ رکھتے ہیں۔

انٹر یونیورسٹی کانفرنس میں ۱۹۲۹ء بمقام دہلی سر حیدری نے دارالترجمہ کی مطبوعات پیش کیں تو لارڈ ارون کی زبان سے بے تحاشا نکلا کہ "یہ حیرت انگیز کارنامہ ہے"۔ بغداد اور قرطبہ نے علم اور فن کی بڑی خدمت کی مگر "زوال ملک مستعصم" کے ساتھ ساتھ یہ خدمات بھی "دجلہ برد"

ہوگئیں، اب حقیقی معنی میں اگر آپ بغداد کو دیکھنا چاہتے ہوں تو حیدرآباد دکن آئیے۔ یہاں آپ کو ہارون اور مامون کی علمی سرپرستیوں کی زیارت کے علاوہ یونانی اقادیمیہ کی زیارت بھی نصیب ہوگی۔

آج ہندوستان کیا بلکہ دنیا بھر میں صرف ایک سلطنت آصفیہ ہی نظر آتی ہے جو اپنے خزانے کا ایک بہت بڑا حصہ تعلیم، تربیت، علم اور فن پر صرف کر رہی ہے جس نے اردو کو بامِ عزت پر پہنچا دیا جس نے ہر مغلیہ یادگار کو باقی رکھنے کی کوشش کی اور اردو جیسی مغلئی پیدا دار کو وہ پروان چڑھایا کہ یہی البیلی، رسیلی لشکری اردو جو کسی فنی اور علمی مجلس میں آنکھ ملاتے ہوئے شرماتی تھی۔ آج بڑے بڑے فنوں پر چرب زبانی کے ساتھ گفتگو کرتی ہے اور اس کی ننھی سی زبان بلا روک ٹوک کلکتی کترنی سی چلتی ہے۔ یہ ادبی کرشمہ ہے۔ حضور نواب میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہٗ کی علم پروری اور معارف نوازی کا

زندہ کردی چوں مسیحا علم و فن را در دکن
شاد باش اے حضرت عثمان علی خاں شاد باش

مولوی الیاس برنی ایم اے، ناظم دارالترجمہ کا مشکور ہوں کہ آپ نے میری استدعا پر دارالترجمہ کی مکمل فہرست جدید اندراجات کے ساتھ روانہ کی اور متعلقہ مواد کے علاوہ میرے استفسارات کے جواب بھی نہایت اخلاق سے بروقت ادا کئے۔
مجھے یقین ہے کہ مولوی صاحب موصوف میرے ان پر خلوص مشوروں پر بھی توجہ فرمائیں گے جو ان اوراق میں پیش کئے گئے ہیں۔
جو حضرات دارالترجمہ کی فہرست یا کتابیں وغیرہ طلب کرنا چاہیں اس پتے سے مراسلت کر سکتے ہیں۔

ناظم صاحب دارالترجمہ سرکار عالی
(یونیورسٹی ٹاؤن اڈیکمیٹ)
حیدرآباد دکن

سید تمکین کاظمی
حیدرآباد دکن

غزل

تمہارے دردِ محبت کو اور کیا کہئے
اسے جو کہئے تو درمانِ جانفزا کہئے

جو کچھ کہوں تو وہ دیتے ہیں درسِ خاموشی
جو چپ رہوں تو وہ کہتے ہیں مدعا کہئے

صنم کہا تو برا ماننے کی بات نہیں
تمہیں صنم جو نہ کہئے تو کیا خدا کہئے

کسی کی وہ نگہِ لطف اب نہیں نہ سہی
گلے فضول اسے خواب ملتفے کہئے

اُسے جو آپ سے اس درجہ سوءِ ظن ہے ذکیؔ
اسے عدو کا فریبِ وفا نما کہئے

محمد عبدالسلام
بی۔ اے

احساس تغافل

(سانیٹ)

ابھی تک آنکھ کے تل میں تری تصویر رقصاں ہے
ابھی تک حشر برپا ہے تمناؤں کے ایواں میں
ابھی تک گم ہیں میرے ہوش اک دنیائے پنہاں میں
ابھی تک دل میں تیری یاد اک عشرت کا ساماں ہے

ابھی تک چشمۂ مہر و محبت ہے ادا تیری
ابھی تک تیرے دم سے ہے کمال دلکشی پیدا
ابھی تک روح افسردہ میں ہے اک تازگی پیدا
ابھی تک لطف دیتی ہے مرے دل کو جفا تیری

ابھی تک پھول جھڑتے ہیں ترے لب ہائے خنداں سے
ابھی تک تیری باتوں میں وہی انداز پنہاں ہے
ابھی تک تیرے نغموں میں وہی اعجاز پنہاں ہے
ابھی تک کھیلتے ہیں میرے ارماں تیرے داماں سے

مگر حیرت ہے تو اس قرب پر کیوں دور رہتی ہے؟
تری صورت مری آنکھوں سے کیوں مستور رہتی ہے؟

روشن نکودری

سرخ دھاگا

(ایک ایکٹ کا ڈراما)

افراد

پاشا ——— ایک دُکاندار

فیروزدین ——— گاؤں کا نمبردار

امجد بیگ ——— فیروزدین کا دوست

گل خاں ——— ایک معزول شدہ سپاہی

دولت یار ——— ہوٹل کا مالک

ایک مسافر

منظر۔

شہر سے باہر کچھ فاصلے پر سڑک کے کنارے ہوٹل کا ایک کمرہ۔ کمرے کی چھت قدرے پست ہے۔ دائیں طرف ایک کھڑکی اور سامنے آتش دان ہے جس میں کوئلے دہک رہے ہیں۔ بائیں جانب دروازہ ہے جو باہر گلی کی سمت کھلتا ہے۔ کمرہ معمولی طور پر سجا ہوا ہے۔ چند ایک چھوٹی چھوٹی تپائیاں مع ایک ایک دو دو کرسیوں کے مختلف جگہوں پر پڑی ہوئی ہیں۔ تین چار رنگین قطعے بھی دیواروں سے آویزاں نظر آتے ہیں۔ آتش دان کے قریب ہی بجلی کی گھنٹی کا بٹن لگا ہوا ہے۔ فروری کا مہینہ ہے۔ موسم نہایت خراب ہے۔ سرد ہوا کے تیز و تند جھونکے کھڑکی کے راستے سے کبھی کبھی اندر آتے ہیں۔ شام کا وقت ہے لیکن مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے باہر گہری تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔

پاشا، امجد بیگ اور فیروزدین ایک میز کے گرد بیٹھے ہیں جس پر تین بلوری گلاس پڑے ہوئے ہیں۔ امجد بیگ جو اپنے آپ کو اپنے ساتھیوں سے زیادہ عقلمند سمجھتا ہے اور فیروزدین جو جلد باز اور کسی حد تک بے وقوف واقع ہوا ہے دروازے کی جانب دیکھ رہے ہیں۔ پاشا اپنے خیالات میں گم ہے۔ وہ ایک مضبوط اور قوی الجثہ آدمی ہے۔ تمام ڈرامے کے دوران میں اس کے چہرے پر بدحواسی کے آثار نمایاں رہتے ہیں۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ دولت یار دروازے میں راستہ روکے کھڑا ہے۔ گل خاں دروازے کے باہر گلی میں ایستادہ نظر آتا ہے۔

دولت یار۔ (فیصلہ کن انداز میں) نہیں گل خاں میں تمہیں اور نہیں دے سکتا۔ میری رائے میں اب تم گھر جاؤ اور بہتر ہے کہ سو رہو۔

گل خاں۔ کیا میں نے نہیں کہا کہ تمہیں قیمت صبح ادا کر دوں گا؟

دولت یار۔ بالکل درست۔ مگر میرا یہ مطلب نہیں۔ خان تم نہیں سمجھتے۔ میرا ٹھیکہ۔ لائسنس۔ سب کچھ ضبط ہو جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں۔

گل خاں۔ جانے بھی دو۔ لاؤ مجھے ایک بوتل دو۔ وسکی!

دولت یار۔ نہیں تم کافی پی چکے ہو۔

گل خاں۔ (اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے) کمینے!

(چلا جاتا ہے۔ اس کے پاؤں کی آہٹ سیڑھیوں سے نیچے اترتے ہوئے سنائی دیتی ہے۔ پھر کسی بھاری دروازے کے کھلنے اور زور سے بند ہونے کی آواز آتی ہے۔ دولت یار سر کھجلاتے ہوئے

پاشا کی طرف دیکھتا ہے)

امجد بیگ۔ ہاں ٹھیک ہے۔ وہ بہت زیادہ پی گیا ہے۔

فیروزدین۔ عجب آدمی ہے۔ کیسے آرام کے ساتھ میز جیبوں سے نیچے اترا ہے۔ کیوں پاشا؟

پاشا۔ (جیسے کوئی خواب سے بیدار ہو رہا ہو) کون؟ اوہ گل! ہیں تو اس سے بیزار ہوں۔ ہمیشہ میری دکان میں ادھر اُدھر سے جھانکتا رہتا ہے اور ہر وقت کوئی نہ کوئی چیز بغیر دام ادا کرنے کے اٹھالے جانے کی فکر میں رہتا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی جب میں دکان کو بند کر رہا تھا تو باہر کھڑا دکان کی ہر چیز کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے ڈانٹ کر ہٹا دیا تھی۔

(اس پر پھر پہلی سی حالت طاری ہو جاتی ہے)

دولت یار۔ یہ اس کا جسم نہیں دماغ ہے جو سب کچھ کر رہا ہے اور اگر سچ پوچھو تو دوستو میں اُس سے نہیں بلکہ اُس کے لئے ڈرتا ہوں کاروبار کی سخت بری حالت ہے۔ خدا جانتا ہے میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں بہت جلد گل جیسے آدمیوں سے تنگ آجاتا ہوں۔ پورے ایک سال سے بے کار ہے۔ اور حالت دن بدن بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کب اور کہاں سے وہ روپیہ لاتا ہے۔ ہاں گھنٹی ——

امجد بیگ۔ (گلاسوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) پھر وہی۔

(دولت یار گلاس اکٹھے کرتا ہے)

پاشا۔ (غنودگی کے عالم میں) میرے لئے نہیں میں اب گھر جاؤں گا۔

امجد بیگ۔ نہیں۔ ایک اور۔ ہاں ہم سب کو ایک ایک اور (پاشا گلاس ہاتھ سے رکھ دیتا ہے) اور (سنو دولت یار) میں پاشا کی اس حالت پر بالکل حیرت میں نہیں ہوں۔ عزیز کا واحد دوست اس سے جدا ہو گیا ہے۔ دونوں ——

دولت یار۔ ہاں ٹھیک ہے امجد لیکن اس کے باوجود میں ایک آدمی کا اعتدال کی حد میں رہتے ہوئے غم غلط نہ کرنا پسند نہیں کرتا (گلاس لے کر باہر چلا جاتا ہے)

امجد بیگ۔ آہ کتنا طویل دن تھا۔ میری زندگی میں شاید یہ طویل ترین دن گزرا ہوگا۔

فیروزدین۔ نہیں اتنا نہیں جتنی کہ اکرام کے لئے کل کی رات تھی۔

پاشا۔ (سر کو اٹھائے بغیر) کل کی رات۔ اُف! میری روح!

(دونوں اس کی طرف دیکھتے ہیں)

فیروزدین۔ آہ! تم نے ضرور محسوس کیا ہوگا۔ پاشا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ایسا منظر دیکھنے کے لئے کیوں گئے؟ آہ یہ خیال کرنا کہ صبح آٹھ بجے وہ انسان نما شیطان اکرام پھانسی کے تختے پر لٹکایا گیا تھا۔ حتیٰ کہ وہ۔

امجد بیگ۔ بس بس! تفصیلات میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اکرام نے اپنے کئے کی سزا پائی اور بس۔

پاشا۔ (سر اٹھاتے ہوئے) مجھے گھر جانا چاہئے۔ مجھے کچھ وہم سا ہو گیا ہے کہ میں اپنی نقدی کی صندوقچی کی کنجی وہیں گدی پر چھوڑ آیا ہوں اور شاید قفل بھی اچھی طرح بند نہیں کیا۔ میری طبیعت بہت پریشان تھی (کھڑا ہوتا ہے لیکن پھر آہستہ آہستہ بیٹھ جاتا ہے)

فیروزدین۔ پاشا فکر کی کوئی بات نہیں۔ تمہارا اللہ دتہ جوں کا توں پڑا ہوگا۔ آہ اکرام کی حالت پر ترس کھانا چاہئے۔ اگرچہ ہم میں سے کوئی بھی اس جیسا نہیں ہے۔ لیکن یہ درست ہے کہ اس کا مقدمہ پوری طرح سے لڑا گیا اور اس کے ساتھ پورا پورا انصاف ہوا ہے۔ اس لئے نہیں کہ مجھے اس کے قاتل ہونے میں کوئی شک ——

پاشا۔ ایسا مت کہو۔ یہ بہت رنجدہ ہے۔ اکرام عجب قسم کا آدمی تھا اور پھر —— (رک جاتا ہے) اور بے شک وہ مجرم تھا۔ کیونکہ گواہوں نے ایسا ہی ثابت کیا۔ کیا میں نے جھوٹی گواہی دی ہے؟

فیروزدین۔ بے شک گواہوں نے ایسا ہی ثابت کیا۔ لیکن ——

(دولت یار داخل ہوتا ہے اور ہر ایک کے آگے شراب سے بھرا ہوا ایک ایک گلاس رکھ دیتا ہے)

امجد بیگ۔ ہم صبح کے الناک واقعہ کا ذکر کر رہے ہیں (جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر میز پر رکھ دیتا ہے)

دولت یار۔ ہاں درست ہے۔ درست۔ بہت الناک (نوٹ اٹھاتے ہوئے) تمہاری باتوں سے ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ گل خاں بھی تم میں موجود ہے۔

فیروزدین۔ کیا؟ وہ؟

امجد بیگ۔ وہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کا عزیز دوست اکرام پھانسی پا چکا ہے۔

دولت یار۔ وہ کہہ رہا تھا کہ جس جج نے اکرام کو پھانسی کی سزا دی ہے
اس کے پیٹ میں چاقو گھونپ دوں گا اور گواہوں کو زہر ——
فیروزدین۔ بے وقوف۔ وہ ضرور دیوانہ ہو گیا ہے۔
امجد بیگ۔ (زاہدانہ انداز میں) جب آدمی شراب پیتا ہے تو اس کا
یہی حال ہوتا ہے۔
فیروزدین (مذاق کے لہجے میں) گستاخی معاف۔ لیکن گل خاں تو کبھی مدہوش
نہیں ہوا۔
امجد بیگ۔ بہت خوب! بہت خوب! (ریاکارانہ طریق پر ہنستا ہے)
پاشا۔ اور اگر گل اپنے ارادے کا پکا ہو تو۔
امجد بیگ۔ کیا؟
فیروزدین۔ تو کیا! جج یا گواہوں کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔ خواہ وہ غلط
ہی کیوں نہ ہوں۔
دولت یار۔ (گھبرا کر) کیا ہے پاشا؟
(پاشا بغیر کچھ جواب دیئے ہوئے سر جھکا لیتا ہے)
امجد بیگ۔ (آہستہ سے) کمزوری! محض کمزوری۔
دولت یار۔ ٹھیک ہے مجھے بھی اس کا کچھ تجربہ ہے۔ بلکہ میں اس وقت
بھی اس کا شکار ہو رہا ہوں۔
فیروزدین۔ اچھا! (پینے کی رغبت ظاہر کرتے ہوئے امجد بیگ کو اشارہ
کرتا ہے) ہاں! (پینا شروع کر دیتا ہے)
دولت یار۔ میں خیال بلکہ پیشین گوئی کرتا ہوں کہ ہمارا بدنصیب دوست
گل خاں آج رات ضرور یہاں آئے گا۔ گو میں اس کا یہاں آنا پسند
نہیں کرتا۔
امجد بیگ۔ ہم تمہیں مدد دیں گے —— اخلاقی مدد —— اس کو شراب نہ دیں گے
دولت یار۔ بہت مشکور ہوں گا۔ میں اس کو کبھی بھی شراب نہیں دوں گا۔
میرے ضمیر کا یہی تقاضا ہے۔
فیروزدین۔ اور تمہارا لائسنس —— اور اس کے علاوہ اُس کے پاس
ایک دمڑی تک نہیں ہے۔
دولت یار۔ بے شک (باہر چلا جاتا ہے)
فیروزدین۔ دیکھو پاشا یہ خالص شیمپین ہے۔ تمہارے لئے ازبس مفید ہے
پاشا۔ (جیسے کوئی گہری نیند سے چونک اٹھتا ہے) میں نے گل خاں کو آج
صبح جیل خانے میں دیکھا تھا۔ میری طرح وہ بھی کسی طریق سے اکرام کو
پھانسی پر لٹکتے ہوئے دیکھنے گیا ہوا تھا۔ وہ اپنے منہ اور سر کو بری
طرح لپیٹے ہوئے تھا۔ لیکن میں نے پھر بھی اُسے پہچان لیا۔ خدایا!
میں کبھی اس کا چہرہ بھول سکتا ہوں! جب اکرام کو پھانسی پر چڑھایا
گیا تو اس کی آنکھوں سے خوفناک وحشت برس رہی تھی۔
فیروزدین۔ (بے تاب سا ہو کر) اس کی صورت کیسی تھی؟
امجد بیگ۔ خاموش فیروز خاموش —— غم میں ڈوبی ہوئی ہوگی ضرور
پاشا۔ وہ ایک —— ایک انتہائی اذیت کے عالم میں تھا۔
امجد بیگ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کچھ انسانیت کا عنصر موجود ہے۔
اگرچہ جب وہ اس کونے میں (کونے کی طرف اشارہ کرتا ہے) بیٹھ کر
شراب پیتا ہے تو مجھے اس کی شرافت پر شک گزرتا ہے (اپنا گلاس
اٹھا کر پینے لگتا ہے) اس سے ظاہر ہے ہمیں اپنے ہمسائیوں کو
پرکھنے میں احتیاط سے کام لینا چاہئے۔
فیروزدین —— ممکن ہے اس میں اور اکرام میں ہمارے گمان سے زیادہ
دوستی ہو۔ ہاں وہ بہت گہرے دوست تھے (موٹر کے ٹھہرنے
کی آواز آتی ہے) کون ٹھہرنے آیا ہے یہاں؟ (اٹھ کر کھڑکی میں
جاتا ہے) ایسی بھیانک رات میں موٹر کی سواری کا بھی لطف لیا
شاید موٹر کا رنگ بھی سیاہ ہے۔ اُف! (کانپ جاتا ہے) خدا
کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ مجھے کہیں دور نہیں جانا ہے (آسمان
پر بجلی چمکتے دیکھ کر ڈر جاتا ہے۔ کھڑکی بند کرنے لگتا ہے کہ ہوا کا
ایک تند جھونکا اندر آ جاتا ہے)
(پاشا چیخ مار کر اپنی جگہ پر کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر کانپتے کانپتے
خود بخود بیٹھ جاتا ہے)
امجد بیگ۔ ایسے موسم میں غیر متوقع طور پر آیا ہے۔ پاشا کیا بات ہے تم کچھ
بیمار سے معلوم ہوتے ہو۔ کوئی خوف کی بات نہیں۔
پاشا۔ (جذبات کا اظہار کرتے ہوئے) آہ۔ آج رات کوئی آفت آنے
والی ہے۔ ضرور کہیں نہ کہیں کوئی سخت ظلم ہوا ہے۔ مجھے
گھر جانے سے ڈر لگتا ہے۔
فیروزدین۔ (کرسی پر دوبارہ بیٹھتے ہوئے) چھوڑو ایسی باتوں کو۔ اس
طرح کچھ نہیں ہو گا (گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اس کے
دو ایک گھونٹ پیو۔ تمہیں ضرور افاقہ ہو جائے گا۔ تمہیں آج صبح
اکرام کو دیکھنے کے لئے نہیں جانا چاہئے تھا۔

پاشا۔ (کانپتے ہوئے) فیروز! میں نے جنگ کے اس اشرارے میں کرام کو دیکھا ہے اور وہ ایک ــــــ ایک سرخ دھاگے سے لٹک رہا تھا۔

(فیروز دین اور امجد بیگ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں)

امجد بیگ کیا!

پاشا۔ (مجنونانہ انداز میں) صرف سرخ دھاگا اور وہ مردہ اور پتھر کی طرح بے حس و حرکت اور ــــــ اس کا سر ایک ــــــ ایک طرف کو لٹکا ہوا۔ لبوں پہ اُف ــــــ خوفناک مسکراہٹ جیسے ــــــ

فیروزدین۔ (جلدی سے سانس لیتے ہوئے) مسکراہٹ!

امجد بیگ ــــــ توبہ!

(دروازہ کھلتا ہے۔ ایک مسافر داخل ہوتا ہے۔ پیچھے پیچھے دولت یار ہے)

مسافر۔ (اپنا بھیگا ہوا کوٹ اتارتے ہوئے) بس یہ ٹھیک ہے۔ میرے لئے علیحدہ ایک کمرے میں آگ روشن کر دو اور ایک میرے ڈرائیور کے لئے۔ مگر پہلے مجھے ایک برانڈی کا گلاس دو اور کچھ گرم پانی بھی (آتشدان کے قریب جاتا ہے اور دونوں ہاتھوں کو ملا کر آگ تاپنے لگتا ہے)

دولت یار۔ بہت بہتر (چلا جاتا ہے)

(کمرے میں چند لمحوں کے لئے خاموشی چھا جاتی ہے جس کے دوران میں فیروزدین اور امجد بیگ پہلے مسافر کی طرف اور پھر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ پاشا اپنی ٹھوڑی چھاتی سے لگائے بے خبر بیٹھا ہے۔ باہر ہوا کا زور کم معلوم ہوتا ہے لیکن اچانک ہی ایک تند جھونکا کھڑکی سے آ کر ٹکراتا ہے)

فیروزدین۔ خدایا اس کے کیا معنی؟

امجد بیگ۔ کچھ نہیں۔ جھکڑ چل رہا ہے (مسافر کو مخاطب کرنے لگتا ہے)

پاشا۔ (سوئے ہوئے) سرخ دھاگے سے لٹک رہا تھا اور مسکراہٹ ــــــ ہاں خوفناک مگر معصوم ــــــ (آواز ہلکی ہوتی جاتی ہے) بے گناہ مظلوم ــــــ (لب ہلتے ہیں لیکن کچھ سنائی نہیں دیتا)

فیروزدین۔ (دبی ہوئی آواز میں) ہیں!

امجد بیگ۔ (پاشا کی طرف جھک کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہے) کچھ فکر نہ کرو میرے دوست (فیروز کو اشارہ کرتے ہوئے) میرا خیال ہے کہ پاشا یہاں آنے سے پیشتر ہی منوم ہو گا۔ (کھانستا ہے اور مسافر کو اپنی طرف مخاطب کرتا ہے) بہت بری رات ہے جناب۔

مسافر۔ (رُخ بدلتے ہوئے) بہت خراب (کسی قدر سرد مہری سے) شاید میں آپ کی محفل میں مخل ہوا ہوں۔ مگر آگ تاپنی تھی جو صرف یہیں ہے

امجد بیگ۔ نہیں صاحب مطلق نہیں۔ یہ کوئی خاص کمرہ نہیں ہے اور اگر خاص بھی ہوتا تو ایسی سرد رات میں آپ کبھی بارِ خاطر نہ ہوتے۔

مسافر۔ میں آپ کا مشکور ہوں (کرسی گھسیٹ کر آتشدان کے قریب کرتا ہے۔ جمائی لیتا ہے اور سیگرٹ کیس نکال کر ایک سیگرٹ سلگاتا ہے (امجد بیگ اور فیروزدین غور سے اس کی طرف دیکھتے ہیں) یہاں نزدیک ہی کوئی گاؤں بھی معلوم ہوتا ہے۔

امجد بیگ۔ ہاں۔ سڑک کے اس پار ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ فیروز دین جہاں پاشا رہتا ہے۔

مسافر۔ تو پھر تم جانتے ہو گے۔ کیا وہاں کوئی بہرا ــــــ پتھر کی طرح کانوں سے بہرا آدمی بھی رہتا ہے اور شاید وہ گونگا بھی ہے۔

امجد بیگ۔ نہیں جناب۔

فیروزدین۔ (امید کی جھلک لئے ہوئے) ہاں ایک آدمی رہتا ہے۔ لیکن وہ تو رعشہ کا مریض ہے۔

مسافر۔ نہیں نہیں! یہ شخص شاید بستی کو جا رہا تھا۔ ظالم نے میرے اور میرے موٹر ڈرائیور کے بدن پر رونگٹے ہی تو کھڑے کر دیئے۔

(دولت یار داخل ہوتا ہے اور مسافر کے آگے اس کی مانگی ہوئی چیزیں رکھ دیتا ہے)

امجد بیگ۔ (شائستگی کے ساتھ) یعنی کیا ہوا جناب؟

مسافر۔ (دولت یار سے) بس شکریہ (برانڈی کو گلاس میں انڈیلتے ہوئے) ہاں۔ باد و باراں کے اس طوفان میں وہ سڑک کے عین وسط میں کمال اطمینان کے ساتھ جا رہا تھا۔ ہم نے ہر چند پورے زور سے موٹر کا ہارن بجایا۔ لیکن بے سود اس نے کوئی توجہ نہ کی۔ ہمیں مجبوراً موٹر کو آہستہ کرنا پڑا۔ آخر کار خود بخود ہی وہ سڑک سے پرے ہٹ گیا۔ لیکن جوں ہی ڈرائیور نے موٹر تیز کی چشم زدن میں ظالم پھر سامنے آ گیا (دولت یار جو کہ دروازے کی طرف جا رہا

تھا کھڑا ہو جاتا ہے اور سننے لگتا ہے) بس موٹر اس کے اوپر سے گزر ہی چلی تھی کہ میرے ڈرائیور نے کمال ہوشیاری کے ساتھ موٹر کو عین قدموں پر روک لیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہوا ہمارے مخالف نہ ہوتی تو موٹر الٹ جاتی اور ہم اس وقت بجائے اس آتشدان کے پاس بیٹھ کر گرم ہونے کے پوری طرح سرد ہو چکے ہوتے اور اس پر طرہ یہ کہ اس بھلے مانس نے منہ پھیر کر دیکھا تک نہیں۔ مزے سے چلتا گیا۔

(برانڈی کا گھونٹ پیتا ہے)

امجد بیگ۔ توبہ! کیا کسی نے کبھی ایسا واقعہ سنا ہے! اور جناب پھر آپ نے کیا کیا!

مسافر۔ میں چلایا جتنی کہ میری آواز میری مدد کر سکتی تھی۔ لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ میرا خیال ہے پھر وہ جلد ہی سڑک سے اتر گیا۔ کیونکہ جب ہم نے دوبارہ موٹر کے انجن کو درست کر کے چلایا تو اس کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ (وحشیانہ انداز میں) کاش میں اس سے گفتگو کر سکوں!

امجد بیگ۔ کوئی دیوانہ معلوم ہوتا ہے۔ کیا آپ نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا؟

مسافر۔ نہیں۔ مجھے صرف اس کی پشت ہی دکھائی دی ہے (برانڈی کا ایک اور گھونٹ پیتا ہے) اس کا قد دراز تھا اور پولیس کے سپاہیوں کا سا بڑا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ سر پر سیاہ رنگ کی ٹوپی بھی تھی۔

فیروزدین۔ یہاں کئی لمبے قد بڑے کوٹ اور سیاہ رنگ کی ٹوپیوں والے رہتے ہیں۔

مسافر۔ اس نے اپنی گردن کے گرد ایک مفلر بھی لپیٹا ہوا تھا۔ شاید گلے کو بارش سے بچانے کے لئے اور جب موٹر کے لیمپ کی روشنی اس کے اوپر پڑی میں نے دیکھا کہ اس کے مفلر کا رنگ سرخ تھا۔

(فیروزدین کے جسم میں کپکپی سی دوڑ جاتی ہے اور وہ کانپ اٹھتا ہے)

امجد بیگ۔ (چیختے ہوئے) کیا؟

دولت یار۔ (دروازے کو زور سے پکڑے ہوئے بڑبڑاتا ہے) مفلر کا رنگ سرخ تھا۔

(پاشا آہستہ آہستہ اپنے خواب سے بیدار ہوتا ہے)

مسافر۔ ہاں کچھ عجیب قماش کا آدمی تھا۔ — میں کہتا ہوں تمہارے دوست کو کیا ہوا ہے! (پاشا کی طرف اشارہ کرتا ہے)

امجد بیگ۔ اسے معاف فرمائیے گا۔ اس نے کچھ زیادہ پی لی ہے۔

پاشا۔ (بڑبڑاتے ہوئے) سرخ دھاگے سے لٹکا ہوا — اور مسکراہٹ —

امجد بیگ۔ (تسکین دیتے ہوئے) بس بس پاشا۔

پاشا۔ (جیسے اس نے امجد بیگ کی بات کو سنا ہی نہیں: مسافر کی طرف مخاطب ہوتا ہے اور کانپتی ہوئی انگلی سے کھڑکی کی جانب اشارہ کرتا ہے) آہ وہ اس کی روح تھی جو تم نے سڑک پر دیکھی — اکرام کی روح جو قتل کے الزام میں آج صبح کچے جیل میں پھانسی دیا گیا اور وہ — وہ اسی سرخ مفلر کے دھاگے سے لٹکایا گیا تھا۔ خدا اس کی روح کو تسکین دے (اس پر وہی غنودگی کا عالم طاری ہو جاتا ہے)

مسافر۔ (امجد بیگ سے) میرا خیال ہے کہ یہ سب کچھ میری طاقت سے باہر ہے۔ میں آپ کو یہ بتانا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کے دوست کی یہ حالت زیادہ شراب پینے کی وجہ سے نہیں بلکہ کسی سخت ذہنی اور روحانی صدمے کے باعث ان کا یہ حال ہو رہا ہے۔

فیروزدین۔ (امجد بیگ کی ترجمانی کرتے ہوئے) ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ پاشا نہایت شریف آدمی ہے اور اتنا ایماندار جتنا کہ کسی دکاندار کو اس سرد بازاری میں ہونا چاہیئے۔ اپنی مالی مشکلات پر نہایت ہوشیاری سے قابو پاتا ہے۔ دراصل پاشا کو آج صبح اکرام کو پھانسی چڑھتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہیئے تھا۔ بات یہ ہے کہ پاشا ہی صرف موقع کا گواہ تھا اور سب سے بڑی یہی شہادت تھی جس کی بنا پر جج نے اکرام کو پھانسی کی سزا دی۔ بدقسمتی سے پاشا کو ایک وہم سا ہو گیا تھا کہ اکرام کو پھانسی ملتے ہوئے ضرور دیکھنا چاہیئے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔

مسافر۔ (ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے) اور اکرام — اور سرخ مفلر!

فیروزدین۔ ہاں —

امجد بیگ۔ (بات کو کاٹتے ہوئے) موسم سرما میں اکرام ہمیشہ سرخ مفلر باندھا کرتا تھا۔ اس کا یہ مفلر مشہور تھا۔ بلکہ بسا اوقات تو وہ اسی مفلر کے نام ہی سے پکارا جاتا تھا۔ کیونکہ اس بستی میں اور کوئی آدمی ایسا مفلر نہیں باندھتا تھا۔ ایک رات اس نے ایک

کسان کو جو شہر میں روئی بیچ کر آرہا تھا۔ اسی سڑک پر مار ڈالا اور قریبًا چار سو روپیہ جو اس نے ایک تھیلی میں باندھا ہوا تھا لے کر چمپت ہوگیا۔ ظالم نے ہتھوڑے سے اس کا دماغ پاش پاش کر دیا تھا۔ (ایک ہلکی سی آہ بھرتا ہے)

فیروز دین۔ اور وہ ہتھوڑا اکرام کے گھر میں پایا گیا۔ اس پر خون لگا ہوا تھا۔ بلکہ دو ایک سر کے بال بھی خون کے ساتھ اس پر چپکے ہوئے تھے لیکن تعجب تو اس بات پر ہے کہ آج تک اس روپوں والی تھیلی کا سراغ نہیں ملا۔ خبر نہیں اس نے کہاں چھپا رکھی ہے نیز یہ بھی ثابت ہوگیا تھا کہ اس وقت اکرام کو روپے کی اشد ضرورت تھی۔ کیونکہ اس کی لڑکی کی شادی انہی دنوں میں ہونے والی تھی۔ ہاں عدالت میں اس نے ان الزامات سے انکار کر دیا تھا اور بیان دیا تھا کہ جب یہ واقعہ رونما ہوا وہ اپنے گھر میں سو رہا تھا۔

امجد بیگ۔ لیکن اس کی جان اس کے اس سرخ مفلر نے لی۔ اگرچہ اور بھی بہت سی شہادتیں اس کے خلاف تھیں۔ اس نے وہ مفلر ضرور کہیں چھپایا یا جلا دیا ہوگا۔ کیونکہ اس کے بعد ہزار تلاش کے باوجود بھی وہ نہ مل سکا۔ مگر اکرام حلفیہ بیان کرتا تھا کہ اس کا مفلر کہیں گم ہو چکا ہے۔

فیروز دین۔ لیکن مظلوم کسان کے ناخن میں اس مفلر کا ایک باریک دھاگا اٹکا ہوا تھا۔ آہ غریب نے اپنی جان بچانے کے لئے خدا معلوم کتنے جتن کئے ہوں گے۔ اسی لئے یہ درست ہے کہ اکرام ایک سرخ دھاگے سے پھانسی پر لٹکایا گیا۔

دولت یار۔ (آگے بڑھ کر کھانستے ہوئے) اور جناب کو یہ بھی علم ہونا چاہئے کہ سزا ہونے کے بعد بھی اکرام کا خیال بلکہ یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی غیر معمولی حادثہ ضرور رونما ہوگا۔ جس سے اس کی جان بچ جائے گی ـــــــ مگر (سر ہلاتے ہوئے) وہ پھانسی پر چڑھایا گیا اور اسی طرح مر گیا جس طرح ہم سب نے مرنا ہے۔ میں اکرام کو نہیں جانتا۔ وہ کبھی میرے پاس نہیں آیا لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ آج کا دن بہت تکلیف دہ تھا۔

(گھڑیال نو بجاتا ہے)

مسافر۔ کیا شہر میں ابھی مارشل لا جاری ہے؟

دولت یار۔ جی ہاں۔ اور اس علاقہ میں بھی نو بجے رات کے بعد کوئی آدمی گھر سے باہر نہیں نکل سکتا۔ لیکن یہاں قانون کی بہت سختی سے پابندی نہیں کی جاتی۔ (فیروز دین اور امجد بیگ کو مخاطب کرتے ہوئے) کیا آج رات یہیں قیام کرو گے۔

امجد بیگ۔ (گھبراہٹ کے عالم میں) نہیں نہیں۔ کم بخت بارش تھمتی ہی نہیں۔

(امجد بیگ اور فیروز دین کھڑے ہو جاتے ہیں۔ فیروز دین پاشا کو جگانا چاہتا ہے)

مسافر۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اگر آپ صاحبان چند منٹ اور یہاں تشریف رکھیں۔ شاید اس عرصے میں بارش بھی تھم جائے (دونوں مسکراتے ہیں اور کچھ توقف کے بعد بیٹھ جاتے ہیں) ہاں اور لانا برانڈی۔

دولت یار۔ بہتر جناب اور اگر آپ ایک لمحے کے لئے مجھے معاف فرمائیں تو میں نیچے دروازہ بند کر آؤں۔ میں قانون کی خلاف ورزی نہیں کرنا چاہتا (جاتا ہے)

مسافر۔ تو کیا آج رات آپ اپنے دوست کو یہیں چھوڑ جائیں گے؟

امجد بیگ۔ بہتر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بیدار نہ کیا جائے یا اور تھوڑے عرصے میں ہم دونوں اسے گھر پہنچا دیں گے۔ بیچارے کے دل پر صبح کے واقعے کا کتنا اثر ہوا ہے!

مسافر۔ (نیا سیگرٹ سلگاتے ہوئے) اچھا تو آپ کا آپ کے دوست کے مطابق اکرام کی روح والے مسئلے کے متعلق کیا خیال ہے؟

امجد بیگ۔ ذاتی طور پر میرا بھوت پریت اور روحوں وغیرہ پر کوئی یقین نہیں

فیروز دین۔ اور نہ ہی میں ایسی باتوں کا قائل ہوں۔

امجد بیگ۔ اور میں قسم کھانے کے لئے تیار ہوں کہ اس بستی اور اس کے گردو نواح میں کوئی فرد نہیں نکلے گا جس نے سرخ مفلر باندھا ہو۔

فیروز دین۔ تو پھر وہ (اچانک کوئی آواز سنتا ہے اور دوسروں کو خاموشی رکھنے کے لئے ہاتھ بلند کرتا ہے) شاید کوئی اور آرہا ہے۔

(باہر کچھ ہلچل سی معلوم ہوتی ہے۔ سب خاموش ہو جاتے ہیں۔ دولت یار کی آواز آتی ہے "نہیں نہیں۔ میں یہ نہیں کر سکتا۔ نو بجے کے بعد یہاں کوئی داخل نہیں ہو سکتا")

امجد بیگ۔ اگر خدا جھوٹ نہ بلوائے تو معلوم ہوتا ہے کہ گل خاں دوبارہ آگیا ہے

مسافر۔ گل خاں کون؟

امجد بیگ۔ پھانسی لگنے والے کا دوست اور میرا خیال ہے کہ دولت یار کے لئے اب مشکل ہوگئی ہے۔ پہلے ہی صبح سے خود کام کر رہا ہے

بے چارے کے دونوں لڑکے کل سے نمونیہ میں مبتلا ہیں۔

مسافر۔ میں بھی حیران تھا کہ اس ہوٹل میں کوئی ملازم کیوں نظر نہیں آتا!

(بحث کی آواز نزدیک تر ہوتی جاتی ہے۔ گل خاں گالی گلوچ بک رہا ہے اور دولت یار کبھی خوشامد اور کبھی تحکمانہ لہجے میں کلام کرتا ہوا سنائی دیتا ہے)

دولت یار۔ (باہر) اب ـــــ اب گل خاں خدا کے لئے ہوش میں آؤ کیا تم میرا لائسنس ضبط کروانا چاہتے ہو۔ نو کب کے بج چکے ہیں۔ اگر تمہیں کسی نے اندر آتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ آہ! میں نے دروازہ وقت پہ کیوں بند نہ کیا۔

گل خاں۔ (باہر) مجھے گزرنے دے۔ شراب کی بوتل لا۔ ہاں میرے پاس روپیہ ہے۔ سنتے ہو ہاں ہاں جلدی لاؤ شراب۔

دولت یار۔ (باہر) ہوش میں آؤ۔ گل خاں خدا کے لئے آرام سے بات کرو۔

(ہاتھا پائی کی آواز آتی ہے)

اگر میں تمہیں اندر آجانے دوں تو کیا تم وعدہ کرتے ہو کہ ــــــ

(گل خاں دروازے کو زور سے دھکا دیتا ہے اور اندر داخل ہو جاتا ہے۔ اس کے پیچھے مغموم سا چہرہ لئے دولت یار کمرے کے اندر آتا ہے۔ گل خاں ایک بڑا سپاہیوں والا کوٹ پہنے ہوئے ہے۔ کوٹ کے تمام بٹن بند ہیں اور اس سے پانی کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔ اس کا سر ننگا اور چہرے پر موت کی سی سفیدی چھائی ہوئی ہے۔ نہایت استقلال کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے حسب معمول کمرے کے ایک گوشے میں کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

دولت یار (دروازے کی چوکھٹ پر کھڑے ہوئے معذرت کے طور پر) افسوس میں اسے باز نہ رکھ سکا۔

مسافر۔ خدایا! کیا صورت بنائی ہے! (دولت یار کو اشارہ کرتا ہے)

گل خاں۔ (خالی کرسی کی طرف دیکھتے ہوئے اور کسی قدر ترنم کے ساتھ) جج کے پیٹ میں چاقو۔ بوتل شراب کی مجھے (دولت یار دبے پاؤں آتا ہے)

مسافر۔ (دولت یار کے کان میں) خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ اسے ایک گھونٹ تک مت پلاؤ۔

دولت یار۔ نہیں! کبھی نہیں (آہستہ سے) کیا یہ ــــــ کیا یہ بیہوشی ہے؟

مسافر۔ مدہوشی! خدا معلوم کیا ہے! ــــــ خیر، دروازہ بند کرو۔ اچھا ٹھہرو تیار ہو جاؤ۔

گل خاں۔ (بغیر کسی طرف توجہ کئے) زہر سب گواہوں کو۔ بوتل شراب کی مجھے۔

(مسافر اپنی کرسی کے بازو پکڑے ہوئے کمال احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ آگے کی طرف جھکتا ہے۔ فیروز دین بیوقوفانہ انداز میں ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا ہے۔ پاشا نیند سے بیدار ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے)

امجد بیگ۔ (منہ پر ہاتھ رکھ کر کھانستے ہوئے) میرے خیال میں اسے گرم گرم چائے پلانی چاہئے۔

(مسافر خاموش رہنے کے لئے اشارہ کرتا ہے۔ کمرے میں پورا پورا سکوت ہے۔ لیکن باہر ہوا سائیں سائیں کر رہی ہے اور کبھی کبھی کھڑکی سے بھی ٹکراتی ہے)

گل خاں۔ (پہلے کی طرح) بوتل شراب کی ــــــ

(پاشا گل خاں کی موجودگی کو محسوس کرتا ہے اور خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھا رہتا ہے بجلی چمکتی ہے اور بادل کے گرجنے کی آواز بڑے زور سے سنائی دیتی ہے۔ گل خاں کے سوا باقی سب دم بخود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ہوا کا شور دھیما پڑ جاتا ہے)

گل خاں۔ (پہلے کی طرح) بوتل شراب کی ــــــ (دفعتاً اسے کچھ خیال آتا ہے اس کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے) قیمت! تم قیمت مانگتے ہو ــــــ (بجلی کی سی سرعت کے ساتھ وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو جاتا ہے کوٹ کے بٹن کھولتا ہے اور اندر جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ نقدی سے بھری ہوئی مٹھی باہر نکالتا ہے اور ایک لمحے کے لئے اس کا جسم تن جاتا ہے) قیمت! (ہاتھ میں پکڑی ہوئی تمام نقدی زمین پر دے مارتا ہے) قیمت۔ دولت۔ شراب (سب چپ چاپ اس کی طرف دیکھتے ہیں) ناکافی ہے! ہا ہا! (پھر جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے اور گاڑھے کی ایک تھیلی نکالتا ہے) بوتل شراب کی (تھیلی کو دولت یار کے قدموں میں دے مارتا ہے) لو۔

دولت یار۔ (خوف سے سکڑتے ہوئے) او خدا! مظلوم کسان کی تھیلی! کسان کا قاتل ـــــ

(فیروز دین امجد بیگ کے بازو کو زور سے دباتے ہوئے تھیلی

کی طرف حیرت کے عالم میں اشارہ کرتا ہے۔ پاشا پتھرائی ہوئی
آنکھوں کے ساتھ اپنی جگہ پر آہستہ آہستہ کھڑا ہوتا ہے اور
کرسی کی پشت کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے
اس کے ہونٹ بغیر کسی آواز کے ہلتے ہیں)

گل خاں۔ بوتل شراب کی (ایک لمحے کے لئے خاموش ہو جاتا ہے)
بوتل شراب کی (پھر ایک لمحے کے لئے خاموش ہو جاتا ہے)۔
اکرام ـــــ پھانسی ـــــ اکرام۔
(اس کا منہ آہستہ آہستہ کبھی کھلتا اور کبھی بند ہوتا ہے۔ مسافر اٹھتا
ہے۔ دولت یار کو اشارہ کرتا ہے۔ گل خاں کا منہ بند نہیں ہوتا
اور وہ مشین کی طرح دو قدم آگے بڑھتا ہے۔ مسافر اور نزدیک آ
جاتا ہے۔ گل خاں پنجوں پر کھڑا ہو جاتا ہے)

مسافر۔ (دولت یار سے) جلدی۔
(گل خاں اور آگے بڑھتا ہے۔ مسافر اور دولت یار اسے پکڑ لیتے ہیں)
یہاں میری کرسی پر۔ (اتار دو اس کا کوٹ (دولت یار کوٹ اتارتا ہے
اور سرخ مفلر اس کی گردن اور چھاتی کے گرد لپٹا ہوا نظر آتا ہے) بس
یہی آدمی تھا جس نے ـــــ

فیروز دین۔ (فاتحانہ انداز میں) خوب! کسان کی تھیلی اور سرخ مفلر۔ ہاں
ہاں!

مسافر۔ خاموش (اپنا کان گل خاں کے سینے پر دل کے اوپر رکھتا ہے
اور ایک لمحے کے بعد غمگین صورت بنائے سر اٹھاتا ہے) افسوس!

پاشا۔ (آگے بڑھتا ہے۔ ایک ہاتھ سے اپنے سر کے بال نوچتے ہوئے
اور دوسرا گل خاں کی طرف اٹھائے ہوئے) گل! او رذیل کتے
ـــــ چور! میری صندوقچی سے تمام نقدی چرا لایا (اپنے الفاظ
کی اہمیت کو سمجھتا ہے۔ اس پر سکتے کا عالم طاری ہو جاتا ہے)
(مسافر۔ امجد بیگ۔ فیروز دین اور دولت یار یکے بعد دیگرے
اس کی طرف دوڑتے ہیں)

پردہ گرتا ہے

(ترجمے سے بہتر)

قیوم نظر

غزل

زہے قسمت گلستانِ تمنا میں بہار آئی
مری اجڑی ہوئی راتوں میں سوزِ جانفزا لائی

سنبھل اے رونے والے آہ نیری چھپ کے راتوں کو
فلک سے بربطِ ناہید کے نغمے چرا لائی

کسی کے سرمئی گھونگھٹ میں جلوے تلملا اٹھے
کسی کے دل کے ناسوروں پہ اک بجلی سی لہرائی

پسینہ آ گیا کالی گھٹاؤں کی جبینوں پر
جواں شانوں پہ زلفوں نے متوالی سی انگڑائی

مرے افکار کی قندیل سے کونین روشن ہیں
میری تخئیل سے شمس و قمر نے ہے ضیا پائی

الطاف مشہدی

رباعیات

برسات

برسات کا موسم ہے شباب فطرت
برسات نے اُلٹی ہے نقاب فطرت
آویزش ابر و باد نے چھیڑا ہے
یہ کیف آور و دلآویز رباب فطرت

پپیہا

برسات کی گلریز ہواؤں میں پیا ڈھونڈھے
سرشار و گہربار گھٹاؤں میں پیا ڈھونڈھے
شاید تری تسکین سے پی پگھل جائے
جگنو سے بھری ہوئی فضاؤں میں پیا ڈھونڈھے

بجلی

بجلی یہ نہیں رعد کے ہیں زریں تیر
یا ابر سیہ مست کی لرزاں شمشیر
یا ابر و ہوا نے کاتبی ہاتھوں سے
کھینچی ہے فلک پہ ایک سنہری تحریر

بگلے

نسرین کی گوری شاخ گلبار ہوئی
یا سلک گہر مائل رفتار ہوئی
یا ابر سیاہ میں سے بگلوں کی قطار
یا چرخ پہ کہکشاں نمودار ہوئی

عباس بیگ محشر

ایک راہبہ کے محبّت نامے!

دوسرا خط!!

اپنے خطوں میں جب میں تمھیں اپنی کیفیتِ غم لکھتی ہوں تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کو تم تک پہنچانے میں اپنے جذباتِ دل کے ساتھ میں نے ایک سنگین ظلم کیا ہے۔ کاش کبھی تم بھی اپنی بے رخی اور غفلت شعاری کو سامنے رکھ کر میری مظلومیت کا اندازہ کرتے۔ مگر میں تم سے کسی قسم کی امید نہیں رکھ سکتی، اور یہ سچا اظہار کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتی کہ تمھیں مجھ سے اس قدر روکھے پن اور بے پروائی سے پیش نہیں آنا چاہئے۔ آہ، کس قدر معیوب حرکت ہے یہ تمھاری سنگ دل اور جابرانہ ذہنیت کی کہ تم میرے دل کی شکستگی پر بھی ترحم نہیں کھاتے میں تم سے بے انصافی نہیں کر رہی جو اپنی مصیبتوں کا شکوہ تم سے کرتی ہوں۔ اپنی ان مصیبتوں کا شکوہ جن کی قسمت کا حال مجھے اس وقت ہی معلوم ہوگیا تھا، جب تم مجھ سے جدا ہو کر چلے گئے تھے۔

یہ راز مجھ پر اب کھلا کہ میں نے خود کو فریب دیا۔ یہ سمجھ کر کہ تم مجھ سے عام لوگوں کا سا سلوک روا نہ رکھو گے۔ مجھے محبت کی بے اختیاری نے مجبور کر ڈالا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ میں نے تم کو دنیا کے اور انسانوں کی طرح نہ جانا۔ میں نے تمھارے خلوص پر اعتماد کیا اور تم سے غیر معمولی وفاداری کی امیدوار رہی مگر آہ! تمھاری جدائی کی سختیوں نے مجھے اب اس قابل نہیں رکھا کہ میں تم سے کسی قسم کے انصاف کی آرزومند رہوں۔ اگر تم یہ خیال کرکے کہ میں تمھیں چاہتی ہوں۔ مجھ سے محبت کرتے تو یقیناً اس طرح میرے دل کی تشنگی نہ ہوتی۔ میں تو ہمیشہ تم سے تمھارے دلی شوق کی بھیک مانگتی رہی ہوں مگر افسوس یہ اب تک تم مجھ پر ظاہر نہ کرسکے کیونکہ چھ ماہ کے اس قدر طویل عرصے میں تم نے مجھے ایک بھی خط نہ لکھا۔ میں اپنی تیرہ بختی کی تمام تر مایوسیوں کو اپنی محبت کے اندھے پن پر محمول کرتی ہوں اور الفت کے اس لگاؤ کا [جو ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ منسلک کئے ہوئے ہے] ۔ ذمہ دار اپنے احمق دل کو ٹھیراتی ہوں۔ کاش اس وقت جبکہ میری اولین مسرتیں زخمی ہو رہی تھیں میں اپنی محبت کے انجام کو بھی تصور میں لے آتی!!!

کیا میں امیدوار رہوں کہ تم اپنے وطن کی موجودہ رنگین صحبتوں کو چھوڑ کر پرتگال چلے آؤ گے اور میری محبت کی بے قراریوں کو آکر مٹاؤ گے میری زخم نصیب روح کو تم سے اور کچھ نہیں چاہئے۔ صرف ہمدردی اور بس!!

ہماری الفتِ رفتہ کی رنگین یادیں جو غضب میرے دل پر ڈھاتی ہیں۔ آہ۔ میں وہ تمھیں کیونکر بتاؤں؟

اچھا! تو کیا میری آرزوؤں کو ٹھکرا دیا جائے گا، اور کیا اب تم اپنے نظارے سے میری پُراشتیاق نگاہوں کو محروم رکھو گے؟ مگر آہ، میں تو فریب کھا رہی ہوں۔ کیونکہ میرے دل کو اب اس کا پورا یقین ہے کہ محبت کے جن رنگین جذبوں سے تم نے میری پرستش کی تھی وہ عارضی تھے ـــــــ محض فانی!! اور ان خوش گوار لمحوں [جن میں ہم ایک دوسرے کی محبت میں مدہوش وسرور رہتے] کے ساتھ ہی فنا ہوگئے!!!

کاش میں تمھاری الفت میں اس قدر دیوانی نہ ہوتی۔ اور تمھاری محبت کے اتنی مہلک شدت کے ساتھ مزے نہ چکھتی ـــــــ اور اپنی ان موجودہ کرب زائیوں اور خلشوں کو بھی درمیان میں رکھتی!!

میں نے احمق بن کر اپنی زندگی کی تمام راحتیں۔ اپنی روح کی ساری آسائشیں تم پر نثار کر دیں اور اپنی اس وارفتگی اور دیوانگی میں محبت کے بے رحم مستقبل کا کچھ بھی خیال نہ کیا اور اس ہنسی خوشی میں یہ بھی نہ سوچا کہ فطرت نے میرے رلانے کے لئے آنسو بھی پوشیدہ رکھے ہوئے ہیں۔

مجھے اپنی محبت کی انتہائی مسرت میں اس کا احساس تھا کہ میرا تمھارا ساتھ دوامی نہیں، تم مجھ سے ایک نہ ایک دن ضرور چھین لئے جاؤ گے ملاقاتوں کے دوران میں تم سے اکثر کہا کرتی تھی کہ تم میری محبت کو ویران بنا کر

چھوڑ دوگے۔ مگر میرے دل کے یہ سب خدشات و خطرات تمہاری محبت کی سرمستیوں میں ہی ضائع ہو کر رہ گئے۔ یہاں تک کہ تمہارے جھوٹے اقراروں اور وعدوں کی سحرکاری نے میری سب بدگمانیاں بھلا ڈالیں اپنی زخم نصیب روح۔ آہ! اپنی الفت شکستہ کی حقیقت مجھ پر اب کھلی میرے لئے یہ کس قدر آسان تھا۔ اگر میں آغاز محبت میں ہی تمہیں بھلا ڈالنے کی سعی کرتی۔ میں اب محبت کے سب دکھ سب بلائیں خوشی خوشی جھیلوں گی۔ مگر تمہاری محبت ترک کر دوں۔ یہ مجھ سے ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا کیا ہم دونوں کی محبت کا دار و مدار تنہا مجھی پر ہے۔ مجھ پر محبت نہ کرنے کا الزام ہرگز عائد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ میں نے شروع محبت سے اب تک ایک لمحہ بھی تمہاری یاد . . . . تمہاری چاہت کے بغیر نہیں گزارا!

میری بہ نسبت تم زیادہ اس معاملے میں ملامت کے قابل ہو۔ میری طرح سے محبت کی ظلمتوں میں کھو جانا کہیں اچھا ہے۔ ان مٹ جانے والی فانی طرب زائیوں سے جو تمہیں فرانس کی خوب صورت اور نازک اندام عورتیں مہیا کر رہی ہوں گی!!

میں تمہاری بے اعتنائی کی شاکی نہیں۔ مگر تمہیں مظلوم سمجھتی ہوں . . . . . صرف مظلوم!!!

اچھا میں کہتی ہوں کہ تم مجھے بھول جاؤ۔ بالکل بھول جاؤ۔ میرے دل کو پورے طور سے تسلی ہے اور یقین بھی کہ تم میرے بغیر اپنی زندگی کی تمام تر خوشیوں کو ادھورا پاؤ گے اور تم سے میں ہر حالت میں خوش و خرم رہوں گی۔ اس لئے کہ میں تمہاری محبت میں مصروف ہوں!!

چند دنوں سے مجھے کانونٹ [خانقاہ] کا محافظ بنا دیا گیا ہے جس کسی سے مجھے بات کرنے کا موقع ملتا ہے وہ مجھے دیوانی سمجھتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں انھیں کیا جواب دوں۔ کانونٹ کی دوسری لڑکیاں مجھ سے زیادہ پاگل اور سودائی ہیں جو یہ خیال کرتی ہیں کہ میں کچھ سمجھ سکنے کے قابل ہوں!!

فرانسسکو اور ایانول [تمہارے دونوں خادموں] پر مجھے کتنا رشک آتا ہے۔ کاش ان کی طرح میں بھی تمہارے ساتھ رہتی۔ اور ایک وفادار خادمہ کی حیثیت سے ہی تمہاری خدمت کیا کرتی!! مجھے دنیا میں کسی شے کی ضرورت نہیں۔ ضرورت ہے تو ایک صرف تمہاری! تم اگر مجھے مل جاؤ تو پھر دنیا میں اور رہ کیا گیا جس کی میں آرزومند بنوں؟!! کبھی کبھی کم از کم مجھے یاد تو کر لیا کرو۔ تاکہ میں صرف اسی خیال سے کہ تم بھی مجھے یاد کیا کرتے ہو۔ اپنے غم زدہ دل کو شاد کام کر لیا کروں۔ مگر آہ! مجھے یہ کیونکر یقین آئے کہ تم مجھے کبھی یاد بھی کر دگے!

میں نے کیوں نہ اس وقت تمہاری چاہ سے اپنی امیدوں اور ارمانوں کو محدود کر لیا۔ جب میں تمھیں ہر روز دیکھ سکتی تھی۔

یہ تم نے مجھ پر خوب واضح کر دیا ہے کہ میں صرف عجز و نیاز سے تمہارے آگے سر تسلیم خم کیا کروں اور تمہاری مرضی کو اپنی مرضی سے مقدم فرض کیا کروں۔ میری بے کسی اور مظلومیت دیکھو کہ میں نے ہمیشہ ایسے ہی کیا۔ اپنے جذبات کا نہیں تمہارے جذبات کا احترام کیا۔ اس قدر چاہنے کے بعد پھر بھی میری سادگی کی جانب نگاہ کرو کہ تمہاری۔ آہ! صرف تمہاری ہی محبت کی انتہاؤں کی آرزومند ہوں!!

تم مجھ سے علیحدہ ہوگئے۔ میں پھر بھی ناخوش نہیں۔ تمہاری مفارقت [چاہے کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو] میری محبت کی سرجوشیوں کو کم نہیں کر سکتی!!

میں چاہتی ہوں کہ میری محبت رسوائے عام ہو جائے۔ میں اسے راز بنا کر چھپانے کی کوشش کیوں کروں۔ جب کہ میں جانتی ہوں یہ بات میرے لئے انتہائی مسرت کا باعث ہے کہ میں نے اپنی محبت کے فرائض نہایت ایمان داری سے ادا کئے ہیں۔ میں تمھیں اپنی عزت سمجھ کر نہیں بلکہ اپنا ایمان جان کر آزادانہ اور والہانہ طور پر محبت کر رہی ہوں۔

میں یہ سب کچھ اس لئے نہیں لکھ رہی کہ تمہارے جذبۂ رحم کو متاثر کروں۔ یا تم سے اپنی محبت کا کچھ صلہ مانگوں۔ خدا کے لئے اپنے آپ کو مجبور کر کے میرے لئے کبھی کچھ نہ کرنا۔ میں ہرگز ہرگز آرزو نہ کروں گی کہ تم مجھے اپنے دلی شوق سے نہیں بلکہ کسی اور خیال سے مرعوب ہو کر چاہو۔

تمہاری محبت کی نشانیاں [جو تم نے وعدہ کیا ہے کہ بھیجو گے] میں قبول نہ کروں گی!!

کیا تم نے کبھی یہ بھی سوچا کہ میں تمہاری غلطیوں کو معاف کر کے کتنا خوش ہوتی ہوں۔ میں ایسا اس لئے کرتی ہوں کہ تم بھی شاید کبھی میری ہی طرح خوش ہو کر میری خاطر کچھ لکھنے کی تکلیف گوارا کرو۔ تمہارے قصوروں کو نظر انداز کرنے میں واقعی مجھے ایک انتہائی مسرت ایک روحی کیف میسر ہوتا ہے!!

آج صبح ایک فرانسیسی افسر کافی دیر تک [شاید میری حالت سے

متاثر ہو کر) مجھ سے تمہارے متعلق باتیں کرتا رہا۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ فرانس میں اب امن و امان ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو کیا پھر تم مجھ سے ملنے کے لئے نہ آؤ گے اور اپنے ہمراہ مجھے بھی فرانس نہ لے چلو گے ؟!

جو تمہارا جی چاہے کرو۔ میری مظلوم محبت تمہارے اس سفاکانہ رویے سے کبھی بھی بحال نہ ہوئی۔ تمہاری آخری ملاقات کے دن سے اب تک میں نے اپنے دل کو ایک لمحہ بھر کے لئے بھی خوش نہ پایا پھر بھی میری یہ حالت ہے کہ میں دن میں ایک بار نہیں ہزار ہزار بار تمہارے محبوب نام کو دہراتی ہوں اور اسی طرح اپنا دل بہلاتی رہتی ہوں۔ میری سہیلیاں [جو جانتی ہیں کہ تم ہی نے مجھے اس قابل رحم حالت کو پہنچایا ہے] اکثر تمہارا ذکر مجھ سے چھیڑ دیا کرتی ہیں!!

میں اس کمرے کے باہر [جو ہماری اولین ملاقاتوں کی یادگار ہے] جہاں تک ممکن ہوتا ہے کم ہی جاتی ہوں۔ اور تمہاری پیاری تصویر کو [جو مجھے اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز اور مرغوب ہے] دیکھ کر ہی اپنا جی بہلاتی رہتی ہوں اور بحالت دیوانگی اسے بار بار دیکھتی رہتی ہوں!!

تمہاری تصویر کو دیکھ کر میں تھوڑے عرصے کے لئے خوش تو ہو جاتی ہوں۔ مگر آہ! جب یہ خیال کرتی ہوں کہ اب تمہیں کبھی نہ دیکھ سکوں گی تو اس خوشی کو ایک دم بھول جاتی ہوں اور پھر محبت کے جاودانی غم میں مبتلا ہو جاتی ہوں!!

آہ کیا یہ سچ ہے کہ میں تمہیں اب کبھی نہ دیکھ سکوں گی؟ کیا تم مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے ہو؟

میں تمہیں خط لکھ رہی ہوں اور آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا رہی ہیں۔ تمہاری ستم زدہ میری آنا۔ اب محبت کی تلخی کو برداشت کرنے سے معذور ہو چکی ہے۔ خط کا آخری جملہ ہے اور مجھ پر غشی کی سی حالت طاری ہے۔ الوداع ——— خدارا مجھ پر رحم فرماؤ!!!

عظیم قریشی

گاندھی جی سے بات چیت

مندرجہ بالا عنوان کے تحت ایک مدلل اور مسکت کھلی چٹھی سید ابوالقاسم صاحب کی طرف سے مہاتما جی کے نام ادبی دنیا کے مارچ کے پرچے میں اشاعت پذیر ہو چکی ہے

سید صاحب نے جس وضاحت اور عالمانہ استدلال کے ساتھ مہاتما جی کو قائل کرنے کی کوشش کی ہے اس سے ہمارے خیال میں کوئی مخلص اور محب وطن ہندوستانی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا

سید صاحب اپنے گرامی نامہ مورخہ ۱۲ اپریل ۱۹۳۶ء میں تحریر فرماتے ہیں:-

"یہ سن کر کہ گاندھی جی اردو اچھی طرح لکھ پڑھ نہیں سکتے زیر تذکرہ مضمون ناگری میں لکھوانا پڑا جس نے سو صفحوں سے زیادہ جگہ گھیری حالانکہ اردو ٹائپ اسے ۳۵ صفحوں سے زیادہ نہ بڑھا سکا۔

ناگری میں لکھی ہوئی کاپی پر اردو ٹائپ کی ۳۵ صفحے والی کاپی بک کے جوابی رجسٹری سے گاندھی جی کے پاس بھجوائی۔ یہ اس لئے کہ ناگری کا غیر معمولی پھیلاؤ اور اردو رسم الخط کا اختصار بھی ساتھ ہی ساتھ مہاتما دیکھ لیں۔ گاندھی جی نے اس کا جو جواب بعد مدت کم و کاست بعینہٖ درج ذیل ہے۔

مہاتما کی پہلی چٹھی | بھائی صاحب۔ آپ نے بہت محنت سے کر کے مجھے لمبا خط لکھا ہے لیکن جو بات میں نے کبھی نہیں کی اس پر آپ نے اپنا لیکچر بنایا ہے۔ میں تو اردو زبان کی بڑی قدر کرتا ہوں اردو زبان اچھی طرح جاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں نے جو خیالات دس برس پہلے اندور میں ظاہر کئے تھے وہی آج بھی ہیں۔ اب آپ کہیں مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ آپ کا گاندھی

سید صاحب کا جواب | مہاتما جی آپ نے پوری لکھت نہیں پڑھی اسے پڑھ لیتے تو پھر آپ مجھ سے یہ نہ پوچھتے "آپ کیا چاہتے ہیں" اچھا آپ نے مجھ سے جو کہا اور مدراس میں آپ کو جو کہنا پڑا کیا یہ دونوں ایک ہیں۔ ہر تما کے لئے میری پوری لکھت پڑھئے اور پھر جو آپ کو لکھنا ہے وہ لکھئے۔

مہاتما کی دوسری چٹھی | سید صاحب۔ آپ کا خط ملا۔ میں نے آپ کی لکھت پوری پڑھ لی تھی۔ میرا کہنا تو یہ تھا نہ کہ جو آپ نے مان لیا۔ میں نے کہا تھا وہ میں نے کہا ہی نہیں تھا۔ آپ کو تو یہ بتانا ہے میں نے ایسا کہاں کہا تھا۔ جی ہاں جو میں نے مدراس میں کہا سو میں نے ہمیشہ کہا ہے مانا ہے۔ مجھے معلوم نہیں اخبار والوں نے کیا لکھا ہے۔ آپ کا
گاندھی

اس خط و کتابت پر ہمارا کچھ لکھنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ غالب مرحوم پچھتر برس پہلے فرما گئے ہیں۔ ؎

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

ادارہ

انقلاب

نئے سرے سے مجھے وقفِ اضطراب نہ کر ستم کے واسطے دل میرا انتخاب نہ کر
گذر نہ جھوم کے دل کی عمیق آہوں سے نہ دیکھ مجھ کو محبت بھری نگاہوں سے
سنا نہ عشرتِ امروز کا پیام مجھے بنا نہ دل کی تمناؤں کا غلام مجھے
نہ چھیڑ ٹوٹے ہوئے سازِ دل کے تاروں کو جگا نہ خفتہ تمناؤں کے شراروں کو

زباں سے شعلہ نوائی کا کام لینے دے دل و نظر سے مجھے انتقام لینے دے
جگر کو حسن کی نظروں سے چھین لایا میں بتوں کے عشق و محبت سے باز آیا میں
نہیں پسند طلسماتِ رنگ و بو مجھ کو ہے اور ہی کسی جلوے کی جستجو مجھ کو

~~~

عبث جہان کی رنگینیاں بلاتی ہیں نظر کو نور بھرے شعبدے دکھاتی ہیں
سرور و کیف مرے دل کو ورغلاتے ہیں مری نگاہ میں آ آ کے پھر سماتے ہیں
وہ ان کا شرم سے گردن جھکا کے یہ کہنا مرا سہاگ ہو تم میری زیست کا گہنا
وہ ان کا میرے تغافل سے مضطرب ہونا وہ بار بار مرے ہاتھ چوم کر رونا

گدازِ دل کے شرر ہلکی آگ ہوں میں نیازِ عجز کا دفتر حسین نگاہوں میں
نئے خیال کی دنیا میں کھو گیا ہوں میں مگر کچھ اس طرح دیوانہ ہو گیا ہوں میں
کوئی بھی ہوش میں اب مجھ کو لا نہیں سکتا کوئی خیال مرے دل پہ چھا نہیں سکتا

~~~

بسی ہے ایک نئی دل میں آرزو ہو کر جنوں نے چھوڑ دیا کس مقام پر لا کر
وہ آرزو جو کرے سرفراز انساں کو وہ آرزو جو کرے استوار ایماں کو
مہ و نجوم سے آگے ہے کچھ جہاں میرا نظر کی حد سے بہت دور ہے مکاں میرا
نگاہ دامِ تصور میں لا نہیں سکتی جسے خیال کی پرواز پا نہیں سکتی
جنوں نے کر دیا ہر حوصلہ جواں میرا تڑپ کے جی اٹھا پھر جذبۂ فغاں میرا
مہ و نجوم کی چھاتی پہ پاؤں دھرنا ہے فلک کی وسعتِ بے حد عبور کرنا ہے

خیالِ منزلِ موہوم کا شکار ہوں میں
اگرچہ کچھ بھی نہیں ایک تاجدار ہوں میں

خاور (سہام)

دنیائے ادب

داستان گوئی کا فن

دیہی زندگی کا ایک دلچسپ منظر

داستان گوئی کا فن ہندوستان سے آہستہ آہستہ معدوم ہوتا جاتا ہے۔ اب ہمیں وہ پرانے گویے اور داستان گو نظر نہیں آتے جو گاؤں گاؤں پھرتے رہتے تھے اور ستار یا سارنگی پر گا گا کر پرانے قصے کہانیاں عشق و محبت کی داستانیں اور شجاعت اور دلیری کے قدیم واقعات سنایا کرتے تھے۔ گاؤں کا کتھک بھی اب لاپتہ ہے۔ لیکن ابھی تک گاؤں کی زندگی میں اس کی جگہ لینے والا کوئی عنصر پیدا نہیں ہوا ہے۔ یہ خلیج اب شاید ہی بھرے۔ گاؤں کی سادہ معاشرت میں کتھک اور داستان گو ایک نہایت اہم اور مفید خدمت انجام دیتے تھے۔ یہی لوگ مقامی روایات کے محافظ و امین ہوتے تھے اور یہ روایات سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی چلی آتی تھیں۔ یہ لوگ گاؤں والوں میں شجاعت و مردانگی اور قربانی اور جاں نثاری کا جذبہ پیدا کرتے رہتے تھے۔ پھر اہم واقعات اور حادثات بھی انہیں کی زبانی گاؤں میں مشہور ہوتے تھے۔

داستان گو صرف مورخ اور شاعر ہی نہ ہوتا تھا۔ یہی شخص گاؤں میں ناچ رنگ اور ناٹکوں کا بھی موجد ہوتا تھا۔ سینما اور تھیٹر اس وقت ناپید تھے۔ جہاں تک گاؤں کی زندگی کا تعلق ہے یہ اب بھی ناپید ہیں — گاؤں کی اکثریت نے کبھی خواب میں بھی سینما یا تھیٹر نہ دیکھا ہوگا — نوٹنکیاں ہوتی تھیں لیکن ان کا دائرہ عمل بڑے بڑے قصبوں اور شہروں تک محدود رہتا تھا۔ گاؤں میں لے دے کر یہی کتھک اور داستان گو ہوتا تھا جو گاؤں والوں کی ادبی پیاس بجھاتا تھا اور جن چیزوں کو وہ خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکتے تھے۔ داستان گو ان کا نقشہ کھینچتا تھا اور اس سے انہیں محفوظ کرتا تھا... وہ اپنی شیریں زبانی سے بہادری قربانی، جنگ و ہنگامہ اور آخر کار حق و صداقت کی فتح کی تصویریں خاص انداز میں کھینچتا جس سے گاؤں والے پوری طرح لطف اندوز ہوتے تھے۔

لیکن یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ داستان گو کی خدمات یہیں ختم ہو جاتی تھیں۔ وہ صرف ایک فرد نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو ایک ایسا ادارہ ہوتا تھا جس کے بغیر گاؤں کی زندگی سونی بے مزہ اور غیر دلچسپ ہو جاتی۔ وہ گاؤں کی ساری تفریحات کا مخرج اور مرکز ہوتا تھا — ایسا مرکز جو گاؤں کی معاشرت اور سماجی زندگی میں شیرازہ کا کام دیتا تھا۔ گاؤں کے لوگ اس کے پاس کہانیاں سننے کے لئے اکٹھے ہوتے لیکن یہاں صرف کہانیاں ہی نہ سنی جاتیں۔ سب لوگ تبادلۂ خیالات کرتے اور گاؤں کے سارے مسائل زیر بحث آتے۔ داستان گو کی چوپال سیاسی کلب کا کام دیتی اور گاؤں کی عدالت گاہ بھی ہوتی جہاں گاؤں والے اپنے رسم و رواج اور معیار قابلیت کے مطابق عدل و انصاف کے معبد میں نذر عقیدت پیش کرتے اس چوپال یعنی سیاسی کلب کا کوئی نام نہ تھا اور نہ اس کی شہرت تھی۔ نہ کوئی یہاں اُس خوف اور احترام کے جذبے کے ساتھ آتا جو موجودہ عدالت گاہوں میں نظر آتا ہے۔ اس وقت تک جب تک کہ لوگ یہاں اپنی مرضی اور خوشی سے اکٹھے ہوتے تھے کسی کو اس کا احساس بھی نہ ہوتا تھا کہ یہ چوپال اتنی اہمیت رکھتی ہے۔ سب یہی محسوس کرتے تھے کہ یہ چوپال کتھک کی قیام گاہ ہے اور یہاں کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔۔

کتھک کی دنیا

کتھک گاؤں کی زندگی سے شاذونادر ہی کہیں اور جاتا — اس کا ذہنی اور دماغی ماحول گاؤں کی فضا سے بنتا — اُس کی خمیر میں

کسی بیرونی اثر کی آمیزش مشکل ہی سے ہوتی۔ اُس کے تخیل کی پرواز اتنی بلند نہ ہونے پاتی کہ گاؤں والے اُس سے لطف اندوز ہی نہ ہو سکیں۔ اور گاؤں والوں کی خوشی پر اُس کی زندگی اور اُس کے ذرائع آمدنی کا انحصار رہتا تھا۔ —— وہ شجاعت اور قربانیوں کے قصوں سے گاؤں والوں کو مسرور اور متاثر کرتا لیکن وہ ان قصوں میں کوئی ایسی بات نہ بیان کرتا جس سے گاؤں والوں کو لطف نہ آئے جو اُن کے مذاق اور عقل سے بلند ہو، وہ ان کہانیوں میں گاؤں کے مقامی تشبیہہ و استعارات سے مدد لیتا اور ان کی آمیزش سے اپنی کہانیوں پر حقیقت اور واقعیت کا رنگ چڑھا دیتا۔

ہندوستان میں مذہب کا عام تخیل رہبانیت اور تپسیا کا تخیل ہے لوگ خیال کرتے ہیں کہ مذہب روزانہ زندگی اور اس کے تجربات سے لاپروائی کا نام ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مذہب میں یہ تمام باتیں پوشیدہ ہیں لیکن پھر بھی مذہب صرف انہیں چیزوں کا نام نہیں کیونکہ ایسی صورت میں روزانہ عبادتیں اور نیکیاں اور اطاعت گذاریاں کہاں داخل کی جائیں —— زندگی کی جسمانی حرکتوں میں یہ بھی تو شامل ہیں —— قدیم زمانے کا کتھک وہ غلطی کبھی نہ کرتا تھا جو ہم لوگ کرتے ہیں۔ اُس کی کہانیوں میں مذہب کا عنصر بھی پایا جاتا تھا اور وہ انہیں بھی زندگی کی حقیقتیں تصور کرتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ مذہب کے تار سے بھی اپنی کہانیوں کے راگ نکالتا تھا۔ بہادری اور شجاعت کی تمام کہانیاں قدیم اعتقادی افراد اور واقعات کے گرد حلقہ کئے ہوتیں اور انہیں افراد کی زندگی سے وہ نتیجہ نکالتا اور انہیں کو وہ نمونہ بنا کر پیش کرتا۔

لوگ ہندوستان کے گاؤں والوں کی فلسفیانہ قناعت پسندی اور اطاعت گذاری پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر زندگی کا معیار پست ہو اور انسان کی مادی ضروریات نہ پوری ہوا کریں تو اس میں تقدیر پرستی، حسرت اور قناعت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ فرد اور قوم دونوں کی یہی خصوصیت ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ خود فریبی اور فلسفیانہ قناعت پسندی کی بھی ایک حد ہوتی ہے، انسانی زندگی کی ضروریات بہت زیادہ نہیں ہیں اور وہ اگر حالات موافق ہوں تو آسانی سے پوری ہو سکتی ہیں لیکن اس وقت بھی جب ہندوستانی کسان کو کھانے کی کمی نہ تھی۔ وہ تقدیر کے رازہائے سربستہ پر غور کیا کرتا تھا۔ ممکن ہے کہ اس کے کردار کو اس ڈھانچہ میں ڈھالنے میں آب و ہوا کا ہاتھ بھی ہو لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہاں کے دیہاتی کا زاویہ نگاہ فلسفیانہ ہوتا ہے اور وہ تقدیر اور اُس کے متعلقہ موضوعات پر اس قدر بے لاگ طریقہ پر اور اتنی دقتِ نظر کے ساتھ گفتگو کرسکتا ہے کہ اجنبیوں کو حیرت ہوتی ہے۔ —— اس بے تکلفی اور رواداری اور قناعت پسندی پر یہ معلوم کرنے کے بعد اور بھی حیرت ہوتی ہے کہ اس وقت ہندوستان میں تقریباً ہر دیہاتی ان پڑھ اور جاہل ہوتا ہے۔ پھر آخر کار ان کا دماغ اس قدر متمدن کیونکر ہے جب کہ انہیں حرف پہچاننا تک نہیں آتا۔

مذہب

یہ راز اس وقت سمجھ میں آتا ہے جب ہم گاؤں کے کتھک کی خدمات اور اس کے فرائض کا اندازہ لگاتے ہیں۔ اُس کا کام یہ تھا کہ گاؤں والوں کو مذہب اور اخلاق کی تعلیم دے اور اس کے قصے کہانیوں سے تعلیم کی ضرورت بہت کچھ پوری ہو جایا کرتی تھی۔۔۔ آج بھی جہاں کتھک یا داستان گو موجود ہے یہ ضرورتیں تھوڑی بہت پوری ہوتی رہتی ہیں۔ آج بھی فلسفہ علم الاصنام کی شکل میں موجود ہے قصہ کہانیوں کے ذریعے اخلاق کی تعلیم نہایت آسانی سے دی جاسکتی ہے۔

داستان گو کے فن پر اس پہلو سے عجیب و غریب تبصرہ ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں میں مذہبی ادب نے ترقی کی ہندوؤں میں تو کتھک کو اپنے قصوں کا مواد رامائن اور مہابھارت اور رگہ ان کے قصے کہانیوں سے نہایت آسانی اور افراط کے ساتھ مل سکتا تھا۔ لوگ یہ قصے کہانیاں سن کر خوش بھی ہوتے تھے اور اُن سے سبق بھی حاصل کرتے تھے —— اس طرح ہندو مذہب کی تعلیم عوام میں عام ہوئی اور لوگ بہت کثرت کے ساتھ ہندو مذہب کے قدیم بزرگوں اور اُن کی تعلیمات سے واقف ہوتے گئے۔ لیکن مسلم داستان گو کو مقابلتہ یہ آسانیاں نہیں تھیں کیونکہ اسلام میں علم الاصنام تقریباً معدوم ہے۔ پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ لوگ مذہبی تعلیمات اور اخلاقی پند و نصائح سے بھی ہر وقت لطف اندوز نہیں ہوسکتے۔ اگر معجزوں پر بھی انسانی حقائق کا پردہ نہ ڈالا جائے اور اُن کی ہستیوں کو انسانی زندگی کی تشبیہوں سے کم نہ کیا جائے تو کوئی اُن سے محظوظ نہ ہوگا۔ ہندو مذہب کے قصوں بہمول اخلاقی کہانیوں میں سازشوں و دغابازیوں اور وفاشعاریوں کی آمیزش ہوتی ہے لیکن مسلمان داستان گو ان دشواریوں کے سامنے ہمت ہارنے والا نہ تھا۔ اگر اسلام میں اس قسم کے قصے کہانیاں نہیں تھے تو کیا وہ ان کو گھڑ لینے سے قاصر تھا۔؟

اکبر کا تجربہ

دوسرے شعبہ ہائے زندگی کی مانند اس شعبہ میں بھی اکبر ہی نے پہل کی۔ انہی نے سب سے پہلے اس کا ایک منتظم تجربہ کرنا چاہا — ممکن ہے کہ یہ چیز اکبر سے قبل شروع ہو چکی ہو — گمان غالب ہے کہ اس تجربے کا آغاز اس سے پہلے ہو چکا تھا لیکن شاذ و نادر ہی حقیقی موجد کو دنیا موجد تسلیم کرتی ہے۔ کیونکہ دنیا کی نظروں میں موجد وہ ہوتا ہے جو اصل موجد کی خامیوں کو دور کر دے اور اس کی خوبیوں کو اپنا لے۔ بہرحال قصہ یوں ہی مشہور ہے کہ اکبر ہی نے سب سے پہلے اپنے مشہور درباری بیربل کو مہابھارت کو اسلامی رنگ میں لکھنے کا حکم دیا — کچھ دنوں کے بعد بیربل نے بادشاہ سے عرض کیا کہ جہاں پناہ میں نے اسلامی مہابھارت کا خاکہ تیار کر لیا ہے۔ البتہ ایک بات حضور سے دریافت کرنے کی اجازت چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ مہابھارت میں دروپدی کے پانچ شوہر تھے۔ اب آپ فرمائیں کہ اسلامی مہابھارت میں دروپدی کے لئے میں کتنے شوہر متعین کروں؟"

ممکن ہے کہ قصہ بالکل فرضی ہو۔ لیکن اس فرضی قصہ کی تہ میں بھی چند حقیقتوں کی جھلک پائی جاتی ہے۔ یہ یقینی ہے کہ مسلمانوں نے بھی داستان گوئی کی ضرورت محسوس کی ہوگی۔ یہ ضرورت کس طرح پوری ہوئی اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہوں نے طلسم ہوشربا اور طلسم نور افشاں، قصہ حاتم طائی، قصہ چہار درویش وغیرہ جیسی کتابیں دیکھی ہوں۔ یہاں ایک ایک جلد مہابھارت کو مات کرنے والی تھی اور آج تک ان کتابوں کے قصے گاؤں میں بکثرت سنائے جاتے ہیں۔

ان کہانیوں کا نہ ہی ڈھانچہ ہر جگہ ایک ہے لیکن ان ڈھانچوں پر جو گوشت پوست چڑھایا گیا ہے اُس کی شکل ہر صوبے میں مختلف ہے۔ بنگالی کا رام تلسی داس کے پیش کردہ رام سے مختلف ہوتا ہے بنگال کے کرشن جی متھرا کے کرشن سے مختلف ہیں لیکن یہ فرق مدارج کا ہے نوعیت کا نہیں — مسلمانوں کی طلسمات کی کتابوں میں بھی فرق ہو گیا ہے۔ طلسم ہوشربا کے امیر حمزہ بنگالی زبان کے امیر حمزہ سے مختلف ہوتے ہیں۔

لیکن صوبوں کا دیہی ادب اپنی مشابہت میں اتنا دلچسپ نہیں جتنا اپنے اختلافات میں ہوتا ہے — کیونکہ ان اختلافات سے صوبے کی سماجی تاریخ اور وہاں کے رسم و رواج معلوم ہوتے ہیں جو خاص فضا اور حالات میں پیدا ہوئے — بنگال کی دیہی کہانیوں اور گانوں میں سفر کا ذکر اکثر آتا ہے وہاں کا ہیرو بادشاہ نہیں بلکہ سوداگر ہوتا ہے۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں عموماً اس قسم کی کہانیوں کا مرکز کوئی شہزادہ ہوتا ہے۔

لیکن اب یہ تمام باتیں تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ روزانہ کے واقعات نہیں۔ البتہ کہیں کہیں اب بھی کسی داستان گو کی صورت نظر آ جاتی ہے بالکل اسی طرح جس طرح کسی مٹتی ہوئی قوم یا نسل کی ماں کی قدیم خصوصیتیں اب پھر واپس آنے والی نہیں۔ اب تفریح کے نئے سامان پیدا ہو رہے ہیں اور نئی ایجادیں انہیں دعوت مبارزت دے رہی ہیں۔ لیکن وہ خلیج جو داستان گو کے فنا ہو جانے سے پیدا ہو گئی ہے اب تک نہیں بھری — اس کے ساتھ گاؤں کی چند مسرتیں بھی جاتی رہیں۔

"پیام"

رباعی

چھلکا ہے سوادِ درونہاں سے ساقی
لاؤ گے بھی مئے ناب کہاں سے ساقی
[illegible] گدائے در کو تشنہ اک جام
ہے کیفِ حیاتِ گذراں سے ساقی

سعید احمد اعجاز

سچائی

دریا کے کنارے پر گھنے درختوں کے وسط میں آفتاب غروب ہو رہا تھا۔

جوگی لڑکا مویشی گھر واپس لے آیا تھا،

اور دہکتی ہوئی آگ کے قریب بیٹھا ہوا،

اپنے آقا گوتم کی نصیحت آمیز گفتگو سن رہا تھا۔

اتنے میں ایک اجنبی لڑکا حاضر ہوا، اس نے پھل اور پھول پیش کئے، مہاتما کے قدم چومے اور سریلی آواز میں کہنے لگا۔

"مہاراج میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں! مجھے سچائی کا راستہ بتائیے۔ میرا نام ستیا کاما ہے"۔

تجھ پر برکتیں نازل ہوں، میرے بچے تو کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے؟ صرف برہمن ہی اس ارفع عقل کو حاصل کر سکتے ہیں"۔

"مہاراج یہ تو میں نہیں جانتا کہ میں کس خاندان سے ہوں لیکن میں اپنی ماں سے پوچھ کر بتاؤں گا"۔

یہ کہہ کر ستیا کاما مہاتما سے رخصت ہوا اور چشمے کے کنارے آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا اپنی جھونپڑی میں واپس آیا۔ یہ جھونپڑی ریگستانی ویرانے کے اختتام اور خواب آلود گاؤں کے کنارے واقع تھی۔ جھونپڑی میں مدھم چراغ روشن تھا اور ماں اندھیرے میں دروازے پر کھڑی اپنے بیٹے کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔

ماں نے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا، اُس کے بال چومے اور مہاتما کے پاس جو پیغام لے گیا تھا اس کی بابت دریافت کیا۔

"پیاری ماں میرے ابا کا کیا نام ہے؟"

مہاتما جی نے مجھ سے کہا کہ راہِ حق صرف برہمن ہی حاصل کر سکتے ہیں عورت کی نگاہیں جھک گئیں اور لڑکے کے کان میں چپکے سے بولی۔

جب میں جوان تھی تو بہت غریب تھی، پیٹ پالنے کے لئے میں نے بہت جگہ نوکری کی، میرے پیارے تو اپنی ماں کی گود میں اس وقت آیا جبکہ اس کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی"۔

صبح کے آفتاب کی اولین شعاعیں جنگلی درختوں کی پھنگیوں پر ناچ رہی تھیں، قدیم درخت کے نیچے طلبہ مہاتما کے سامنے با ادب بیٹھے تھے۔ اُن کے الجھے ہوئے بال صبح غسل کرنے کی وجہ سے ابھی تک بھیگے ہوئے تھے۔

ستیا کاما آیا، اور مہاتما کی قدم بوسی کے بعد خاموش کھڑا ہو گیا۔

تم کس خاندان سے تعلق رکھتے ہو، مجھے بتاؤ"۔

مہاراج مجھے یہ نہیں معلوم، لیکن میرے پوچھنے پر میری ماں نے مجھ سے کہا، میں نے کئی جگہ نوکری کی تھی، اور تو اپنی ماں کی گود میں اس وقت آیا جبکہ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی"۔

قدیم درخت کے نیچے سنسناتی ہوئی شہد کی مکھیوں کے غصے کی طرح بھنبھناہٹ گونجنے لگی، اور طلبہ اس عزیب کی بے شرم گستاخی پر بڑبڑانے لگے۔

مہاتما بدھ اپنی جگہ سے اُٹھے، انہوں نے اپنے ہاتھ پھیلائے اور لڑکے کو اپنے سینے سے لگا کر کہا۔

"میرے بچے تو تمام برہمنوں سے افضل ہے۔ کیونکہ تو سچائی کا اعلیٰ درثہ رکھتا ہے۔

(ٹیگور)

(ساقی) سعد منیر

شعر

ابتدا وہ تھی کہ تھا جینا محبت میں محال

انتہا یہ ہے کہ اب مرنا بھی مشکل ہو گیا

جگر مراد آبادی

ایک اندھی لڑکی کی دُعا

تو نے تاروں کو ضیا بخشی ہے سورج کو جمال ۔۔۔ بارشِ انوار سے دنیا کی کھیتی ہے نہال

نور پاشی ہیں قمر سے آپ ہی اپنی مثال ۔۔۔ مجھ کو ان چیزوں کی کچھ خواہش نہیں اے ذوالجلال

یہ تمنا ہے کہ اپنی ماں کی صورت دیکھ لوں

لوگ کہتے ہیں کہ رنگوں کی کئی اقسام ہیں ۔۔۔ سرخ ہیں کالے ہیں پیلے اور نیلی فام ہیں

اور ان رنگوں سے وابستہ بہت سے کام ہیں ۔۔۔ مجھ کو کیا! یہ آنکھ والوں کے لئے انعام ہیں

یہ تمنا ہے کہ اپنی ماں کی صورت دیکھ لوں

سنتی آئی ہوں کہ کھلتے ہیں چمن میں لالہ زار ۔۔۔ روئے گل پر رنگ برساتی ہے ساون کی پھوہار

تازگی سی روح میں بھرتا ہے کلیوں کا نکھار ۔۔۔ میں نہیں کہتی کہ یہ سب دیکھ لوں پروردگار

یہ تمنا ہے کہ اپنی ماں کی صورت دیکھ لوں

میری آنکھوں کو بصارت کی ہوس اصلا نہیں ۔۔۔ بے بصر ہوں میں مگر اس کی مجھے پروا نہیں

تو نے سمجھا ہے میں عاجز ہوں مگر ایسا نہیں ۔۔۔ مجھ کو ہرگز آرزوئے دیدۂ بینا نہیں

یہ تمنا ہے کہ اپنی ماں کی صورت دیکھ لوں

"کلیم" ۔۔۔ غلام رسول نازکی کشمیر

نقد و نظر

رہنمائے تعلیم کا تعلیم جدید نمبر

ہمیں یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ "رہنمائے تعلیم" نے اپنی عادت مستمرہ کے مطابق اس دفعہ بھی ایک عظیم الشان خاص نمبر شائع کیا ہے جو ۲۰×۳۰ کے پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے۔

کسی قوم کی بہبودی اور سرفرازی کا تمام تر انحصار اس قوم کے نونہالوں کی صحیح اور قرار واقعی تعلیم پر منحصر ہے۔ رزمنہ سابقہ کے تعلیمی طریقے اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق ہوں تو ہوں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان سے موجودہ زمانے کے بدلے ہوئے حالات کا مقابلہ کسی طرح نہیں ہو سکتا۔

اقوام عالم معراجِ کمال کی اُن بلندیوں تک جا پہنچی ہیں کہ ہندوستان ابھی اس کا تصور بھی صحیح طور پر نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے ہر عمل کو سائنٹفک اصول قوانین کے مطابق کرتے ہیں لیکن ہندوستانی ابھی تک اسی پرانی لکیر کی مسخ شدہ صورت کو پیٹ رہا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی قوم کی فلاح و بہبود کے لئے اس کے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ درخت کی نشو و نما کے لئے اس کی جڑوں میں پانی دینا۔ کسی خشک اور بے برگ و بار درخت کی پژمردہ شاخوں کو آبِ حیات سے دھو کر بھی وہ نتائج حاصل نہیں کئے جا سکتے۔

آیندہ نسلیں ماسٹر جگت سنگھ جی کو ان معلمین میں شمار کریں گی جنہوں نے قوم کو فلاح کا سیدھا راستہ بتایا اور اپنی رہنمائی کا پورا حق ادا کیا۔

جہاں تک ہم نے اس خاص نمبر کا مطالعہ کیا ہے اس سے یہی واضح ہوتا ہے کہ ماسٹر صاحب موصوف نے جدید طریقۂ تعلیم پر بہترین مواد فراہم کیا ہے۔ ہم اپنے ان قارئین سے جو تعلیمی معاملات میں تھوڑی بہت بھی دلچسپی رکھتے ہیں اس نمبر کے مطالعے کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔ قیمت صرف دو روپے

مینجر رسالہ "رہنمائے تعلیم" لاہور سے طلب فرمائیے۔

ادارہ

چند قابل ذکر ہندوستانی مصنوعات

لکھنؤ میں راج زینت ورکس کے نام سے ٹائلٹ کی اشیاء کی تیاری کے لئے ایک کارخانہ کھولا گیا ہے جس نے ان اشیاء کی بہتری اور عمدگی کی بنا پر تھوڑے ہی عرصہ میں پبلک میں کافی نام پیدا کر لیا ہے اور یو۔پی کی بڑی نمائش میں تمغہ و سرٹیفکیٹ بھی حاصل کیا ہے۔ کارخانہ ہذا کی تیار کردہ ٹوتھ پیسٹ اعلےٰ درجہ کی خوشبودار، خوش ذائقہ اور دافع پائیوریا ہونے کے علاوہ جملہ امراض دندان سے بھی محفوظ رکھتی ہے۔

راج سنو چہرے کے داغ دھبے اور چھائیاں دور کرتی ہے۔ جلد کو نرم ملائم اور چمکدار بنا کر صحیح معنوں میں عورت کے حسن کو دوبالا کر کے چار چاند لگا دیتی ہے۔ کارخانہ ہذا کی ترقی کو دیکھ کر ملک کے بڑے بڑے اخبارات نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے لیڈر الٰہ آباد رقم طراز ہے۔ اس کارخانے کی تیار کردہ کولڈ کریم ٹوتھ پاؤڈر اور دلیز کے نمونوں کو ہم نے نہایت تسلی بخش پایا۔ مسٹر راج بل شرما کی محنت اور استقلال قابل داد ہیں پائنیر رقمطراز ہے کہ نہایت اعلیٰ ٹائلٹ کی اشیاء تیار کرنے والوں میں سے راج زینت ورکس لکھنؤ نے اپنا نام پیدا کر لیا ہے۔ ٹوتھ پاؤڈر سنو ہیئر آئل وغیرہ مغربی اشیاء سے اچھی طرح مقابلہ کر سکتی ہیں مسٹر سی وائی چنتامنی سابق وزیر یو۔پی گورنمنٹ فرماتے ہیں کہ ہمیں ملک کا صناع مسٹر راج بل شرما کے استقلال اور تجارتی معیار کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے ہمیں امید اور یقین ہے کہ یہ اشیاء ہندوستان کے گھر گھر میں اپنا گھر بنا لیں گی۔ صوبہ پنجاب کے لئے کارخانہ ہذا کا برانچ آفس امرت دھارا بلڈنگ لاہور میں بھی کھول دیا گیا ہے۔

منیجر ادبی دنیا۔ لاہور

"کہاں جائیں؟"

عزیزم! تمہارا سوال کہ "کہاں جائیں"! ایک یاس انگیز ذہنی کیفیت کا اظہار کرتا ہے۔ سچ کہتا ہوں۔ مبالغہ نہیں جس دل سے یہ سوال نکلے اس کی جذباتی ویرانی پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ہندوستان میں پیدا ہوئے اور یہیں پرورش پائی یہیں پڑھ لکھ کر جوان ہوئے۔ اب کہتے ہو "کہاں جائیں؟" کیا تمہارے لئے اس جنت نشان ملک میں کوئی دلچسپی کا مقام نہیں۔ میں نے تو کہا تھا دلّی چلے آؤ۔ یہاں سات سلطنتوں کی یادگاریں ہیں۔ قدیم زمانے سے دلّی سیاحوں کے لئے دل کشی کے ہزاروں سامان رکھتی ہے۔ جامع مسجد۔ لال قلعہ قطب مینار لوہے کی لاٹھ۔ نئی دہلی۔ ہمایوں کا مقبرہ۔ نظام الدین اولیا۔ کس کس کا ذکر کروں۔ مگر تم ہو کر اٹھنے کا نام نہیں لیتے لاہور بھی مرکزی شہر ہے۔ مدرسوں کالجوں کا گھر ہے۔ اس کے علاوہ شالامار۔ جہانگیر کا مقبرہ۔ نورجہاں کا مزار۔ شاہی مسجد قلعہ کھیل۔ تماشے۔ تم لکھو تو سہی، یہ کیا زندگی ہے کہ آدمی ایک ہی جگہ پڑا سڑا کرے۔ بلکہ میرا ارادہ تو پشاور جانے کا بھی ہے۔ بہت قدیم شہر ہے۔ وسط ایشیا، ترکستان، ایران، افغانستان وغیرہ سے روز کارواں آتے ہیں اور سوداگری کا مال لاتے ہیں۔ کیا یہ دیکھنے کی بات نہیں کہ ریل، جہاز، ہوائی جہازوں کا زمانہ ہو۔ اور ایشیا اللہ جانوروں سے کام لے۔ میں تو تمہیں درۂ خیبر دیکھنے کے لئے بھی کہتا۔ مگر کچھ سردی ہے اور پھر سرحدی علاقہ ہے لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ یہ تاریخی درّہ ایک دفعہ ضرور دیکھنا چاہئے۔ ہاں کراچی سے بھی ایک صاحب مدت سے دعوت دے رہے ہیں تم اگر تیار ہو جاؤ تو ان کے شکوے کی تلافی ہو جائے۔ کراچی بمبئی کے بعد بڑی دلکش بندرگاہ ہے منورا کلفٹن ساحل۔ بندر روڈ۔ جہازوں کا آنا جانا دیکھنے کی چیزیں ہیں اور پھر کشتی میں سمندر کی سیر۔ اس کے علاوہ سندھی شکارپوریوں کی تاجرانہ سرگرمیاں۔ واپسی پر حیدر آباد (سندھ) دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ شہر تعمیر اور فضا کے لحاظ سے قابل دید ہے۔ میں تمہیں ماہنجوڈارو۔ اور ٹیکسلا دیکھنے کی کیا ترغیب دوں۔ تمہاری طبیعت تو ایک بے چراغ ہی مسجد سے گھبرا جاتی ہے۔ اور یہ ہزاروں برس کے پرانے کھنڈر۔ تو شاید تمہیں پاگل ہی بنا دیں۔ البتہ ایسے ویرانوں کا وہی لطف اٹھا سکتے ہیں۔ جو پرانی تہذیب کریدنے کا شوق رکھتے ہوں۔

عزیزم! یہ خیال نہ کرنا کہ شمال مغربی ہند دکھانے سے میرا کوئی خاص مطلب ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم کسی طرح کریہ چھوڑ دو کینچلی اتار دو۔ اور واسو دیو تالاب کو خدا حافظ کہہ کر حرکت میں آؤ۔ اپنے لئے تو پورب پچھم۔ اتر دکھن سب برابر ہیں۔ میں ذکر تو نہ کرتا مگر راجپوتانے اور وسط ہند کی آبادیاں قریب ہیں۔ ان کے رستے ویرانے ہی سہی مگر ان شہروں کی عالی شان عمارتیں اور رنگ قدیم ایام کی یادگاریں ہیں اور دیکھ کر ایک حد تک قدیم ہندوستان کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔

تم دور نہ جانا ہم آگرے سے آگے قدم نہ اٹھائیں گے "اکبر آباد" اور اس کے آس پاس مغلیہ اقبال کے بے شمار نشان باقی ہیں۔ انہیں دیکھ کر بڑے بڑے سیاح عش عش کر اٹھتے ہیں کہ ہندوستان کی کیا شان تھی اور ہندوستانی کیسے لازوال ترکے کے وارث ہیں۔ کسی خاموش مقام سے قلعہ پر نظر ڈالئے۔ ہندوستان کی سطوت و جبروت سے تمام فضا معمور ہوئی محسوس ہوگی۔ پاس سکندرہ آباد میں مغلیہ جلال آغوش لحد میں سو رہا ہے ذرا آگے شیخ سلیم چشتی کا مزار اور اس کے آستانہ پر اکبری عقیدت و نیاز کی بستی یعنی فتحپور سیکری کے خاموش محلات ہیں اور بلند دروازہ تو اپنے بنانے والے کے عزم کا اعتراف کر رہا ہے۔ ہاں تاج سبحان اللہ ایک مرمریں آیت ہے جو لب دریا ایک ابدی کیف کا الہامی اظہار ہے۔ وہی تاج اور اس کی حسن کاری اس محبت گم گشتہ کی سحر کن تعبیر ہے جو صبح ازل کی معصوم نکہت بیزیوں میں بسا رہا ہوئی جس نے آفتاب عالمتاب کی طرح دنیا کو منور کر دیا جس کی ارغوانی شام راحت و نشاط کا پیام لائی۔ اور وہ محبت جو رات میں چاندا ستاروں سے ہم گوشش و ہم نوا رہی۔ تاج ایک طلسم ہے نہیں اعجاز! جو ہر ایک دل و دماغ کو مختلف اوقات میں مختلف انداز سے متاثر کرتا ہے۔ اس کے حسین و جمیل گنبد کے نیچے عہد وفا کی پابند دو ہستیاں محو خواب ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر ایسے مقامات کی زیارت ہو جائے تو سیر فردوس سے کم نہیں۔

ایک اور تجویز ہے۔ الہ آباد بھی کیفیت کی جگہ ہے گنگا جمنا کا سنگم ایک پرلطف اتحادی سبق ہے پھر بنارس ہے جہاں بت اور بتکدے حسن و شباب اور رنگ و بو۔ جوش عبودیت میں سرشار ہیں۔ یہاں سے لکھنؤ جا سکتے ہیں۔ لکھنؤ اور اس کی شان کیا کہنا سارے اودھ کی جان ہے۔ زیادہ کیا لکھوں۔ جو ارادہ ہو۔ اطلاع دو۔

عباد اللہ

امپیریل سٹوڈیو نیوز!

از دفتر امپیریل فلم کمپنی بمبئی نمبر ۲

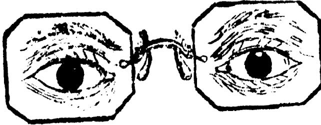
موٹر کار موٹر سائکل سے ٹکرا گئی امپیریل فلم کمپنی کی اسسٹنٹ پکچر ونت بنگالی کا وہ سنسنی خیز سین ہے جس کو ادائی کے ساتھ ادبہت سے حیرت انگیز اور دل ہلا دینے والے مناظر آپ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔ اس پکچر کو مشہور نوجوان ڈائرکٹر مسٹر ایس۔ پی ایرانی ڈائرکٹ کر رہے اور مس حسن بانو۔ جسونت وہ عبدل۔ سید احمد۔ غلام رسول وغیرہ اس میں بہترین اداکاری کے جوہر دکھا رہے ہیں، اس کے مکالمے اور گانے اردو کے مشہور جرنلسٹ اور ملک کے مسلم الثبوت شاعر و انشا پرداز حضرت ساحل بلگرامی تحریر کر رہے ہیں۔

سلوچنا کمیونسٹ ہو گئیں حقیقت میں نہیں بلکہ صرف امپیریل کی فلم "سرچ لائٹ" میں۔ جن میں خدا پرستی اور دہریت کی کشمکش کو نہایت عمدہ طریقہ پر دکھایا گیا ہے۔ اس فلم کو امپیریل کے مشہور ڈائرکٹر ماسٹر ہومی ڈائرکٹ کر رہے ہیں اور ملکہ حسن مس سلوچنا۔ ڈی بلیموریا۔ زلو۔ جمشید جی۔ غلام رسول رشید احمد اور عبدل وغیرہ اپنے اپنے پارٹ ادا کرنے میں نہایت محنت سے کام لے رہے ہیں۔ امید ہے کہ یہ فلم پردہ پر آ کر ایک انقلاب پیدا کر دے گی۔

نکمے بیٹے نے باپ کی لاج رکھ لی امپیریل کی اس فلم کا نتیجہ ہے جس کا نام "میرے لال" ہے اور جسکو امپیریل کے تجربہ کار ڈائرکٹر مسٹر گنجال نہایت مستعدی سے ڈائرکٹ کر رہے ہیں مسٹر غزنوی بی۔ اے مس پرمیلا۔ مسٹر ڈبلیو۔ ایم خان۔ زلو جمشید جی وغیرہ اس میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھا رہے ہیں اس کے مکالمے اور گانے مسٹر قابل امرتسری لکھ رہے ہیں جو ایک تجربہ کار مکالمہ نویس ہیں۔

پردہ پر رنگینی آج کل مسٹر گڈوانی ایک رنگین فلم کی آوٹ ڈور شوٹنگ کر رہے ہیں اور جس میں مس پدما اور ماسٹر نثار کے علاوہ امپیریل کے بہترین اداکار سید احمد وغیرہ کام کر رہے ہیں امپیریل ہندوستان کی پہلی فلم کمپنی ہے جس نے رنگین فلموں کو تیار کر کے ملک کے سامنے پیش کرنے کا انتظام کیا ہے۔ آپ اس فلم کی رنگینی دیکھ کر بہت ہی محظوظ ہوں گے۔ اس کے مکالمے اردو کے مشہور انشا پرداز مسٹر سعادت حسن منٹو لکھ رہے ہیں۔

رتن بائی کی مزدور کی بیٹی تیار ہو چکی ہے اور اب مسٹر اٹارٹی کسی دوسری پکچر کی شوٹنگ کا پروگرام بنا رہے ہیں! امید کی جاتی ہے کہ عنقریب ہی شوٹنگ شروع ہو جائے گی جس میں رتن بائی اور حافظ جی کام کریں گے۔



فہرستِ مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہِ جون ۱۹۳۷ء

جلد ۱۵   تصویر: غمِ روزگار   نمبر ۸

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس (۱۰) شلنگ

(گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر پبلشر چھپکر دفتر ادبی دنیا "کمرشل بلڈنگس مال روڈ لاہور سے شائع ہوا)

ماتمِ منصور

زباغِ جوانی گلے برنچیدہ — سوئے خلد بشتافت منصور احمد

بجاں آفریں دادجانِ عزیزش — ۵۶ ۱۳ حیاتِ ابد یافت منصور احمد

(حفیظ ہوشیار پوری)

منصور احمد مرحوم کے اٹھ جانے سے اُن کے عزیزوں اور دوستوں کی زندگی میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے۔ وہ تو یقیناً کبھی معمور نہیں ہو گا لیکن رنج و غم کا وہ اظہار بھی جو اُن کی بے وقت موت پر ملک کے گوشے گوشے میں کیا گیا ہے۔ کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ باوجودیکہ وہ طبعاً ایک نہایت خاموش طبیعت انسان تھے اور خود نمائی و خود ستائی سے سخت متنفر لیکن ان کی مقناطیسی اور باوقار شخصیت اور ان کی سیرت کی نمایاں خوبیوں سے وہ اصحاب بھی جنہوں نے مدۃ العمر کبھی اُن سے بالمشافہ ملاقات نہیں کی تھی اسی طرح متاثر نظر آتے ہیں جس طرح ان سے ہر دم ملنے والے احباب۔ دفترِ ادبی دنیا میں روزانہ کئی اصحاب بہ نفسِ نفیس اظہارِ افسوس کے لئے تشریف لاتے ہیں اور ہر ڈاک سے ہمیں تعزیت کے بے شمار خطوط موصول ہو رہے ہیں۔ میں ان تمام حضرات کے خلوص اور ہمدردی کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور اُنہیں یقین دلاتا ہوں کہ ان کے ہمدردانہ جذبات ہی ہماری ڈھارس بندھانے کا موجب ہوئے ہیں اور ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ جو مقصد منصور مرحوم کو دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھا یعنی خدمتِ زبان و ادب۔ ہم اُس کے حصول کے لئے اپنی بے بضاعت کوششیں سرگرمی سے جاری رکھیں گے۔

بے انصافی ہو گی اگر ملک کی ادبی انجمنوں اور مجلسوں کی قراردادیں جو مرحوم کے ماتم میں منظور کی گئیں اور اُن کے دور افتادہ احباب اور قلمی معاونین کے پرسوز خطوط جن میں مرحوم کی سیرت کی بعض لطیف خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ادبی دنیا کے ہزاروں ناظرین سے جو منصور احمد کے ماتم میں ہمارے برابر کے شریک ہیں مخفی رکھے جائیں لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ سلسلہ دراز ان ہے۔ باقی صفحات میں جو ہم نے اس غرض کے لئے محفوظ کر دئیے ہیں۔ کسی طرح سما نہیں سکتا۔ اس لئے مناسب یہی سمجھا گیا ہے کہ اس بارے میں انتخاب اور اختصار سے کام لیا جائے۔

معاصرین میں سے ہم ہمایوں۔ ساقی۔ تریبون۔ شیرازہ۔ خاتون سماج اور اختر کے مرہونِ منت ہیں کہ انہوں نے اپنے کالم مرحوم کے ماتم کے لئے وقف کر دئیے اور منصور جیسے ادیبِ یکتا کے سوگ میں ہمارے شریک ہوئے۔ علاوہ بریں وہ روزانہ اخبارات بھی شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے مرحوم کے انتقال کی خبر ملک کے طول و عرض میں ان کے احباب اور مخلصین تک پہنچانے میں ہماری مدد کی۔

حضرت علامہ کیفی۔ جناب جلال الدین اکبر۔ جناب مصطفےٰ خاں آزاد حضرت علی منظور حیدر آبادی۔ جناب حفیظ ہوشیار پوری۔ جناب شہید ابن علی اور حضرت ضیا فتح آبادی نے مرحوم کی یاد میں دل گداز مرثیے لکھے ہیں۔ علامہ کیفی کا مرثیہ پچھلی اشاعت میں درج ہو چکا ہے۔ باقی حضرات کا کلام اس اشاعت میں شامل ہے اور حق یہ ہے کہ مرحوم کی سیرت کی یہ تصویریں جو ان کے احباب نے مختلف زاویوں سے کھینچی ہیں ان میں ستائش بے جا یا مبالغہ کا نقش موہوم تک نہیں۔

آخر میں مجھے جناب عاشق حسین بٹالوی بی اے ایل ایل بی اور حضرت حفیظ ہوشیار پوری ایم اے کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے میری اور مرحوم کے برادرِ اصغر مولوی منظور احمد صاحب کی خواہش پر مرحوم کی جانشینی یعنی ادبی دنیا کی ادارت کی ذمہ داری قبول کر لی ہے۔ عاشق صاحب کا نامِ نامی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ سرزمینِ ادب اُن کے قلم کی بہار آفرینی سے رشکِ صد گلزار ہے اور وہ اس وقت اردو کے چوٹی کے ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں، حضرت حفیظ ہوشیار پوری نوجوان ہونے کے باوجود بے حد پختہ مشق ہیں اور ان کی قادر الکلامی اور

رنگین بیانی نے ان کے لئے ملک کے اوّل درجے کے شعرا کی صف میں ایک ممتاز جگہ حاصل کر لی ہے اور یہ ایک قابل فخر امر ہے کہ موصوف انجمن اردو پنجاب کے اسسٹنٹ سکرٹری کی حیثیت میں پہلے ہی سے خدمت اردو میں مصروف ہیں۔ منصور مرحوم تو مجمع الصفات تھے۔ وہ اگرچہ بہت کم شعر کہتے تھے لیکن شاعر گر واقع ہوئے تھے۔ ترجمے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ سلیس اور پرزور اردو لکھنے میں وہ اپنی طرز کے موجد تھے۔ اور تنقید ادبی و شعری پر تو انہیں ایسی استادانہ قدرت حاصل تھی کہ بہت بڑے بڑے لوگ جن کا نام اس ضمن میں سن کر آپ حیران ہو جائیں۔ اس میدان میں اُن کا لوہا مانتے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں فنِ ادارت کا بے نظیر سلیقہ ودیعت ہوا تھا۔ دوست دشمن سب ایک بات پر متفق ہیں کہ منصور احمد جیسا میگزین ایڈیٹر اردو صحافت نے آج تک پیدا نہیں کیا۔ یہ واقعہ ہے مبالغہ نہیں۔ ایسے شخص کی جانشینی کچھ ہنسی کھیل نہیں تھا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ مجھے ایسے دو رفیق کار میسر آ گئے ہیں جن کی قابلیت اور خوش ذوقی اور جن کی مقبولیت خاص و عام میری ہمت بندھاتی ہے اور مجھے امید دلاتی ہے کہ ادبی دنیا منصور احمد کی بہترین اور پائندار یادگار ثابت ہوگا۔

صلاح الدین احمد

روز و شب رو لئے شام و سحر رو لئے
کچھ نہ روئے آہ گر ہم عمر بھر رو لئے

معزز معاصر ہمایوں اپنی تازہ اشاعت میں رقمطراز ہے۔

"کس طرح انہوں نے "ہمایوں" کے لئے برسوں دن رات محنت کی۔ "ہمایوں" اسے کبھی نہیں بھول سکتا۔ کیسے انہوں نے ترقی کی اُن کے قلم میں کیسا زور پیدا ہوا۔ اقتباس ترجمہ نظم تنقید کیونکر ان تمام ادب کے شعبوں میں ان کی طبیعت نے اپنا زور دکھایا۔ ان سب باتوں کا ایک گہرا نقش ہمایوں کے صفحات پر ہمیشہ کے لئے موجود رہے گا۔ دن رات کی ادبی محنت اور غور و فکر نے ایک منحنی جسم کو اور کمزور بنا دیا۔ مجبوراً وہ ہمایوں سے علیٰحدہ ہوئے لیکن جب تھوڑی مدت آرام کرنے سے صحت بہتر ہوئی تو ان کی حساس طبیعت کو پھر ادب نے اپنی طرف کھینچا۔ اس کے بعد انہوں نے کیا کچھ کیا۔ ادبی دنیا اور اُس کے شاندار سالنامے اس کے شاہد ہیں۔

اردو ادب کے وہ سینکڑوں خدمت گزار جن کی خدمت کی بنیاد دلی شوق اور محبت کے درجے تک پہنچی ہے جن کی اس سیاست زدہ زمانے میں کماحقہٗ قدر نہیں ہو سکتی جن پر دنیا کی نظریں کم پڑتی ہیں لیکن جن کا خلوص اور یکسوئی ان کا ایمان ہے۔ ان سینکڑوں میں منصور احمد کی محبوب شخصیت کو ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ اردو ادب کی راہ میں شہید ہوئے یقین جانئے کہ وہ ادب جسے ایسے ایسے مخلص شہیدوں کا خون سیراب کرے کبھی فنا نہیں ہو سکتا۔

بشیر احمد

"منصور کی طویل علالت نے اس کے جسدِ عنصری کو بے حد لاغر کر دیا تھا۔ مگر آج اس کے باوجود مجھے اُس کی موت مرگِ ناگہاں معلوم ہوتی ہے یہ اس لئے نہیں کہ مجھے اس کے نحیف پیکر کی طاقتِ برداشت پر اعتماد تھا۔ بلکہ میں شاید یہ سمجھتا تھا کہ جس زبردست ارادے اور پرخروش عزم کی آگ اس مشتِ خاکستر میں سلگ رہی ہے۔ اس کو موت نہیں آ سکتی۔ میرے اس خیال کی اصلیت کچھ بھی ہو زندگی کے ساتھ منصور کا تعلق اتنا گہرا تھا کہ اب بھی دنیا سے اس کی دائمی علیٰحدگی کا یقین کرنا دشوار ہے۔ اگر عزم و جرأت اور ہمت و استقلال کی بنا پر زندگی عطا ہوتی تو منصور کو حیات جاوداں مل چکی ہوتی۔ اس کی تمام زندگی ایک طویل اور خاموش جد و جہد تھی جس سے وہ نہ کبھی تھکا اور نہ گھبرایا۔ اس جد و جہد کے جو پہلو دنیا کی نظر کے سامنے آ سکے وہ خیالستان ہمایوں اور ادبی دنیا کے ساتھ منصور کے تعلقاتِ ادارت تھے۔ اس کے ذوقِ عمل کی یہ کیفیت تھی کہ وہ مایوسی کے نام سے ناآشنا تھا اُسے معلوم ہی نہیں تھا کہ پژمردگی و درماندگی انسان کی زندگی کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے۔ موت نے اُسے میدانِ جنگ میں گرا ہوا نہ پایا

بلکہ اُس وقت جب وہ گھمسان میں تلوار چلا رہا تھا موت نے اچانک پیچھے سے آ کر اس کی آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔

اس کے احساس خودداری نے اس کی گردن ہمیشہ بلند رکھی۔ اس کے ہر کام میں اس کی عزت نفس کی شان ہویدا تھی۔ اس کی نیت میں خلوص، قول میں راستی اور عمل میں بے باکی تھی۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جس پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ اس کی شرافت اس کی پیشانی سے آشکار تھی۔ اخیر وقت تک اس نے اپنی آن اس طرح قایم رکھی کہ مرض کی شدت میں بھی کوئی کلمہ اضطراب اس کے منہ سے نہ نکلا۔ آخری رات کو اس کے بستر سے تین مرتبہ کراہنے کی آواز آئی تو عزیزوں نے سمجھ لیا کہ واقعی عمر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

آج تک یہ راز نہ کھلا کہ کیوں قدرت پہلے ایک دلکش نغمہ چھیڑتی ہے اور پھر اُسے پورا کئے بغیر ساز کو توڑ کر پھینک دیتی ہے۔ آہ اے سوزِ ناتمام

حامد علی خاں

معزز معاصر **ساقی** لکھتا ہے:۔

جواں مرگ منصور احمد بہت اچھے ادیب اور بہت اچھے ایڈیٹر تھے وہ ادب نواز بھی تھے اور ادیب نواز بھی۔ ترجمہ نہایت پاکیزہ کرتے تھے اور اپنی طبیعت سے جو کچھ لکھتے تھے اس کا تو کہنا ہی کیا۔ شعر کم کہتے تھے مگر جتنے کہتے تھے نپے تُلے۔ ایک خوبی ہو تو بیاں کی جائے۔ ع

سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

انہیں تو اُن کے کمالات ہی کی نظر کھا گئی۔

منصور احمد کی موت پر جتنے بھی آنسو بہائے جائیں کم ہیں۔ انہوں نے ہم سے ایسے وقت میں منہ موڑا جب ہمیں اُن کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ پسماندگان کے دلوں پر کیسی قیامت گزری ہو گی جب اس چھبیس سال کے کڑیل جوان کی لاش مٹی کو سونپی گئی ہو گی۔ خیال ہی سے دل کٹ کٹ جاتا ہے

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی منصور
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

اللہ تعالیٰ مرنے والے کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور پسماندگان کو صبر کی توفیق دے۔

شاہد

ہمعصر **شیرازہ** نے اپنی گزشتہ اشاعت میں لکھا

مولانا منصور احمد صاحب ایڈیٹر ادبی دنیا کی بے وقت اور ناگہانی موت سے پنجاب کی اردو صحافت اور انشا پردازی میں ایک ایسی جگہ خالی ہو گئی ہے جو مدت تک پُر نہیں ہو سکے گی۔ آپ نے مختلف حیثیتوں میں اردو شعر و ادب کی جو خدمات سرانجام دیں "خیالستان" "ہمایوں" اور "ادبی دنیا" کی جلدیں اس کی شاہد ہیں۔ "دنیا کے بہترین افسانے" آپ کے ترجمہ کی مہارت اور انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے۔ برسوں کی مشق اور عرق ریزی نے صحیفہ نگاری میں وہ پختگی پیدا کر دی تھی کہ اس کی مثال اور کہیں مشکل سے نظر آئے گی۔ بہت کم حضرات کو معلوم ہو گا کہ منصور ایک طباع اور خوش ذوق شاعر بھی تھے۔ ندیم کے نام سے آپ کا کلام "ہمایوں" اور "ادبی دنیا" میں شائع ہوتا رہا ہے۔ اب سے ایک سال پیشتر علالت کے دوران میں کشمیر کی فردوس رشک فضا نے مرحوم کی زبان سے جو شعر نکلوائے تھے وہ انہیں زندہ جاوید بنانے کے لئے کافی ہیں۔

یہ اس جواں مرگ ادیب اور شاعر کی مختصر زندگی کا وہ پہلو تھا جو منظر عام پر آ چکا ہے اور جس سے کم از کم وہ حضرات ضرور روشناس ہوں گے جنہیں اردو شعر و ادب سے ذرا بھی مس ہے۔

مرحوم کی زندگی کا دوسرا پہلو اس سے بھی زیادہ اہم اور روشن تر ہے۔ منصور ایک شریف النفس اور مرنجاں مرنج انسان اور ایک نہایت ہی مخلص دوست تھا۔ احباب کا ذکر آخری دم تک اُن کی روح کے لئے سرمایۂ راحت رہا۔ اس مشتِ استخواں کے صبر، بردباری اور تحمل کا یہ عالم تھا کہ بسترِ علالت پر بھی کسی مایوسانہ کلمہ یا شکایت سے زبان کو آلودہ نہ ہونے دیا

روشن اور پُر خلوص آنکھیں، نیک دل، متبسم لب، انکسار میں ڈوبی ہوئی گفتگو —— یہ تھا منصور!

اے کاش

برہم نہ یہ بزمِ شادمانی ہوتی!
اے کاش نہ ختم یہ کہانی ہوتی!
اے کاش سدا فزار گل کو ہوتا!
اے کاش بہار جاودانی ہوتی!

(منصور احمد مرحوم)

معاصر "اختر" رقمطراز ہے

ایسے وقت میں منصور کا ہم سے چھن جانا ہماری انتہائی بدقسمتی ہے منصور کا نعم البدل اب ادبی دنیا میں مشکل سے ملے گا۔

انجمن اردو پنجاب لاہور

انجمن اردو پنجاب کی مجلس عاملہ کا سالانہ جلسہ زیر صدارت پنڈت برج موہن صاحب کیفی دتاتریہ ۵ ارمئی کی شام کو المنظر میں منعقد ہوا، اور مندرجہ ذیل قرارداد تعزیت جو صدر محترم کی طرف سے پیش ہوئی۔ حاضرین نے کھڑے ہو کر متفقہ طور پر منظور کی ہے۔

"انجمن اردو پنجاب کا یہ اجلاس، مولانا منصور احمد صاحب ایڈیٹر 'ادبی دنیا' کی بے وقت اور ناگہانی موت کو اردو ادب و صحافت کے لئے نقصان عظیم تصور کرتے ہوئے انتہائی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔"

پنجاب لٹریری لیگ لاہور

پنجاب لٹریری لیگ کا ایک غیر معمولی اجلاس ۱۵ رمئی کو لیگ کے کلب ہاؤس میں منعقد ہوا میاں بشیر احمد بی اے آکسن بیرسٹرایٹ لا صدر تھے اور پنجاب کے ممتاز ادبا اور اخبار نویسوں کے علاوہ دیگر اہل علم اصحاب بھی شریک جلسہ تھے۔ صاحب صدر کے علاوہ پروفیسر حمید احمد خاں ایم اے، عاشق حسین صاحب بٹالوی بی اے ایل ایل بی، ملک عطاء اللہ کلیم ایم اے، سید محمد جعفری ایم اے، مسٹر ایس ایم فاروق ایم اے، مسٹر ایف ایم ساقی اور مسٹر اپندر ناتھ اشک نے ماتمی تقاریر کیں، جن کا خلاصہ یہ تھا کہ

"منصور احمد اگرچہ دنیا کی نظر میں ایک بے مثال ادیب تھے اور وہ انہیں اسی حیثیت سے یاد رکھے گی لیکن ان کا اصلی مرتبہ کچھ وہی لوگ جانتے ہیں جنہیں قریب سے ان کی شخصیت کا مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ وہ درحقیقت ایک بہت بڑے انسان تھے۔ راستی۔ حق پرستی۔ خودداری اور حقیقی مروت ان کی سیرت کی نمایاں خصوصیات تھیں۔"

عاشق صاحب نے تجویز پیش کی کہ مرحوم کی کوئی یادگار قائم کی جانی چاہئے۔ مسٹر اندر لال داس قمر ایم اے اور دیگر اصحاب نے اس کی پرزور تائید کی اور اسے جامۂ عمل پہنانے کے لئے ایک خاص اجلاس طلب کرنے کی تجویز پر جلسہ برخاست ہوا۔

بزم ادب ڈیرہ غازی خاں

۹ رمئی کو بزم ادب ڈیرہ غازی خاں کا اجلاس خصوصی زیر صدارت ادیب شہیر مولانا صادق ایوبی صاحب جن بست بغرض تعزیت منعقد کیا گیا جس میں صاحب موصوف نے مولانا منصور احمد کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا۔

بعد ازاں سید فضل الحسن شفقت کاظمی نے یہ قرارداد پیش کی کہ بزم ادب ڈیرہ غازی خاں کا یہ اجلاس خصوصی مولانا منصور احمد صاحب کی موت پر اظہار افسوس کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ خداتعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

انجمن ترقی اردو کشمیر

جموں۔ ۱۲ رمئی۔ انجمن ترقی اردو جموں و کشمیر کا ایک عام اجلاس انجمن ہذا کے دفتر میں زیر صدارت شیخ محمد واحد صاحب صبا منعقد ہوا۔

صاحب زادہ حسن شاہ صاحب فاروقی نے حضرت منصور احمد صاحب ایڈیٹر ادبی دنیا کی بے وقت اور ناگہانی موت پر اظہار افسوس کا ریزولیوشن پیش کیا جو باتفاق رائے منظور کیا گیا اور مرحوم کے حق میں دعا کی گئی کہ خدا انہیں جنت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

بزم ادب اردو کوہاٹ

کوہاٹ ۱۴ رمئی۔ بزم ادب اردو کوہاٹ کا اجلاس خصوصی منعقدہ ۱۳ ر مئی ۱۹۵۳ء ہندوستان کے قابل ترین و مایہ ناز ادیب جناب منصور احمد ایڈیٹر ادبی دنیا کی وفات حسرت آیات پر اپنے انتہائی رنج والم کا اظہار کرتا ہے۔

بزم سخن پشاور

بزم سخن پشاور کا ایک اجلاس خصوصی منصور احمد صاحب مرحوم کی تعزیت کے لئے منعقد کیا گیا جس میں مرحوم کی علمی و ادبی خدمات پر پشاور کے بہترین ادبانے تقریریں کیں اور بالاتفاق قرار پایا کہ بزم سخن مرحوم کی وفات حسرت آیات پر دلی رنج و افسوس کا اظہار کرتی ہے اور اسے ادب اردو کے لئے ایک صدمۂ عظیم تصور کرتی ہے۔

دور افتادہ اصحاب کے خطوط

خان بہادر مولوی ضیاء الدین احمد ایم اے ایل ایل بی ڈائرکٹر تعلیمات بہاولپور اپنے گرامی نامہ کے دوران میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"آج ہمیں منصور احمد کی خداداد ادبی قابلیتوں کی یاد اتنا نہیں ستاتی جس قدر اُن کی بلند اور محبوب شخصیت کی جدائی۔"

جناب مہر لال سونی صاحب ضیا فتح آبادی ایم اے۔ لکھتے ہیں:۔

"ادبی مصروفیتوں کے سلسلہ میں میں بہت سے ایڈیٹروں اور ادیبوں سے ملا ہوں مگر یہ بالکل واقعہ ہے کہ منصور احمد ایک ملنسار اور مخلص انسان کی حیثیت سے سب سے بلند اور زیادہ باوقار تھے۔ اُن سے ملنے والے اپنے دلوں

میں اُن کے لئے خلوص و قدرت اور احترام کا جذبہ ہی محسوس نہیں کرتے تھے بلکہ محبت اور وہ بھی ایک بے پایاں محبت کا دریا امڈتا ہوا پاتے تھے۔

ادب اردو کو منصور احمد سے جو توقعات تھیں۔ قدرت کی ایک ناموزوں کروٹ نے اُن سب کو ایک دم خاک و خون میں ملا دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جانے والا اپنے پیچھے راستے پر وہ نقوش چھوڑ گیا ہے جو ابد تک بعد میں آنے والوں کے لئے رہنما بن کر منزل کی طرف اشارہ کرتے رہیں گے۔

آسمانِ صحافت کا وہ درخشندہ ستارہ بظاہر غروب ہو چکا ہے مگر اس اندھیرے میں وہ حقیر ذرے جو اُس کے روشن ماحول میں رہتے ہوئے اس کی روشنی کا کچھ حصہ خود میں جذب کر چکے ہیں اب اُس کا نام روشن کرنے کے لئے مستقبل قریب میں اپنی چمک سے آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دینے والے ہیں۔

علامہ محمد حسین صاحب عرشی رقمطراز ہیں:۔

یہ میں کیا سن رہا ہوں! منصور بھی چل بسے!! ہیہات۔ میری ان کی قلمی شناسائی آج سے سترہ سال پہلے ۱۹۲۰ء سے تھی، جب انہوں نے خیالستان نکالا۔ آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

مجھے امید ہے کہ آپ ان کی علمی یادگار "ادبی دنیا" کو قایم رکھیں گے۔

سعید احمد صاحب اعجاز پٹنہ سے لکھتے ہیں:۔

منصور احمد صاحب کی وفات حسرت آیات سے دل کو سخت صدمہ پہنچا ہے ع کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے۔ مرحوم کی ذات بڑی خوبیوں اور اخلاق مندیوں سے متصف تھی۔ اگرچہ آپ کا میرا غائبانہ تعارف تھا، پھر بھی آپ کے خطوط میں محبت اور خلوص کی ایسی جھلک ہوتی تھی جس نے مجھ پر گہرا اثر چھوڑا۔ منصور صاحب کے اُٹھ جانے سے اردو ادب کو جیسا محسوس نقصان ہوا ہے، اُس کی توضیح کی حاجت نہیں، اہلِ نظر اچھی طرح جانتے ہیں ابھی نہ جانے کیسے کیسے دُرِ خوش آب آپ کی قلم سے سلکِ تحریر میں آنے والے تھے، کہ یکایک موت نے ہاتھ روک دیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

جناب عبد السمیع صاحب پال اثر صہبائی ایم اے ایل ایل بی وکیل سری نگر سے لکھتے ہیں

مرحوم بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ ایک ذہین اور رطباع انسان ایک صاحبِ ذوق ادیب، ایک حق پسند اور حق گو نقاد اور پھر ایک مخلص اور محبت بھرا دوست، اللہ تعالیٰ مرحوم پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے، مرحوم کی علیحدگی سے ادبی دنیا پر ایک کوہ گراں ٹوٹ پڑا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق عطا فرمائے کہ آپ ادبی دنیا کے معیار اور وقار کو برقرار رکھ سکیں۔

سید علی منظور صاحب حیدرآباد دکن سے رقمطراز ہیں۔

یہ سچ ہے کہ مرحوم کی ملاقات کا شرف مجھے حاصل نہیں ہوا لیکن انھوں نے یگانۂ فن غالب کی طرح مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا تھا، میں نے ان کے سبق آموز کردار کا جو خاکہ پیش کیا ہے اس کو ان ہی کے خطوط کی ایک جھلک سمجھئے۔

اُردو کی خدمت میرے مرحوم دوست جس سنجیدگی کے ساتھ کر رہے تھے اُس کی داد مجھ جیسا لاابالی شاعر کیا دے سکتا ہے، مولانا شاہد احمد صاحب بی اے آنرز دہلوی، مرحوم کو فلسفی اڈیٹر اور ان کے رسالہ "ادبی دنیا" کو اردو کا سب سے بڑا اور سب سے اچھا رسالہ کہتے ہیں۔ ایک جدید تعلیم یافتہ آزاد خیال اہلِ زبان ایسی وقیع رائے یونہی نہیں دے دیتا۔ مرحوم کی تعریف میں نے بلا مبالغہ کی ہے، وہ جیسے بے باک تھے اُس سے دنیائے ادب آگاہ ہے۔ مرحوم بڑی خوبیوں کے آدمی تھے اگر آپ ان کی کوئی مفید یادگار عصری ضرورتوں کو ملحوظ رکھ کر قائم کرنا چاہتے ہیں تو میں بھی اپنی حیثیت کے موافق آپ کی تائید کروں گا۔ انشاءاللہ

سید تسکین عابدی صاحب نے حیدرآباد دکن سے لکھا ہے۔

مجھے ہر وقت ادبی دنیا کا تازہ پرچہ دیکھنے سے جو مسرت حاصل ہوتی تھی افسوس کہ اس مرتبہ وہ مسرت رنج سے بدل گئی۔ پنڈت کیفی کا نوحۂ منصور اور آپ کا نوٹ پڑھ کر جو صدمہ ہوا وہ عرض نہیں کر سکتا۔

بھائی! جب ہم کوسوں پار کے نادیدہ دوستوں کو منصور کی موت سے جو صدمہ ہوا وہ ہمارے لئے ایک صدمۂ عظیم ہے تو ظاہر ہے کہ آپ کے لئے کیا نہ ہوگا۔

جناب ناصر عسکری بی اے ایل ایل بی، اسسٹنٹ سیکرٹری کشمیر کونسل لکھتے ہیں "منصور کے کسی دوست کو یہ یقین کیونکر آسکتا ہے کہ اس نے شرطِ دوستی توڑ کر ہم سے ہمیشہ کے لئے جدائی اختیار کی"۔

جناب سیفی نوگانوی شاہ آباد سے تحریر کرتے ہیں۔

کیونکر سمجھوں کہ وہ مخلص رفیق اس دنیا سے چلا گیا جس سے میری ادبی دلچسپیاں وابستہ تھیں جس کی قدردانی اور جوہر شناسی سے ہمت بڑھی تھی جس نے میری سادگی کو پسند کر کے تحریر کے میدان میں ہاتھ پکڑ کے اس طرح چلایا کہ اپنی کمزوریوں کا خیال نہ رہا اور قدم بڑھا کر اُس عاشقِ ادب کے ساتھ ہو لیا۔

ہیہات کون یاں سے نہ جائے گا منصورا
حیف یہ ہے کہ نوجوان گیا

ادبی دنیا کو میں مرحوم کی یادگار سمجھتا ہوں۔ اگر آپ اسے جاری رکھیں تو جو خدمت اب تک کرتا رہا ہوں کرتا رہوں گا۔

جناب مہر محمد خاں صاحب شہاب بمبئی سے لکھتے ہیں۔

کیا میں پنجاب کے اردو اخبارات کی اس اطلاع کو صحیح باور کر لوں کہ آپ کے رفیق قدیم اور رفیق کے مخلص ترین دوست اور اردو زبان کے فلسفی ادیب و نقاد مولوی منصور احمد صاحب وہاں پہنچ گئے۔ جہاں سب کو جانا ہے اور جہاں جاکر آج تک کوئی واپس نہیں آیا۔

برادرم! منصور کو آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں لیکن منصور کی خوبیوں کے عاشقوں میں سے ایک یہ بے نوا بھی ہے۔ میں عنقریب مرحوم کی سیرت و اخلاق اور علمی و ادبی کمالات اور اپنے ان سے ذاتی تعلقات کے متعلق ایک مضمون لکھوں گا۔ وباللہ التوفیق۔

جناب سید احمد حسین صاحب ہیڈ ماسٹر سکول فار الکزینڈرز (؟) لدھیانہ سے تحریر فرماتے ہیں:۔

ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مُرد۔ آپ کے قوتِ بازو مولانا منصور احمد صاحب مرحوم کی بے وقت موت کا حال اخبارات میں پڑھ کر بے حد رنج و ملال ہوا۔ مرحوم نہایت شریف۔ بے حد لائق و خلیق نوجوان تھے۔ یہ موت بڑی دردناک ہے کہ جوانی میں انتقال ہوگیا۔ افسوس۔

سید یوسف بخاری صاحب دہلی سے تحریر فرماتے ہیں:۔

"زمیندار" میں مولانا منصور احمد کی وفات حسرت آیات کی خبر پڑھ کر بے انتہا صدمہ ہوا۔ خدا مرحوم کو بخشش فرمائے۔ ایک روز سب کو یہاں سے جانا ہے لیکن اُن کی اس بے وقت جدائی نے "اردو" کو ایک مخلص خادم کی خدمات سے محروم کر دیا جو آخر وقت تک اردو کی ترقی کے لئے کوشاں تھا۔ آہ! "ادبی دنیا" کا مسیحا چل بسا!!

میر زمان خاں سلطان ضلع جہلم سے لکھتے ہیں۔

ان کی وفات کا صدمہ میرے لئے بھی ویسا ہی جانکاہ ہے جیسا آپ صاحبان کے لئے۔ اس لئے میں غالب کی طرح آپ کو صبر کی تلقین کیسے کرسکتا ہوں۔ جبکہ اس صدمے سے خود میں متاثر ہوں۔

جناب حمید عرفانی ایم اے۔ پشین بلوچستان سے رقمطراز ہیں

منصور اپنی نظیر آپ تھا جس شخص کو منصور سے ذاتی تعارف کا موقعہ ملا۔ وہ اُس کی سادگی اور خلوص سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں منصور کو پنجاب کی صحافی دنیا کا بہترین نمونہ سمجھتا ہوں اور بحیثیت ایک انسان کے میں نے اُس سے بہتر شخص نہیں دیکھا۔ مجھے کتنی خوشی تھی کہ اب کے وہ یہاں آئیں گے اور اس دور دراز کونے میں چند دن لطف سے گزریں گے۔ منصور ایسے انسان کا کھو جانا کوئی معمولی بات نہیں یہ ہماری زبان اور ملک کی بدنصیبی ہے۔ ہماری آنکھوں میں "ادبی دنیا" ہی منصور کی نشانی ہے اور خدا کرے اس کو ہر طرح سے کامیابی ہو۔ ذاتی طور پر میں مرحوم کا ممنونِ احسان ہوں۔ ڈرامائی شاعری کی طرف نہ صرف مرحوم نے مجھ کو توجہ دلائی بلکہ اصلاح تک بھی دی۔ اس وقت میرے سامنے وہ منظوم ڈراما ہے جو مرحوم کے ایما سے میں نے پچھلی صدی کی انگریزی شاعری کے نمونے پر تحریر کیا اور ان سطروں پر سرخ پنسل کے نشانات اور اشارات ہیں۔ میرے پاس تو شاید چند خطوط اور یہ ڈراما مرحوم کی ذاتی یادگاریں ہیں۔

جناب مرزا یاس یگانہ چنگیزی سب رجسٹرار لاتور۔ دکن نے یہ جامع تعزیت نامہ بھیجا ہے۔

منصور احمد مرحوم و مغفور
بندہ بھی مجبور فطرت بھی مجبور

انا للہ وانا الیہ راجعون

جناب سید عابد علی صاحب طالب ایم اے الہ آباد سے لکھتے ہیں۔

منصور مرحوم کے انتقال کی خبر سے رسمی اور ادبی نہیں روحانی تکلیف ہوئی۔ اب بہترین "یادگار" یہی ہوگی کہ رسالے کو کامیاب سے کامیاب تر بنانے جائیے۔

جناب صلاح الدین ملک صاحب پٹنہ سے تحریر فرماتے ہیں۔

آہ! آج ہم سے وہ شخص جدا ہوگیا جس سے ہم نوجوانوں کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ کتنا نیک اور کتنا شفیق۔ نور کا پتلا اور معصومیت کی تصویر۔ غریبوں کا ہمنوا اور نوجوانوں کا ہمدرد، ہم لوگوں میں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اٹھ گیا۔ آہ! آج صحافت کا آفتاب جس سے جہان اردو روشن تھا، ہم لوگوں کو تاریکی میں چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔ امید ہے کہ تمام نوجوان و ہمدرد زبان ہندوستانی (اردو) مرحوم کی یادگار باقی رکھنے کے لئے جریدہ ادبی دنیا کو جو مرحوم کی سچی یادگار ہوگی قایم رکھنے کی کوشش فرمائیں گے۔

(باقی مضمون بر صفحہ ۶۰۷)

نوحۂ منصور

خاک اڑاتی ہے گلستاں میں صبا تیرے بعد
چاک کرتے ہیں گل و لالہ قبا تیرے بعد

کیوں "عروسِ ادب و شعر" نہ فریاد کرے
پھر کوئی چاہنے والا نہ ملا تیرے بعد

پیکرِ صدق و صفا تجھ سا نہ پیدا ہوگا
روز بدلے گا جہاں رنگ نیا تیرے بعد

کھو کے پایا ہے تجھے رازِ محبت ہم نے
ہم کو معلوم ہوئی قدرِ وفا تیرے بعد

آہ! وہ چین نہ آتا تھا جنہیں تیرے بغیر
ہو گئے قائلِ تسلیم و رضا تیرے بعد

جی رہے ہیں کہ ترا نام ہے زندہ ہم سے
ورنہ دل اپنا ہے جینے سے خفا تیرے بعد

کھل گیا ہم پہ بھرم آج وفاداری کا
کس سے باندھے کوئی پیمانِ وفا تیرے بعد

تیرے جینے کی دعائیں ہوئیں ثابت بیکار
اب نہ اُٹھے گا کبھی دستِ دعا تیرے بعد

وسعتیں ہو گئیں دل پر غمِ ہستی کی عیاں
بھیدِ تقدیر کا لیکن نہ کھلا تیرے بعد

بن گیا نغمۂ دل نالۂ ماتمِ منصور!
آہ وہ لطفِ تغزل نہ رہا تیرے بعد

انتہا دیکھ چکا ہے غمِ فرقت کی حفیظ
غم نہ ہو گا کوئی اس غم سے سوا تیرے بعد

غمزدہ
حفیظ ہوشیارپوری

غمِ منصور

جان سے آہ گزر جاؤں تو کچھ دور نہیں
انجمن میں نظر آتا کہیں منصور نہیں

کون سا دل ہے کہ غم میں ترے رنجور نہیں
کون سا سینہ ہے جس میں ترا ناسور نہیں

کون سی تیری مساعی ہیں کہ مشکور نہیں
کون سی بزم ہے جس میں ترا مذکور نہیں

بزمِ اربابِ ادب میں ترے جلوے کے بغیر
دل بھی مسرور نہیں آنکھ میں بھی نور نہیں

ایک سے ایک ہے اربابِ ادب میں بہتر
کوئی منصور نہیں ہے کوئی منصور نہیں

جان پر کھیل کے کی خدمتِ اردو تو نے
جاں کنی شیوۂ ہر چاکر و مزدور نہیں

تیرے مٹنے سے مٹی رسمِ وفا صد افسوس
اب زمانے میں وفا کا کہیں دستور نہیں

حق تو یہ ہے کہ مروت میں وفاداری میں
نظر آتا کوئی ہم پایۂ منصور نہیں

یاد ہیں چاندنی راتوں کی وہ سیریں باہم
آج ان چاندنی راتوں میں مگر نور نہیں

یاد میں تیری تڑپتا ہوں شب و روز مگر
کیا مصیبت ہے ملاقات کا مقدور نہیں

یہ تو ممکن ہے کہ مرنے سے مجھے تو مل جائے
موت سے پہلے مگر مرنے کا مقدور نہیں

اس کا مونس تھا تو ہر غم میں پہ تیرے غم میں
کوئی پرسانِ دلِ اکبرِ رنجور نہیں

جلال الدین اکبر

منصور نہیں

دور وہ ہم سے بظاہر ہے مگر دور نہیں
کون کہتا ہے کہ اب بزم میں منصور نہیں

یوں بھی جاتا ہے کوئی چھوڑ کے اپنوں کو بھلا
مشربِ عشق و وفا میں تو یہ دستور نہیں

مستیٔ بادۂ عشرت میں جدائی کا الم
ہم کو منظور نہیں اس کو بھی منظور نہیں

اور اگر سچ ہے کہ وہ چھوڑ گیا ہے ہم کو
نقصِ تقدیر ہے، انسان کا مقدور نہیں

اُٹھ گیا محفلِ احباب سے منصور احمد
کوئی تسکین کی صورت دلِ رنجور نہیں

منحصر قوتِ بینائی تھی جس پر نہ رہا
شمع روشن ہے مگر بزم میں وہ نور نہیں

ذرّے ذرّے سے برستی ہے جہاں میں وحشت
جب وہ ساحر ہی نہیں پھر کوئی مسحور نہیں

یہ کرشمہ بھی ہے ادراک کی حد سے باہر
آدمی زیست پہ مجبور ہے، مجبور نہیں

چشمِ ظاہر سے اگر دور ہے منصور تو کیا
اے ضیاؔ دیدۂ باطن سے تو مستور نہیں

ضیاؔ فتح آبادی

منصور سے

کیا جنتِ کشمیر کی آئی نہ ہوا راس ؟ کیوں جنتِ فردوس کو منصور سدھارا؟
اِس عالمِ فانی سے گیا سوئے عدم تو یا دامنِ افلاک سے ٹوٹا کوئی تارا
پینا ہی پڑا ہم کو وہ زہرِ غمِ فرقت غیروں کے لئے بھی جو نہ کرتے تھے گوارا

کھول آنکھ ذرا شاعرِ نو عمر و جواں مرگ کیوں محفلِ احباب سے کرتا ہے کنارا
اُٹھ تجھ کو تری ہمتِ عالی کی قسم ہے اٹھ لے کے فلک گیر عزائم کا سہارا
اُٹھ بہرِ خدا! دیکھ، رواں ہجر میں تیرے احباب کی آنکھوں سے ہے خونناب کا دھارا
کیا پاس تجھے گریۂ والد کا نہیں ہے اُٹھ کشتۂ اندوہ نہ کر اس کو خدارا
اٹھ بزمِ ادب تیرے لئے سوگ نشیں ہے اٹھ تیری خموشی نہیں یاروں کو گوارا
اٹھ عشق گراں گام کو پھر درس جنوں دے
اٹھ اور دلِ بے تاب کو تعلیم سکوں دے

شہید ابن علی

منصور احمد کی آخری جھلک

مندرجہ ذیل اشعار منصور احمد مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں سپردِ قلم کئے تھے۔ ۱۰ مئی کی شام کو وہ کوہ مری سے واپس ماڈل ٹاؤن پہنچے اور ۱۱ مئی کو دوپہر کے وقت ان کا انتقال ہو گیا۔ درمیانی شب کے کسی حصہ میں خدا جانے کس جذبۂ بے اختیار سے مجبور ہو کر انہوں نے یہ شعر کہے۔ انھوں نے اپنے ہاتھ سے یہ تین شعر کاغذ کے ایک پرزے پر لکھ کر اپنے بستر کے تکئے کے نیچے رکھ دئیے۔ ان کی وفات کے بعد یہ مسودہ مرحوم کے چھوٹے بھائی مولوی محمود احمد صاحب کو ملا۔

منصور احمد کو تمام عمر جس جذبۂ عمل نے مصروف و سرگرم رکھا حیرت ہے اُس کی تپش اُن کی رگوں میں اُس وقت بھی ارتعاش پیدا کر رہی تھی جب زندگی کی آخری رمق اُنہیں الوداع کہنے کو تھی۔ یہ اشعار اس رجائیت، اُس روشن خیالی اور اُس زندگی و زندہ دلی کے آئینہ دار ہیں جو مرحوم کی سیرت کا سب سے نمایاں اور سب سے گرانمایہ پہلو تھا۔ عین اُس وقت کہ موت سر پر منڈلا رہی ہو اور ایک نحیف و نزار جسم مرض کی شدت سے گھل گھل کر چند گھڑی کا مہمان رہ گیا ہو، مزاج کا یہ ثبات و استقلال اور طبیعت کا یہ عزم و استحکام ہمیں حیرت زدہ بنا دیتا ہے۔

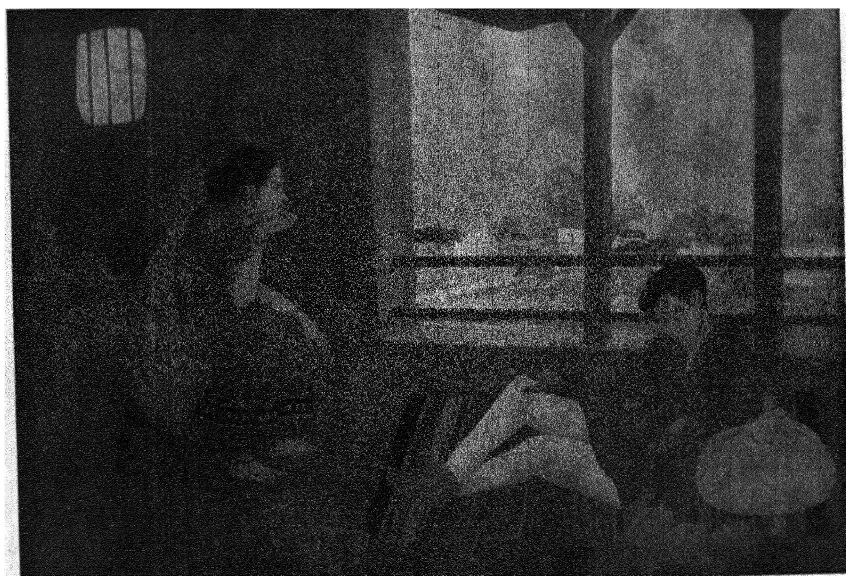
ادارہ

بڑے بڑے سرکشوں کے سر جھک گئے ہیں دنیا میں میرے آگے
مقابلہ کر چکا ہوں میں اس کی رستمی اور بہمنی کا

سکوں سے ناآشنا ہے دل مضطرب ہے جاں کا ہر ایک ذرّہ
عمل سے ہے زندگی مری، راز ہے عمل میری زندگی کا

مرے ہی قلبِ حزیں کی ہے شمعِ جاوداں یہ یقین جانو
جہانِ تاریک میں سراسر ظہور ہے جس کی روشنی کا

منصور احمد



غم روزگار (عمل اوپاما)

آہ منصور!

(۱)

یاروں کو رلائے گی بہت فرقتِ منصور ۔۔۔ پیری کی نہیں موت، یہ ہے مرگِ جوانی

کل تذکرے شادی کے ہوا کرتے تھے جس کی ۔۔۔ آج اس کی مجھے کرنی پڑی مرثیہ خوانی

کل تک جو نوا سنج تھا خود بزم ادب میں ۔۔۔ آج اس کی حکایات ہیں اوروں کی زبانی

دنیائے صحافت میں جو کل سحر رقم تھا ۔۔۔ مفقود ہے آج اس کی وہ سب سحر بیانی

اک ڈھیر ہے مٹی کا دبائے ہوئے اُس کو ۔۔۔ کل تک جو تھا دنیا کے لئے بحرِ معانی

مشکل ہی سے منصور سے ملتے ہیں جہاں میں ۔۔۔ بے عیب جو سیرت تھی، تو پاک اس کی جوانی

(۲)

منہ پھیرے ہوئے جاتے ہو دنیائے دنی سے ۔۔۔ آیا نہ پسند آہ تمہیں عالمِ فانی؟

رُوٹھے ہوئے جاتے ہو جو گھر والوں سے یوں تم ۔۔۔ یہ کس نے سکھایا تمہیں، کیا دل میں ہے ٹھانی؟

کہہ دو گے کہ بھائی تو ہیں دونوں ہی جواں اب ۔۔۔ ماں باپ تو بوڑھے ہیں، سنو اُن کی کہانی

احباب نے بھی تم سے جفا کوئی نہ کی تھی ۔۔۔ پھر کیوں ہوئی اب اُن سے یہ بے وجہ گرانی

کہتا نہ تھا میں تم سے کہ صحت ہے مقدم ۔۔۔ لیکن نہ سُنی تم نے مری اور نہ مانی

اب کس سے بتاؤ کریں ہم لطف کی باتیں ۔۔۔ اور جا کے سنائیں کسے اب رازِ نہانی

یاد آئیں گے اوصاف تمہارے ہمیں ہر دم

ہر چند کہ تم فانی تھے اور ہم بھی ہیں فانی

مصطفیٰ خاں آزاد

روشن خیال دوست

یہ سُن کر کہ منصور جاتا رہا کہا دشمنوں نے مزا کیا رہا
بیاں کیا کروں میں کہ خود میرے ساتھ سلوک اُس کا ہر وقت کیسا رہا
کبھی اُس نے ٹالی نہیں ایسی بات
نہاں فایدہ جس میں سب کا رہا وہ آخر تک اپنوں کا شیدا رہا

عدو سے جھجک کر پلٹتا نہ تھا وہ خوش حوصلہ بڑھ کے گھٹتا نہ تھا
کبھی عجب سے اس نے سازش نہ کی ندامت سے ہرگز سمٹتا نہ تھا
ندامت ہو جس پر وہ کوشش نہ کی
سبق "وقت سازی" کا رٹتا نہ تھا کبھی اپنے مرکز سے ہٹتا نہ تھا

جو تھا مجھ سے "آئین" میں اختلاف اسے میرے آگے بھی کہتا تھا صاف
جسے حق سمجھتا رہا اس کا دل نہ کرتا تھا اس سے کبھی انحراف
نہ ہونے دیا میں نے اس کو خجل
کہا اس کے علم الیقیں کو معاف کہ باتیں نہ تھیں اس کی لاف و گزاف

بظاہر وہ ناکامِ ارماں رہا مگر سنیئے مجھ سے تو شاداں رہا
یہ دنیا ذلیل اس کا طالب ذلیل وہ اپنی قناعت پہ نازاں رہا
نہیں رازِ عزت "متاعِ قلیل"
وہ ملت فروشوں پہ حیراں رہا رہا تو انہیں سے پریشاں رہا

غضب اس کی تھی "عُسر کش" زندگی وہ رُخ وہ شرافت کی تابندگی
نہ کی یُسر کی اس نے کس دن تلاش ہوئی ختم کب اس کی درماندگی
تہی دست پا کر اُسے بدمعاش
اٹھاتے رہے لطفِ شرمندگی خیالوں میں اس کے نہ تھی گندگی

طریقِ کرام اس نے دکھلا دیا مرے دل کو بر وقت گرما دیا
نہ دے جس کی فطرت زمانے کا ساتھ زمانے نے کب ساتھ اس کا دیا
نہ پھیلایا اس نے کہیں اپنا ہاتھ
مجھے اس کی غیرت نے تڑپا دیا سبق جو دیا عبرت افزا دیا

کہے العطش جس کا خالی سبو سیہ مست وہ تشنۂ آرزو!
مجھے یاد ہے اُس کی شانِ غیور وہ تھا سب کی نظروں میں باآبرو
اُسے قعرِ پستی سے رکھتی تھی دُور
طرب آفریں شوکتِ گفتگو نہ ہو کیوں مجھے اس کی پھر جستجو

نہ لے جو کسی سے "بہائے ضمیر" وہ خود دار انساں ہے کیا امیر
ملاتے جو اس کی نظر سے نظر کہاں آج وہ "ذی وجاہت فقیر"
مرا نیک دل دوست المختصر
لیاقت فضیلت میں تھا بے نظیر سپہرِ نجابت کا مہرِ منیر

مگر آہ اس کا یہ فضل و کمال رہے گا مجھے یاد با صد ملال
نہ کی میں نے کچھ قدر اس کی نہ کی گیا اس جہاں سے وہ آشفتہ حال
تمہارا بھی ہے دوست ایسا کوئی
تو ہر آن رکھو تم اس کا خیال نظر آئے تا "عارفانہ جلال"

وگرنہ مری طرح دُکھ پاؤ گے بہت اپنی غفلت پہ شرماؤ گے
کوئی تم کو غافل نہ کر دے کہیں جب آ جائے گا ہوش گھبراؤ گے
"گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں"
نہ کھونے کی شے کھو کے پچھتاؤ گے اسی غم میں تم خود بھی مر جاؤ گے

علی منظور حیدرآبادی

ظہورِ قدسی

ھ

عالمِ رنگ و بو کی پُر کیف انگڑائیاں اکثر خمار نظارہ بن چکی ہیں فصلِ گل ہمیشہ نکہت بدوش ہواؤں کے قافلے کے قافلے ساتھ لاتی رہی ہے۔ بزمِ دہر بارہا ایسے ساز و سامان سے آراستہ ہوئی ہے کہ نگاہیں فرشِ راہ بن کر رہ گئی ہیں۔ نگار خانۂ وجود کے بام و در بکثرت فروغِ مسرت سے معمور نظر آئے ہیں۔ لیکن گل کدۂ دہر کی اس طرح کی نظر فروزی، فصلِ بہار کی اس طرز پر عطر بیزی، انجمن عالم کی اس نہج پر آراستگی، ایوان ہستی کی اس روش پر تابناکی جیسی کہ ربیع الاول میں چشمِ روزگار نے دیکھی کبھی نہ دیکھی تھی۔

ماہ ولادت کے متعلق تو سب کا اتفاق ہے کہ ربیع الاول ہی میں ارضِ بطحا کے مقدر کا ستارہ چمکا۔ ہاں تاریخ ولادت کی تعیین میں اختلاف ہے یہ اختلاف بھی چھ سے سترہ تک میں منحصر ہے اس سے آگے نہیں۔

محمود پاشا فلکی ناقد علم ہیئت نے اپنے ایک رسالے میں ربیع الاول کی نویں، پیر کا دن، ۲۰ اپریل ۵۷۱ء ولادت باسعادت کی یہ تاریخ بہ تفصیل ریاضی ادلہ سے ثابت کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ جناب ابراہیم (جگر گوشۂ رسول الثقلین) کی رحلت کے وقت سورج گہن سنہ ۱۰ ہجری کا واقعہ عام طور پر مسلم ہے۔ اس وقت شہنشاہ کونین کی عمر گرامی ترسٹھ برس کی تھی۔ ریاضی کے قاعدوں سے اس امر کی تصریح ہوتی ہے کہ ۷ جنوری ۶۳۲ء آٹھ بج کر تیس منٹ پر سنہ ۱۰ کا گہن لگا تھا قمری حساب سے ترسٹھ برس پیچھے ہٹنے پر سال ولادت ۵۷۱ء اور تاریخ ولادت ۲۰ اپریل ۵۷۱ء مطابق ۹ ربیع الاول روز دوشنبہ قرار پائی ہے۔

یہ وہ میمنت آور تاریخ مسعود ہے جس تک پہنچنے کے شوق میں دستِ سپہر نے نہ معلوم کتنی مرتبہ کہکشاں کی تابناک کمندیں پھینکیں دن رات کے مسلسل قاصد بھیجے۔ مہر و ماہ کے زر افشاں اور سیم افشاں کتنے سربمہر لفافے روانہ کئے۔ سیاح فلک قوس قزح کے نظر افروز خلعت، ستاروں کے پُر ضیا جواہر انتظار کی کشتی میں لگائے کب سے اس کی راہ تک رہا تھا۔

قضا و قدر نے عناصر کی کارفرمائیاں، مہر و ماہ کی ضو پاشیاں سحاب دُربار کی گہر ریزیاں شمیم عطر افشاں کی نکہت انگیزیاں، خُلّتِ ابراہیمی، حسن یوسفی، اعجازِ موسوی، انفاس عیسی کا بیش بہا سرمایہ بند رِیج اسی لئے فراہم کیا تھا کہ آخری قصرِ نبوت زینتِ تکمیل کے فروغ سے جگمگا اُٹھے۔

آج کی صبح پُر نور وہ سعادت آفریں صبح ہے جس کی رات نے رفعتِ کسروی، سطوتِ کیانی، صولتِ رومی، اغلالِ چینی کو خاک میں ملا دیا۔ آتش کدۂ ضلالت، آذر کدۂ جہالت، سقر شر، جحیم ضرر سب ٹھنڈے ہو گئے۔ بت خانے مسمار ہو کر گردِ دامن روزگار بنے صنمکدے ویرانی سے آباد ہوئے، مجوسیت کا درفش کاویانی سرنگوں ہوا، نصرانیت کے اقانیم ثلاثہ قعر تحقیر نے اپنے آغوش میں چھپا لئے۔

چمنِ روزگار میں یمن و سعادت کی روح پرور بہار آئی، زمزمۂ توحید سے دشت و در لبریز ہوئے۔ عالمِ امکان آفتابِ ہدایت کی تجلی ریزیوں سے بقعۂ نور بنا، نہاں خانہ ضمیر اسرارِ قدس کا جلوہ خانہ بن گیا، اخلاق انسانی کا خس پوش چشمہ سحاب سعادت کے فیضان سے بحر مواج بن کر بہہ نکلا یعنی جناب عبداللہ کا دُرِّ یتیم، حضرت آمنہ کا نورِ نظر، پارۂ جگر، خدیو حرم، شہریار عجم، خانوادۂ ہدایت کا چشم و چراغ، تنزیہ و تقدیس باری کا مہکتا ہوا باغ، دین و دنیا کا تاجدار، لنگرِ زورق روزگار، خسرو عرش نشیں، رحمۃ للعالمین عزت افزائے خطۂ ارض ہوا۔

پہلے پہل حضرت آمنہ کے معجز نما دودھ کی دھاریں پیکرِ رسالت کے کام و دہاں کا تغذیہ بنیں، پھر ہالہ (جناب آمنہ کی بنت عم اور حضرت حمزہ کی والدۂ گرامی) ثوبیہ (کنیز ابولہب) اُمّ ایمن (کنیز جناب عبداللہ) پھر بی بی حلیمہ کی گود (ابن اسحاق کی تحقیق کے موافق) پورے چھ برس تک رسول البطحی کا گہوارہ بنی رہی۔

خصوصیاتِ عرب اور فصاحت زبان کے جوہر کی حفاظت کے لئے معززین عرب کے شیر خواروں کا خانہ بدوش بدوؤں میں نشو و نما پانا

اس وقت کے تمدن کا ایک خاص دستور تھا حلیمہ خاتون کے آغوش میں ختم المرسلین کے زمانۂ رضاعت وغیرہ بسر ہونے کی قوی وجہ یہی ہے۔

چھ برس کے سن میں والدۂ ماجدہ کا سایہ سر سے اٹھا۔ آٹھ سال کی عمر میں جدِ محترم سے مفارقت ہوئی۔ شعور کی آنکھ کھلی تو اپنی ذات کو اپنے عمِ مکرم کی کنفِ حمایت میں پایا۔ جناب ابو طالب نے جس محبت و شفقت رافت والفت کے ساتھ فرض پرورش ادا کیا۔ اپنے پیارے بھتیجے کو جس طرح اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھا، ہر آفت میں جس طرح سینہ سپر رہے، سرورِ کونین کی الفت میں جو جو تلخیاں برداشت کیں، سختیاں سہیں، مصیبتیں جھیلیں یہاں تک کہ تمام عرب کو اپنا دشمن جان بنا لیا۔ یہ ایک مستقل طولانی داستان ہے۔ مثال کے طور پر صرف شعبِ ابوطالب (پہاڑ کا یہ درہ تھا جس پر آلِ ہاشم کا موروثی قبضہ چلا آتا تھا) میں بنو ہاشم کی طولانی نظربندی کا واقعہ (جسے طبری اور ابن سعد نے بتفصیل لکھا ہے) اجمالاً بیان کر دینا کفایت کرتا ہے۔

کفارِ قریش نے اسلام کے مٹانے میں اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ ہزاروں جتن کئے۔ ہر قسم کی روک ٹوک کی۔ ہر طرح کا بند و بست کیا مگر اس پر بھی جب اسلام کی ترقی روزافزوں نظر آئی تو ان کے غم و غصہ کی بھڑک کی انتہا نہ رہی۔

اسلام سے کفار کو اپنے خودساختہ خداؤں کی تحقیر و تذلیل کے علاوہ اپنا دنیوی اقتدار بھی خاک میں ملتا دکھائی دیتا تھا۔ اس لئے ایک لمحے کے واسطے بھی وہ وجودِ اسلام کو گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ مارِ سیاہ کی طرح پیچ و تاب کھا کھا کر آپس میں کہتے تھے: ہمیشہ سے ہمارا خاندان آلِ ہاشم کا حریف اور مدِمقابل رہا ہے۔ آج تک ہم کسی بات میں بھی اس سے دب کر نہیں رہے۔ بڑی بڑی گھمسان کی لڑائیاں اگر اس نے جیتیں تو ہم نے بھی اس طرح کے بہت سے معرکے سر کئے۔ اس نے جہاں نوازیاں کیں تو ہم نے بھی اس سے بڑھ کر کیں۔ اس نے خون بہا دئے تو ہم نے بھی دئے جس طرح اس کے ہاتوں سے سخاوت کا مینہ برسا اس سے زیادہ بارشِ فیض ہمارے ہاتوں سے ہوئی۔ ہر ایک بات میں ابتدا سے ہم اس کے دوش بدوش رہے اور کبھی پیچھے نہیں ہٹے۔ اب بنو ہاشم پیغمبری کا دعوےٰ کر کے ہمیں دبانا چاہتے ہیں تو یہ بات کبھی کسی طرح بھی ممکن نہیں۔

اسی جوشِ غضب سے بے خود ہو کر اسلام کو نیست و نابود کرنے کے منصوبے سوچنے کے لئے تمام قبائل کے سرگروہ ایک جگہ ہوئے۔ اس باب میں بہت سی تدبیریں سوچیں، مختلف مشورے ہوئے دیر تک رد و قدح کے بعد آخر یہ طے ہوا کہ خاندان بنو ہاشم سے فوراً بائیکاٹ کر دیا جائے اس گھرانے میں نہ اب کسی قرابت کی سلسلہ جنبانی کی جائے اور نہ کسی قسم کے لین دین کا معاملہ۔ روزمرہ کے استعمال کی چیزیں یہاں تک کہ کھانے پینے کا سامان بھی اس خاندان تک نہ پہنچنے پائے۔ اس کی نگہداشت نہایت سختی سے اس وقت تک باقی رہے جب تک بنو ہاشم اپنے نئے نبی کو ہمارے حوالے نہ کر دیں۔ جب ان باتوں پر اتفاق ہو چکا تو یہی باتیں عہدنامے کی صورت میں آگئیں۔ یہ عہدنامہ منصور بن عکرمہ نے لکھا اور درِ کعبہ پر لٹکا دیا۔ اب گویا رجسٹری ہوگئی اور کفارِ قریش میں سے ہر ایک پر اس عہدنامہ کی پابندی لازمی قرار پائی۔

ہوا کا یہ بدلا ہوا رُخ جناب ابوطالب نے دیکھا اور نہایت خاموشی سے اپنے تمام کنبہ کو ساتھ لے کر شعبِ ابوطالب میں جا کر پناہ لی۔ یہاں گزربسر کی یہ حالت تھی کہ اس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ اس خاندان کا کوئی فرد معاہدۂ مذکور کے لحاظ سے علی الاعلان کوئی چیز نہیں خرید سکتا تھا۔ اگر کبھی اتفاق سے چھپ چھپا کر کہیں سے کچھ جنس وغیرہ ہاتھ آگئی تو گویا عید ہوگئی۔ نہیں تو یوں ہی فاقوں پر فاقے ہوتے تھے یا بھوک کی انتہائی تکلیف میں درختوں کے پتے آگ پر بھنے ہوئے سوکھے چمڑے کے ٹکڑے، پانی میں بھگو بھگو کر حلق سے اتار لئے جاتے۔ بھوک سے چھوٹے چھوٹے بچوں کے بلکنے کی پُر درد آوازوں سے تمام درہ گونج اٹھتا درے سے باہر سنگدل اور بے درد ان دردناک صداؤں کو سُن سُن کر خوش ہوتے اور قہقہے لگاتے تھے۔ پھر یہ شدائد ایک دن دو دن نہیں پورے تین سال تک برابر برداشت کرنا پڑے۔ لیکن جناب ابوطالب نے ایک لمحے کے لئے بھی اپنے پیارے بھتیجے کا ساتھ چھوڑنا گوارا نہ کیا اور زندگی بھر شمعِ رسالت کا پروانہ بنے رہے۔

آلِ ہاشم کے ان مصائب پر ان سنگ دلوں ہی میں سے بعض کے دل پسیجے۔ اگرچہ ابوجہل اس معاہدے کی خلاف ورزی کا سخت مخالف تھا اور آخر تک برابر ہاں ہاں کرتا رہا۔ لیکن جو لوگ اس وقت تک کے برتاؤ کو ناروا ظلم سمجھ چکے تھے انہوں نے پھر اس کی ایک نہ سُنی اور متفق ہو کر اسی کے سامنے وہ عہدنامہ درِ کعبہ سے جھپٹ کر گھسیٹا اور پرزے پرزے کر کے وہیں زمین پر پھینک دیا۔ اس کے بعد بھی لوگ خاندان بنو ہاشم کو

اس درے سے اپنے ساتھ باہر نکال کر لائے۔

ہر طور گھر کا پیشہ تجارت تھا۔ معاش کے سلسلے میں آپ نے بھی یہی اختیار کیا۔ اسی سلسلے میں مختلف مقامات کے سفر کرنا پڑے۔ تجارت میں معاملہ ایسا کھرا اور صاف و پاک رکھا کہ قوم "امین" کے لقب سے پکارنے لگی۔

تجارت کے کاروبار میں تاجر کی بہترین اخلاقی خوبی یہی قرار دی جا سکتی ہے کہ وہ پابند عہد اور صادق الوعد ہو۔ اگرچہ اس وقت تک مقنن اعظم کی پیش گاہ سے اوفوا بالعهود کا قانون محکم نافذ نہیں ہوا تھا لیکن مکہ کا تاجر نفاذ قانون سے پہلے ہی محاسن اخلاق میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا۔ چنانچہ "سنن ابی داؤد" میں عبداللہ بن ابی الحمساء ایک صحابی کے واقعے کی یہ تصریح موجود ہے کہ نبوت سے پہلے رسالت مآب صلعم سے تجارت کے سلسلے میں ان کا لین دین کا کچھ معاملہ ہوا۔ ابھی بات طے نہ ہونے پائی تھی کہ کسی فوری ضرورت سے تصفیے تک یہ وہاں نہ ٹھہر سکے اور تکمیل معاملہ کے لئے جلد آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ یہاں سے جانے کے بعد یہ اپنا وعدہ ایسا بھولے کہ تیسرے دن ادھر سے گزرتے وقت مکہ کے تاجر امین کو وعدہ گاہ پر موجود پا کر اپنے وعدے کا خیال آیا۔ تین دن تک زحمت انتظار برداشت کرنے پر بھی چہرۂ اقدس پر غیظ و غضب کا کوئی اثر نہ تھا۔ صرف یہ فرما کر اس واقعہ کو ختم کر دیا کہ تین دن سے میں یہیں ہوں - تمہارے وعدے نے اذیت دی۔

آپ کے حسن معاملہ، صدق و راست بازی کی بڑھتی ہوئی شہرت سے متاثر ہو کر مکہ معظمہ کی معزز و متمول خاتون جناب خدیجہ نے اپنے یہاں کا کاروبار تجارت بھی آپ کے سپرد کر دیا۔ کچھ دنوں بعد جناب خدیجہ کی خواہش پر سرور کائنات نے پچیس سال کی عمر میں پہلے پہل حضرت خدیجہ کو اپنا شریک زندگی بنا کر ام المومنین کا شرف مرحمت فرمایا۔

دنیاوی تعلقات، تجارت کی دیکھ بھال اسی سلسلے میں سفر وغیرہ کی مصروفیت، اولاد کی غور و پرداخت اگرچہ یہ باتیں سرور دو عالم کو اپنا کر کے رکھنا چاہتی تھیں لیکن اس رنگ میں بھی محبوب حقیقی کی تلاش برابر جاری رہی۔ آخر یہ نوبت پہنچی کہ غار حرا (جو مکہ سے تین میل کی مسافت پر تھا) کا خلوت کدہ مطلوب حقیقی کی جستجو کا میدان بن گیا۔ یہاں تک کہ دیباچہ نبوت کی ابتدا ہوئی اور رویائے صادقہ میں حقیقتیں بے پردہ نظر آنے لگیں۔ آگے بڑھ کر خواب کی باتیں واقعہ بنیں اور واقعہ بن کر سامنے آ گئیں۔ اس کے بعد وہ وقت آیا کہ بتدریج اپنے حبیب سے ناموس اعظم کا تخاطب شروع ہوا جس نے بڑھتے بڑھتے یہ صورت اختیار کی کہ پھر تو ناز و نیاز کا تانتا بندھ گیا۔

سراپردۂ قدس سے اُس وقت مکہ کے ایک ایسے امی کو امانت اسرار سپرد کی جا رہی تھی جس کا دست معلومات اور رسمی علوم کے اوراق سے بالکل خالی تھا جس کی نگاہیں حروف و الفاظ کی دنیا سے یکسر ناآشنا تھیں جس کے زانو اپنے ہی نوع کے کسی ادب آموز کے سامنے تہ نہ ہوئے تھے جس کے گرد و پیش کفر کی مہیب تاریکیاں تھیں اور ناقوسوں کی بھیانک آوازیں جس نے الہیات، اخلاقیات، آئین معاشرت، اصول قانون کا نام تک کسی سے نہ سنا تھا وہ یک بیک بھری دنیا کو تزکیۂ اخلاق، طہارت باطن، تصفیۂ روح، درس الہیات، نوعیت معاد، فلسفۂ معاشرت، اصول تمدن کے ایسے اسرار و حقائق رموز اور باریکیاں باتوں میں سمجھا دے کہ حکما کا گروہ، فلاسفہ کا مجمع، مقننین کا جتھا تو ایک طرف رہا خود پیغمبران اولوالعزم کی بزم اس طرح کی حقیقت آفرینی کے مکمل تذکرے سے برابر خالی رہی۔

غار حرا کا سکوت نیاز نطق ناز میں تبدیل ہوتے وقت تمام دنیا پر اوہام پرستی کی گھٹا ٹوپ تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ہند اور مصر والوں کے الوہات عقاید بے شمار خداؤں یا اوتاروں کی فرضی معجز نمائیوں سے معمور تھے۔ نصرانی، باپ بیٹا۔ روح القدس کو اپنے اعتقادات کی دنیا کے مو البد ثلاثہ مان کر احترام و عقیدت کے سہرے تثلیث پر چڑھا رہے تھے۔ صابئین جگمگاتے تاروں کی پوجا میں مصروف تھے۔ مجوسی یزداں اور اہرمن نیکی اور بدی کے دو خدا قرار دے کر نور و ظلمت کی پرستش کر رہے تھے۔ عالم بھر میں یہودی توحید کے مدعی ضرور تھے لیکن اس کی حد بھی زبانی جمع خرچ سے زیادہ نہ تھی اس لئے کہ وہ جس خدا کے سامنے سر نیاز جھکانا پسند کرتے تھے اس کی نوعیت انسان ہی کے مماثل یا شاید کچھ اس سے زیادہ ہو۔ رہا عرب تو وہ بادۂ کفر و الحاد سے ایسا چھکا ہوا تھا کہ اسے اپنے تن بدن کا ہوش تک نہ تھا۔

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ جس طرح کے ماحول میں انسان بسر کرتا ہے اس کے ارد گرد جس قسم کے خیالات و روایات کے انبار لگے ہوتے ہیں انہیں میں سے گھٹا بڑھا کر اس کے دماغ کا سانچہ خیالات کی صورتیں ڈھالنے کا خوگر ہے۔ اس معیار پر رسول اللہ کا خدا زیادہ نہ سہی کچھ نہ کچھ تو

اُس دور کے رجحانات و میلانات ذہنی کے مماثل ہونا چاہئے تھا۔

فلسفۂ انتساب یعنی نسبت کا فلسفہ مثلاً ہم ایسے اگر ہم نہیں ہمارے آباو اجداد ایسے گھر بار ایسا۔ خاندان، کنبہ، قبیلہ ایسا۔ یا ہمارا مذہب ایسا ہم مذہب ایسے۔ یہاں تک کہ ہمارا شہر ایسا۔ ہمارا ملک ایسا۔ کسی نہ کسی طرح قریب یا بعید بلکہ بعید تر دور از قیاس نسبت سے بھی اپنی ذات کو فایدہ پہنچانے میں ادنیٰ کمی نہ کرنا اس کا ماحصل ہے۔

اکثر مسیح پرستوں نے اسی فلسفہ کے تحت ملت بیضا کو طرح طرح سے نصرانیت کا منت پذیر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ بعض جیرہ دہن افراد نے تو کھلم کھلا اسلام کو نصرانیت کی ایک مسخ شدہ ہیئت کہہ ہی دیا۔ بعض عیسائی مصنفین نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اس سعی لاحاصل کا ساز چھیڑا ہے کہ ذات رسالت امی نہ تھی بلکہ رسمی علوم سے خاصی واقفیت رکھتی تھی۔ جرجیس نامی عیسائی سے تورات و انجیل کا سبق لے چکی تھی۔ یہ محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے جس کے ثبوت میں مدعی کے پاس ایک دلیل بھی نہیں۔ لیکن تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے کہ یہ جو کچھ خیال آرائی کی گئی وہ سب صحیح ہے تو اُس زمانے کی تورات و انجیل اور جرجیس عیسائی کی تعلیم سے آنحضرتؐ کے دل میں اسی قسم کے خدا کا خیال پیدا ہونا لازمی تھا جس کی تعلیم پائی تھی اور جیسے خود جرجیس سا معلم مانتا تھا۔ ایسی صورت میں تو اور بھی خالص وحدتِ مطلقہ کا خیال پیدا ہونا غیر ممکن ہی نہیں بلکہ سراسر محال تھا۔

سر ولیم میور نے نسطوری فرقہ (عیسائیوں کا ایک مذہبی گروہ) کے بحیرا نامی ایک راہب سے شہنشاہ کونین کی ملاقات کو اس اس طرح بیان کیا ہے کہ اس کے دیکھنے کے بعد حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ زیادہ تر اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ طبیعتیں جو ایک طرف دقت نظر موشگافی کی گہرائیوں سے سطح پر آنا پسند ہی نہیں کرتیں دوسری طرف وہی سطحی، رسمی دور از کار باتوں کی پل بندیوں میں مصروف و منہمک نظر آتی ہیں۔

بحیرا راہب والی روائت ہمارے یہاں کوئی مستند اور موثق زوائت نہیں اس لئے کہ اسے اصول فن کے لحاظ سے مرسل مانا گیا ہے یعنی پہلے راوی کا واقعے کے وقت نہ موجود ہونا ثابت ہوتا ہے اور نہ اس شخص کے نام کا پتا چلتا ہے جو خود اس واقعے میں شریک تھا۔ اس کے علاوہ اگر اس روائت کو صحیح ماننے پر اصرار ہے تو اسی طرح کیوں نہیں تسلیم کیا جاتا جس طرح یہ روایت بیان کی گئی ہے۔ وہ اس سے زائد نہیں کہ بسلسلہ تجارت جناب ابوطالب کے شام روانہ ہوتے وقت سرور کائنات نے بھی اپنے عم مکرم کی معیت اختیار کی (اس وقت آپ کی عمر گرامی بارہ برس سے نہ تھی) اور شہر بصرے (جو دمشق کے جنوب میں ملک شام کی سرحد پر آباد تھا) کی ایک نسطوری خانقاہ میں اقامت گزین ہوئے۔ یہیں بحیرا راہب سے ملاقات ہوئی جس نے سردار دو عالم کو دیکھتے ہی کہا کہ سید المرسلین یہی ہیں۔ لوگوں نے پوچھا کہ یہ تمہیں کس طرح معلوم ہوا۔ اس نے جواب دیا کہ جب یہ پہاڑ سے اتر رہے تھے تو شجر و حجر سب کے سب ان کی تعظیم کے لئے جھک گئے۔

روایت صرف اتنی ہی ہے جس میں بحیرا کی تعلیم و تلقین کے نام سے ایک حرف تک نہیں لیکن چونکہ ملتِ مصطفوی کے غیر متزلزل قصر فلک بوس کا سنگِ بنیا دستِ مسیحیت سے رکھوانے کا فخر حاصل کرنا ہے۔ اس جوشِ تمنا نے روایت مذکور کو اس طرح گھڑنے پر مجبور کر دیا کہ شہر بصرے کی نسطوری خانقاہ میں پیغمبر اسلام کو بحیرا راہب نے مذہبی تعلیم دی اور آپ کے پر قوت دماغ نے اپنے ہم نشیں کے مذہبی اور فلسفیانہ خیالات کا ایسا زبردست اثر لیا کہ اُس کا نتیجہ اسلام کی صورت میں دنیا نے دیکھا۔

یہاں پر ضرورت ہے کہ خود بحیرا کے خیالات وغیرہ کا جائزہ لیا جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ کتنے پانی میں تھا اور اس کی پرواز خیال کہاں تک تھی۔ یہ نسطوری عقاید کا متبع حضرت مریم کو اُمِّ خدا ماننے سے احتراز کرتا تھا۔ نسطوری فرقے کا بانی نسطور نامی ایک شخص قسطنطنیہ کا بطریق اعظم جس نے فلسفہ ارسطو کا نہایت گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور اس کی یہی کوشش تھی کہ خالص عقاید مسیحی اسی کسوٹی پر کسے جائیں۔ چنانچہ اہل مصر نے جب حضرت مریم کی پرستش کو عقاید میں داخل کرنا چاہا تو اس باب میں اسی نسطور نے پُر زور مخالفت کی۔ یہ حضرت مریم کے احترام کا مادرِ خدا ہونے کی حیثیت سے قائل نہ تھا۔ اس کے حریف چونکہ دربار قیصر میں پیش پیش تھے اس لئے نسطور کی کچھ پیش نہ گئی اور یہ خود اُلٹا اپنے اس خیال کی پاداش میں خارج البلد ہی نہیں بلکہ مرتے دم تک ایک ریگ زار میں نظر بند رہا اس کے خیالات کو جن لوگوں نے رضا و رغبت کے کانوں سے سُنا اور عقیدت کی آنکھوں سے دیکھا وہ نسطوری کہلائے۔ یہ نسطوری گروہ دور دور تک پھیلا۔ بحیرا راہب جس کی ملاقات افضل البشر سے بیان کی جاتی ہے۔ اسی نسطوری فرقے کا ایک فرد تھا۔ باپ، بیٹا، رُوح القدس کی پرستش کرنے

والوں کے عقاید پر اگر نقد و تبصرہ کیا جائے تو ملتِ مسیحی کے عام پیرؤوں میں خاص کر یہی نسطوری فرقہ نصرانیت کے محدود دائرے ہی میں روشن خیال کہا جا سکتا ہے اس سے زاید بحیرا کے حالات بالکل تاریکی میں ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ اپنے محدود فرقے میں بھی کسی غیر معمولی دل و دماغ کا مالک نہ تھا۔

بھلا یہ نرالی منطق کس قسم کے دماغ تسلیم کریں گے کہ بحیرا کے چند گھنٹوں یا چند دنوں کی تعلیم و تلقین ایک بارہ برس کے بچے میں تو وہ زبردست طاقت پیدا کر دے کہ وہ آگے بڑھ کر ایک عالم کو زیر و زبر کر کے رکھ دے اور خود بحیرا دمِ واپسیں تک اسی تثلیث کی دلدل میں پھنسا ہوا ہاتھ پاؤں مارتا رہے۔ بانیٔ اسلام کا تبحرِ تبلیغ اگر مسیحی اساتذہ کے فیض تعلیم کا منت پذیر ہوتا تو ممکن ہی نہ تھا کہ توحید خالص میں کچھ نہ کچھ تثلیث کی جھلک باقی نہ رہتی۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب باری عز اسمہٗ کی نسبت عقائد کی یونیورسٹی میں عدیم النظیر کی و مدنی ڈاکٹر نے جس تنزیہ و تقدیس کا مکمل معجز نما پیکر دیا بحیرا تو بحیرا چشم روزگار نے بھی کبھی اس کا خواب تک نہ دیکھا تھا۔

دنیا کو حیرت ہے کہ وہ قوم عرب جس کا دامن حیات ایک زمانے سے فسق و فجور کی نجاست سے داغ دار چلا آتا تھا۔ سوق عکاظ کے مناظر قبیحہ جس کی کتاب تہذیب و شائستگی کے اہم اجزا سمجھے جاتے تھے۔ اس وقت کی متمدن اور مہذب قومیں جس ذلت بھری نظروں سے عرب کو دیکھتی تھیں اس کا ثبوت اس واقعے سے ملے گا کہ پہلے پہل دعوت اسلام پہنچنے پر کج کلاہ ایران نے نہایت نفرت خیز اور حقارت انگیز لہجے میں یہ الفاظ کہے تھے:۔

> اونٹنیوں کا دودھ اور گوہ کا گوشت کھانے کھاتے لو۔ اب
> عربوں کو بھی یہ دن لگے کہ وہ کیانی سلطنت کی آرزو کرنے لگے
> اے گردش چرخ تجھ پہ تف ہے۔

دفعتہً اس خانہ بدوش قوم کی حالت بدلی اور اسی سرزمین سے ایک پیکرِ قدسی جس کی ایک ادنیٰ جنبش لب صدہا اوامر سلطانی سے بڑھ کر تھی۔ امانت توحید لئے ہوئے فقیروں کے بھیس میں منظر عام پر آیا اور تمام عالم سے اس معجز نما لہجے میں تخاطب شروع کیا کہ چاروں طرف سے لبیک کی صدائیں آنے لگیں۔ اگرچہ ابتدا میں اس کی دعوت حدیث سے مقامی افق پر انکار اور عدم تسلیم کی گھنگھور گھٹائیں چھا گئی تھیں۔ لیکن اس کے استقلال عزم اور قوت تحمل کے سامنے مخالفت و انکار کے دل بادل دیر پا نہ رہ سکے اور رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچی کہ آفتاب ہدایت کی ضو پاشیوں سے عالم تمام مطلع انوار ہو گیا۔ آج بنی نوع انسان کے ایک تہائی حصے کے معتقدات اسی مبلغ اعظم کے فیضان تعلیم کے سامنے سر بسجود ہیں۔

سر ڈریکومین نے عالم کو جس نہج اور جس طرز پر تعلیم توحید سے بہرہ ور کیا وہ تعلیم نکتہ شناس اور دقیقہ رس طبیعتوں کے لئے حیرت آفریں اور تحیر خیز ہے جو مقام بے شمار خداؤں کی فرضی قدرت نمائیوں سے گھرا ہوا ہو وہاں مبلغ اسلام کی یہ تعلیم کہ سرچشمۂ ہستی، علتہ العلل، احد و صمد، ناموس اعظم، خالق لوح و قلم، معبود برحق، قادر مطلق، یگانہ و یکتا، عظمت و جبروت میں بے ہمتا وہی ایک ذات ہے جس کا وجود کسی علت کا محتاج نہیں۔ اس کی ذات بے مثال ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ باقی رہے گی۔ وہ وحدہٗ لاشریک نشیب و فراز، پست و بلند، یمین و یسار، زمان و مکان میں سے کہیں بھی نہیں اور پھر ہر جگہ جلوہ گر ہے۔ وہ ایسا دیکھنے والا ہے کہ گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں بھی چیونٹی کے پاؤں کے نشان اس سے چھپ نہیں سکتے۔ وہ ایسا جاننے والا ہے کہ دل کے چھپے ہوئے بھید کسی طرح بھی اس سے مخفی نہیں رہ سکتے۔ وہ ایسا محاسب ہے کہ پوری کائنات کے منتشر و پراگندہ ذرّوں کی تعداد اس سے پوشیدہ نہیں۔ انسان کی سریع الزوال بیرونی اور اندرونی تمام قوتیں ایسی ناکارہ اور اپاہج ہیں کہ اُس کی حقیقت و کنہہ کا راز سربستہ نہیں دریافت کر سکتیں۔ بشری حواس و احساسات جو تحت و فوق، جہت و اشارہ کے سہارے چلنے کے خوگر ہیں اُس کے سرا پردۂ اقتدار تک کسی طرح نہیں پہنچ سکتے۔ وہ ازل و ابد کا شیرازہ بند اپنے غیر فانی اور لازوال اقتدار تام کے ساتھ جیسے پہلے تھا ویسا ہی اب بھی ہے اور یوں ہی سریر قدس پر ہمیشہ جلوہ گر رہے گا۔

اس حیرت آفریں سلسلے سے گھبرا کر گبن کہتا ہے کہ زمان و مکان، تحت و فوق، جہت و اشارہ ان تمام خصوصیتوں کو علیحدہ کرنے کے بعد خیال بشر کے لئے کوئی چیز ہی نہیں بچتی۔ دست انسانی سے حواس اور احساسات کا پورا سرمایہ ہی جب چھین لیا جائے تو پھر اس کے پاس باقی ہی کیا رہ جاتا ہے۔ مگر خیال کی یہ لطافت، یہ پاکیزگی، یہ بلندی، جو بانیٔ اسلام نے اپنے خدا کی نسبت صرف کی کسی طرح بھی کبھی نہیں معلوم ہوتی۔

سر ولیم جونس کہتا ہے کہ پیغمبر اسلام نے اپنے گرد و پیش اور ماحول کے بالکل خلاف وحدت باری اور صفات ایزدی کے متعلق وہ دقیق اور نازک حکیمانہ خیالات بے جھجک اس طرح ظاہر کئے کہ جن کے

تصور سے قلبِ انسانی ہیبت کدہ بن کر رہ جاتا ہے۔

کانٹ ہنری فرانسیسی متبحر کہتا ہے کہ بانیٔ اسلام کی توحید خالص کی تعلیم دقتِ نظر سے دیکھنے کے بعد پھر ایک لمحے کے لئے بھی یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ اس طرح کی تعلیم تورات و انجیل کے مطالعہ کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔ مبلّغ اسلام جس طرح کی فطرتِ سلیم، وجدانِ نازک، احساس لطیف، مذاقِ صحیح لے کر آیا تھا اس کے لحاظ سے اگر یہ کتابیں اسے پڑھنے کو دی جاتیں تو وہ انہیں اٹھا کر دور پھینک دیتا اور ان پر اک سرسری نظر ڈالنا بھی کبھی گوارا نہ کرتا۔

جان ولیم ڈریپر کو اسلام کی خالص تعلیم توحید اور اس کی ترویج پر ایسا رشک ہے کہ بے اختیار حسرت آگیں طریقہ پر ایک جگہ یہ لکھتا ہے کہ:۔

"تبلیغ مسیحیت کو کبھی بھی یہ دن نصیب نہیں ہوا کہ وہ بت پرستی کا استیصال کر سکتی۔ اس کی قوت و سطوت جتنی بڑھتی گئی یہ وبا بھی اس کے ساتھ ساتھ رہی۔ مسیحیت کا فروغ و عروج جتنا آگے بڑھا اسی حد پہ اس نے بھی پاؤں پھیلائے۔ بہ خلاف اسلام کے کہ پہلے ہی دن اُس نے علی الاعلان کھلم کھلا جس تنزیہ و تقدیس کا پرزور دعوے کیا تھا۔ وہ محض زبانی جمع خرچ نہ تھا بلکہ اُسے عملی طریقے سے ثابت کر کے دنیا کو دکھا دیا۔ مختلف قبائل عرب کے دیو ہیکل خداؤں کے مجسموں کو نفرت و حقارت کی منجنیقوں سے ٹکڑے ٹکڑے اور ریزہ ریزہ کر کے ایسا سرمہ سا بنا دیا کہ ان کا غبار گردِ روزگار میں مل کر اعتقادات کی نگاہوں سے بالکل غائب ہو گیا اور عرب کی جمود پسند قوم شارعِ اسلام کی اچھوتی تعلیم توحید کی بدولت دیکھتے ہی دیکھتے ہر قسم کی نظر فروز زرنفیوں کا ایک ایسا مرکز بن گئی کہ جس کی طرف عالم بھر کی ٹکٹکی بندھ گئی تھی۔

جناب ختمی مرتبت کے فیضانِ تعلیم سے بہرہ ور ہو کر اس خانہ بدوش قوم نے دنیا پر اپنی وہ دھاک بٹھا رکھی تھی کہ اک عالم نے اس کی عظمت و جبروت کا لوہا مانا۔ شام، دمشق، ایران، مصر، بیت المقدس، اسکندریہ عربوں کے ایوان فتح و ظفر کے جب صحن بن چکے تو تقریباً بیس سال تک اسلامی نبرد آزماؤں کی پیش قدمی آب بستہ کی طرح رُکی رہی جس کی تلافی اس جوش کشورستانی سے ہوئی جو عقبہ وادیٔ نیل سے کوہ و دشت و صحرا کی ناہموار اور دشوار گزار راہوں اور اس سلسلے کے درمیانی شہروں اور ملکوں کو فتح و نصرت کے قدموں سے روندتا ہوا بحرِ اوقیانوس کے لب ساحل دم لینے کے لئے ٹھہر گیا۔

گبن کہتا ہے کہ جبل الطارق سے دریائے لائر کے ساحل تک طولاً ہزار میل کی مسافت پر اسلامی فتح و ظفر کی قدم قدم پر ڈاک بیٹھی ہوئی تھی اسلامی کشورستاں قدم اگر اتنی ہی مسافت اور طے کر لیتے تو ایک طرف پولینڈ کے حدود اور دوسری جانب اسکاٹ لینڈ کی سر بفلک چوٹیوں پر اسلام کا پرچم اقبال لہراتا ہوتا۔ اسلامی سورماؤں نے اپنے دست و بازو سے جیسی وسیع اور عظیم الشان سلطنت قائم کی تھی جغرافیہ کے لحاظ سے سکندر اعظم اور روما الکبرٰے کی سلطنتیں بھی اس کے پاسنگ نہ تھیں۔

سید ابوالقاسم
دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن

رباعی

یہ رات، یہ منزل، یہ گھٹائیں ساقی!
طوفانِ گرج، تند ہوائیں ساقی!
لا جامِ مئے سوزاں کہ لپٹی ہیں بہت
ہو ہو کے سیہ مست بلائیں ساقی!!

سعید احمد اعجاز

گوالے

سامنے مسکرا رہی ہے سحر
اوس کی آفتاب پر ہے نظر

دھوپ کی چھوٹ ہے پڑاوے پر
گا رہے ہیں کمہار آوے پر

سوئے مغرب جو جنگلی خانہ ہے
واں سحر درد کا فسانہ ہے

ایک جھگھٹ سا ہے گوالوں کا
گائے بکری کے دودھ والوں کا

رُخ پہ اک انہماک کی اُلجھن
سر پہ بے عیب دودھ کے برتن

تیز سانسوں سے بوئے مجبوری
گرم ماتھوں پہ گردِ مزدوری

خاک سے ہیں اٹے ہوئے کپڑے
ڈاڑھیوں میں لگے ہوئے تنکے

خوابِ قارونیت کی تعبیریں
سربسر مفلسی کی تصویریں

ان میں کچھ عورتیں بھی ہیں جن کے
بھوک سے ہیں سُتے ہوئے چہرے

رُخ پہ بیماریٔ شباب کا رنگ
دینِ پاک میں حجاب کا رنگ

باغِ ویرانِ شادمانی کے
پھول ٹوٹے ہوئے جوانی کے

شوخیاں دم بخود ادا خاموش
نازِ مجروح بانکپن بے ہوش

باری باری سے کر رہے ہیں ادا
ہے جو محصول زندہ رہنے کا

جب محرر کے پاس آتے ہیں
خوف کھاتے ہیں تھرتھراتے ہیں

نطق گر اس جگہ ہو گرمِ سخن
چھوٹ جائے بیان کا دامن

کاش اس پائمال طبقے کو
خستہ و پُر ملال طبقے کو

رہنما کوئی ایسا مل جائے
جو انہیں راہِ راست پر لائے

ان کے سینوں میں روشنی کر دے
جلد از جلد آدمی کر دے

ان کے افلاس کا علاج کرے
علم سے صیقلِ مزاج کرے

احسانِ دانش

سرِ دلبراں

اتوار کا دن تھا اور حفیظ، یعقوب اور ناصر حسب معمول سرفراز کے مکان پر جمع تھے۔ شروع سے یہی قاعدہ چلا آرہا تھا کہ چھٹی کے روز دوستوں کی مجلس سرفراز کے مکان پر جمتی۔ یہ لوگ دوپہر کا کھانا کھا کر آئے تھے اور اب سہ پہر کی چائے کا تقاضا کر رہے تھے۔ پہلے تو سرفراز بھی ٹال مٹول کرتا رہا لیکن جب اس نے دیکھا کہ فرار کی تمام راہیں بند ہیں تو مجبوراً ملازم کو مٹھائی لانے کے لئے بازار روانہ کیا اور اندر گھر میں چائے کے لئے کہلا بھیجا۔ تاش کی پے بہ پے کئی بازیاں ختم کرنے کے بعد اب یہ چاروں دوست چھوٹی میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھے چائے کا انتظار کر رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ فقرے چست ہو رہے تھے اور پھبتیاں کسی جا رہی تھیں۔ بذلہ سنجی اور حاضر جوابی میں یعقوب ان سب میں بڑھا ہوا تھا۔ اس نے بی اے کے بعد بیمے کا کام شروع کر دیا تھا جہاں اُس کی ذہانت و قابلیت نے اس کی آیندہ ترقی کے بہت سے دروازے کھول دیئے تھے۔ حفیظ کا اصلی وطن کرنال تھا لیکن اُس کے والد کی ملازمت کا سارا زمانہ لاہور میں بسر ہوا تھا۔ یہیں انہوں نے مکان بنا لیا تھا اور پنشن لینے کے بعد بود و باش بھی اس جگہ اختیار کر لی تھی۔ حفیظ کو تعلیم ختم کرنے پر لاٹ صاحب کے دفتر میں ایک معقول اسامی مل گئی تھی اور اب وہ اپنے کنبے کے دیگر افراد کے ہمراہ لاہور میں رہتا تھا۔ ناصر سیالکوٹ کا رہنے والا تھا لیکن گزشتہ آٹھ سال سے لاہور ہی میں مقیم تھا۔ اس نے ایم اے تک تعلیم حاصل کی تھی اور اب یونیورسٹی میں "ریسرچ سکالر" کی حیثیت سے کام کر رہا تھا جس کا اُسے اچھا خاصا.... مشاہرہ مل جاتا تھا۔ اُسے امید تھی کہ اگر وہ اپنے موجودہ فرائض محنت و سرگرمی سے ادا کرتا رہا تو مستقبل قریب میں اُسے محکمہ تعلیم میں ضرور کوئی قابلِ عزت جگہ مل جائے گی۔ ان احباب میں صرف سرفراز لاہور کا اصلی باشندہ تھا۔ سرفراز کے والد لکڑی کی تجارت کرتے تھے اور لاہور کے صاحبِ ثروت لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ پہلے وہ دہلی دروازے کے اندر اپنے جدی مکان میں رہتے تھے لیکن کچھ عرصے سے انہوں نے شہر سے باہر ایک وسیع خوبصورت بنگلہ تعمیر کرا لیا تھا جہاں اب وہ اہل و عیال سمیت منتقل ہو آئے تھے۔ سرفراز نے بی اے کے بعد باپ کے کاروبار میں شریک ہونے کی بجائے قانون کی تعلیم حاصل کرنا پسند کیا اور اب اسے پریکٹس جاری کئے ہوئے دو سال کے قریب گذر چکے تھے۔ ایک تو وکالت کا پیشہ یوں بھی کچھ ایسا نفع بخش نہیں رہا اور پھر لاہور ایسے شہر میں جہاں ہر قسم کے چھوٹے بڑے وکلا کی کثرت نے کام کو اور زیادہ محدود کر دیا ہے ایک مبتدی کے لئے روزگار مہیا کر لینا بے حد مشکل ہو گیا ہے۔ کاروبار کی اس واماندگی سے سرفراز چنداں مایوس نہیں ہوا تھا۔ اُسے کھانے پینے اور رہنے سہنے کی تمام ضروریات میسر تھیں اس لئے اطمینان سے اپنے کام میں محنت کئے جانے سے اُسے گریز نہ تھا۔ اُس نے کوٹھی کے دو بڑے کمرے اپنے لئے الگ کر لئے تھے۔ ایک میں اس کا دفتر تھا اور دوسرا نشستگاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ دوست احباب آتے اور یہیں فرصت اور تفریح کا وقت گزرتا تھا۔

اتنے میں چائے آ گئی اور سب دوستوں نے بڑھ بڑھ کر مٹھائی پر ہاتھ مارنا شروع کئے۔ باتیں بھی جاری رہیں۔ حفیظ کہنے لگا "لاہور میں اچھی مٹھائی دلّی والے حلوائی بناتے ہیں"۔

یعقوب بولا "تم مٹھائی کا ذکر کرتے ہو۔ میں کہتا ہوں لاہور کی ہر اچھی چیز باہر والوں کی محنت اور کوشش کا نتیجہ ہے!"

حفیظ اور ناصر نے مسکرا کر سرفراز کی طرف دیکھا۔ وہ جانتے تھے کہ یعقوب لاہور کے باشندوں کی مذمت میں ہمیشہ پیش پیش رہتا ہے۔ اور سرفراز کے ساتھ اُس کی اکثر پرلطف نوک جھونک ہوتی رہتی ہے۔ یعقوب بالعموم یہ کہنے کا عادی تھا کہ "اگر باہر کے لوگ لاہور میں آ کر آباد نہ ہوتے تو یہ شہر علم و ادب کا مرکز بننے کی بجائے جہالت نگر ہوتا!"

سرفراز نے گرم گرم چائے کی پیالی ہاتھ میں اٹھائی اور یعقوب کے سر پر لا کر کہا "اگر تم نے اپنی زبان بند نہ کی تو یاد رکھو یہ آگ تمہارے اوپر گرا دوں گا۔" ناصر کہنے لگا "سرفراز بھائی اس طرح کام نہیں چلے گا۔ دلیل سے بات ہونی چاہیئے۔ یعقوب جو کچھ کہہ رہا ہے مجھے اس سے

پورا اتفاق ہے۔ لاہور کو لاہور [illegible] لوگوں نے بنایا ہے۔ لاہور سے مراد وہ لاہور نہیں جو آج [illegible] کے اندر آباد ہے بلکہ وہ شہر جو میونسپل کمیٹی کے باغات سے باہر کھڑا ہے لاہور ہے اور اس لاہور کو بنانے، سجانے اور سنوارنے والے ہم ہیں۔ یہاں کی علمی و ادبی مجالس جنہیں دیکھ کر دلّی و لکھنؤ کی قدیم صحبتوں کی یاد تازہ ہوتی ہے ہمارے دماغ کی کاوشوں کی شرمندہ ہیں۔ یہاں کی بین الاقوامی شہرت رکھنے والی درس گاہیں جن کے طفیل لاہور خطۂ یونان بن رہا ہے ہمارے خون سے سینچی گئی ہیں۔ یہاں کی ہنگامہ خیز صحافت جس کی دھاک ہندوستان کے طول و عرض میں بیٹھ چکی ہے۔ ہمارے قلم کی مرہونِ منت ہے۔ یہاں کی صنعت و حرفت اور یہاں کے سیاسی و معاشرتی اداروں کی رونق ہمارے دم قدم سے زندہ ہے۔ اگر ان تمام عناصر کو جنہوں نے لاہور کے تنِ مردہ میں خونِ زندگی کی حرارت پیدا کر رکھی ہے خارج کر دیا جائے تو بتاؤ لاہور ایک لنگڑے، لولے، اندھے اپاہج سے زیادہ کیا رہ جاتا ہے!"

یعقوب چلّا اٹھا "ناصر زندہ باد۔ اور اب میرے بھائی ذرا اس لاہور کا بھی ذکر کر دو جس پر ہمارے دوست سرفراز کو ناز ہے۔ بات یہ ہے کہ لاہور اور لاہوریت دو مختلف المعانی الفاظ ہیں۔ لاہوریت ایک استعارہ ہے جس سے مراد ایک خاص قسم کی معاشرت خاص قسم کی زبان، خاص قسم کے رسم و رواج اور خاص قسم کا ماحول ہے جسے اس لاہور سے کوئی تعلق نہیں جس کے ہم باشندے ہیں۔ دہلی دروازے کے اندر داخل ہو کر ٹکسالی دروازے تک چلے جاؤ۔ تمہیں جگہ جگہ لاہوریت کے لاجواب نمونے نظر آئیں گے۔ چڑیا کو چِڑی، سرفراز کو سرفرازا اور سڑک کو سڑک کہنا یہاں کے فصحاء کی زبان ہے اور اس میں جاہل اور تعلیم یافتہ، مہذب اور غیر مہذب کی کوئی تمیز نہیں۔ بات بات پر ہنسی ہنسی میں دو دو من کی گالی استعمال کرنا یا گفتگو کے دوران میں زیبِ داستان کے طور پر مقفّٰی و مسجّع مغلظات کی بارش کر دینا یہاں کی معاشرت کا ایک عام محبوب و مرغوب پہلو ہے۔ بلدیہ کے باغات میں صبح سے شام تک لٹو گھما گھما کر ہاؤ ہو برپا کرنا یا کباب فروش اور فالودہ بیچنے والے کی دکان پر دلجمعی سے بیٹھ کر نہایت کرخت آواز میں ناٹک کے گیت الاپتے رہنا یہاں کے دلچسپ مشاغلِ حیات ہیں۔ اگر لاہوریت کا حقیقی رنگ و روغن دیکھنا ہو تو اس کی دو جگہیں ہیں۔ پہلوانوں کا دنگل یا حمام۔ سردیوں کے موسم میں صبح کے وقت کسی حمام میں جا نکلو تو لاہوریت اپنے اصلی خد و خال میں نظر آ جائے گی۔ میں تفصیل اس لئے بیان نہیں کرتا کہ مبادا ہمارے دوست حضرتِ سرفراز کی طبعِ نازک پر گراں گزرے۔ یہی حال دنگل کا ہے جہاں ہر شخص اپنے لباس، اپنے اندازِ نشست و برخاست اور اپنی چال ڈھال سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ تہذیب و متانت کے مروّجہ و مسلمہ اصولوں کی پابندی کو اپنی شانِ قیادت کے منافی سمجھتا ہے۔ یہاں ہر شخص جو لباس میں زیادہ آشفتہ حال و پریشاں، زبان میں زیادہ بے احتیاط و گریزاں اور کردار میں زیادہ فحش و عریاں ہو خلیفہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس محفل میں ہر شخص بے تاب نظر آتا ہے کہ اپنا ڈیل ڈول دکھلانے کے لئے دوسرے کی پگڑی اچھالے۔ چنانچہ اس غرض کے لئے بات بات پر آستینیں چڑھائی جاتی ہیں اور سب و شتم کی روانی میں زبان قینچی کی طرح استعمال کی جاتی ہے۔ جو شخص ثقاہت و متانت کا جامہ زیادہ تندی سے تار تار کرتا ہے وہی محفل کی سرداری کا زیادہ اہل تصور کیا جاتا ہے۔ یہاں پندرہ سال سے اوپر عمر کا ہر لڑکا اپنے اچھے بھلے صافے کو کانوں پر گرا کر اور تہمد کے پلّو کو دائیں ہاتھ سے اٹھا کر اپنی چال ڈھال اور وضع قطع میں عمداً ایسا رنگ پیدا کرتا ہے جو اُسے معقول اور سنجیدہ انسانوں کی صف سے خارج کر دے کیونکہ جب تک لباس کی تراش خراش اور رفتار و گفتار کے انداز میں سنجیدگی و معقولیت کا ذرا شائبہ بھی ہے اُسے "خلفاء" کے حلقے میں شریک ہونے کی توقع نہیں ہو سکتی اور آپ جانتے ہیں کہ لاہور میں ہر نوخیز و نوعمر نوجوان کا منتہائے نظر یہ ہے کہ وہ جلد از جلد خلیفہ بن جائے۔ باقی رہا وہ لاہور جس میں یونیورسٹی ہے، کالج ہیں، اخبارات و رسائل ہیں، تمدنی و سیاسی ادارے ہیں، علم و ادب کے چرچے ہیں، صنعت و حرفت کے ہنگامے اور شستگی و رنگینی کے نمونے ہیں سو اس کا تعلق ہم ناچیز انسانوں کے ساتھ ہے جنہوں نے اپنا وطن چھوڑ کر یہاں اقامت اختیار کر لی تاکہ لاہور کی مٹی کو سونا بنایا جائے۔"

حفیظ کہنے لگا "بعض لوگ لاہور کو بڑا مردم خیز خطہ سمجھتے ہیں۔ لیکن آپ پنجاب اور ہندوستان کے اکابر کی فہرست سامنے رکھ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ لاہور کی مردم خیزی محض ایک بے حقیقت افسانہ ہے۔ میں نے لاہور کا جو کچھ دیکھا ہے اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں عشق و محبت کا سوز بھی موجود نہیں البتہ رندی و ہوسناکی کے مناظر عام ہیں۔"

سرفراز خاموش بیٹھا سب کچھ سن رہا تھا اور کبھی کبھی مسکرا دیتا تھا۔ جب حفیظ نے بات ختم کی تو اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ وہ کہنے لگا

بھائیو، جو کچھ آپ نے کہا ہے وہ غلط ہے یا صحیح اس پر پھر کبھی بحث کریں گے۔ لیکن سر دست میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حفیظ کے اس فقرے نے کہ لاہور میں عشق و محبت کا سوز موجود نہیں البتہ رندی و ہوسناکی کے مناظر عام ہیں، مجھے ایک ایسا واقعہ یاد دلادیا ہے جو عشق کے سوز اور محبت کی بے کسی کی ایک اندوہناک مثال ہے۔ یہ ایک دردناک داستان ہے جس میں محبت کے عجز و درماندگی کے علاوہ عشق کی بے پناہ ہلاکت آفرینی کی ایک دنیا آباد ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ واقعہ گوش گزار کروں۔"

یکایک سب دوستوں کے ہنستے ہوئے چہروں کا رنگ اڑ گیا اور انہوں نے یک زبان ہو کر کہا "ضرور"

سرفراز اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا اور پندرہ منٹ کے بعد وہاں سے برآمد ہوا تو اس نے ہاتھ میں ایک لفافہ پکڑا ہوا تھا اور چہرے پر حزن و ملال کے آثار ہویدا تھے۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے کہا "اس کوٹھی میں آنے سے پہلے ہم دہلی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ میں کالج میں پڑھتا تھا اور فرصت کا وقت عموماً گھر پر ہی گزرتا تھا۔ میرا کمرہ مکان کے نیچے کی منزل میں تھا جہاں دوست احباب بے تکلفی سے آنے اور اٹھنے بیٹھنے کے عادی تھے۔ میرا ایک دوست فیاض جو دسویں جماعت تک میرا ہم مکتب و ہم سبق رہ چکا تھا ہمارے پڑوس میں رہتا تھا۔ دسویں جماعت پاس کرنے کے بعد فیاض چھ مہینے کے قریب بے کار رہا اور پھر اسے ریل کے دفتر میں چالیس روپے ماہوار کی ملازمت مل گئی تھی۔ یہ ایک خوش باش بے فکر کھلنڈرا لڑکا تھا۔

چار بجے دفتر سے آکر سیدھا منٹو پارک چلا جاتا تھا جہاں کھیل کود میں سرگرمی سے حصہ لینا اس کا روزمرہ کا معمول تھا۔ ہفتے میں دو تین بار شام کو میرے پاس آکر ضرور بیٹھتا تھا اور محلے میں کسی شادی غمی کی تقریب پر، ریل کے دفتر کے کسی واقعہ یا اسکول کے زمانے کی کسی بات پر ہمارے درمیان آدھ پون گھنٹہ گفتگو ہوا کرتی تھی۔ فیاض کے والد چمڑے کی دکان کرتے تھے اور اچھے مرنجاں مرنج خوش حال بزرگ تھے شکل و صورت کے لحاظ سے فیاض نہایت دلکش انسان تھا لیکن اسے عام نوجوانوں کی طرح بن ٹھن کر رہنے کا قطعاً شوق نہ تھا۔ میں کبھی کبھی مذاق کے طور پر اس سے کہتا تھا کہ دنیا میں اچھی شکل لے کر پیدا ہونا ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ اکثر لوگ ہیں کہ اگر ان کی دنیاوی ترقی کے وسائل پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ان کی کامیابی کا راز ان کی خوش [illegible] میں مضمر ہے۔ تم یقیناً خوش قسمت ہو کہ قدرت نے تمہیں اس نعمت سے نوازنے میں بخل نہیں کیا اور تم چاہو تو اس خصوصیت سے فائدہ اٹھا کر اپنے ہم عصروں میں سربلندی و امتیاز حاصل کر سکتے ہو اور اگر تمہیں اسی حالت میں رہنا پسند ہے کہ گریبان چاک ہو، بال پریشان ہوں اور چہرے کو دوروز سے پانی کا چھینٹا نصیب نہ ہوا ہو تو بہتر ہے کہ اپنی شکل کسی اور کو دے دو۔"

وہ ہنس کر جواب دیتا "میں تو اب تک یہی سنتا آرہا ہوں کہ جو انسان زیادہ جفاکش، زیادہ محنتی اور زیادہ مستعد ہے وہی اس کارگاہِ عمل میں زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ تم پہلے شخص ہو جس نے یہ نکتہ بتایا ہے کہ دنیا میں عروج حاصل کرنے کے لئے خوب روئی و خوش جمالی کی ضرورت ہے میں تو جیسا ہوں ویسا ہی رہوں گا۔ یہ ہر وقت بن سنور کر رہنا اور صبح و شام ناز نخرے کی فکر میں لگے رہنا مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔"

عادات و اطوار کے لحاظ سے فیاض بالکل سیدھی سادی طبیعت کا لڑکا تھا۔ اس کے مزاج کی سادگی اور بے پروائی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ ہر مہینے تنخواہ لاکر اپنی والدہ کے حوالے کر دیتا اور کہتا کہ "مجھے تو صرف کھانے کے لئے دو وقت کی روٹی اور پہننے کے لئے کپڑا درکار ہے اور یہ چیزیں مجھے آپ مہیا کر دیتے ہیں۔ اس لئے یہ روپے میرے کسی کام نہیں۔"

ایک مرتبہ اس کی والدہ نے اس کی شادی کا ارادہ کیا تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا "گھر کے کام دھندوں اور بیوی بچوں کی الجھنوں میں بسر کرنے کے لئے ابھی عمر پڑی ہے۔ یہ دو چار سال تو مجھے اور آزادی کی ہوا کھا لینے دیجئے۔"

سیاست یا ادب سے فیاض کو چنداں دلچسپی نہ تھی۔ میرے پاس آکر بیٹھتا تو اخبار رسالے پڑھ لیا کرتا تھا یا پھر میں خود ہی کبھی کبھی اسے کوئی دلچسپ مضمون یا اچھی سی نظم سنا دیا کرتا تھا۔

دفعتہً فیاض کی طبیعت میں انقلاب آگیا۔ وہ چپ چاپ اور اداس اداس رہنے لگا۔ شام کا کھیل تقریباً ترک ہو گیا۔ چار بجے دفتر سے آکر وہ اب بھی گھر میں زیادہ نہ ٹھہرتا تھا۔ لیکن اتنا اس کے دوستوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ حسبِ معمول منٹو پارک نہیں جاتا۔ غروبِ آفتاب کے بعد اب وہ باقاعدگی سے ہر روز میرے ہاں آنے لگا تھا لیکن میرے مطالعہ میں مارج ہونے کی اس نے کبھی کوشش نہ کی تھی۔ اس کی

عادت تھی کہ خاموشی سے آکر، مزاج پرسی کے چند کلمات کہہ کر، میز کے قریب آرام کرسی پر دراز ہو جاتا۔ یلدرم کی خیالستان یا حسرت موہانی کا دیوان اس کی محبوب کتابیں بن گئی تھیں۔ گھنٹوں گھنٹہ کرسی پر لیٹے لیٹے انہی کتابوں کے ورق الٹتا رہتا اور پھر چپ چاپ اٹھ کر چلا جاتا تھا۔ میں نے دو ایک مرتبہ اُس سے اس تکدر و اضمحلال کی وجہ دریافت کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے ہاں نہیں میں ٹال دیا۔ اُس کے والد خود متفکر تھے کہ فیاض کو کیا ہو گیا ہے۔ ایک روز وہ میرے پاس بیٹھا خالی نظروں سے ہوا میں دیکھ رہا تھا تو میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور کہا "تمہیں آج صاف صاف بتانا ہو گا کہ تمہاری حالت روز بروز کیوں خراب ہو رہی ہے یہ ہر وقت تم کس فکر میں غرق رہتے ہو۔ وہ تمہارا ہنسنا کھیلنا اور خوش رہنا کیا ہوا؟ تمہاری اس کیفیت سے تمہارے گھر کے لوگ اور تمہارے دوست سخت پریشان ہیں!"

فیاض نے سر اٹھا کر نہایت عاجزی کے ساتھ میری طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ میں حیران ہو گیا۔ میں نے بہت نرمی کے ساتھ اس سے کہا "گھبراؤ نہیں۔ میں تمہارا ہمدرد اور خیر خواہ دوست ہوں۔ مجھ سے بلا تامل اپنی تکلیف بیان کرو اور میں بہ دل و جان تمہاری مدد کروں گا۔"

فیاض نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا "میں جانتا ہوں کہ تمہیں مجھ پر ترس نہیں آئے گا بلکہ الٹا تم میری حماقت پر ہنسو گے لیکن یہ خدا جانتا ہے کہ میں آج کل کس جان لیوا اذیت میں مبتلا ہوں"۔

میں نے اُسے پھر تسلی دیتے ہوئے کہا "مجھ پر کامل اعتماد کرو۔ تمہاری بہتری کے لئے جو کچھ بن پڑے گا میں دریغ نہیں کروں گا لیکن مجھ سے اپنا راز مت چھپاؤ۔"

فیاض نے کہا "میں خود نہیں جانتا مجھے کیا ہو گیا ہے میری زندگی کا یہ انوکھا واقعہ ہے اور میں اس قدر گھبرا گیا ہوں کہ مجھے راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر میں تم سے سچ سچ کہہ دوں تو کیا تم مجھ سے نفرت تو نہ کرنے لگو گے؟"

میں نے جواب دیا "تم بھی کیا بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو میرے بھائی، اگر تم دنیا کا سب سے بڑا گناہ کر کے آؤ تو بھی میں تمہاری امداد سے گریز نہ کروں گا۔"

فیاض کہنے لگا "میرے ایک بہت دور کے قرابت دار ہیں جن کا نام میں اس وقت بتانا نہیں چاہتا۔ دو سال ہوئے ان کی شادی ہوئی تھی اور وہ اپنی بیوی کو ہمراہ لے کر کہیں باہر چلے گئے تھے۔ اب تین مہینے ہوئے وہ واپس لاہور آئے ہیں۔ میں ان سے ملنے گیا تھا۔ ان کی بیوی کو میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔ اس قدر حسین اور نازک اندام لڑکی ہے کہ اس کی مثال آج تک نظر سے نہ گزری تھی۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ گلاب اور موتیا کے پھولوں کی پتیوں سے بنی ہوئی ایک آسمانی حور ہے۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی شگفتگی کا یہ عالم ہے کہ اُسے ایک مرتبہ دیکھ لینے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ فضا میں نور و سرور کی بارش شروع ہو گئی ہے۔ وہ چلتی ہے تو خدا کی قسم کوہستان کی پری معلوم ہوتی ہے جو ہوا میں اٹکھیلیاں کرتی جا رہی ہو اور وہ ہر وقت اس قدر شاداں و فرحاں رہتی ہے کہ اس کے سامنے رنج و غم کا ذکر کرنا قدرت کی نعمتوں کی توہین کرنا ہے۔ میں نے جب سے اُسے دیکھا ہے میرا دل میرے اختیار میں نہیں رہا۔ ایک ناقابلِ بیان خلش ہر وقت دل و دماغ کو بے قرار رکھتی ہے۔ رات کو آرام اور دن کو کام کے اوقات کا کوئی لمحہ اس کے تصور سے خالی نہیں رہتا۔ میں نے اُسے بھول جانے کی بے حد کوشش کی ہے لیکن جادو کی طرح جو انسانی تصرف و اختیار سے باہر ہو اس کا خیال میری روح پر حاوی ہو چکا ہے۔ میں نے اُس کے ہاں جانا ترک کر دیا ہے لیکن جوں جوں اُس سے غافل رہنے کی کوشش کرتا ہوں وہ ناقابلِ فہم طریق سے میری زندگی پر چھائی چلی جاتی ہے۔"

میں نے پوچھا "کیا اُسے تمہاری اس کیفیت کا علم ہے؟"

"بالکل نہیں۔ یہ ہو کیونکر سکتا ہے۔ میں اگر اشارۃً و کنایۃً بھی اس کا اظہار کر دوں تو تم جانتے ہو اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔ دو خاندان تباہ ہو جائیں گے۔ وہ ایک محبت کرنے والے شفیق و مہربان خاوند کی بیوی ہے اُس کے فرائض نہایت اہم اور اس کی ذمہ داریاں بے حد نازک ہیں اور وہ خود اپنے گھر میں اس قدر خوش و خرم اور مسرور و مطمئن ہے کہ میں اس مہلک راز کے اظہار کی کبھی جرأت نہ کروں گا۔ ایسا کرنا قتل عمد سے زیادہ خوفناک جرم ہے۔ میں اُس کے ہاں اکثر جاتا تھا لیکن اب کئی ہفتے ہوئے ہیں میں وہاں نہیں گیا۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر مجھ سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہو گئی جس سے ذرا سا شک و شبہ بھی پیدا ہوا تو ہم تباہ و برباد ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا "اس کو بھول جانے کی کوشش کرو۔ ایسے واقعات اکثر انسان کی زندگی میں رونما ہوا کرتے ہیں لیکن ان سے اس طرح متاثر ہونا ٹھیک نہیں۔ دفتر کا کام زیادہ محنت سے کرو اور سہ پہر کو منٹو پارک کے کھیل میں بلاناغہ شریک ہوا کرو۔ فرصت کا وقت میرے پاس گزارنے میں اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو بلا تکلف یہاں آجایا کرو۔ مجھے مذہب سے زیادہ شغف نہیں لیکن ایسے مصائب میں دعا سے استمداد کرنا ضرور انسان کی روحانی تشفی کا باعث ہوتا ہے۔ اس لئے ابتلا سے نجات پانے کے لئے مذہب سے مدد طلب کرو"

فیاض کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو جاری ہوگئے اور اُس نے بمشکل آنکھوں کو رومال سے خشک کرتے ہوئے کہا "میں سب کچھ کرچکا ہوں۔ تمہیں کیا معلوم کہ میں نے کس طرح راتیں جاگ جاگ کر آنکھوں میں کاٹی ہیں۔ میں نے گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگی ہیں کہ خدایا مجھے اس آزمائش سے بچالے۔ میں نے محض اسے بھول جانے کے لئے روزانہ بارہ بارہ گھنٹے دفتر کا کام کیا ہے لیکن اس کا خیال بدستور دماغ کے گوشے گوشے میں موجود ہے۔ کام سے ذرا سر اٹھاتا ہوں تو اس کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ بتاؤ ایسی حالت میں میں کیا کروں۔ میں کام اور آرام دونوں سے محروم ہوں۔ رات کو نیند نہیں آتی۔ دن بھر کرب و اضطراب میں بسر ہوتا ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر میں اس راز کو کھول دوں، اگر اس کے سامنے جاکر اپنا سینہ چاک کردوں۔ اگر اس سے کہہ دوں کہ خدارا محبت کی ایک نگاہ مجھ ناچیز پہ ڈال دے تو کیا ہو۔ اس خیال کی دہشت سے میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اس کا مسکراتا ہوا چہرہ سامنے آجاتا ہے اور میں اس بات کے تصور ہی سے کانپ اٹھتا ہوں کہ میرے اس فعل سے اس کی زندگی بھر کی مسرت و راحت تباہ ہوجائے گی"۔

فیاض نے میز پہ سر رکھ دیا اور اس کی آنکھوں سے پھر آنسو ٹپکنے شروع ہوگئے۔

میں نے پوچھا "اس کا نام کیا ہے؟"

"کس کا نام؟"

"تمہاری محبوبہ کا"

"میں اُس کا نام نہیں بتاؤں گا۔ میں نے آج تک اس واقعے کا کسی سے ذکر نہیں کیا۔ میں جانتا ہوں کہ اگر یہ بات نکل گئی تو وہ مفت میں بدنام ہوجائے گی۔ لیکن تم سے چونکہ پردہ نہیں اس لئے میں صرف اتنا بتانے کو تیار ہوں کہ اُس کا نام ز سے شروع ہوتا ہے"۔

اس گفتگو کے ایک مہینہ بعد فیاض نے خودکشی کرلی۔ اپنے مکان کے ایک کمرے کو اندر سے مقفل کرکے اُس نے اپنے بائیں بازو کی شریان چاقو سے کاٹ ڈالی اور اس کے جسم کا سارا خون بہہ گیا۔ میں نے جاکر اُس کی لاش دیکھی تو ایک عجیب چیز نظر آئی۔ فرش پہ جگہ جگہ خون سے ز لکھا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ خون بہہ رہا تھا اور وہ انگلی کو خون میں ڈبو کر فرش پہ ز۔ ز لکھ رہا تھا"۔

سرفراز نے یہ قصہ ختم کیا تو سننے والوں کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں ناصر نے پوچھا "آخر ز کا راز بھی معلوم ہوا یا نہیں؟"

سرفراز نے جواب دیا "کچھ پتہ نہیں چلا۔ میرا خیال ہے کہ ز سے مراد غالباً زبیدہ ہے۔ لیکن وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ اس راز کو محفوظ رکھنے کی خاطر تو فیاض نے اپنی جان دے دی تھی"۔

سرفراز نے لفافے سے ایک تصویر نکالی اور کہا "یہ فیاض کا فوٹو ہے" مسکراتا ہوا خوبصورت سا گول چہرہ۔ پیشانی پر بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے بال۔ لمبی لمبی آنکھیں جنہیں گھنی پلکوں کے سائے نے زیادہ دلکش بنا دیا تھا۔

حفیظ نے تصویر کو بغور دیکھتے ہوئے کہا "اللہ اللہ، ایسے ایسے انسان بھی دنیا میں موجود ہیں"۔

عاشق حسین بٹالوی

تجلیات

گر نورِ محبت سے ہے روشن ترا سینہ
اے مردِ جواں بخت! ہے جینا ترا جینا

جس عرش پہ ہیں جلوۂ یزداں کی بہاریں
اخلاص و محبت ہے اسی عرش کا زینا

جو شام و سحر تیری ضیا سے رہے روشن
یارب مری قسمت میں ہو وہ دیدۂ بینا!

اک مستیٔ جاوید ہے جامِ مئے حق میں
گو تلخ تریں ہے مگر اے دل! یہی پینا!!

تسنیم سے بھی پاک ہے سورج سے بھی روشن
وہ رند کہ سرمست ہے بے ساغر و مینا

طوفاں میں بھی جو کھیلتا پھرتا ہو خوشی سے
ساحل پہ پہنچ کر ہی رہے گا وہ سفینہ

بن محفلِ ہستی میں ہوں اک شمعِ دل افروز
میں خاتمِ ہستی کا ہوں انمول نگینہ

جچتے نہیں یاقوت و گہر میری نظر میں
پنہاں ہے مرے دل میں محبت کا خزینہ

نزہت میں ہے فردوس کے پھولوں سے بھی بڑھ کر
وہ دل کہ اثرؔ جس میں عداوت ہے نہ کینہ

اثرؔ صہبائی

حضرت زکی بلگرامی بحیثیت مرثیہ گو

دنیائے شاعری کا یہ آفتاب جس کا نام محمد زکی اور تخلص زکی تھا ۱۲۸۳ھ میں ارضِ پاک بلگرام پر طلوع ہوا۔ پانچ برس کی عمر تھی کہ رسم بسم اللہ ہوئی اور اردو فارسی کی تعلیم شروع ہونے لگی۔ پندرہ برس کی عمر تھی کہ یہ ہونہار ہستی درسیات سے فارغ ہو کر علم ادب کے بحرِ ناپیدا کنار کی شناوری کرنے لگی۔ خوش قسمتی سے تعلیم کی ابتدائی منزل میں ایسے استاد کی رہبری حاصل ہوئی جو ہمہ داں اور ہمہ گیر تھا جس کے یہاں دن رات شعر و شاعری کے چرچے رہا کرتے تھے یعنی مولوی کرم حسین بلگرامی جن کا تبحر علمی اہلِ خبر سے پوشیدہ نہیں۔ مرحوم بہت ہی قابل بزرگ تھے عربی۔ فارسی اور اردو علم ادب پر انہیں حیرت ناک عبور حاصل تھا۔ اگرچہ شعر نہیں کہتے تھے مگر علم العروض کے بہت بڑے ماہر تھے اُن کی قابلیت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر ایسا جما ہوا تھا کہ جب کوئی نازک مسئلہ درپیش ہوتا اور آپس کے بحث و مباحثے سے طے نہ ہو سکتا تو ان کی طرف رجوع کیا جاتا اور ان کا فیصلہ ناطق سمجھا جاتا۔ اسی وجہ سے دن رات ان کے یہاں شعرا اور ادبا کا مجمع رہتا تھا معمول یہ تھا کہ سب لوگ جمع ہو جاتے طرح دی جاتی اور ہر شخص طبع آزمائی کرتا۔ مصرعوں پر مصرعے لگائے جاتے اور مولوی کرم حسین ان میں ترمیم و تنقیح کرتے جاتے۔ اس طرح پر قریب قریب روزانہ ایک اچھا خاصہ مشاعرہ ہو جاتا تھا۔ یہ ادبی نیرنگیاں زکی مرحوم کی فطرت میں جذب ہونے لگیں۔ مشاعروں کی کثرت اور شعر و شاعری کے شیدائیوں کی صحبت نے ان کے دل میں بھی لیلائے سخن کی محبت کی تخم ریزی کی۔

ابتدائے شاعری دس گیارہ سال کی عمر ہی کیا ہے مگر اس کمسنی کے عالم میں بھی یہ شمع ادب چاروں طرف چھوٹ ڈالنے لگی۔ سلام کہنا۔ غزلیات کے مصرعوں پر برجستہ مصرعے لگانا ان کا معمولی کام تھا۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا ہے کہ سب سے پہلے آپ نے یہ شعر کہا تھا ؎

ہمیشہ باتوں ہی باتوں میں آ کر چھیڑ جاتے ہو ٭ بڑے بے درد ہو دکھتے ہوئے دل کو دکھاتے ہو

اسی زمانے کا ایک یہ بھی شعر ہے ؎

زکی میں جان دینے کے لئے از خود نہیں آیا ٭ کسی بے رحم کا جذبِ محبت کھینچ لایا ہے

زکی بلگرامی کا لکھنؤ میں ورود پندرہ سولہ برس کی عمر میں لکھنؤ میں گزر ہوا۔ اس وقت یہاں کے چمنستانِ شاعری پر بہار کا عالم تھا۔ عندلیبانِ خوش نوا (انیس و دبیر) کی زمزمہ سرائیوں سے یہاں کی زمین کا ذرہ ذرہ مست ہو رہا تھا۔ اربابِ بہار (ادب) تو کچھ اس درجہ مست ہو گئے تھے کہ ان کے کان سوائے ان نغموں کے کسی نالۂ خوش نوا کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے لیکن گلستانِ بلگرام کے اس طوطیٔ شیوا بیان (زکی) نے کچھ اس انداز سے اپنا نغمہ چھیڑا کہ فضلائے ادب گونج اٹھی اور سیہ مستانِ ادب جھوم جھوم کر اس نغمۂ جانفزا کی طرف خود بخود کھنچنے لگے۔ بعض تو اس درجہ سرشار ہوئے کہ انہیں اپنے جذبات پر قابو نہ رہا اور اُن کے وہ خیالات جو دماغوں میں چکر لگا رہے تھے۔ زبانِ قلم سے نکل کر دامنِ کاغذ پر اس طرح گہر ریز ہوئے۔

زکی بلگرامی کے متعلق تذکرہ نویسوں کی رائے

(۱) "میر محمد زکی ... سراپا ذہن و ذکا تھے، اسم بامسمٰی تھے ... بڑے مشاق، سلام اور مرثیہ کہنے میں طاق ... قصیدہ۔ غزل اور اقسام کے شعر کم کہتے تھے مگر جب کہتے تھے تو ہم چشموں سے کم نہ رہتے تھے۔"
(انتخاب یادگار صلاا مولفہ امیر مینائی)

(۲) "ان حضرت نے مرثیہ گوئی میں بڑی مشق بہم پہنچائی تھی ... ہرچند کہ غزل، قصیدہ۔ رباعی ہر قسم کی شاعری کرتے تھے لیکن اپنے ہم عصروں سے اس فن خاص میں سبقت لے گئے" (تذکرہ یادگار ضیغم ص ۲۹)

(۳) "سید محمد زکی ... بڑے طباع اور قابل بزرگ تھے ... مرثیہ اور قصیدہ کہنے میں اچھی مشق تھی۔" (خمخانۂ جاوید ص ۴۲۴ مولفہ لالہ سری رام)

مندرجۂ بالا اقوال پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ زکیؔ مرحوم نے صنفِ مرثیہ میں بہ نسبت دیگر اصناف کے اپنی طبع رسا کی جولانیاں زیادہ دکھلائی ہیں مگر تعجب ہوتا ہے کہ جس صنف میں ان کی طبیعت کو خاص لگاؤ تھا۔ اس میں بہت ہی تجسس کے بعد ہمیں صرف ۴۲ مرثیوں کا پتہ چل سکا

زکیؔ مرحوم کا کلام انیسؔ و دبیرؔ سے کیوں کم ہے؟

(۱) میرؔ صاحب اور مرزا صاحب کی طبع رسا کی جولانیاں صرف مرثیہ، سلام اور رباعی پر ختم ہو گئی تھیں۔ برخلاف اس کے زکیؔ کل اصنافِ سخن پر برابر طبع آزمائی کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس صنف (مرثیہ گوئی) میں ان کا کلام حضرات انیسؔ و دبیرؔ سے تعداد میں کم ہو گیا۔

(۲) چونکہ خلاقِ عالم نے ان کی طبیعت میں لاپروائی کا مادہ ودیعت فرمایا تھا اس لئے انہوں نے اپنا کلام جمع کرنے کی کوشش نہیں کی میری رائے کی تصدیق منشی امیر احمد صاحب امیرؔ مینائی کے اس قول سے ہوتی ہے۔ "اُن کا کلام آزادہ طبعی کی وجہ سے جمع نہ ہو سکا"[1] اس آزادہ طبعی کے باوجود بھی کچھ کلام جمع ہو گیا تھا مگر ان کے انتقال پر ان کے بڑے صاحبزادے محمد حسن صاحب نے وہ سب کلام نواب رام پور مرحوم و مغفور کے ہاتھ فروخت کر ڈالا۔ نہیں معلوم اس بستے میں کتنے مرثیے تھے۔ برخلاف اس کے حضرات انیسؔ و دبیرؔ کا کلام اُن کے اعزا اور احباب کی کوششوں سے جمع ہوتا رہا اور پھر مطبع نول کشور کی بدولت وہ سب طبع ہو کر ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گیا

(۳) چونکہ زکیؔ مرحوم صاحبِ تصنیف و تالیف تھے اس لئے ان کے وقت کا زیادہ حصہ تصنیف و تالیف کی نذر ہو جاتا تھا۔ برخلاف اس کے حضرات انیسؔ و دبیرؔ کو نثر نگاری سے کوئی علاقہ نہ تھا اس لئے ان کی عمر کا تمام حصہ مرثیہ گوئی ہی میں صرف ہوا۔

تصنیفات زکیؔ

(۱) کلیلہ و دمنہ (نثر اردو) (۲) نل دمن (نثر اردو) بطرز و جواب فسانۂ عجائب رجب علی بیگ سرورؔ (۳) گل بکاولی (نثر اردو) (۴) داستان امیر حمزہ (نثر اردو) ۴ جلد (۵) تاریخ بلگرام (نثر اردو) (۶) تذکرۃ الشعرا (نثر اردو) (۷) تحقیقات زکی (لغت اردو) (۸) علم العروض والقوافی (۹) رسالہ تذکیر و تانیث (۱۰) علم اللسان (۱۱) مراثی زکی بلگرامی (۱۲) دیوان زکیؔ بلگرامی (غزلیات۔ قصائد۔ مثنویات۔ تواریخ۔ سہرے۔ واسوخت وغیرہ وغیرہ) (۱۳) مثنوی بطرز و جواب گلزار نسیم۔

زکیؔ مرحوم کی مرثیہ گوئی

لغت میں مرثیہ کے معنے ہیں "کسی کی مصیبت پر رحم کرنا" مگر شعرا کی اصطلاح میں مرثیہ اُس صنف نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی مرنے والے کے حالات۔ اوصاف سخاوت شجاعت وغیرہ وغیرہ بیان کئے جائیں لیکن اردو شعرا نے اس صنف کو علی العموم شہدائے کربلا اور دیگر آئمہ معصومین کی شہادت کے بیان کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔

مرثیہ کی ابتدا

کہا جاتا ہے کہ اس کا وجود خلقت انسانی کے ساتھ ساتھ وجود میں آیا۔ شمس العلما مولانا محمد حسین آزادؔ دہلوی تحریر فرماتے ہیں۔

"روئے زمین پر پہلا غم ہابیل کا تھا کہ قابیل کے سبب سے حضرت آدم کے دل پر طاری ہوا اسے نتیجہ جوشِ غم کا سمجھنا چاہیے کہ باوجودیکہ اس وقت شعر و شاعری کا نام نہ تھا مگر جوشِ طبیعت سے جو کچھ کلام اس وقت ان کی زبان سے نکلا موزوں تھا۔ چنانچہ وہ سریانی میں اب تک موجود ہے"[2]۔ امیر خسرو فرماتے ہیں ؎

ماہمہ در اصل شاعر زادہ ایم   دل باین محنت نہ از خود دادہ ایم

مرزا صائب کہتے ہیں ؎

آنکہ اول شعر گفت آدم صفی اللہ بود   طبع موزوں حجت فرزندی آدم بود

اردو مرثیہ گوئی کی ابتدا

اردو شاعری کا سرچشمہ دکن ہے اور یہ اُسی کی فیاضیوں کا نتیجہ ہے کہ اردو شاعری آج بامِ ترقی پر جلوہ افروز ہے۔ شاہانِ گولکنڈہ اور بیجاپور خود بھی شاعر تھے اور شعرا کے قدردان بھی تھے اور چونکہ یہ مذہب امامیہ رکھتے تھے لہٰذا تحصیل ثواب کی غرض سے خود بھی مرثیہ کہتے تھے اور لوگوں کو مرثیہ کہنے کی ہدایت کرتے تھے۔ مگر اس زمانے کے مرثیے بالکل ابتدائی حالت میں تھے اس وقت اس کا یہ انداز تھا کہ غزل کی طرح متفرق اشعار میں دردانگیز داستان دہرائی جاتی تھی۔ دو چار مثالیں ملاحظہ ہوں

سلطان قلی قطب شاہ المتخلص بہ معانی ؎

اک پوت کو دے زہر دوسرے پہ چھینے خنجر ہا کا فرنے کیسے قہر یو زخم کاری نائے

ہاشم علی المتخلص بہ ہاشم

زہر دے مارے حسن کوں کر سیں   سبز تھا وہ چہرۂ گل فام کا

---

[1] اگرچہ ابتدا میں کچھ غزلیں میرؔ صاحب نے بھی کہی تھیں مگر وہ تعداد میں اس قدر کم ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہیں [2] انتخاب یادگار ص۱ [3] دیکھو نظم آزاد مصنفہ آزاد دہلوی "نظم اور کلام موزون کے باب میں خیالات" تقریر جلسہ منعقدہ ۱۵ اگست ۱۸۶۷ء ص۵۔

کربلا میں تھا حسین ابن علی　　آرزو میں تیر کے اک جام کا
ماتم آل نبی یا شمس علی　　آج تک ہوگا انہیں ایام کا

کاظم سے

اے نابکاراں دین کا پھتر گرانا کہاں روا
سرور نبی کی آل کا دکھ میں لیانا کہاں روا

مرزا گل احسین گدا سے

جب آ کربلا میں وہ گردش کی ماری ٭ ہو فاطمہ کی علی کی پیاری
گنوا بادشاہی لٹا شہریاری ٭ چلی شام میں قید ہونے بچاری

اس کے بعد شعرا دہلی کی ترقی کا دور شروع ہوا ان لوگوں نے مرثیہ میں بہت دلچسپی لی چنانچہ میر نے اپنے تذکرہ نکات الشعرا میں اور میر حسن دہلوی نے تذکرۃ الشعرا میں بہت سے مرثیہ گو شعرا کا ذکر کیا ہے جن میں میر اماںی۔ میر عاصی۔ میر آل علی۔ درخشاں۔ سکندر۔ قادر۔ گمان۔ ندیم وغیرہ مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے مرثیہ گو تھے جن کے کلام کے نمونے درج کئے جاتے ہیں۔

عالم شاہ محزوں دہلوی۔ لکھنؤ میں رہتے تھے۔ سے

بانو اکبر کو کہیں اے مرے جانی افسوس ٭ تیری صورت کو کہوں یا کہ جوانی افسوس
مل گیا خاک میں تو حیف جوانی افسوس ٭ ہائے اعدائے تری قدر نہ جانی افسوس

جعفر علی۔ آپ کا کوئی تخلص نہ تھا بلکہ پورا نام لکھتے تھے سے

جب سر کو شبک ہو ذ تھی حیران سکینہ ٭ ماں رو رو کے کہتی تھی میں قربان سکینہ
بابا ترا آتا ہے مری جان سکینہ ٭ کیوں رو رو کے تو ہوتی ہے ہلکان سکینہ

تیسرا طریقہ یہ تھا کہ مطلع میں چار مصرعے ایک قافیہ میں اس کے بعد ٹیپ کا ایک شعر اور پھر تین مصرعے ایک قافیہ میں اور چوتھے مصرعے میں مطلع کا قافیہ ہوتا اور پھر ٹیپ کا ایک شعر ہوتا تھا سے

جب وداع ہونے لگی وہ دسویں رات ٭ شہ نے بعد از نوافل و رکعات
تسبیح ادیر پھیرا با جلدی ہات ٭ کہا کہ اے دست و دل کرو طاعات

ہر دم از عمر می رود نفسے　　چوں نگہ می کنم نماند بسے

جاگتے جاگتے وہ ساری رین ٭ کی پرستش خدا کی با سر و عین
کہا آنکھوں نے تک نوسئے حسین ٭ کہا کیا سوؤں اب گزر گئی رات

خواب نوشیں بداد رحیل　　باز دارد پیادہ را ز سبیل

اس طرز کو سید انشا کے زمانے تک لوگ قدر کی نظر سے دیکھا کئے مگر مرزا علی ندیم نے اس طرز کو اور ساتھ ہی ساتھ دیگر خامیوں کو مرثیے سے

الگ کر دیا۔ آخر کار موجودہ مرثیہ گوئی کا انداز قائم ہوا اور مرثیے مسدس کہے جانے لگے۔

سب سے پہلے جس نے مرثیہ کو موجودہ طرز کا خلعت پہنایا وہ میر ضمیر مرزا دبیر کے استاد ہیں۔ میر ضمیر کے مرثیے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں میر ضمیر اور میر خلیق کے بعد ہی انیس و دبیر کا مبارک زمانہ آگیا اس زمانہ میں مرثیہ کے پیکر بیجان میں روح حیات پھونک دی گئی ان بزرگوں سے پیشتر ہی مرثیہ مسدس کی شکل میں منتقل ہو چکا تھا لہٰذا اس کی شکل میں تو کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہاں البتہ ان دونوں نے جو کچھ خلیق و ضمیر سے پایا تھا اُسے معراج کمال پر پہنچا دیا۔

زکی بلگرامی کا عہد شاعری

زکی مرحوم کی مرثیہ گوئی کی ابتدا کا زمانہ لکھنؤ کا وہ مبارک عہد تھا جس وقت وہاں کی شاعری کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ انیس سا بلبل ہزار داستاں چہک رہا تھا اور دبیر سا طوطی خوش بیان زمزمہ پرداز تھا انہیں آفتاب و ماہتاب کی بدولت مرثیہ معراج کمال پر پہنچا ہوا تھا۔ لکھنؤ والوں کے کانوں میں یہی دو نغمے گونج رہے تھے لہٰذا یہ بات مشکل تھی کہ غیر کی وہاں تک رسائی ہو سکے۔ اور پھر وہ ان دونوں کے مقابلے میں مجلسیں پڑھے اور برابر داد سخن لے کر منبر سے اترے۔ لیکن زکی ہی کی ایک ایسی ذات تھی جس نے برق سخن کی ضیا پاشیوں سے ان مہر و ماہ (انیس و دبیر) کی آنکھوں کو جھپکا دیا۔ چونکہ انیس و دبیر کی طرز شاعری کی عملداری تمام لکھنؤ پر قائم ہو گئی تھی لہٰذا اس زمانے کے مرثیہ گو شعرا کو سوائے ان حضرات کی سکھائی ہوئی چالیں چلنے کے اور کچھ نہ آتا تھا۔ لیکن چونکہ حضرت زکی مرحوم کا خمیر بلگرام کے آب و گل سے بنا تھا اور ان کے دل میں اپنے دیگر ہم وطنوں کی طرح خودداری کا جذبہ جوش زن تھا اس لئے وہ حضرات انیس و دبیر کے نقش قدم پر سجدے کرنے کو اپنا ننگ سمجھتے تھے۔ وہ میر صاحب اور مرزا صاحب سے برابری کا دعوے رکھتے تھے ان کے مقابلے میں مرثیے کہتے اور مفاخرت کے پہلو نظر انداز نہ کرتے تھے۔ ملاحظہ ہو سے

ہیں نظم ہو چکے یہ مضامین پیش ازیں　　ممکن نہیں نظیر بتا کہتے ہیں ہمنشیں
دیکھیں بچشم غور سخن فہم و نکتہ چیں　　یہ صورت دوم ہے وہ تھا نقش اولیں
پیدا ہوا آئینہ میں جو شکل آفتاب کی
تصویر بول اٹھے ابھی حاضر جواب کی

شاعرانہ تعلّی اور معاصروں پر چشمک زنی

اعجاز ہے کلام فصاحت نشاں مرا ۔۔۔ کلمہ پڑھیں سخنورِ شیریں زباں مرا
کیا منہ کہ عندلیب کرے امتحاں مرا ۔۔۔ دم بند ہو سنے جو یہ رنگیں بیاں مرا

ہوا اور ہی بہار جو ظاہر یہ بھید ہو
یوں رنگ اڑے کہ رنگ گلوں کا سفید ہو

چشمک

کیا ناک ہے جہاں میں مرے کلک کی صریر ٭ تحریر میں یہ زمزمہ پیرا ہے بے نظیر
مانا نہ ہیں انیس نہ مونس نہ ہوں دبیر ٭ قدرت خدا کی ہے نہ کریں رشک ہم صفیر

باتیں وہی ہیں اور وہی اردو زبان ہے
لیکن یہ رنگ اس کی کریمی کی شان ہے

مداحِ امام ابن امام آیا ہے ۔۔۔ شیدائے شہ عرش مقام آیا ہے
آنکھیں مہ و مہر کی جھپکتی ہیں کہ ۔۔۔ کیا ذرۂ خاکِ بلگرام آیا ہے

ظاہر ہے کہ اس وقت حضرات انیس و دبیر لکھنو کیا ہندوستان کے سپہرِ شاعری کے آفتاب و ماہتاب تھے اور لوگ انہیں آفتاب و مہتاب کے روشن نام سے موسوم بھی کرتے تھے۔ لہذا معلوم ہوتا ہے کہ مہ و مہر سے مراد انیس و دبیر ہیں اور اس طرح زکی مرحوم نے ان پر چشمک کی ہے

کلام زکی اب میں حضرت زکی مرحوم کے مرثیوں کا انتخاب مولوی شبلی مرحوم کی قائم کردہ سرخیوں کی تحت میں درج کرتا ہوں تاکہ ناظرین کرام اندازہ کرسکیں کہ زکی مرحوم کی یہ شاعرانہ تعلیاں اور چشمکیں کہاں تک راستی پر مبنی ہیں۔

فصاحت علمائے ادب نے فصاحت کی یہ تعریف کی ہے کہ (۱) لفظ میں جو حروف آئیں اُن میں تنافر نہ ہو۔ الفاظ نامانوس نہ ہوں قواعد صرفی کے خلاف نہ ہو (۲) الفاظ سادگی، آسانی، کثیر الاستعمالی کے ساتھ ہی مبتذل اور سوقی بھی نہ ہوں۔ جب ایسے الفاظ مل جائیں جو سادہ۔ آسان کثیر الاستعمال اور غیر مبتذل ہوں تو یہ بھی ضرور ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئیں اُن کی ساخت۔ ہیئت۔ نشست۔ سبکی اور گرانی کے ساتھ اُن میں خاص تناسب و توازن ہو، ورنہ فصاحت قائم نہ رہے گی جب کسی مصرعے یا شعر کے تمام الفاظ میں ایک خاص قسم کا تناسب و توازن پایا جاتا ہے، اس کے ساتھ وہ تمام الفاظ بجائے خود بھی فصیح ہوتے ہیں تو وہ پورا مصرعہ یا شعر فصیح کہا جاتا ہے اور یہی چیز ہے جس کو بندش کی صفائی، نشست کی خوبی، ترکیب کی دلآویزی، برجستگی، سلاست، اور روانی سے تعبیر کرتے ہیں۔[1]

مندرجۂ بالا کلیہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے حضرت زکی مرحوم کے مندرجہ ذیل چند بند ملاحظہ ہوں۔

ہیبت

ہیہم یہ صدا آتی ہے ہلتے ہیں جو کہسار ۔۔۔ ہے وقت اذا زلزلت الارض خبردار
شامت پہ ہے قہر و غضب ایزدِ قہار ۔۔۔ موت آئی بس اب بچ کے کدھر جائیں گے کفار

لشکر شکن و صفدر و ہیجایہ ولی ہے
ہاں آمدِ ضرغامِ نیستانِ علی ہے

ہلچل سے ہوئی فوج مخالف تہ و بالا ۔۔۔ صف پر جو گری صف تو رسالہ پہ رسالہ
ہستی کا کیا موت پہ قسمت نے حوالا ۔۔۔ تقدیر کی گردش نے عجب پیچ میں ڈالا

آئے جو نظر یک بیک آثار غضب کے
دم بند ہوئے خوف سے ہوش اڑ گئے سب کے

سراپا جناب قاسم

صل علیٰ وہ طلعتِ زیبا وہ شانِ حُسن ۔۔۔ صدقے ہوئے نثار ہوئے قدردانِ حُسن
قامت کے راستے نے دکھائے نشانِ حُسن ۔۔۔ پرتو سے سطح خاک بنا آسمانِ حُسن

ذروں میں جان پڑ گئی چہرے کے نور سے
حوریں بلائیں لینے لگیں رُخ کی دُور سے

چمکا رخِ صبیح کا آئینۂ جمال ۔۔۔ لکھی قلم نے زلف کی تفسیر خط و خال
آنکھوں کے سامنے نظری ہو گئے غزال ۔۔۔ پلکیں زبان بن گئیں ہنگامِ قیل و قال

رتبہ گھٹا جبیں سے مہ باکمال کا
جُنبش بھوؤں نے رنگ مٹایا ہلال کا

بینی سے وجہ آئنہ بینی ہوئی عیاں ۔۔۔ سبزے سے خط کے زرد ہوا سبزۂ جناں
قائل ہوئے دہن کے سخن فہم و نکتہ داں ۔۔۔ گلبرگ ترسے کہیں لب رنگین شوخیاں

دانتوں سے تارے ہو کے خجل ڈوبنے لگے
چاہِ ذقن کی چاہ میں دل ڈوبنے لگے

مناجات امام

دستِ دعا بلند کئے سوئے آسماں ۔۔۔ کی عرض رو کے درگہِ حق میں بصد فغاں

[1] موازنۂ انیس و دبیر" مولفہ مولوی شبلی نعمانی۔

کس منہ سے ہو سکے ترے الطاف کا بیان　　بندوں پہ ہیں سوا تری بندہ نوازیاں
حقا دلیل رابطۂ جسم و جاں ہے تو
مخلوق سب ہیں خالق کون و مکاں ہے تو
تو رہنمائے حضرت خضر ظلمت کی راہ میں　　یعقوب کا انیس ہے فریاد و آہ میں
رکھا تری پناہ نے سر دم پناہ میں　　یونس کو بطن حوت میں یوسف کو چاہ میں
آدم کو در د ہجرت سے درمان جاں ملی
عیسیٰ کو دار پر رہ دار الاماں ملی

ہے گو کہ دل پہ چار طرف سے ہجوم غم　　بھرتا ہوں دم مگر تری الفت کا دم بدم
بیٹے کا رنج ہے نہ برادر کا ہے الم　　لشکر کا شوق ہے نہ ہوس رایت و علم
اندیشۂ قضا ہے نہ مطلب حیات سے
بندے کو مدعا ہے فقط تیری ذات سے

وقت سفر قریب ہے زاد سفر نہیں　　آساں گذر ہو جس سے یہ وہ رہ گزر نہیں
ہمدم نہیں رفیق نہیں راہبر نہیں　　کیا راہ میں گزرتی ہے اس کی خبر نہیں
در پیش تن سے روح کو راہ شباب ہے
نے قدرت قیام نہ رحلت کی تاب ہے
گہہ محملوں کا غل گہے شور الرحیل　　ساماں کثیر چاہیئے فرصت بہت قلیل
خاطر ہو مطمئن نہیں ایسی کوئی سبیل　　اے کردگار بندۂ عاجز کا ہو کفیل
ہاتف سنا رہا ہے پیام انتقال کا
ہو خاتمہ بخیر محمد کی آل کا
جی چاہتا ہے وعدۂ طفلی وفا کروں　　قربان تجھ پہ جان کروں سر فدا کروں
اظہار بندگی تہہ تیغ جفا کروں　　وقت قضا بھی شکر کا سجدہ ادا کروں
بےچین ہے دل کو فکر ہے امت کے دین کی
اللہ تیرے ہاتھ ہے عزت حسین کی

پھولوں سے نخل شاہد گل پیرہن بنے　　کلنٹے زبان بن گئے غنچے دہن بنے

شرمائے آفتاب قیامت جلال وہ　　یوسف نے خواب میں بھی نہ دیکھا جمال وہ

طلعت میں حرف حرف سہ باکمال ہے　　دیکھو یہ وصف قاسم یوسف جمال ہے

[1] موازنۂ انیس و دبیر مولفہ مولوی شبلی نعمانی۔

صندل کے بدلے خاک کا چھاپا قبول ہے　　اچھا سدھارو ہم کو رنڈاپا قبول ہے

دیتے ہیں اہلبیت دہائی رسول کی　　میدان میں لٹ رہی ہے کمائی بتول کی

کلام کی اصلی ترتیب کا قائم رہنا

"ترکیب الفاظ کے لحاظ سے شعر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ کلام کے اصلی اجزا کی جو اصلی ترتیب ہے وہ قایم رہے مثلاً فاعل، مفعول، مبتدا، خبر، متعلقات فعل جس ترتیب کے ساتھ ہر وقت بول چال میں آتے ہیں، یہی ترتیب شعر میں بھی قایم رہے . . . نظم کا درحقیقت سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ اگر اس کو نثر کرنا چاہیں ہو سکے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب شعر میں الفاظ کی وہی ترتیب باقی رہے جو نثر میں معمولاً ہوا کرتی ہے"[1]۔ بطور نمونہ حضرت زکی کے کلام سے ایک بند ملاحظہ ہو۔

جاتے تو ہو مگر مجھے بیوہ بنا تے جاؤ　　کیا گزرے گی نباہ کی صورت کوئی بتاؤ
صاحب تم اپنے ہاتھ سے تم چوڑیاں بڑھاؤ　　کہہ دو پھوپھی سے یہ لے رنڈسالا پہناؤ
جن سے سہاگ تھا وہ چلے منہ کو موڑ کے
گہنا اتاریں پھینک دیں ہرے کو توڑ کے

روزمرّہ اور محاورہ

بہنوں سے کہہ دو آئیں جو ہے نیگ کی طلب　　کمھلا رہے ہے دھوپ کے مارے یہ غنچہ لب
رخصت کریں عروس کو حضرت کہیں یہ سب　　چڑھتی ہے دھوپ دیر مناسب نہیں ہے اب
رسموں کا دھیان ہے نہ دلھن کا خیال ہے
گرمی ستم کی ہے مرا بچہ نڈھال ہے
فرقت کا غم ہے سرور عالم پناہ کو　　صدقے گئی سلام کرو اٹھ کے شاہ کو

فریاد اجاگ کر مری تقدیر سو گئی　　بیٹا میں پال پوس کے بے آب ہو گئی

میں جانتی تھی چین ملا دل ٹھہر گئے　　لو اب کھلا کہ جان سے دونوں گزر گئے

مناسبت الفاظ

یعنی مضامین کے لحاظ سے الفاظ کا استعمال کرنا۔

رزمیہ بند میں فخر کے پہلو اس طرح دکھائے جاتے ہیں سہ
کانپے فلک دکھاؤں اگر قوت شباب　　الٹوں جو آستیں تو ہو دنیا کا انقلاب

اس ضرب شر شکن کی نہیں کافروں کو تاب   سن تھا یہی چڑھے تھے جو خیبر پہ بوتراب
دادا کا نام نامِ خدائے قدیر ہے
ان انگلیوں میں زورِ شہ قلعہ گیر ہے

اگر کسی جری بہادر کا سراپا کھینچنا منظور ہے تو اس کا یہ انداز ہے ؎

الحق کہ خدا داد ہے یہ دبدبہ و جاہ   یہ طنطنہ و سطوت و صولت ہے من اللہ
دیکھے جو یہ تیور تو بنے شیر بھی روباہ   نزدیک ہے یہ کوہ اڑیں مثلِ پرِ کاہ
اقبالِ سلیماں ہے بہادر کے جلو میں
ہے بادِ صبا ملکِ سبا کے تگ و دو میں

دیگر رزمیہ اشعار کی شان و شوکت ملاحظہ ہو ؎

تھا شور ہل رہے ہیں طبق رزم گاہ کے   بپھرے ہوئے ہیں شیر حسینی سپاہ کے

منہ شیرِ خشمناک کا ہے سوئے رزمگاہ   ابرو پہ بل، جبیں پہ شکن، قہر کی نگاہ

"دیکھو[1] جس طرح ایک بہادر اور پُرہیبت شخص بحالت غیظ و غضب کسی شخص کو مرعوب بنا دیتا ہے اسی طرح ان پُرزور الفاظ کے صورت و لہجہ سے شوکت و جلال کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔"

بلاغت بلاغت کلام یہ ہے کہ کلام مقتضائے حال کے مطابق اور استعارات باقرائن کنایات بلیغ، تشبیہات نادرہ غیر مبتذلہ سے آراستہ ہو، بشروط فصاحت کیونکہ فصاحت بلاغت کا ایک جزو ہے، پس فصاحت کا تعلق الفاظ بامعنی سے ہے اور اس میں الفاظ اور بندش الفاظ کے حسن و قبح سے بحث ہوتی ہے، اور بلاغت کا اصلی تعلق معانی الفاظ سے ہے یعنی اس میں خوبی و نفاست کی نوعیت کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔"

"بلاغت[2] کا کمال یہ ہے کہ واقعات کربلا کو جو مرثیہ گویوں کا موضوع شاعری ہے اس طرح بیان کیا جائے کہ بالکل مقتضائے حال کے موافق ہو اور واقعہ کی صورت آنکھوں میں پھر جائے (۲) حریفوں کی لڑائی میں یہ واقعات بیان کئے جائیں۔ دونوں کے سراپا، ڈیل ڈول، اسلحۂ جنگ کے سجنے کا نقشہ دونوں نے فنِ جنگ میں کیا کیا ہنر دکھائے وغیرہ وغیرہ (۳) واقعات کے بیان میں جس رتبہ اور درجہ، اور جس سن و سال کے لوگوں کا ذکر آئے اسی قسم کے طرزِ خیال اور طریق ادا کو ملحوظ رکھا جائے۔ بوڑھے۔ بچے۔ جوان۔ مرد عورت۔ کنواری۔ بیوہ۔ آقا۔ غلام۔ نوکر چاکر۔ غرض جس کی زبان سے جو خیال ظاہر کیا جائے اس کی زبان اور طرزِ خیال کی تمام خصوصیتوں کو قایم رکھا جائے۔"

سراپا حضرت قاسم ابن امام حسن علیہ السلام کا سراپا ؎

سیادت کا سر ہے یہ زلفِ مسلسل   صحیفہ ہے روئے کتابی یہ مدول
یہ دیوانِ قدرت کی ہے نظمِ اول   کھلی اس سے شانِ کتابِ منزل
بڑھا حُسنِ رخسار حسنِ رقم سے
کھنچا ہے یہ نقشہ اسی مو قلم سے

کدھر ہیں مہ و خور یہ رخسار دیکھیں   فرشتے یہ روئے ضیابار دیکھیں
کلیمِ خدا کشفِ اسرار دیکھیں   نہ ہوں غش تجلیِ انوار دیکھیں
اٹھا پردہ راز دیندار آئیں
زیارت کو مشتاقِ دیدار آئیں

رگیں ہیں جو نازک گلے کی ہویدا   ہیں آثارِ صبحِ شہادت کے پیدا
کریں شورِ مستانہ بلبلِ شیدا   صبوحی کے طالب صباحت کے شیدا
ہوا خوش ہے کشتِ تمنا ہری ہے
مے خلد سے یہ صراحی بھری ہے

اب فوجِ کفار کے پہلوانوں کا سراپا ملاحظہ ہو، حضرت عون و محمد علیہم السلام کے مقابلے کے لئے چار کافر نکلتے ہیں۔

رخِ نحس تھے روسیاہی کے شایاں   وہ پیشانیاں تنگ تھیں مثلِ زنداں
ان آنکھوں سے تھے چار چشمے نمایاں   وہ شیطاں تھے ہم چشمِ غولِ بیاباں
بھویں نونِ ناقص تھیں پلکیں الف تھیں
نگاہیں خود اس رمز کی معترف تھیں

نہایت تھی مکروہ بینی بریدہ   کہ تھی خطِ بینی نشانِ ندیدہ
فلاکت زدہ تھے وہ آفت رسیدہ   دریدہ دہن بدزباں لب گزیدہ
عمِ مخلصی ذقنِ مشکل تھی ان کو
ذقن کی گھڑی چاہِ بابل تھی ان کو

گلوں کی رگیں تھیں کہ زنار گردن   بتوں کے تھے بندے وہ مغرور پرفن
دلوں میں جو تھی آگ سینے تھے گلخن   کر کا یہ ایما عدم میں ہیں یہ دشمن

---

[1] المیزان مولفہ سید نظیر الحسن صاحب فوق منہ [2] دیکھو "المیزان" مولفہ مولوی نظیر الحسن صاحب فوق [3] دیکھو "موازنہ انیس و دبیر" مولفہ مولوی شبلی نعمانی۔

زمانے کی گردش سے محوِ الم تھے
نہ تھے حلقۂ ناف گرداب غم تھے

حضرت قاسم علیہ السلام اپنی ایک رات کی بیاہی دلہن سے رخصت لے کر میدان میں جانا چاہتے ہیں۔ وہ انہیں روکنا چاہتی ہیں مگر خود بسبب حجاب کے کچھ کہہ نہیں سکتیں اپنی کمسن بہن حضرت سکینہ علیہا السلام سے کہتی ہیں کہ تم انہیں روکو۔ دلہن کا اپنی بہن کو سمجھانا پھر حضرت سکینہ کا اقرار کرنا کہ میں انہیں نہ جانے دوں گی اس کے بعد اُن کا حضرت قاسم علیہ السلام کو روکنا۔

مجھ بدنصیب کو تو ہے بی بی ابھی حجاب   یہ منتظر جواب کے ہیں کون دے جواب
درپردہ رو رہے ہیں ہو دیدۂ پُر آب   ہے ہے کسے دکھاؤں جو ہے دل پہ اضطراب
سب گھر کو دولھا بھائی تمہارے رلائیں گے
گر ضد کرو گی تم تو یہ مرنے نہ جائیں گے

بولی سکینہ خوب بھلا جائیں تو ابھی   میں خاک پر مچل کے قیامت کروں ابھی
روٹھے ہیں آپ ہی آپ کسی کا قصور بھی   لے لو یہ ماجرا ہے پریشاں ہیں سب ابھی
جاتے تو ہیں حضور سے رخصت بھی پائی ہے
اچھا میں پوچھتی ہوں یہ کیا دل میں آئی ہے

آئی قریب قاسم نوشاہ وہ خورد سال   گویا ہوئی یہ تھام کے دامن بصد ملال
کھلتا نہیں کچھ آپ کی آزردگی کا حال   میں بھی سنوں دلہن سے ہے کس بات کا خیال
ناحق نہ بات بات پہ تکرار کیجئے
منظور کیا ہے آنکھ ذرا چار کیجئے

بھیا مری بہن کو رلاتے ہو واہ واہ   بھیا نہ دل دکھاؤ کرو رحم کی نگاہ
بھیا غضب کی جا ہے بھرا گھر ہوا تباہ   بھیا کہیں گے سب کہ مبارک ہوا نہ بیاہ
آیا یہ کیا خیال کہ کس کر کمر چلے
جنگل میں ہم کو چھوڑ کے بھیا کدھر چلے

میدان کربلا میں امام حسینؑ کے خیمے دریا کے کنارے برپا ہو رہے تھے کہ فوجِ شام آکر مانع ہوئی اس پر ناصرِ حق امام علیہ السلام کو جلال آیا اور حضرت عباس نے تلوار علم کی۔ اس شور و غل کی آواز سن کر عورتیں پریشان ہو گئیں۔ حضرت زینب کی زبان سے اضطراب کی حالت میں جو الفاظ نکلے وہ اس طرح حوالۂ قلم کئے ہیں ؎

گھبرا کے اٹھ کھڑے ہوئے سلطانِ خوش خصال   بیتاب محلوں میں ہوئی فاطمہ کی آل
چلائی رو کے زینب ناشاد خستہ حال   کیسا یہ غل ہے خیر تو ہے اے علی کے لال
سنتی ہوں میں فساد پہ دشمن تلے ہوئے
تیغیں کھنچی ہوئی ہیں علم ہیں کھلے ہوئے

فرمایا مہمانوں سے گھیرے ہیں اہل کیں   عباس سے ہوئی ہے یہ بحث اے علم و دیں
لڑنے میں مجھ کو ہول سدھارو نہ تم کہیں   بھیا بلاؤ ابنِ یداللہ کو یہیں
ہے فوج شام درپئے آزار کس لئے
حجت یہ کس سے ہے یہ تکرار کس لئے

ہے ہے کہاں ہیں عون و محمد وہ جلد جائیں   عباس نوجوان کو میرے پاس جلد لائیں
غصہ کی یہ جگہ نہیں ہرگز نہ طیش کھائیں   تکرار کیا ضرور ترائی سے ہاتھ اٹھائیں
اب تیغ تیز نہر کی ایک ایک لہر ہے
بن جائے جس سے جان پہ پانی وہ زہر ہے

تشبیہ حضرت شہربانو کے دل میں جلوۂ ایمان کا پرتو جھلکنے لگا ہے گر ابھی وہ کفرستان دایران میں ہیں۔

تھی اس صنم کدہ میں وہ حق فہم و حق نگر   یا دیر میں مرقعِ مریم تھا جلوہ گر
گویا حجابِ شب میں نہاں تھا رخِ سحر   خورشید تھا غبار میں اور ابر میں قمر
خلات تھی آب شور میں دُرِ خوش آب کی
مابین خار زار کلی تھی گلاب کی

یوں ہے قدم رکاب ظفر انتساب میں   جیسے شعاعِ مہر مبیں آفتاب میں

دیکھی نہیں یہ صورتِ کنعاں نے خواب میں   ملتے ہیں چاند ہے کہ قدم ہر رکاب میں

صنائع و بدائع زکی مرحوم کی ابتدائے شاعری کے وقت لکھنو کے شعرا رعایات لفظی اور صنائع و بدائع کے بہت دلدادہ تھے۔ شعر کو حقیقت سے کام نہ تھا معنویت سے تعلق نہ تھا۔ جذبات باطنی مفقود واردات قلبی ناپید ہو چکے تھے۔

اسی لئے ان کے کلام میں بھی یہ رنگ نظر آتا ہے مگر انہوں نے رعایت لفظی کے چکر میں پڑ کے شعر کی لطافت کو دھبا نہ لگنے دیا۔ ان کے یہاں جو صنائع و بدائع نظر آتے ہیں وہ ملح فی الطعام کا مزہ دیتے ہیں۔

صنعت ایہام یعنی ایک لفظ کے دو معنی ہوں ایک معنی مراد ہوں اور دوسرے معنی اگرچہ مراد نہ ہوں لیکن مقدم و موخر الفاظ سے ان کو مناسبت ہو

طالب تھا آبرو کا جو اُس بادشاہ سے — دریا بھی اس ہوا میں بڑھا لاکھ چاہ سے

دل ہو گئے دو نیم جگر چاک ہو گئے — سایہ بھی اس کا حسن پہ پڑا خاک ہو گئے

مبالغہ | جناب امام حسین کربلا میں اترے ہیں اور سیر کرتے ہوئے دریا کے کنارے پہنچے ہ

الیاس و خضر نے یہ کہا بڑھ کے ناگہاں — ہشیار اے فرات کہ آئے شہ زماں
یہ سنتے ہی حباب ہوئے سر کے بل رواں — ساحل پہ آ کے لگ گئیں موجوں کی کشتیاں

طالب تھا آبرو کا جو اس بادشاہ سے
دریا بھی اس ہوا میں بڑھا لاکھ چاہ سے

شاعر کے نزدیک یہ باتیں خلافِ عقل نہیں ہیں کیونکہ وہ امام حسین کو اپنے رسول کا جانشین اور صاحبِ اعجاز مانتا ہے۔ ان کے معجزات کو دیکھتے ہوئے ان باتوں کا وقوع پذیر ہونا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔

حسن تعلیل | اس کی حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کے واسطے کسی شے کو علت فرض کریں جو درحقیقت میں اُس کی علت نہ ہو۔

جناب عباس نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈالا۔ گھوڑے کے سموں کے وزن سے دریا کے پانی کو جنبش ہوئی۔ موجیں اٹھیں اور حباب اُبھرنے لگے مگر شاعر کے نزدیک اُن کی علت یہ ہے کہ جناب عباس کے حُسن کے پرتو کے پانی پر پڑنے کی وجہ سے اس میں تلاطم برپا ہوا اور یہ موجیں گھوڑوں کے سموں کے وزن سے نہیں اُٹھ رہی ہیں بلکہ پانی شوق لقائے جناب عباس میں بے تاب ہو رہا ہے اور حباب اُن کی زیارت کے لئے اُبھر رہے ہیں[۵]

دیکھا جو حُسن طلعت دلبند بوتراب — سیماب کی طرح متلاطم ہوا وہ آب
گویا دلیلِ شوق تھا موجوں کا اضطراب — پیہم اُبھر اُبھر کے لگے دیکھنے حباب

چاہا کہ دست بیچ ہو خالق کے نور سے
پھیلائے ہاتھ پنجۂ مرجاں نے دور سے

صنعت طباق | یعنی دو متضاد یا متقابل چیزوں کا جمع کرنا ہ

ع - آنکھیں ہوئیں جو بند تو راز نہاں کھلا
ع کھلی جو چشم شوق بندھا آنسوؤں کا تار
ع اب شربت حیات مرے حق میں زہر ہے
ع یکساں ہیں ہم کو صبح وطن اور سفر کی شام

ع - بازار گرم موت کا دل زندگی سے سرد

مراعات النظیر | یعنی الفاظ کی رعایت۔ اس صنعت میں کئی چیزیں متناسب غیر متضاد ایک کلام میں مذکور ہوتی ہیں مثلاً ذوق۔

خط بڑھا زلفیں بڑھیں کاکل بڑھے گیسو بڑھے
حُسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

خط۔ زلف۔ کاکل۔ گیسو باہم متناسب ہیں لیکن اگر کسی سادہ طریقے پر اس صنعت کو برتا جائے تو کچھ قابل تعریف بات نہیں، البتہ شاعر کی جولانی فکر کا نمونہ اور قابل تعریف و پرلطف اس کی وہ قسم ہے جس کو ایہام التناسب کہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ مثلاً دو معنی جمع کریں جن کو آپس میں کچھ مناسبت نہ ہو مگر ان معنوں کو جن دو لفظوں سے تعبیر کریں اُن میں ایک لفظ کے دو معنی ہوں اور معنی دوم جو غیر مقصود ہوں ان کو پہلے لفظ سے مناسبت ہو ہ

سیادت کا سہرا ہے یہ زلفِ مسلسل — صحیفہ ہے روئے کتابی یہ جدول
یہ دیوان قدرت کی ہے نظم اول — کھلی اس سے شانِ کتاب منزل

بڑھا حُسن رخسار حُسن رقم سے
کھنچا ہے یہ نقشہ اسی مو قلم سے

یہ نور نظر ہیں جو مردم کو پیارے — بٹھایا ہے آنکھوں پہ الفت کے مارے

ع ذرہ چمک کے مہر ہو وہ آفتاب دے
ع آندھی کی خاک قدر ہے باندھا کے ہوا

صنعت معاد[۶] | یہ صنعت ردالعجز علی الصدر کے قبیل سے ہے۔ اس میں وہ الفاظ جو مصرع اول کے آخر میں ہوتے ہیں اُن کو مصرع دوم کے اول میں لاتے ہیں اور جو مصرع دوم کے آخر میں ہوتے ہیں ان کو مصرع سوم کے اول میں لاتے ہیں وعلیٰ ہذا القیاس۔

عدو نارسا تھے یہ بجلی رسا تھی — رسا تھی کہ فصل خزاں کی ہوا تھی
ہوا تھی کہ عباس کی خاطر بلا تھی — بلا تھی کہ یہ ناگہانی قضا تھی

قضا تھی کہ ٹھہرنے کی جس کو قسم تھی
قسم تھی اسی وجہ سے تیز دم تھی

[۵] المیزان مولانا سید نظیر الحسن صاحب فوق ص ۱۵۱

[۶] المیزان نظیر الحسن فوق

صنعت تنسیق الصفات ایک موصوف کے لئے متواتر کئی اوصاف کا ذکر کرنا۔

حضرت زینب علیہا السلام کے صاحبزادوں کی مدح سے

ذی تمکنت، متین، ہنرمند، ارجمند
حق فہم، حق نیوش، حق اندیش، حق پسند
مانند جد شجاع، وسرفراز، سربلند
نانا کی طرح قابل عزت دو دلبند

انسانی جذبات یا احساسات چونکہ شعر کا نمایاں وصف جذباتِ انسانی کو برانگیختہ کرنا ہے یعنی ایسا کو سن کر دل میں رنج، یا خوشی یا جوش کا اثر پیدا ہوتا ہے[۱] اس لئے اصلی شاعری، دلی جذبات اور خیالات کے ہو بہو اور صحیح صحیح نقشہ اتارنے کو کہتے ہیں[۲] "یہ نقشہ جس قدر اصل کے مطابق ہوگا اسی قدر موثر و دلنشین ہوگا" ایسے مضامین کے ادا کرنے میں حضرت زکی مرحوم نے جو کمالات دکھائے ہیں وہ مندرجہ ذیل انتخاب سے نظروں کے سامنے آجائیں گے۔

جناب عباس میدان جنگ میں پہنچ گئے ہیں۔ اُن کے غم میں امام حسین کی بے تابی سے

بیٹھے ہیں خاک پر شہِ بیکس جھکائے سر
تھامے ہیں ایک ہاتھ سے دل ایک سے جگر
چہرہ ہے زرد ریشِ سفید آنسوؤں سے تر
رہ رہ کے دیکھتے ہیں بحسرت اُدھر اُدھر
ٹکڑے جگر ہے چاک دل ناصبور ہے
اُس گل کو ڈھونڈتے ہیں جو آنکھوں سے دور ہے

شکل نبی کو دیکھ کے کرتے ہیں یہ بیاں
آتے ہیں غش پدر کو سنبھالو پدر کی جاں
جھکو تو سوجھتی ہے زمیں اب نہ آسماں
دیکھو تو کس طرف ہے مرا شبر نوجواں
بیٹا کہاں شفیق امام غریب ہے
دریا کے پاس ہے کہ صفوں کے قریب ہے

جناب عباس علمبردار کی لاش پر امام حسین تشریف لاتے ہیں سے

ٹھنڈا جو ہوا رن میں علم فوج خدا کا
اور قصد بہشتی نے کیا ملکِ بقا کا
تڑپا دل بے تاب شہنشاہِ ھدیٰ کا
مقتل میں گئے سن کے پیغام قضا کا
دیکھا کہ لہو خاک پہ سقے کا بہا ہے
اک شیر ترائی میں پڑا لوٹ رہا ہے

شانوں کا لہو منہ پہ ملا اور یہ پکارے
بھائی کہو جیتے ہو کہ دنیا سے سدھارے
منہ موڑ چلے اے مرے جینے کے سہارے
بھیا مجھے اس غم نے کیا گور کنارے
ٹھنے نہیں دم بھر جو عدم کے سفری ہیں
اے ماہ جبیں ہم بھی چراغِ سحری ہیں

حضرت قاسم کی لاش پر۔ ماں بہن اور دلہن کے بین

ماں کے بین:۔

منہ رکھ کے منہ پہ بیٹے کے بولی بحال زار
اے لال تیرے چاند سے مکھڑے کے میں نثار
خاموش کس لئے ہو مرا دل ہے بے قرار
دیکھو تو آنکھ کھول کے ماں کر رہی ہے پیار
عزت مری زیادہ ہوئی آبرو ہوئی
ڈوبے جو تم لہو میں تو ماں سرخرو ہوئی

بہنوں سے کہہ دو آئیں جو ہے نیگ کی طلب
کمھلا رہا ہے دھوپ کے مارے یہ غنچہ لب
رخصت کریں عروس کو حضرت کہیں سبب
چڑھتی ہے دھوپ دیر کی ٹھنی نہیں ہے اب
رسموں کا دھیان ہے نہ دلھن کا خیال ہے
گرمی ستم کی ہے مرا بچہ نڈھال ہے

شانہ ہلا کے پھر یہ صدا دی بچشم تر
مجھ غمزدی کے حال پہ واری کرو نظر
طے کا ہے خیال نہ بچوں کی ہے خبر
جاگو کہ بے حواس ہے بیٹا تمام گھر
فرقت کا غم ہے سرورِ عالم پناہ کو
صدقے گئی سلام کرو اٹھ کے شاہ کو

ہے ہے نہ راس آیا تجھے تیر ہوا یہ بیاہ
ہے ہے ملا دھر عروج ہوا اور ادھر زوال
ہے ہے ہوا یہ بیاہ کا جوڑا لہو سے لال
ہے ہے مرے شہید کیا تجھ کو پائمال
صرفِ خزاں تمام مرادوں کے باغ ہیں
روشن رہیں گے دل میں صدا جو یہ داغ ہیں

بہن کے بین:۔

رو کر بلائیں لیتی تھی اور پیٹتی تھی سر
کہتی تھی ہائے اے مرے ماں جائے بیر
ہے ہے کلیجہ پھٹتا ہے صورت یہ دیکھ کر
یہ لاش ہے کہ چاند پڑا ہے لہو میں تر
غربت میں دم پہ بن گئی قسمت بگڑ گئی
ہے ہے حسن حسین کی کھیتی اجڑ گئی

بھیا مسافرت میں قضا ظلم کر گئی
بھائی ہوا شہید بہن کیوں نہ مر گئی
یہ کس طرح کا قہر ہوا کیا گذر گئی
بھیا نکل کے گھر سے سواری کدھر گئی
منزل کی ہے خبر نہ پتہ ہے مقام کا
بھیا کہاں ہے آج ارادہ قیام کا

رخصت کرو برات کو کیا شہ نے کہہ دیا
شربت براتیوں نے پیا یا نہیں پیا
بھیا کہاں کا قصد ہے اس دھوپ میں کیا
بھیا ابھی تو نیگ بھی میں نے نہیں لیا

۱؎ شعر العجم جلد ۳ صفحہ ۱۳ مؤلفہ شبلی نعمانی۔
۲؎ رسالہ المیزان مؤلفہ نظیر الحسن فوق

ماں جائے کو حرم میں لگا کے گلے چلوں
بھیّا چلو میں سائے میں آنچل کے لے چلوں

. . . .

نئی دلہن کے بین :-

گھونگھٹ الٹ کے لاش پہ سہرے کی تھی نظر | اور منہ پہ خاک مل کے یہ بولی بچشم تر
صاحب لٹوں گی یوں مجھے اس کی نہ تھی خبر | اک رات کی دلہن کو چلے کس پہ چھوڑ کر
کیا سو رہے ہو داد دو مجھ داد خواہ کی
صاحب بتاؤ اب کوئی صورت نباہ کی

ماتم کروں کہ لاش پہ آہ و بکا کروں | تازی دلہن ہوں سوگ کی کیونکر بنا کروں
دل میں تو ہے تڑپ کے قیامت بپا کروں | پر شرم سے زبان پہ ہے مُہر کیا کروں
دریا رواں ہے اشک کا چشم پر آب سے
صاحب میں بین کر نہیں سکتی حجاب سے

منظر یعنی سین[1]

کسی خاص واقعے یا کسی حالت کی تصویر کھینچنا جس کو انگریزی میں سین کہتے ہیں، واقعہ نگاری کی ایک قسم ہے عام واقعہ نگاری اور سین میں فرق ہے کہ واقعہ نگاری میں ہر واقعہ انفرادی حیثیت رکھتا ہے بخلاف اس کے سین اُس کیفیت کا نام ہے جو متعدد واقعات یا واقعہ کی متعدد جزئیات کے مجموعے سے پیدا ہوتی ہے۔"

نزع کی حالت۔ حضرت عباس کی نزع کی حالت

یہ کہہ کے سوئے مشک بحسرت نگاہ کی | آنسو بہائے آنکھوں سے اور دل سے آہ کی
دم اُکھڑا کرب نزع نے حالت تباہ کی | آواز آئی اشھد ان لا الہ کی
چُھریاں قضا کی دل پہ، کلیجے پہ چل گئیں
رنگت سفید ہو گئی آنکھیں بدل گئیں

تمام رفقا کی شہادت کے بعد حضرت امام حسین کی بیکسی

جب کربلا میں گلشن زہرا خزاں ہوا | ماتم کدہ مرقع باغ جہاں ہوا
جنت کو قافلہ شہدا کا رواں ہوا | یوسف نبی کی آل کا بے کارواں ہوا
بچھڑے رفیق مونس و غمخوار چھٹ گئے
حضرت پہنچ کے منزل آخر پہ لٹ گئے

[1] موازنۂ انیس و دبیر مصنفہ شبلی نعمانی

تمہارا ہا بتول کی آغوش کا پلا | مولائے کائنات ہوا مورد بلا
غربت میں پیش آیا جو آفت کا مرحلہ | مشتاق آب تیغ ہوا پھول سا گلا
سینے میں داغ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے
خوناب دل سے زخم جگر سب ہرے ہوئے

حضرت امام حسین کا میدان کربلا میں داخلہ۔ رفقا کی شان و شوکت اور گفتگو۔

مقتل میں سید الشہدا کا ورود ہے | شام سواد منزل آخر نمود ہے
ہر جا ظہور قدرت رب ودود ہے | حمد و ثنا کی دھوم سے شور درود ہے
ہیں گلعذار فاطمہ مہمان کربلا
پھولوں سے ہے بھرا ہوا دامان کربلا

نوبت کی وہ صدا وہ نشانوں کا اوج موج | وہ جزر و مد ہوا سے پھریروں کا مثل موج
پیدل وہ فرد فرد وہ اسوار زوج زوج | قربان بادشاہ و نثار شکوہ فوج
اک شور دور باش کا نزدیک و دور ہے
کیا شوکت ورود امام غیور ہے

وہ شبر ہیں کہ چشم نظارے سے ہو نہ سیر | کانٹے جہاں تھے جمع وہاں ہیں گلوں کے ڈھیر
خوش خوش ٹہل رہا ہے لب نہر کوئی شیر | کہتا ہے مست خاک اٹھائے کوئی دلیر
کھینچا ہے کربلا نے ہمیں کس تپاک سے
اُنس دلی ہے روح کو اس خاک پاک سے

کہتا ہے یوں کسی سے کوئی ہو کے شاد کام | سنتا ہوں ہے ولادت عیسیٰ کا یہ مقام
جاں بخش اس جگہ کی ہے آب ہوا تمام | مولودیاں کے مردے جلاتے ہیں یک کلام
بندے کو خاص رب جہاں آفریں کیا
اس خاک نے مسیح کو گردوں نشیں کیا

کہتا ہے نونہال حسن کیا بہار ہے | کس لطف کی زمیں ہے عجب سبزہ زار ہے
سامان جشن چار طرف آشکار ہے | ہر شے وہ خوشنما ہے کہ بس جی نثار ہے
نوشاہ حسن پھول ہر اک اس چمن کا ہے
غنچہ کا ہے حجاب کہ گھونگھٹ دولہن کا ہے

بولے نہ سپہر قین کہ تفریح ہے عجیب ہاں بڑھ چلو یہاں سے جنت بہت قریب
اک مشت خاک اٹھا کے یہ گویا ہوئے حبیب اے ابن بوتراب کے فدیو خوشا نصیب
یہ خاک ہے کہ آب رخ حور خلد ہے
سونگھو تو اس میں نکہت کا فور خلد ہے

تھے جستجوئے آب میں عباس ذی وقار خوش خوش پھرا دہاں سے وہ حیدر کا یادگار
کی عرض ہاتھ باندھ کے یا شاہ نامدار نہر فرات ہے یہیں دیکھ آیا جان نثار
کیا دل پسند آب و ہوائے لطیف ہے
قابل ملاحظہ کے وہ جائے لطیف ہے

فرمایا شاہ نے کہ مجھے اس کی ہی خبر بھائی مری نگاہ میں ہے سب خشک و تر
یہ کہہ کے سوئے نہر چلے شاہ بحر و بر ہمراہ سب ہوئے رفقا بھی ادھر ادھر
عاشق وہ سب تھے سبط رسالت مآب کے
تارے بھی ساتھ ساتھ چلے ماہتاب کے

پہنچے کنار نہر امام فلک جناب آئینہ بن گیا ہے دیدار سطح آب
پرتو فگن ہوا رخ دل بند بوتراب پایا زمیں پہ چشمۂ خورشید کا جواب
ابر کرم کے فیض کی اک دھوم پڑ گئی
موتی کی بھی صدف کی طرح آنکھ لڑ گئی

واقعہ نگاری "واقعہ نگاری اور سین میں یہ فرق ہے کہ واقعہ نگاری میں ہر واقعہ انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ بخلاف اس کے سین اس کیفیت کا نام ہے جو متعدد واقعات یا واقعہ کی متعدد جزئیات کے مجموعہ سے پیدا ہوتی ہے۔"

امام حسین زخمی ہو کر گھوڑے سے گرتے ہیں اور حضرت زینب خیمہ سے نکل آتی ہیں اس وقت کا دردناک سین ملاحظہ ہو۔

زہرا کی طرح رو رو کے کرتی ہوئی بیاں پہنچی قریب سبط پیمبر بصد فغاں
دیکھا گلے پہ تیر ستم اور لبوں پہ جاں ہے عین غش میں رخ سے عیاں موت کے نشاں
اک رخ لہو میں لال ہے اور اک زمیں پہ ہے
رکتا ہے دم اجل کا پسینہ جبیں پہ ہے
منکا ڈھلا ہے کان کی لو ہے پھری ہوئی زخم بدن میں ریگ بیاباں بھر گئی ہوئی
تن سرد، جی نڈھال، طبیعت گری ہوئی ہے ایک جان لاکھ بلا میں گھری ہوئی
جلاد پہلوؤں میں ہیں بالیں پہ موت ہے
سب صورتوں میں زیست کا مضمون فوت ہے

زینب کو جب یہ قہر کا ساماں پڑا نظر پھیلا کے ہاتھ بھائی سے لپٹی بچشم تر
چہرے سے گرد پاک کی زانو پہ رکھ کے سر کھینچا گلے سے تیر کلیجہ سنبھال کر
سچ ہے یہ حال دیکھ کے کس طرح کل پڑے
نکلا نہ تیر آنکھوں سے آنسو نکل پڑے
چلائی آب اشک چھڑک کر وہ دل فگار بے ہوش کیا ہو ہوش میں آؤ بہن نثار
ہمشیر کی صدا نے کیا دل کو بے قرار آنکھوں کو غش سے کھول دیا شہ نے ایک بار
روداد پر بہن کے برادر نے رو دیا
بھائی کے منہ کو دیکھ کے خواہر نے رو دیا

رزمیہ اردو شاعری میں اس کا فقدان تھا۔ میر ضمیر نے اس کی بنیاد ڈالی "وہ بالکل نقش اولیں تھا۔" مگر میر انیس اور مرزا دبیر نے اس کو اس قدر ترقی دی کہ اردو شاعری دنیا کی بہترین زبانوں کے پہلو بہ پہلو چلنے کے قابل ہو گئی۔ اگر یہ دو ہستیاں اس میدان میں قدم نہ رکھتیں تو یہ اس قابل بھی نہ ہوتی کہ دیگر زبانوں کے ساتھ اس کا نام بھی لیا جاتا۔

زکی مرحوم نے بھی اس صنف نظم پر خوب خوب طبع آزمائی کی ہے۔ اور ایسے نایاب مضامین نکالے کہ بے ساختہ منہ سے واہ نکل جاتی ہے۔

بہادروں کی آمادگی جنگ:۔

نیزہ ہلا ہلا کے پکارا کوئی دلیر ہاں صفدران لشکر اسلام کیا ہے دیر
بولا یہ کھینچ کر دم شمشیر کوئی شیر اے نو بہی تو ن کے ہوں پشتے سروں کے ڈھیر
چلایا کھینچ کر کوئی چلہ کمان کا
یہ تیر توڑتا ہے تو آسمان کا

آمد:۔

آمد ہے اُس جری کی جو ہے صفدروں میں فرد ضرغام رزم فارس جولانگہ نبرد
پرگرد و پرغبار ہے مینائے لاجورد ہے نیم رنگ و حیف کا رنگ آسماں کا زرد
مہتاب چھپ رہا ہے رخ آفتاب پر
گویا پڑی ہے اوس ستاروں کی آب پر
ریگ رواں ہے نہر تو آب رواں سراب جاں باختہ بھنور ہیں سراسیمہ جباب
حیرت سے دیکھ کر یہ تلاطم یہ اضطراب زہرے ہوئے ہیں مردم آبی کے آب آب
ہیں مائل فرار محافظ فرات کے
دریا بھی چاہتا ہے بہے راہ کاٹ کے

جھک جھک کے سطحِ خاک میں چھپتا ہوا آسماں
ہل ہل کے کوہسار بھی کہتے ہیں الاماں
ڈر ڈر کے جی چھپاتے ہیں جنگ آزما جواں
مڑ مڑ کے تیر ڈھونڈتے ہیں گوشۂ کماں

بڑھ بڑھ کے سدِّ راہ ہوں وہ شاطر ہیں نہیں
تھم تھم کے چل رہی ہے ہوا یہی دم نہیں

حملہ کا زور شور اور فوجوں کی ہلچل :-

اٹھا جو شہ نے بہر وغا آستین کو
دیکھا اجل نے ڈر کے یسار و یمین کو
حاصل ہوا فراقِ مکاں سے مکین کو
کانپے یہ کوہسار کہ چھوڑا زمین کو

بحرِ محیطِ قہرِ خدا موج زن ہوا
زندوں کے تن پہ جامۂ ہستی کفن ہوا

جنبش ہوئی زمین کو تھرائے آسماں
سینوں میں قلب گور میں مردے ہوئے طپاں
اعضا سے زورِ جسم سے جانیں ہوئیں رواں
گہہ الحذر کا غل ہوا گہہ شورِ الاماں

دم میں ہوائے کبر سروں سے نکل گئی
خورشید کو زوال ہوا دھوپ ڈھل گئی

دہشت سے عرش مثلِ زمیں کانپنے لگا
ذروں کی طرح مہرِ مبیں کانپنے لگا
سنگیں دل سپاہ حسیں کانپنے لگا
ایسا نہ تھا کوئی کہ نہیں کانپنے لگا

سوجھی نہ جائے امن کہیں اضطراب میں
دریا سمٹ کے آ گیا جامِ حباب میں

گھوڑا اور تلوار :-

گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں میر انیس اور مرزا دبیر نے خوب خوب زورِ قلم دکھایا ہے جس کے بعد ان موضوعات پر قلم اٹھانا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں رہی لیکن زکی مرحوم نے گھوڑے اور تلوار کی تعریفوں میں جس دلکش انداز سے خامہ فرسائی کی ہے وہ بے نیازِ تعریف ہے۔ مرحوم نے ان کی تعریفوں میں خاص زورِ طبیعت دکھایا ہے۔ نئے اور پیارے انداز سے جولانیٔ طبع دکھائی ہے۔ اسلوبِ بیان کے ساتھ مبالغہ کا زور، جدتِ تخیل کے ساتھ کلام کی بلاغت، دقیقہ رسی کے ساتھ بحرِ فصاحت کی موج زنی، یہ وہ سحر کاریاں ہیں جنہوں نے ان کے کلام کو سراسر اعجاز بنا دیا ہے

تلوار لعینوں پہ بپھرتی ہوئی نکلی
اک شاہزہ پری تھی کہ نکھرتی ہوئی نکلی
تن تن کے نظر فوجوں پہ کرتی ہوئی نکلی
دم مرگِ مفاجات کا بھرتی ہوئی نکلی

منظور لگاوٹ ہوئی لیلیٰ عرب کو
پیغام صفائی کا دیا کھنچتے ہی سب کو

غل پڑ گیا جانوں کی خریدار وہ نکلی
نا طورۂ خونشیر و طرحدار وہ نکلی
گردن کش و لشکر کش و خونخوارہ نکلی
آتش زن ہنگامۂ پیکار وہ نکلی

ہوتے ہیں شرارے تنِ گرد سے پیدا
لو آگ ہوئی عرصۂ ناورد سے پیدا

تھا شور تب و تاب میں ہر جنِّ ملک ہے
یہ قہرِ قیامت ہے کہ جلاد فلک ہے
سینوں میں تو یہ سوز ہے زخموں میں چمک ہے
گر ہے یہی گرمی تو سما ہے نہ سمک ہے

بجلی پہ ہے بالا یہ عجب برقِ جہاں ہے
گردوں بھی اسی آتشِ سوزاں کا دھواں ہے

. . . .

سینے میں جو ڈوبی دلِ بیتاب میں پہنچی
تالاب سے مچھلی چہ سیماب میں پہنچی
زرہوں کے ہر اک دیدۂ پُر آب میں پہنچی
موجوں سے گزرتی ہوئی گرداب میں پہنچی

گھبرائی نہ ظلمات میں ذوالنون کی صورت
رگ رگ میں غرض دوڑ گئی خون کی صورت

گھوڑا :-

وہ سازوہ یراق سمندِ صبا شتاب
ناوک کنوتیاں تھیں فلاخن کہ اک کا ب
ہیکل وہ چار آئنہ کی جس میں آب و تاب
پاکھر زرہ تھی، زین جیلنہ کا تھا جواب

رہوار تھا کہ قہر کا دریا تھا جوش پر
تھی یال یا کمند تھی رستم کی دوش پر

گلگوں برنگِ نکہتِ گلشن رواں ہوا
بادِ سحر چلی کہ وہ توسن رواں ہوا
ہُدہُد اٹھا کے ناز سے گردن رواں ہوا
گویا براقِ عرش نشین رواں ہوا

دامانِ زیں سے نیز پری کے اثر کھلے
ایسی ہوا بندھی کہ نہ پریوں کے پر کھلے

کس قہر کی آمد ہے غضب جلوہ گری ہے
رہوار نہیں شبیر کے پرنٹے میں پری ہے

سید شاہد حسین رضوی

غزل

لائے گی رنگ آپ کی یہ دل لگی کچھ اور
بڑھ کر رہے گی اب مری آشفتگی کچھ اور

مجھ پر کھلیں گے اور ابھی رازہائے عشق
دل کو ملے گی لذتِ بےچارگی کچھ اور

میری حیات عشق سے ہے تمہید انبساط
جلوے دکھائے گی مجھے خود رفتگی کچھ اور

ان کی طرف ہے چشم سخن گو دم اخیر
اس کے سوا نہیں اثر زندگی کچھ اور

ہاں اے خیال، دوست دکھا دوست کو دکھا
باقی کچھ اور ہے ہوس بندگی کچھ اور

رہنا نہ اتنا دور میں اس جلوہ گاہ سے
اے کاش ابھارتا غم افتادگی کچھ اور

وعدے یوں ہی جو کرتے رہیں گے وہ نو بہ نو
حاصل کروں گا میں طربِ زندگی کچھ اور

منظور اک نگاہ طرب سوز کے سوا
دیکھا نہ ہم نے حاصل شرمندگی کچھ اور

علی منظور حیدرآبادی

سوز ناتمام

خزاں کی ایک بے کیف رات میں ہوا درختوں کی بے برگ اور خشک شاخوں سے بین کرتی ہوئی گزر رہی تھی۔ میں خلاف معمول رات کے دو بجے بھی جاگ رہا تھا۔ دراصل تمام دن میں نے بے چینی میں گزارا تھا اور اب تخیلات کے سمندر میں ڈوبا ہوا کہیں کا کہیں بہتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ کبھی مجھے والد سے آخری گفتگو کا خیال آتا تھا اور کبھی اپنے مستقبل پر نگاہ چلی جاتی تھی۔ میں ایک مصنف کی حیثیت سے دنیا میں روشناس ہو چکا تھا لیکن مجھے وہ کامیابی نصیب نہ ہوئی تھی جس کی آرزو ہر مصنف کے دل میں قدرتاً موجود ہوتی ہے۔ کیا طاہر کا خیال واقعی درست تھا "تم نفسیات سے کبھی واقف نہیں ہو سکتے جب تک نہیں کسی . . . کا مطالعہ کرنے کا موقعہ نہ ملے"۔ . . . کسی عورت . . . کے مطالعہ کرنے کا موقعہ . . . آخر میں انہیں خیالات میں کھویا ہوا نیند سے ہم آغوش ہو گیا۔

دن ایسے ہی گزرتے چلے گئے۔ مطالعہ نے مجھے ہر وقت مصروف رکھتا تھا۔ میری دنیا میرے گھر میں کتابوں سے لدی ہوئی الماریوں میں موجود تھی۔ بڈھا کلن گو مجھے وقت پر کھانا تیار کر دیتا تھا، لیکن کمبخت سارا دن ایسا غائب ہوتا تھا کہ مجھے کئی دفعہ اس پر مر جانے کا شبہ ہوتا۔ البتہ رات میرے لئے آفت تھی۔ پریشان خیالات کا ہجوم میرے گرد و پیش منڈلانے لگتا تھا۔ میں نہیں سمجھ سکتا تھا کہ آخر میری بے چینی کی وجہ کیا ہے۔ مجھے کلن سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن اس کی غیر حاضری سے ضرور دلچسپی ہو گئی۔ ایک شب کوئی گیارہ بجے ہوں گے مجھے یوں ہی خیال آیا کہ آج اس سے اس کے مشاغل کی بابت پوچھنا چاہئے۔ چنانچہ میں نے اُسے فوراً آواز دی . . . لیکن صدائے برنخواست۔ ایک۔ دو، تین، آخر میں ضبط نہ کر سکا جی میں آیا کہ اس کو پیٹ ہی تو دوں گا۔ اٹھ کر اس کے کمرے میں گیا دیکھا تو حضرت غائب۔ طبیعت پہلے ہی منغض تھی، اور بھی زیادہ پریشان ہو گئی آخر وہ کہاں گیا تھا اور تمام دن کہاں رہتا ہے۔ جس جگہ میں نے مکان لے رکھا تھا وہ شہر سے شمال کی جانب عیدگاہ کے قریب پہاڑ کے دامن میں تھی اور شہر سے قریباً ایک میل کے فاصلے پر۔ مجھے قدرتی طور سے اس کا سراغ لینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن وہ حضرت ایسے نہیں تھے کہ بغیر رسید کے واپس آ جائیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں کب سویا لیکن اتنا ضرور ہے کہ گھڑی نے دو میرے سامنے بجائے تھے۔ میں سحر خیز نہیں ہوں اور صبح آٹھ بجے سے پہلے نہیں اٹھ سکتا۔ فرائض کی ادائیگی میں کلن نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ چنانچہ دوسرے دن بھی جب گھڑی نے ٹن سے آٹھ بجائے اس نے اپنی تھوتھنی دروازے سے نکال کر کہا "سرکار چائے حاضر ہے"۔ مجھے یکایک رات کا معاملہ یاد آ گیا اور میں نے گرج کر کہا۔ "رات کہاں تھا مکار"۔ "سرکار کار رتوال گیا تھا۔ دردانہ . . ." "کیا بکتا ہے بولتا کیوں نہیں (حالانکہ ابھی اُس نے اپنا فقرہ بھی ختم نہیں کیا تھا) میری درشتی پر وہ بالکل خاموش ہو گیا۔ میں بھی خاموش ہو رہا۔ مجھے اس کے افعال سے کیا واسطہ تھا۔ کھانے کے وقت مجھے پھر کچھ پوچھنے کی ترغیب ہوئی لیکن خلاف مصلحت سمجھ کر چپ ہو رہا اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ رات کے وقت تمام ناچا پھر میری آنکھوں میں پھر گیا۔ میں نے اپنے آپ کو کسی اور خیال میں گم کرنا چاہا۔ انسان ابتدائی منازل سے کس طرح گزرا؟ پیغمبر اب کیوں نہیں آتے؟ انسان اتنا مکمل ہو چکا ہے کہ اب اُسے اس کی ضرورت نہیں پیغمبر۔ کیسا مضحکہ خیز خیال ہے، جنگ! مجھے تو اس کے نام سے خوف آتا ہے۔ یہ لوگ کیوں لڑتے ہیں۔ جوع الارض۔ کلن!!! میں نے بے ساختہ آواز دی! "سرکار۔ حاضر ہوا"۔

جس وقت وہ نگاہیں نیچی کئے سر جھکائے ہاتھ باندھے میرے سامنے کھڑا تھا مجھے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے دل میں کس قدر ہیجان ہے۔ میں نے نہایت ملاطفت سے پوچھا "کلن تم کہاں غائب رہتے ہو۔ اگرچہ مجھے اس بات کا کوئی حق نہیں کہ تمہاری سرگرمیوں میں دخل دوں لیکن پھر بھی تمہارے آقا کی حیثیت سے پوچھنا میں اپنا فرض

خیال کرتا ہوں کہ تمہاری مجھ سے اشت کروں۔ دیکھو تمہاری عمر کا انسان اگر کوئی غلطی کرے تو قابلِ معافی نہیں۔"

کلن نے مجھ سے صرف اس قدر کہا "سرکار!" معلوم ہوتا تھا کہ آگے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے اور نہیں کہہ سکتا۔ میں نے اسے بیٹھ جانے کا حکم دیا اور یقین دلایا کہ سچ سچ کہہ دینے پر میں اسے سب کچھ معاف کر دوں گا اس نے بیان کرنا شروع کیا "سرکار آپ جانتے ہیں میں مجرد ہوں۔ تمام عمر کبھی عورتوں کے دام میں نہیں پھنسا۔

لیکن جب سے یہاں آیا ہوں۔ کارنیوال میں جاتا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ میں تباہ ہو رہا ہوں۔ لیکن پھر بھی چلا جاتا ہوں صرف دردانہ کو دیکھنے کے لئے۔"

آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ مجھے اس بوڑھے لنگور کی حالت پر رحم آیا اور میں نے کہا "وہ دردانہ کون ہے"۔ کہنے لگا "سرکار مجھے معلوم نہیں لیکن میں اپنے دل میں ایک زبردست خواہش محسوس کرتا ہوں کہ میں اس کی بھی خدمت کروں جس طرح سرکار آپ کی خدمت کر رہا ہوں۔ اگر آپ اسے اپنے گھر میں لے آئیں تو . . . "

اس کی اس بات پر میں جل ہی تو گیا اور جل کر کہا۔ "دور ہو کمبخت" اس کے چلے جانے کے بعد میں ایک خواب کے عالم میں تھا۔ ظاہر بے وقوف ہے جو کہتا ہے کہ نہیں عورت کے مطالعے کی ضرورت ہے۔ شیکسپیئر نے تو اسے اس قدر وضاحت اور اختصار سے بیان کر دیا ہے کہ اور کسی بات کی ضرورت ہی نہیں۔ ہاں "کمزوری تیرا نام ہی تو عورت ہے"۔ اذیت دہ خیالات میں گم ہو کر میں سو رہا۔ سارا دن نہایت اطمینان سے میں نے کام کرنے میں گزارا۔ "ولز کی کتاب ختم کرنے کے بعد میں بھی اپنی نئی تصنیف میں مشغول ہو جاؤں گا۔" "عجز و عبودیت کوئی اچھا نام نہیں"۔ "اعترافِ شکست" اس میں کونسی رعنائی ہے"۔ دردانہ! اف میرے خدا"۔ رات ابھی آئی ہی نہیں اور بستر کے کانٹے جسم و روح کو چھلنی کئے دیتے ہیں۔ آج میں خیالات کو شکست دوں گا۔" مجھے کلن کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ اسے آواز دی اور اس نے دیسی آم کی چوسی ہوئی گٹھلی کی طرح شکل دکھائی۔ "سرکار"۔

"تم کبھی سرکار! چلو کارنیوال چلیں" "مگر سرکار"۔ "جلد تیار ہو جاؤ میں بھی کپڑے پہنتا ہوں اور برق جیسی سرعت کے ساتھ میں بستر سے اچھلا اس نے مجھے کپڑے پہنائے اور میری فلٹ اور چھڑی میرے ہاتھ میں دے دی۔ کارنیوال چھاؤنی کی جانب تھا اس لئے تھوڑی دور پیدل چل کر ہمیں گاڑی لینی پڑی۔ کلن تمام راستہ ساکت و صامت "صمٌ بکمٌ" بنا بیٹھا رہا اور جس وقت کارنیوال کی روشنی ہمیں دور سے دکھائی دی میں نے محسوس کیا کہ اس کے یخ بستہ جسم میں ارتعاش پیدا ہو گیا ہے۔ کارنیوال میں بے حد رونق تھی۔ کلن مجھے کھینچ کر لئے جا رہا تھا۔ نسبتاً ایک کم رونق جگہ پرے جا کر مجھے اشارہ کیا کہ سرکار اس کمرے میں تشریف لے چلئے۔ اندر جا کر مجھے معلوم ہوا کہ دراصل یہی جگہ کارنیوال کا دل ہے۔ داؤ لگ رہا تھا اور ہم دونوں ایک کونے میں بیٹھ کر حاضرین کی دلچسپی کا جائزہ لے رہے تھے۔ کلن نے گھنٹی بجائی اور چھوکرے کے آنے پر چائے کی فرمائش کر دی۔ اگرچہ ہم تماشائی کی حیثیت میں تھے۔ لیکن میرے دل کا اضطرار ہر لحظہ زیادہ ہو رہا تھا۔ چائے لانے والی چھوکرے کے بجائے ایک لڑکی تھی اور غالباً یہی دردانہ تھی۔ اس نے آتے ہی کلن کی طرف دیکھا اور پھر جھک کر مجھے سلام کیا

اس کی صورت حد درجہ متوحش نظر آتی تھی اور اس کا رنگ گلاب کی کھلائی ہوئی پتی کی طرح بے رونق تھا۔ برف کی سی سفیدی اس کے نیم برہنہ بازوؤں اور مرمریں گردن سے نمایاں تھی۔ وینس کا مجسمہ اس قدر متناسب الاعضا نہیں ہوگا جتنا اس غمزدہ لڑکی کا جسم تھا۔ میری نگاہیں اس پر جم کے رہ گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مجھے اس سے ہمدردی پیدا ہو گئی ہے۔ اس نے چائے کا سامان میز پر رکھ دیا اور خاموش واپس چلی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی ہرن نیند ہی نیند میں چل رہا ہو۔ "کلن یہ لڑکی کون ہے۔ اس قدر غمگین کیوں ہے" میں نے مڑ کر سے پوچھا "سرکار خاموش رہئے۔ یہی دردانہ ہے اور صرف اس کی دید کی خاطر اتنے لوگ اپنی جیبیں خالی کر رہے ہیں۔ مجھے اب تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ کون ہے۔" ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد دردانہ اس کمرے میں بھٹکے ہوئے غزال کی طرح آتی تھی اور ملول و پژمردہ واپس چلی جاتی تھی۔ غالباً یہی اس کے مالک کا حکم تھا کہ خمارِ دلبستگی کبھی زائل نہ ہو۔ میں نے کئی دفعہ کوشش کی کہ اسے اپنی طرف متوجہ کروں۔ لیکن بلور کی آنکھوں کی طرح شاید ان میں دید کی طاقت ہی نہ تھی۔ وہ کسی کی طرف بھی متوجہ نہ ہوتی تھی۔ اس رات کے بعد میرا معمول ہو گیا کہ ہر شب وہاں چلا جاتا لیکن سوائے حسرت و یاس کے اس کے قلبِ محزوں میں مجھے کچھ دکھائی نہ دیتا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس کی تہ تک پہنچ جاؤں۔ لیکن

میری زبان کو تاب گویائی نہ تھی۔ اب اسے بھی یقین ہو گیا تھا کہ یہ مستقل گاہک ہے۔ ایک دن اس نے پوچھا آج آپ دیر سے تشریف لائے ہیں۔ مجھے اس روز دیر ہو گئی تھی "تو تم میری منتظر تھیں"۔ "نہیں آقا ہم لوگ اپنے سرپرستوں کا ضرور خیال رکھتے ہیں"۔ "میں تو صرف تمہارے لئے آجاتا ہوں۔ آخر تم ہو کون اور اس قدر المناک کیوں ہو؟" جیسے کسی نے سویا ہوا فتنہ بیدار کر دیا ہو۔ اس کے برفانی چہرے پر ایک چمک نمودار ہوئی اور شرارے کی طرح چشم زدن میں ماند پڑ گئی۔ "آقا آپ کی ہمدردی کا شکریہ! قدرت نے عورت کو محتاج ہی پیدا کیا اور اسے ہمیشہ کسی نہ کسی کی محتاج ہی رکھتی ہے"۔ اس کی آواز بھرا سی گئی جلد ہی اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کہنے لگی "آقا قید انسان بری بلا ہے"۔ وہ تو چلی گئی اور مجھے تفکرات کے بحر بے پایاں میں غوطہ دے گئی۔ "قید انسان! قید ہونا اور قید کرنا دونوں اذیت دہ ہیں۔ محبت میں یا دشمنی میں . . . قید کتنی تکلیف کا باعث ہے۔ غلامی ابدی غلامی۔ غلام بنانے والا ہمیشہ ہی خوش اور غلام ہمیشہ ناخوش۔ جب تک کوئی روئے نہیں دوسرا ہنس نہیں سکتا۔ ایک کی تکلیف سے ہی دوسرے کو راحت مل سکتی ہے"۔ انہیں خیالات میں میں نے تمام شب گزار دی۔

دوسری شب میں نے اس سے کہا "دردانہ میں کل نہیں آؤں گا۔ اگر تم اپنی کیفیت بتا دیتیں تو شاید تمہارے لئے میں کچھ کر سکتا۔ اگر تمہیں مجھ سے کسی امداد کی ضرورت ہو تو کہہ سکتی ہو"۔ اس کے جواب میں اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک پڑے اور اس نے خدا معلوم دل کی کن گہرائیوں سے کہا "یہ سہارا بھی ٹوٹ گیا" اور چلی گئی۔ اس کے الفاظ نے میرے دل پر سخت چوٹ لگائی جیسے مجھے کسی نے خواب سے چونکا دیا ہو۔ اب میں اس کے لئے رحم ہی نہیں محبت بھی محسوس کرتا تھا۔ اس کے دوبارہ آنے پر میں نے اسے تشفی دی اور کہا "صبح چار بجے کل اس کمرے کی پشت پر آ جانا۔ اگر تم میرے پاس آ جاؤ تو اس اندوہ سے نجات مل سکتی ہے"۔ اس نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ میں جلد ہی گھر چلا آیا اور سوچنے لگا کہ اسے یہ کیا دعوت دے آیا ہوں۔ خود کردہ را علاجے نیست۔ طوعاً و کرہاً میں نے کلن کو اس بات سے آگاہ کیا۔ میرے حکم پر وہ کانپ ہی تو گیا لیکن مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ خوش بھی ہے۔ پانچ بجے صبح دردانہ میرے کمرے میں تھی لیکن اس حالت میں کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ "ان لوگوں کو معلوم ہو جائے گا تو وہ کیا کریں گے"۔ ہمیں یہ خیال پریشان کئے دیتا تھا۔ اس کے حالات معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ ابھی وہ بچہ ہی تھی کہ ان ظالموں کے پالے پڑ گئی۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ یہاں کیسے لائی گئی ہے خواب کی طرح اسے یاد تھا کہ اس کے والدین نہایت دولتمند تھے اور غالباً وہ کسی نہایت اونچے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور یہاں غالباً اغوا کر کے لائی گئی تھی۔ اس سے زیادہ وہ مجھے کچھ نہ بتا سکی۔ شام کو حسب معمول میں کارنیوال پہنچا۔ چائے طلب کی۔ خدمتگار سے پوچھا وہ چھوکری کہاں ہے۔ کہنے لگا حضور وہ بیمار ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں نے پولیس میں خبر نہیں دی۔ کیونکہ الٹا انہیں خود پھنسنے کا اندیشہ تھا۔ ایک ہفتہ تک متواتر میں وہاں جاتا رہا تا کہ حالات سے باخبر رہوں۔ وہاں کی بساط الٹ چکی تھی۔ رونق کا دور ختم ہو چکا تھا۔ اس کے بعد میں نے بھی جانا چھوڑ دیا۔

جیسے کسی نرم و نازک پھول کے پودے کو تمتماتی دھوپ سے اٹھا کر سائے میں رکھ دیا جائے۔ بعینہ یہی حالت دردانہ کی ہوئی۔ اگرچہ وہ مجھے آقا کہتی تھی اور میری ہر آسائش کا خیال رکھتی تھی لیکن مجھے یہ اعتراف کرنے میں ذرا تامل نہیں کہ اسے مجھ سے انس بھی تھا۔ مجھے کتابوں سے عشق ہے اور بس لیکن حسن نگاہ سے کون نفرت کر سکتا ہے۔ وہ میرے کتب خانے میں کھڑکی کے سامنے جس میں پھولدان رکھے تھے کرسی بچھا کر بیٹھ جاتی تھی اور پڑھنے لکھنے میں مشق بہم پہنچاتی تھی۔ بارہا ہماری نگاہیں کتابوں سے اٹھ کر دوچار ہو گئیں اور اس کے لب لعلیں سے تبسم کی جھلک نمودار ہو کر اندر ہی اندر جذب ہو گئی۔ غالباً وہ مجھے آقا کی حیثیت سے دیکھتی تھی اور چاہتی تھی کہ اپنے جذبات کے اظہار میں جس قدر اخفا سے کام لے سکے لے۔ میں کوئی اندھا تو ہوں نہیں۔ طاہر کی نصیحت کے مطابق اب میں انسانی مطالعے میں مشغول تھا۔ لیکن اس میں اس قدر کھو گیا کہ سب کچھ بھول گیا۔ محبت بیکاری کا بہترین مشغلہ ہے لیکن وہ لوگ جنہیں دنیا میں کوئی کام کرنا ہے اس سے دور ہی رہیں تو اچھا ہے اور میں بھی تو ایک بہترین مفکر اور مصنف کی حیثیت سے جلوہ گر ہونے والا تھا اس لئے اس کھیل سے مجھے بھی پرہیز ہی لازم تھا۔ لیکن ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

کیوپڈ تیر چلاتا ہے اور شکار کو اسی وقت پتا چلتا ہے جب صیاد اسے

فتراک سے کس کر باندھ لیتا ہے۔ خلوت کی آب و ہوا محبت کی آبیاری کے لئے بہت راس ہے اور یہی وجہ تھی کہ نخلِ الفت بے روک ٹوک بڑھتا اور پھلتا پھولتا گیا۔ اب ہم دونوں کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر کتابِ قدرت کا مطالعہ کیا کرتے۔ شام کے وقت پہاڑی پر سورج کے غروب ہونے کا نظارہ عجیب دلکشا ہوتا۔ چاندی اور سونے کے محلات تعمیر ہو ہو کر رات کی تاریکیوں میں غائب ہو جاتے۔ صبح صبح نسیمِ شمال آ کر ہمیں بیدار کرتی۔ کائنات پر شباب جلوہ پاشی کر رہا تھا۔ قدرت کی ہر شے جوان تھی۔ غم والم کا سایہ چھٹ چکا تھا۔ وہی نگاہ جو کبھی ٹنڈ منڈ درختوں پر جا کر ناکام واپس آ جاتی اب ان کی سرسبزیوں میں جا کر الجھ جاتی تھی۔ پرندے گیت گا کر خوابیدہ روح کو پیغام بقا دیتے تھے میں کتاب لکھنے میں مصروف تھا اور اسرارِ کائنات عریاں ہو کر میرے سامنے مصروفِ رقص تھے۔

دن گزر جاتے ہیں لیکن اپنے نہ مٹنے والے اثرات چھوڑ جاتے ہیں میری بیکلی اور بے چینی خوشگوار اور امید افزا تخیلات میں تبدیل ہو چکی تھی لیکن ایک قوت ناممکن البیان قوت مجھے اپنی طرف کشاں کشاں لئے جاتی تھی۔ اف کس قدر زبردست تھی وہ کشش جس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

میں اپنی روح کی والہانہ سرگشتگیوں میں محو تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اُس پیکرِ جاذبیت میں کس قدر ہیجان و تلاطم برپا تھا۔ میرے لئے شاید میرے ہی دل کی کایا پلٹ چکی تھی لیکن در اصل دردانہ کے دردمند دل میں بھی ایک رنگیں امنگ ایک حسین آرزو جلوہ گر تھی۔ جس کا احساس مجھے اس طرح ہوا۔

ایک شام جبکہ میں تخیلات کی بلندیوں پر محوِ خرام تھا۔ دردانہ میرے پہلو میں آرام کرسی پر دراز تھی۔ کبھی کبھی کنکھیوں سے میں اس کی طرف دیکھ لیتا۔ کسی وقت اس کا چہرہ شفقِ بہار کی طرح تمتما اٹھتا اور کبھی دستبردِ خزاں سے تاراج شدہ آخری برگِ گل کی طرح زرد معلوم ہوتا اس کے دل میں امید و بیم کا پرجوش قلزم موجزن تھا جو نہ معلوم اسے کنارِ عافیت پر پہنچا دیتا یا عین لبِ لعلِ تشنۂ حیات رکھتا۔ قدرت کا دل ربا و حسین منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ سامنے پہاڑ کی چوٹیوں پر زمردیں قصر تعمیر ہو رہے تھے اور شفق کے گوناگوں رنگ ان پر سنہری اور زرد بیل گل کاریاں کر رہے تھے۔ کبھی پارہ ہائے ابرِ پیلِ دماں کی صورت دکھائی دیتے اور کبھی افقِ آتشیں پردۂ نگاہ پر چھا جاتی۔ اس حیرت انگیز و دلنشین لمحہ میں مجھے دردانہ کی موسیقیوں میں غرق آواز سنائی دی۔ "آقا میں آپ سے شرفِ ہمکلامی حاصل کر سکتی ہوں"۔ چنگ و رباب کے نغموں سے لبریز تار کو چھیڑنے سے جو چوٹ دل پر لگتی ہے۔ وہی میرے دل پر لگی۔ میں نے کہا "کہو دردانہ کیا بات ہے" "آقا میں آپ کی کنیز بن کر تا عمر آپ کی خدمت گزاری کا شرف حاصل نہیں کر سکتی؟" میرے دل و دماغ پر بجلی سی کوند گئی۔ مجھے فیصلہ کرنا تھا کہ متاہل زندگی کی تاریکیوں میں کود جاؤں یا آزاد و دلفریب ہواؤں سے لطف اندوز ہوں میری آئندہ توقعات کامیابی نے مجھے اس بات پر مجبور کر دیا کہ میں گرست کے بندھنوں میں جکڑا جانے کی بجائے ہمیشہ شبابِ بہارِ زندگی سے ہمکنار رہوں۔ لیکن فیصلہ یہ کرنا تھا کہ آیا مجھے دردانہ سے محبت نہیں تھی؟ تھی اور والہانہ لیکن میرے دل و دماغ کو محبت نے مختل نہیں کر دیا تھا اور خدا کا شکر ہے کہ میں ابھی بقید ہوش و حواس تھا۔ میں نے جواب دیا "دردانہ بچوں کی سی باتیں نہیں کیا کرتے"۔ اس کے بعد موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ میری نگاہیں سامنے درختوں پہ جمی رہیں اور کچھ دیر کے بعد دردانہ اٹھ کر چلی گئی۔

رات کا کھانا بھی خاموشی میں ہی تمام ہوا۔ بے وقوف کلن راز خموشی معلوم کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا کہ ضرور معاملہ کچھ بے طور ہے۔ رات میری بے چینی حد سے گزر گئی۔ لیکن میں نے جو کچھ کیا تھا اپنی بہتری کے لئے کیا تھا۔ مجھے اس پر پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ عقل و شعور مجھے تسلیاں دے دے کر اور تھپک تھپک کر سلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن کسی کروٹ چین نہ پڑتا تھا۔ معلوم نہیں میں کس وقت سویا۔ صبح کلن کی زبانی معلوم ہوا کہ دردانہ جا چکی ہے۔ میرے دل میں غصے اور محبت کی آگ بھڑک اٹھی۔ لیکن میں کیا کر سکتا تھا۔ عقلِ پختہ کار نے کہا تجھے اس ناپسند کھیل سے کیا غرض تھی جو تیرے مستقبل کے لئے مضرت رساں تھا۔ کلن نے کہا "حضور وہ وہیں چلی گئی ہو گی۔ میں نے ڈپٹ کر کہا۔ خاموش نامعقول"

اس کے بعد میرے شب و روز الم و اندوہ میں گزرنے لگے۔ میرے مشاغل بے کیف رہ گئے۔ میں کام کرتا تھا لیکن بغیر شوق و تجسس کے ایسے معلوم ہوتا تھا کہ میں بغیر روح کے کام کر رہا ہوں۔ جس طرح پھولوں کی خوشبو ضائع ہو جانے سے وہ پھیکے پھیکے معلوم ہوتے ہیں

بعینہٖ یہی میرے پژمردہ دل کی حالت تھی۔ سکون و سرور ناپید ہو چکے تھے۔ لیکن اس پر بھی دن گزر جاتے ہیں۔ میرے بھی دن گزرتے جاتے تھے۔ اب میں نے سیر و تفریح بالکل چھوڑ دی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ کتابوں میں ہی پڑا رہوں۔ اگرچہ یہ میری رفیق زندگی تھیں لیکن استعداد یگانگت و انبساط سے بے بہرہ تھیں۔ انسان۔ انسان ہی ہے۔ خواہ کتنا ہی مصروف ہو اکیلے اکتا ہی جاتا ہے۔ مجھے اگرچہ اپنی طبیعت پر مکمل اختیار حاصل تھا لیکن وہ آوارہ اور آزاد ہونے کے لئے بے قرار تھی۔

بے سکون راتوں کے گزرنے پر بھی میں عنانِ عقل و شعور سنبھالے ہوئے تھا۔ لیکن دردانہ کے چلے جانے کے پورے ایک ماہ بعد مجھے دیوانگی کا پہلا دورہ ہوا۔ رات گیارہ بجے کے قریب میری طبیعت حد درجہ افسردہ اور نڈھال تھی۔ گریبان چاک کرنے اور دیوانہ وار جنگل میں چلے جانے کو جی چاہتا تھا۔

عقل و ہوش نہ معلوم کہاں ہجرت کر گئے تھے۔ میں چپ چاپ اٹھا کوٹ پہن کر چھڑی ہاتھ میں لی اور کلن کو بتائے بغیر نکل کھڑا ہوا۔ مجھے میرے پاؤں مقناطیسی قوت کے ساتھ آفندی کے ہوٹل کی طرف کھینچ رہے تھے۔ اس کشش کے مقابل جو مجھے ادھر لئے جا رہی تھی میں بالکل بے بس تھا۔ خیالات خوابِ پریشان کی طرح ناپید تھے اور میں مشین کی طرح حرکت کر رہا تھا۔ میں ہوٹل میں داخل ہو گیا اور اپنی پرانی نشست کی طرف بڑھا۔ وہاں ایک نوعمر خوش پوش چھوکرا جاگزین تھا ناچار مجھے ایک اور خالی نشست پر بیٹھنا پڑا۔ میں پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ہر چیز کی طرف تکتا تھا لیکن دیکھتا کچھ بھی نہیں تھا۔ چھوکرے نے آ کر پوچھا "حضور چائے چاہیئے"۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ چپ چاپ چلا گیا اور چائے کا سٹ میرے سامنے لا کر رکھ دیا۔ میں نے پیالی تیار کی۔ بھاپ کے بادل پیالی میں سے اٹھ رہے تھے اور میری نگاہیں انہیں میں کھوئی ہوئی تھیں۔ مجھے معلوم نہیں میں کتنی دیر اسی طرح بیٹھا رہا۔ جس وقت میں اپنے خواب سے بیدار ہوا دردانہ اسی نوخیز لڑکے کے پاس کھڑی تھی۔ وہ اس کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ امید و بیم اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے نمایاں تھے۔ میں نے محسوس کیا اس کی نگاہیں بہت تیز ہیں۔

دردانہ بے پروایانہ انداز سے کھڑی تھی۔ اسے اس کی کچھ پروا نہیں تھی کہ کون اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ بہار کی اولیں صبح کی اولیں کلی کی طرح مسکرائی۔ نوجوان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔ مجھے نہ معلوم کیا ہوا۔ کیک کاٹنے کی چھری یکایک میرے ہاتھ میں تھی۔ میں غصے جوش اور دیوانگی کے عالم میں دردانہ کی طرف لپکا کہ وہ خنجر اس کے سینے میں گھونپ دوں جس وقت اس نے مجھے اپنے مقابل پایا نہایت سکون سے اپنا گلا برہنہ کر کے میرے سامنے پیش کر دیا۔ اس کی نگاہوں میں اطمینان و تشکر کی شراب کا خمار جھلکیاں لے رہا تھا۔ پیار و محبت کی کرنیں چھن چھن کر میرے ظالم و مکروہ چہرے پر پڑ رہی تھیں میرا ہاتھ رک گیا میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ مڑا اور نوجوان کے پہلو میں جو ابھی نشہ محبت کی پینک سے اچھی طرح بیدار بھی نہیں ہوا تھا۔ وہی پارۂ آہن پیوست کر دیا۔ اس کے منہ سے ایک کرب و اندوہ سے معمور چیخ نکلی جس نے میری بے خودی کا تمام طلسم توڑ دیا۔ مجھے ایک لمحے میں اپنے خطرناک فعل کا احساس ہو گیا۔ اب بھاگ کر جانا ناممکن تھا۔ لوگوں کے طعن و تشنیع سے بھرپور آوازوں کے درمیان میں تھانے پہنچا دیا گیا۔ رات میں نے حوالات میں کاٹی۔ صبح معلوم ہوا کہ وہ نوجوان خفیف سی ضرب کا شکار ہوا ہے اور خطرے سے بالکل باہر ہے۔ عدالت نے مجھے دس ہزار کی ضمانت پر رہا کر دیا اور میرے وکیل نے اپنی عقلمندی سے فریق مخالف کو پانچ ہزار روپیہ دے کر صلح نامہ داخل کروا دیا۔ میں اب آزاد تھا۔ لیکن شکستہ دل۔ پڑھنے پڑھانے سے قطعاً بیزار۔ میں نے اپنی لائبریری چھوڑ کر روپوش ہونے کا ارادہ کر لیا۔

کلن کو اپنے مکان کا محافظ ٹھہرا کر میں اسی دن ایک نامعلوم سمت کو روانہ ہو گیا۔

کئی سال میں اسی گردش کا شکار رہا۔ انسان کبھی ایک حالت پہ قانع نہیں۔ اس غیر منتہی سفر سے میرا دل بھی اکتا گیا۔ اب مجھے سکون کی ضرورت تھی۔ میرے والد بقید حیات تھے اور ان سے جدا ہوئے مجھے پانچ سال ہو چکے تھے۔ میری والدہ میری عمر کے سولہویں برس میں ہی انتقال کر گئی تھیں اور اگرچہ میرے دو چھوٹے بھائی اور دو کمسن بہنیں اور تھیں لیکن اس چار سال کے عرصے میں جب تک میں والد کے پاس رہا انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔

ایک نامعلوم شئے کی تلاش میں میں ادھر سے ادھر مارا مارا پھر رہا تھا۔ کبھی کبھی مجھے یہ خواہش بھی گدگداتی تھی کہ وطن جا کر اپنے

والد اور بہن بھائیوں کی صورت دیکھوں۔ لیکن ہمیشہ ہی میں اس خواہش کو رد کر دیا کرتا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دنیا میں میرا کوئی نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میں کسی کا بھی نہیں۔ میں نے دنیا کا چپہ چپہ چھان مارا تھا لیکن آہ وہ سرزمین جہاں مجھے چین ملے دکھائی نہیں دیتی تھی۔ زندگی کس قدر دکھ آزار ہے۔ کیا مشاہیر عالم خوشی اور مسرت کی بلندیوں کو طے کر چکے ہیں۔ میرے لئے یہ راز ابھی سربستہ تھا۔ آہ جب دنیا میں کسی کا کوئی نہ ہو تو یہ خواہش کس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ کوئی ہو اور جب کوئی ہو تو یہ آرزو کہ ؏

ہمنشیں کوئی نہ ہو اور ہمنوا کوئی نہ ہو

میرے دل میں والد اور عزیزوں سے ملنے کا شوق فزوں سے فزوں تر ہوتا گیا اور آخر ایک دن کہ میں وطن سے ایک روز کی مسافت پر تھا میں نے والد کے نام تار بھیج دیا کہ فلاں گاڑی سے آرہا ہوں۔ یہ خیال میرے لئے قدرے سکون بخش تھا کہ کل صبح سویرے اپنے عزیز و اقارب میں مل کر بیٹھوں گا۔

گاڑی اپنے مقررہ وقت پر سپنارہ آکر رُکی۔ میرے والد یہیں کے جاگیردار تھے جس وقت میں نے پلیٹ فارم پر قدم رکھا چار متجسس نگاہیں مجھے ڈھونڈھ رہی تھیں اور ایک لمحہ بعد میں اپنے والد سے بغلگیر تھا۔ چھوٹا بھائی مجھ سے مل کر حد درجہ محظوظ تھا اور سٹیشن پر ہی کہنے لگا کہ ہم نئی امی لے آئے ہیں۔ وہ بہت اچھی ہیں اور اس قدر تعریفوں کے پل باندھنے لگا کہ میرے دل میں اسے دیکھنے کی زبردست خواہش محسوس ہونے لگی۔ جب میں گھر گیا تو عزیز کشاں کشاں مجھے زنان خانے کی طرف لے چلا۔ میں نے صحن میں اپنا قدم رکھا ہی تھا کہ حیرت سے میری آنکھیں پتھرا گئیں۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا "دردانہ"۔ اسی اثنا میں عزیز اس کی ٹانگوں کے ساتھ امی امی جان کہہ کر چمٹ گیا۔ ہماری نگاہیں ایک لمحے کے لئے دو چار ہوئیں اور میں دیوانخانے میں لوٹ آیا۔ اس وقت میرے دل کی جو حالت تھی نہ میں بیان کرسکتا ہوں اور نہ کسی سے بیان ہوسکتی ہے

بہنیں اور بھائی میرے ساتھ چمٹ چمٹ کر خوش ہو رہے تھے اور ان کا یہ عالم میرے خیالات کو مجتمع ہونے سے ہر چند روک رہا تھا لیکن حقیقت میں میں کسی اور ہی دنیا میں آباد تھا۔

چند لمحوں کے بعد چائے تیار تھی اور سامنے میز پر والد بیٹھے تھے وہ مجھ سے کہنے لگے۔ "دردانہ کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے!" میں چونک پڑا۔ "آپ کا مطلب"؟ مسکرا کر کہنے لگے۔ "ہاں ہاں تمہاری وا . . . . "

میں جھینپ سا گیا۔ "بہت اچھی ہیں ابا جان"

"تمہیں پتا ہے یہ کیسے ہاتھ لگیں"؟ ڈھائی تین سال ہوئے میں نے بچوں کی غور و پرداخت کرنے کے لئے کسی اتالیق خاتون کی ضرورت کے تحت اخبارات میں اشتہار دیا تھا۔ اس کے چند روز بعد یہی خاتون حصولِ ملازمت کے مقصد سے مجھ سے ملنے آئیں اور اپنی خدمات پیش کیں۔ میں نے ان سے ان کا گزشتہ حال دریافت کیا کہنے لگیں میں اس کے متعلق آپ سے ایک لفظ بھی نہیں کہوں گی خواہ آپ مجھے ملازم رکھیں یا نہ رکھیں اور یہ شرط بھی پیش کی کہ آئندہ کبھی یہ سوال نہیں کیا جائے گا۔ مجھے ان کی پیشانی سے نجابت کے آثار دکھائی دئیے۔ اگرچہ یہ اس وقت نہایت شکستہ حالت میں تھیں۔ میں نے ان کی شرط منظور کر لی اور گھر کا انتظام ان کے سپرد کر دیا۔ تین سال کے عرصے میں ان کی دیانت۔ شرافت اور نیکی نے میرے دل پر نہایت گہرا اثر کیا۔ آج تک ان کی نگاہیں کبھی مجھ سے دوچار نہیں ہوئیں۔ اور نہ کبھی ضرورت کے علاوہ اس نے کوئی بات کی ہے۔ یہ بات البتہ قابل ذکر ہے کہ یہ ہمیشہ سیاہ لباس پہنتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے غم میں سوگوار ہے۔ لیکن اب اس کی زندگی بہت بہتر ہو جائیگی۔

ایک مہینہ ہوا میں نے اسے شادی کرنے کے لئے کہا۔ اگرچہ تمہاری والدہ کی وفات کے بعد نہ میرا شادی کرنے کا ارادہ تھا اور نہ اس پچاس سال کی عمر میں مجھے اس کی ضرورت تھی۔ اس نے مجھ سے ایک مہینہ کا عرصہ سوچنے کے لئے مانگا۔ کل جس وقت ہمارا نکاح ہوا سب سے پہلی خوشی کا پیغام جو آیا وہ تمہارے آنے کا تار تھا میں اسے نہایت مبارک فال خیال کرتا ہوں"۔ میں ہمہ تن گوش ہو کر یہ تمام کہانی سنتا رہا کہ وہ کہنے لگے۔ "ہاں تو تم نے کچھ نہیں کہا نسیم" میں نے چونک کر جواب دیا۔ "ہاں ابا جان نہایت نیک فال ہے۔ لیکن میں تو یہاں صرف آپ کی قدم بوسی حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوا تھا اور میں آج ہی رات چلا جاؤں گا۔"

"نہیں بیٹا۔ مجھے چھوڑ کر تم کیوں چلے جاؤ گے!" اس بات کا جواب میں کیا دے سکتا تھا میں نے وہ تمام دن دیوانخانے میں ہی

گزارا۔ میرے سر پر وحشت سوار تھی۔ رات میں نے ہمیشہ کے لئے اپنے وطن کو خیرباد کہا۔

میرے دل میں اپنی لائبریری اور کلن کو دیکھنے کی خواہش محسوس ہوئی اور میں نے اسی طرف کا رخ کر دیا۔ تین روز کے بعد شام کے دھندلکے میں میں اپنے مکان کے دروازے پر تھا۔ کلن نے دروازہ بند کر رکھا تھا۔ میری آواز پر اس نے بے پروائی سے کہا "کون ہے! ابھی آتا ہوں"۔ شاید اس نے پہچانا نہیں تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے دروازہ کھولا اور مجھے دیکھ کر "سرکار آپ آگئے" کہہ کر مجھ سے لپٹ ہی تو گیا۔

میں ایک پتھر کی مورت کی طرح بالکل بے حس تھا۔ اس نے جلدی سے میری ضرورت کے مطابق چائے اور کھانے کا انتظام کیا میں اپنے مطالعہ کے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔ تمام کمرہ بہترین صفائی اور نفاست کا مرقع تھا۔ غالباً کلن اپنے دن کا بیشتر حصہ اس کی صفائی ہی میں صرف کر دیتا تھا۔ میں خالی اور تھکی ہوئی نگاہوں سے کھلی ہوئی کھڑکی میں سے بے کیف فضائے آسمانی کی طرف تک رہا تھا کہ وہ کرسی کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا "سرکار اگر حکم دیں تو ایک بات کہوں"۔ میں نے متوحشانہ جواب دیا "ہاں کہو"۔ اس نے کہا "سرکار جس روز آپ کا فیصلہ ہوا تھا اور آپ چلے گئے تھے اسی شام وہ یہاں آئی اور مجھ سے آپ کی بابت پوچھا۔ میں نے کہا وہ تو چلے گئے خدا معلوم کہاں۔ پھر وہ اسی کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر سر جھکائے بہت دیر تک روتی رہی۔ پھر بجلی کی طرح تڑپ کر اٹھی اور کہنے لگی میں جاتی ہوں ان کو تلاش کرنے اور دیوانہ وار یہاں سے نکل گئی۔ جاتی دفعہ اس نے یہ الفاظ کہے۔ اگر وہ کہیں آ جائیں تو ان سے یہ بات میری زبانی کہنا۔

میری زندگی ان کی یاد سے وابستہ تھی میری زندگی کا سہارا ان کی یاد ہو گی۔ کاش وہ اپنی کنیز کو اپنے پاس رکھتے"۔

میں نزع کی سی حالت میں یہ افسانہ جانگداز سنتا رہا۔ اختتام پر میں نے کلن سے کہا۔ جاؤ کلن اب تم آرام کرو۔ میں یہ سوچتا ہوں۔

"مسرت میرے قریب آ کر بھی مجھ سے دور کیوں رہتی ہے"؟

"میری بے کیف زندگی کا مقصد کیا ہے"؟

محبت یا سوز ناتمام؟

نذیر احمد خاں مرغوب ایم اے

غزل

سوزِ نہاں ہے اس قدر ہجرِ رخِ نگار میں
آگ سی ہے لگی ہوئی رشتۂ جانِ زار میں

گردشِ چرخ سے نہ ڈر شوق سے کوہِ غم اٹھا
وزن نہ ہو سکے مگر دیدۂ اعتبار میں

گلشنِ دہر کی ہوا دشمنِ انبساط ہے
کھلتے ہیں کب گلِ مراد گلشنِ روزگار میں

سینے سے نیرے متصل شاید اسے قرار ہو
گوندھ لے میرے دل کو بھی اپنے گلے کے ہار میں

بندہ نوازیاں ہیں یہ آپ کے لطفِ عام کی
بات تو ورنہ کچھ نہ تھی جوہرِ خاکسار میں

کنول نین جوہر
بی سی۔ ایس لائل پور

غزل

سرمستیوں میں روحِ جوانی کچل گئی! | یعنی بہار سوزِ بہاریں سے جل گئی
کیا یاد کر کے عشرتِ رفتہ کو روئیے | اک لہر تھی جو ناچتی گاتی نکل گئی
وہ ایک لمحہ جس میں ہوئی تھی نظر دوچار | اُس ایک لمحے میں مری دنیا بدل گئی
تھی کھیتوں میں لپٹی ہوئی ایک یادِ آہ | موجِ نسیم آج کلیجہ مسل گئی
چھیڑا جو تو نے ساز کے پردوں کو مطربہ! | محسوس یہ ہوا کہ مری جاں نکل گئی
یادش بخیر، عہدِ محبت کی شاعری | ایک آہ تھی جو گیت کے سانچے میں ڈھل گئی

اختر گھٹائیں جھوم کے برسیں کچھ اس طرح
ارمان جاگ اٹھے، تمنا مچل گئی

اختر انصاری

عورت

(ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

افراد:

ڈاکٹر رضا ــــــ شعیب کا دیرینہ دوست عمر ۴۰ سے اوپر

شعیب ــــــ سہیل کا باپ عمر ۴۵ کے لگ بھگ

سہیل ــــــ شعیب کا بیٹا عمر ۱۲ سال

میری ــــــ نرس

(ایک کمرہ جس میں ایک چارپائی پر سہیل لیٹا ہوا ہے اس کے سرہانے ذرا دور میز پر بجلی لیمپ جل رہا ہے جس کی مدھم سی روشنی اس کے نحیف اور بیمار چہرہ پر پڑ رہی ہے۔ باقی بدن لحاف سے ڈھکا ہوا ہے۔ پاس ہی تپائی پر دواؤں کی چند بوتلیں پڑی ہیں۔ بائیں طرف دیوار پر کلاک لٹک رہا ہے اُس کے نیچے ایک بڑا میز رکھا ہے تین آرام کرسیاں ہیں ایک پر شعیب سر جھکائے بیٹھا ہے۔ چہرہ پر غم کے آثار ہویدا ہیں۔ دوسری پر ڈاکٹر لیٹا ہوا ہے اور آنکھیں اوپر چھت پر جمی ہوئی ہیں۔ تیسری خالی ہے سامنے دیوار میں ایک کھڑکی ہے جو باہر کھلتی ہے اس وقت بند ہے ــــــ بارش اور ہوا کی ملی جلی آواز آرہی ہے۔ کبھی کبھی بادل بھی گرجتا ہے۔ کلاک ٹن ٹن دو بجاتا ہے۔ ڈاکٹر کلاک کی طرف دیکھتا ہے۔ شعیب چونک کر اٹھتا ہے)

شعیب۔ دو بج گئے۔ دوا دینی چاہئے؟

ڈاکٹر۔ ہاں (اٹھتا ہے مریض کے قریب آکر اُس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیتا ہے۔ وہ بے ہوش پڑا ہے) میرے خیال میں بھاپ بھی دے دینی چاہئے۔

شعیب۔ اچھا (گھنٹی بجاتا ہے۔ ایک نرس چہرے پر نقاب ڈالے داخل ہوتی ہے) میری! کھولتا ہوا پانی لاؤ۔ مریض کو بھاپ دی جائے گی۔

میری۔ بہت اچھا (چلی جاتی ہے)

شعیب (ڈاکٹر کے پاس کھڑا ہو کر افسردگی سے مریض کو تکتا ہے اور اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتا ہے) اوہ۔ بدن تو ویسے ہی پھنک رہا ہے (گھٹنوں پر جھک کر بھرائی ہوئی آواز میں) بیٹا ہوش کرو۔

ڈاکٹر۔ اوں ہوں۔ اُسے بلاؤ نہیں (ہذیانی میں دوا انڈیلتا ہے۔ مریض کو مطلق ہوش نہیں ڈاکٹر اور شعیب دانتوں کو چیر کر دوا حلق میں الٹتے ہیں)

شعیب سہیل تو بالکل بے ہوش ہے۔ آہ ڈاکٹر میرے دماغ میں برے برے خیال آرہے ہیں۔

ڈاکٹر۔ (ظاہری صورت سے) گھبراؤ نہیں خیریت ہے ـــ

شعیب آہ تم جھوٹ بولتے ہو۔ خدارا مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ۔ میں ہر بری خبر سننے کے لئے تیار ہوں۔ رضا مجھے فریب میں نہ رکھو! بولو۔ بولو۔

ڈاکٹر۔ (اُس کی تیز اور متجسس نگاہوں کی تاب نہ لاکر شکستہ الفاظ میں) کیسے کہوں شعیب۔ اگر تین گھنٹے تک بخار نہ اترا تو سہیل کی جان خطرے میں ہے۔

شعیب (ماتھے پر ہاتھ مار کر) آہ ــ سہیل کی جان خطرے میں۔ میرا لخت جگر معصوم سہیل۔ آہ سہیل بچ جائے۔ میں مر جاؤں (مریض کی چارپائی کی پٹی پر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ حالت غشیان میں کرب و بے چینی سے ہاتھ پیر مارتا ہے) میرے معصوم بچے۔ مجھ بدنصیب کو تنہا نہ چھوڑ جانا تیرے بغیر میری زندگی موت سے بدتر ہے۔ میں نے آج تک

تیری ہر معمولی سے معمولی خواہش کو پورا کرنا اپنی زندگی کا نصب العین بنا رکھا تھا۔ بیٹا سہیل مجھ سے نہ روٹھ جانا۔ تیرے بھولے بھالے چہرے کو دیکھ کر میں اپنے دردناک ماضی کو بھول جانا سیکھ گیا تھا۔ اِن پیاری آنکھوں کو کھولو سہیل۔ خدارا کھولو ان آنکھوں کو جن سے نکلی ہوئی ایک ایک نگاہ نے مجھے صبر و ضبط کا ایسا سبق دیا جو بڑے سے بڑا فلسفی بھی نہیں دے سکتا تھا۔ آہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی خوشی نہیں دیکھی۔ قدرت نے جب تجھے بڑا کیا تو میں سمجھا کہ میرے مقدر کا ستارہ اب گردش سے نکل چکا ہے میں نے تجھے پا لینے کے بعد اپنی داستانِ غم کو رفتہ رفتہ بھلا دینا چاہا۔ آہ سہیل۔ تیرے معصوم چہرے کے سامنے اور تیری ان چمکتی ہوئی مقدس آنکھوں کے روبرو میرے لئے کائنات بھر کے تمام بیش بہا خزانے اور جہان بھر کی تمام لطیف ترین نعمتیں ایک خذف سے بڑھ کر وقعت نہ رکھتی تھیں۔ آہ اب قدرت تجھ کو مجھ سے چھین لینے پر مصر ہے (ماتھے پر ہاتھ مارتا ہے) آہ سہیل قدرت نے تجھے مجھ کو دیا ہی کیوں تھا۔

ڈاکٹر۔ حوصلہ کرو شعیب۔ اٹھو (اس کو اٹھاتا ہے) سہیل کو بھاپ دے دیں۔ دیکھو ابھی آرام ہو جائے گا۔ تم تو بہت صابر تھے (گھنٹی کا بٹن دباتا ہے۔ . .) میری نہیں آئی۔ باہر کہیں ہے شاید۔ دیکھو تو (شعیب باہر جاتا ہے۔ ڈاکٹر کمرے میں ٹہلتا ٹہلتا کھڑکی کھولتا ہے باہر گھُپ اندھیرا ہے۔ بادل گرجتا ہے۔ مریض کرب و بے چینی میں ہاتھ پیر مارتا ہے اور بحالت ہذیان میں کہتا ہے۔ "ہاں ہائے۔ ماں۔ آں" ڈاکٹر کھڑکی بند کر کے مریض کی نبض دیکھتا ہے اُس کو لحاف سے ڈھانکتا ہے اور پھر ٹہلنے لگتا ہے اور آپ ہی آپ کہتا ہے) خدا کرے یہ بچہ بچ جائے شعیب تو مر جائے گا۔ خدا تو بڑا رحیم ہے۔ ایک تنہا باپ کی زندگی جس نے اس بچے کو چودہ سال پالا پوسا اتنے ستے اتنا کیا اب اُس کے سامنے زندگی کی آخری گھڑیاں گزارے توبہ خدایا —— یہی ننھی سی جان اس کی تمام عمر کی کمائی ہے تیرے خزانۂ غیب میں رحمت کی کمی نہیں اگر تو اب بھی سہیل کو شفا دے دے تو تیری قدرت بے مثال سے کچھ بعید نہیں۔ (قدموں کی آہٹ سن کر خاموش ہو جاتا ہے۔ شعیب اور میری داخل ہوتے ہیں) یہاں رکھ دو دیگچی۔

میری۔ (دیگچی رکھ کر) کیا حال ہے اب ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر۔ ویسا ہی ہے۔ دعا کرو۔

میری۔ دعا؟ ایک بے معنی لفظ ہے۔ کیا خدا خود ہماری مصیبتیں نہیں دیکھتا کیا وہ انتظار کرتا رہتا ہے کہ ہم دعا کے لئے ہاتھ اٹھائیں تو وہ رحم کرے۔ آپ کا خدا کتنا تنگ دل خدا ہے

ڈاکٹر۔ چپ میری۔

مریض (بے ہوشی میں ہاتھ پیر مارتا ہے) ماں —— اوہ۔ ماں۔

شعیب۔ ہائے بیٹا تیری ماں کو کہاں سے لاؤں۔ وہ یہاں کہاں بیٹا۔ بے ہوشی میں بھی تجھے وہی ملعونہ یاد آ رہی ہے (چارپائی پر جھک جاتا ہے) مجھے بتا سہیل پیارے۔ تیرا باپ حاضر ہے۔

ڈاکٹر۔ (کچھ سفوف باہم ملا رہا ہے) میری! دیگچی کو بستر کے قریب کر دو۔ شعیب!!! (شعیب کچھ پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ میری دیگچی کو بستر کے قریب رکھتی ہے) سہیل کو اب اس طرف کروٹ دلانا ہے (نرس اور شعیب مریض کو کروٹ دلاتے ہیں۔ نرس سہیل کے سر کو ذرا آگے کو تھامے رکھتی ہے۔ ڈاکٹر ڈھکنا اٹھا کر دیگچی میں دوا الٹ دیتا ہے اس میں* سے سفید سی بھاپ اٹھنے لگتی ہے —— مریض کھانستا ہے) بس نرس اب سیدھا لٹا دو۔

شعیب۔ یا خدا رحم!!!

ڈاکٹر۔ (دیگچی پر ڈھکنا دیتے ہوئے) لے جاؤ اسے میری۔ (میری لے جاتی ہے)

شعیب۔ اب افاقہ ہو جائے گا؟؟؟

ڈاکٹر۔ امید تو ہے۔

شعیب۔ اچھا —— !!! دوسری خوراک کس وقت دینی ہے۔!

ڈاکٹر۔ اب دو گھنٹے تک کوئی دوا نہیں دی جائے گی۔ پانچ منٹ کے بعد ٹمپریچر لینا ہے اگر کم ہو گیا تو خطرہ سے بچ نکلنے کا امکان ہے

شعیب۔ (خوشی سے) اچھا۔

ڈاکٹر۔ بیٹھ جاؤ۔ تم فکر نہ کرو دیکھو خدا کو کیا منظور ہے (دونوں بیٹھ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر جیب سے سگرٹ نکال کر سلگاتا ہے ایک شعیب کو دیتا ہے

شعیب۔ نہیں۔ جی نہیں چاہتا۔

ڈاکٹر۔ بہت سردی ہے شعیب۔ صرف ایک پی لو —— (شعیب سگرٹ سلگا لیتا ہے دونوں خاموش بیٹھے کش لیتے رہتے ہیں

شعیب کلاک کی طرف دیکھتا رہتا ہے)

(۴ منٹ خاموشی)

شعیب۔ رضا اتنی غنودگی کیوں ہو رہی ہے۔؟

رضا۔ چونکہ بخارات دماغ کی طرف صعود کر رہے ہیں اس لئے ہذیان کی نوبت آ گئی ہے۔ (کلاک کی طرف دیکھ کر) دو منٹ اور باقی ہیں۔

شعیب (کلاک کو دیکھ کر) یا خدا رحم کر ——— یہ بھاپ تپ کو کم کرتی ہے؟

ڈاکٹر۔ ہاں ——— دیکھو۔ ابھی اپنا اثر دکھائے گی۔

(خاموشی)

(ڈاکٹر جیب سے تھرما میٹر نکال کر جھٹکتا ہے اور کلاک کی طرف دیکھتا ہے۔ دونوں اٹھتے ہیں۔ مریض کی چارپائی کے قریب ٹھہرتے ہیں ڈاکٹر پھر کلاک کی طرف دیکھتا ہے۔ تھوڑی انتظار کے بعد تھرما میٹر نکالتا ہے ——— شعیب اپنے چہرے کو ہاتھوں سے چھپائے سر کو نیچا اٹھائے منہ میں کچھ گنگنا رہا ہے۔ جیسے دعا میں محو ہے ——— ڈاکٹر تھرما میٹر نکالتا ہے۔ دیکھ کر خوشی سے کہتا ہے) ٹمپریچر کم ہو گیا (تھرمامیٹر شعیب کو دیتا ہے)

شعیب۔ (تھرمامیٹر دیکھ کر) خدایا شکر ہے تیرا۔ میرے بچے پر رحم کر (دونوں کرسیوں کی طرف جاتے ہیں۔ شعیب بیٹھنے سے پہلے واپس مڑ کر مریض کی پیشانی پر بوسہ دیتا ہے پھر کرسی پر بیٹھتا ہے) کیا بعید ہے ڈاکٹر سہیل کو خدا آرام دے دے۔

ڈاکٹر۔ خدا کی رحمتوں سے کوئی بعید نہیں۔ خدا پر بھروسہ کرو شعیب۔

سہیل۔ ہائے ——— ماں ——— آں۔

شعیب۔ (فرش پر نظریں گاڑ کر) آہ بے ہوشی میں بھی کہتا ہے "ماں" (شکستہ الفاظ میں) اف ماں بھی کیا چیز ہے؟؟؟

ڈاکٹر۔ جب باہر تھے تم اُس وقت بھی کہتا ہے۔

شعیب۔ کب؟

ڈاکٹر۔ جب تم میری کو بلانے گئے تھے ——— میری کیا خود پانی گرم کر رہی تھی تم نے بہت دیر کر دی تھی وہاں؟

شعیب۔ چھوکرا کم بخت سو گیا تھا۔ بے چاری خود کوئلے سلگا رہی تھی۔

ڈاکٹر۔ میری بڑی اچھی نرس ہے۔

شعیب۔ بیشک رضا اُس نے تو میری تکلیف آدھی کر دی ہے۔ خدا اُس کو اجر دے۔ میرا خیال تھا نرسیں بہت ہمدرد نہیں ہوا کرتیں۔ اُس نے تو خدا کی قسم کئی کئی راتیں سہیل کے سرہانے آنکھوں میں کاٹ دی ہیں۔ اُس کے اخلاق کی میں تعریف نہیں کر سکتا۔ ابھی جب میں نے پوچھا کہ وہ خود کوئلے کیوں سلگا رہی تھی تو کہنے لگی۔ ملازم کل رات بھی نہیں سو سکا ابھی ابھی اُس کی آنکھ لگ گئی تھی میں نے اُسے جگانا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے کہا وہ بھی تو تمہاری طرح ہی ہے۔ تم کیوں جاگ رہی ہو؟ کہنے لگی اپنے اپنے فرض کا احساس ہوتا ہے اگر اُسے اب جگایا بھی تو کام تو کر دے گا مگر بددلی سے جس کام کو خوشی خوشی نہ کیا جائے۔ اُس میں خدا کی برکت نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر۔ کبھی کبھی تو بہت معقول بات کرتی ہے۔ مگر یہ نقاب کیوں پہنتی ہے؟

شعیب۔ پتہ نہیں۔ میں نے اِس کے متعلق اُس سے جب وہ میرے پاس ملازمت کے لئے آئی تھی سوال کیا تھا جس کا جواب اس نے نہایت غمگین آواز سے ان الفاظ میں دیا کہ میں ایک غمزدہ عورت ہوں۔ عیسائی ہونے سے پہلے ایک راسخ الاعتقاد جینی عورت تھی اور اب بھی جب کہ مجھے عیسائی ہوئے کئی برس گزر چکے ہیں۔ میرے گزشتہ مذہب کے کئی اعتقادات میرے ساتھ ساتھ ہیں مثلاً اب بھی میرا ضمیر مجھے قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ میرا سانس ہوا میں سمائی ہوئی ننھی ننھی جانوں کے لئے موجب ہلاکت ہو۔ میں کیوں عیسائی ہوئی یہ ایک طویل داستانِ غم ہے جو میں کسی کو بھی ہرگز سنانے کے لئے تیار نہیں ——— جناب آپ میرا کام دیکھیں میری ذات کے متعلق سوال کرنا قطعی لاحاصل ہے۔ بعد ازاں مجھے اُس سے سوال کرنے کی بھی جرأت نہیں ہوئی اور سچ تو یہ ہے کہ اُس نے مجھے اتنا آرام پہنچایا ہے کہ میں نے عمداً اس سے کبھی کچھ دریافت ہی نہیں کیا ———

ڈاکٹر۔ اس سے پہلے بھی تم نے کوئی نرس رکھی تھی؟

شعیب۔ نہیں ڈاکٹر۔ ایسی نرس مجھے بھلا کہاں مل سکتی تھی۔ خدا ساز بات ہے کہ میں ابھی اپنے کمرے میں نرس کی ضرورت کا اشتہار لکھ رہا تھا کہ ملازم نے اطلاع دی کہ ایک نرس ملاقات کے لئے آئی ہے۔ میں نے کہا اُسے اندر بھیج دو۔ تب یہ اندر آئی

اور اس سے معاملے ہو گیا۔ میں نے اُسے جب یہ کہا کہ تیری! مریض کی ماں مر چکی ہے اس لئے تیمار داری کے تمام انتظامات کی تنہا ذمہ دار تم ہی ہو اس لئے تم کو بہت دلجمعی سے مریض کی خدمت کرنی ہوگی تو اُس کا جواب پتہ ہے کیا تھا؟ میں سہیل کو اپنا بیٹا یا بھائی سمجھ کر خدمت کروں گی اگر ایک بار بھی شکایت کا موقع دوں تو آپ مجھے ایک پیسہ دئے بغیر نکال سکتے ہیں۔ اُس کے اس ہمدردانہ جواب نے مجھ پر بہت اثر کیا۔ واقعی ڈاکٹر اُس نے جس تندہی سے سہیل کی خدمت کی ہے۔ میرا دعوے ہے مائیں بھی نہیں کر سکتیں ——

ڈاکٹر۔ خیر یہ تو تمہارا مبالغہ ہے۔ ماں اور پھر اپنی اولاد کی بیمار اولاد کی خدمت نہ کرے؟ ناممکن ہے۔

شعیب۔ (لمبی سانس لے کر) آہ! دنیا میں ایک جیسی مائیں نہیں ہوتیں۔

ڈاکٹر۔ لیکن اولاد کے معاملہ میں سب ایک جیسی ہیں۔

شعیب۔ نہیں ڈاکٹر تم غلطی پر ہو۔ میری بات کو رد مت کرو۔ میرے الفاظ میری زندگی کا نتیجہ ہیں (جوش میں) کون ہے دنیا میں جو میرے الفاظ کو جھٹلا سکے۔ میں نے ان کو قیمتاً —— قیمتاً خریدا ہے۔

سہیل کی جلاد ماں کو دیکھو ڈاکٹر رضا نے ——

ڈاکٹر۔ شعیب کیوں مردے اکھیڑتے ہو۔ وہ جلاد تھی؟؟؟

شعیب۔ مُردے؟؟؟ حسنہ جلاد تھی جلاد، ظالم جلاد۔ اس وقت وہ گلچھرے اڑا رہی ہے رضا خدا کی قسم گلچھرے اڑا رہی ہے۔ مری کب تھی وہ نابکار۔ مجھے مار گئی تھی تمہیں علم نہیں کیا! میں نے سب داستان تمہیں لکھ دی تھی۔

ڈاکٹر۔ داستان!!! کیسی داستان؟؟؟

شعیب۔ کیسی داستان؟ اُس کے بھاگ جانے کی ——

ڈاکٹر۔ کیا تم دیوانے ہو گئے ہو شعیب! آج سے چودہ پندرہ برس پہلے اُس کی موت کے متعلق تمہارے ہاتھ کا لکھا ہوا خط مجھے مدراس میں ملا تھا۔

شعیب۔ سچ کہتے ہو رضا؟ —— اور تو اور آہ تم سے بھی میں نے یہ راز پوشیدہ رکھا۔ وہ معلونہ مری نہیں تھی۔ بھاگ گئی تھی ——

ڈاکٹر۔ (کرسی کو اُس کے قریب گھسیٹ کر) ہیں بھاگ گئی تھی!؟! آج تک میں تاریکی میں رہا۔

شعیب۔ میں نے اپنے حلقۂ اعزہ و احباب میں ہر ایک کو اس کی موت کی خبر دی تھی اور آج تک یہ سمجھتا رہا کہ صرف تمہیں میں نے ساری کی ساری داستان لکھ دی —— ہے۔ رضا میں اس سانحہ کے بعد کئی برس تک جنونی سا رہا۔ مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ کیا ہو گیا ہے۔ میں پاگل تھا تم سچ کہتے ہو میں نے تمہیں بھی اس کے مرنے کی ہی خبر دی ہوگی در انحالیکہ سمجھتا یہ رہا کہ اصل واقعہ کے متعلق تمہیں اطلاع دے چکا ہوں۔

ڈاکٹر۔ واقعہ کیا تھا وہ؟

شعیب۔ آہ تو سن لو پیارے رضا۔ تم کو شاید علم نہیں کہ حسنہ بچپن سے اپنے چچیرے بھائی سے منسوب تھی اور آغازِ شباب میں ایک آدھ سال تک ان کے درمیان عشق و محبت سے لبریز نامہ و پیام کا تبادلہ بھی ہوتا رہا تھا۔ الیاس کی طبیعت میں فطرتاً لاابالیانہ پن اور آوارگی تھی۔ ایسے آدمی ہر ایسی ذمہ داری سے جو اُن کی آوارہ منش طبیعت پر ایک قید کی طرح گراں گزرے ہمیشہ گریز کرتے ہیں۔ وہ شادی سے ایک برس پہلے گھر سے بھاگ کر افریقہ چلا گیا۔ اُس خوب صورت جادوگر کی جدائی میں حسنہ کے بچنے کی کوئی امید باقی نہ تھی مگر آہ اس وقت قضاؤ قدر کے فرشتے اسی ضمن میں میری دائمی بربادی اور تباہی کا فیصلہ کر رہے تھے۔ دو برس بعد میرا مقدر مجھے اُس کے آستانے پر لے گیا اور میں چپکے چپکے اُسے چاہتا رہا۔ حتیٰ کہ ایک برس کے صبر و شکیب کے بعد مجھے یارائے ضبط نہ رہا۔ میں نے اظہارِ محبت کے لئے زبان کھول ہی دی اُس کی نگاہیں جھک گئیں۔ مجھے اب تک یاد ہے —— جب میں نے اُس کے بے جان ہاتھ پر اولیں بوسہ دے کر اپنی چاہت کا نتیجہ اُس کے حسین چہرے سے اخذ کرنا چاہا تو اُس کی آنکھوں سے ایک موٹا سا آنسو نکل کر اُس کے رخسار پر تھرتھرایا اور نیچے گر پڑا۔ عورت شاید جامِ محبت سے ایک گھونٹ پی کر اس کے کیف آگیں نشے سے سرشار ہو کر پیالہ ہاتھ سے دینا نہیں چاہتی۔ وہ بھی محبت کی پیاسی تھی۔ لوگوں نے ہر چند رکاوٹیں پیدا کرنا چاہیں مگر ہم نے ایک دوسرے سے ایسا رشتہ استوار کر لیا کہ کبھی ٹوٹنے کا شائبہ تک نہ رہا۔ شادی کے وقت اُس کی عمر بیس اور میری تیس برس کی تھی۔ ہماری شادی کے دو

برس بعد الیاس افریقہ سے واپس آگیا اور اس کی آمد کی خوشی میں اس کے باپ نے ایک بہت بڑی شاندار دعوت دی ہم بھی مدعو تھے۔ مجھے ان دنوں کام کاج سے ایک منٹ کی فرصت بھی نہ تھی اور وہاں سے شرکت کے لئے خط پر خط آرہا تھا۔ آخر میں نے اپنے لئے معذرت پیش کرتے ہوئے حسنہ کو بھیج دیا۔ وہ ان دنوں حاملہ تھی۔ کوئی ایک مہینہ وہاں رہی ہوگی۔ واپسی پر جب الیاس کے متعلق باتیں چھیڑیں تو مجھے یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ افریقہ سے بہت دولت کما کر لایا ہے ـــــ حسنہ گو پہلے کی طرح بدستور اب بھی میرے آرام و آسائش کا خیال رکھتی رہی مگر میں نے ایک تبدیلی اس میں نمایاں طور پر دیکھی۔ میرے روبرو ہرچند وہ ویسے ہی مسرور، قہقہے لگاتی رہتی مگر میں اکثر جب وہ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی ہوتی اس کو اداس اداس کسی غمناک سی سوچ میں پڑے ہوئے دیکھا کرتا اور آہ میری نادانی میں یہ سمجھتا رہا کہ اس کو چونکہ تکلیف ہے اس لئے بیزار سی رہتی ہے مگر یہ تمام وہم میرے سامنے حقیقتیں بن کر کب روشن ہوئے۔ جب وہ چھ مہینے کے معصوم سہیل کے تکئے کے نیچے ایک مختصر مہمل سی تحریر چھوڑ کر بھاگ گئی ـــــ

مجھے یقین ہے کہ وہ الیاس ہی کے ساتھ ہندوستان سے کہیں باہر چلی گئی تھی کیونکہ اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد جس طرح الیاس پہلے گھر سے بھاگ گیا تھا اسی طرح اب پھر اچانک غائب ہوگیا۔ وہ یقیناً اسی کے ساتھ گئی تھی مجھے یقین ہے ـــــ یقین ہے (اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں دبا کر) آہ رضا عورت کو سمجھ لینا آسان کام نہیں۔ اس کی فطرت کبھی ظاہر نہیں ہوسکتی۔ مجھے اب تک یاد ہے آج سے سالہا سال قبل اس کی آنکھوں سے نکلا ہوا وہ موتی سا آنسو مجھے اب تک یاد ہے۔ آہ اس کو میں نے اپنی محبت کے جواب میں محبت کا اشارہ سمجھا تھا۔ اُف ہماری کرخت فطرت بھی عورت کے صرف ایک آنسو کے سامنے اپنے تمام ہتھیار ڈال دیتی ہے وہ ملعونہ مجھے زندہ میں لا کر الیاس کا انتقام مجھ ناکردہ گناہ سے لینا چاہتی تھی (ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسری میں ڈال کر زور سے دباتا ہے) ڈاکٹر! اس نے آغاز شباب میں الیاس کو اک شدید ترین جذبۂ محبت سے چاہا تھا۔ یہ مت سمجھو کہ چنگاری جب راکھ میں دب جائے تو اس کا وجود عدم کے برابر ہو جاتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ وہ ایک شعلۂ جوالہ بننے کے لئے بے قرار رہتی ہے اور آخر ذرا سی ہوا کے لگنے سے وہ ایک بھڑکتا ہوا شعلہ بن جاتی ہے۔

رضا! اس کے بھاگ جانے کے بعد میری زندگی نے یک لخت پلٹا کھایا ـــــ ابتدا میں تو اکثر پرانی باتیں یاد آ آ کر مجھے تڑپایا کرتی تھیں مگر پھر میں نے سوچا کہ یوں جان کو ہلاک کرنا بے سود ہے جس عورت نے میری محبت کی اور اپنے جگر کے ٹکڑے کی بھی پروا نہ کی اور اتنی سخت دل ہو کر کہ اس کو ہمیشہ کے لئے اپنے سے علیحدہ کر کے ایک آوارہ منش شخص سے بھاگ جانا گوارا کر لیا، اس کا خیال کرنا دنیا میں سب سے بڑی حماقت ہے (آنکھیں نکال کر) جس طرح اس نے کئی برس متواتر مجھے کانٹوں پر لٹایا ہے۔ اس کی راتیں بھی اسی طرح پریشان ہو کر رہیں گی۔ وہ کبھی چین نہ پاسکے گی میری بددعائیں کبھی خالی نہیں جاسکتیں ـــــ آہ کبھی کبھی حسنہ سے انتقام لینے کا خیال مجھ پر ایک جنونی کیفیت طاری کر دیتا اور میں بارہا سہیل کو اور اپنے آپ کو گولی سے ہلاک کر دینے کے درپے ہو جاتا مگر کسی غیبی طاقت کے ماتحت ہمیشہ رک جاتا رہا۔ عورت اور وفا ـــ پانی اور آگ !!! (دیوانوں کی طرح ہنستے ہوئے) دنیا کی سب سے ناقابل اعتبار ہستی ـــ رضا تم حیران کیوں ہو رہے ہو۔ انسانی زندگی یکسر سوز و گداز ہے۔

ڈاکٹر۔ (جو اس کی داستان غم سنتے سنتے کھو سا گیا تھا اپنے آپ کو سنبھال کر، ایک لمبی سانس لے کر) واقعی شعیب فطرت تمہارے معاملے میں بہت بے انصاف واقع ہوئی ہے۔

شعیب۔ بے انصاف! اس نے برسوں سے مجھ سے طمانیت قلب چھین لی ہے سالہا سال سے میرے لبوں سے مسکراہٹ نوچ لی ہے اب اس حزنیہ داستان کا اعادہ کرتے وقت میرا دل اور دماغ یوں معلوم ہوتا ہے کہ پھٹ جائیں گے مگر آہ ان آنکھوں میں ایک آنسو نہیں آتا۔ یہ سچی ہیں میں نے ان کے راستے اتنا پانی بہا دیا ہے کہ عورتوں کی وفاداری پر ناز کرنے والے گدھوں نے اتنا پیا بھی نہیں ہوگا۔ رونا چاہتا ہوں مگر رونا نہیں آتا ـــــ

ڈاکٹر۔ (حیران ہو کر) شعیب! اس اندوہناک واقعے کے متعلق کس کس کو علم ہے؟

شعیب۔ کس کس کو علم ہے؟ میری بہن اور حسنہ کا باپ آج تک یہی سمجھتے

ہیں کہ میری بیوی مر چکی ہے ۔ میں نے اُن کو بھی یہی اطلاع دی تھی میری خودداری یہی چاہتی تھی رضا۔ آہ شروع شروع میں میرا سینہ اس ہولناک راز کو اگل دینا چاہتا تھا مگر ہزار دقتوں اور لاکھ کوششوں کے بعد میں نے اپنی طبیعت پر جبر کر لیا اور آج تک جبکہ سہیل کی عمر کا چودھواں سال گزر رہا ہے یہ راز میرے سینے میں دفن رہا ــــ آج ۔ اتنی طویل ترین مدت کے بعد جب قدرت نے دو بچھڑے ہوئے دوستوں کو یہاں مسوری میں لا ملایا ہے شاید اس کو یہی منظور تھا کہ میرے لبوں کی یہ سنگین خاموشی تمہارے روبرو پاش پاش ہو جائے۔ (بادل زور سے گرجتا ہے سہیل چیخ مارتا ہے)

شعیب۔ او وہ بیٹا! (دونوں لپک کر چارپائی پر جھک جاتے ہیں اور ایک آدھ لمحہ گھبرائے ہوئے کھڑے رہتے ہیں)

ڈاکٹر۔ (سہیل کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر) ڈر گیا ہے! (پھر کچھ پیچھے ہٹ کر مریض کو غور سے دیکھتا ہے)

شعیب۔ خیر تو ہے ؟؟؟ (ماتھے پر ہاتھ رکھ کر) اوہ حرارت تو بڑھ گئی ہے (ڈاکٹر اور شعیب کی مایوس نظریں چار ہوتی ہیں)

ڈاکٹر۔ (پیچھے ہٹ کر گھنٹی کا بٹن دباتا ہے ۔ پھر دروازے کی طرف منہ کر کے آواز دیتا ہے) میری ــــ میری!

شعیب۔ (چارپائی کی پٹی پر بیٹھ کر مریض کی پیشانی کو چومتا ہے) آہ میرا بیٹا!!!!!

میری۔ (گھبرائی ہوئی آتی ہے) جناب؟

ڈاکٹر۔ چولہا اور دیگچی ٹیکے کی سرنج!

میری بہت اچھا (چلی جاتی ہے)

شعیب۔ کیا ٹیکہ کرو گے؟

ڈاکٹر۔ (جیب میں ہاتھ ڈال کر) ہاں ــــ (جیب سے تھرمامیٹر نکال کر مریض کو لگاتا ہے ۔ شعیب ہاتھوں سے اپنے سر کو دبائے کھڑا ہے۔ کمرے میں موت کی سی خاموشی چھا رہی ہے ــــ کہیں دور گھڑیال کے چار بجانے کی آواز آتی ہے۔ ڈاکٹر کلاک کی طرف دیکھتا ہے اور دیکھتا رہتا ہے ــــ مریض کے منہ سے تھرمامیٹر نکالتا ہے شعیب اس کے کندھوں پر سے درجہ حرارت دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ڈاکٹر دیکھ کر مایوس سی صورت بناتا ہے شعیب اُس کے ہاتھ سے تھرمامیٹر چھین کر خود دیکھتا ہے۔

شعیب (گھبرا کر) ایک سو آٹھ!!!!!

(ڈاکٹر اُس کے ہاتھ سے تھرمامیٹر لے کر جیب میں رکھ لیتا ہے شعیب چارپائی کی پٹی پر خاموش بیٹھ جاتا ہے ۔ ڈاکٹر کمرے میں ٹہلتا ہے اور ٹہلتا ٹہلتا کھڑکی کھول کر باہر دیکھتا ہے۔ بارش رک چکی ہے آسمان سے بادل اڑ گئے ہیں اور نصف چاند ایک رقیق سی بدلی کے ٹکڑے سے باہر نکلا ہوا ہلکی سی روشنی دے رہا ہے۔ وہ کھڑکی کھلی رہنے دیتا ہے ــــ میری ایک ہاتھ میں اسٹوو اور ایک میں بیگ پکڑے داخل ہوتی ہے اور اس وحشت ناک خاموشی سے گھبرا سی جاتی ہے۔ کلاک ٹن ٹن چار بجاتا ہے۔ میری بیگ سے دیگچی نکال کر اسٹوو پر رکھ کر اس میں سرنج رکھتی ہے دیگچی میں پانی گراتی ہے اور دروازے کی طرف جاتی ہے)

ڈاکٹر۔ کہاں جاتی ہو؟

میری۔ ماچ بکس!!!

ڈاکٹر۔ یہ لو (جیب سے نکال کر اُسے دیتا ہے اور خود کھڑکی کے پاس کھڑا ہو کر باہر آسمان کی طرف نظر کر کے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپا لیتا ہے)

میری۔ (اسٹوو کو جلاتی ہے پھر مریض کے پاس جا کر اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتی ہے) ٹمپریچر دیکھا ہے؟

شعیب۔ ایک سو آٹھ!

میری۔ ایک سو آٹھ!!! (مریض کے سرھانے بیٹھ کر سوچ میں پڑ جاتی ہے)

شعیب۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) میرا بیٹا سہیل! ہائے اگر تو مر گیا تو میں کہاں جاؤں گا۔ میرے اجڑے ہوئے گھر کی رونق تیرے دم سے ہے۔

ڈاکٹر۔ (ٹھٹک کر شعیب کی طرف دیکھتا ہے) حوصلہ کرو شعیب ۔ دعا کیوں نہیں کرتے؟

شعیب۔ دعا کس سے کروں؟ خدا (ہاتھوں کو اوپر اٹھاتا ہے) خدایا بدنصیب پر رحم کر۔ تیری بے حساب رحمت کہاں گئی میری زندگی کا دل بہلاوا میرے زخمی دل کا کھلونا کیوں توڑا جا رہا ہے کیا تو رحیم نہیں (مٹھیاں بند کر کے) اگر میری خانماں بربادی کی انتہا سہیل کی جان لے کر ہی کرنی تھی تو اسے مجھے دیا ہی کیوں تھا۔ اب

اُسے مجھ سے چھین رہے ہو۔ تیری بے نیاز ذات سے یہ توقع تو نہ تھی (ڈاکٹر ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے کھڑکی کے پاس کھڑا شعیب کو تک رہا ہے) آہ بدنصیب پر رحم کھا۔ اس تاریک رات میں امید کی شعاع کے لئے تڑپ رہا ہوں۔ خدایا کیا میری دعا کے لئے تیرے کان بند ہو گئے ہیں۔ اگر سہیل کو کچھ ہو گیا تو میں تیرے سر چڑھ کر مر جاؤں گا۔ میں اپنی جان سے بیزار ہوں۔ سہیل کے بعد میرا جینا بیکار ہے (سہیل کو پیار کرتا ہے) تو نے اپنے رحمت کے خزانہ سے مجھے تو ایک پل کی خوشی بھی نہیں دی۔ ہاں ہاں مانا سہیل میرے لئے بہت بڑی خوشی تھا مگر اب تو اُسے بھی مجھ سے چھین رہا ہے۔ کتنا ظالم ہے تو (جس طرح کسی اڑتے ہوئے پرندے کو اچانک گولی آلگے اور وہ بے جان ہو کر زمین پر گر پڑے۔ اسی طرح شعیب بے جان سا ہو کر سہیل پر گر پڑتا ہے۔ اُسے چومتا ہے)

میری۔ (جو ابھی تک اپنے سر کو ہاتھوں سے دبائے مریض کے سرہانے بیٹھی تھی۔ آنسو پونچھتی ہوئی اٹھتی ہے اور اسٹووکے قریب آتی ہے سرنج کو دیگچی میں سے نکالتی ہے اور آہستہ آہستہ ٹوٹی ہوئی آواز میں کہتی ہے) آہ۔ انسان کی زندگی۔ خدا ہم سے کیا چاہتا ہے۔ بے چارہ شعیب۔ پیارا سہیل۔ میں بدنصیب مر جاؤں ——— (ڈاکٹر اس کے قریب جاتا ہے اور بیگ سے دوائی کی چھوٹی سی بوتل نکال کر سرنج کو بھرتا ہے۔ میری ایک پھریری کو ٹنچر آئیوڈین سے تر کر کے مریض کے سرہانے ساکت و صامت کھڑی رہتی ہے۔ شعیب اوندھے منہ سہیل سے لپٹا ہوا ہے ڈاکٹر آگے بڑھتا ہے)

ڈاکٹر۔ شعیب۔ شعیب! (شعیب اٹھتا ہے) خدا ہر شے پر قادر ہے کوئی بعید نہیں کہ اُس کو اس معصوم پر رحم آجائے۔ ہٹو ہمیں ٹیکہ کرنے دو (شعیب ایک طرف ہٹ جاتا ہے اور مجسمِ مظلوموں کی طرح کھڑا ہو کر انہیں ٹکٹکی باندھے دیکھتا ہے۔ میری پھریری ڈاکٹر کو پکڑا کر مریض کا بازو لحاف سے باہر نکالتی ہے۔ آستین چڑھاتی ہے اور برہنہ بازو کو بے اختیارانہ چوم لیتی ہے۔ پھر ڈاکٹر سے پھریری لے کر مریض کے بازو پر ٹنچر آئیوڈین کا نشان لگاتی ہے۔ ڈاکٹر ٹیکہ لگا کر مریض کو سیدھا لٹا دیتا ہے مریض کی کرب دبے چینی لحہ بہ لحہ بڑھتی جاتی ہے)

شعیب (حسرت اور رقت آمیز آواز میں) ڈا ——— کٹر ———!!؟؟؟

(ڈاکٹر اور نرس کی نظریں مریض کے زرد چہرے پر ہیں)

مریض۔ (ہاتھ پیر مارتا ہے۔ الفاظ اُس کے منہ سے کانپتے ہوئے نکلتے ہیں) ہا ہا ہائے ——— م۔ م آں ——— م، آں ———

شعیب۔ (مریض پر جھک کر اُسے چومتا ہے) میری۔ جا۔ ن ——— دفع بھی کر۔ ماں کو ——— بھولے سہیل، بدکار ماؤں کو بھی۔ بیٹے یاد کیا کرتے ہیں۔ تیرا باپ ——— مر گیا ہے!

(میری کے منہ سے بے اختیارانہ ایک دردناک چیخ نکلتی ہے شعیب اور ڈاکٹر گھبرا کر اُس کی طرف دیکھتے ہیں)

میری۔ (نقاب کو پھاڑ کر) بھولے سہیل۔ تیری بدکار ماں۔ مظالم سے کچلی ہوئی زمانے کی روندی ——— آہ تیری ماں (بڑھ کر سہیل پر گر پڑتی ہے) ہائے میرا بیٹا (وہ اپنا منہ سہیل کی گالوں پر رکھ کر دیوانوں کی طرح بوسوں کا تار باندھ دیتی ہے)

شعیب۔ (حیرت سے) حسنہ!!!!! ——— او وہ حسنہ!؟؟؟ (دانتوں کو پیس کر آگے بڑھتا ہے) نابکار، لعین ——— بے حیا حسنہ۔ میرا گھر ناپاک ہو گیا (اُس کو کھینچتا ہے) ٹھکرائے ہوئے سہیل سے لپٹتی ہے۔ آہ۔ معصوم کو آلودہ کر رہی ہے (کھینچ کر دھکا دیتا ہے۔ وہ گر پڑتی ہے اور محبت بھری آنکھوں سے پہلے سہیل کو دیکھتی ہے پھر شعیب کو)

حسنہ۔ (آنکھوں سے زار زار آنسو گرتے ہیں آواز بھرائی ہوئی) معاف کر دو مجھے۔ پیارے سہیل کے باپ ———

شعیب۔ نکل جا یہاں سے ذلیل بدکار عورت۔ کتیا دھتکاری ہوئی (اس کو گھسیٹتا ہے وہ بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی کمرے سے باہر نکل جاتی ہے۔ یوں جیسے حسرت و ارمان کی تصویر جا رہی ہو۔ شعیب خونخوار بھیڑئیے کی طرح دانت پیس پیس کر اس کو حقارت و نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔ رضا حیران و ششدر سہما ہوا بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑا ہے)

سہیل۔ (پھر ہاتھ پیر مارتا ہے) او وہ! او وہ! (مری ہوئی آواز میں) ماں ——— آں ——— آں۔

شعیب۔ (زور سے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتا ہے اور مریض پر جھک جاتا ہے)

آہ سہیل۔ پیارے سہیل تجھے ماں کی ضرورت ہے۔ ہوش کرو
خدا کے لئے ہوش کرو۔ آہ ــــ آ ــــ ہ ــــ سہیل۔
ہا ــــ ہا ــــ

(ڈاکٹر کھڑکی کے پاس کھڑا ہو کر باہر دیکھتا ہے۔ اچانک گھبرا سا
جاتا ہے اور غور سے کچھ دیکھتا رہتا ہے)

شعیب۔ رضا ــــ!!! (ڈاکٹر رضا کو دیکھتا ہے۔ رضا جیسے سنا ہی نہیں
کھڑا رہتا ہے۔ شعیب پاس آکر کھڑکی سے باہر دیکھتا ہے ــــ
گھبرا جاتا ہے) حسنہ؟؟؟ (زور سے آواز دیتا ہے) حسنہ
ــــ حسنہ۔ ٹھہرو۔ رک جاؤ۔ ٹھہرو۔ (آگے چٹان ہے
خطرناک نشیب ہے) حسنہ، حسنہ۔ وہ گری (دونوں اپنی
اپنی آنکھوں کو ہاتھوں سے چھپا کر پیچھے ہٹتے ہیں۔ شعیب فوراً
کمرے سے بھاگ جاتا ہے۔ ڈاکٹر بے جان سا ہو کر کرسی پر بیٹھ
جاتا ہے)

(چند منٹ بعد)

سہیل۔ آہ ــــ آ آہ ــــ اہ۔ ہاہ ــــ (اُس کی ہچکی بندھ جاتی
ہے۔ ڈاکٹر اس کے قریب ہو جاتا ہے۔ اس کے چہرے
کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے۔ پھر اوپر چھت کی طرف ٹکٹکی پھٹی پھٹی
سے دیکھتا ہے)

ڈاکٹر۔ اے خدا۔ رحم رحم کر ــــ (اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کر سر
باہر نکال کر زور سے آواز دیتا ہے) شعیب ــــ شعیب جلدی
آؤ۔ (پھر مریض کی نبض ہاتھ میں لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ بدستور
ہچکیاں لے رہا ہے) اے خدا سہیل اس دنیا سے معصوم جا
رہا ہے۔ یہ کلی ہے جو ابھی شگفتہ بھی نہیں ہوئی۔ اس پر رحم کر خدا
رحم کر (وہ ایک آخری لمبی سی ہچکی لے کر جسم و روح کے تعلق
سے آزاد ہو جاتا ہے۔ رضا اُسی وقت اُس کی پیشانی پر ایک بوسہ
دیتا ہے) لو یہ بدنصیب شعیب کی طرف سے آہ خدایا ــــ
شعیب تو مر جائے گا پاگل ہو جائے گا (کھڑا ہو کر اُس کے چہرے
کو لحاف سے ڈھانپ دیتا ہے۔ اتنے میں شعیب حسنہ کو ہاتھوں
پر اٹھائے اپنے پیروں کو گھسیٹ گھسیٹ کر کمرے میں داخل
ہوتا ہے)

شعیب۔ لے آیا ہوں تیری ماں کو سہیل۔ (حسنہ کے بال سفید اور کالے
سے جا بجا نیچے لٹک رہے ہیں۔ کپڑے کیچڑ سے لت پت ہیں۔
زرد گردن کے پاس خون کا بڑا سا دھبہ ہے۔ شعیب کی آنکھیں
بے نور ہو رہی ہیں اور ان کے گرد نیلے نیلے حلقے پڑے ہوئے
ہیں۔ رنگت میں موت کی سی زردی ہے۔ حسنہ کو فرش پر لٹا کر
اس کے دل پر ہاتھ رکھتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے اس کا بازو
اوپر اٹھا کر) دیکھو رضا۔

رضا۔ (نبض کو ہاتھ میں لے کر۔ سر کو دائیں بائیں ہلاتا ہے)

شعیب۔ ختم؟؟؟ ــــ (اچانک چارپائی پر نظر پڑتی ہے۔ ٹھٹک کر)
سہیل؟؟؟ (لپک کر چہرے سے لحاف اتارتا ہے۔ چہرہ فوراً
سخت ہو جاتا ہے۔ آنکھوں میں ایک آنسو نہیں زبان پر ایک لفظ
نہیں۔ بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہتا ہے ــــ ڈاکٹر
رومال سے اپنی آنکھیں پونچھتا ہے اور آگے بڑھ کر شعیب کا ہاتھ
اپنے ہاتھ میں پکڑ لیتا ہے اُسے دباتا ہے۔ شعیب ہاتھ چھڑا کر
پاگلوں کی طرح رضا کو گریبان سے پکڑ لیتا ہے اور کھینچ کر ہنستا
ہے) آ ہا ہا ہا۔ آ ہا ہا ہا ہا۔

رضا۔ (گھبرا کر) شعیب ــــ شعیب

(پردہ گرتا ہے)

(پردہ گرنے کے بعد بھی آواز آتی ہے)

شعیب!!!

باکر بٹالوی بی اے (آنرز)

اشعار

ملتا نہیں بلبل کو تڑپنے کا صلہ کیوں
کیا دامن گلچیں میں کوئی خار نہیں ہے
سینہ میں تلاطم ہے تو آنکھوں میں ہیں آنسو
درگاہِ اجابت میں مگر بار نہیں ہے

رضا

غزل

نہیں دیکھے گئے وہ بھی نگاہِ برقِ مضطر سے
جو تنکے بچ رہے تھے آشیاں میں بادِ صرصر سے

ارے صیاد مجبوری اسی کا نام ہے شاید
نشیمن جل رہا ہے دیکھتے ہیں ہم ترے گھر سے

بہارِ صحنِ گلشن ہے اگر اپنے مقدر میں
قفس کی تیلیاں سرسبز ہوں گی دیدۂ تر سے

ہمارے دل کے زخموں کی یہ ہیں دھندلی سی تصویریں
حروفِ نامہ جل کے مٹ گئے ہیں دیدۂ تر سے

قفس میں دل کی ہر جنبش پہ اتنا ہوش آتا ہے
کہ انجامِ خزاں کا ذکر تھا نکلے تھے جب گھر سے

خدا یاد آیا جب پامالِ حسرت دل ہوا اپنا
نکل آئی رہِ عمرِ ابد اجڑے ہوئے گھر سے

دعا کے ساتھ وہ آمین کہتے ہیں مگر جوہر
اثر بیگانہ سا رہتا ہے کچھ تیرے مقدر سے

لکشمی نرائن جوہر بدایونی

حُورِ صحرا کے نام

میں سوچتا ہوں کہ یہ دن رات کی محنت، یہ صبح و شام کی شقت آخر کس لئے؟ یہ راتیں جاگ جاگ کر آنکھوں ہی کاٹنا، یہ دن بھر سر گردان و پریشان ہو کر پھرنا آخر کس واسطے؟ میری شام و سحر کی محنت میری شب و روز کی کاوش کا انجام کیا ہے؟ راتوں کی دیدہ ریزی اور دنوں کی جاں فشانی سے کیا مقصود ہے؟

شہرت کی خواہش؟ دولت کی ہوس؟ نام و نمود کی چاہت؟ میں نے اگر سیم و زر کے انبار جمع کر بھی لئے، میرا نام اگر بحر و بر کی دور دراز پہنائیوں تک پہنچ بھی گیا اور میرے قلم کی سحر طرازیوں نے اگر دنیا کو محوِ حیرت بنا بھی دیا تو کس کام؟ میں جب تک اس کی نگہِ التفات سے محروم ہوں زر و جواہر کے خزانے ہیچ ہیں۔ ہفت افلاک کی شہرت بے معنی ہے اور شعر و ادب کی ہنگامہ آرائی بے سود

اور پھر سوچتا ہوں کہ یہ شعر و ادب ہے کیا! بس اُس کی ایک جھلک کے بھڑکائے ہوئے شعلوں کی تپش، اُس کی ایک نظر کے برپا کئے ہوئے طوفانوں کی لہر اور اُس کی ایک آواز کے متحرک کئے ہوئے نغموں کا ترنم۔ شعلوں کی اس تپش، طوفانوں کی اس لہر اور نغموں کے اس ترنم نے میری زندگی کو تہ و بالا کر دیا ہے۔ لیکن میرے دل و دماغ کی دنیا اسی تپش، اسی لہر اور اسی ترنم سے آباد ہے۔ یہ چیزیں مجھ سے چھین لو اور میں اس بے آب و رنگ دنیا میں زندہ رہنے کی خواہش سے دست بردار ہو جاؤں گا۔

یہ شعر گوئی، یہ نغمہ خوانی، یہ افسانہ نگاری صرف اس امید پر حاصل کی تھی کہ اپنے دل کے درد، اپنی روح کے گداز اور اپنی جان کے روگ سے اُسے آگاہ کر سکوں گا۔ یہ ادب و انشا کی زندگی محض اس خیال سے اختیار کی تھی کہ الفاظ کے پردے میں اپنے زخموں کی خلش، اپنی آہوں کی جلن اور اپنی آنکھوں کی سوزش اُسے دکھا سکوں گا، لیکن میری تیرہ بختی کہ جگر خون ہو ہو کر آنکھوں سے بہتا رہا، شرر بار آہوں سے جسم و جان جل جل کر راکھ ہو گئے، زخموں نے رس رس کر ناسور کی صورت اختیار کر لی اور وہ میرے حالِ تباہ سے بے خبر، میرے رنج و الم سے غافل، میرے درد و کرب سے بے نیاز اطمینان سے دنیا کا تماشا کرتی رہی۔ ہائے

وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی
میرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی

لوگ کہتے ہیں کہ میرے الفاظ میں مقناطیس کی قوت، بجلی کی تڑپ اور شعلوں کی حدت پنہاں ہے۔ میرے حریف حیران ہیں کہ میرے کلام میں سوز، میرے بیان میں سحر اور میری انشا میں رنگینی کہاں سے آئی۔ وہ شاید سمجھتے ہیں کہ لغت کے قواعد اور محاورے کی پابندیاں زبان کو معجز بیانی اور قلم کو جادو نگاری کی طاقت بخش دیتی ہیں۔ لیکن آہ یہ راز دوست دشمن سبھی سے پوشیدہ رہا کہ میری بے کیف زندگی جب تک اس کے جلووں سے منور نہ ہوئی تھی، میرے لیل و نہار کا بے روح و بے ذوق تسلسل جب تک اُس کی نگاہوں کے سحر سے پاش پاش نہ ہوا تھا اور وہ جب تک اپنے حسن و جمال کی تابانیوں کے ساتھ میرے افقِ حیات پر چودھویں کا چاند بن کر نمودار نہ ہوئی تھی۔ میرے الفاظ میں نہ مقناطیس کی کشش تھی اور نہ بجلی کی چمک۔ میری زبان میں تاثیر تھی اور نہ میرے قلم میں روانی۔ اُس نے بھولے سے ایک نظر مجھ خانماں خراب پر ڈال دی اور یہ سوئے ہوئے فتنے یک بارگی جاگ اُٹھے، بجھی ہوئی چنگاریاں انگاروں کی طرح دہکنے لگ گئیں اور سازِ زندگی کے ٹوٹے ہوئے تاروں سے نشاط و کامرانی کے نغمے پھوٹ پھوٹ کر بہ نکلے۔ عشق فصاحت و بلاغت کا سب سے بڑا معلّم ہے۔ جب دل اس کی شعاعوں سے جگمگانے لگتے ہیں، جب روحیں اس کے نغموں سے وجد میں آتی ہیں اور جب حواس پر وہ ایک خمار بن کر چھا جاتا ہے تو زبان حقائق و معارف کی ترجمان بن جاتی ہے

اور قلم ازل و ابد کے اسرار کے پردے چاک کر دیتا ہے۔

میرے دل و دماغ پر حکومت کرنے والی ساحرہ! تیری ایک نگاہ نے میری دنیا بدل ڈالی۔ میری زندگی کی شاہراہ کس قدر تاریک تھی، تو نے ایک لمحہ کی مسکراہٹ سے اُسے دور دور تک روشن کر دیا۔ یہ صبح و شام کی فرسودگی، یہ لیل و نہار کی گردش دلآویزیوں سے محروم ہو چکی تھی۔ تو نے آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور جس طرح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ کائنات کے مردہ جسم میں حیات تازہ کی لہر دوڑ جاتی ہے میری مضمحل و افسردہ زندگی تیرے جمالِ جاں فروز کے پرتو سے چمک اٹھی۔ آہ

ایک ہی بار ہوئیں وجہِ گرفتاریِ دل
التفات اُن کی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا

یہ کاہش فراق، یہ تجھ سے دور رہنے کی اذیت، یہ تجھ تک نہ پہنچ سکنے کی بے کسی مجھے ہلاک کئے دیتی ہے۔ پھر یہ سب کچھ ایک روز کا دکھ ہو تو صبر بھی ہو سکتا ہے۔ مگر جب حالت یہ ہے کہ دن رات میں کوئی لمحہ تیری یاد سے غافل اور شام و سحر کا کوئی دقیقہ تیرے تصور کے بغیر نہیں گزرتا تو بتا میں دلِ ناداں کو کہاں تک تسلیاں دے دے کر بہلاتا رہوں۔ جانتا ہوں کہ تیری عیش و آرام میں ڈوبی ہوئی زندگی میرے رنج و اضطراب سے متاثر نہیں ہو سکتی لیکن اس پر بھی اپنے دلِ غم نصیب کے اُن خونچکاں گوشوں کو بے نقاب کرنے کی جرأت کر رہا ہوں جن کی ایک جھلک شاید دنیا سے مسرت و نشاط کا وجود فنا کر دے

میری جان، میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ تجھے صحرا کی زندگی کیوں پسند آ گئی ہے؟ تیرا یاسمین جسم جو مہتاب کی کرنوں سے بڑھ کر حسین و جمیل اور موسمِ بہار میں کھلنے والے پھولوں سے زیادہ معطر و شاداب ہے ریگستان کی گرم ہواؤں کی کیوں کر تاب لا رہا ہے! کیا اس لئے کہ لیلےٰ کو نجد اور عذرا کو یمن عزیز تھا اور تو نے بھی دل نوازی و دل بری کی انہی روایات کو زندہ رکھنے کی خاطر نجد یا کوہ ریگ زار منتخب کر لیا ہے جہاں حُسن ہمیشہ ناوک فگنی اور عشق ہمیشہ جاں کنی میں مصروف رہتا ہے؟

اگر یہ چند سطریں تیری نظر سے گزریں ——— آہ مجھے اپنے بختِ نارسا سے اس کی توقع نہیں ——— تو سمجھ لیجو کہ قدرت نے تجھے لیلےٰ روشی سکھا کر مجھ مہجور و حرماں نصیب کو قیس کی سوختہ سامانی عطا کرنے میں بخل نہیں کیا۔

"ع"

"سانیٹ"

عزمِ ترنم آج بھی بادِ بہار ہے
اب بھی ہے اودی اودی گھٹا زُہد آزما
طوفانِ رنگ و بو ہے فسوں کارِ سحر زا
اب بھی ہزار کیف کی پروردگار ہے

غارت گرِ قرار ہے اب بھی شفق کا رنگ
اب بھی ابھارتی ہے دلوں کو گناہ پر
اب بھی نظر نواز ہے رنگینیٔ سحر
بیدار دل میں کرتی ہے اب بھی وہی اُمنگ

اب بھی ہے اُن کی زلفِ پریشاں جنوں طراز
محشر بدوش اب بھی ہیں اٹھتی جوانیاں
اب بھی نگاہِ حسن میں رقصاں ہیں بجلیاں
عہدِ شباب اب بھی ہے پر میرے چارہ ساز!

اس روز و شب کی اشک فشاں کو کیا کروں!
دل ہی جواں نہ ہو تو جوانی کو کیا کروں!

سکندر

ایک راہبہ کے محبّت نامے!

تیسرا خط!!!

میری مظلومیتوں کی اس سے زیادہ حسرت ناک انتہا اور کیا ہوگی اور تم مجھ سے اپنی محبت کا اس سے زیادہ صلہ اور کیا چاہتے ہو؟ میرے ذہن کی تمام طاقتیں سلب ہو چکی ہیں۔ میری مایوسیوں نے مجھے کچھ سوچنے سے بھی مجبور و لاچار کر دیا ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اب کیا کروں۔؟

میں اسی امید میں جی رہی تھی کہ تم جہاں بھی جاؤ گے، جس شہر سے بھی گزرو گے، مجھے ضرور کچھ نہ کچھ لکھ کر بھیجو گے، خطوں میں مجھے اپنے ملنے کی امید دلا کر میری شکستہ دلی کو دور کر دو گے اور اس طرح سے اپنی وفاداری کا ثبوت بہم پہنچاؤ گے۔ میرے لئے اتنا ہی کافی تھا میں یقیناً اطمینان کا سانس لیتی اور سمجھتی کہ تمہیں بھی میرے غم کا پاس ہے، میرے دل کی آہ و زاری کا تمہیں بھی خیال ہے۔ تمہارے اس طرح یاد کرنے سے میری تمام مصیبتوں کی تلافی ہو جاتی اور میرا غم بھی یقیناً ہلکا ہو جاتا!!

آہ، تم کیا جانو کہ میرے دل کے ساتھ کیا گزر رہی ہے اور تمہاری ظالم جدائی مجھ پر کیا کیا ستم ڈھا رہی ہے۔ میری صحت برباد ہو چکی ہے۔ میرے دل کے معصوم جذبات منتشر اور شکستہ پڑے ہیں۔ میری پرشوق آرزوئیں غارت ہو چکی ہیں اور میری مایوس نگاہیں تمہاری دید سے محروم ہو ہو کر تڑپ رہی ہیں۔!!

کیا جدا ہوتے وقت تم نے جو پیمانِ الفت باندھے تھے وہ سب جھوٹی فریب کاریاں تھیں تمہاری رخصت کی ——— جنہیں میں نے اپنے بھولے پن سے اپنی آنے والی قسمت کا معاون و مددگار سمجھا تھا!!!

آہ، کیا یہ محبت کے غم کا بار مجھے اکیلے ہی اٹھانا پڑے گا، کاش میں اپنی اس بے چارگی اور ناتوانی کو اس وقت محسوس کرتی۔ جب تمہیں میں نے اپنی محبت کے لئے انتخاب کیا تھا!!! افسوس میری مظلومیت اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ میں تمہیں اپنے رنج و غم کا شریک بھی نہیں بنا سکتی اور تنہا خود ہی مجھے اپنی بدقسمتی کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے!!!

یہ ظالم خیال مجھے مارے ڈالتا ہے اور اس ڈر کی وحشت مجھے پنپنے نہیں دیتی کہ شاید تم نے واقعی کبھی محبت کی اصل خوشی چاہی ہی نہ تھی!!

ہاں! اب مجھے معلوم ہوا کہ تمہاری وہ سب سرگرمیاں اور تمہارے وہ سب شوق محض جھوٹے تھے اور بے ثبات! تمہارا یہ کہنا کہ تم میرے بغیر اکیلا رہنا گوارا نہیں کر سکتے تھے دھوکا تھا سراپا دھوکا!!

تمہاری روح کی وحدانیت، تمہارے دل کی بے قراریاں، یہ سب کچھ میرا دل رکھنے کے لئے تھا، تمہیں تو صرف میرے دل کا سکون برباد کرنا تھا سو کیا۔ یہ حقیقت کہ تم میری محبت سے کبھی بھی متاثر نہیں ہوئے۔ مجھ پر اب کھلی۔ میں نے یہ راز اب جانا۔ ذرا سوچو تو! تم نے میرے اس قدر ایثار، میری اس درجہ عاجزی اور انکساری سے کیا فائدہ حاصل کیا! یقیناً کچھ بھی نہیں!! آہ، کتنے بدنصیب ہو تم! اور یہاں میرا یہ حال کہ تمہاری اس قدر پرستش کر چکنے کے بعد بھی میں تمہیں اپنا نہ بنا سکی!!

مجھے سخت افسوس ہے (اپنے دل کے تمام تر خلوص و صدق کے ساتھ) محبت کی اُن بے انتہا مسرتوں کا جنہیں تم ضائع کر چکے ہو! کیا تم نے اُن مسرتوں کو حاصل کرنے کی کبھی آرزو بھی کی تھی!!!؟

اگر تم محبت اور محبت کی اصلیت سے آگاہ ہو جاتے تو بجائے اس کے کہ مجھے فریبوں میں مبتلا کرتے۔ میری عبادت کرتے، اور اس راز کو سمجھ سکتے کہ محبت کئے جانے کی نسبت دیوانہ وار محبت کرنے میں ایک مسرت روحی ایک وجدانِ حقیقی ہوتا ہے!!!

میری جانب دیکھو، میں نے اپنے آپ کو محبت میں غرق کر ڈالا ہے یہاں تک کہ اپنی ہستی کو بھی بھولی ہوئی ہوں۔ اتنا بھی نہیں جانتی کہ مجھے کرنا

کیا ہے اور وہ کون ہے جس کی آرزو میں کھوئی جا رہی ہوں !!!؟

سینکڑوں فکر مالی اور بے بس کرنے والے افکار اور پریشانیوں نے مجھے بے حس و مردہ بنا رکھا ہے۔ آہ، میری عاجزی کتنی حسرت خیز ہے کہ میں نے تمہاری محبت میں اپنا سب کچھ کھو کر بھی تم سے یہ درخواست نہ کی، کہ تم بھی میری طرح محبت کی تلخیوں سے بے خود و بے قرار ہو۔ میں خودکشی کر لوں گی! اگر ایسا نہ کر سکی تو غموں میں گھل گھل کر اپنی جان پر کھیل جاؤں گی! آہ، اگر مجھے اتنا صرف اسی قدر معلوم ہو جائے کہ تمہیں بھی میرے غم میں سکون نصیب نہیں۔ تمہاری زندگی بھی میری طرح درد والم سے ہم کنار ہے۔ تمہاری راتیں بھی میرے غم میں پریشان رہتی ہیں۔ تم بھی میری یاد میں روتے رہتے ہو اور سب سے آخر میں یہ کہ دنیا میں میرے بغیر تمہیں بھی کوئی شے بھلی نہیں لگتی !!!

مجھے محبت نے اس درجہ ناتواں اور نحیف بنا دیا ہے کہ مجھ میں اب اپنے غموں کا مقابلہ کرنے کی بھی سکت نہیں رہی۔ اُف! اگر کہیں ایسا ہوتا کہ تم بھی میری طرح افسردہ و غمگین ہوتے (اگر تمہیں کوئی غم ہوتا تب!) تو یہ ناممکن تھا کہ میں تمہارے ان شدید بدنما سرگرم غموں کو برداشت کر سکتی !!

یقین جانو کہ مجھے ہر اُس شے سے خطرناک طور پر حسد ہے۔ جو ذرا سی میں تمہارے دل و دماغ کے لئے دلچسپی اور دلکشی کا باعث بنی ہوئی ہے!!

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تمہیں خط کیوں لکھتی ہوں۔ زیادہ سے زیادہ تم یہی کرو گے کہ مجھ سے اظہار ہمدردی کرنے لگو۔ لیکن میں اب ہر چیز سے بے نیاز ہو چکی ہوں۔ مجھے اب تمہاری ہمدردی کی بھی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ مجھے اس وقت خود سے نفرت ہونے لگتی ہے جب میں یہ سوچتی ہوں کہ میں نے تمہارے لئے کیا کچھ کیا۔ میں تمہاری خاطر اپنی عزت اپنا وقار سب کچھ کھو بیٹھی ہوں۔ میں نے صرف ایک تمہارے لئے اپنے تمام عزیزوں کو ناراض کر لیا۔ میں نے صرف تمہاری خوشی کے لئے سنگین قوانین کی بھی پروا تک نہ کی جو حکومت نے ہمارے طبقہ کی عورتوں کے لئے نافذ کر رکھے ہیں اور پھر سب سے بڑھ کر تمہاری بے وفائی —— تمہاری سرد مہری کا نشانہ بنی جس سے زیادہ مہلک میرے لئے دنیا میں اور کوئی مصیبت نہیں —— کوئی بلا نہیں !! مگر آہ یہ سب کچھ کر کے بھی میری محبت ابھی تشنہ ہے۔ میری پشیمانی ابھی تک نامکمل ہے میں ابھی اور ان سے زیادہ خطرناک مصائب تمہارے لئے نہایت خوشی اور آسانی سے جھیل سکتی ہوں۔ آہ میں اب بھی تیار ہوں۔ میں اب بھی راضی ہوں۔ اپنی زندگی کی تمام تر لطافتیں اپنی معصوم جوانی کی ساری رنگینیاں اپنے ناموس کی تمام شہرتیں اور سرفرازیاں تمہارے لئے آہ صرف تمہارے لئے قربان کر دینے کو !!!

اب بھی میرے لئے جو کچھ عزیز ہے، اب بھی دنیا میں جو چیز مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے وہ فقط تمہارے لئے وقف ہے، میں اُسے بلا روک ٹوک، کسی قسم کا تامل کئے بغیر، تمہارے قدموں پر لٹانے کے لئے، تم پر نثار کرنے کو ہر وقت ہر لمحہ تیار ہوں !!

مجھے اِس کا احساس ہے کہ مجھے ابھی تک میری محبت کے غم نے اچھی طرح سے مطمئن نہیں کیا۔ میری محبت کی تکمیل ابھی تک نہیں ہوئی۔ میری روح کو اس وقت تک چین نصیب نہ ہوگا۔ جب تک کہ میں تمہارے دل کی تسلی کو حاصل نہ کر سکوں! میری اس تمام تر ریاضت اور عبادت کا کیا فایدہ اگر میں تمہیں خوش نہ کر سکی ؟

میں زندہ ہوں مگر اپنی وفاؤں کے صلے کے بغیر آہ، اپنی آرزوؤں کی کامیابی کے بغیر! مجھے اپنی زندگی کے برقرار رکھنے میں اتنا لطف حاصل نہ ہوگا جتنا کہ میں اسے کھو کر خوش ہوں گی!!

کاش میں اپنی اس شکستگیٔ پندار کی حالت میں ہی مر جاتی۔ پھر میری محبت کی خونچکاں داستان صرف خطوں میں ہی پوشیدہ رہتی !!

اگر میں اپنی روح کی تمام تر گہرائی اور شدت کے ساتھ (جس کا اظہار میں پہلے بھی کئی بار کر چکی ہوں) تم سے محبت کرتی تو کیا میں اب تک مر نہ جاتی؟ میں نے ایسا نہ کر کے یقیناً تمہیں فریب دیا ہے۔ تمہیں دھوکے میں رکھا ہے۔ تم اس بات کا مجھ سے شکوہ کر سکتے ہو، تم میری اس غفلت طرازی کا مجھے مجرم ٹھیرا سکتے ہو! تم مجھے اس کی سزا دے سکتے ہو!!! آہ تم مجھے سزا دینے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ !!!!! تم مجھ سے جدا ہو گئے ہو اور اب میں کسی حال میں کسی طرح بھی یہ امید نہیں کر سکتی کہ تم مجھے کبھی ملو گے۔ آہ، یہ سب کچھ جانتے ہوئے میں پھر بھی زندہ ہوں۔

میں نے تم سے دغا کی ہے۔ میں تم سے معافی چاہتی ہوں۔ مگر آہ، تم مجھے معاف نہ کرو۔ تم مجھ سے بے رحمانہ برتاؤ کرو۔ مجھے اس بات کا طعنہ دو کہ میرے احساسات غیر مستقل اور ناتواں ہیں۔ تم میری خوشیوں کے لئے مشکل بن جاؤ اور مجھے حکم دو کہ میں تمہاری محبت میں مر جاؤں !!! میں تم سے منت کرتی ہوں —— التجا کرتی ہوں کہ اس معاملے میں خدارا تم میرا ساتھ دو! تاکہ میں اپنی نسوانی کمزوری

کو اچھی طرح محسوس کرلوں اور ایک ابدی موت سے اپنی اس محبت کی خام کاری کا خاتمہ کرڈالوں! اور پھر شاید تم میرے اس دردناک انجام سے کچھ نہ کچھ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکو اور پھر شاید مجھے کبھی کبھی یاد بھی کرلیا کرو!!

میری موجودہ حالت (جس کا تمام تر گناہ تمہاری گردن پر ہے) شاید وہ حالت کچھ بہتر ہو!!

الوداع، اے میری زندگی کے چھیننے والے، الوداع!!

آہ میں کتنی خوش نصیب ہوتی۔ اگر تمہاری محبت کی اولین نگاہ کو ٹھکرا دیتی!! میری محبت کے اس قوی الاثر جذبے نے مجھے بعد میں کتنا تباہ کیا۔ اب جبکہ میں اپنے دل کی واردات لکھ رہی ہوں۔ مجھ پر یہ راز عیاں ہو رہا ہے کہ جتنا میں پہلی بار تمہیں دیکھ کر پریشان ہوئی۔ اتنا ہی تمہیں چاہنے میں مایوس نہیں ہوئی!!

بغیر کسی شکوہ و شکایت کے میں اپنی نابکار قسمت کی ہار مان لیتی ہوں! جب مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ تم نے اسے خوش رکھنے میں ذرا سی بھی کوشش سے کام نہیں لیا! تم (جو میری محبت کو مظلوم بنانے والے معصوم قاتل ہو) مجھ سے عہد کرو کہ تم میری مایوس موت پر اپنے دل کے رقیق اور نرم جذبات سے آنسو بہاؤ گے، اور میرے دیوانے جذباتِ محبت کی اس معصوم قربانی سے متاثر ہو کر دنیا کی کسی اور دلچسپی میں حصہ نہ لو گے۔ اُنہی آہ، صرف اسی قدر تسلی میرے دل کے لئے کافی ہو گی! اگر میں تم سے اپنی محبت کو واپس چھین لوں گی تو میں تمہیں کسی دوسری محبوبہ کی آغوش محبت میں دیکھنا بھی پسند نہ کروں گی۔ اس سے زیادہ تمہاری بے رحمی کی حد اور کیا ہو گی کہ تم میری محبت کو فنا کر کے اپنے آپ پر نازاں ہو اور یہ سمجھتے ہو کہ تم نے کائنات میں ایک معصوم روح کو مجروح اور پامال کر کے دنیائے محبت پر ایک بہت جلیل القدر احسان کیا ہے!!!!؟

میں تمہیں دوسری بار الوداع کہتی ہوں۔ میری جانب سے تمہیں بہت طویل خطوط لکھے جاتے ہیں۔ میں تمہارے قیمتی وقت کا بھی تو خیال نہیں کرتی جس کی میں تم سے معافی مانگتی ہوں اور یہ امید رکھنے کی جسارت کرتی ہوں کہ تم ضرور اپنے قیمتی وقت کی تھوڑی سی مصروفیت ایک دیوانی لڑکی کی داستان الم کے سننے کے لئے بھی نکال لو گے۔ آہ، وہ دیوانی لڑکی جو تمہیں محبت کرنے سے پہلے یقیناً فرزانہ تھی۔

مجھے اس کا علم ہے کہ میں تم سے اپنی پریشانیوں کا بہت تذکرہ کرتی ہوں تاہم میں تمہارا تہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں کیونکہ میری یہ سب پریشانیاں تمہاری ہی بے اعتنائی کی مرہون منت ہیں!!!

مجھے اپنی زندگی کے اُس سکون سے بھی نفرت رہی ہے جو مجھے تمہاری محبت سے پہلے حاصل تھا!!

اس وقت کہ میں تمہیں آخری بار الوداع کہنا چاہتی ہوں قلم ہاتھ سے گرا جا رہا ہے! دل ہے کہ بے تاب ہو رہا ہے ——— اور روح ہے کہ پگھلی جا رہی ہے ——— آہ مجھے ابھی تم سے کیا کیا کچھ اور کہنا تھا!!!!

عظیم قریشی

رباعی

گردوں پہ چھا گیا انجمن آرائی نے

خنجر میں سمو دیا بادہ پیمائی نے

رس گنبد مینائی کا پی و یکشش نے

لرزا دیا کس مست کی انگڑائی نے

سعید احمد اعجاز

پروفیسر رگھوپتی سہائے صاحب فراق گورکھپوری ایم اے۔ الہ آباد سے تحریر فرماتے ہیں:۔

میرے غمزدہ بھائی یہ خط لکھتے ہوئے کلیجہ دکھتا ہے۔ آہ منصور احمد کی موت نے ہم سے اور آپ سے بالکل زندگی کے اور مشاغل تو بر طرف تمام ادبی کاموں سے جی اُچاٹ گیا۔ ادبی دنیا میں مرحوم کی تصویر دیکھ کر ایسی محبت اُمڈی اور جی اتنا دکھا کہ میں رو تک نہ سکا۔ میں آپ کی تشفی کیا کروں گا۔ آپ پاس ہوتے تو آپ سے تشفی کی امید کرتا۔ ہاں مرحوم کے والد سے لپٹ کر رونے کا خیال پیدا ہو جاتا ہے۔ اُن کے قدموں میں ممکن اور مناسب ہو تو میرے یہ الفاظ پہنچا دیجئے گا۔ یہ سب لکھ رہا ہوں پھر بھی اپنے غم اور ان الفاظ میں کوئی نسبت نہیں پاتا۔ منصور احمد کی موت میرے بھائی اور دو ایک سال چھوٹے بھائی کی موت کے برابر ہے۔ جی چاہتا ہے کہ مرحوم کے والد صاحب سے کہوں کہ منصور احمد آنجہانی کی جگہ ہم سب کو سمجھیں۔ اس غم اور مایوسی میں جگر مراد آبادی کے اس شعر سے مجھے آپ کو اور مرحوم کے متعلقین کو سہارا لینا چاہیئے:۔

تو فنا آمادہ ہے تجھ کو نظر آتی ہے موت
زندگی نابندگی پائندگی پاتا ہوں میں

اُدبی دنیا کا اور اپنا مجھے برابر خادم اور مخلص سمجھئے۔

شہید ابن علی صاحب بیرہ ضلع مظفر گڈھ سے لکھتے ہیں۔

مرحوم کی جواں موت کے صدمے کا اندازہ تو اس کے دل سے ہو سکتا ہے جس کا وہ لختِ جگر تھا یا جس کا دستِ راست۔ مگر مجھے بھی ایک سخت صدمہ نصیب ہوا ہے کیونکہ اس دنیا میں ادبی مقالات کے متعلق سوائے ان کے میرا اور کوئی دستگیر نہ تھا اور مجھے ان سے ایک عقیدت تھی۔ مخلصانہ۔ نیازمندانہ عقیدت —— بے پناہ اور نامحدود عقیدت۔

برا ہو موت کا کہ اُس نے ایک ایسے ادیب شہیر کے جسدِ خاکی کو دنیا سے مٹا دیا۔ مگر اس کا نام مٹانے کی طاقت موت کو نہیں ہے۔ وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

محمد یعقوب صاحب بی اے۔ اسلامیہ کالج پشاور سے رقمطراز ہیں۔

افسوس۔ مرحوم کے خویش و اقارب ایک نیک سیرت عزیز اور اُس کے دوست ایک مخلص رفیق کی پیاری شخصیت سے محروم ہو گئے کون آدمی ہے جس نے منصور احمد کے ساتھ ایک دفعہ بات کی ہو اور پھر اُس کی صفاتِ حمیدہ کا گرویدہ نہ ہوا ہو۔

اردو ادب اور زبان کی انتہائی بدقسمتی ہے کہ ایک ہونہار ادیب کی بیش بہا خدمات سے اُسے فایدہ اٹھانے کا موقعہ نہیں ملا۔

مجھے اس ناگہانی موت سے بہت صدمہ ہوا ہے۔ اگر سچ پوچھیں تو میں مجسمۂ قنوطیت بن گیا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک تاریک غار میں دھکیل دیا گیا ہوں۔ جہاں مجھے چاروں طرف موت ہی موت نظر آتی ہے۔ ہم سب اس کے بغیر اور کیا کر سکتے ہیں کہ چپ چاپ خدا کی مرضی کے سامنے سرِ نیاز خم کریں۔

جناب تمکین کاظمی صاحب حیدر آباد دکن سے رقمطراز ہیں۔

"منصور احمد صاحب کی موت بڑی ناوقت موت ہے اور اس کا رنج رسمی نہیں بلکہ قلبی ہے۔ درحقیقت یہ ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ خداوند مرحوم کو مدارج اعلیٰ عطا کرے۔

ادارہ

~~~~~~~~

رباعی

[illegible] شادمانی ہوتی
[illegible] کہانی ہوتی
اے کاش [illegible] ہوتا
اے کاش یہ بہار جاودانی ہوتی

منصور احمد مرحوم
~~~~~~~~

نقد و نظر

شاعر (آگرہ) کا سالنامہ

ہمعصر شاعر نے اس شدتِ گرما میں اپنا عظیم الشان سالنامہ شائع کرکے ثابت کر دیا ہے کہ شاعر جب چاہے تخیل کے سحابی ایوانوں سے نکل کر میدانِ عمل میں بھی سرگرم کار ہو سکتا ہے۔ سوا پانسو صفحات کی یہ تالیفِ لطیف ایک بہت وقیع ادبی کارنامہ ہے جس کا بیشتر حصہ "آگرہ اسکول" کے نغمہ سرا ہونے تین سو شعرا کے کلام اور حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے۔ کئی شعرا کی تصاویر بھی زینت دہ اوراق ہیں اور ایک جدت جو ہمیں عجیب معلوم ہوئی یہ ہے کہ آگرہ سکول کے میرِ کارواں یعنی حضرتِ سیماب اکبرآبادی اپنے تلامذہ کی نظموں اور غزلوں کی جس طرح اصلاح کرتے ہیں اُس کے بہت سے نمونے درج کئے گئے ہیں۔ آگرہ سکول کیا ہے۔ اس کا مختصر جواب پروفیسر حامد حسن صاحب قادری نے یوں دیا ہے:۔

"تعلیم یافتہ اور ترقی مآب طبقوں میں دہلی و لکھنؤ کے تصنع و تکلف کی زیادہ قدر نہ رہی۔ کچھ افراد ملک میں ایسے پیدا ہو گئے جو ان دونوں اسکولوں سے الگ ایک جدید رنگ کے علمبردار ہوئے۔ یہ وہ رنگ تھا جو مرزا داغ اور مرزا غالب کے رنگِ تغزل کے امتزاج سے بقدر معتدل پیدا ہوا تھا۔ آگرہ اسکول بھی آج اسی رنگ کا متبع و مؤید ہے۔"

اور مفصل جواب چاہیں تو سالنامۂ شاعر ملاحظہ فرمائیں جسے بقول ایڈیٹر صاحب شاعر آگرہ سکول کی توضیح کا مکمل نمونہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

لکھائی چھپائی اچھی، کاغذ عمدہ، سرورق خوبصورت، قیمت صرف ایک روپیہ بارہ آنے (ع۱۲) ملنے کا پتہ قصر الادب آگرہ۔

میکدہ

شاید بہت کم اصحاب کو معلوم ہوگا کہ حکیم سید علی احمد صاحب نیر واسطی جن کا دستِ شفا سرزمین پنجاب میں ہزاروں بندگانِ خدا کو پنجۂ اجل سے چھڑانے میں کامیاب ہو چکا ہے ایک اعلیٰ پایہ کے ادیب اور شاعر بھی ہیں۔ آپ کی غزلوں اور قومی و ادبی نظموں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ میکدہ کے پُر آفریں نام سے شائع ہو کر تشنگانِ زلالِ ادب کو صلائے عام دے رہا ہے۔ ہم نے جستہ جستہ مقامات سے میکدہ کا مطالعہ کیا ہے۔ نیر صاحب کے کلام میں جو چیز